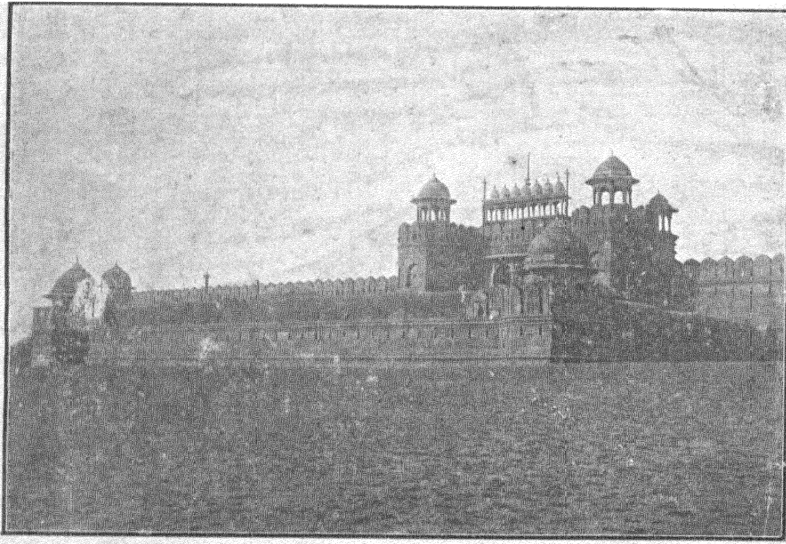
PAGES MISSING
WITHIN THE
BOOK ONLY

جلد اوّل ۶۹ بابت جنوری سنہ ۱۹۲۱ء حصّہ اوّل

اُردُو





انجمنِ ترقیِ اُردو
کا
سہ ماہی رسالہ

(باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ سے چھپکر شائع ہوا)

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آغاز

ابتدا سے انجمنِ ترقی اُردو کے مقاصد میں یہ داخل ہی کہ اس کی طرف سے ایک رسالہ شایع کیا جائے۔ لیکن سرمایہ کی قلّت اور حالات کی نامساعدت کی وجہ سے یہ ضروری مقصد اب تک عمل میں نہ آیا۔ اب حالات اور واقعات بہت کچھ بدل چکے ہیں، انجمن کی حیثیت بھی وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔ اور اگرچہ اس کا سرمایہ ایسا نہ ہو جس پر ہم فخر کر سکیں مگر ایک حد تک قابلِ اطمینان ضرور ہی اور گو اس کے ارکان کی تعداد، جیسا کہ ہماری خواہش ہی، ہزاروں تک نہ پہونچی ہو تاہم اس کے سرپرستوں اور حامیوں کی ایک مختصر جماعت ایسی ہی جو اس کی ترقی کی خواہاں اور اس کی اعانت کے لیئے دل سے آمادہ رہتی ہی۔ علاوہ اس کے اقتضائے وقت ایک ایسی چیز ہی جس کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہی اور جسے وقت پر نہ سمجھنے سے ہمیشہ پچھتانا پڑتا ہی۔ اِس کے بعد تامل کرنا یا کسی بہتر زمانہ کا انتظار کرنا قابلِ الزام ہوگا۔ اِس لیئے بعد غور اور مشورہ کے یہ قرار پایا کہ اس سال جس طرح بن سکے انجمن کا رسالہ ضرور شایع ہو جانا چاہیئے۔

اب سوال یہ ہی کہ یہ رسالہ کیسا ہو؟ معاً اس سوال کے جواب میں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہی، کیا اِس کی تشریح کی ضرورت ہی؟ انجمن کا مقصد ظاہر ہی اور اس کا رسالہ اس کے مقصد کے تابع ہوگا۔ اِس لیئے بظاہر

کسی تشریح یا توضیح کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن اس بارے میں جب بعض احباب سے گفتگو آئی تو معلوم ہوا کہ اس کے سمجھنے میں کچھ اُلجھن پیدا ہوتی ہے اور کیا عجب ہے کہ ہمارے بعض ناظرین کو بھی اُردو زبان کے موجودہ رسالوں پر قیاس کرنے سے مغالطہ ہو، لہٰذا اس رسالہ کی خصوصیت کے متعلق مختصراً کچھ لکھ دینا مناسب ہوگا۔

سب سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ رسالہ خالص ادبی ہوگا۔ یہ مثل کشکول کے نہ ہوگا جس میں ہر قسم کی رطب و یابس اور رائل بے جوڑ مضامین بھر دیئے جاتے ہیں اور کوئی خاص مقصد پیش نظر نہیں ہوتا۔ صرف پیشانی پر اس قدر لکھ دینا کافی ہے "ادبی، اخلاقی، تاریخی، معاشی، سیاسی رسالہ"۔ میں نے یہ تعریضاً نہیں کہا، ملک کو ایسے رسالوں کی بھی ضرورت ہے۔ مگر انجمن کا رسالہ ادب اور اس کے متعلقات کی حد سے آگے بڑھنا نہیں چاہتا۔

اس پر اکثر صاحبوں نے اعتراض کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ کاغذ کی یہ ناؤ کب تک چلیگی اور یہ مضمون کب تک مساعدت کریگا۔ بہت ہوا تو دو سال چلیگا۔ اور آخر یہ دفتر تہ کرنا پڑیگا۔

میں اس کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ان صاحبوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا اور روشِ علم اس رائے کا باعث ہوئی ہے۔ اگر ذرا نظرِ غور سے دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ میدان باوجود تنگی کے بہت کچھ وسعت رکھتا ہے اور بجائے خود ایک عالم ہے۔ قلم کا مسافر آبلہ پا نہو تو یہاں وہ وہ منظر نظر آئینگے جن کے لطف اُٹھانے اور بیان کرنے کو ایک عمر چاہیئے۔ نظر کوتاہی نہ کرے تو بہت سے ایسے خزانے ہیں جو ابھی تک پردۂ خفا میں ہیں اور جنھیں ہوا تک نہیں لگی۔ ہمت جی نہ چُرائے تو بہت سی کانیں ہیں جو ابھی کھودنی ہیں۔

کون انکار کرسکتا ہے کہ بہت سے الفاظ اور محاورے ابھی تحقیق طلب ہیں۔

بہت سے ایسے مصنف اور شاعر ہیں جن کا کلام ابھی تک ارباب قدردانی تک نہیں پہونچا۔

بہت سی کتابیں ہیں جو لکھنے کے بعد ہی گوشۂ گمنامی میں رہ گئیں یا شایع ہوتے ہی ناپید ہوگئیں۔

زبان کے رسم الخط، املا اور انشا میں بہت سی باتیں اصلاح طلب اور مشورہ اور بحث کی محتاج ہیں۔

اُردو کی تاریخ اور اس کی نشوونما میں بہت سی منزلیں ابھی طے کرنی باقی ہیں۔

شاہراہِ زبان سے مختلف شاخیں ایسی پھوٹتی ہیں جن کا سراغ لگانا ضروری ہے۔ مثلاً خود اُردو اور اُس کی بہنیں کس خاندان کی ہیں ان میں باہم کیا تفاوت اور تعلق ہے اور ملک میں اُن کا کیا درجہ ہے۔

زبان کی ترقی و اشاعت کی بہت سی ایسی تجویزیں ہیں جو ابھی تک عالمِ خیال سے صفحۂ قرطاس پر نہیں آئیں۔ اُن پر بحث کرنا، اُن کا جانچنا اور اُن کو عمل میں لانا بھی بڑا کام ہے۔

تنقید جو ادب کی جان اور ذوقِ سلیم کی روح و رواں ہے ابھی ہمارے یہاں ابتدائی مرحلہ میں ہے اُسے صحیح رنگ میں دکھانا بہت بڑا فرض ہے۔ اس کے بغیر ادب کی خدمت ادا ہونی ممکن نہیں۔

اُردو کے بہت سے ایسے محسن ہیں جن کے حالات اور کارنامے ملک کے سامنے پیش ہونے چاہئیں اور خاصکر جو خدمت انھوں نے اُردو کی کی ہے اُسے وضاحت کے ساتھ دکھانے اور اُن کے کلام پر ہمدردانہ اور تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت باقی ہے۔

اس کے علاوہ غیر زبانوں کے ادب میں ایسے انمول جواہر ہیں جو صاحب نظر ادیب اور شائقین ادب کے لیئے سب سے بڑا تحفہ ہیں۔ ضرورت ہے کہ انھیں اُردو کے لباس میں پیش کیا جائے تاکہ ہمارے اہلِ ملک اسلوب بیان، طرزِ تخیل و ادائے مطلب سے حظ حاصل کریں اور متمتع ہوں۔

خود غیر زبانوں کے ادب کا بیان ہمارے لیئے سبق آموز اور عبرت خیز ہو سکتا ہے۔ مثلاً اس نے کن ذرایع سے ترقی حاصل کی اور اہلِ ملک کے خصائل و عادات پر کیا اثر ڈالا۔ اور ملک کے ابھارنے اور بنانے میں کیا کام کیا۔

اس زمانہ میں اُردو کے حامی اور بہی خواہ اپنی زبان کو علمی زبان بنانے کے متمنی ہیں اور اس کے لیئے بہت کچھ سعی بھی کر رہے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ کس قدر دشوار اور کٹھن منزل ہے۔ جدید اصطلاحات اور نئے خیالات کے لیئے الفاظ کی تلاش کرنا لوہے کے چنے چبانا ہے۔ باوجود ہزار سرگردانی اور جاں کاوی کے بیان تشنہ رہتا ہے اور مطلب ادا نہیں ہوتا۔ بعض اچھے اچھے ذہین اور مستعد اصحاب اس کوہ کنی اور مغز پاشی سے عاجز ہو کر کام چھوڑ بیٹھے ہیں یا یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے خیال و رائے کے مطابق من مانی الفاظ استعمال کرنے لگتا ہے جس سے پڑھنے والے کو سخت اُلجھن ہوتی ہے اور زبان میں کوئی لفظ قایم نہیں ہونے پاتا۔ لیکن کیا کیا جائے مجبوری ہے۔ اپنے خیالات کا اظہار کہاں کریں، اِن بحثوں کو کیونکر پیش کیا جائے اور فیصلہ کس طرح ہو۔ اِس کی ایک ہی صورت ہے جو ہمارے آپ کے پیشِ نظر ہے۔

علاوہ اِس کے زبان و ادب کے متعلق اور بہت سے مباحث اور مسائل ہیں جو کتابوں میں نہیں آسکتے تھے

الگ شایع نہیں کرسکتے۔ اُن کی کھپت ایسے ہی رسالہ میں ہوسکتی ہے جس کا یہی ایک مقصد ہے، تاکہ لوگ اُسے پڑھیں
ضرورت ہو تو اپنے خیالات اور تنقید سے دوسروں کو مستفید کریں۔ اور عالمانہ بحث سے سب کو فائدہ پہونچے۔

پھر ایک بات اور ہے کہ بعض انشا پرداز ایسے بلند نظر اور پاکیزہ مذاق ہیں جو اپنے جگرپارے معمولی اخباروں اور عام رسالوں کے حوالہ کرنا نہیں چاہتے۔ اُن کے لیئے بھی تو آخر کوئی سامان ہونا چاہیئے۔

غرض جس قدر غور کیجئے گا اُسی قدر اس مضمون میں وسعت نکلتی آئیگی۔ اِس قدر لکھنے کے بعد اب ضرورت باقی نہیں رہی کہ میں رسالہ کے مقاصد بیان کروں۔ مختصر یہ کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ رسالہ اُردو زبان اور ادب کی ایسی مفید اور محققانہ بحثوں سے مالامال ہو کہ شائقین ادب اُسے غور اور شوق سے پڑھیں اور فائدہ اُٹھائیں اور اہل ملک کے ذوق پر اس کا اچھا اثر ہو اور وہ دن آئے کہ لوگ اِس کے پرچے ڈھونڈھتے پھریں۔

بعض احباب یہ فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں کی آب وہوا ایسے بلند پایہ رسالوں کے لیئے راس نہیں۔ تہذیب الاخلاق اتنے دنوں رہا سوائے محدود قدردانوں کے اس کے خریداروں کی تعداد کبھی زیادہ نہ ہوئی۔ معارف نے بڑا زور مارا آخر اس کا جو حشر ہوا ظاہر ہے۔ حسن بھی چند سال اپنا جلوہ دکھا کر روپوش ہوگیا۔ دکن ریویو بڑے آن بان سے نکلا مگر نہ چل سکا اور بند کرنا پڑا۔ اب تم کس برتے پر یہ نیا رسالہ نکالتے ہو؟

یہ سب سچ ہے لیکن اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ تہذیب الاخلاق نے ملک میں انقلاب پیدا کردیا، خیالات میں ہل چل ڈال دی اور ادب اُردو میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اگرچہ اِس کے خریداروں کی تعداد محدود تھی اور تین بار نکل کے بند ہوا لیکن جو کام اس نے کیا وہ اُردو زبان میں ہمیشہ یادگار اور لائق تعریف رہیگا۔ اب بھی اس کے مضامین مستقل کتابوں کی صورت میں شایع ہوتے ہیں اور لوگ ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں اور اُردو نصاب تعلیم کی کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں اِس کے مضامین نہوں۔ معارف اگرچہ ناقدردانی کی وجہ سے بند ہوگیا، لیکن اِس کے پرزور مضامین اور ادبی خوبیوں کی وجہ سے سارے ملک میں غلغلہ پڑگیا تھا۔ اب بھی اس کے مضامین اُسی وقعت سے دیکھے جاتے ہیں اور وقت پر اس کے پرچوں کی تلاش ہوتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس نے اُردو زبان کی خدمت نہیں کی۔ اور اپنی ادبیت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر نہیں بٹھا دیا تھا۔ حسن اپنے محققانہ مضامین کی وجہ سے اب تک یاد آتا ہے۔ اُس وقت کے بہترین انشا پرداز اِس کے لکھنے والے تھے۔ اور

اُس نے اُردو زبان میں جو اضافہ کیا وہ ہر طرح قابلِ شکریہ ہی۔ دکن ریویو نے اُردو کی کچھ کم خدمت نہیں کی وہ جس آب و تاب سے نکلتا تھا اُس کے مضامین جس شوق سے پڑھے جاتے تھے اُس کے قدرداں اب بھی موجود ہیں۔ اس کی نظم و نثر دونوں اُردو کے لیئے مایۂ ناز تھیں۔

اصل یہ ہی کہ کوئی چیز ہونی چاہیئے۔ جس مقصد سے جو کام کیا جائے اُس کا پورا حق ادا ہونا چاہیئے۔ خواہ وہ ایک سال رہے یا دس بیس سال۔ مگر جب تک رہے اس کی نظر بلندی کی طرف رہے پستی کی طرف مائل نہ ہو۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اُردو زبان کو جیسی ترقی ہونی چاہیئے تھی وہ نصیب نہیں ہوئی تاہم اس کا رُخ آگے کی طرف ہی۔ لوگوں میں اپنی زبان کی ترقی کا احساس پیدا ہوتا جاتا ہی۔ ہر سال علمی اور ادبی کتابوں میں اضافہ ہو رہا ہی۔ نئے نئے لکھنے والے پیدا ہو رہے ہیں۔ طرزِ تحریر میں نمایاں فرق ہوتا جاتا ہی۔ ترجمہ و تالیف میں نئی شان نظر آتی ہی قدردانوں کی تعداد بھی روز بروز بڑھتی جاتی ہی۔ لکھنے پڑھنے اور کتابوں کا شوق بھی پہلے سے زیادہ نظر آتا ہی۔ ایسے وقت میں ایک ایسے رسالہ کی بہت زیادہ ضرورت ہی۔ کیونکہ جہاں حالت اُمید افزا اور شوق بڑھتا ہوا ہی، وہاں تھوڑا سا کھٹکا بھی ہی۔ بعض نئے انشاپرداز جدّت کے دھوکے میں یا تقلید کے غیر محسوس اثر سے بے مزہ، مبہم اور دُور از قیاس استعارات و تشبیہات اور نامربوط غریب اور بھونڈی ترکیبوں کی دلدل میں پھنس گئے ہیں اور شروع سے آخر تک ایک عجیب قسم کی طرزِ تحریر ہوتی ہی۔ "عربی نہ فارسی نہ ترکی"۔ بعض صاحبوں نے ایسا رنگ اختیار کیا ہی کہ معلوم ہوتا ہی کہ اُردو نہیں عربی فارسی لکھ رہے ہیں اور مرزا غالب نے ابتدا میں فارسی آمیزش سے جو اُردو نظم میں رنگ پیدا کیا تھا وہ اب اُردو نثر میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ایک دوسرا فرقہ ان سے بھی چار قدم آگے ہی جو انگریزی کا دلدادہ ہی۔ انگریزی الفاظ کا کہیں کہیں استعمال اگرچہ معیوب ہی مگر اتنا معیوب نہیں جتنی انگریزی نما اُردو۔ انگریزی نما اُردو سے مُراد اُردو کی وہ طرزِ تحریر ہی جو فطرتِ اُردو کے خلاف انگریزی ترکیب اور وضع پر لکھی جاتی ہی۔ جس میں اُکھڑے اُکھڑے فقروں کو جوڑ کر انگریزی وضع کا ایک طول طویل جملہ بنا دیا جاتا ہی جس کے سامنے ابوالفضل کی نثر بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ جملوں کا بھونڈا اور طولانی ہونا تو ایک طرف، اس میں ا... کا استعمال اور اُن کی غیر مانوس اور بے لطف ترکیب اور غضب ڈھاتی ہی۔ چند صاحب اس قسم ... لکھیں تو خیر کچھ مضائقہ نہیں۔ لیکن ڈر یہ ہی کہ اُن کی تقلید میں اگر دوسرے لوگ بھی اسی ...

کی آبرو خاک میں مل جائیگی۔ کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ اُردو زبان کی تاریخ میں ایک ایسا وقت آیا تھا جب کہ اُردو طرزِ تحریر پر فارسی عربی کے بے محل اور جا و بے جا استعمال سے فارسی عربی کا رنگ ایسا غالب آگیا تھا کہ اُردو کی حیثیت بگڑ چلی تھی۔ خدا خدا کرکے یہ جنون کم ہوا تو اب ایک دوسری بلا نازل ہوئی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جس طرح فارسیت کے غلبہ کو کم ہونے میں ایک مدت لگی، جس کے لیئے ہم سرسید، حالی و آزاد جیسے صحیح مذاق اور عالی پایہ انشا پردازوں کے ممنون ہیں، پھر ایک مدت گزرنے کے بعد ہماری آنکھیں کھلیں اور انگریزیت کے اثر کو مٹانے کے لیئے کسی خاص جدّ و جہد یا لطیفۂ غیبی کا انتظار کرنا پڑے۔ یہ کس قدر ظلم کی بات ہی کہ ہم دوسری زبانوں کو پڑھ پڑھ کر خود پسندی سے یا غرورِ علمیت میں اُن کی آمیزش اور آلایش سے اپنی زبان کو گندہ کردیں۔ ہر زبان خاص خاص خصوصیتیں رکھتی ہی، ہر زبان میں طرزِ ادا کے خاص اسلوب ہوتے ہیں، ہر زبان کی فصاحت جداگانہ ہوتی ہی۔ اور اس لیے اِس میں لکھنے کے لیئے ان خصوصیتوں کا مطالعہ ضرور اور اُن کی پیروی لازم ہی۔ جدّت کا کوئی مانع نہیں۔ یہ زبان کا حُسن ہی بشرطیکہ حسنِ ذوق اُس کا ہمنوا ہو۔ کسی ایک زبان کو دوسری زبان کی خراد پر چڑھانا بدمذاقی ہی نہیں جہالت ہی۔ غلطی کا ہونا اس قدر قابلِ اعتراض نہیں جس قدر بے مزہ بے جان اور غیر مانوس طرزِ تحریر قابلِ اعتراض ہی۔ یہ گویا زبان کا گلا گھونٹنا ہی۔ یہ ظاہری لباس کے تغیر و تبدّل سے فرنگی کو حبشی یا حبشی کو فرنگی بنانا ہی۔

زبان کوئی بے جان یا مردہ شے نہیں ہی، یہ بھی دوسرے جانداروں کی طرح بڑھتی گھٹتی اور پھلتی پھولتی ہی۔ اِس پر بھی آب وہوا اور گرد و پیش کے دوسرے حالات کا اثر پڑتا ہی۔ اس لیئے اگر ہم اس کی صحت اور خوشحالی کے خواہاں ہیں تو ہمیں اِس کے اُصولِ نشو و نما سے غافل نہیں رہنا چاہیئے۔

زبان کے حسن و فروغ یعنی فصاحت کا دارومدار صحیح ذوق پر ہی۔ اور صحیح ذوق کا پیدا کرنا اور پھیلانا سب سے بڑی خدمت زبان کی ہی۔ جن حضرات کے ہاتھ میں اخبار اور رسالے ہیں اُنھیں سب سے بڑھ کر یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیئے کیونکہ اُن کی ذمہ داری بہت بڑی ہی اور عام طور پر لوگ اِنھیں سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔

ہمیں کسی کے مقابلہ میں کوئی خاص دعویٰ نہیں۔ لیکن ہم اپنی بساط کے موافق کوشش کرینگے کہ زبان کی خصوصیت جانے دیں، پاک صاف اور شستہ زبان کا استعمال کریں اور ذوقِ سلیم کے پیدا کرنے میں طرح طرح سے

اِس لیئے جانے پہچانے، مقبول و معروف انشاپردازوں اور زبان کے ہواخواہوں ہی سے نہیں بلکہ اُن سے بھی جو نام و نمود کے خواہاں نہیں اور گوشۂ عزلت میں رہ کر ادبی ذوق سے خود ہی حظ اُٹھاتے ہیں یہ التجا ہی کہ وہ ہماری اس سعی میں ہیں مدد دیں۔ نیز ان حضرات سے جو کسی بلند پایہ رسالہ کے نہ ہونے سے اپنے خیالات کے اظہار میں مضائقہ کرتے تھے یہ درخواست ہی کہ اگر وہ اسے اپنے مذاق کے مطابق پائیں تو اعانت میں دریغ نہ فرمائیں۔

عبدالحق

آنریری سکرٹری انجمن ترقی اُردو



محاسنِ کلامِ غالبؔ (اردو)

(از ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم)

انجمن ترقی اُردو کا ایک مدت سے ارادہ تھا کہ مرزا غالب کے اُردو دیوان کا ایک نفیس صحیح جدید اڈیشن طبع کرے۔ چنانچہ بڑی کوشش اور تحقیق سے یہ دیوان مُرتب کیا گیا۔ میری درخواست پر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے اس کے لئے بطور مقدمہ کے غالب کے کلام پر تبصرہ لکھنا شروع کیا۔ اسی اثنا میں اتفاق سے بھوپال کے سرکاری کتب خانہ میں مرزا صاحب کے قدیم دیوان کا مکمل نسخہ نکل آیا جس میں وہ تمام نظمیں درج تھیں جو بعد میں خارج کر دی گئی تھیں۔ علمی لحاظ سے یہ ایک بڑی نعمت اور بیش بہا خزانہ تھا۔ مرحوم نے انجمن کے لئے اسے ترتیب دینا شروع کیا۔ لیکن افسوس اجل نے اتنی مہلت نہ دی کہ اس کی تکمیل ہو جاتی اور یہ ہونہار نوجوان جو علم و اخلاق کا پُتلا تھا بے وقت اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ یہ مضمون جو زورِ بیان جدتِ فکر اور بلندیِ خیالات کے لحاظ سے اُردو زبان میں بالکل ایک نئی چیز ہے۔ مرحوم کی یادگار ہے سب سے اوّل رسالہ میں درج کیا جاتا ہے۔ (اڈیٹر)

گر شعر و سخن بدہر آئیں بودے ۔۔۔ دیوانِ مرا شہرتِ پرویں بودے

غالبؔ اگر ایں فنِ سخن دیں بودے ۔۔۔ آں دین را ایزدی کتاب ایں بودے

ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں **مقدس وید اور دیوانِ غالب** ۔

لوح سے تمت تک مُشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں۔ کون سا نغمہ ہے جو اس سازِ زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے۔ شاعری کو اکثر شعرا نے اپنی اپنی حدِ نگاہ کے مطابق حقیقت اور مجاز جذبہ اور وجدان ذہن اور تخیل کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے مگر یہ تقسیم خود اُن کی نارسی کی دلیل ہے۔ شاعری انکشافِ حیات ہے جس طرح زندگی اپنی نمو میں محدود نہیں۔ شاعری بھی اپنے اظہار میں لاتعیّن ہے۔

جمالِ الٰہی ہر شے میں رُونما ہوتا ہے، آفرینش کی قدرت، جو صفاتِ باری میں سے ہے شاعر کو بھی ارزانی کی گئی ہے۔ جہاں ملائکہ کارخانہ ایزدی میں پوشیدہ حُسن آفرینی میں مصروف ہیں، شاعر یہ کام علی الاعلان کرتا ہے۔

اس لحاظ سے مرزا کو ایک رب النوع تسلیم کرنا لازم آتا ہے۔ غالبؔ نے بزمِ ہستی میں جو فانوسِ خیال روشن کیا ہے

کون سا "پیکر تصویر" ہے جو اُس کے "کاغذی پیرہن" پر منازل زیست قطع کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔

(۲)

اگر ادبی حیثیت سے غور کیا جائے تو دیوان غالب یکتا ہے۔ بلاغت یعنی تقلیل الفاظ بلا اختلال معنی اس سے زیادہ محال ہے۔ کہیں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس کو بُرکن کہا جا سکے۔ فصاحت کی یہ کیفیت ہے گویا دریائے لطافت رواں ہے۔

اگر بوطیقا کی رُو سے لحاظ کیا جائے تو یہ کتاب اپنا آپ جواب ہے۔ شعر کی بنیاد عروض پر قایم ہے عروض موزونیت کی میزان میں الفاظ کے تولنے کا نام ہے۔ نقطۂ تعدیل کو پانے کے لئے صدہا نازک سے نازک اور گراں سے گراں اوزان سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ اوزان شاعری نے موسیقی سے مستعار لئے ہیں کوئی آسان سے آسان اور مشکل سے مشکل بحر ایسی نہیں جس میں مرزا نے کلام موزوں نہ کیا ہو جہاں اُن کے ہاں وہ بحریں ہیں جو خطِ مستقیم سے مماثل ہیں وہیں وہ بحریں بھی موجود ہیں جن کی صورت از روئے اقلیدس خطوط منحنی اور دوائر سے مشابہ ہے۔ جہاں رواں بحریں موجود ہیں وہیں اُفتان وخیزاں بحریں بھی ہیں مثلاً

دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا — کہتے ہیں نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
برقِ خرمنِ راحت خون گرم دہقاں ہے — کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے — آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے
کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے — عجب نشاط سے جلاّد کے چلے ہیں ہم آگے

بہت سے شعرا جن میں اُستاد شامل ہیں عروض کو شعر کی تکمیل کے لئے کافی خیال کرتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ عروض کا مدعا اس موسیقی کی طرف سامعہ کو رہنما کرنا ہے جو قالب شعر کو اپنے دخل سے زندہ کرتی ہے۔ اگر شعر از روئے مفاعلن مفاعیلن مفاعیلن درست ہو لیکن آہنگ تشنہ رہ جائے تو خام ہے ایسا شعر مثل اک آئینہ کے ہے جو گلخن سے سالم اور درست باہر آئے لیکن صیقل سے محروم رہے۔

مرزا غالب کے لئے شاعری موسیقی اور موسیقی شاعری ہے یہی باعث ہے کہ دیوان کا ہر مصرعہ تار رباب نظر آتا ہے۔ اوزان رمل میں فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات ایک نہایت مستعمل بحر ہے الفاظ نہایت آسانی سے اس کا

جامہ قبول کر لیتے ہیں۔ شعرائے اُردو اکثر اس کو کام میں لاتے ہیں لیکن عیب اس میں یہ ہے کہ مصرعوں میں رقص صوتی کم پیدا ہوتا ہے مثلاً یہ فارسی شعر ؎

ہر کہ خواہد گو بیاید ہر کہ خواہد گو برو
گیر و دار حاجب و درباں دریں دربار نیست

جو وصل و ترکیب کی بیش بہا مثال ہے باوجود اُستاد کی کاوش و کاہش کے معیار رسا نہیں ہوا اس کے مقابلہ میں یہ ترانہ ریز شعر ملاحظہ ہو

ہم نشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزم عیش دوست
واں تو میرے نالہ کو بھی اعتبار نغمہ ہے

غالب کے شعر کی موسیقی کی خوبی بلا امداد ساز و ترنم کے ترتیل سے دریافت ہو سکتی ہے۔

(۳)

تنازع البقا میں مغلوب ہو کر ایشیائی ایسے مرعوب ہو گئے ہیں کہ اپنے ہر فعل و خیال کا موازنہ مغربی اقوال اور آرا سے کرنے لگے ہیں یہ وہ غلامی ہے جس کی زنجیروں کو تلوار بھی نہیں کاٹ سکتی پس کیا تعجب ہے اگر اس یورپ زدگی کر زمانہ میں طالب علم اور انگریزی تعلیم یافتہ مرزا **غالب** کا شیکسپیر ورڈس ورتھ Shakespeare, Wordsworth اور ٹے نی سن (Tennyson) سے مقابلہ کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ افسوس یہ کوتاہ نظر یہ نہیں جانتے کہ شاعری اور تنقید پر کیا نادانستہ ظلم ہوتا ہے۔

صلاح الدین خدابخش نے غالب کا مقابلہ ہائن رش ہائی نے (Heinrich Heine) المانی شاعر سے کیا ہے۔ کہاں ہائن رش ہائی نے محض مغنیٔ جوشِ عشق و اُلفت کے مضامین بصورت قطعات افسردگی کے ساتھ بیان کر کے خاموش ہو جاتا ہے کہاں غالب جو دنیا کو اطلس کی مثال اپنے شانوں پر اُٹھائے ہوئے ہے اور جس کا سر درد سیارہ بہ سیارہ ہوتا ہوا افلاک الافلاک تک پہنچتا ہے۔ Atlas

مرزا غالب کا صحیح اندازہ قایم کرنا خود ایک بلند پایہ شاعر ہی کا کام تھا اقبال نے بجا کہا ہے

آہ تو اُجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے   گلشن ویمر Weimar میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

دُنیا میں اگر کسی شاعر سے غالبؔ کا مقابلہ ہو سکتا ہی تو وہ شعرائے المانیہ کا سرتاج یوحنا ولف گانگ فان گئٹے المعروف بہ گئٹے (Johann Wolfgang von Goethe) ہی۔

غالب اور گئٹے (Goethe) دونوں کی ہستی انسانی تصور کی آخری حدود کا پتہ دیتی ہے۔ شاعری کا دونوں پر خاتمہ ہو گیا ہی۔ عتیق اور جدید خیالات حقیقت اور مجاز، قدرت اور حیات کی کثرت اُن کے دماغوں میں وحدت میں منتقل ہو کر جوڑ پاتی ہی دونوں اقلیم سخن کے شہنشاہ ہیں۔ تہذیب تمدن، تعلیم تربیت، فطرت کوئی زندگی کا ایسا پہلو نہیں جس پر دونوں کا اثر نہ پڑا ہو۔

گئٹے کو خود اپنے زمانہ میں شہرت حاصل ہوئی۔ غالبؔ ان اہلِ کمال میں ہیں جن کو بقائے دوام کے کشور میں داخل ہونے کے لئے موت کے دروازہ سے گزرنا پڑتا ہی۔ گئٹے کا کلام متعدد جلدوں میں ہی۔ غالب کا دیوان علاوہ قصائد و رباعیات ۵۰ا غزلوں سے جن میں ایک ہزار چار سو چھپن اشعار ہیں زیادہ نہیں۔

گئٹے کا کلام قومی اور ملکی ترقی کا باعث ہو چکا اور اپنا خاص منشا پورا کر چکا۔ غالبؔ کا کلام اب مقبول ہوا ہی اور آیندہ نسلیں اس امر کا موازنہ کریں گی کہ اُن کی ترقی میں غالب کے کلام کا جز و اعظم کہاں تک ممد اور معاون ہوا ہی۔

گئٹے کی نگاہ اشیا کے خارجی پہلو سے گذر کر داخلی کیفیت تک پہنچتی ہی۔ غالب کی نظر اندرونی کیفیت کے مشاہدہ سے بیرونی کیفیت کا قیاس کرتی ہی گویا غالب گئٹے سے کہہ سکتے ہیں۔

Warheit suchen wir beide, du aussen im Leben ich innen In dem Herzun, und so findet Sie ein jeder geviss

(۴)

زبان ارضی ہی اور شاعرانہ خیالات سماوی ہیں ان دونوں کو وصل دینا گویا لطیف روح اور مکدر مادہ سے جسم طیار کرنا ہی شعرا گو تلامیذ الرحمٰن ہیں لیکن ان میں بھی یہ قدرت نہیں کہ اپنے خیالات کا کامل اظہار کر سکیں۔ جو خیالات دل میں موجزن ہوتے ہیں وہ اصلی لطافت کے بہت کچھ ضائع ہوئے بغیر روئے خیال سے روئے قرطاس تک نہیں آتے۔

اقبال نے اس احساس کو یوں بیان کیا ہی

زندگانی ہے مری مثل رباب خاموش　　　جس کے ہر رنگ کے نغموں سے ہی لبریز آغوش

بربطِ کون و مکاں جس کی خموشی پہ نثار　　جس کے ہر تار میں ہیں سیکڑوں نغموں کے مزار
محشرستانِ نوا کا ہے امیں جس کا سکوت　　اور شرمندۂ ہنگامہ نہیں جس کا سکوت

آہ اُمید محبت کی برآئی نہ کبھی
چوٹ اس سازنے مضراب کی کھائی نہ کبھی

غالب کی شاعری کے جسم پر زبان کا جامہ اسی وجہ سے تنگ ہے یہاں تک کہ بعض جگہ سے چاک ہو گیا ہے اور عُریاں بدن اندر سے نظر آتا ہے۔

چوں کہ مرزا غالب کا موضوع کلام بیشتر فلسفہ ہے یہ مشکل اور بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ فلسفہ چیز ہی ایسی ہے فلابیر (Flaubert) فرانسیسی ناول نگار کا قول ہے

"جب میں کانٹ (Kant) اور ہے گل (Hegel) کو مطالعہ کے لئے اُٹھاتا ہوں تو سر میں درد ہونے لگتا ہے"۔

یہی باعث ہے کہ

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

دیوان غالب میں ایسے اشعار بھی ہیں جن کا مفہوم پانے سے ذہن مطلقاً قاصر ہے تخیل عرصۂ امکان میں ہر جانب پرواز کے بعد مجبور واپس آجاتا ہے گویا ایک دائرہ ہے جس سے گریز ناممکن ہے۔ بہت سے نقاد اس کو "کیف شراب" پر محمول کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ گٹے کے اعلیٰ ترین کلام پر جو فاؤسٹ (Faust) حصہ دوم میں ہے یہی اعتراض ہر جانب سے کیا گیا تھا۔ ایک دن ایکرمان (Eckermann) نے گٹے (Goethe) سے دریافت کیا کہ اِس اشکال کا کیا باعث ہے؟

گٹے نے جواب دیا یہی تاریکی ہی تو ہے جس پر لوگ فریفتہ ہیں۔ لوگ ان مقامات پر لاینحل مسائل کی مثال غور کرتے ہیں اور اپنی ناکامیابی سے نہیں اُکتاتے۔ انسانی طلب کی انتہا تحیّر ہے اگر کسی فعل سے حیرت پیدا ہو تو وہ کمال فن ہے اور یہ بات پر اصرار نہ کرنا چاہیئے کہ اُس کے پسِ پشت کیا ہے۔ لیکن بچے جب آئینہ میں اپنا عکس دیکھکر

حیران ہوتے ہیں تو نادانی سے پشتِ آئینہ کو بھی دیکھنے لگتے ہیں۔

(۵)

فنون لطیفہ میں خوش نگاری کو فن تعمیر سے سب سے زیادہ مشابہت ہی۔ الفاظ وہ خشت وگل، چوب اور آہن ہیں جن سے ادبیات کی عمارت عبارت ہوتی ہی۔ میر حسن دہلوی کی طرح اطالوی شاعر ارسٹو ARISTO نے اپنے دیوان میں عجب گلکار آئینہ بند منور اور پرعشرت محلات طیار کئے ہیں۔ کسی نے اُس سے دریافت کیا کہ اے غریب کاشانہ نشین شاعر یہ ساز وسامان کہاں سے پایا ارسٹو نے جواب دیا الفاظ خشت وسنگ سے ارزاں ہیں۔

لیکن مرزا غالب کے الفاظ لعل وجواہر سے بھی گراں ہیں مرزا غالب اس بات سے خوب واقف ہیں کہ مترادفات کو محض مولفان لغت نے طلبا کی سہولت کی غرض سے وضع کرلیا ہی ورنہ ایک معنی کے دو الفاظ کسی زبان میں نہیں ہیں توام بچے کتنے ہی ہم صورت ہوں ان کو ایک دوسرے کی عارضی غیر حاضری میں بھی ایک سمجھنا فاش غلطی ہی۔ مرزا الفاظ کے نازک سے نازک فرق کو خوب جانتے ہیں وہ ادیبان فرانس کی طرح عقیدہ (Mot Propre) کے پابند اور قائل ہیں۔ دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ مرزا نے ایک لفظ کو جہاں تک ہوسکا ہی دو بار استعمال نہیں کیا اس کی وجہ سحبان وائل کی طرح یہ نہیں ہی کہ وہ کسی لفظ کی تکرار نہیں کرتے بلکہ یہ ہی کہ وہ کسی خیال کا اعادہ نہیں کرتے

زبان ارتقا کی پابند ہے۔ الفاظ بے جان نہیں بلکہ زندہ ہیں۔ گو منطق کے قواعد لاتبدیل ہیں لیکن تصوّرات بمرور وقت تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور چوں کہ تصور کے زبان سے ادا کرنے کا نام ہی لفظ ہی الفاظ بھی تغیر کا تقاضا رکھتے ہیں اگر یہ تجدید عہد بہ عہد نہ ہوتی رہی تو زبان کہنہ اور پارینہ ہوجائے۔ زبان کی تجدید مذہبی یا تمدنی اصلاح سے آسان نہیں جس طرح رواج پر غالب آنا مشکل ہی محاورہ کا مٹانا بھی مشکل ہے بہت سے ادیب اس نکتہ سے غافل ہیں کہ خوب سے خوب محاورہ بلحاظ عمر آخر ضعیف ہوکر بے جان ہوجاتا ہی چنانچہ اُردو میں اس وقت بہت سے محاورات ہیں جو حقیقت میں الفاظ اور فقرات کی "ممیاں" ہیں۔ مرزا نے اپنے دیوان میں محاورہ کی بندش سے اکثر احتراز کیا ہی۔ تمام دیوان میں مشکل سے دس اشعار ایسے ہیں جنھیں کوئی محاورہ باندھا ہی۔ مرزا کی شاعری دلّی کی گلیوں یا لکھنؤ کے کوچوں کی پابند نہیں بلکہ آزاد اُردو زبان ہی جب مرزا نے اپنے فلسفیانہ خیالات کے لئے موزوں الفاظ کی تلاش کی تو اُردو کے ذخیرہ الفاظ کو بہت محدود پایا لیکن قاعدہ ہی کہ جہاں نیا خیال پیدا ہوتا ہی وہاں نیا لفظ خود بخود پیدا ہوجاتا ہی۔ ہر جان اپنا جسم خود ہمراہ لاتی ہی۔ مرزا کے

خیالات نے اپنے اظہار کے لئے خود الفاظ تیار کرلئے بلکہ وقت نے مرزا کی مشکل پسند طبیعت کے لئے کام کچھ زیادہ آسان کر دیا الفاظ سازی کے فن میں مرزا اجتہاد کامل کا درجہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہ الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

دام شنیدن۔ خمارِ رسوم۔ آتشِ خاموش۔ جوہر اندیشہ۔ گلبانگ تسلّی۔ شبنمستان۔ دریائے مے۔ پہلوئے اندیشہ۔ غرق نمکداں۔ خانہ زاد زلف۔ زنجیر رسوائی۔ جمع وخرج دریا۔ موج نگاہ۔ نبض خس۔ تشنۂ فریاد۔ خلوتِ ناموس۔ صید ز دام جستہ۔ خود داریِ ساحل۔ شہپر رنگ۔ موجۂ گل۔ گزرگاہِ خیال۔ برگ ادراک۔ طالع خاشاک۔ آئینۂ انتظار۔ خسِ جوہر۔ لذتِ سنگ۔ گردشِ رنگ۔ افشردۂ انگور۔ شہر آرزو۔ صحرا دستگاہ۔ دریا آشنا۔ محشرِ خیال۔ مژگانِ سوزن۔ مژگانِ یتیم۔ کنگرِ استغنا۔ سلکِ عافیت۔ معاشِ جنوں۔ دام تمنّا۔ دریائے بے تابی۔ وادیِ خیال۔ سیاستِ دربان۔ نسیہ ونقد دوعالم۔ طلسم پیچ وتاب۔ طعنۂ نایافت۔ جنّت نگاہ۔ فردوس گوش۔ کالبد دیوار۔ گلستانِ تسلّی۔ چشمِ صحرا۔ شیرازۂ مژگاں۔ برخوردار بستر۔ رنگ فروغ۔ دامانِ خیال۔ قلزم خون۔ غبار وحشت۔ شرار جستہ۔ جیب خیال۔ دعوتِ مژگاں۔

ان الفاظ کی جدّت آشکارا اور خوبیاں ظاہر ہیں بہت سے نکات ضرور قابل بیان ہیں لیکن اُن کی اس تمہید میں گنجائش نہیں۔

میکائیل آنجلو Michael Angelo کا قول ہے کہ مجسمہ ساز بت کو مرمر تراش کر نہیں بناتا بلکہ حقیقت میں بت ابتداہی سے سنگ سفید میں موجود اور جلوہ نمائی کا منتظر اور متقاضی ہوتا ہے اُستاد کامل محض پتھر کی عارضی چادر کو علحدہ کر دیتا ہے۔ یہی حالت مرزا کے ساختہ الفاظ کی ہے وہ ساختہ نہیں بلکہ ورجل (Vergil) کی مثال آفریدہ ہیں۔

مرزا غالب نے بعض اوقات قواعد کے خلاف زبان لکھی ہے [illegible] کے متعلق سید فضل الحسن حسرت اور علی حیدر طباطبائی نے چند مناسب اور معقول اعتراضات کئے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ قواعد منطق کا خارجی پہلو ہے اور شاعری منطق سے آزاد ہے۔ علم القواعد کا کام تقریر اور تحریر میں صحت پیدا کرنا ہے۔ کلام میں لطافت پیدا کرنا نہیں۔ اس لئے بعض اوقات شاعر کو اپنے جذبات کے کامل اظہار کے لئے قیود سے آزادی حاصل کرنا ضروری ہے۔

فنون لطیفہ میں موسیقی یا مصوری کی تحصیل کے لئے علم الاصوات اور علم الالوان کا جاننا لازمی ہے لیکن گاہ گاہ ایک ایسا آتشِ نفس مغنی اور مانی قلم مصور پیدا ہوتا ہے جو بلا تعلیم اپنے زمانہ کا مجتہد ہوتا ہے بعینہ کبھی کبھی ایک ایسا پیغمبرِ سخن دنیا

میں آتا ہی جو نظریات اور قواعد زبان سے آزاد اور صرف روح القدس کا ترجمان ہوتا ہی۔

شیکسپیر (Shakespeare) اور غالب کا کام قواعد زبان کی پابندی نہیں ہے یہ قواعد زبان کا کام ہے کہ اُن کی پابندی کرے یا اُن کی خاطر اپنی درسیات میں خاص ضمیمہ جات کا اضافہ کرے۔

(۶)

جہاں مرزا نے الفاظ میں نادر اور شستہ تصرفات سے کام لیا ہی وہیں تشبیہات اور استعارات میں بھی عام پابندیوں سے گریز کیا ہی۔ تشبیہات اور استعارات کی بنیاد قیاس پر قایم ہی تشبیہ یا استعارہ کا پہلا کام معنی آفرینی ہے۔ کسی امر کو کتنا ہی واضح بیان کیا جائے ذہن مفہوم کے پانے سے قاصر رہتا ہی لیکن ایک مشابہ مثال کام دے جاتی ہی۔ بہت سی دشوار اور غریب اشیا حل نہیں ہوتے لیکن ایک مقابل شعر فوراً مضمون کو آئینہ بنا دیتا ہے تشبیہ یا استعارہ کا دوسرا کام حسن آفرینی ہی۔ تشبیہات اور استعارات تصویر نظر کے بو قلموں الوان ہیں جن کی آمیزش بغیر تصویر اکثر تکمیل حیات کو نہیں پہنچتی اور بے رنگ رہ جاتی ہی تشبیہ یا استعارہ کا تیسرا کام اختصار اور بلاغت پیدا کرنا ہی۔ جو بات دو لفظوں میں ادا ہو جاتی ہی دوسری طرح دو سطروں میں بیان نہیں ہو سکتی۔

اُردو شاعری میں جو تشبیہات اور استعارات قدیم ہیں اور جو دور بدور چلے آتے ہیں اُن کو اصول مسلمہ خیال کیا جاتا ہی اور شعرا اُن سے بال برابر تجاوز کرنا گناہ خیال کرتے ہیں چنانچہ بقول مولانا حالی معشوق کی صورت کو چاند، سورج یا جنت سے۔ آنکھ کو نرگس، بادام یا بیمار سے ابرو کو کمان یا محراب سے مژہ کو تیر سے لبوں کو نبات یا آبحیات سے، منہ کو غنچہ سے کمر کو بال سے اور دونوں کو عدم سے مشابہ قرار دینا مخصوص اور لازم ہو گیا ہی۔

مرزا نے خود کو اس تنگ دائرہ میں مقید نہیں کیا جس طرح ہر زمانہ کی تصویروں کا رنگ و روغن علٰحدہ ہونا بہ تقاضائے وقت لازمی ہی، ہر زمانہ کی تشبیہات اور استعارات کا جدا ہونا بھی ضروری ہی۔

صاحب نظر ایک نگاہ میں محض رنگ سے تبلا سکتے ہیں کہ تصویر مصر کے عہد اوّلین سے ہندوستان کے عہد اجنتا سے یا فرنگ کے قرون وسطیٰ سے یا اطالیہ کے زمانہ احیا سے متعلق ہی۔ ہر عہد کے مصوّر اپنا رنگ بھی اپنے ہمراہ لاتے ہیں۔ ططیان (Titian) کے رنگوں میں بھی وہی سکون ہی جو اُس کی جنبش مو قلم میں ہی اور گاگین Gaugin کے رنگوں میں بھی وہی ہیجان ہے جو ارتعاش اُس کے تخیل میں ہی۔ مرزا نے خود آفریدہ تشبیہات اور استعارات کا

اس بے تکلف انداز سے استعمال کیا ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے گویا یہ ہمیشہ سے ہماری زبان میں موجود تھے اور ہزار بار کے سُنے ہوئے ہیں۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

چنانچہ کس خوبی سے موئے آتش دیدہ کو زنجیر سے دانہ ہائے تسبیح کو صد دلِ عشاق سے۔ خانۂ مجنوں کو گردِ بے دروازہ سے بہار کو حنائے پائے خزاں سے جوہر آئینہ کو طوطیِ بسمل سے، حضرت یعقوب کی نابینا آنکھوں کو روزنِ دیوارِ زندانِ یوسف سے دامِ موج کو حلقۂ صد کام نہنگ سے۔ تارِ اشکِ یاس کو رشتۂ چشم سوزن سے۔ ہر قطرۂ خون تن کو نگینِ نامِ معشوق سے۔ دریا کو زمین کے عرقِ انفعال سے سرمہ کو دودِ شعلۂ آواز سے نالہ کو گردشِ سیارہ کی صدا سے صبحِ وطن کو خندۂ دنداں نما سے موئے شیشہ کو دیدۂ ساغر کی مژگاں سے۔ آئینہ کو ورطہ سے۔ موجِ شراب کو مژۂ خواب ناک سے ساغر کو متاعِ دستگراں سے وعلیٰ ہذا مماثل بیان کیا ہے۔

مولانا شبلی نے صنائع اور بدائع کے متعلق بحث کرتے ہوئے بجا کہا ہے کہ ان کا نتیجہ شاعروں کے لئے کوہ کندن اور کاہ برآوردن سے زیادہ نہیں۔ کلام میں جس قدر صنائع اور بدائع کے استعمال کی زیادتی ہوگی اتنا ہی کلام حقیقت سے بعید اور تصنع سے قریب ہوگا۔ خاموش اور کم مطلب اشعار محض آرایش کے قواعد سے گویا اور پُر معنی نہیں بن سکتے حسن قوانین کا پابند نہیں ہے بلکہ ہمہ قیود سے آزاد ہے۔ مار کو دل پنیو کے قواعد مصوری کی رُو سے عورت کا بدن تصویر کے خاکہ میں ایک خط منحنی کو ایک دو اور تین میں حسابی قاعدہ سے ضرب دینے سے قایم ہوتا ہے۔ بھلا کہیں بے جان لکیریں نسوانی جسم کی شعریت کو وجود میں لاسکتی ہیں۔ بعض تصویر نگار مختلف رنگوں میں مختلف معنی بیان کرتے ہیں افلاطون کے پیرو کہتے ہیں کہ حسن روح میں ہے۔ ارسطو کے متبعین مخالفت کرتے ہیں کہ جسم میں ہے لیکن درحقیقت نہ پیکرِ معشوق میں کوئی معین خطوط ہیں نہ کسی رنگ میں کوئی خاص مناسبت ہے۔ خوبی نہ روح سے متعلق ہے نہ جسم سے محدود ہے حسن حسن میں ہے جس کی آفرینش شعرا کا کام اور راز ہے۔ جس طرح اقلیدسی خطوط سے خوبصورت سراپا نہیں بن سکتا صنائع و بدائع سے خوب کلام ترتیب نہیں پا سکتا۔ قابلِ عزت ہیں وہ تمام فضلا جنھوں نے علم صنائع اور بدائع کو فروغ دیا ہے لیکن اگر ان کی تمام کتابیں جلادی جائیں تو شعرا کا ذرا بھی نقصان نہیں۔

صنائع اور بدائع کے استعمال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ طبیعت میں آمد نہیں ہے۔ صنائع اور بدائع کا استعمال کلام کو عام ادبی زندگی سے جدا کر دیتا ہے اور جس زمانہ میں صنائع اور بدائع کا عام رواج ہو وہ زمانہ اقوام کے انحطاط اور زوال کا ہوتا ہے۔ غالب بہت کم صنائع اور بدائع کا استعمال کرتے ہیں اُن کے کلام کے اِشکال کا باعث فارسیت کا غلبہ الفاظ کا ادق ہونا اور ترتیب کا پس و پیش ہونا ہے اُس میں صنائع اور بدائع کی مشکلات کو ذرا بھی دخل نہیں ہے۔

لیکن ایک خصوصیت اُن کے کلام میں ایسی ہے جس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے کلام میں موجود نہیں ہے جس طرح سفید رنگ میں تمام آفتابی الوان مضمر ہیں اُن کے بعض اشعار کی سادگی میں عجیب و غریب لطیف معنی پنہاں ہیں جیسے کولمبس نے امریکا کو دریافت کیا تھا مولانا حالی نے مرزا غالب کے کلام میں اس نئی دُنیا کا پتہ لگایا ہے اور حقیقت میں مولانا حالی مرزا غالب سے کچھ کم مستحق داد نہیں ہیں ؎

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
(۱)
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

جہاں اس کے یہ معنی ہیں کہ دشت اس قدر ویراں ہے کہ خوف سے گھر یاد آتا ہے وہیں یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم تو گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہ ہوگی لیکن دشت بھی اتنا ویراں ہے کہ اُس کو دیکھنے سے گھر کی ویرانی یاد آتی ہے

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
(۲)
ہے مکرر لب ساقی میں صلا میرے بعد

اس شعر کے ظاہر معنی یہ ہیں کہ میرے مرنے کے بعد شراب عشق کا کوئی خریدار نہیں اور ساقی یعنی معشوق کو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسرے لطیف معنی یہ پنہاں ہیں کہ ساقی مصرعۂ اولیٰ کو مکرر پڑھتا ہے ایک دفعہ بلانے کے لہجہ میں یعنی کوئی ہے جو مے مرد افگن عشق کا حریف ہو پھر جب اُس کی آواز پر کوئی نہیں آتا تو اُسی مصرعہ کو مایوسی کے ساتھ پڑھتا ہے یعنی کوئی نہیں۔

کیوں کہ اُس بت سے رکھوں جان عزیز
(۳)
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

اس کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ اگر میں اُس سے جان عزیز رکھوں گا تو وہ ایمان لے لیگا۔ اس لئے جان کو عزیز

نہیں رکھتا اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اُس بُت پر جان قربان کرنا تو عین ایمان ہے پھر اُس سے جان کیوں کر عزیز رکھی جا سکتی ہے۔

ترے سرو قامت سے اِک قدِ آدم
(۴)
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

اس کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ تیرے سرو قامت سے فتنۂ قیامت کم ہے اور دوسرے معنی یہ بھی کہ چوں کہ تیرا قد اسی میں سے بنایا گیا ہے اس لئے وہ ایک قدِ آدم کم ہو گیا ہے۔

سر اوڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
(۵)
ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

اس جملہ کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ تیرے سر کی قسم ہم ضرور سر اُڑائیں گے۔ دوسرے یہ کہ ہم کو تیری سر کی قسم ہے یعنی ہم تیرا سر کبھی نہ اُڑائیں گے۔

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
(۶)
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہو

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تم جیسے نازک مزاج شہر میں اور ہوں تو شہر کا کیا حال ہو اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب تم کو اپنے عکس کا بھی اپنی مانند ہونا گوارا نہیں تو شہر میں اگر فی الواقع تم جیسے ایک دو حسین موجود ہوں تو تم کیا قیامت برپا کرو۔

(۷)

بعض کا خیال ہے کہ شاعری مصوری ہے۔ اس پہلو سے بھی دیوان غالب عدیم المثال ہے۔ ہر ورق پر ایسے اشعار موجود ہیں جن کو صفحۂ قرطاس سے جامۂ تصویر پر منتقل کیا جا سکتا ہے۔
شعر کو تصویر پر یہ ترجیح ہے کہ تصویر ساکن اور شعر متحرک ہے۔ تصویر اپنے قایم کردہ انداز کو نہیں بدل سکتی شعر ایک کیفیت کی مختلف حرکات کو ظاہر کرنے کی قدرت رکھتا ہے تصویر رقبۂ حیات پر ایک نقطہ ہے شعر ایک دائرہ ہے۔
حُسن وعشق کے تمام معاملات کو مرزا نے اس خوبی سے نظم کیا ہے کہ ہُو بہو تصویر نگاہوں میں پھر جاتی ہے۔ اس کے

لئے صرف زبان پر قدرت ہونا کافی نہیں بلکہ فطرت کا بڑا نکتہ داں ہونا ضروری ہے۔ کیا خوب زندگی کی روزمرہ تصویریں ہیں مثلاً کہتے ہیں۔

غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یوں
(۱)
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

تصور گوش آشنا ہوتے ہی اوّل دُرِ دنداں اور لب مرجاں کا خاکہ کھینچتا ہے پھر مستی کی اداہٹ اور پان کی سُرخی سے اُن میں تبسّم کا رنگ بھرتا ہے پھر رُونمائی میں مشغول ہوتا ہے اور سرمہ کی تحریر اور قشقہ کی لکیر تک نہیں بھولتا پھر گردن کے اُتار اور سینے کے اُبھار کے خطوط کی کشش سے پیکر طیار کرتا ہے اور اس ہی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ دست حنائی میں جو پردہ ہے وہ بھی اور جس غرفہ میں وہ پردہ آویزاں ہے اُس کو بھی دکھلاتا ہے۔

کہیں کہیں روزمرہ تصاویر کا دوسرا رُخ دکھایا ہے یعنی واقعات حقیقت اور قدرت کے مطابق ہیں لیکن اُمید اور عادت کے خلاف ہیں مثلاً

آئینہ دیکھ اپنا سا مُنہ لے کے رہ گئے
(۲)
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

وہ صنم جو عشق کو جنون کہتا تھا جو حُسن کے اثر کا منکر تھا اور ہر عاشق و معشوق سے رم کرتا تھا اپنے جمال کے ایک جلوے سے کیا حیراں ہے۔ یار کے آئینہ کی جانب بے پرواہ بشاشن بڑھنے اپنی صورت سے دوچار ہونے اور "نرگس" کی طرح تیر عشق کا نشانہ ہو کر بے اختیار پیچھے ہٹنے کا کیا صادق عکس ہے۔

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
(۳)
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

لے تو لوں سوتے میں اُس کے پاؤں کا بوسہ مگر
(۴)
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

یار محوِ خواب ہے اور عاشق پابوسی کے لئے جھکنا چاہتا ہے لیکن اس خیال سے کہ ممکن الامر اگر معشوق بیدار ہو گیا تو تمام عمر کے لئے اعتبار جاتا رہیگا باز رہتا ہے عقل و شوق، اندیشہ اور آرزو کے کیا متضاد تقاضات ہیں۔

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ
(۵)
یار لائے مری بالیں پہ اُسے پر کس وقت

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اُس نے شدّت کی
(۶)
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے
(۷)
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

ہم سے کھُل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
(۸)
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھکر عذرِ مستی ایک دن

امیر خسرو کا ایک شعر ہے

جاناں اگر شبیت دہن بر دہن نہم
خود را بخواب سازو مگوئیں دہانِ کیست

مرزا غالبؔ نے اپنے شعر میں دوگونہ لطف پیدا کیا ہے پہلے مصرعہ میں کہتے ہیں کہ نشہ کا بہانہ کرکے ہم سے کھل جاؤ کوئی یہ نہ جانے گا کہ تمہاری آرزو سے ایسا ہوا ہے دوسرے مصرعہ میں کہتے ہیں کہ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میں خود نشہ کا بہانہ کرکے پیش قدمی کروں گا اور پھر خواہ تم کچھ ہی کہو سب مجھے معذور رکھیں گے۔

نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں
(۹)
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

اس شعر کو پڑھتے ہی مجنون بنی عامر کے آخری کلام کا مضمون یاد آجاتا ہے البتہ جو درد اور گداز اُس وارفتہ کے اشعار میں ہے وہ اِس میں نہیں۔

بِرَبِّیْ ھَلْ ضَمَمْتَ اِلَیْکَ لَیْلیٰ
قُبَیْلَ الصُّبْحِ اَوْ قَبَّلْتَ فَاھَا
وَھَلْ رَفَّتْ عَلَیْکَ قُرُوْنُ لَیْلیٰ
رَفِیْفَ الْاُقْحُوَانَۃِ فِیْ نَدَاھَا

تجھے خدا کی قسم ہے کیا صبح کے پہلے تو نے لیلیٰ کو سینہ سے لگایا ہے یا اُس کے مُنہ پر بوسہ دیا ہے۔ کیا تیری اور لیلیٰ کی زلفیں لہرائی ہیں جس طرح کہ گلِ بابونہ لہراتا ہے۔

(۱۰) واں وہ غرورِ عزو ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

(۱۱) رات کے وقت مَے پئے ساتھ رقیب کو لئے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

(۱۲) تم اپنے شکوہ کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

(۱۳) دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
مُنہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے

(۱۴) غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

(۱۵) سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ سرِ رہ گزر ہے کیا کہئے

اگر وہ مرقع ساز جو عشق و محبت کے معاملات کے نئے نئے مضامین کے متلاشی رہتے ہیں مندرجۂ بالا اشعار کو لوح قرطاس سے پردہ تصویر پر منتقل کریں تو ان میں سے ہر ایک ایک یادگار زمانہ تصویر ہو۔ مرزا کا قلم مو قلم ہے۔

(۸)

اقبالؔ نے مرزا غالبؔ کی شان میں کہا ہے

فکرِ انساں کو تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تصوّر کی رسائی تا کجا !

کتابِ قدرت ایک تاریک کتاب ہے جس کے اوراق پر سوائے شعرا کے کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا۔ اس ضیا میں ہر شے ایک نئی صورت اور کیفیت میں مشاہدہ ہوتی ہے لیکن روشنی شعشۂ برق کی مثال دم زدن میں غائب ہو جاتی ہے اور پھر وہی ظلمت چھا جاتی ہے اس روشنی میں ہر رگِ سنگ میں خونِ شہیداں اور ہر شرارِ سنگ میں جلوۂ یزداں نظر آتا ہے۔ یہ کوئی شاعرانہ دروغ یا فریبِ نظر نہیں بلکہ مشاہدۂ حقیقت ہے۔

جب شعرا گردو پیش کے مناظر اور واقعات کو دور از کار اور فوق الفطرت طور پر بیان کرتے ہیں تو وہ بیان اُن کے عینی اور یقینی نظارہ پر مبنی ہوتا ہے۔

وہ نام نہاد شاعر ہیں جو محض الفاظ کے پس و پیش سے تمثیلات تیار کرتے ہیں اور نابینا ہونے کے باعث خود

اُن کو نہیں دیکھ سکتے۔

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال

(۱) ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آبدار تھا

وفا جو ایک صفتِ قلبی ہے شاعر کو خارجاً دشت کی صورت میں نظر آتی ہے۔ اور دشت بھی بے آب۔ ہر جانب جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے ریگ رواں ہے اور سراب کے ذرات جوہرِ تیغ آبدار کی طرح تمازت آفتاب میں لرزاں ہیں اس مقام لق و دق کی صحرانوردی کا نام عشق ہے۔

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا

(۲) بے تکلف داغِ مہ مُہرِ دہاں ہو جائے گا

عاشق چاند کو دیکھتا ہے۔ چاند کے مشاہدہ سے معاً یہ خیال اُس کے دل میں پیدا ہوتا ہے کہ اگر میں نے رازِ الفت اور دردِ فرقت کو اور چھُپایا تو میں دیوانہ ہو جاؤں گا اور کوئی اتنا بھی تو نہ جانے گا کہ میرے جنون کا باعث کیا ہے میرے غمخواروں اور میرے محبوب تک کو خبر نہ ہوگی۔

گویا یہ ماہتاب جس کی روشنی میرے قلب میں مانیا کا تلاطم پیدا کر رہی ہے میرے لئے مُہرِ دہاں ہو جائے گا ورڈس ورتھ (Wordsworth) غروب ماہتاب کی کیفیت کے مشاہدہ سے متاثر ہو کر بے اختیار کہتا ہے

"O Mercy, to myself I cried
If Lucy should be dead"

سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی

(۳) ہر قدم سایہ کو اپنے میں شبستاں سمجھا

عاشق سفرِ عشق میں اس درجہ خستہ جاں اور مضمحل ہو گیا ہے کہ قدم قدم پر ضعف سے لغزش ہوتی ہے اور آگے بڑھنے کا یارا نہیں اس ادنی مضمون کو وسعت تخیل اس طور پر ادا کرتا ہے کہ جس طرح تشنہ لب مسافر کو دشت میں سراب دریائے آب معلوم ہوتا ہے۔ شکستہ روح اور مجروح بدن عاشق کو اپنے سایہ پر خوابگاہ منزل کا گمان ہوتا ہے۔ ہر لحظہ خیال کرتا ہے کہ مقام مقصود کو پالیا اور ہر لحظہ جو نکتا ہے کہ نہیں ہنوز دشت ناپیدا کنار کے عین وسط میں ہے۔

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
(۴) سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

کہتے ہیں کہ جب مجنوں کا شباب عشق تھا میرا وقت طفلی تھا تمام شہر کے بچے مجنوں کو پتھروں سے مارا کرتے تھے
کہ اقتضائے بچپن ہی میں نے بھی ایک بار دیگر ہم عمروں کی طرح اس ستم زدہ کو نشانۂ سنگ بنانے کی غرض سے پتھر اُٹھایا
دم زدن میں اپنی تمام آیندہ زندگی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا کیا دیکھتا ہوں کہ میں آگے آگے ہوں اور اطفال شہر
پیچھے پیچھے اور خشت و سنگ کی بارش کر رہے ہیں یعنی سرشت عشق طفلی کی نافہمی سے آزاد ہی گو لڑکپن کا زمانہ تھا لیکن
پہلے ہی کجروی پر ضمیر عاشقی نے متنبہ کر دیا۔

جس طرح بنوت بطن مادر سے شروع ہوتی ہی عشق بھی عہد طفلی سے آغاز ہوتا ہی چنانچہ خود مجنوں کا قول اُس کا
مصداق ہی۔

أَلَا أَيُّهَا الْقَلْبُ الَّذِي لَجَّ هَائِمًا
وَلِيدًا بِلَيْلَى لَمْ تُقَطَّعْ تَمَائِمُهُ

میں لیلیٰ کے عشق کے بھنور میں اُسی وقت پھنس گیا تھا جب کہ بچہ تھا اور میرے گلے کے تعویز بھی نہ کٹے تھے
ایک روایت ہی کہ منصور کو انا الحق کہنے کے باعث لوگ خشت و سنگ سے سرزنش کیا کرتے تھے ایک دن شبلی کا بھی
اُس راہ سے گزر ہوا۔ شبلی نے شاید از راہ مزاح ایک پھول منصور کی جانب پھینک دیا۔ منصور کو نہایت درجہ ملال ہوا
کیوں کہ شبلی جو خود عاشقانِ خدا میں سے تھے منصور کے معاملہ سے واقف تھے۔

ضرور ہے کہ جب مرزا نے مجنوں پر پتھر اُٹھایا ہوگا تو مجنوں نے شکایتاً مڑ کر اُن کی طرف دیکھا ہوگا۔

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہی
(۵) پُر گل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

عاشق کے مقتل کو جانے کی مسرت کا اندازہ ممکن نہیں دامنِ نگاہ یعنی "بہر کجا کہ می نگرم" تمام افق زخموں کے خیال
کی بہار سے پُر گل ہی یہ گلزار عاشق گلزار خلیل اللہ سے کم نہیں۔

(۶) پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن — سایۂ تاک میں ہوتی ہی ہوا موجِ شراب

موسمِ باراں میں ابر و ہوا کا زور ہی باغ سے تا بباغبان سب شور بور ہیں درخت جوشِ شباب سے سبز سے تیرہ گوں سبز ہو گئے ہیں۔ گویا یہ مست رندان چمن وجد میں ہیں۔ تمام باغ پر سرور کا اثر معلوم ہوتا ہی۔

گلوں کا لبِ نہر پر جھومنا اسی اپنے عالم میں منہ چومنا

وہ جھک جھک کے گرنا خیاباں پہ نشہ کا سا عالم گلستان پہ (میر حسن)

مرزا کہتے ہیں کہ یہ کیفیت ہی کہ نم بارش آلود ہوا خوشہ انگور کے مس سے لطیف شراب ہو جاتی ہے۔

(۷)

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے واں بھی خانہ آرائی

سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں میں

جب زلیخا نے یوسف سے اپنا مقصود دل نہ پایا تو عزیز سے کہکر زنداں میں بھیجدیا۔ یہ زلیخا کی آخری کوشش تھی کہ شاید وہ دلربا تکلیف قید سے مان جائے لیکن ادھر یوسف روانہ ہوا ادھر داروغہ کو فرمان ہوا کہ محبس کی آرایش میں مشغول ہو تاکہ وہ نازنین قید سے زیادہ ملول نہ ہو۔

معطر دار دیوار و درش را

منور ساز طاق و منظرش را (جامی)

چنانچہ معار حجرہ یوسف میں سفیدی میں مشغول ہیں مرزا کا خیال کہاں سے کہاں منتقل ہوتا ہی اُن کو یہ سفیدی دیدۂ یعقوب کی نابینا آنکھوں کی سفیدی معلوم ہوتی ہے۔

پدرش نگران ست کہ یوسف بہ زندان ست۔

(۸)

غم نہیں ہوتا ہی آزادوں کو بیش از یک نفس

برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

دُنیا کی تکالیف علائق سے ہیں جو اضافیت اور نسبت سے بری ہیں وہ الم سے بھی سبکدوش ہیں۔

آزاد ظاہر میں سب سے زیادہ آزار پاتے اور رنج اُٹھاتے ہیں اور شب و روز تاریک ماتم خانہ میں رہتے ہیں لیکن واقعاً غم کا اثر اُن پر عارضی اور فوری ہوتا ہی۔ مرزا اپنی اِس سکون طبیعت کی کیا فوق الخیال مثال دیتے ہیں کہ جب برق بلا گرتی ہی تو ہم بجائے خوف زدہ اور پریشان ہونے کے کمال اطمینان سے اُٹھکر جوالہ برق سے اپنے

الم کدہ کی خاموش کشتہ شمع کو روشن کر لیتے ہیں۔

شوق اُس دشت میں دوڑائے ہے مجھکو کہ جہاں
(۹)
جادہ غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہیں

دشتِ وفا میں عشق کی تگ و دو کا انجام موت ہی اس بحرِ سراب کا کوئی ساحل نہیں، کوئی جادہ نہیں جس سے مسافر صحرا سے جان سلامت لے جا سکے۔ راہ کے عدم کو مرزا کمال شاعری سے یوں بیان کرتے ہیں کہ صرف ایک راستہ ہی اور وہ نگہ دیدہ تصویر ہے یعنی کوئی راستہ نہیں۔ کیا خوب عدم کو وجود کے لباس میں جلوہ گر کیا ہی۔

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
(۱۰)
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

حضرت یعقوب کی آنکھیں فرزند کے فراق میں روتے روتے سفید ہو گئی تھیں۔ مرزا کے فکر رسا نے اس سے تاثیرِ عشق کا کیا طرفہ مضمون پیدا کیا ہی کہ وہ روزن جو دیوار زندان یوسف میں ہیں حضرت یعقوب کی نابینا آنکھیں ہیں جو اپنے فرزند کو دیکھتی رہتی ہیں۔ سفید نابینا آنکھوں کو جو روزن سے مشابہت ہی ظاہر ہے قطرہ قطرہ پانی اگر کہیں گرتا رہتا ہے تو مرمر اور فولاد تک میں سوراخ کر دیتا ہی۔ حضرت یعقوب کی مدام اشکباری سے دیوار زنداں میں سوراخ ہو گئے ہیں جس طرح روزنِ دیوار کبھی بند نہیں ہوتے حضرت یعقوب کی نابینا آنکھیں کبھی بند نہیں ہوتیں رات دن بیخواب جانب یوسف نگراں رہتی ہیں۔ حضرت یعقوب کی آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں تاکہ تاریکی اور حبس سے یوسف کا دم خفا نہ ہو۔ آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں تاکہ یوسف زنداں سے دُنیا کا تماشہ دیکھ سکیں اور تنہائی سے پریشان نہ ہوں۔

بیضہ آسا تنگ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس
(۱۱)
از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

حیات بعد الممات اور بقائے روح کی کیا عجیب مثال دی ہے۔

(۹)

قدرت مستور حقیقت ہی قدرت اور عوام کے درمیان ایک دیوار حائل ہی جس میں سے صرف شاعر کی نظروں کی

الضیاشعائیں گذر پاتی ہیں۔

مرزا غالب کی چشم بینا قدرت کو تمام نقاط نگاہ سے دیکھتی ہے اور ہر نظر میں ایک نیا جلوہ پاتی ہے جو شعرا قدرت کے ترجمان ہیں اُن میں سے اکثر سعدی اور ورڈس ورتھ (Wordsworth) کی طرح قدرت سے تماشائے بہار و خزاں باغ و راغ، کہسار و آبشار مراد لیتے ہیں۔ غالب کے مشاہدات کنار دریا، دامن کوہ، لب جُو سے بہت کم متعلق ہیں مرزا کا جی لب دریا خاموش مرغزاروں سے زیادہ شہروں کے پرشور کوچوں میں لگتا ہے جہاں زندگی شعاع منتشر کی طرح ہفت رنگ جلوہ دکھاتی ہے۔ مرزا کے نزدیک دلی کی گلیوں کی رونق یا ویرانی، خوش وقتی، یا افسردگی، شورش یا خاموشی خود اُن کے اپنے احساسات کی خارجی تصویریں ہیں۔ جو صورتیں اِدھر اُدھر رواں دواں نظر آتی ہیں وہ مرزا کے نزدیک اُن کے اپنے خیالات کے مجسمات ہیں۔ اُن کو القا کے لئے سرو و چنار کو شب ماہ لب آب صحبت یار میں با ساغر و مے دیکھنے کی ضرورت نہیں وہ اگر کسی بنتی ہوئی عمارت پر نصب شدہ جرثقیل کا آہنی حلقہ بھی رسّی میں آویزاں دیکھتے ہیں تو اُن کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا سیمرغ اپنا چنگل آسمان سے تارے توڑنے کے لئے دراز کر رہا ہے جن مظاہر قدرت کو مرزا دیکھتے ہیں اور شعرا یا تو اُن کو عام خیال کرکے اُن پر غور ہی نہیں کرتے یا ان میں اس درجہ شعریت نہیں پاتے کہ اُن کی کیفیت کو اپنے کلام میں بیان کریں اور اگر کرتے ہیں تو کامیاب نہیں ہوتے۔ مثلاً

شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دھواں اُٹھتا ہے
(۱)
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

کون ہے جس نے شمع کو گل ہوتے نہیں دیکھا لیکن کسی شاعر نے مشاہدہ کیا ہے کہ شعلے کے ختم ہو جانے کے بعد دیر تک فتیلہ سے دھواں اُٹھتا رہتا ہے۔ عاشق کی موت کی اس سے بہتر کیا تمثیل ہو سکتی ہے۔

برنگ کاغذ آتش زدہ ہم رنگ بیتابی
(۲)
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بال یک طپیدن پر

حروف آشنا کاغذ گویا بلکہ زندہ ہوتا ہے کاغذ چونکہ کلام ربی اور کلمات بشری کا حامل ہے، کاغذ کے جلانے کو عیب خیال کیا جاتا ہے لیکن کاغذ کی تحریر مستقل سند ہوتی ہے اس لئے شہادت کو تلف کرنے کے لئے کاغذ کا ضائع کرنا بسا اوقات لازمی ہو جاتا ہے۔ معشوق ابتدا سے نامہائے عشاق کو جلاتے آئے ہیں لیکن کسی شاعر کے

مشاہدہ میں یہ نہ آیا کہ کاغذ کے جلنے میں کیا شاعرانہ کیفیات نہاں بلکہ عیاں ہیں۔ جب کاغذ کو آگ میں ڈالا جاتا ہے تو ذراسی دیر آتش بلند ہو کر شعلہ بجھ جاتا ہی اور سُرخ وسیاہ رنگ کا غذ کا نیم جاں جسم رہ جاتا ہی جس میں سکرات اور نزع کی تمام علامات نظر آتی ہیں پھر یہ ارتعاش حیات بھی فرو ہو جاتا ہے اور سراپا جل چکنے کے بعد ہزاروں نقطہ ہائے روشن کاغذ پر نمودار ہو جاتے ہیں۔ آخر کار کاغذ خاکستر ہو جاتا ہی۔

ہوئی ہی مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی
(۳) کفِ سیلاب باقی ہی برنگِ پنبہ روزن میں

جو شہر دریاؤں کے کنارے واقع ہوتے ہیں بعض اوقات شدّت آب کی وجہ سے غرق سیلاب ہو جاتے ہیں بلا حیدرآباد اور لکھنؤ کے واقعات سب کو یاد ہیں جب آب دریا طغیانی کے ساتھ شارعات سے مکانات میں داخل ہوتا ہی تو جہاں سے راہ پاتا ہے درآتا چلا جاتا ہے۔ جہاں داخل ہونے میں مزاحمت ہوتی ہے پانی کف لے آتا ہے۔ جب جوش دریا فرو ہو چکتا ہی تو سطح آب پھر نیچی ہو جاتی ہے اور پانی واپس دریا کی جانب رو بہ ہو جاتا ہی لیکن کفِ سیلاب جس جس جوف اور سوراخ میں پیدا ہوا تھا وہ وہیں باقی رہ جاتا ہی اور تار عنکبوت کی کی طرح اس رخنہ کو بند کر دیتا ہی۔

ہوئی اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
(۴) پرافشاں جوہر آئینہ میں مثل ذرّہ روزن میں

جو لوگ علم مناظر و مرایا سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر کسی ذرّہ کو کسی روزن میں آنکھ لگا کر دیکھا جائے تو ذرہ کے بے مقدار جسم سے ہر سمت شعاعیں نکلی ہوئی نظر آتی ہیں اس کا باعث آفتاب کی روشنی ہے جس کے عکس سے ذرہ کا جسم خارجاً روشن ہو جاتا ہے۔ یہ شعاعیں بعینہٖ ایسی معلوم ہوتی ہیں گویا پھلجڑی چھوٹ رہی ہے مرزا غالب اس کو ذرّہ کا پرافشاں ہونا کہتے ہیں۔

سوال ہی کہ مرزا کے وقت میں تو کیا اس زمانہ میں بھی جب کہ انکسار اور انعکاس کے مسائل زبان زد عام میں کتنے اشخاص ایسے ہیں جو اس کیفیت سے واقف ہیں۔

ایک اور معنی اس شعر کے ممکن ہیں۔ مرزا نے بعض اوقات پرافشانی کو پر زنی کے معنوں میں بھی استعمال

کیا ہے مثلاً :-

کروں بیداد ذوقِ پرفشانی عرض کیا قدرت
(۴)
کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے پہلے میری شہپر کی

اگر یہاں بھی یہی معنی ہیں تو ذرّات کی پرواز مراد ہے چنانچہ ایام گرما میں دوپہر کے وقت تاریک کمرے میں اگر کوئی آفتاب کی کرن سیاہ پوش روشن دان کے کسی رخنہ سے اندر آجاتی ہی تو غبار کے باریک ذرّے جو خطِ شعاع سے روشن ہوجاتے ہیں اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
(۵)
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

کہنہ اور زوال رسیدہ عمارات میں آب و ہوا کے مدام اور پیہم اثر سے سنگ سفید اور سنگ موسیٰ کے ریختہ مربعات پر کائی جم جاتی ہے اور بعض اوقات دیواروں سے پانی رسنے لگتا ہی۔ سیاہ و سفید شکستہ مرمر کی بالائی خشت سے قطرہ قطرہ آب گرتا رہتا ہی۔ قطرے ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے آتے ہیں اور جو سب سے آگے ہوتا ہی وہ مقام مقرّرہ پر پہنچ کر چشم زدن توقف کے بعد گر پڑتا ہی۔ جو چیز قطرے کو فوراً گر پڑنے سے روکتی ہی وہ پانی کے سالمات کا باہم ملصق ہونا ہی لیکن کہاں ایک قطرہ کی قوت قرار کہاں تمام کرۂ ارض کی کشش ثقل قطرہ کیا تاب لاسکتا ہی۔ مرزا غالب اپنے دل کا ٹپکتے ہوئے قطرے سے مقابلہ کرتے ہیں۔ انسان کے دل کو اطباء فرنگ نے ناسپاتی سے تشبیہ دی ہے لیکن درخت میں آویزاں ناسپاتی کا بالائی حصّہ خورد اور زیرین حصّہ کلاں ہوتا ہی اور دل کی حالت اس کے خلاف ہی۔ دل کی کوئی تشبیہ خون کے ٹپکتے ہوئے قطرے سے بہتر ممکن نہیں علاوہ ازیں دل کی لاچاری اور عاجزی کی کیا تصویر ہی۔

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہی صدا
(۶)
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہی

کس شاعر نے آج تک آتش کے فرو ہونے کی اس ظاہر اور ادنی کیفیت کو مشاہدہ اور محسوس کیا ہے لفظ "ہر کوئی" میں آگ کے طبعاً مغرور اور سرکش ہونے کا اشارہ نہایت خوبی سے مضمر ہی۔

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے
(۷) آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

وینس (Venice) براعظم یورپ کا حلب ہے۔ وینس کے بلوریں جام و ساغر مشہور ہیں اُن کی نزاکت کا اندازہ بیان سے باہر ہے۔ دیکھکر بے اختیار جی چاہتا ہے کہ صناعوں کے ہاتھ چوم لے۔ آئینہ گر حقیقت میں عمر خیام کے کوزہ گر سے کہیں زیادہ "خالق" کے لقب کا مستحق ہے جو گلخن میں مغشوش ریگ کو رفتہ رفتہ تربیت سے مینا کر دیتا ہے۔ مینا سے بلور بنا دیتا ہے بلور سے آبگینہ کر دیتا ہے اور آبگینہ سے آتشیں شیشہ بنا دیتا ہے جب گرم شیشہ آتشکدہ سے باہر آتا ہے رقیق حالت میں ہوتا ہے اُس وقت آئینہ ساز اپنے "دم" سے جو صورت چاہتا ہے شیشہ کو عطا کرتا ہے اگر کسی پہلو آگ کی تپش اعتدال سے ذرا بھی زیادہ ہو جاتی ہے تو شیشہ کُملا جاتا ہے اور اپنی صورت چھوڑ دیتا ہے مرزا شراب کو رنگ اور تاثیر کے لحاظ سے آتشِ گلخن کا مقابل بیان کرتے ہیں اور مے کی حدت اور شدت کو یوں ظاہر کرتے ہیں کہ ساغر کو گداخت سے بے صورت کئے دیتی ہے پھر کہتے ہیں کہ یہی حالت میرے دل کی ہے جو فکر اور اندیشہ کی آگ کی تاب نہ لا کر کملایا جاتا ہے۔

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
(۸) کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

جب آفتاب راہرو کی پشت کی جانب ہوتا ہے تو سایہ سامنے پڑتا ہے۔ مرزا دوپہر کے قریب اپنے مقتل میں جانے کے متعلق اپنے شوق کو یوں بیان کرتے ہیں کہ میرا سر پاؤں سے دو قدم آگے آگے ہے۔ اس کیفیت کو ہر شخص نصف النہار کے بعد خود دیکھ سکتا ہے۔

رگِ پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو
(۹) ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

قدرت نے قریب قریب جملہ مہلک سمیات کو تلخ بنایا ہے ہندوستان میں جو زہر زیادہ تر خودکشی کے لئے مستعمل ہیں وہ تیلیا، سنکھیا، دھتورا، افیون اور کچلہ ہیں یہ سب سخت تلخ ہیں اس لئے سب سے پہلی مشکل ان کا مُنہ تک لیجانا ہے۔ زہر کا فعل معدہ کے فعل پر منحصر ہے اور دیر طلب ہے چنانچہ دورانِ سر، بردِ اطراف، امتلا

غشیان۔ جریان خون۔ عطش۔ ضیق النفس اور انقباض و تشنج جو موت کی علامات ہیں اُس وقت تک شروع نہیں ہوتیں کہ زہر سرایت نہ کر جائے۔ مرزا غم اور رنج کے اثر کا کیا خوب زہر سے مقابلہ کرتے ہیں آغاز میں غم صرف سخت تلخ معلوم ہوتا ہے لیکن انجام کار رفتہ رفتہ گھلا کر مار دیتا ہے۔

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھسے نہ ٹھیرا جائے ہے مجھسے (۱۰)

جنگ میں اس سے زیادہ کوئی مجبوری کا عالم نہیں۔ جب تک گولی دل یا دماغ میں نہ لگے انسان کو لڑنے سے فوراً معطل نہیں کر سکتی۔ بسا اوقات جدید باریک کلاہ کی گولیاں فم معدہ میں ایک جانب سے دوسری جانب بلا تکلف شکم سے پشت کی طرف نکل جاتی ہیں اور سوائے خارجی خفیف زخموں کے کوئی اثر نہیں ہوتا۔ غشاء معدہ کے سوراخ فوراً خود بخود مندمل اور بند ہو جاتے ہیں پھیپھڑوں میں۔ جگر میں گولیاں بعض مرتبہ محسوس بھی نہیں ہوتیں اور قریب قریب جزو بدن ہو جاتی ہیں لیکن وقت ہنگام پاؤں پر گولی کا لگنا غضب ہے نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔

مرزا غالب نے میدانِ عشق میں بے بس ہو جانے کی کیا مثال دی ہے۔

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے (۱۱)

ہندوستان میں مغلوں کے زمانہ کے بہت سے باغات غیر آباد اور ویران پڑے ہیں سنگ مرمر اور سنگ رخام کی بارہ دریاں شکستہ افتادہ ہیں۔ جہاں شاہزادے اور بیگمات رہتی تھیں وہاں اب جنات اور پریوں کا مسکن ہے۔ جن روشوں پر کافوری شمعیں روشن رہتی تھیں وہاں اب جگنوں اُڑتے ہیں۔ نباتات نے دست انسانی کی قطع و برید سے آزادی پا کر ایک عجیب آوارگی اختیار کر لی ہے۔ پانی کے پاس درختوں کے سایہ میں جو پودے ہوتے ہیں وہ اکثر طویل اور نازک تن ہوتے ہیں جن کی شاخیں پتلی ہونے کے باعث پھول کے وزن سے بھی جھک جاتی ہیں اور ذرا سے ہوا کے جھونکے میں اِدھر سے اُدھر لہرانے لگتی ہیں۔ شام کے وقت ان شاخوں کا عکس سبزہ پر بعینہ سانپ کی طرح نظر آتا ہے۔ اگر طبیعت پر مانیا یا وحشت یا ہول کا اثر ہو تو اس افعی سے ڈرنا کوئی عجب نہیں۔

(۱۲) نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغ نگاہ کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

بھلا اطبا کے علاوہ کون اس بات سے واقف ہی کہ زخم کے خراب ہو جانے کی علامت یہ ہی کہ اُس کے اندر ہوا نفوذ کر جاتی ہی جو زخم "سانس دینے لگتا ہی" ضرور مسلک ثابت ہوتا ہی۔

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے (۱۳)

مرغ قفس کو کس نے نہیں دیکھا۔ کہاں فضائے نامحدود کہاں کنج قفس جس میں پروں کو پھیلانے تک کی جگہ مفقود چمن کی ہوا اور ہمدموں کی صدا تک نہیں آتی لیکن تقاضائے حیات پھر بھی نامشکور کوششوں کا خواستگار رہتا ہے جب "دانہ بدول" کا زمانہ آتا ہی تو گو محض تنہائی اور تجرد ہے اور تنکوں کا مہیا کرنا بے معنی لیکن خس قفس میں ضرور جمع کر لیتا ہی۔

(۴)

مرزا غالب کے کلام کی عجیب سادگی اور ہشیاری اور عجیب تربے خودی اور پرکاری انتہائے کمال ہے۔
بعض نقاد مرزا غالب یا ٹیگور کے کلام کی سادگی سے سخت مغالطہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں اُن کے خیال میں یہ بات آتی ہی کہ اس میں خوبی ہی کیا ہے ہر شاعر ایسا لکھ سکتا ہی۔ یہ ایک فریب ہی۔ ہر شخص اپنے ذہن میں یقین کرتا ہے کہ وہ اُن تمام اشیا کو جو اس کے پیش نظر ہیں خوب جانتا ہی اور ان کے من وعن بیان اور اظہار کی قابلیت رکھتا ہی حالاں کہ چند منتخب افراد کے سوا دنیا میں کوئی شخص اپنی گرد و پیش کی ادنی اشیا کی محض صورت سے بھی واقف نہیں یہی وجہ ہے کہ اگر اُس سے الفاظ یا رنگ یا آواز میں اُن کا نقشہ اُتارنے کو کہا جائے تو اس کے دعوے کا باطل ثابت ہوتا اور اس کا قاصر رہنا قطعی ہی کیا قدرت کے نظارے اور عورتوں کے اجسام کو دیکھنے کی ہر شخص نگہ رکھتا ہی کیا گیوتو (Giotto) اور لارن سے ٹی (Lorenzetti) کی سادہ تصاویر کا راز یہی ہے کہ وہ فن موقلم کشی اور رنگ آمیزی سے واقف تھے اور اگر تم کو یہ فنون بدرجہ کمال سکھا دیئے جائیں تو تم بھی ایسی تصویریں بنا لو۔ اس غلط اندازہ میں کبھی مبتلا نہ ہونا۔

جملہ فنون لطیفہ میں جن میں شاعری بھی شامل ہی بقول فرینسس ٹامپ سن (**Francois Thompson**) سادگی انتہائے اشکال ہی جب مصور نقش نادبت طناز کو حوالہ تصویر کرنے کے لئے موقلم اُٹھاتا ہی یا شاعر اس مضمون کو

جس کو ناواقف بزعمِ خود آسان جانتے ہیں ادا کرتا ہے تو بت یا مضمون مصوّر یا شاعر کے سامنے ایک نئی دنیا کی صورت میں نظر آتا ہے جس کو کولمبس (Columbus) کی مثال کوشش اور نہایت جستجو سے دریافت کرنا پڑتا ہے۔ میکائیل آنجلو (Michael Angelo) کا قول ہے کہ تصویر ہاتھ سے نہیں بلکہ دماغ سے کھینچی جاتی ہے جب لیونارڈا دو ونچی (Leonorda de Vinci) سے خانقاہ ویلاگراطسیا کی (Delle Grazia) کے اسقف نے عشائے ربّانی کی تصویر بنانے کے لئے کہا تو وہ کئی روز تک صبح سے شام تک اپنا موقلم ہاتھ میں لئے کھڑا رہا اور پردہ کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم ہر تبسّم کو دیکھتے ہیں حالاں کہ ہم کو صرف ایک دُھندلی سی کیفیت سے زیادہ دیکھنے کی قدرت نہیں سوائے ماہرانِ فنونِ لطیفہ کے کوئی بھی عالم کے مظاہراتِ خارجی اور باطنی کو نہیں دیکھ سکتا اور اسی وجہ سے اُن کا اظہار نہیں کرسکتا۔

جب میں ذیل کی غزلوں کو دیکھتا ہوں تو مجھکو معاً ابن رشیق کا قول یاد آتا ہے۔

فَاِذَا قِیْلَ اَطْمَعَ النَّاسَ طُرًّا
وَاِذَا رِیْمَ اَعْجَزَ الْمُعْجِزِیْنَا

جب پڑھا جائے تو ہر شخص کو یہ خیال ہو کہ میں بھی ایسا کہہ سکتا ہوں مگر جب ویسا کہنے کا ارادہ کیا جائے تو معجز بیان عاجز ہو جائیں۔

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی ۔۔۔ میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی
نہ سنو گر بُرا کہے کوئی ۔۔۔ نہ کہو گر بُرا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی ۔۔۔ بخش دو گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند ۔۔۔ کس کی حاجت روا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے ۔۔۔ اب کسے رہنما کرے کوئی
جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

کہ زمیں ہو گئی ہے سرتاسر ۔۔۔ روکشِ سطحِ چرخِ مینائی!
سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی ۔۔۔ بن گیا روئے آب پر کائی
سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے ۔۔۔ چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر ۔۔۔ بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی
کیوں نہ دُنیا کو ہو خوشی غالبؔ
شاہ دیندار نے شفا پائی!!

پھر اس انداز سے بہار آئی ۔۔۔ کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک ۔۔۔ اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

کوئی اُمید بر نہیں آتی ۔۔۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے ۔۔۔ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی ۔۔۔ اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد ۔۔۔ پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ۔۔۔ ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی ۔۔۔ کچھ ہماری خبر نہیں آتی!
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی ۔۔۔ موت آتی ہے پر نہیں آتی
کعبہ کس مُنہ سے جاؤگے غالب ۔۔۔ شرم تم کو مگر نہیں آتی

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی ۔۔۔ میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے ۔۔۔ کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رُسوائی ۔۔۔ اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے ۔۔۔ غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو ۔۔۔ آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں ۔۔۔ نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف ۔۔۔ آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے ۔۔۔ بے نیازی تری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسد ۔۔۔ گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ۔۔۔ آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار ۔۔۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں ۔۔۔ کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود ۔۔۔ پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں ۔۔۔ غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے ۔۔۔ نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ۔۔۔ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید ۔۔۔ جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا ۔۔۔ اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں ۔۔۔ میں نہیں جانتا دعا کیا ہے
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب ۔۔۔ مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

کوئی دن گر زندگانی اور ہے ۔۔۔ اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں ۔۔۔ سوزِ غمہائے نہانی اور ہے
بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں ۔۔۔ پر کچھ اب کی سرگرانی اور ہے
دے کے خط مُنہ دیکھتا ہے نامہ بر ۔۔۔ کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے
قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم! ۔۔۔ وہ بلائے آسمانی اور ہے
ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام ۔۔۔ ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

اب سہل ممتنع سے قطع نظر مشکل اور غریب انداز پر غور کیا جائے تو دلچسپ تر صورت ہے۔ جو لوگ کہ گرم معتدل فرشِ ارض پر رہنے کے عادی ہیں وہ اُن لوگوں کی پاک اور خوف آمیز مسرّت کو کیا جان سکتے ہیں جو فنونِ لطیفہ کی سرد اور بے داغ برف سے ڈھکی ہوئی مرتفع چوٹیوں میں گشت لگا رہے ہیں۔

کانٹ نے اپنی کتاب Kritik der reinen Vernunft Urtheilskraft میں خوب کہا ہے کہ بہت سے اشعار ایسے ہوتے ہیں جن میں "آزاد حسن" ہوتا ہے۔ وہ پھولوں کی طرح اپنے معنی نہیں بیان کرتے بلکہ اپنی خوشبو سے مشام جان کو مسرور کرتے ہیں۔ اگر ان کے نثر کرنے اور اُن کے مطالب کے دریافت کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ کوشش ایسی ہی ہوگی جس طرح کوئی شخص پھولوں کی خوشبو کو پانے کی غرض سے ان کے پتوں کو توڑ کر علیحدہ کرے۔ بعض اوقات انسان پر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے اس کیفیت میں خواب کی سی حالت ہوتی ہے۔ خواب میں متخیلہ ادراک پر غالب آجاتی ہے اور عجیب پرلطف پریشان مطالب مظاہر پیش کرتی ہے۔

پال ورلین (Paul Verlaine) کی مشہور نظم "میرا خواب" (Mon reve familier) مرزا کے مفصلۂ ذیل قطعہ سے کس قدر مشابہ ہے۔

نشہ ہا شاداب رنگ و سازہا مست طرب

شیشۂ مے سرو سبز جوئبار نغمہ ہے

غالب نشہ کو نخل کی طرح "شاداب" اور ساز کو مے گسار کی طرح "مست" بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شیشۂ مے سرود کے جوئبار پر ایک سرو سبز ہے۔

بودلیر (Baudelaire) لکھتا ہے کہ شاعرانہ کیفیت میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب تمام حواس نہایت درجہ تاثرات پذیر اور ذکی الحس ہو جاتے ہیں۔ آنکھیں پردہ ابد تک دیکھنے لگتی ہیں۔ پُرشور مقامات میں خفیف سے خفیف آواز کو کان سننے لگتے ہیں اور شور سے بالکل ناآشنا رہتے ہیں۔ اختلال خیالات واقع ہوتا ہے اور جملہ اشیاء عالم اپنی صورت سے بسا اوقات دوسری صورتوں میں منقلب ہو جاتی ہیں اور خیالات میں ناقابل حل اطلاقی تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔ آوازیں رنگین معلوم ہونے لگتی ہیں اور رنگ میں نغمہ پیدا ہوتا ہے۔

غالب کو نشہ شاداب اور ساز مست اور نغمہ آب رواں اور جام سرو سبز نظر آتا ہے۔ لیکن غالب میں یہ کیفیت ایک نہایت معتدل انداز اور صحیح حد تک ہے۔ رمبو (Rimbaud) کی طرح اُس حد تک نہیں پہنچی کہ جس طرح حرو فی حروف کے اعداد میں معنی نہاں پاتے ہیں وہ ہر حرف میں ایک خاص رنگ پاتا ہے چنانچہ کہتا ہے۔

A noir, Eblanc, I rouge, U vert, O bleu, voyelles,

غالب کا اس انداز کا کلام سب سے زیادہ فرانسیسی شاعر ملارمین (Millarme) سے مشابہ ہے۔

غم آغوشِ وداع میں پرورش دیتا ہے عاشق کو — چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ — خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے

بجا ہے گر نہ سنے نالہائے بلبلِ زار — کہ گوشِ گل نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے

پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا — ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

میکدہ گر چشمِ مستِ ناز سے پاوے شکست — موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا — خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی — ہوا جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

لیکن شاعرانہ جذبہ اور وجدان میں ایک ایسی کیفیت بھی واقع ہوتی ہے جس کو سرمستی سے مترادف کہا جا سکتا ہے جس میں شاعر آفتاب اور ماہتاب کو اپنے کفِ دست میں اٹھا لیتا ہے۔ اس بے خودی کے عالم میں مرزا نے کلام موزوں کیا ہے۔

مرزا کی دیوانگی جرمن دیوانے شاعر الفرڈ مام برٹ (Alfred Mombert) سے کچھ کم نہیں۔ ممبرٹ اپنے جنون میں کہتا ہے۔

DA Mond und Sonne dir ewig kalt ist, und dir das Sternengewoelbe ewig alt ist, und in der Finsternis zerreisst dein Gang Lausche meinem Geasang

مرزا فرماتے ہیں:-

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام — مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگزارِ بادباں

مرزا اور مام برٹ دونوں ظلمات کی تاریکی میں داخل ہوئے ہیں اور سکندر کی آخری منزل سے بھی آگے نکل گئے ہیں لیکن مرزا صحیح سلامت خضر کی طرح واپس آگئے ہیں اور وہ غریب ہمیشہ کے لئے وہیں رہ گیا ہے۔

فریڈرش نطشے اپنی تصنیف "بقول زردشت" میں لکھتا ہے "میں شعرا سے تنگ ہوں۔ قدیم شعرا سے اور جدید سے

وہ سب پایاب پانی میں ہیں۔ ان کی مثال خشک دریاؤں کی سی ہے ان کا تخیل تعمق سے خالی ہے۔ ان کے احساسات سطحی ہیں تعیش اور رندی کے چند جذبات کے سوا ان کے دیوانوں میں کچھ نہیں"۔ میرزا کی شاعری اس الزام سے مطلق بری ہے۔ غالب کا دل ایک آئینہ ہے جس میں ہر مظہر الٰہی اور منظر قدرت کا جلوہ موجود ہے اس کی زبان ترجمانِ حقیقت ہے۔ اس کے پرکارِ تخیل کا دائرہ دائرۂ امکان سے ہمکنار ہے۔ عالمِ کون و فساد میں ایک ذرہ کی جنبش بھی اس کے حلقۂ غور سے باہر نہیں ہے۔ غالب ایک فلسفی ہے جو شاعری کا جامہ زیب تن کئے ہوئے ہے۔

غالب وحدت الوجود کے قائل ہیں وہ خدا کو ماسوا سے علیحدہ نہیں خیال کرتے بلکہ اُن کا مذہب ہمہ اوست ہے۔ فلسفہ میں کوئی سوال اس سے زیادہ مشکل نہیں کہ دُنیا کی آفرینش کس وجہ سے ہوئی ہے۔

غالب اس کا جواب دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں

مبدأ عالم حُسن ہے اور حُسن کو تقاضائے اظہار ہے اس لئے دنیا عدم سے وجود میں آئی ہے دنیا ایک آئینہ ہے جس میں حُسنِ ازل خود بیں ہے یہ خیال مرزا غالب کا اپنا خیال نہیں ہے بلکہ اسلامی تصوف کا عقیدہ ہے مگر جس خوبی کے ساتھ مذکورۂ بالا شعر میں مرزا غالب نے اس کو ظاہر کیا ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ[1] کے علاوہ کسی نے اس خوبی سے اس کو نظم نہیں کیا۔

اہلِ تصوف نے اس راہ کو جو طالب کو مطلوبِ حقیقی تک لے جاتی ہے۔ تین عوالم یا سات واسطوں میں تقسیم کیا ہے ابتدائی عالم عالمِ ناسوت ہے اس میں ذہن اسرارِ ہستی کے رازوں کی عقدہ کشائی کرتا ہے اور عقل راہ معرفت کا راستہ دکھاتی ہے۔ غالب عالم ناسوت میں کہتے ہیں۔

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اُٹھائیے طاقت کہاں کہ دید کا احسان اُٹھائیے

مادہ خود بے جان اور جامد ہے جو چیز مادہ کو تحریک و جنبش میں لاتی ہے وہ حرکت ہے مگر حرکت خود اپنی ذات سے آفرینش کی قدرت نہیں رکھتی جب تک کہ متعین نہ ہو اگر حرکت میں قاعدہ نہ ہوتا تو دنیا عالمِ فساد سے عالمِ کون میں نہ آسکتی پس علت العلل وہ ذات یا طاقت ہے جو حرکت کے پس پشت حرکت کو تعین دیتی ہے۔

---

[1] در بیان آں کہ ہر یک از جمال و عشق مرغیست از آشیانۂ وحدت پریدہ در شاخسار مظاہر کثرت آرمیدہ (یوسف زلیخا صفحہ ۲۰)

ہو کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے   پرتو سے آفتاب کے ذرّہ میں جان ہے

ہے تجلی تری سامانِ وجود!!!   ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

عالم جبروت سے عالم لاہوت کا راستہ وادیٔ تحیّر میں سے ہے۔ العلم حجاب اکبر۔ جس قدر علم میں زیادتی ہوتی جاتی ہے ماہیت سے بُعد ہوتا جاتا ہے۔ شرارہ کا عریاں آنکھ سے نظارہ کرنا اور اُس سے واقف ہونا آسان ہے لیکن اگر طاقت ور خوردبین سے اُس کا مشاہدہ کیا جائے تو وہ ایک آتشکدہ معلوم ہوگا جس کی کیفیت کو مطالعہ کرنا ناممکن ہے جس قدر حقیقتِ عالم پردہ سے روشنی میں آتی جاتی ہے دماغ عاجز ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک مدام حیرت اور استغراق کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ مرزا غالب نے اپنی اس کیفیت کو جس خوبی سے اپنے کلام میں بیان کیا ہے اُس کی مثال موجود نہیں۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے   حیران ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود   پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں   غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکن زلف عنبریں کیوں ہے   نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں   ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ہرچند ہر ایک شے میں تو ہے   پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

ہاں کھائیو مت فریب ہستی   ہرچند کہیں کہ ہے نہیں ہے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ
آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

وادیٔ حیرت کا راستہ نہایت پرخطر ہے۔ بہت سے طالب حقیقت اس سے آگے نہیں پہنچ پاتے۔ یہ سراب اور تشنہ لبی کی کیفیت ہے۔

صفائے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر   تغیّر آب برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

مگر لیکن جو اہلِ ظرف ہیں وہ بدیر و بدقت اس وادی کو طے کر جاتے ہیں۔ مرزا غالبؔ اس کیفیت کو جب یہ حجاب

اُن کی نگاہ سے رفتہ رفتہ اُٹھ رہا ہے یوں بیان کرتے ہیں۔

کثرت آرائیِ وحدت ہی پرستاریِ وہم کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

آہستہ آہستہ معلوم ہونے لگتا ہی کہ یہ ہنگامہ یہ پری چہرہ لوگ یہ غمزہ و عشوہ و ادا یہ شکنِ زلف عنبریں یہ نگہِ چشمِ سرمہ سا یہ سبزہ و گل یہ ابر و ہوا اصنامِ خیالی ہیں۔ اس کثرت کا تسلیم کرنا پرستارئے وہم ہی حقیقت سب کی وحدت ہی جب طالبِ حقیقت سے دوچار ہو جاتا ہی تو من و تو کے امتیازات مٹ جاتے ہیں اور اللہ اور غیر اللہ کا فرق باقی نہیں رہتا۔

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے کام اچھا ہی وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

منصور کا انا الحق پکارنا اور بایزید بسطامی کا یہ کہنا کہ خدا میرے ملبوس میں ہی، اسی کیفیت کا ثبوت ہی سرمد کی طرح مرزا غالب کہتے ہیں۔

جلا دسی ڈرتے ہیں نہ واعظ سی جھگڑتے ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے

وحدت الوجود کا مسئلہ تصوّف سے مخصوص نہیں۔ معتزلہ کا بھی یہی مذہب ہی۔ غیلان دمشقی۔ واصل ابن عطا عمر بن عبید۔ مادہ روح اور خدا تینوں کو ازلی اور ابدی خیال کرتے ہیں۔ خود فلسفۂ قدیم اور جدید میں یہ ایک معرکۃ الآرا مسئلہ تسلیم کیا جاتا ہی۔ فلسفے کے جملہ مدارس دو فریق میں تقسیم ہیں۔ وحدت الوجود کے قائل کہتے ہیں کہ تمام عالم مادی کو اگر تحلیل کیا جائے تو ایتھر رہ جاتا ہی اور ایتھر خود تحلیل ہو کر خیال اور خیال تحلیل ہو کر صرف مسبب الاسباب باقی رہتا ہی۔ افعال کی نیکی اور بدی محض تعلق مادّی کی وجہ سے نظر آتی ہی ورنہ جو شے ایک کے خیال میں نیک ہے وہی دوسرے کے خیال میں بد ہی۔ بالذات نیکی اور بدی کا وجود نہیں توحید کے قائل خدا کو خالق اور ماسوا کو مخلوق خیال کرتے ہیں۔ خدا دنیا سے بے تعلق اور آزاد ہی۔ ثنویت کے پیرو نیکی اور بدی کو اہرمن اور یزدان کی مثال ہمیشہ مصروفِ پیکار بتلاتے ہیں۔ مادّہ اور روح کو متحد الذات نہیں بلکہ مختلف الذات کہتے ہیں۔

جدید ترین فلسفہ اور حکمت کی تحقیقات وحدت الوجود کی طرف مائل ہی (Spinoza) کا قول نہایت مسلّم ہی وہ کہتا ہی

حکمت میں ہیکل (Heckel) کا فلسفہ ان الفاظ میں بیان ہو سکتا ہی "عالم کا تمام نقد و نسیہ ایتھر ہی"

موجودہ زمانہ کی سب سے بڑی تحقیقات مسئلہ ارتقا ہے اگرچہ مسلمانوں کی کتب ماضیہ میں بھی یہ مسئلہ موجود ہے اور الفارابی بو علی سینا اور خصوصاً الحسن کے نام سے منسوب ہے اور بغداد کے کتب خانہ کی تباہی کے باوجود اخلاق ناصری رسائل اخوان الصفا۔ فوز الاصغر۔ مثنوی معنوی وغیرہ میں اس کا ثبوت موجود ہے لیکن واقعات کے لحاظ سے اس کا فخر زمانہ جدید ہی کو حاصل ہے۔ ڈارون اور مرزا غالب ہم عصر ہیں گو دونوں کو ایک دوسرے کا کچھ بھی علم نہ تھا مسئلہ ارتقا کے متعلق ایک عجیب بات یہ ہے کہ ڈارون (Darwin) سپنسر (Spencer) رسل والس (Wallace) ہیکل (Heckel) وائزمن (Weismann) منڈل (Mendel) وغیرہ نے تقریباً ایک ہی وقت میں ایک دوسرے سے آزاد طور پر اس کا پتہ لگایا۔ میری رائے یہ ہے کہ ہر عہد کی ایک روح العصر ہوتی ہے جس کو المانی (Zeitgeist) کہتے ہیں وہ روح القدس کی طرح حسب ضرورت زمانہ انسان کو تعلیم دیتی ہے مرزا غالب نے بھی مسئلہ ارتقا کو پہچانا ہے۔

لوٹزے (Lotze) کا بیان ہے کہ عالم کی یہ کیفیت ہے جس طرح بیج رفتہ رفتہ منازل بہ منازل نمو پذیر ہوکر تناور درخت ہوجاتا ہے یہ "جان عالم" ہے۔

فان ہارٹ مان (Von Hertmann) کا قائل ہے زمانہ جدید کا سب سے بڑا فلسفی برگساں (Elan de vie Bergson) کو جانتا ہے اور کہتا ہے کہ حیات جو تمام عالم میں جاری اور ساری ہے بالذات آمادۂ ارتقا ہے۔ دنیا برابر تکمیل پا رہی ہے اور منتظر ہے۔ مرزا غالب نے اس بات کو کس نزاکت سے کہا ہے:

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

یعنی معشوق عالم جو موجودات کے نقاب میں پنہاں ہے برابر اپنی جمال آرائی میں مصروف ہے اور آئینہ نقاب ہی میں لئے ہوئے اپنے غازہ کو درست کر رہا ہے جب عالم تکمیل کو پہنچ جائیگا تو نقاب الٹ دے گا عالم کو دیکھنے سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کسی چیز کی کمی ہے شش جہت آراستہ ہو رہے ہیں اور منتظر ہیں۔

کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا آئینہ فرش شش جہت انتظار ہے

(۱۱)

غالب عالم کو مایا خیال کرتے ہیں

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے　　ہوتا ہی شب و روز تماشا مرے آگے

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور　　جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

یہ اپنشدون کی قدیمی تعلیم ہے لیکن ہندو عام طور پر اسکا مفہوم غلط سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ عالم کا وجود ایک فریب نگاہ ہی۔ ایک دشت کمراب ہی جو خواب میں نظر آتا ہے۔ ایک خواب ہی جو چشم کور عالم رویا میں دیکھتی ہی۔ مرزا غالب کی حقیقت بین عقل اس مغالطہ سے آزاد ہی۔ غالب لفظ ہستی کو ہمیشہ مادہ کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ وہ مادہ کے منکر ہیں۔ عالم گو اجسام خارجی سے مملو نظر آتا ہے اور غایت لطیف فانیات سے لے کر غایت گران فلزات تک عناصر سے پُر ہی۔ مادہ کا وجود محض بالنسبت ہی بالذات نہیں۔ زندگی کی جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویریں حرکات لصوات الوان۔ کوئی وجود نہیں رکھتیں جب تک کہ ذہن اُن کا ادراک نہ کرے۔ وجود کی بنا تصور پر ہی۔ یہ تصور کوشش سے آزاد ہوتا ہی۔ بعض نے اس پر یہ اعتراض عائد کیا ہی کہ فرض کرو کہ ہم اپنے دوست کو جو موجود نہیں اپنے پہلو میں موجود تصور کریں تو اس فلسفہ کی رُو سے اُس کا غائب اور حاضر ہونا مساوی ہے اس کا جواب یہ ہی کہ متخیلہ کی مدد سے کسی تصور کا قایم رہنا ایک مدام اور متصل کوشش پر منحصر ہی جب تک تم اپنے دوست کا خیال کرتے رہوگے اور جتنی تکلیف اور محنت سے تخیل کو کام میں لاؤگے وہ نقش قایم رہیگا۔ جہاں خیال اُس نقطہ سے آوارگی اختیار کرے گا نقش محو ہو جائیگا۔ بخلاف اس کے موجود اشیا کا تصوّر کوشش سے آزاد ہی۔ دوسرا اعتراض یہ کیا جائے گا کہ اگر تمہارا فلسفہ یہ ہی کہ تمہارے وجود سے عالم مادی کا وجود ہی تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ تمہارا خاتمہ خود دنیا کو ختم کر دے گا اس کا جواب یہ ہی کہ "انا" نے جہاں مادہ کو اپنے تصور سے قایم کیا ہی وہیں یہ بھی معلوم کیا ہی کہ خود اُس سے مماثل اور بہت سے "انا" موجود ہیں جو میری طرح سے فاعل اور مختار ہیں۔ بہت سے مظاہر جو اس کے اثر اور اقتدار سے باہر ہیں اُن کے اثر اور اقتدار میں ہیں۔

تمام مادّہ جس میں خود میرا جسم اور اور بنی نوع کے اجسام شامل ہیں بے جان اور بے کار ہی وہ رُوح وہ رواں وہ خیال جوان پر فاعل ہی حقیقت ہی۔

غالب کا فلسفہ سپی نوزا (Spinoza) ہیگل (Hegel) برکلے (Berkly) اور فشٹے (Fichte) سے ملتا ہی۔

حکمت کی رُو سے بھی مرزا غالب کا خیال صحیح ہی مادہ سالمات سے مرکب ہی۔ اگر پانی کے ایک قطرہ کو کرۂ ارض کے

برابر خیال کریں تو اس کے سالمات چوگان کے گیند سے بڑے نہ ہوں گے یہ تمام سالمات رقصان حلقوں کی مثال ہیں۔ سالمات اجزا سے مرکب ہیں جواب لاتجزی خیال نہیں کئے جاتے بلکہ جواہر برق سے مرکب مانے جاتے ہیں۔ ہر جزو کو اگر ایک کلیسا سے مشابہ خیال کریں تو بقول سر آلیور لاج (Lodge) یہ جواہر کلیسا میں اُڑتی ہوئی مکھیوں کی مثال ہیں۔ اگر ان کو تخیل پھر تحلیل کرے تو اُن کی ساخت حلقہائے ایثر سے ہوئی ہے اور اگر ایثر کے حلقوں کی گرہ کھل جائے تو محض خیال باقی رہ جائے۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

وہ کیا چیز ہے جس نے خیال کو جو حقیقت میں اپنی کل میں ذات باری ہے اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ وہ مایا کے مختلف مادی لباسوں میں درجہ بدرجہ جلوہ گر ہوتا ہے۔ جمال الٰہی اگر بہ تقاضائے اظہار حسن وجود چاہتا ہے تو وجود مادی کیوں اختیار کرتا ہے اس کا جواب مرزا غالب کے سوا آج تک دنیا کے کسی فلسفی نے نہیں دیا اور وہ جواب یہ ہے:-

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

یہی باعث ہے کہ بقول اسپنسر (Spencer) مادہ متحد الجنس اشیا سے مختلف الجنس اشیا کی تکوین کے لئے ایک آزاد حالت سے لازب کیفیت کی طرف چلتا تھا۔ عالم حیوانات میں جاندار جس قدر سادگی سے بناوٹ کی طرف بڑھتے ہیں اور اعلیٰ مدارج پر آتے ہیں "گل حکمت" کے خمیر میں کثافت زیادہ ہوتی جاتی ہے یہی باعث ہے کہ شاعر کے دل کو اپنی کھوئی ہوئی لطافت کے حاصل کرنے کے لئے غم کی آگ میں جلنا پڑتا ہے۔

غالبؔ اُن لوگوں میں نہیں ہیں جو حدود کے قائل ہیں اور اُن کے سامنے اظہار عجز کر کے رک جاتے ہیں وہ لاادریہ کی طرح یہ نہیں کہتے کہ حقیقت عالم پردۂ غیب میں نہاں اور پنہاں ہے اور علم کے احاطہ سے باہر ہے۔ وہ حافظ کی طرح بیچارگی کا اظہار نہیں کرتے ع

ایں راز نہان ست و نہاں خواہد ماند

بلکہ وہ کہتے ہیں کہ دل دانا اور چشم بینا کے لئے کوئی راز نہیں ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

گوش شنوا کو ہر وقت پیغام حقیقت پہنچتا رہتا ہے۔

عالم کا کون و فساد دن رات ہماری آنکھوں کے سامنے واقع ہوتا ہے۔ جو عالم سکون میں نظر آتا ہے وہ بھی چشم بینا کو مبتلائے فساد دکھائی دیتا ہے۔ ع

غنچۂ ناشگفتہ را برگ عافیت معلوم

باوجود دلجمعی خواب گل پریشاں ہے اور جو عالم ارتعاش کیف اور تحریک میں دکھائی دیتا ہے وہ بھی بستۂ زنجیر کون ہے

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی   ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصت روانی کی

یہ کون و فساد کا نقشہ صاف بتلاتا ہے کہ کوئی صورت نگار اس پردہ کے عقب میں موجود ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا   کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

جب میں مرزا غالب کی طبیعیات الٰہیت پر غور کرتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے۔ یہ فلکیات کی ایک جدید ترین تحقیقات خیال کی جاتی ہے جو مشاہدہ سے زیادہ ریاضی کے تخمینوں پر مبنی ہے کہ اگر ہم فضائے سماوی کے سب سے آخری ستارے اور سیارہ تک پہنچ جائیں تو وہاں سے آگے بھی ویسے ہی ستارے اور سیارے نظام ہائے شمسی قنوان وغیرہ موجود ہیں۔ آباد فضا بھی بے اندازہ ہے اور نہیں معلوم کہ خلا، ایثر کہاں شروع اور ختم ہوتا ہے۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے   عرش سے اُدھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

نہ معلوم یہ خیالات مرزا غالب نے مجسطی، مسعودی اور عمر خیام کے مطالعہ سے اخذ کئے یا وہ اپنا وقت دہلی کے جنتر منتر میں گزارا کرتے تھے اور ہمایوں کی طرح (جو ستارہ بینی میں مرزا) فلک پیمائی کیا کرتے تھے۔ یا علم ریاضی کے ذریعہ اُنھوں نے اس کا پتہ لگایا یا اُن کی نگاہ تخیل خود فضا پیما تھی۔ کانٹ (Kant) لاپلاس (Laplace) اور ہرشل (Herschel) اور اُن کے جانشینوں سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ نظام ہائے فلکی کی آفرینش ایثر سے اس طرح ہوئی ہے جس طرح کسی خراد پر سے ٹکڑے جو گردش میں حائل ہوتے ہیں ٹوٹ کر علیحدہ ہو جاتے ہیں یا جیسے کوئی کسی چیز کو پھینکتا ہے مرزا غالب کو خورشید کی نسبت یہ کہاں سے معلوم ہوا۔

چھوڑا مہ نخشب کی طرح دست قضا نے   خورشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا

جس شخص کی نگاہ سے ستاروں کی آفرینش مخفی نہ تھی اس کے لئے جغرافیہ کی جدید تحقیقات کیا حقیقت رکھتی ہے

بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

(۱۲)

مرزا غالب کی عبادت گاہ عرش و کرسی کے سایہ میں ہی۔ وہ تسبیح جس پر وہ اسمار الٰہی کا وظیفہ پڑھتے ہیں صد ہزار دانہ ہی اور وہ دانے اجرام فلکی اور اجسام سماوی ہیں۔ کعبہ اور دیر کلیسا اور کنشت اس رفیع بارگاہ سے یکساں نظر آتے ہیں جہاں عوام و خواص کا مذہب منتہی ہو جاتا ہی مرزا کا مذہب آغاز ہوتا ہی۔

ہی پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود　　　　قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

ذات خداوندی گو جملہ مذاہب کا مقصود ہی خدا تعالیٰ خود طریق و ملت کی قید سے مبرا ہی۔ مرزا غالب بھی کسی ارضی مذہب کے پابند نہیں بلکہ۔

I sit as God holding no form of creed
But contemplating all

اُن کو ہر مذہب کا اس قدر پاس ہی کہ اُنھوں نے سب میں شرکت کی خاطر تمام کی ظاہری رسوم کو جو باعث امتیاز ہیں ترک کر دیا ہی۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہی ترکِ رسوم　　　　ملتیں جب مٹ گئیں اجزاء ایماں ہو گئیں

اُن کی طلب اور آرزو دوزخ کے عذاب کے خوف اور جنت کی لذات کے حرص سے آزاد ہے۔

ستائشگر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا　　　　وہ اِک گلدستہ ہی ہم بے خودوں کے طاق نسیاں کا

جنت فی الحقیقت عوام کے لئے ایک خوش آیند خیال ہے۔

ہم کو معلوم ہی جنت کی حقیقت لیکن　　　　دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہی

حقیقی بہشت قرب الٰہی اور حقیقی جہنم بعد خداوندی ہے۔

سنتے جو ہیں بہشت کی تعریف سب درست　　　　لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو

اگر جنت کی ہوا و ہوس دوزخ کا خوف و ہراس دل پر غالب ہو تو عبادت عین معصیت ہی یہاں تک کہ اگر طالب کو یقین ہو کہ اُس کی مناجات درجہ قبول ضرور حاصل کرے گی تو یہ خیال ہی سجدۂ نیاز کو باطل کر دینے کے لئے کافی ہی

گر تجھکو ہی یقینِ اجابت دُعا نہ مانگ　　　　یعنی بغیر یک دل بے مدعا نہ مانگ

جنت اور دوزخ اور اُمید و بیم مانع عشق حقیقی اور معرفت ایزدی ہیں۔ اللہ اکبر کس مقام پر نشستہ ہیں جہاں سے یہ

فتویٰ صادر فرمایا ہی۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

اس پایہ کے لوگ جب سفر کعبہ کو نکلتے ہیں تو کعبہ خود اُن کے استقبال کو آتا ہی۔ اس جادہ پیمائی کا جو سفر نیاز میں ہی ایک قدم اس تمام زندگی کی مسافت سے جو سفر نماز میں ختم ہو زیادہ ہی ایسے آوارگان کوی صنم کی خودرائی کا کیا کہنا ہی عمر خیام کہتے ہیں کہ جب قیامت میں مجھسے سوال ہوگا تو میں کہوں گا ع

ایں راہ بہ کسے بگو ترا نہ شناسد

مرزا غالب جو دعویٰ رکھتے ہیں کہ

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

کیا عجب ہی کہ حضور داور محشر میں یہ عرض کریں۔

آتا ہے داغ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھسے مرے گنہ کا حساب ای خدا نہ مانگ

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہی

جو عبادت اس درجہ پر پہنچاتی ہی وہ قید کفر و دین سے آزاد ہی وہ عشق کامل ہی۔

وفاداری بہ شرطِ استواری عینِ ایماں ہی
مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

(۱۳)

انسان کی اصل مرزا کے خیال میں علّت العلل سے ایک ہی اور حیات اُس کا اپنے مبدا سے جدا ہوکر دنیا میں آنا ہی چنانچہ کہتے ہیں۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

انسان کا عدم سے وجود میں آنا بحر سے قطرہ ہوجانا ہی۔

مولانا روم نے فرمایا ہی کہ میں ”نے“ ہوں جس میں وہ سرود نواز عالم صوت سرمدی دم کرتا ہی۔

از نیستاں تا مرا ببریدہ اند
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

مرزا غالب کہتے ہیں۔

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز

مرزا غالب کا فلسفۂ حیات ابن رشد سے مشابہ ہے۔ اندلسی فلسفی نے بیان کیا ہے کہ مادہ ہمیشہ ہیولیٰ کا محتاج ہے سبب صورت مادہ کا تصور ناممکن ہے۔ ہیولےٰ ارواح کی طرح مادہ سے صورت آشنا ہونے کے لئے پریشان علیحدہ تصور میں نہیں پھرتے بلکہ مادہ سے یکجاں ہیں۔ مادہ چوں کہ سافل ہے۔ مادہ کے جزو حیات ہونے سے کثافت اور خرابی عالم اجسام میں راہ پاتی ہے۔ مادہ کے ذریعہ زوال اور انحطاط ابتدا ہی سے جزو بدن ہو جاتے ہیں۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا اُڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

وہ شئی لطیف جو مادہ کی آمیزش سے حیات کو تکمیل (Entelechia) دیتی ہے روح ہے روح مادہ کے محبس میں اسیر ہونے سے گھبراتی ہے اور اپنے ماضی کو یاد کر کے فریاد کرتی ہے۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

لیکن یہ روح اور مادہ کا امتیاز حقیقت میں ایک فریب خیال ہے ورنہ مادہ محض مایا ہے جب ادراک کامل اور عقل رسا ہو جاتی ہے تو مادہ کی غیریت خود بخود زائل ہو جاتی ہے۔

اتنا ہی مجھکو اپنی حقیقت سے بعد ہے جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

جو راز عالم سے آگاہ ہو جاتے ہیں وہ آلام اور تکلیف نہیں پاتے اور شکایت نہیں کرتے۔ بلکہ فلسفۂ غم فلسفۂ حیات کے ہم معنی اور مترادف ہو جاتا ہے۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

عیش و نشاط دنیا کمزوروں اور کم ظرفوں کا حصہ ہیں جو رندان آتش نوش ہیں اُن کے لئے شراب غم مخصوص ہے جو کیفِ رنج سے معمور ہے۔

در خورِ قہر و غضب جب کوئی ہمسا نہ ہوا پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہل شوق کا آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

جمالِ ایزدی غایت خوب ہی مگر جلال بھی جس کے ہیبت انگیز جلوہ کی نہ موسیٰ اور نہ طور تاب لا سکے کمال حسن

ہی ٹیگور کہتے ہیں۔

"خوبصورت ہی ستاروں سے آراستہ مختلف رنگ کے جواہرات سے جڑا ہوا تیرا کنگن۔ لیکن میرے لئے

تو اس سے کہیں زیادہ خوبصورت ہی تیری تلوار۔ محترم طائر وشنو کے پھیلے ہوئے بازو کی طرح بجلی کا سا خم

رکھنے والی تلوار۔ غروب آفتاب کی غصہ ناک سرخ روشنی میں پوری طرح تلی ہوئی تلوار۔

وہ کانپتی ہی جیسے موت کے فیصلہ کن ضرب پر شدتِ درد میں زندگی کا آخری جواب۔ وہ چمکتی ہی

جیسے اک خوفناک چمک کے ساتھ دنیاوی حس کا جلا دینے والا پاک شعلہ ہستی۔

خوبصورت ہی تاروں جیسے جواہرات سے مزین تیرا کنگن۔ لیکن تیری تلوار کی ساخت میں اے گرج کے

مالک۔ کمال حسن صرف ہوا ہی۔ جو بصارت وتخیل (دونوں) کے نزدیک مہیب ہی"۔

یہی باعث ہی کہ مرزا غالب نے افلاطون کے اُستاد سقراط کی مثال تلخ زہراب کو ہمیشہ نوش شیریں پر ترجیح

دی غالب کا علم الاخلاق جان سپاری ہی اور ع

جاں سپاری شجرِ بید نہیں

(۱۴)

مرزا غالب ان تابوت بردوش فلسفیوں میں نہیں ہیں زندگی کو ماتم خانہ اور اہل دنیا کو اہلِ خبازہ خیال کرتے ہیں

وحدت الوجود کے فلسفہ کا پہلا سبق یہی ہی کہ ماسوا اور خدا جو صرف عارضی طور پر جدا ہیں اور بعد الموت پر یہ جدائی

ختم ہو جاتی ہی۔ ع

عشرتِ قطرہ ہی دریا میں فنا ہو جانا

انسان خود کو اپنی غلط بینی سے اور افراد سے علیحدہ اور اپنے ماحول سے جدا خیال کرنے لگتا ہی اور یہ خیال کرتا ہی

کہ میں دنیا میں اجنبی ہوں اور مخالف اشخاص اور قوانین سے گھرا ہوا ہوں لیکن انسان اور علاوہ میں حقیقت میں کوئی رخنہ

حائل نہیں ہی یہاں تک کہ موت بھی اُس میں رخنہ پیدا نہیں کرتی۔

اپنشدون میں لکھا ہی:۔

موت اور بقا اس کا سایہ ہے" موت اور حیات میں کوئی فرق نہیں نہ تضاد ہی۔ بلکہ حیات ہی موت ہے حیات کی آمد زندگی اور رفت موت ہی۔ موت حیات عارضی کو دائمی کر دیتی ہے۔

فنا کو سونپ اگر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا — فروغِ طالعِ خاشاک ہی موقوف گلخن پر

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ — عیدِ نظارہ ہی شمشیر کا عریاں ہونا

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

نظر میں ہی ہماری جادۂ راہِ فنا غالب — کہ یہ شیرازہ ہی عالم کے اجزائے پریشاں کا

مرزا غالب موت کے مقابل ہیں خائف بچہ کی مثال نہیں ہیں وہ اُن میں نہیں ہیں جو جس قدر موت کے خیال سے خالی الذہن ہونا چاہتے ہیں اُتنا ہی خیالِ مرگ اُن کو ستاتا ہی۔ موت کا خوف جو فکر کرنے سے بڑھتا ہی۔ موت کو خواہ مخواہ سخت بنا رکھا ہی بیکن کا قول ہی:-

Pompa mortis magis terret quam more ipsa

لیکن موت بھاری نہیں۔ موت سے زیادہ سہل کوئی اور چیز نہیں۔

ہی نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند — سخت مشکل ہی کہ یہ کام بھی آساں نکلا

موت سے انسان کے گھبرانے کی وجہ یہ ہی کہ اُس کو یہ خوف دامن گیر ہوتا ہے کہ کہیں اختتامِ زندگی چراغِ شخصیت کو ہمیشہ کے لئے گُل نہ کر دے۔ لیکن جیسا کہ ماٹرلنک (Maeterlinck) نے بیان کیا ہی ہستی محض یادوں کا مجموعہ ہی۔ جو چیز ہمیں تمام علاوہ سے ایک عارضی امتیاز دے رہی ہی وہ چند یادوں کے اجزائے پریشان ہیں اور یہ عارضی امتیاز ایسا عارضی ہے کہ "نشۂ مے" "عالمِ خواب" "جنوں" "صدماتِ عارضی" "رُویا" تک میں قایم نہیں رہتا منقلب ہو جاتا ہی۔ مرزا غالب اس خوف میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ اُن کی سکون طلب طبیعت کو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں احیای بعد الموت بھی ایک تنازع البقا اور کون و فساد ہی نہ ہو۔

وائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا — لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

موت سے زیادہ گوارا کوئی پند نہیں۔ سکرات اور نزع تو زندگی کا جانا ہی موت کا آنا نہیں موت تو تمام تکالیف ارضی کو ختم کر دیتی ہی۔ آلامِ جسمانی سے نجات دلاتی ہی اور عذابِ روحانی سے آزاد کرتی ہی۔ بالغ عالم میں افراد اشمار کی

شمال ہیں بہت سے ترش ہوتے ہیں جن کو تا ختم بہار پختہ ہونے کے لئے انتظار کرنا پڑتا ہی بعض شیرینی کو پاہی نہیں سکتے
اور محض بزدلی کے باعث اپنی شاخوں کو خیرباد نہیں کہتے۔ بعض اپنی گرانباری سے شاخوں کو توڑ دیتے ہیں۔ بعضوں کو
ہوائے تند خراب کر دیتی ہی۔ بعض کو خار یا طائرات کو کھا جاتے ہیں۔ بعض کے قلب میں دیدان گھر بنا لیتے ہیں بعض کا
رنگ خوبصورت ہوتا ہے لیکن حلاوت سے عاری ہوتے ہیں۔ بعض گو خوشبو رکھتے ہیں ذائقہ اُن کا تلخ کام کرتا ہے۔
بہت سے بچے ضعیف پیدا ہوتے ہیں۔ بہت سے ضعیف تا دم گور بچے ہی رہتے ہیں۔ بعض جوانی میں سر سفید ہو جاتے
ہیں بعض پیری میں بھی سر سیاہ دنداں سفید رہتے ہیں۔ لیکن موت کے آرام کی سب کو ضرورت ہوتی ہی۔

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی — میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

سپاہی اپنی موت تلوار سے چاہتے ہیں۔ منجم پہلے ہی سے اپنے آخری وقت سے مطلع ہونا چاہتے ہیں۔ شعرا فصل بہار میں غنچہ ریز
مولسریوں میں دب کر مدفون ہونا پسند کرتے ہیں لیکن یہ سب خامی ہی۔ جو اہل ظرف ہیں ان قیود کے قائل نہیں۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسدؔ — سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

موت کے بعد جسم محض ایک کالبد ایک نشان رفتگان سے زیادہ نہیں۔ روح کا چلا جانا اصلی واقعہ ہے جسم کا
رہ جانا اس سے زیادہ نہیں جیسے کہ گل کی پریشان پنکھڑیاں خشک ہو کر گر پڑتی ہیں جس طرح صبا گلاب کی پتیوں کو
اُڑا کر ڈھیر یا لگا دیتی ہی اور کہاں سے کہاں لیجاتی ہی اس جسم کو بھی ہونا چاہیئے۔ اس کو مضبوط اور قیمتی صندوقوں میں سجانے
آگ کے مقدس شعلوں کے نظر کرنے کی کیا ضرورت ہی سب سے بہتر یہ ہے کہ شراب ساز کو دیدیا جائے کہ وہ اسے
بادہ میں آغشتہ کر کے اس سے پھر جام طیار کرے یا گلیوں میں تشہیر کیا جائے تاکہ ایک آخری کام اس سے بھی سرانجام ہو

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں — جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگذار تھا

(۱۵)

خندہ کیا ہی؟ ارسطو کے زمانہ سے آج تک فلسفی اس مسئلہ پر غور کرتے آئے ہیں۔ ہمارے زمانہ میں
کانٹ (Kant) اسپنسر (Spencer) ہیکر (Hecker) کریپلین (Kraeplin)
لپس (Lipps) میرے ڈتھ (Meredith) اور برگسان (Bergson)۔
نے عجیب اور نادر نکات پیدا کئے ہیں۔

قہقہہ ہمیشہ مجلسوں میں بلند ہوتا ہے۔ جہاں گرم صحبت نہیں یہ سازِ محفل بھی نہیں اس ہی وجہ سے لکھنؤ کے قیصر باغ کے عیاشانہ جلسوں کے رندؔ۔ انشاؔ اور جرأتؔ اور آگرہ کی برج کی ہولیوں کے کنہیاؔ۔ نظیرؔ کے قہقہوں کی آواز آج تک بلند ہے اور میر تقیؔ، میر دردؔ اور غالبؔ کے کلام میں جو دنیا سے نفور اور ہنگامۂ عالم سے دُور رہنے والوں میں ہیں کمال سنجیدگی اور خاموشی کا اثر ہے۔

قہقہہ قدرت کا غلبۂ نفس کو دُور کرنے کا ذریعہ ہے یہ صحت بخش ضرور ہے لیکن خود اخلاط کی زیادتی اور مرض کی علامت ہے چنانچہ رنگینؔ اور دیگر ہزل سرا شعرا کا اصلی علاج بذریعہ فصد ہونا چاہیئے تھا۔

مرزا کی طبیعت میں خیالاتِ سفلیہ کو مطلق بار نہیں خندہ اصلاحِ عیوب کے لئے ایک تازیانہ ہے اس میں انصاف نہیں بلکہ ظلم پایا جاتا ہے۔ سوداؔ اور اکبرؔ کے قہقہوں کی یہی شان ہے۔ غالبؔ کی طبیعت میں رحم ہے وہ انسانی کمزوریوں پر لب آسا ہنستے نہیں بلکہ چشم آسا روتے ہیں۔

خندہ لاتعلقی کی علامت ہے۔ زندگی کو جو شخص دُور سے دیکھتا ہے اور خود بے پرواہ رہتا ہے وہ ہنستا ہے اور جو قریب سے دیکھتا ہے اور اس میں شریک ہوتا ہے وہ نہیں ہنستا۔ غالبؔ زندگی کی خارجی کیفیات سے اندرونی جذبات کا اندازہ نہیں کرتے بلکہ اپنے اندرونی جذبات سے خارجی کیفیات کا موازنہ کرتے ہیں اس لئے غالبؔ کے لب ہنسی سے ناآشنا ہیں

خندہ غم سے ناواقف ہونے کی اور لطفِ خواب کی علامت ہے اطفالِ شیر خوار سوتے میں ہنستے ہیں لیکن جب بیدار ہوتے ہیں تو روتے ہیں۔ جب تک انسان آلام اور مصائب سے شناسا نہیں ہوتا ہنستا رہتا ہے لیکن جب دل ٹوٹ جاتا ہے تو بجز غم کے کوئی رفیق نہیں رہتا۔ بدنصیب مرزا سے قہقہۂ نشاط کی اُمید رکھنا بے جا توقع ہے۔

خندہ غم اور سکون کو چھپانے کا پردہ بھی ہے۔ اس مسئلہ پر برگسان (Bergson) اور غالبؔ متفق ہیں۔ برگسان اپنی کتاب "خندہ" (Le Rire) کے اختتام پر لکھتا ہے

"سمندر میں سطح پر موجوں میں رقص اور ارتعاش پایا جاتا ہے لیکن عمقِ قلزم میں ہمیشہ امن و سکون ہوتا ہے۔ لہریں آپس میں ٹکراتی ہیں اور کف لے آتی ہیں۔ بچے کفِ دریا کو "نمش" جان کر ساحل سے اٹھاتے کھول کر دیکھتے ہیں تو بجز پانی کے کچھ بھی نہیں پاتے۔

جو شخص اس کے رقص کو فاصلہ سے دیکھتا ہے خوش ہوتا ہے اور آفتاب سے

اُس کا سامدار جسم روشن ہو کر طلسم نور نظر آتا ہی لیکن جو قریب جاتا ہے محض فریب پاتا ہے اور تلخ کام ہوتا ہی"

مرزا یوں فرماتے ہیں۔

عرض نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہی | دعویِ جمعیت احباب جائے خندہ ہی
ہی عدم میں غنچہ محو عبرت انجام گل | یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہی
کلفت افسردگی کو عیش بے تابی حرام | ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہی
شورش باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں | دل محیط گریہ ولب آشنائے خندہ ہی

لیکن مرزا کو کبھی بلند آواز سے نہیں ہنستے گاہ گاہ زیر لب تبسم ضرور کرتے ہیں۔ ان کا تبسم تمسخر نہیں بلکہ مزاح (Espirit) کا انداز رکھتا ہی یہ ابتسام معشوق کے کسی خلاف عادت کام سے یا اپنے کسی خلاف عادت ارادہ یا واقعہ سے پیدا ہوتا ہی اس میں کسی کی بابت کسی کے متعلق کوئی حملہ یا اشارہ عیاں یا پنہاں نہیں ہوتا بلکہ بقول وکٹر ہیوگو (Victor Hugo) اس کا منشا (Pour rien, pourle plasir) ہوتا ہی۔

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام | ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا | لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیئے غیر سے تہی | سُن کے ستم ظریف نے مجھکو اُٹھا دیا کہ یوں
کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی | بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو | دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے
مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے | ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھکر قلم نکلے
گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے | اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

ان ہی وجوہ سے مرزا نے کبھی کسی کی ہجو نہیں لکھی۔ ایک شعر کی نسبت جو شہزادہ جوان بخت کے سہرے
کہا گیا تھا کہ ذوق پر حملہ ہے لیکن مرزا قطعہ گزارش میں کہتے ہیں کہ مقطع میں محض سخن گسترانہ بات آپڑی
سے اس قصور کے لئے بھی معافی کے طالب ہیں۔ آزردنِ دشمنان خطاست۔
دو ایک اور اشعار کی نسبت گمان ہو سکتا ہی کہ ذوق پر جن سے چشمک ضرور

میں جو گستاخ ہوں آئین غزل خوانی میں　　یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف　　آج سینے میں مرے درد سوا ہوتا ہے

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا　　وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

یہاں خیال یہ ہے کہ لفظ غالب میں ایہام ہے لیکن یہ موشگافی ہے اور عیب جو کا اپنا آپ قصور ہے۔

(۱۶)

ملک ناروے کا مشہور ادیب (Henrik Ibsen) ہنرک ابسن اپنے ناٹک (Kongs Emnerne)

"وارثان تخت" میں بادشاہ اور مغنّی کے درمیان مفصلہ ذیل گفتگو لکھتا ہے:-

بادشاہ۔ تم کس طرح مغنّی ہو گئے۔ تم نے فن موسیقی کس سے حاصل کیا؟

مغنّی۔ جہاں پناہ فن موسیقی تحصیل نہیں ہو سکتا۔

بادشاہ۔ نہیں۔

مغنّی۔ نہیں۔ میں نے یہ خداداد اکرام غم کے ہاتھوں پایا ہے۔

بادشاہ۔ تو کیا مغنّی ہونے کے لئے غم کی ضرورت ہے۔

مغنّی۔ مجھکو غم سے یہ دولت ملی، بعض کو مسرّت سے یہ نعمت حاصل ہوتی ہے اور.........

بادشاہ۔ اور..............

مغنّی۔ تیقن سے جو ایمان کے درجہ تک ہو اور شک سے..........

بادشاہ۔ شک سے بھی۔

مغنّی۔ جو ایمان کے درجہ تک ہو ناقص نہ ہو۔

۔ ناقص شک کس کو کہتے ہیں۔

۔ ہیں شک کرنے والے کو خود اپنے شک میں شبہ ہو۔ یہ شفق ہے جو نور اور ظلمت دن اور رات

تے ہے۔

ہں چنانچہ دریافت کرتے ہیں۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند | گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں
جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع | گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں
اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے | حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود!! | پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے!!
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں!! | غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے!!
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے!! | نگہ چشمِ سرمہ سا کیا ہے!!
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں!! | ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے!!
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ | آخر کیا ہے تو اے "نہیں ہے"
یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے | لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

(۱۷)

جب عمر خیام کی شیرازی شراب کو فزجیرلڈ (Fitzgerald) نے ابریق مغرب میں محفل فرنگ میں پیش کیا تو سب نے یہ سوال کیا کہ یہ مینائے معرفت ہے یا بادۂ مجاز۔ مغربی عمر خیام کے کلام میں ابیقورس کے فلسفۂ ابتہاج کی شوخی اور بیباکی پاتے ہیں اور خیام کی تلقین لذات و شہوات سے ممتع ہونے اور دنیاوی لذائذ کے ذریعہ سے نفس کو تسکین دینے میں خیال کرتے ہیں۔

اگر غالبؔ کا انگریزی المانی فرانسیسی یا روسی زبان میں ترجمہ ممکن ہوا اور کیا جائے تو عجب نہیں کہ یہی سوال غالبؔ کے متعلق پیدا ہو۔ لیکن مرزا کی شراب کے طہور کے ثابت کرنے کے لئے کسی علم البیان کے رسالہ کی مدد ضروری نہیں بلکہ خود اُن کا بیان موجود ہے۔

مطلب ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام | چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو | بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مرزا کی شراب سے بے خودی مراد ہے۔ یہ وہ کیفیتِ جذب ہے کہ جہاں سالک راہ طریقت کے لئے باادب اور خاموش جا رہے ہیں یہ سرِراہ بیٹھے اللہ ہو کے نعرے لگا

(چوں عمر تبہ کردم چنداں کہ نگہ کردم ‏ ‏ در کنج خراباتے اُفتادہ خراب اولیٰ)

لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم ‏ ‏ دردیک ساغر غفلت ہی چہ دُنیا و چہ دیں

ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم ‏ ‏ لغو ہی آئینۂ فرق جنون و تمکیں

زمزم ہی پہ چھوڑ دو مجھے کیا طوف حرم سے ‏ ‏ آلودہ مے جامۂ احرام بہت ہے

یہ سرمستی اور مدہوشی کم مائگی نہیں ہی بلکہ خمخانۂ جاوید میں داخل ہو کر شراب بے اندازہ پی گئے ہیں۔ یہ کیف سرمدی ہے۔ یہ عشق الٰہی کے نشہ میں غش ہیں۔ کون ایسا ہی جو اس کیف میں سرشار ہو کر ہوشمند رہ سکتا ہی۔

حریف جوشش دریا نہیں خودداریٔ ساحل ‏ ‏ جہاں ساقی ہو تو باطل ہی دعویٰ ہوشیاری کا

ان ہی کا ظرف ہی کہ اس دانش رُبا شراب کو جس کی دوسرے بو بھی نہیں لے سکتے پیتے ہیں یہ وہ شراب ہے کہ جب ساقی جام میں ڈالتا ہی تو مسیح اور خضر رشک سے سبقت کے لیے کشاکش کرتے ہیں۔

بہشت کی آرزو بھی یہی ہی کہ ایک ہاتھ میں زلف یار ہو اور ایک میں شراب ہو۔

وہ چیز جس کے لئے ہو ہمیں بہشت عزیز ‏ ‏ سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

وہ کیسے خوش قسمت ہیں جن کو یہ دولت قسمت ہی۔

جانفزا ہی بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا ‏ ‏ سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

آہ تا دمِ آخر کیا آرزوئے بے خودی ہی۔

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے ‏ ‏ رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

مادہ خود بے صورت ہی مادہ میں نہ کوئی خوش صورتی ہے اور نہ بدہیتی ہی۔ حسن خارج نہیں باطن ہے۔ حُسن مادہ کے جسم میں نہیں بلکہ صاحب نظر کی نگاہ میں ہی۔ حسن ہیں کا قلب شعلہ ہی مادہ صرف پردۂ فانوس ہی۔ شاعر جو حسن کو دیکھکر محو ہوتا ہی اور اپنی ذات کو خوبصورتی میں فنا کر دیتا ہی۔ یہ کیا ہے؟ عدم اور ازل میں جو صورت دیکھی ہی وہ شرار کے ... اور مُنہ چھپا لیتی ہے نہال ثمرور میں یا عشق پیچاں میں پھولوں میں، یا عطر میں، عورت میں خواہ ... حسن اُس اشارہ میں ہی جو جمال الٰہی اُن کے ذریعہ سے کرتا ہی۔

... صنم نظر آتا ہی وہ "رخ لیلیٰ" نہیں بلکہ "عارض جان عالم" ہے۔ یہاں تک کہ جب

ہر آنکھ اُس کی دید کی تمنا رکھتی ہے۔

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے　　جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

لیکن وہ معشوق حقیقی اپنے وصل سے کسی کو خوش کام نہیں کرتا بلکہ شرم اور استغنا اور غرور اُس کو رونمائی تک میں مانع آتے ہیں اور وہ اپنے چہرۂ نازنین سے نقاب نہیں اُٹھاتا۔

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی　　ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیم روز　　آپ ہی ہو نظارہ سوز پردہ میں منہ چھپائے کیوں

.... وہ اپنی آپ مثال ہے کوئی اُس کی مثال نہیں :۔

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا　　روبرو کوئی بُتِ آئینہ سیما نہ ہوا

ہوئے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے　　پرافشاں جوہر آئینہ مثل ذرہ روزن میں

جس آئینہ جہاں نما میں وہ پرتو افگن ہو جاتا ہے طوطی جوہر کی حالت مرغ قبلہ نما کی سی ہو جاتی ہے۔

اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیِ ناز　　جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا

جو مجذوب عشاق سب دے کر اس کو لے لیتے ہیں وہ بھی اس کا روئے انور سراپا نگہ ہو کر بھی نہیں دیکھ سکتے جب کوئی اور مانع نہیں رہتا تو نگہ خود مانع آتی ہے اور پردہ بن کر حائل ہو جاتی ہے۔

ہنوز محرمِ حُسن کو ترستا ہوں　　کرے ہے[1] ہر بن مو کام چشمِ بینا کا

وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حُسن　　غیر از نگاہ[2] کوئی بھی حائل نہیں رہا

اس یوسف کے عشق میں ایک عالم زن عزیز کی مثال دیوانہ ہے لیکن اُس کا صد چاک پیرہن اس کی پارسائی کے منہ پر مہر ہے۔

نہ ہو حسن تماشا دوست رُسوا بے وفائی کا　　بمہر صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

مرزا غالب اُن شعرا میں سے ہیں جو حُسن کو نیرنگِ قدرت یا کیف مینا یا سرود بربط میں تلاش نہیں کرتے بلکہ[sic?] سینہ میں ڈھونڈتے ہیں۔

---

[1] یعنی گو کرے ہے　[2] یعنی نگاہ اب بھی حائل ہے۔

مرزا غالب کی معشوقہ مریم تھیں جو خیالِ غیر سے پاک اور جنسِ مقابل سے بالا ہی بلکہ زلیخا ہی۔ وہ خود یوسف نہیں بلکہ سری کرشن ہیں۔ اُن کے معشوق کی تصویر رافائل (Raphael) نہیں کھینچ سکتا یہ روبنس (Rubens) کا کام ہی:

مانگے ہی پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس — سرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے
اک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ — چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو — زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے

اُن کا معشوق تمام عشوہ گری کے انداز اور ناز سے واقف ہی:-

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا — لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
پُرسشِ طرزِ دلبری کیجیے کیا کہ بن کہے — اُس کے ہر اک اشارہ سے نکلے ہی یہ ادا کہ یوں
سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری — حُسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

اس کا حسن انتہائے جمال ہی ورنہ مرزا جیسے بلند نظر کی نگاہ میں سما بھی نہ سکتا۔ یہ وہ حسن ہے جو نہ صرف مرعوب بلکہ مغلوب کر لیتا ہی۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم — میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی — خوں ہی مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

یہاں تک کہ اگر وہ خود اپنے حُسن کو چشمۂ آئینہ میں دیکھے تو یونانی نوجوان نرگس کی طرح تاب نہ لاسکے۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے — صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

عشق کیا ہی؟ آرزوئے وصل جو دو پریشان خاک کے ذرّوں اور دو پریشان دلوں میں یکساں موجود ہے، کن اسباب سے پیدا ہوتی ہی۔ مادہ کی کشش اور دل کی کشش دونوں ایک ہیں کشش کا تقاضا ہی کہ ایک دوسرے کو کشش کرنے والے حوں قریب ہوتے ہیں کشش میں افزونی ہوتی ہے یہی محبت کی کشش کا حال ہی عشق میں کہیں ایک جانب فاتحانہ مفتوحانہ تسلیم کہیں دونوں سمت جوشِ جذبات اور آرزوئے قرب کہیں ایک طرف جویائی اور لیکن یہ کششِ قلبی کب اور کہاں اور کیوں پیدا ہوتی ہے اُس کا نشان پانا مشکل ہی۔

ہی یہ وہ آتش غالب — کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

فلسفی ذہنی اور دماغی نقطۂ نظر سے عشق کو مرض قرار دیتے ہیں :۔

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل　　کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

لیکن دل سے دماغ مجبور ہی :۔

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہی　　عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

یہ وحشت طبیعت میں ازل سے راسخ ہی اور یہ سکون اور راحت کے مانع آتی ہی۔

دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہی ہمیں　　ورنہ یاں بے رونقی سودِ چراغِ کشتہ ہی

یہ وہ مرض ہی طبیعت جس کے علاج سے منحرف رہتی ہے اور ہمیشہ یہی چاہتی ہے کہ کبھی صحت نہ ہو فیضی کا شعر ہی۔

نوشدار وی محبت را مپرس اجزا کہ چیست　　سودۂ الماس در زہر ہلاہل میکنند

مرزا غالب اسی شعر کو جلا دے کر فرماتے ہیں :۔

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحت دل کا　　کہ اس میں ریزۂ الماس جزو اعظم ہی

اس عشق جوئی کا سبب یہ ہی کہ اسی ہنگامہ ہائے وہو سے عالم میں رونق اور جان ہی۔

رونق ہستی ہی عشق خانہ ویران ساز سے　　انجمن بے شمع ہی گر برق خرمن میں نہیں

جہاں درد موجود ہو عشق ضرور ثمر لاتا ہی۔

عشق تاثیر سے نومید نہیں　　جاں سپاری شجر بید نہیں

مت پوچھ کہ کیا حال ہی میرا ترے آگے　　تو دیکھ کہ کیا رنگ ہی تیرا مرے آگے

اور عشق کا ثمر خانہ ویرانی۔ بربادی۔ تباہی۔ پشیمانی۔ بے اعتباری۔ عریانی اور صحرانوردی ہے۔

شوق ہر رنگ رقیب سر وساماں نکلا　　قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل　　جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

حاصل الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو　　دل بدل پیوستہ گویا اک کفِ افسوس تھا

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں　　شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

گوش مہجور پیام و چشم محروم جمال !!　　ایک دل تسپر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

لیکن گو مرزا غالب کی معشوقہ ایک ارضی عورت ہے ان کا عشق ہوس سفلیہ اور لذات حرصیہ سے پاک ہے اُن کو اس کے حسن بے پایاں کے دیکھنے سے ایک ارتعاش روحانی ایک وجدآگیں پیدا ہوتا ہے جس میں جذبات کامرانی اور خواہشات کامجوئی کا کوئی عنصر نہیں اُس کا جلوۂ رُخ ایک کیفیت وجدانہ پیدا کردیتا ہے اور جسم کے تار تار میں ایک رقص عشقیہ پیدا ہوجاتا ہے لیکن یہ حاجت آرزوئے بشریہ سے لا تعلق ہوتی ہے خلوت سفلیہ کیا ہے جب روح گیرائی اور قبضہ کی جانب مائل ہوتی ہے تو یہ ہوس پیدا ہوتی ہے۔ ہوس مطلوب کو اپنے پرشہوت ہاتھوں سے ملوث کرنا چاہتی ہے۔

عشق کیا ہے عشق میں ادب اور شرم شامل ہیں عشق دوسرے پرستش اور پرستاری کرتا ہے جہاں اضطراب آتش زیر پا ہے خوف ہے وہاں عشق نہیں عشق نور ہے اور جلوت اور خلوت دونوں کو اپنی ضیا سے روشن کرتا ہے۔

میرے ہونے میں ہے کیا رُسوائی — اے وہ جلوت نہیں خلوت ہی سہی

میدان عشق میں جہاں جانا بازیِ طفلاں نہیں ہے ہزاروں میں سے ایک عزت سلامت لاتا ہے اس ہی عشق کا درجہ ہے کہ

چپک رہا بدن پر لہو سے پیراہن — ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا — کریدتے ہو جواب راکھ جستجو کیا ہے

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل — جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

جو اہل ہوا و ہوس اس کوچہ عشاق میں قدم رکھتے ہیں وہ اہل دل کو بدنام کرتے ہیں:-

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی — اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

اس عشق حقیقی میں ایک کیف دائمی ایک خمار ابدی ہے ہمیشہ آرزوئے وصل رہتی ہے کبھی پوری نہیں ہوتی اس کا لطف جوجانکنی سے زیادہ لطف بخش ہے کبھی کم نہیں ہوتا۔ "وصال یار" وہیں ہے جہاں عشق آرزو خام ہے اور اسیر آرزو ہے۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا — اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

یہاں تک کہ عاشق سراپا ایک "شعلہ مضطر" بن جاتا ہے۔

گرنگاہ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط — شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہوجائیگا

جہاں اس کا حُسن حقیقی بے پایاں ہے وہیں مرزا کی تاب عاشقی بے نہایت ہے۔

کیوں جل گیا نہ تاب رُخ یار دیکھکر — جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھکر

گرتی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھکر

یہ انتظار غیب اور حضر دونوں میں یکساں رہتا ہے خود نظارہ رُخ یار کا پردہ بن جاتا ہے۔

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہی

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہی
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھسے دیکھا جائے ہی

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

یہاں تک کہ اگر وہ معشوق صہبائے محبت میں مدہوش قبائے حریر کے بند خود کھول دیتا ہی تو بھی۔ع

زشادی دست و پا گم می شود خود را نمی یابم

دُرنے کیا ہی حسن خود آرا کو بے حجاب
اے شوق یاں اجازتِ تسلیم ہوش ہے

اس مدام لب دریا تشنہ لبی کا باعث صرف یہ ہی کہ علوی محبت کبھی جسمانی قرب سے خود کو سیراب نہیں کرتی اگر معشوق کے دست نازنین کو مکرر بوسہ دیا جائے تو دوسرے بوسہ میں یا تو پہلے کے مساوی لذت ہوگی یا اس وجہ سے کہ پہلا بوسہ لینے سے معشوق کی نارسائی کی شان جاتی رہی ہے اور اگر مساوی ہی تو بھی چوں کہ پہلے بوسہ سے بوسہ کی کیفیت کی لاعلمی جاتی رہی ہے ضرور کم ہوگی۔ فارسی قصہ نگار نے اگر وگل کے داستان میں اور فرانسیسی داستان گو نے Mademoiselle de Maupin اسی امر کو بیان کیا ہی۔

گر تری جی میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موج محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

اس عشق کے اہل اہل ولا کی طرح ہر زمانہ میں شاذ ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں :۔

کون ہوتا ہی حریف مے مرد افگنِ عشق
ہی مکرر لب ساقی میں صلا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

آئے ہی بے کسی عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائیگا سیلاب بلا میرے بعد

کیا شاعری مصوری ہی؟ اس میں شک نہیں کہ فن مصوری اور فن شاعری ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں دونوں کا کام غیر موجود اشیا کو حاضر اور واقع دکھلانا ہی دونوں کی بنا ایک خوش انداز فریب پر قایم ہے مصوری سرمہ آواز شاعری ہی اور شاعری شیریں زبان مصوری ہے جہاں مصور کا موقلم رنگ اور خطوط سے مختلف حقیقی یا مجازی مضامین

صورت دیتا ہی وہیں شاعر کا قلم الفاظ اور انداز بیان سے وہی کیفیت پیدا کرتا ہی الفاظ شاعر کے رنگ ہیں اور الوان مصور کے الفاظ ہیں۔

ارسطو کا بیان ہی کہ شاعری کا مقصد قدرتی اشیاء کی نقل ہی لیکن اس کا منشا یہ نہیں کہ شاعر کا کام واقعات کو اُن کی من وعن بے رنگ کیفیت میں نقل کرنا ہی بلکہ یہ ہے کہ شاعر کو محاکات اُس حالت میں دکھلانا چاہیئے جس میں چشم تخیل اُن کو دیکھتی ہی۔ یورپ کے بہت سے موجودہ شعراء واقعات زندگی کی ہُوبہُو تصویریں اُتارتے ہیں لیکن یہ عکاسی ہے مصوری نہیں اور کم رتبہ کام ہی۔

شکسپیر کے کلیات میں جو جذبات انسانی کے مرقعات ہیں وہ گویا بالکل زندگی سے مماثل معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں تخیل سے رنگین ہیں اور یہی رنگ ہی جو شکسپیر کے کلام کو لاثانی بناتا ہی مرزا کی مصوری شکسپیر کی مصوری ہی۔

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہی — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

بندگی میں بھی وہ آزاد وخودبیں ہیں کہ ہم — اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں — جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا

ہوریس کی رائے میں تصویریں خواہ وہ مصور کی بنائی ہوئی ہو یا شاعر کی کوئی بات موزونیت کے خلاف نہ ہونی چاہیئے (۱۱-۱۳) حسن موزوں ہونا چاہیئے (۱۴-۲۳) خمیدہ ناک آنکھوں اور بالوں کی خوبصورتی کو بھی ضائع کردیتی ہی (۳۵-۳۷) مرزا کی محاکات میں یہ خوبی غایت قطعی ہی۔

شمارِ سبحہ مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا — تماشائے بیک کف بُردن صد دل پسند آیا

سب رقیبوں سی ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے — ہی زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں

رات کے وقت مے پیئے ساتھ رقیب کو لیئے — آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

یہ مرزا ہی کی قدرت بیان سُرعت انتقال اور شدت ذکا کا کمال ہی کہ ان تصاویر کو ایسے متناسب اور متوازن الفاظ میں کھینچا ہی۔ ان اشعار کے الفاظ کی لطافت اور اثریت ہلکے سے ہلکے رنگوں کی سیالیت کو مات کرتی ہی۔ لیسنگ نے ایک عالمانہ بحث میں بیان کیا ہی کہ :-

"اصنام اور اشعار میں مابہ الامتیاز یہ ہے کہ بُت سکون اور اشعار جنبش کا اظہار کرتے ہیں جب حسن بہت کر چُپ چاپ

کھڑا ہو جاتا ہی تو مجسمہ کہلاتا ہے اور جب حرکت اور رقص کرنے لگتا ہے تو شعر نام پاتا ہی۔ اجسام صنم سازی کا اور افعال شاعری کا موضوع ہیں) شعر میں تصویر سینہ موطو غراف کی طرح رواں حالت میں ہوتی ہے اور مسلسل کیفیت دکھلاتی ہی۔"

قاآنی موسم بہار کی تصویر یوں کھینچتا ہی:-

"نرمک نرمک نسیم زیر گلان می خزد غبغب این می مکد عارض آں می گزد گہ بچمن می چمد گہ بہ چمن می دزد۔ گاہ بشاخ درخت گہ بہ لب جوئبار۔

ہوا کی یہ رفتار شاعر قرطاس پر قلم ہی سے دکھلا سکتا ہی مصور پردہ پر مو قلم سے نہیں دکھلا سکتا۔ مرزا کے قلم کی یہ تصویر ملاحظہ ہو۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے — جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو — عرصہ ہوا ہی دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہی دم — برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس — مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کئے ہوئے

پھر پرسشِ جراحت دل کو چلا ہے عشق — سامان صد ہزار نمک داں کئے ہوئے

پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل — سازِ چمن طرازیِ داماں کئے ہوئے

باہمدگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب — نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے — پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب — عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال — صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا — جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کئے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس — زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو — سُرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ — چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں — سر زیرِ بارِ منتِ درباں کئے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن — بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے — بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

ہجر میں ارمان وصل کا مُرقع اس سے بہتر کیا ہوسکتا ہے عاشق کی تمام زندگی ان اشعار میں موجود ہے۔ اوّل اُس زمانہ کو بیان کرتا ہے جب محفل وصل شراب سے لبریز آبگینوں سے روشن رہتی تھی۔ پھر کہتا ہے کہ تقاضائے احتیاط جو کچھ بھی ہو فراق یار میں تسکین ناممکن ہے اس کے بعد دل کے نہ ماننے اور پھر طواف کوئے ملامت کو جانے کی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے نالۂ دلدار کے تصوّر سے ہاتھوں کا کانپنا کہ خوشی سے اُس کو کھول بھی نہیں سکتے اور پھر کسی کے در پر پڑے رہنے کا قصد مُصمّم کرنا عشقیہ جذبات کا ایک مرقع ہے ہر شعران میں سے ایک مکمل تصویر ہے اور ہر تصویر اپنے سے مابعد تصویر سے متعلق ہے کوئی مُصوّر رنگ سے وہ اثر پیدا نہیں کرسکتا جو شاعر نے یہاں کیا ہے۔

بوعلی سینا نے شِفا میں محاکات سے لذت پانے کی دلیل یہ لکھی ہے کہ ہر شے کی تصویر خود لطف انگیز ہے خواہ وہ شے فی نفسہ بُری ہو یا بھلی چنانچہ جو حیوانات نامقبول صورت ہیں اُن کی تصویریں دیکھکر بھی لوگ خوش ہوتے ہیں لیکن باوجود اس اَمر کے بلند پایہ مصور بدصورت اشیا کی تصویر اُتارنے سے کنارہ کرتے ہیں حُسن سیرت کو حُسن صورت سے جو تعلق ہے اُس کا تقاضا ہے کہ باطنی خیالات اور تصوّرات کا اثر چہرہ اور بشرہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ظلم یا غصّہ کی حالت میں دلفریب سے دلفریب صورت کے خدوخال نامقبول ہوجاتے ہیں اور جذبہ کی شدّت حُسن کو باطل کردیتی ہے اس لئے اُستاد ایسی حالت کی تصویر کھینچنے سے ابا کرتے ہیں۔

یونان کے مشہور قدیم مصوّر سے جب رحم میڈیا کی تصویر کھینچنے کے لئے کہا گیا تو اُس نے اُس کی تصویر اُس وقت کی حالت میں کھینچی جب کہ وہ تذبذب کی حالت میں تھی اور ہنوز قتل پر آمادہ نہیں ہوئی تھی۔ غالبؔ نے بھی معشوق کو رقیب کی آغوش میں ناز کرنے کی کیفیت کو حوالہ تصویر نہیں کیا کہ جو نا تیزگی اس انداز میں پائی جاتی ہے وہ کسی مرقع میں ادا کئے جانے کے قابل نہیں۔ یہ ایک ایسا نظارہ ہے جس کو کوئی آنکھ دیکھنا پسند نہیں کرتی اسی لئے اس جان آزار منظر کی کیفیت کو یوں دکھایا ہے۔

نقشِ نازِ بُتِ طنّاز بآغوشِ رقیب　　　پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

گویا فلیبس شاعر کا قول میڈیا اور شاعر کی بے وفا معشوقہ کے بارہ میں یکساں درست ہے:-

"اے ظالمہ تو اسی قابل ہے کہ پردۂ تصویر پر بھی تیری صورت نہ دکھائی جائے"

شعر کا تعلق وقت سے اور تصویر کا تعلق فضا سے ہے تصویر ایک نگاہ میں اپنے مضمون کو ظاہر کر دیتی ہے شعر وقت کا طالب ہوتا ہے اور کلی کی طرح رفتہ رفتہ اپنے معنی کو بیان کرتا ہے تصویر ایک ثانیہ کی یادگار ہے شعر ایک تتلی ہے جس کے پیچھے خیال بچّہ کی طرح کہیں سے کہیں نکل جاتا ہے مثلاً جب یہ شعر پڑھا جاتا ہے

غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یُوں　　　بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یُوں

تو تصوّر گوش آشنا ہوتے ہی اوّل دُرِ دنداں اور لبِ مرجاں کا نقشہ کھینچتا ہے پھر مستی کی اُداہٹ اور پان کی سُرخی کے ساتھ اُن میں تبسّم کا رنگ بھرتا ہے پھر رُخ نگاری میں مشغول ہوتا ہے اور سرمہ کی تحریر اور قشقہ کی لکیر تک بھی نہیں بھُولتا اور پھر گردن کے اُتار اور سینہ کے اُبھار کے خطوط کی کشش سے پیکر طیار کرتا ہے اور اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ دستِ حنائی میں جو پردہ ہے وہ بھی اور جس غرفہ میں وہ پردہ آویزاں ہے اُس کو بھی دکھاتا ہے۔

شبلی کا بیان ہے کہ ایک بڑا فرق عام مصوّری اور شاعرانہ مصوّری میں یہ ہے کہ تصویر کی اصلی خوبی یہ ہے کہ جس چیز کی تصویر کھینچی جائے اُس کا ایک ایک خط و خال دکھایا جائے لیکن شاعر اکثر محض اُن چیزوں کو لیتا ہے اور اُن کو نمایاں کرتا ہے جس سے صرف ہمارے جذبات پر اثر پڑتا ہے باقی چیزوں کو وہ نظر انداز کرتا ہے یا اُن کو دھندلا رکھتا ہے کہ اثر اندازی میں اُن سے خلل نہ آئے۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم　　　میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

پرسشِ طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے　　　اُس کے ہر اک اشارہ سے نکلے ہے یہ ادا کہ یُوں

سادگی و پُرکاری بیخودی و ہشیاری　　　حُسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

سطوت سے تیرے جلوۂ حُسنِ غیور کی　　　خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

ہومر جب کبھی معشوق کی شاعرانہ تصویر کھینچتا ہے تو چوں کہ وہ اُستادوں کا اُستاد ہے کبھی اس سے زیادہ نہیں کہتا کہ ہیلن میں دیویوں کا سا حسن تھا حالاں کہ تمام رزم نامۂ الیڈ کی بنیاد ہیلن کے حُسن پر قائم ہے۔ ارسطو جو اُستادوں کے

درجہ کو نہیں پاتا جب اپنی کتاب آرلینڈو فروزیو میں الکینا کی شاعرانہ تصویر کھینچتا ہے تو اُس کا پُورا سراپا لکھ جاتا ہے ہومر نے صرف دو جگہ اتنا لکھا کہ ہیلن کی باہیں گوری تھیں اور اُس کے بال خوشنما تھے۔ غالبؔ نے بھی کل دیوان میں زلفِ سیاہ یا چشمِ سیاہ سے زیادہ اپنے معشوق کا پتہ جس طرح بعض اوقات مجسمہ سازیت میں باوجود جسم جامد کے حرکت کا دھوکہ پیدا کردیتا ہے اُسی طرح بعض اشعار میں محاکات بھی موقلم کی رنگین تصویر کی طرح خاموش ہوتی ہے کانٹ وو کیلس کی رائے ہے کہ بہترین شعر وہ ہے جس کے مضمون کو مصوّر بلا دقت صفحۂ قرطاس سے جامۂ تصویر پر منتقل کرسکے اور جو حالت خواب تصویر میں قایم ہو وہ بیداری سے مبدّل نہ ہو اگر اس خیال سے اتفاق نہ کیا جائے تو ان اشعار سے بہتر مثال ممکن نہیں۔

پھر اس انداز سے بہار آئی   کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک   اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

کہ زمیں ہوگئی ہے سر تا سر   روکش سطح چرخ مینائی

سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی   بن گیا روئے آب پر کائی

یہ کُل اشعار ایک نظارۂ قدرت پیش کرتے ہیں جس میں متصل اور مسلسل واقعات نہیں بلکہ صرف ایک دلفریب خاموش منظر ہے عقب میں نیلگوں اُفق ہے آفتاب چمک رہا ہے اور قرص ماہتاب بھی بیتاب اور ماند موجود ہے۔

بارش نے زمین کو آئینہ یاب بنادیا ہے سامنے ایک تالاب ہے سبزہ کی یہ زیادتی ہے کہ سطح آب تک دست دراز ہے اشجار گُل پوش اور گلبار ہیں سب سے آگے شاخ نرگس گویا چشم نرگس مشغول تماشا ہے ایک چڑیا یا تتلی تک بھی تو نہیں جو اس خاموشی میں شور یا حرکت پیدا کرے غالبؔ نے حقیقت میں ورجل کو بھی جس کی نظم کنار دریا کے متعلق مشہور ہے مات کردیا ہے۔

علمی مصطلحات دیسی زبانوں میں

(از جناب نواب عماد الملک بہادر (مولوی سید حسین صاحب بلگرامی) سی ایس آئی ظلہٗ)

یہ مضمون جناب نواب عماد الملک بہادر نے پچاس سال قبل انگریزی زبان میں تحریر فرمایا تھا۔ کاش یہ بحث اس کے بعد بھی جاری رہتی۔ باوجود اس قدر مدت گزرنے کے اُس میں وہی جدت اور خیالات کی تازگی موجود ہے اور ہمارے مقصد کے لئے اب بھی ویسا ہی مفید اور قابل قدر ہے۔ وضع اصطلاحات کی بحث میں یہ پہلا مضمون ہے جو ایسی عالمانہ اور مجتہدانہ شان سے لکھا گیا ہے کہ جو حضرات اس بحث سے ذوق رکھتے ہیں اسے بغور مطالعہ فرمائیں گے۔ ہماری درخواست پر فاضل ممدوح نے اُن اصول کا ایک خلاصہ بھی تحریر فرما دیا ہے جن کے مطابق اُردو میں اصطلاحات وضع ہونی چاہئیں۔ یہ تحریر اس مضمون کے آخر میں درج ہے۔ اڈیٹر

تقریباً ایک سال کا عرصہ ہوا حکومت بنگال نے دیسی زبانوں میں طبی رسائل کی تالیف کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔ اس کمیٹی کے دو ارکان کی آرا شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن سوال محض طب ہی کی اصطلاحات کا نہیں۔ بلکہ اس مسئلہ کا تعلق اُن تمام علوم کی مصطلحات سے ہے جو جدید فکر و تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ ہمارا مقصد ایک ایسا قاعدہ وضع کرنا ہے جس کے مطابق سائنس کی تمام اصطلاحات کو دیسی زبانوں کا جامہ پہنایا جا سکے۔ کتب سائنس اور حقیقت میں دیکھا جائے تو ہر قسم کی مغربی تصنیفات کے مترجم کے لئے سب سے بڑی مشکل ان اصطلاحات کی کثیر تعداد ہے جن کے مترادف دیسی زبانوں میں بالکل نہیں ملتے۔ اسی مشکل کی وجہ سے اُردو میں بہت کم کتابوں کا ترجمہ کیا گیا ہے اور اچھے تراجم کی تعداد تو اسی وجہ سے اور بھی قلیل ہے۔

اس مشکل کو رفع کرنے اور دیسی زبانوں کو نو آموز مترجمین کے مضر اثر سے بچانے کے لئے جو ان زبانوں میں مترادف الفاظ کے ہوتے ہوئے بوجہ لاعلمی یا تو نئی اصطلاحیں گھڑ لیتے ہیں یا موجودہ الفاظ کے غلط استعمال سے ایک ایسا ذخیرہ فراہم کرتے ہیں جو آیندہ نسلوں کو رد کر دینا پڑے گا۔ مستند اہل الرائے حضرات کے لئے یہ ازبس ضروری ہے کہ وہ کوئی ایسا قاعدہ کلیہ مقرر کریں جس سے اس قسم کی لچکیلی اصطلاحات بنائی جائیں جو ہماری نئی علمی ضروریات کو پورا کر سکیں

اور ہماری دیسی زبانوں کی فطرت سے ایسی مطابقت رکھتی ہوں کہ بلا تکلف ان میں ضم کی جا سکیں۔

لیکن اس مسئلہ میں اختلاف آرا اس قدر ہے کہ کوئی خاص قاعدہ مقرر نہیں کیا جا سکتا، جس پر تمام علما، جو رائے قایم کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں متفق ہوں یا اظہار تشفی کریں۔ اس وقت ہمارے سامنے تین مختلف تجاویز ہیں جن میں مختلف خیالات ظاہر کئے گئے ہیں۔ اور ہر تجویز میں کچھ نہ کچھ خوبیاں ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے ایک فاضل اجل و ماہر علم اللسان بابو راجندر لال متر کا مقبول و عالمانہ تبصرہ ہے۔ علمی اصطلاحات پر اس سے زیادہ مبسوط بحث پہلے کبھی ہماری نظر سے نہیں گزری دوسرا تبصرہ اس ملک کے نامور طبیب مولوی تمیز خاں بہادر کے قلم سے ہے جنھیں اس صوبہ کی دونوں زبانوں میں علوم تشریح الابدان و طب کی تعلیم دینے کا بہت عرصہ سے تجربہ ہے اور سالہا سال سے اپنے ابنائے وطن میں مغربی تعلیم پھیلانے کی نہایت شوق سے مسلسل کوشش کر رہے ہیں۔ لہذا ان کا قول مسئلہ زیر بحث کے لئے ایک بہت بڑی سند کا حکم رکھتا ہے۔ تیسری رائے مہتمم مدارس حلقہ بہار کی ہے جس کا کلکتہ کی کمیٹی سے کچھ تعلق نہیں۔ لیکن اس میں ایک خوبی یہ ہے کہ اس کے ساتھ بہت سی عملی مثالیں سائنس کی کتابوں کے متعدد ترجموں کی شکل میں بطور نمونہ دی گئی ہیں جن پر ہم بعد میں حسب ضرورت نظر ڈالیں گے۔

ہم فی الحال ان تمام تجاویز کی نمایاں خصوصیات نہایت اختصار کے ساتھ دکھانے پر ہی اکتفا کریں گے اور اپنی رائے کو کسی آیندہ صفحہ کے لئے محفوظ رکھتے ہیں۔

بابو راجندر لال متر اصطلاحات کا ترجمہ کرنے کے زبردست حامی ہیں۔ لیکن وہ ترجمہ لفظی پابندیوں میں جکڑا نہ ہو۔ جس طرح چینی نقل کرتے وقت مکھی پر مکھی مارتے ہیں۔ بلکہ اس ترجمہ سے ایسے الفاظ پیدا ہونے چاہئیں جو اشیائے متذکرہ کے لئے علامات کا کام دیں۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ الفاظ اشیا کا ایک دھندلا تصور ظاہر کریں جو قدیم زمانے میں کسی نسل نے غلطی سے ان کے متعلق اپنے ذہن میں قایم کیا تھا جس وجہ سے غلط الفاظ اس کی زبان میں ہمیشہ کے لئے داخل ہو گئے اور زمانۂ قدیم سے مستعمل ہونے کے باعث اب تک مروج ہیں۔

صاحب موصوف نے اپنے مقصد کے لحاظ سے جملہ الفاظ کو چھ قسموں میں تقسیم کیا ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ ان کی تقسیم کی انتہائی موزونیت اور کمال کا اختصار سے خون کیا جائے۔ لہذا ہم انھیں کے الفاظ درج کئے دیتے ہیں:-

مختلف علوم کی ان تمام اصطلاحات کا جو ملکی مدارس میں بالعموم پڑھائے جاتے ہیں بغور مطالعہ کرنے کے بعد

یں نے یہ رائے قایم کی ہی کہ وہ چھ اقسام یا اصناف میں تقسیم کی جا سکتی ہیں جن میں سے ہر قسم اپنی امتیازی خصوصیت رکھتی ہی۔

پہلی قسم میں زبان کے وہ معمولی الفاظ شامل ہیں جو کبھی کبھی بطور اصطلاحات استعمال ہوتے ہیں۔

دوسرے قسم کے الفاظ میں جامد اسمار اور مختلف چیزوں کے نوعی نام شامل ہیں جیسے مالٹ (شعیر منقوع) بیسٹ (خمیر) رینٹ (   ) وغیرہ۔ گو یہ الفاظ نہایت عام فہم ہیں لیکن زیادہ تر ایک خاص فن میں استعمال ہونے کی وجہ سے انھوں نے ایک نیم اصطلاحی شکل اختیار کرلی ہی اور یہ سائنس اور روزمرّہ کی زبان کے بین بین ایک بحث طلب حیثیت رکھتے ہیں۔

تیسری قسم کے الفاظ سائنس کی اشیاء کے غیر اشتقاقی نام ہیں مثلاً کونین۔ اپی کاکوانہا (ایک تلخ دوا جو ایک امریکائی پودے کی جڑ سے حاصل کی جاتی ہے) ٹیلریم (ایک دھات) سلینیم (ایک دھات) برومین (ایک مفرد مالہ) وغیرہ۔ ابتداءً جب یہ الفاظ وضع کیے گئے تو اکثر حالتوں میں جن چیزوں کے لئے استعمال کیے جاتے تھے ان کی کوئی خاصیت ظاہر کرتے تھے لیکن اُن میں سے بہت سے الفاظ کے اشتقاقی معنیٰ عرصۂ دراز سے مفقود ہوگئے ہیں اور یہ الفاظ اب دوسرے درجہ کے جامد بن گئے ہیں جنھیں سنسکرت میں 'یوگ روڑھی' کہتے ہیں۔

چوتھی قسم میں نباتات وحیوانات کے مرکّب علمی ناموں کا شمار ہی جو ابتدا میں اشتقاقی معنیٰ رکھتے تھے۔ لیکن بوجوہ چند در چند ان میں سے اکثر الفاظ کی اب یہ کیفیت نہیں رہی اور اب وہ کسی خاص نوع یا جنس کا نام ظاہر کرتے ہیں، جونیسیا اسوکا (Jonesia Asoka) کوئیس بھکتی (Coius bhekti) وغیرہ۔ لہذا گزشتہ اقسام کی طرح یہ بھی جامد اسماء تصوّر کیے جا سکتے ہیں۔

پانچویں قسم سے اُن مفرد الفاظ کو تعلق ہی جن کے اشتقاقی معنیٰ نہایت صاف وصریح ہوتے ہیں اور صرف اسی حد تک کارآمد ہیں جب کہ سامع پر اپنے اشتقاقی معنیٰ بخوبی واضح کردیں۔ چوں کہ یہ الفاظ صرف علوم وفنون ہی میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس لئے انھیں خالص اصطلاحی سمجھنا چاہیئے۔

چھٹی قسم میں وہ مرکّب اصطلاحات شامل ہیں جن کا کم از کم ایک اور اکثر حالتوں میں ہر جزو کچھ نہ کچھ اشتقاقی معنیٰ ضرور رکھتا ہی۔ یہی معنیٰ اُن اصطلاحوں کی جان ہوتے ہیں اور اس شی کی نوعیت معلوم کرنے کی غرض سے

جس کے لئے کوئی اصطلاح استعمال کی جاتی ہو لازمی ہے کہ سامع ہر جزو کا مطلب بخوبی سمجھ لے۔

الفاظ کی ان چھ قسموں کا فاضل موصوف نے اس طرح تصفیہ کیا ہے۔ (ہم ذیل کی عبارت صاحب موصوف ہی کے تبصرہ کے خلاصہ سے جس میں انھوں نے مسئلہ ہذا پر شرح وبسط کے ساتھ بحث کی ہو نقل کرتے ہیں)

(۱) خلاصہ کلام پہلا قاعدہ جو میں تجویز کرتا ہوں یہ ہو کہ ان تمام اصطلاحات کا جو اشیا کی صفات ظاہر کرتی ہیں بغیر استثنار ترجمہ کیا جائے یا ضروری ترمیم سے انھیں مفید مطلب بنایا جائے۔ لیکن اگر ہندوستانی زبانوں میں مترادف الفاظ نہ ملیں تو مفرد اشیاء کے نام یورپی زبان سے لئے جاسکتے ہیں اور اس قاعدہ کے استعمال کے متعلق میری یہ رائے ہی۔

(۲) قسم اوّل کے الفاظ کا ترجمہ کیا جائے۔

(۳) قسم دوم کے الفاظ کا ترجمہ کیا جائے یا مناسب ترمیم سے انھیں موزوں بنا لیا جائے اور بشرط ضرورت ان میں اصلاح کی جائے۔

(۴) قسم سوم کے الفاظ کا املا خاص قواعد کی پابندی سے دیسی زبان میں لکھا جائے۔

(۵) قسم چہارم کے الفاظ کا املا خاص قواعد کی پابندی سے بلا تغیر و تبدل دیسی زبان میں لکھا جائے۔

(۶) قسم پنجم کے الفاظ کا ترجمہ کیا جائے یا مناسب ترمیم سے انھیں موزوں بنا لیا جائے اور بشرط ضرورت ان میں اصلاح کی جائے۔

(۷) قسم ششم کے الفاظ کا ترجمہ کیا جائے اور بشرط ضرورت ان میں اصلاح کی جائے۔ لیکن آلات کے نام اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اُن کا صرف املا ہی دیسی زبان میں لکھا جائے۔

(۸) مترجمین کی رہنمائی کے لئے چند آسان قواعد مرتب کئے جائیں۔

(۹) اصطلاحات کے مکمل لغات تیار کئے جائیں، جن میں دیسی زبان کے مترادف الفاظ یا اُن الفاظ کا املا دیسی زبان میں درج ہو جن کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔

ڈاکٹر تیزخاں اس بات میں تو بابو راجندر لال سے متفق ہیں کہ دیسی زبان کی اصطلاحات اگر مل سکیں تو ضرور اختیار کی جائیں لیکن وہ نئے الفاظ گھڑنے کے موید نہیں ہیں۔ کیوں کہ وہ اسے غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ دیسی زبانوں میں مترادف

نہ ملنے کی حالت میں وہ نئی اصطلاحات وضع کرنے کے لئے عربی و سنسکرت سے کام لینے کے بجائے بہتر یہی سمجھتے ہیں کہ مغربی اصطلاحات کو برقرار رکھا جائے۔

اُن کی رائے حسب ذیل ہے:۔

اس تجربہ کی بنا پر جو طب انگریزی کے بعض شعبوں کا اردو و بنگالی میں ترجمہ کرنے اور انھیں زبانوں میں اس کی تعلیم دینے سے مجھے حاصل ہے۔ میں وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ترجمہ کے لحاظ سے سائنس کی مغربی اصطلاحات تین جداگانہ اصناف میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔

صنف اوّل میں ایسی مشہور و معروف علمی اصطلاحوں کا شمار ہے جن کے صحیح مترادف اُردو و بنگالی دونوں زبانوں میں موجود ہیں۔

صنف دوم میں وہ بے شمار علمی اصطلاحیں شامل ہیں جو طب کی انگریزی کتابوں میں آتی ہیں اور جن کے ہم معنی الفاظ بہ ظاہر دیسی زبانوں میں نہیں پائے جاتے۔ اس صنف کا ذکر آگے چل کر پھر آئے گا۔

تیسری اور آخری صنف میں وہ اصطلاحی الفاظ شامل ہیں جو طب کی انگریزی کتابوں میں استعمال کئے جاتے ہیں لیکن جن کے مترادف فی الواقعہ دیسی زبانوں میں بالکل موجود نہیں۔ اس صنف میں نسبتاً بہت زیادہ الفاظ شامل نہیں

پہلی دو صنفوں کے لئے انھوں نے دیسی زبانوں کے الفاظ استعمال کرنے کی سفارش کی ہے اور ان الفاظ کے انتخاب کے لئے انھوں نے یہ رائے دی ہے کہ قابل مولویوں اور پنڈتوں کی ایک کمیٹی مقرر کی جائے لیکن آخری قسم کے الفاظ کے بارے میں وہ کہتے ہیں:۔

ان الفاظ کے متعلق جو میں نے تیسری صنف میں داخل کئے ہیں یعنی وہ اصطلاحات جن کے ہم معنی الفاظ دیسی زبانوں میں مطلق نہیں پائے جاتے اور جن کی تعداد بدقسمتی سے کچھ کم نہیں بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ترجمہ میں مغربی اصطلاحیں ہی اپنی اصلی اور ابتدائی حالت میں بلا تغیر و تبدل قایم رکھی جائیں یا مترجمین دیسی زبانوں میں انھیں ادا کریں اور ان کا مفہوم بتانے کے لئے نئے الفاظ وضع کریں۔ اس دقیق مسئلہ کے دونوں پہلوؤں کی تائید میں معقول دلائل و براہین پیش کئے جا سکتے ہیں۔ نئے الفاظ گھڑنے کی مخالفت میں جتنے قوی دلائل بیان کئے جا سکتے ہیں اتنے ہی اس کی حمایت میں بھی پیش ہو سکتے ہیں۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ محض سنسکرت، عربی یا فارسی لفظ

کے جاننے سے ہمیں کسی چیز کا اس تصور سے کچھ بہتر تصور نہیں ہو سکتا۔ جو اس کا انگریزی، لاطینی یا یونانی نام سننے اور طالب علم کو یہ بتا دینے سے ہوتا ہی کہ فلاں لفظ فلاں شئے کے لئے استعمال کیا جاتا ہی اور کسی دوسری چیز کے لئے نہیں بولا جاتا۔ ہمارے کالج کے مختلف شعبوں کی تعلیم میں اور نیز دوسرے کالجوں میں بعینہٖ کامیابی سے اسی پر عمل ہوتا ہی۔ مثلاً اگر ہم کسی طالب علم سے یہ کہدیں کہ ایک خاص پٹھے کا نام بائی سیپس (Biceps) ہی یا ایک خاص عمل کو اسٹالائیڈ ہائیڈ (Stylohyoid) کہتے ہیں یا وہ جسم لمفیٹک گلینڈ (Lymphatic gland) کے نام سے موسوم ہی اور اس کو ان الفاظ کا اشتقاق سمجھنے کی زحمت دیئے بغیر یہ بتا دیں کہ فلاں نام صرف فلاں شی کے لئے استعمال ہوتا ہی اور کسی دوسری چیز کے لئے نہیں بولا جاتا تو ہم دیکھیں گے کہ وہ طالب علم اس کو اچھی طرح ذہن نشین کرتا اور یاد رکھتا ہی اور کسی دوسری چیز کے نام سے خلط ملط نہیں کرتا۔

ان الفاظ کی نسبت جو ڈاکٹر ٹائیلر اور ایسے ہی دوسرے لوگوں کی محنت سے قبل ازیں وضع ہو چکے ہیں ان کے بہترین استعمال کے متعلق فاضل ڈاکٹر کا یہ خیال ہی:۔

میرا یہ منشا ہرگز نہیں کہ ان کی ناقدری کی جائے۔ یا ان سرگرم نیک نیت اور جلیل القدر مستشرقین کی جانکاہی و عرق ریزی کو بہ نگاہ استحقار و استخفاف دیکھا جائے۔ مگر ان الفاظ کو آیندہ مفید و کارآمد بنانے اور ان لوگوں کو جو محض دیسی زبانوں یا سنسکرت و عربی سے واقف ہیں یورپ کی علمی اصطلاحات کا اشتقاق سمجھانے کے لئے میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ اولاً ترجمہ کی ہر فصل کا عنوان یورپ کی اصل اصطلاح میں ہو۔ ثانیاً متن کتاب میں صنف اوّل و دوم کے الفاظ استعمال کئے جائیں اور ثالثاً نئے موضوعہ الفاظ بہ شکل حواشی کتاب میں درج کئے جائیں لیکن کسی حالت میں بھی انھیں کچھ زیادہ اہمیت نہ دی جائے۔

ہمیں اس بات کا پورا احساس ہی کہ ان تبصروں کا اس طرح خلاصہ درج کر دینے سے ہم نے اوّل الذکر کی گہری تحقیقات اور ثانی الذکر کی علمی و ماہرانہ خصوصیت کی کچھ داد نہیں دی۔ لیکن ان تینوں تجویزوں کے لب لباب کو چونکہ ہم تھوڑی سی جگہ میں محدود کرنے پر مجبور ہیں لہذا اب ہم بادل ناخواستہ تیسری تجویز کی طرف رجوع کرتے ہیں جو دنیائے ہند کے ایک ایسے طبقہ کی جانب سے پیش ہونے کے باعث جسے ہم اب تک عالم ظلمات میں بھٹکتا ہوا خیال کرتے تھے۔ ہماری خاص توجہ کی مستحق ہی۔

ہم شروع ہی میں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ تجویز جو پٹنہ سے پیش ہوئی ہے اور جس کی منسلکہ رسائل میں توضیح کی گئی ہے ہمیں نہایت دلکش معلوم ہوتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ تمام ادق اور ثقیل اصطلاحات نکال دی جائیں اور ان کے بجائے عام لوگوں کی بول چال کے الفاظ اختیار کرکے سائنس کی تعلیم میں آسانی پیدا کی جائے اور اسے عامۃ الناس کی دسترس میں کر دیا جائے۔ اور اگر ہمیں اس بات کا یقین ہو سکتا کہ روزمرہ کی مبہم اور پوچ زبان کی اصطلاحیں وضع کرنے سے علمی ضبط وصحت کا خون نہ ہوگا تو ہم ضرور اس تجویز کی حمایت کرتے۔ اس میں تو کچھ شک نہیں کہ یہ طریقہ نہایت سادہ ہے۔ اور اگر اختیار کیا جائے تو ہمیں اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے نہ تو عربی وسنسکرت علوم کی ضخیم کتابوں کی ورق گردانی کی حاجت ہے اور نہ سیدھی سادی دیسی بولیوں پر غیر زبان کے الفاظ کا بار ڈالنے کی ضرورت اور الفاظ بھی ایسے الفاظ جن کا نہ تو املا دیسی زبانوں میں صحیح طور پر لکھا جا سکتا ہے اور نہ دیسیوں ہی کے نا آشنا لب ان کا ٹھیک تلفظ ادا کر سکتے ہیں۔ اس طرح ہمیں صرف یہی کرنا ہوگا کہ غیر زبان کی ایک اصطلاح لے لی اور لوگوں کی عام بول چال میں اس کا مفہوم ظاہر کر دیا۔ اگر دانایان فرنگ اپنے حرارت ناپنے کے آلہ کو تھرمامیٹر کہتے ہیں تو پٹنہ کے محترم صاحب حکما ہندوستان کی آنے والی نسل کو یہ سکھانا چاہتے ہیں کہ وہ اس آلہ کو "گرمی ناپ" کے نام سے تعبیر کریں۔ اس موقع پر یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ اس دلاویز طریقہ کے وضع کرنے کا سہرا رائے سوہن لال منتظم نارمل اسکول پٹنہ کے سر ہے۔

ہندوستان کی دیسی زبانوں میں علمی اصطلاحات وضع کرنے کے لئے ہم تین تجویزوں کا خلاصہ درج کر چکے ہیں۔ اب اگر ہم غیر زبان کے الفاظ کو دیسی زبانوں میں لکھنے کا طریقہ اس پر مستزاد کریں تو ہم سمجھیں گے کہ یورپ کی جدید مصطلحات علمیہ کو ہندوستانی جامہ پہنانے کے تقریباً تمام ممکن ذرائع ہمیں معلوم ہو گئے۔ یہ طریقہ کچھ ایسا لغو ومہمل نہیں، لیکن یورپ کے بعض ماہرین تعلیم اکثر اوقات "کاہلانہ بے صبری" یا قومیت کے مغالطہ آمیز فخر کی وجہ سے اس طریقہ کی حمایت کرتے ہوئے اصوات واصول نحوی کی مناسبت کا کچھ لحاظ نہیں کرتے تاکہ ان کی مادری زبان کا پلہ کسی طرح بھاری رہے۔

اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب طریقے تین درجوں میں منقسم ہو سکتے ہیں جن میں سے دو انتہائی حیثیت رکھتے ہیں، اور تیسرا ان تینوں کے بین بین ہے۔ لیکن یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ مروجہ اصطلاحات

کے متعلق کوئی اختلاف رائے نہیں ہی اور موجودہ بحث کا تعلق صرف ان الفاظ سے ہی جن کے مترادف معلوم نہیں ہیں۔ یہ مترادف معلوم کرنے کے لئے ہمیں یا تو

(۱) مغربی اصطلاحات کو بجنسہٖ قایم رکھکر انھیں املا کے ایک وقت طلب طریقہ کے مطابق دیسی زبانوں میں منتقل کرنا چاہیئے۔ یا

(۲) اُس خزانۂ الفاظ کو جو عربی و فارسی میں مدفون ہے فراخ دستی و کشادہ دلی سے صرف کرکے ان اصطلاحوں کا دیسی زبانوں میں ترجمہ کرنا چاہیئے۔ اور یا

(۳) بعض مغربی مصطلحات بجنسہٖ قایم رکھنے اور بعض کا ترجمہ کرنے سے ان دونوں طریقوں کو مخلوط کر دینا چاہیئے۔

پہلا طریقہ ہرگز قابل التفات نہیں اس لئے بالکل نظر انداز کیا جاتا ہی۔ کوئی سمجھ دار ہندوستانی ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے اتفاق ظاہر نہیں کرے گا۔ اور نہ کوئی سمجھ دار یوروپین اس کا موٗید ہوگا۔ اس سے ہماری مادری زبان دوغلی بن جائے گی۔ ہم اس بات کا بہ آسانی اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس طریقہ پر عمل کرنے سے ہمارے آیندہ پنڈت لاطینی نما ہندوستانی لکھیں گے اور ہندی نما لاطینی بولیں گے۔ اس کا تصور ہی اس قدر مضحکہ خیز اور عجیب وغریب ہی کہ ذہنیات سے اس کو علمیات میں لانے کی کچھ ضرورت نہیں۔ سوال فی الحقیقت صرف یہ رہ جاتا ہے کہ آیا ہمیں مغربی علوم کی تعلیم صرف بواسطۂ انگریزی دینی چاہیئے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہی تو سب الفاظ کا املا دیسی حروف میں لکھنے کے طریقہ کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہدینا چاہیئے۔

بالفرض اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ انگریزی اصطلاحات عوام سے خراج مقبولیت حاصل کرسکیں گی جو ہمیں بالکل محال نظر آتا ہی تو پھر بھی اس طریقہ پر یہ سخت اعتراض وارد ہوتا ہی کہ وہ الفاظ جو اپنے اصلی ماخذوں سے بالکل منقطع اور دیسی زبان کے متعلین کی نظر میں ہمیشہ اجنبی رہیں گے اور متعلمین پر اتنے ہی گراں گزریں گے جتنے کہ چینی زبان کے حروف تہجی سوائے چینیوں کے اور سب پر گراں گزرتے ہیں۔

اب ہم ترجمہ کی بحث کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتے ہیں۔ اور اس اصول کو ایک بدیہی صداقت سمجھکر ہم یہ تسلیم کئے لیتے ہیں کہ ترجمہ میں ہمیں ہمیشہ سادگی بگیانی اور صحت کو لحوظ خاطر رکھنا چاہیئے۔ اب سوال یہ ہی کہ ان تینوں شرائط کو نہایت پابندی کے ساتھ پورا کرنے کے لئے ہمارے طریق عمل کے اصول موضوعہ کیا ہوں اور ہماری

رہبری کے لیے کیا قواعد مقرر کیے جائیں ؟ اس سوال کا شاید یہ جواب ہو سکتا ہے :-

(۱) مفرد اشیا کے تعبیر کرنے میں مفرد الفاظ کو مرکب الفاظ پر ترجیح دینی چاہیئے ۔

(۲) وہ مصطلحات جو اشیا متذکرہ کی کوئی خاصیت ظاہر کرتی ہیں ان اصطلاحات پر جو کوئی خاصیت ظاہر نہیں کرتیں مرجح ہیں ۔

(۳) اگر ہندوستانی متعلم کے لئے انگریزی اصطلاح اور اس کے ترجمہ میں برابر کا اشکال ہو اور ایک کو دوسرے پر کچھ بھی فوقیت نہ ہو تو یکسانی کی خاطر دیسی اصطلاح کے بجائے انگریزی اصطلاح قایم رکھنی چاہیئے ۔

(۴) مرکب اشیاء کے تعبیر کرنے میں مرکب اصطلاحات کو ترجیح دینی چاہیئے اور یہ اصطلاحات ایسی ہوں کہ مرکب کے اجزا پر بھی کچھ روشنی ڈال سکیں ۔

(۵) ایک ہی قسم کی چیزوں کو ظاہر کرنے کے لئے ایک ہی قسم کے مرکبات و مشتقات کو مرجح سمجھنا چاہیئے ۔

(۶) مروجہ اصطلاحات میں خواہ یورپی ہوں یا ایشیائی کوئی ایسی اصطلاح قایم نہیں رکھنی چاہیئے جو کسی شئے کی نوعیت یا خاصیت کی نسبت غلط خیال پیدا کرتی ہو ۔

ممکن ہے کہ یہ قواعد ناکافی ہوں اور شاید ان میں کسی قدر ردوبدل کی بھی ضرورت ہو ، لیکن ان سے ہمیں اتنا ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر ہم ایک قلیل مدت میں اپنی زبان کے لئے وہ کام کرنا چاہتے ہیں جسے مغربی زبانوں کے لئے کرنے میں عمریں صرف ہو گئیں ہیں تو ہمارے طریق عمل کی حدود ہونی چاہئیں ۔ ہم یہ پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ ہمارا اصول سادگی یکسانی اور صحت ہونا چاہیئے ۔ سادگی اور صحت تو شاید پیدا کی جا سکتی ہیں ۔ لیکن ہندوستانی زبانوں کی اس کثرت کی صورت میں یکسانی کیوں کر پیدا کی جائے گی ؟ ہم دور کیوں جائیں خود ہمارے چھوٹے سے صوبہ میں اردو اور ہندی کے جھگڑے کا کیا تصفیہ ہوگا ؟ کیا ایک صوبہ کے لئے ہم دو قسم کی اصطلاحات مقرر کریں ؟ اس مشکل کا پورا احساس ان دونوں فضلا میں سے جن کے تبصرے اس رسالے کی اشاعت کے محرک ہیں کسی کو بھی نہیں ہوا ۔

کچھ عرصہ ہوا اردو اور ہندی کے مسئلہ پر ایک گرم مباحثہ عام ہوا تھا جس میں ناظرین کو یاد ہوگا کہ سر سید احمد خاں سی ایس آئی نے نمایاں حصہ لیا تھا ۔ ہم اس بحث کو یہاں دوبارہ نہیں چھیڑنا چاہتے ۔ لیکن عربی اور سنسکرت کی

ذاتی خوبیوں کے متعلق ہمیں چند الفاظ ضرور کہنے چاہئیں کیوں کہ ہمارے موجودہ مبحث سے اس مسئلہ کو بہت بڑا تعلق ہے۔
اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ان دونوں زبانوں کے ادبی ذخائر ناپیدا کنار ہیں۔ خوبی کلام، فصاحت معانی، اور خالص فلسفیانہ نکات کی چھان بین کے لیے سوائے یونانی کے دنیا کی باقی تمام زبانوں میں یہ اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔ لیکن اگر ان دونوں کا مقابلہ کیا جائے تو ان میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کہ نوع انسانی کی اُن دو بڑی آبائی نسلوں کے دماغ، خصائل، جذبات اور تاریخ میں ہے جن کے اجتماعی، اخلاقی، ذہنی اور تمدنی تجربہ کی یہ مظہر ہیں۔ خیالات کے صحیح اظہار اور تعین کے لئے یہ دونوں زبانیں اپنی اپنی جگہ نہایت موزوں ہیں۔ لیکن سنسکرت کو عربی پر یہ بہت بڑی فضیلت ہے کہ اس میں الفاظ کے بے شمار مرکبات و مشتقات بن سکتے ہیں اور آگے پیچھے الفاظ بڑھا کر ان میں کئی طرح سے تبدیلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اگرچہ اس بات کے اعتراف کرنے سے ہم لوگوں کی انانیت کو (جو اُردو بولتے ہیں) صدمہ ضرور پہنچتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ زبان عربی اس لحاظ سے نہایت کم مایہ ہے۔ اس میں صرف ایک سابقہ "ال" اور ایک لاحقہ "ی" ہے۔ اس میں مرکب الفاظ بنانے کی صلاحیت بہت کم ہے اور یہ اس لئے کہ اس کے مرکبات کی صرف چار قسمیں ہیں جن میں سے دو ہمارے اغراض کے لئے محض بیکار ہیں۔ مشتقات کے لئے تو یہ قاعدہ کلیہ مقرر ہے کہ داخلی حروف علت کو بدل دیا جائے (اور سامی زبانوں کا یہ ایک امتیاز خصوصی) لیکن نئے الفاظ بنانے کے لئے اس میں کوئی ایسا لچکدار قاعدہ موجود نہیں جو ہر حالت میں کام دے۔ جو مرکب الفاظ اس زبان میں بن سکتے ہیں انھیں ہم سوائے ایک مشتبہ استثنا کے واحد کلمہ صرفی قرار ہی نہیں دے سکتے۔ کیوں کہ ان مرکبات کے اجزا کی انفرادی و ابتدائی حیثیت بدستور قایم رہتی ہے اور انھیں الگ الگ ہی سمجھنا پڑتا ہے۔
یہ ہے وہ مدد جو اُردو کی اصطلاحات وضع کرنے میں ہمیں عربی سے مل سکتی ہے۔
ہم یہ کہہ چکے ہیں کہ عربی زبان بعض صرفی اور لسانی خصوصیتوں کی وجہ سے مرکب اور مشتق الفاظ بنانے میں اتنی مفید امداد نہیں دے سکتی جتنی سنسکرت دے سکتی ہے۔ اگر گنجایش ہوتی اور ہم یہ سمجھتے کہ عربی کے کثیر الفاظ کا انگریزی حروف میں لکھنا ایک انتہا درجہ کا محنت طلب کام نہیں ہے تو ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں بے شمار مثالیں پیش کرتے جنھیں عربی داں حضرات جھٹلانے کی کبھی جسارت نہیں کر سکتے۔ اس زبان کو (جس کا خود راقم بڑا مداح ہے) اس نقص صریح کا ملزم قرار دینے کے بعد اب انصاف یہ ہے کہ ہم دوسرے پہلو پر بھی روشنی ڈالیں۔

یہ ایک مسلّمہ تاریخی واقعہ ہی کہ اندلس اور شام کے عرب یورپ کی علمی ترقی کے ابوالآبا تھے۔ اس زمانہ میں جبکہ دُنیا کے اور لوگوں پر دماغی ظلمت کی گھٹا چھائی ہوئی تھی عرب وادی الکبیر اور فرات کے کناروں پر علمی و ادبی مشاغل میں مصروف تھے۔ جربرٹ کی طرح جو بعدازاں پوپ سلوسٹر کے نام سے مشہور ہوا مسیحی طلبہ صدیوں تک مسلمان فلسفیوں کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے اور علم و فضل میں اعجوبہ روزگار بن کر اپنے وطن کو لوٹتے رہے ہیں۔ ابن رشد اور ابن سینا کی تصانیف صدہا سال تک مغربی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شریک رہے ہیں اور پروفیسروں نے اپنے مسیحی شاگردوں کو ان ہی کے ذریعہ سے تعلیم دی ہی۔ یہی عرب یونانی علوم کے امین اور یونانی تہذیب کے محافظ اور حامل تھے۔ اگر یہ نہ ہوتے تو یورپ کی وہ ادبی اور علمی دولت جو اس کے عروج کا باعث ہوئی کبھی نصیب نہ ہوتی بلکہ خود یہ عروج ایک غیر معین عرصہ تک رُکا رہتا۔ وہ اپنے یونانی اُستادوں کی کچھ کورانہ تقلید بھی نہیں کرتے تھے گو اُن کے عیب جو کبھی کبھی اُن پر یہ الزام لگانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ وہ یکے بعد دیگرے تحقیق کے ہر میدان میں قدم رکھتے تھے۔ ہیئت اور طب کا مطالعہ وہ نہایت شوق سے کرتے تھے۔ علم المناظر اور جر ثقیل میں اُنھوں نے ایسی ایجادیں کی ہیں جن کی بیکن کے زمانہ سے بعد کے لوگ پُوری قدر نہیں کر سکتے۔ کیمیا گری کے بے سود انہماک سے انھوں نے اصلی علم کیمیا کی بنیاد رکھی۔ جعفر نے شورے کا تیزاب اور مار الملوک دریافت کیا۔ اسی شخص نے سب سے پہلے یہ بات عالم آشکارا کی کہ دھات مکلس ہو کر بھاری ہو جاتی ہے۔ گندھک کا تیزاب اور الکحل اوّل اوّل رازی نے بنایا اور ایک بعد کے موجد نے فاسفورس جیسی ضروری شے پہلے پہل تیار کی۔ لنگر کی حرکت سے وقت کا اندازہ کرنا بھی ایک عربی ایجاد ہی۔ اور وہ شخص جس نے مساوات درجہ دوم کے حل کا معمولی طریقہ دریافت کیا ایک عرب ریاضی داں ہی تھا۔ ہیئت اور طبعیات میں ریاضی کے استعمال کے محرک اوّل بھی عرب ہیں۔ ارضیات، نباتات، حیوانات اور معدنیات کے تو وہ بانی ہی قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ عرب جرّاح نہایت مہارت اور صفائی سے عمل جرّاحی کرتے تھے۔ اور آلات جرّاحی بھی رائج تھے۔ سفر و سیاحت کے شوق نے ان کی قرابادین کو بہت وسیع کر دیا۔ اور ادویہ میں بھی معتدبہ اضافہ ہوا جن سے انھوں نے خوب کام لیا۔ ڈریپر لکھتا ہی کہ طب کے نظری اور عملی مسائل میں جہاں تک افعال اعضائے انسانی کی تصریح اور معالجہ امراض کو تعلق ہی۔ کیمیا کا استعمال طب میں عربوں نے شروع کیا۔ جرّاحی میں بھی وہ اپنے طبّی علم سے کچھ کم نہ تھے۔ ابوالقسیس قرطبی خود اپنے فرہا دو نیز فن

دایہ گری کے نہایت نازک عمل جراحی انجام دینے میں ذرا بھی نہ جھجکتا تھا۔ وہ بلا تامل چاقو استعمال کرتا اور گرم سلائی کی داغ لگاتا تھا۔

علم المناظر میں ابن ہیثم کے اکتشافات فی الحقیقت ایک بلند پایہ رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے اسی شخص نے بینائی کی صحیح تشریح کی اور یہ بتایا کہ شعاعیں مرئی اشیا سے منعکس ہو کر آنکھوں کے پردہ شبکیہ پر پڑتی ہیں اور ان کا اثر بذریعہ عصبہ مجوفہ دماغ تک پہنچتا ہے۔ وہ دو آنکھوں کو ایک ہی چیز کے دکھائی دینے اور فریب ہائے نظر کی نوعیت سے کامل طور پر آگاہ تھا اور ان واقعات کے اسباب و علل کو بھی بخوبی جانتا تھا۔ اسی شخص نے اوّل اوّل یہ بات معلوم کی کہ کرۂ ہوا کی کثافت ہر جگہ یکساں نہیں ہے اور اس لئے روشنی کی آڑی شعاعیں ہوا میں سے گزرتے ہوئے منحنی اور زمین کی جانب مقعر ہو جاتی ہیں۔ کرۂ ہوا میں انعطافِ نور کے اس عظیم الشّان کلیہ سے اس نے شفق، تاروں کے جھلملانے، اور افقی حالت میں عمودی قطر شمس و قمر کے بظاہر کم ہو جانے کی تشریح کی۔ انھیں اکتشافات سے کام لے کر اس نے کرۂ ہوا کی بلندی دریافت کی اور اس کی حد تخمیناً ۵۰ میل مقرر کی۔ جر ثقیل اور سکونیات سیّالی میں بھی اُن کے اکتشافات اسی قدر اہمیت رکھتے ہیں۔ اس وقت ہماری میز پر جر ثقیل، علم المناظر، اور اسی نہج کے چند اور عربی رسائل موجود ہیں۔ خود تو یہ رسالے نہایت مختصر ہیں لیکن ان میں ایسی بڑی بڑی کتابوں کے جابجا حوالے دیئے گئے ہیں جو آج کل ہر جگہ بالخصوص ان ملکوں میں مطلقاً معدوم ہیں۔ گو یہ رسالے مختصر ہیں لیکن ان سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ عرب بڑی بڑی قوائے آلیہ کو خوب اچھی طرح سمجھے ہوئے تھے، ان کے استعمال اور اُن تمام حالتوں سے بخوبی واقف تھے جن میں طاقت کم لگانی پڑتی ہے۔ ہم نے "میزان العقل" جو ابن ہیثم کے نام سے منسوب کی جاتی ہے خود تو نہیں دیکھی لیکن اگر ڈریپر اور موسیو خانیکوف کی شہادت معتبر خیال کی جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ طاریسلی کی مشہور ایجاد سے کئی سو سال قبل ابن ہیثم نے کرۂ ہوا کے وزن اور زیادتی کثافت کے باہمی تعلق کو کتاب مذکور میں واضح طور پر بیان کر دیا تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ کثیف واسطہ میں اشیا کا وزن گھٹ جاتا ہے اور مرکز جاذبہ کے اصول اور تیرنے والے اجسام کی کنہ سے بھی وہ آگاہ تھا۔ لنگردار گھڑی اور مایع پیما بھی اسے معلوم تھے۔ مؤخر الذکر سے اس نے اجسام کی کثافتِ اضافی دریافت کی۔ علم الحیات میں تدریجی ترقی کے اصول کا جس سے یورپ کے حکما اب روشناس ہوئے ہیں وہ موجد تھا۔ ابن سینا نے اپنے زمانہ میں قشرۃ الارض کی ساخت کی تشریح کی۔ یہ اور بات ہے کہ اس اکتشاف کو اب الڈٹ کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔

علوم و فنون کے اُن میدانوں کا خاکہ کھینچتے میں جن میں قدیم زمانہ کے عربوں نے قدم رکھا تھا ہم نے بہت سی جگہ صرف کی ہے اور ناظرین کے صبر کا کافی امتحان لیا ہے اور یہ اس غرض سے کہ یورپ اور عرب کے علوم میں جو نمایاں باہمی قربت ہے وہ ثابت ہو جائے۔ ہم یہ بعد میں بتائیں گے کہ اس امر کو ہم اس قدر اہم کیوں سمجھتے ہیں۔

فی الحال ہمارا مقصد صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ مغربی اصطلاحات کا اُردو، ہندی یا بنگالی میں بہترین ترجمہ کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ بنگالی یعنی بنگال کی ہندی ہمارے صوبہ کی ہندی کی طرح سنسکرت ہی میں سے پیدا ہوئی ہے۔ اور اس میں اتنی لچک ہے کہ مترجم نئے الفاظ گھڑنے کے لئے اسے حسب ضرورت استعمال کر سکتا ہے۔ نئی اصطلاحیں ایک دفعہ بنگالی یا ہندی میں داخل ہونے کے بعد ان زبانوں کا جزو بن جاتی اور قدیم زمانہ کے اختیار کردہ الفاظ کی طرح کام دیتی ہیں۔ لیکن زبانِ اُردو اس مداخلت کی اس وقت تک متحمل نہیں ہو سکتی جب تک اس کے موجودہ نظام میں ایک اصولی انقلاب پیدا نہ ہو جائے اور اُردو داں حضرات ہندی کی طرف زیادہ مائل نہ ہوں ان امور سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی یہ تبدیلی ہمارے لئے باعثِ مسرّت ہوگی۔ کیونکہ ہمیں پورا یقین ہے کہ اُردو اور ہندی میں جتنا زیادہ اتحاد و تطابق ہوگا۔ اتنا ہی اُردو کو فائدہ پہنچے گا۔ لیکن ہمیں خوف ہے کہ اس قابلِ قدر مقصد کے پورا ہونے میں بہت عرصہ لگے گا گو اس کی انتہائی کامیابی میں ہمیں مطلق شبہ نہیں جب تک ہندوستان کے مسلمان اپنے اختیار کردہ وطن میں اپنی حیثیت کا غیر منصفانہ خود غرضانہ خیال ترک نہ کر دیں سامی عنصر ہماری مادری زبان میں غالب رہے گا مسلمان جب یہ سمجھنے لگیں گے کہ وہ ہندی پہلے ہیں اور عرب بعد میں یعنی جب انھیں اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ ہندوستان کی متحدہ قومیت میں وہ کوئی غیر عنصر نہیں جو اتحاد میں حارج ہو بلکہ اسی کا ایک جزو ہیں۔ جب وہ عربستان اور عربوں کے بجائے ہندوستان اور ہندوؤں کو اپنی برادری کے لئے منتخب کریں گے تو اس وقت مشترکہ زبان اور متحدہ قومیت کا خواب پورا ہوگا۔ لیکن ہمیں موجودہ حالات سے خواہ وہ کیسے ہی ہوں پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ہندی اور اُردو دونوں زبانوں کے لئے یکساں اصطلاحات وضع کرنا فی الحال ناممکن ہے۔ اور مؤخر الذکر کو علاوہ سنسکرت کے دیگر ذرائع سے بھی کام لینا چاہیئے۔

ہم یہ بتا چکے ہیں کہ اکثر بڑے بڑے علوم کی ابتدا جو ترجمہ کے قابل ہیں عربی میں ہوئی ہے اور جس قدر اصطلاحیں ان علوم کے مبادیات کے لئے ضروری ہیں تحقیقات سے عربی میں معلوم ہو سکتی ہیں۔ عربی ماخذ سے ہماری علمی لغت

میں بہت بڑا اضافہ ہو سکتا ہے۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے موجودہ اہلِ فرنگ بھی عربوں کے علمی انہماک کا اعتراف کرتے ہوئے منفعل نہیں ہوتے اور الکحل، الکمی (کیمیا) الجبر، زینتھ (سمت) ناڈر (نظیر) الیکسر (اکسیر) سرپ (شربت) جولپ (جلاب) اور اسی قسم کے متعدد الفاظ بکثرت استعمال کر کے اپنی ممنونیت ظاہر کرتے ہیں تو ہم اس ذخیرہ کی تحصیل سے فائدہ اُٹھانے میں کیوں تامل کریں؟ ان الفاظ کی تعداد کا صحیح اندازہ جو اس طرح مل سکتے ہیں کوئی شخص اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ حاجی خلیفہ کی تصنیف یا "مدینۃ العلوم" کی کتاب ملاحظہ نہ کرے جس میں کتابوں کی تاریخ درج ہے اور جب تک اسے ان مضامین کا علم نہ ہو جن پر عربوں کی توجہ مبذول رہی ہے اس کے ساتھ ہی ان الفاظ کو کوئی شخص اس وقت تک قابلِ استعمال نہیں بنا سکتا جب تک کہ عربی کی تمام موجودہ علمی کتابوں کا ذخیرہ فراہم کر کے اس کو لایق علما کی ایک جماعت میں پیش نہ کرے۔

علاوہ ازیں ایک اور ایسا ماخذ ہے جس سے زبان اُردو بلا تکلف الفاظ مستعار لے سکتی ہے اور عربی اس کی بیحد ممنون احسان ہے ہمارا اشارہ یونانی زبان کی طرف ہے۔ ڈاکٹر تمیز خاں کے علمی ذوق اور باریک بین نگاہ نے اس نکتہ کو نظر انداز نہیں کیا۔ ان کا یہ خیال ہے کہ تمام یونانی الاصل الفاظ جو طب اور دوسرے علوم میں مستعمل ہیں اس قدر ترمیم کے ساتھ جو ہماری زبان کی ضروریات کے لحاظ سے لازم ہو اختیار کر لینے چاہئیں۔ کیوں کہ قدیم زمانہ کے عربوں نے یہ الفاظ مستعار لے کر ہمارے لئے ایک مثال قایم کر دی ہے اور یہ خیال ہے بھی صحیح۔

ان زبانوں کے علاوہ فارسی ہماری زبردست معاون ہو گی۔ اس سے ہمیں بے شمار الفاظ دستیاب ہوں گے اور چوں کہ یہ ہندی اور اُردو دونوں سے نہایت قریبی تعلق رکھتی ہے اس لئے اس حالت میں جب کہ ہمیں دیگر ذرایع سے ثقیل اور مغلق الفاظ ملتے ہوں یا الفاظ مطلق نہ ملتے ہوں یہ بے حد کارآمد ثابت ہو گی۔ مرکبات اور مشتقات بنانے کا بھی اس میں ایک نہایت عمدہ قاعدہ ہے جو اُردو کے مروجہ قواعد سے اس قدر مشابہ ہے کہ اس نیم اجنبی ماخذ کے نئے الفاظ سے بھی ہم بہت جلد مانوس ہو جائیں گے۔

الغرض اپنی ضروریات کے لئے ہم حسب ذیل الفاظ سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں:۔

(۱) سنسکرت، عربی، فارسی، اور ان مغربی الاصل الفاظ سے جو ہماری زبان میں مروج ہیں۔

(۲) مصطلحات سے جو عربی کی کتابوں میں مذکور ہیں لیکن عام طور پر استعمال نہیں ہوتیں۔

(۳) عربی کے مرکبات و مشتقات سے جو خاص قواعد کی پابندی سے وضع کئے جائیں۔

(۴) یونانی یا لاطینی اصل کی علمی اصطلاحوں سے جن میں بہ تقلید اہل عرب ہماری زبان کی صوتی خصوصیات کے موافق ترمیم ہو جائے۔

(۵) مفرد مشتق یا مرکب الفاظ سے جو فارسی سے مستعار لئے جائیں۔

اب ہم اپنے مجوزہ طریقہ کی مفصل توضیح کے لئے ہر قسم کی چند مثالیں پیش کریں گے۔

(۱) پہلی قسم کی الفاظ کی مثالیں ہر شخص کو سوجھ سکتی ہیں۔ مثلاً کیمیا میں فلز یا دھات (Metal) قرع انبیق (Alembic or retort) اور تیزاب (Acid) وغیرہ الفاظ مستعمل ہیں۔ علم تشریح الابدان اور طب میں قلب یا دل (Heart) ریہ شش یا پھیپھڑا (Lungs) طحال پتی یا پتہ (Spleen) کبد یا جگر (Liver)، دماغ (Brain) رگ یا نس (Vein) بحران (Crisis) تپ (Fever) مدر (Diuretic) مسہل (Purgative) ملین (Apperient) اور اسی قسم کے کئی اور الفاظ سے اردو داں حضرات بخوبی واقف ہیں۔ طبعیات اور ہیئت میں زور یا بل (Force) حرکت یا چال (Motion) وزن ثقل یا بوجھ (Weight) حرارت یا گرمی (Heat) سیارہ (Planet) ثوابت (Fixed Stars) افق (Horizon) وغیرہ الفاظ موجود ہیں۔

(۲) دوسری قسم کے الفاظ ایسے ہیں جیسے کیمیا میں ملحیات (Saline bodies) دہنیات (The Firedoil) تخلخل (Porosity) مائع (Liquid) سیال (Fluid) بخار (Vapour) وغیرہ یا جیسے علم تشریح الابدان اور طب میں شریان (Artery) اعصاب (Tendons) عضلات (Muscles) جمجمہ (Skull) اجواف (Cavities) غدود (Glands) مشیمہ (Secondines) مخدرات (Palliatives) استسقاء (Dropsy) استرخا یا فالج (Paralysis) نطول Fomentation or embrocation وغیرہ یا طبعیات و ہیئت میں بیرم (Lever) بکرۃ (Pulley) مرکز (Fulcrum) تعدیل (Equilibriun) محور (Axis) ارتفاع (Altitude) طول بلد (Longitude) عرض بلد (Latitude) جیب (Sine) وغیرہ۔

(۳) تیسری قسم کی ہم صرف چند ہی مثالیں بیان کریں گے۔ اگر ناظرین زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہیں تو

انہیں علم تشریح الابدان پر ڈاکٹر ٹائٹلر کی قابل قدر عربی تالیف یا علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ اور مولوی کمال الدین لکھنوی کے تراجم ملاحظہ کرنے چاہئیں۔ لیکن ہم ان الفاظ کے مسترد کرنے کا حق محفوظ رکھتے ہیں جو ذوق سلیم یا قواعد صرف کے خلاف وضع کئے گئے ہوں۔ اس قسم کی مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں :-

مقیاس الحرارت	(Thermometer)
حاصل القوا	Resultant of forces
ثنائی الترکیب	Diatomic Substances
ثلاثی الترکیب	Triatounic
تکاثف	Density
معیار	Test
علم السکون	Statics
علم الحرکت	Dynamics
حرکت عمودی	Vertical motion
افقی	Horizontal
وضع افقی	Horizontal position

وضع اصطلاحات میں اس سے بہتر اختراعات بھی کی جا سکتی ہیں لیکن ہمارے مقصد کے لئے یہی کافی ہیں۔

(۴) چوتھی قسم کے الفاظ ان نمونوں کے مطابق اختیار کئے جا سکتے ہیں جو پہلے ہی سے موجود ہیں۔ مثلاً عرب Cornea کے لئے قرنیہ Diabetes کے لئے ذیابیطس یا ذیابیطس (Storax) کے لئے اصطرک Astrolabe کے لئے اصطرلاب۔ اور Is a gogue کے لئے ایساغوجی استعمال کرتے ہیں۔ اور اسماء معرفہ میں (Euclid) کو اقلیدس Pythagoras کو فیثا غورث اور (Socrates) کو سقراط کہتے ہیں۔ ہم بھی اسی طرح سے ان کی تقلید کرتے ہوئے Morphia کے لئے مرفیہ Cryolite کے لئے قرولطیس Crystal کے لئے کرسٹل یا کرسطلس (جو یونانی زبان کے مروجہ لفظ اسطوخودوس کی طرح بنا سکتے ہیں) Hyperstene کے لئے

جیفرسطینو اور Magilus کے لئے مجلس استعمال کر سکتے ہیں۔ ہم diaptase کو دیاپیٹس Spar کو اسپار یا
اسپات Cromine کو برومین اور Iodine کو یودین کہہ سکتے ہیں علیٰ ہذا القیاس۔ ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جن الفاظ کا
صحیح تلفظ ہم نے بدل دیا ہے وہ بعینہٖ اسی صورت میں اختیار یا قبول کر لیا جائے اور نہ ہم قدرت رکھتے ہیں کہ مغربی الفاظ کا املا
دیسی زبان میں صحیح طور سے لکھ سکیں۔ ہم نے محض اس اصول کی تشریح کے لئے روا روی میں چند مثالیں پیش کر دی ہیں کہ
مغربی الفاظ جو مستعار لئے جائیں ہماری صوتی ضروریات کے موافق بدل دیئے جائیں تاکہ دیسی زبانوں کے علما کے ہاتھوں
ان کی زیادہ گت نہ بنے اور جہاں تک صحت لفظی کو تعلق ہے ان کی بے شمار جداگانہ شکلیں پیدا نہ ہوں۔ ٹیکس، کورٹ،
اپیلانٹ، رسپانڈنٹ، وغیرہ الفاظ کی عوام کی زبان پر آکر جو ہیئت کذائی ہو گئی ہے اس سے ہم واقف ہیں اور ہمیں
اس بات کا بھی علم ہے کہ ان الفاظ نے کس قدر بوقلموں بھونڈی شکلیں اختیار کر لی ہیں۔ اس سے ہمیں متنبہ ہو جانا چاہیئے
کہ غیر زبان کے تمام الفاظ بجنسہٖ اپنی زبان میں لے لینا کتنا نقصان دہ ہے۔ ہمیں نئی اصطلاحات کے صرف انتخاب ہی میں
نہیں بلکہ ان میں اپنی زبان کا ٹکسالی روپ پیدا کرنے میں بھی یہ دانشمندانہ احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ ان الفاظ کی اصلی خو
بو ہمیشہ باقی رہے۔ اور لوگوں میں ان کی بگاڑی ہوئی صورتیں رائج نہ ہونے پائیں۔

(۵) پانچویں قسم کی صدہا مثالیں دی جا سکتی ہیں (Air-pump) کے لئے بادکش (Water-pump)
کے لئے آب کش (Anthropomorphus) کے لئے آدمی پیکر ([illegible]) کے لئے نے نما
(Pachydermata) کے لئے سخت جلد وغیرہ الفاظ گھڑ سکتے ہیں (Caly) کا ترجمہ ہم برگ بیرونی کر سکتے ہیں اور
(Corolla) کا برگ اندرونی ہم ناظرین کو یہاں پھر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان اصطلاحات کو ہم الفاظ مذکور کا موزوں ترین
ترجمہ ہرگز تصور نہیں کرتے۔ ہم نے تو چند توضیحی مثالیں پیش کی ہیں اور بس۔ اگر انتخاب کا مسئلہ واقعی درپیش ہو تو شاید ہم
بلحاظ اختصار و صراحت عربی یا ہندی الفاظ کو ترجیح دیں۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ مجوزہ طریقہ پر عمل کرنے سے سب سے بڑی مشکل کا سامنا ان اصطلاحات کے تصفیہ میں ہوگا جن کا
ترجمہ سوائے ادق لغات یا طویل مرکبات استعمال کرنے کے ہو ہی نہیں سکتا۔ اور جنھیں یاد رکھنے کے لئے حافظہ پر بہت
بار پڑتا ہے۔ ہم پر یہ امر بھی بخوبی روشن ہے کہ ان تراجم کا ایسے نکتہ چین حضرات بے حد مضحکہ اڑائیں گے جو
اس طریقہ پر خود کبھی طبع آزمائی کرنے کی وجہ سے اس کی عظیم مشکلات کا صحیح اندازہ کرنے کے ہرگز اہل نہیں لیکن

ہم وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ جن قواعد کے مرتب کرنے کی ہم نے جرأت کی ہے ان پر بہ پابندیِ تمام عمل پیرا ہونے سے یہ مشکل اوّل تو بالکل جاتی رہے گی ورنہ کسی حد تک کم تو ضرور ہو جائے گی۔ اگر مفرد الفاظ مل سکیں تو ہمیں طویل مرکبات کو مسترد کر دینا چاہیے اور اس طرح وضاحت یا لفظی مفہوم کو اگر خفیف سا صدمہ بھی پہنچ جائے تو اس کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن ہمیں کوئی قابلِ اعتراض لفظ اختیار کرنا ہی پڑے تو اُسے بدرجۂ مجبوری قبول کرنا چاہیے اور تا حدِ امکان اسے کار آمد بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمارا خیال ہے کہ عربی کے بھونڈے مرکّب الفاظ بھی بعض اوقات تھوڑی سی قوتِ تمیزی صرف کرنے سے کسی قدر موزوں بن سکتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر ٹاٹلر نے (Stytloglossus) کے لئے لفظ مشلّمیۂ لسانیۃ استعمال کیا ہے۔ اگر یہی لفظ رکھنا منظور ہو تو ہم اسے بدل کر لسانیۃ مشتل بنا سکتے ہیں (Sublingual glands) کے لئے ڈاکٹر صاحب نے اتنا بڑا لفظ تجویز کیا ہے کہ اس کا تلفظ ادا کرنے میں جتنا وقت لگتا ہے اس سے کم وقت میں علم طب کا ایک متوسط طالب علم جو فوجی جماعت سے تعلق رکھتا ہو اپنے آلۂ جراحی سے کام لے کر ان غدودوں کا وجود ثابت کر سکتا ہے۔ لیکن صرف کے سخت قواعد سے کسی قدر انحراف کے بعد اگر ان غدودوں کو تحتانیہ غدین اللسانی یا غد تحت اللسانی کہا جائے تو اس لفظ میں کافی اختصار ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اکثر حالتوں میں جب ایسے چھوٹے چھوٹے کلمے مطلوب ہوں جو آسانی سے یاد رہیں اور بلا دقت بولے جا سکیں تو عربی میں مرکبات مزجی یا امتزاجی اور بنائی کی قسم کے اسماء معرفہ وضع کرنے کے قاعدہ کے مطابق بہت سے الفاظ ایک کلمۂ واحد کی شکل میں ضم کئے جا سکتے ہیں۔ اس پر عربی کے علماء اور دیگر ثقات کو بھی چیں بہ جبیں ہونے کا موقع نہ ملے گا۔ کیوں کہ اس تجویز سے ان کی چہیتی قدیم زبان کے تقدس پر حملہ کرنا مقصود نہیں اور اگر ہم کسی خلافِ محاورہ غلطی کے مرتکب ہوں تو انھیں پورا اختیار رہے کہ اسے ہماری زبان اُردو کے کھاتے میں ڈال دیں جس کا شمار کلاسیکل زبانوں میں نہیں ہے۔

ہم یہ پہلے کہہ چکے ہیں کہ بوقتِ ضرورت ہم فارسی جیسی لطیف زبان سے بھی کام لے سکتے ہیں۔ اس لئے اس قسم کی حقیقی مشکلات شاذ و نادر ہی پیش آئیں گی۔ ہر حالت میں خوش مذاقی اور موزونیت کا اصول مدِ نظر رکھنے سے مترجمین کو بہترین الفاظ کے انتخاب میں مدد ملے گی۔ اصلی الفاظ کا قایم رکھنا مترجمین کا آخری چارۂ کار ہونا چاہیے اور وہ بھی انتہائی مجبوری کی حالت میں۔

لہٰذا مولوی تمیز خاں بہادر کی قابلیت اور پختہ تجربہ کا پورا احترام کرتے ہوئے ہم ان سے اختلاف ظاہر کرنے

پر مجبور ہیں جب وہ یہ کہتے ہیں :-

"میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ محض سنسکرت، عربی، یا فارسی لفظ کے جاننے سے ہمیں کسی چیز کا اس تصور سے کچھ بہتر تصور نہیں ہو سکتا جو اس کا انگریزی، لاطینی، یا یونانی نام سننے اور طالب علم کو یہ بتا دینے سے ہوتا ہے کہ فلاں لفظ فلاں شے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور کسی دوسری چیز کے لئے نہیں بولا جاتا۔ ہمارے کالج کے مختلف شعبوں کی تعلیم میں اور نیز دوسرے کالجوں میں بعینہ یہی بات نہایت کامیابی سے عمل میں آتی ہے۔ مگر اگر ہم کسی طالب علم سے یہ کہدیں کہ ایک خاص پٹھے کا نام بائی سیپس ہے یا ایک خاص عمل کو اسٹائلائیڈ کہتے ہیں یا وہ جسم ملفیٹک گلینڈ کے نام سے موسوم ہے اور اس کو ان الفاظ کا اشتقاق سمجھنے کی زحمت دیئے بغیر یہ بتلا دیں کہ فلاں نام صرف فلاں شے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور کسی دوسری چیز کے لئے نہیں بولا جاتا تو ہم دیکھیں گے کہ وہ طالب علم اس کو اچھی طرح سے ذہن نشین کرتا اور یاد رکھتا ہے اور کسی دوسری چیز کے نام سے غلط ملط نہیں کرتا۔"

ہمیں نفسیات کا کوئی ایسا قانون معلوم نہیں جس سے ثابت ہو کہ جامد اسمار اور بے معنی مصطلحات معنی خیز اصطلاحوں یا ان الفاظ کے مقابلہ میں آسانی سے یاد رکھے جا سکتے ہیں جن کے مفہوم سے متعلم آگاہ ہو اور جنھیں وہ سلسلۂ خیالات کی کسی زنجیر میں منسلک کر کے اپنے حافظہ کے اندر محفوظ رکھتا ہو۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ کس مسلمہ اصول کی بنا پر یہ فرض کیا گیا ہے کہ ایک مشرقی متعلم کے لئے جو بواسطۂ زبان اردو طبعیات اور طب کا اکتساب کر رہا ہو ہندوستانی الفاظ ذات الراسین یا دوسرا اور بادکش کی نسبت بائی سپس اور ایر پمپ کا یاد رکھنا زیادہ آسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر زبان کے الفاظ اگر بہ کثرت اختیار کئے جائیں تو ان پر حافظہ کو اتنی ہی محنت کرنی پڑے گی جتنی اس زبان میں کمال حاصل کرنے کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ غیر معمولی طور پر کام کرنے کے باعث یہ قوت ضرورت سے زیادہ نشو و نما پائے گی جس سے دوسری ذہنی قوتوں کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ کسی علم کی تحصیل میں اس کی اصطلاحات کا سمجھ کر مطالعہ کرنے سے جو دماغی تربیت ہوتی ہے اسے ہم ہرگز حقیر نہیں قرار دے سکتے۔ حیوانیات نباتیات اور کیمیا میں اصطلاحات کا سمجھ کر مطالعہ کرنا ازبس ضروری ہے۔ اگر کوئی متعلم اصطلاحات کے اس طویل سلسلہ کو جو ان علوم میں آتا ہے مختلف اشیا کے نام تصور کرنے کے سوا اور کچھ نہ سمجھے اور ان کے اشتقاقی مفہوم و مطالب سے آگاہ نہ ہو تو ہمیں خوف ہے کہ ان بے شمار الفاظ کو رٹ لینے کے بعد بھی وہ ویسا ہی کورا رہے گا جیسا کہ پہلے تھا۔ اگر کسی ہندوستانی کو نباتات اور

حیوانات کی قسمیں یا کیمیائی مرکبات کے نام ترجمہ کرنے کے بغیر بجنسہٖ بنا دیئے جائیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ان پر پورا عبور کیوں کر حاصل کرسکتا ہے۔ ہماری ناقص رائے میں تو یہ بدرجہا بہتر ہے کہ وہ غیر زبان کے مسخ شدہ بھونڈے الفاظ کی تاریک بھول بھلیاں میں ٹامک ٹوئے مارنے اور مزید "روشنی" کے لئے تگ و دو کرنے کے بجائے مغربی علوم پڑھنے سے پہلے تھوڑی سی ابتدائی انگریزی بطور تمہید سیکھ لے۔ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ علمی پہلو سے یہ طریقہ ایک حد تک کامیاب ہوسکتا ہے تو پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ لوگ جو اس طریقہ سے علم حاصل کریں گے اُسے دوسروں تک نہیں پہنچا سکیں گے اور اس لحاظ سے ان کی حالت بیچارے گریجوایٹوں سے کچھ بہتر نہیں ہوگی جن کی نسبت یہ بات ایک ضرب المثل ہوگئی ہے کہ وہ غیر ملکوں کے علوم اپنے ہم وطنوں کو سکھانے کی قابلیت نہیں رکھتے۔

تاہم اُس مشکل کو رفع کرنے کے لئے جس کا صاحب موصوف نے اپنی رائے میں ذکر کیا ہے اور جس کی تنقید کی ہم نے جرأت کی ہے۔ ہم اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ علمی کتب کے ترجموں میں ہر اصطلاح کا مغربی مترادف ہمیشہ انگریزی اور دیسی زبان کے حروف میں حاشیہ پر درج ہونا چاہیئے۔ اور اگر کوئی طالب علم دونوں قسم کی اصطلاحیں یاد کرسکے تو ہمیں اس پر کچھ اعتراض نہ ہوگا۔ خود ڈاکٹر تمیز خاں بھی اس تجویز کے پرجوش حامی ہیں۔ صرف فرق اتنا ہے کہ وہ دونوں قسم کی اصطلاحات کی جگہ بدل کر جدید وضع کردہ الفاظ کو متن کے ساتھ بطور حواشی درج کرنا چاہتے ہیں۔

اب ہم دوسرے لوگوں کے کام پر جو اس وقت تک ہوچکا ہے ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس موقع پر ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ ترجمہ میں افضلیت کے پہلے حقدار عربی کے عالم متبحر ڈاکٹر ٹانٹلر ہیں جنھوں نے ڈاکٹر ہوپر کی کتاب "اناٹومسٹس ویڈی میکم" کا عربی ترجمہ کرکے اپنے علم و فضل اور حیرت انگیز استقلال کی ایک یادگار قایم کردی ہے۔ اس کتاب نے صحت عبارت اور عربی کے قدیم ادب سے پوری مطابقت رکھنے کے باعث جو اس کا امتیاز خصوصی ہے مسلمانوں میں خاص طور پر مقبولیت حاصل کی ہے۔ اور اس سے ہمارے طبیبوں کو اتنا حقیقی فائدہ پہنچا ہے کہ کسی اور ترجمہ سے نہ پہنچا ہوگا۔ اب تو یہ قریب قریب ایک درسی کتاب بن گئی ہے۔ اور کمال شوق سے پڑھی جاتی ہے ڈاکٹر ٹانٹلر کی "جاں کاہی و عرق ریزی" کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر تمیز خاں نے بہت ٹھیک کہا ہے کہ:۔

"اُس عالم متبحر نے مشرقی طلبہ کو عربی زبان کے ذریعہ سے مغربی طب کی تعلیم دینے کے لئے نہ صرف ہوپر کی پوری کتاب "اناٹومسٹس ویڈی میکم" کا "انیس المشرحین" کے کسی قدر شاعرانہ نام سے پاکیزہ عربی میں ترجمہ کیا ہے بلکہ

اس زمانہ کے طبی ادب کا محنت اور استقلال سے مطالعہ کرنے کے بعد جس کا ہم بے حد احترام کرتے ہیں علمی اصطلاحات کی ایک لغت بھی اس کے ساتھ ضم کی ہے۔ اس لغت کا حجم ڈیڑھ سو صفحہ ہے۔ اور ہر صفحہ پر اکیس اصطلاحیں درج ہیں۔ اس سے ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ ڈاکٹر ٹائیلر نے تشریح الابدان، عضویات علم تشخیص، طب جراحی وغیرہ کی بائیس سو سے زیادہ اصطلاحات جمع کی ہیں۔ اور ان کے ساتھ ان کے عربی مترادف دیئے ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ ان اصطلاحوں کا بیشتر حصہ ڈاکٹر ٹائلر نے بظاہر اپنی ذاتی کوشش سے وضع کیا ہے۔" آگے چل کر ڈاکٹر تمیز خاں لکھتے ہیں کہ :-

"اگر میں اصطلاحات کے اس ترجمہ کو موزوں اور عمدگی سے انتخاب کیا ہوا نہ کہوں تو امید ہے کہ مجھ پر حد سے زیادہ نکتہ چینی کا الزام نہ لگایا جائیگا۔"

ہم مدح سرائی سے بھی متفق ہیں اور نکتہ چینی سے بھی۔ ڈاکٹر ٹائلر کی محنت کا استخفاف ناممکن ہے اور نہ السنہ مشرقیہ کے متعلق ان کی خدمات کو سوائے کامل احترام و امتنان کے کسی اور نظر سے دیکھا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی کہیں گے کہ ان کے تمام وضع کردہ الفاظ پر صاد کرنا مشکل ہے۔ بعض بعض حالتوں میں ان کا انتخاب اچھا نہیں رہا۔ مثلاً ہیڈروجن کے لئے ایک طویل عربی کلمہ مقرر کیا ہے جس کے معنی "پانی پیدا کرنے والی ہوا" ہیں۔ نیٹروجن کے لئے انھوں نے "شورہ پیدا کرنے والی ہوا" اور آکسیجن کے لئے "تیزاب پیدا کرنے والی" کے مترادف الفاظ وضع کئے ہیں۔ حالانکہ اس قسم کے عناصر کے نام یا توحتی الامکان مختصر یا مفرد ہونے چاہئیں اور یا انھیں ویسا ہی رکھنا چاہیئے۔ ان الفاظ کا تو ذکر ہی کیا جو علم کیمیا کے متعلق ہماری جدید ترقی یافتہ معلومات کی رو سے غلط ثابت ہوئے ہیں اسی طرح ڈاکٹر ٹائلر کی کئی منتخبہ اصطلاحات میں جو تشریح الابدان اور عضویات سے تعلق رکھتی ہیں کافی اصطلاح کی گنجایش ہے۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ ڈاکٹر ٹائلر کی محنت آیندہ مترجمین کے لئے بے حد مفید ہوگی اور انھیں اس سے بہت مدد ملی گی۔ ڈاکٹر ٹائلر کی تصنیف ان کے لئے لفظی ذخائر کا ایک وسیع خزانہ ہوگی۔ جسے ہوشیاری سے استعمال کرکے عمدہ نتائج پیدا کرسکیں گے۔

پٹنہ کے ترجموں کے نمونے اس سے بالکل متضاد ہیں۔ ڈاکٹر ٹائلر نے تو یہ غلطی کی ہے کہ بڑے بڑے اور مغلق الفاظ استعمال کئے ہیں جن کا تلفظ نہایت مشکل اور یاد رکھنا اور بھی مشکل ہے۔ لیکن رائے سوہن لال نے اپنے لغو اور سوقیانہ الفاظ سے ہمیں متحیر کردیا ہے۔ اور اگر اپنا اہم مقصد ظاہر کرنے کے لئے وہ ان کے ساتھ ایک تمہید کا اضافہ نہ کرتے تو ہم یہی سمجھتے کہ ان تمسخر آمیز الفاظ سے اہل ہندوستان کو مادری زبان میں سائنس کی تعلیم دینے کے خیال کا مضحکہ اُڑایا گیا ہے۔ ہم

رائے سوہن لال کی علمی واقفیت اور قابلیت کو نہایت وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ہمیں ان کی متانت پر پورا بھروسہ ہی۔ ہمارے خیال میں اُردو کے ادیب کی حیثیت سے انھوں نے اپنے لئے ایک ایسی ڈگر قایم کرلی ہی جس کے یقیناً بہت سے پیرو ہوں گے۔ ان کی تحریر کے چند نمونوں سے جو ہماری نظر سے گزرے ہیں یہ ظاہر ہی کہ اُردو نثر لکھنے میں وہ پورے قادرالکلام ہیں۔ بااین ہمہ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ان کی ادبی ندرت نوازیاں ہرگز روا نہیں رکھی جاسکتیں۔ اور ان کی اوچھے طریقے کے بھی بہت کم حمایتی نکلیں گے۔ ہم خود اس بات کے بہت بڑے موئد ہیں کہ اُردو عبارت میں ہندی عنصر غالب رہنا چاہیئے۔ کیوں کہ طرز تحریر میں وضاحت زور لچک پیدا کرنے کا یہ ایک یقینی ذریعہ ہی۔ اور لکھنوی انشا پردازوں کی ایجاد کردہ ثقیل اُردو کو جس میں عربیت اور فارسیت زیادہ ہو ناپسند کرنے میں ہم کسی سے پیچھے نہیں ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ رائے سوہن لال کی دہقانیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں۔ اور ایسی زبان کے رواج کی مخالفت کریں جو دیہات کے گنواروں ہی کو زیب دیتی ہے۔ اور جسے ہندو مسلمان دونوں مہذب گفتگو میں کبھی استعمال نہیں کرتے۔ ڈاکٹر ٹائٹلر کی پوری لغت میں اتنی خامیاں نہ ہوں گی جتنی غلطیاں اور لغویتیں رائے صاحب کی مختصر سی فہرست اصطلاحات میں ہیں۔ ہمیں اس امر کا اعتراف ہی کہ بعض الفاظ کا انھوں نے نہایت مناسب و موزوں ترجمہ کیا ہی۔ لیکن اس بات پر حیرت بھی ہے کہ حسب ذیل الفاظ کا اس قدر غلط ناموزوں سوقیانہ عامیانہ اور علمی ضرورت کے لحاظ سے محض بیکار ترجمہ کرنے کی انھوں نے کیوں کر جسارت کی ؟

Resultant	پھل
System of forces in equilibrium	سلے تلے ہوئے زور
Plane	کھیت
Exact Science	جانے ہوئے بدّیا
Experimental Science	بچے ہوئے بدیا
Elementary body	نرالی چیز
Definition	پہچان
Axiom	جانی ہوئی بات

ان کی دوبارہ اشاعت کی سفارش نہیں کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ناظم مذکور نے یہ رائے دی تھی کہ ان تراجم سے سائنس کی موجودہ حالت کے مطابق جدید کتابیں تیار کرنے میں بہت مدد ملے گی۔ ہم ان کی قدر و قیمت کے متعلق کوئی رائے نہیں دے سکتے کیوں کہ ان میں سے اہم ترین رسائل ہماری نظر سے نہیں گزرے۔ لیکن برنکلے کی ہیئت کا ترجمہ جو مولوی صاحب نے کیا ہے ہم نے دیکھا ہے۔ ہماری رائے میں یہ کتاب کسی قدر ترمیم کے بعد مشرقی متعلمین کے لئے بہت کارآمد بن سکتی ہے اور آیندہ اس سے مترجمین کو ہیئت کی انگریزی اصطلاحات کے عربی مترادفات تلاش کرنے میں بے حد مدد دی سکتی اس کی طرز تحریر میں وہ سب خامیاں پائی جاتی ہیں جو اچھے ترجمہ میں ہرگز نہ ہونی چاہئیں۔ یہاں اس بات کا بیان کر دینا نامناسب نہ ہوگا کہ سن رسیدہ مولوی صاحب کو ان کی ادبی محنت اور شاہان اودھ کے ماتحت طویل خدمات سرانجام دینے کے صلے میں گورنمنٹ نے ایک معقول وظیفہ عطا کیا ہے۔

ریاضی کے ان رسائل پر بھی جو پروفیسر رام چندر نے لکھے ہیں یہی قول صادق آتا ہے۔ انھوں نے بوشر لاٹ کی کتاب "اُصول حساب الجزئیات والکلیات" کا ترجمہ کیا ہے جو ۱۸۴۵ء میں دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اب یہ کتاب نایاب ہے اور چونکہ اس قسم کی تالیفات میں دیسی متعلمین بہت کم دلچسپی لیتے ہیں اس لئے اُمید نہیں کہ اس کے دوبارہ چھپنے کی جلد نوبت آئے۔

اب ہم ترجمہ کے متعلق چند باتیں بیان کر کے یہ تحریر ختم کرتے ہیں۔ اب تک عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے (یا کیا جاتا تھا) کہ غیر زبان کا ترجمہ کرنے میں اس زبان کے الفاظ کے بجائے اپنی زبان کے الفاظ کا لکھ دینا اور اُسے عوام میں پیش کر دینا ہی کافی ہے۔ جیسے کہ انگریزی عبارت کی انگریزی میں لفظ بہ لفظ تشریح کی جاتی ہے جس میں انٹرنس کے نصاب کی شرحیں لکھنے والے اور فرہنگ فروش یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ اس بات کی مطلق پروا نہیں کی جاتی تھی کہ الفاظ سے مطلب واضح ہوتا ہے یا خبط۔ اُردو زبان میں ایک کتاب شائع کر دینے کے بعد مترجم یہ سمجھ لیتا تھا کہ اس کا مقصد پورا ہو گیا اور اس سے بڑھکر وہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ اس بات کا اسے کبھی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اپنی کتاب کا مطلب سمجھانے کے لئے اسے خود اس کے ہر نسخہ کے ساتھ ساتھ ان تمام ناظرین کے پاس جانا چاہیئے جو اس کی زبان سے ناآشنا ہیں۔ وہ یہ کبھی نہیں سوچتا تھا کہ اس کی کتاب دیوتاؤں اور دیبیوں کی ان تصویروں کے مانند ہے جو ہرزہ گرد برہمن گلی کوچوں میں مذہبی خیال کے تماشا بینوں کو دکھاتے پھرتے ہیں اور ورق اُلٹتے ہوئے ان دیوتاؤں اور دیبیوں کے کارناموں کے گُن گاتے ہیں۔ درائے سوہن لال کے ترجموں کے متعلق پٹنہ کے ڈاکٹر فالن اپنی تنقید کے ابتدائی حصہ

میں کیا خوب لکھتے ہیں :-

سائنس کی کتابیں ابھی دیسی زبانوں میں بالکل مفقود ہیں اس کی کل کائنات فی الحال ابتدائی ہندسہ جبر و مقابلہ اور کسی قدر فلسفۂ طبعی ہے۔ طبعیات علم المدن اور خالص و مخلوط ریاضی کے اعلیٰ شعبوں میں تو میدان بالکل خالی پڑا ہے وہ چند تالیفات جو اس وقت تک ہو چکی ہیں ان کا بھی یہ حال ہے کہ ان میں ایسی دس کتابوں کے نام بھی مشکل سے گنائے جا سکتے ہیں جو واقعی قابل قدر ہوں۔ مغربی علوم کا ترجمہ دیسیوں کے سامنے زیادہ تر جس زبان میں پیش کیا گیا ہے وہ نامکمل، بے لطف، ترتیب و وضاحت کے لحاظ سے ناقص اور اکثر اوقات خلافِ محاورہ و بعید الفہم ہے۔ یہ کتابیں بالعموم کم علم اصحاب اور نا تربیت یافتہ دماغ والوں نے لکھی ہیں۔ جو اپنے مضمون کے محض سطحی علم کی وجہ سے اور زبان پر پوری قدرت نہ رکھنے کے باعث اسی بات میں سہولت دیکھتے ہیں کہ اصلی عبارت کا مبہم اور لفظ بہ لفظ ترجمہ کر دیں۔

تاہم یہ ایک فال نیک ہے کہ لوگ اب ترجمہ کے صحیح مقصد سے آگاہ ہوتے جاتے ہیں وہ اچھے ترجمہ کی زیادہ قدر کرنے لگے ہیں۔ اور اس کی خوبیوں سے بھی بہ نسبت سابق زیادہ واقف ہوتے جاتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر فالن مترجم کا کام کچھ آسان نہیں ہے۔ سائنس کی ایک ابتدائی کتاب لکھنے کے لئے بھی اس مضمون پر پورے عبور کی ضرورت ہے تاکہ ابتدائی مسائل کو انتہائی مسائل کے مطابق واضح کیا جا سکے۔ اس عبور کے ساتھ قوتِ متخیلہ اور دوسرے لوگوں کے سامنے، حقایقِ معلومہ کو وضاحت و ربط کے ساتھ بیان کرنے کی قابلیت کا ہونا بھی لازمی ہے۔ یہ امر کس قدر تکلیف دہ ہے کہ مدرسین و طلبہ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ محض الفاظ پر ضائع کرتے ہیں۔ جب تک دیسی زبانوں میں مفید کتابیں اور ملک میں ایسے معلمین نہ ہوں گے جو اس کمی کو پورا کرنے کی قابلیت و آرزو رکھتے ہوں، مظاہرِ فطرت دیسی طلبہ کے لئے بے معنی و بے لطف رہیں گے۔ قوت ذہنی اور جذبات کے اس طرح رائگاں جانے پر اُن ہمدرد اصحاب کو بہت متفکر ہونا چاہیئے جنھیں ذہنی تربیت کی قدر و قیمت اور لذت کا تجربہ ہے۔

اصول وضع مصطلحات علمیہ

(۱) اگرچہ لا مشاحۃ فی الاصطلاح ہر قوم و ہر زبان میں مسلم ہے مگر اصل اصول وضع مصطلحات کا یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حافظہ پر بار کم ڈالا جائے اس لئے ایسے مصطلحات وضع کرنا جن میں لفظاً موضوع لہٗ سے کوئی مناسبت نہیں ہی بالکل نامناسب ہے۔ جہاں تک ممکن ہو اُس سے احتراز کرنا چاہیئے۔

(۲) زبان عربی میں جتنے مصطلحات قدیم زمانہ سے موجود ہیں اُن کو ہرگز ترک نہ کیا جائے اُن کے عوض جدید مصطلحات وضع کرنے کی ضرورت نہیں مثلاً ہیئت، ہندسہ اور اُس کے فروع حساب، جبر و مقابلہ اُقلیدس، مخروطات وغیرہ یا طب، تشریح، منطق وغیرہ میں ہمارے اساتذۂ فنون نے جو مصطلحات قدیم زمانہ میں وضع یا دوسری کسی زبان سے اخذ کئے ہیں وہ بحالہا قایم رہیں اُن کے عوض جدید مصطلحات تلاش کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ ادنیٰ توجہ سے معلوم ہو جائیگا کہ بعض فنون کے متعدد عربی مصطلحات آج یورپ کی زبانوں میں رائج ہیں پھر ہم کیوں اپنے مصطلحات کو ترک کردیں۔

(۳) جو لغات غیر زبانوں سے لے کر قدیم زمانہ میں معرب کر لئے گئے ہیں یا جو دخیل ہیں وہ اپنے حال پر قایم رہیں اصل کی طرف رجوع کرنا ضرور نہیں۔

(۴) جدید مصطلحات اُردو زبان کے لئے وضع کرنے میں جہاں تک ممکن ہو امور ذیل ملحوظ رہیں۔ حتی الامکان ہندی، فارسی، عربی، انگریزی کے اُنھیں لغات سے مدد لی جائے جو ہماری زبان اُردو میں مُروّج ہیں۔ غیر مانوس جدید لغات سے احتراز کیا جائے۔

(۵) ثقل تلفظ، رکاکت، تراکیب مغلق و غیر مانوس، توالی اضافات وغیرہ سے پرہیز کیا جائے۔ مثلاً ہٹا کٹا، چھپر کھٹ، گندھک، کھٹائی، کھونٹی ثقیل اور رکیک الفاظ ہیں۔ ان کے مترادف الفاظ تندرست و توانا، پلنگ چارپائی، کبریت، گوگرد، ترشی، حموضۃ، میخ ہماری زبان میں موجود ہیں۔

(۶) امالہ ترخیم، فک اضافۃ، اور دوسرے تصرفات سے بوقت ضرورت بے تامل کام لیا جائے۔

(۷) اسم سے فعل بنا لینا ایک قسم کا تصرف ہے جس کی بڑی ضرورت ہے اس کو جائز رکھنا چاہیئے۔

(۸) عربی اور ٹھیٹھ ہندی لفظوں کی ترکیب سے حتی الوسع پرہیز کرنا چاہیئے۔

(۹) جہاں دو یا تین یا زیادہ الفاظ کو ملا کر ایک مرکب لفظ بنانا منظور ہو جس طرح فن کیمیا میں اکثر ضرورت پڑے گی تو اس قدر تصرف جائز رکھا جائے کہ ہر لفظ مفرد میں سے دو ایک حرف حذف کر کے مرکب اصطلاح میں اختصار پیدا کر دیا جائے۔

(۱۰) فن کیمیا میں سیکڑوں نام بسیط اور مرکب مادّوں کے مستعمل ہوں گے جن کے واسطے علامات کا مقرر ہونا ضرور ہے۔ یوروپین زبانوں کی کتابت میں حروف علٰحدہ علٰحدہ لکھے جاتے ہیں اس لئے یوروپین لوگوں کو اس میں کوئی دقت نہیں پیش آتی۔ اب سوال یہ ہے کہ اردو میں مرکب مادّوں کے ناموں میں حروف الگ الگ لکھے جائیں یا ملا کر مثلاً کبیکج اور ک ب ی ک ج پر غور کیجئے۔ حروف کے الگ الگ لکھنے میں آسانی یہ ہے کہ ان کی مقدار کے اظہار کے لئے ہندسے لگا دیئے جا سکتے ہیں۔ ملا کر لکھے جائیں تو ہندسے لگانا مشکل ہو جائے گا۔ گو حروف کے علٰحدہ علٰحدہ لکھے جانے میں طوالت بیشک ہے۔

قدیم یونانی علم ادب

نثر یونانی کا پہلا دور

(از مولوی سید ہاشمی صاحب رکن دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ)

رُکن کی یونانی بحر جسے یُام بِک (Iambic) یا اِلج یاک (Elegiac) کہتے تھے، اتنی آسان اور سادہ بحر ہے کہ اس میں ہر قسم کا مضمون بلا دقت ادا ہو جاتا تھا یہی وجہ ہے کہ یونانی زبان کے منجھنے اور صاف ہونے کے صدیوں بعد تک اس کے ادب میں نظم یا ڈراما[1] کے سوا تحریری نثر کا وجود نہ تھا۔ اوّل اوّل چھٹی صدی قبل مسیحؑ کے وسط میں بعض مذہبی یا فلسفی اشخاص نے مسجع نثر میں اپنے خیالات کا اظہار کیا بھی[2] تو نظم کے مقابلے میں یہ تحریریں مقبول نہ ہوئیں اور گو شجرہ نسب یا حالات سفر بیان کرنے میں کبھی کبھی نثر سے کام لیا جانے لگا تھا لیکن قریب قریب سو برس تک کوئی ایسی کتاب نثر یونانی میں نہیں لکھی گئی جو یادگار رہنے کے لائق مانی جائے۔ اور اس اعتبار سے یونانی زبان کا پہلا قابل ذکر مصنف ہلانی کوس کو سمجھنا چاہیے جس نے پانچویں صدی (ق م) کے وسط میں یونان، مصر، فنیقیہ اور ایران کی تاریخیں لکھیں اور محض سیدھے سادے واقعات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ کہیں کہیں درایت سے کام لیا اور علت و معلول کی ایسی بحثیں بھی کیں جن کا تحمل نظم نہیں کر سکتی۔ کیوں کہ اظہار مطالب کے لئے زبانی گفتگو کے مقابلے میں خود نثر یا تحریر ہی کم تر درجے کا مصنوعی آلہ ہے تو نظم کی قیود میں وہ مطالب پوری طرح کب ادا ہو سکتے ہیں۔

ہرودوتس
۴۸۴ تا ۴۲۵ ق م

لیکن یونانی زبان کا سب سے نامور قدیم مصنف ہرودوتس (ہرودت۔ ہیرودوتوس) ہے جسے دنیا کا سب سے پہلا انشا پرداز کہا جائے تو بجا ہوگا۔ وہ میلاد مسیحؑ سے ۴۸۴ برس پہلے ہالی کرناسوس میں پیدا ہوا جو ایشیائی کوچک کے جنوبی ساحل کا مشہور شہر تھا۔ یہاں ایشیائی اور یونانی ملے جلے رہتے تھے اور سیاسی

[1] یونانی نظم اور ڈراما کی ابتدا اور ترقی کے مختصر حالات دیکھنے ہوں تو ملاحظہ ہو تاریخ یونان قدیم باب ششم۔ یہاں ہم نے اس کو نہیں دکھایا کیوں کہ یہ مضمون حقیقت میں اسی کتاب میں ضم کرنے کی غرض سے تیار کیا گیا تھا۔

[2] اس قدیم ترین نثر کا پہلا نمونہ فرکی دس کی کتاب کو مانا جاتا ہے جس میں مسائل الٰہیات کی بحثیں تھیں اور جو ۵۵۰ ق م کے قریب تصنیف ہوئی

ہو پر یہ صوبہ (کاریہ) سلطنتِ ایران میں داخل تھا۔ اس تعلق نے ہرودوتس کو تمام ایرانی مقبوضات کی سیاحت کا شوق دلایا اور وہ اپنی عمر کے پہلے نصف میں سواحلِ فنیشین (یا بحرِ اسود) سے دریائے نیل تک اور وسط ایران سی بحرِ ایجین کے جزائر و ممالک تک قریب قریب سب جگہ پھرا۔ گویا اُس زمانہ کی متمدن دنیا کا کوئی مشہور مقام ایسا نہ ہو گا جس کی ہرودوتس نے سیر نہ کی ہو۔

۴۴۶ء ق م میں وہ ایتھینز (ایتھنہ) آیا جہاں اُن دنوں پری کلیس (فارقلیس) کا، یعنی ایتھینز کے مین عروج کا زمانہ تھا۔ فنونِ لطیفہ کے بڑے بڑے باکمال جمع تھے سفاکلیس کے بے نظیر ناٹکوں کی دھوم مچی ہوئی تھی غرض ایک جوہرِ قابل کی جلا کے لئے بہتر سے بہتر سامان مہیا تھا۔ ہرودوتس کئی سال تک اس پُر لطف صحبت میں رہا پھر جنوبی اطالیہ کی یونانی نو آبادی ثری میں چلا آیا اور یہیں غالباً ۴۲۵ء ق م میں اس نے وفات پائی۔

ہرودوتس کی ضخیم تاریخ کے دو حصے اور آٹھ "مقالات" ہیں اور پہلے حصے کے پانچ مقالات میں ایرانی سلطنت کی بنا، فتوحات اور ترقی کا ذکر ہے۔ اس ضمن میں اُن ملکوں کے جغرافی حالات بھی آجاتے ہیں جو ایرانی بادشاہوں نے فتح کئے تھے، واضح رہے کہ ان ایرانی بادشاہوں سے خاندان ہنجامنش کے فرماں روا (یعنی کیانی) مُراد ہیں جن کا پہلا بادشاہ سیروس اوّل اور سب سے نامور فاتح سیروس دوم یا کیخسرو تھا۔ اس کا زمانۂ حکومت ۵۵۸ء سے ۵۲۹ء ق م تک ہی اور اس کی وفات اور ہمارے مؤرخ کی ولادت میں صرف ۴۵ برس کا فصل ہے۔ گویا ہرودوتس کو اس عہد کے حالات لکھنے میں خود شاہ کیخسرو کے معاصرین سے چشم دید واقعات سننے کا موقع حاصل تھا اور یہی وجہ ہے اس کی ایرانی تاریخ ہماری عربی فارسی تاریخوں سے زیادہ معتبر ہی کیوں کہ ان مشرقی تواریخ کے ماخذ مشتبہ ہیں اور یقینی طور پر معلوم نہیں کہ انھیں کس نے کب قلم بند کیا تھا۔ اسی بنا پر راقم الحروف کا بہت دن سے خیال ہی کہ ہرودوتس کی کتاب کا اُردو میں ترجمہ ان صاحبوں کے واسطے نہایت مفید ہو گا جنھیں شاہ نامہ فردوسی کی بدولت ایران کی قدیم تاریخ سے دلچسپی ہی اور اس کے افسانوں میں اصلی واقعات کا سُراغ لگانا چاہتے ہیں۔ سائکس کی "تاریخ ایران" بھی جسے انجمن ترقی اُردو ترجمہ کرا رہی ہے ہمیں ہرودوتس کی کتاب سے بے نیاز نہیں کر سکتی کیوں کہ قدیم دنیا کے دلچسپ اور چشم دید حالات کا اتنا بڑا ذخیرہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ دوسرے ہرودوتس کو "ابو المؤرخین" مانا جائے یا نہ مانا جائے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ صحیح معنی میں دنیا کا سب سے پہلا نثار ہی اور ہر شخص کو جسے علم ادب کی تاریخ کا ذوق ہو، اس کی نثر کا مطالعہ کرنا

ضروری ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ ترجمہ میں اس کی انشا پردازی کی خصوصیات پوری طرح نہ دکھائی جا سکیں گی لیکن اس کے متین اسلوب بیان اور تحریر کی بے تکلفی اور روانی کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہو جائے گا اور یہی اس کی انشا پردازی کا کمال ہے۔

درایت کے فن میں اس کو چنداں دخل نہیں ملکی آئین و قوانین اور مذہب و معاشرت کی تہ میں قوم کی عقل و اخلاق کے جو راز پنہاں ہیں اُن تک اُس کی نظر نہیں جاتی۔ سیاسی واقعات بہت پیچیدہ اسباب کا نتیجہ ہوتے ہیں اور ان اسباب کا انسان کے طبعی جذبات اور قوانینِ فطرت سے گہرا تعلق ہے۔ مگر ہمارا مورخ ان اسباب و نتائج سے مطلق بحث نہیں کرتا تمام دنیا کی تاریخ پڑھ کر صرف دو گُر اس کے ہاتھ آئے ہیں اور اس کے "فلسفۂ تاریخ" کی کُل کائنات یہی ہے :-

(۱) ایک تو یہ کہ جس بادشاہ یا قوم نے غرور کیا وہ مغلوب و سرنگوں ہوئے بغیر نہ رہا اور "مدبّرِ حقیقی" نے ضرور اسے سزا دی (۲) اور دوسرے یہ کہ ایشیا اور یورپ میں قرن ہائے دراز سے دشمنی چلی آتی ہے اور یوں ہی مدتوں چلی جائے گی اور (ہیرودوتس کے زمانہ تک) مغرب و مشرق کی اس دائمی عداوت کا آخری مظاہرہ وہ فوج کشی تھی جو زرکسیز (زرکسیز) شاہِ ایران نے یونانیوں پر کی۔ اور اس بادشاہ کی شکست و ذلت پہلے کلیے کی عبرتناک مثال ہے جسے بار بار بیان کرنے سے ہمارا مورخ کبھی نہیں تھکتا۔

توسی دید
[illegible] تا [illegible] ق م

خلاصہ یہ کہ ہیرودوتس نے درایت کا حق بخوبی ادا نہیں کیا۔ البتہ آنے والوں کے واسطے واقعات و قصص کا اتنا ذخیرہ جمع کر دیا ہے کہ وہ چاہیں تو اُن پر غور و خوض کر کے خود بہت سے نتائج استنباط کر سکتے ہیں۔ بایں ہمہ مطالعہ کرنے والوں کا اس میں بہت نقصان ہے کہ خود وہ مصنف جس نے واقعات کو جمع کیا بلکہ دیکھا ہے اُن کے اسباب و علل پر بالکل بحث نہ کرے اور معلوم ہوتا ہے کہ اسی نکتے کو سب سے اوّل ہیرودوتس کے نوجوان ہم عصر توسی دی دیس (توسی دیدش۔ توسی دِدیز یا توسی ڈائی ڈیز) نے سمجھا اور اپنی تاریخ "جنگ پلوپی نسس" میں واقعات کو صرف بیان کر دینے پر اکتفا نہ کی بلکہ اوّل اُن کی جانچ پرتال کی اور پھر ان کی ابتدائی وجوہ کا سُراغ لگایا اور آخر میں ان سے اخلاقی اور سیاسی نتائج کا استنباط کیا۔ یہی سبب ہے کہ اگر ہیرودوتس کو فن تاریخ نگاری کا بانی کہا جائے تو "فلسفۂ تاریخ" کا موجد توسی دی دیس کو ماننا ہوگا۔ حقیقت میں وہ پہلا شخص ہے جو تاریخ نویسی کے فوائد اور مقاصد کو سمجھا اور جس قدر واقعات کی تحقیق میں اس نے محنت کی اُسی قدر اس بات کا لحاظ رکھا کہ اُن کے بیان

کرنے میں بھی مؤرخ کے ذاتی تعصب ومیلان کا دخل نہ ہونے پائے۔

اس قابلِ تقلید وستایش اصول کی پابندی کرنے میں اُسے ایک آسانی حاصل تھی جس پر یورپ کے بعض نقادوں کی نظر نہیں پڑی یعنی یہ کہ وہ کسی غیر قوم کی تاریخ نہیں لکھ رہا تھا بلکہ اس کا موضوع صرف یونانیوں کی باہمی جنگ وجدال تھا۔ یہ سچ کہ اُن دنوں یونان کے شہروں نے اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں الگ بنا رکھی تھیں اور ہر شہر کے رہنے والے اپنے تیئں سب سے جداگانہ ایک خاص "قوم" تصور کرتے تھے۔ مگر قبائلِ عرب کے اختلافات کی طرح یہ نہایت حقیر ومصنوعی اختلاف تھا ورنہ نسل ومذہب اور زبان ومعاشرت کے اعتبار سے وہ سب "ہلینز" یا "یونانی" کہلاتے تھے اور اگر کسی روشن خیال مؤرخ نے ان کے اندرونی اور فرعی اختلاف کو نظر انداز کردیا تو یہ چنداں حیرت انگیز نہیں۔ دوسرے اسی جنگ پلوپنی سس کے دَوران میں توسی دید کو ترکِ وطن کرنا پڑا تھا اور اُس کے آیندہ بیس برس بیشتر اپنے وطن (یعنی ایتھینز) کے دشمنوں ہی میں گزرے۔ پس اتنی مدت میں اگر اپنے شہر کی محبت یا حریف سے تعصب کا جوش کم ہوگیا ہو تو یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے۔

اس کی کتاب کے تین حصے اور آٹھ مقالات ہیں۔ آخری مقالے کو وہ ختم کرنے نہیں پایا اور اس اعتبار سے کتاب گویا ناتمام رہی۔ بایں ہمہ جنگ پلوپنی سس کی بڑی بڑی لڑائیوں کا ذکر کتاب میں موجود ہے اور مؤرخ کو بزم ورزم کے بہت سے یادگار مناظر دکھانے کا موقع حاصل ہے اور انھیں میں بعض عبرت وریخ کے واقعات لکھنے میں توسی دید نے انشا پردازی کا حق ادا کردیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا طرز تحریر اکثر مقامات پر پیچیدہ اور غیر مربوط ہوجاتا ہے لیکن اصلی کمال یہ ہے کہ واقعات تاریخی سے فلسفیانہ نتائج اخذ کرتا ہے اور خود واقعات کو اس خوبی سے بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والوں کے سامنے اس عہد کے یونانیوں کی دماغی حالت اور دلی خیالات کا مُرقع آجاتا ہے۔ اس غرض کے لئے مؤرخ نے "حدیث دیگراں" کا طریقہ اختیار کیا ہے اور مختلف اشخاص کی طرف سے فرضی تقریریں لکھی ہیں جن میں کہیں کہیں وہ قوت وشان پیدا ہوجاتی ہے کہ عصرِ جدید کے بعض مغربی انشا پرداز اُن کو اپنا نمونہ تحریر بناتے ہیں۔

زِنوفن
۴۳۱ تا ۳۵۵ ق م

مگر یورپ میں ان دونوں مؤرخوں سے زیادہ قبولیت جن یونانی مصنفوں کو حاصل ہوئی وہ زِنوفن اور افلاطون ہیں۔ یہ دونوں حکیم سقراط کے شاگرد تھے اور اپنی اپنی جگہ اس کی تعلیم کو پھیلانے کی سعی کرتے رہے۔ لیکن افلاطون خود ایک مجتہد کی حیثیت رکھتا ہے اور اکثر اصول وعقائد جنھیں اس نے اپنے

اُستاد سے منسوب کر دیا ہی خود اُس کی فکرِ عالی کا نتیجہ ہیں۔ برخلاف اس کے سپاہی مزاج زنوفن اپنے اُستاد کا عقیدتمند مقلد ہو اور اپنی تصانیف یا عملی زندگی میں اُس کی تعلیم سے مطلق تجاوز کرنا نہیں چاہتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی کتاب "تذکرہ قراط" (Recollections of Socrates) حکیم موصوف کے اقوال و سوانح کی نہایت کارآمد یادگار ہے اور تاریخی اعتبار سے حکیم افلاطوں کی تحریروں کی نسبت کچھ کم باوقعت نہیں سمجھی جاتی۔ اگرچہ بعض مقامات پر یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا پرجوش مصنف اپنے اُستاد کا ٹھیک ٹھیک مطلب ہی نہیں سمجھا۔ بہرحال اسے اپنے اُستاد سے اتنی محبت تھی کہ جب اس پر مقدمہ چلایا گیا اور سزائے موت ملی (۳۹۹ ق م) تو زنوفن اپنے وطن ایتھینز کو چھوڑ کر چلا گیا اور اسپارٹہ کے بادشاہ اَجسی لاؤس کی ملازمت اختیار کر لی۔ اس کے بدلے میں اہلِ ایتھینز نے اس کو سرکاری طور پر جلاوطن کر دیا اور اُس کی باقی عمر دشمنانِ وطن یعنی اہلِ اسپارٹہ ہی میں بسر ہوئی۔

زنوفن کی سب سے مشہور کتاب "اناباسیس" ہے جو یورپ کے اکثر مدارس میں پڑھائی جاتی تھی۔ اسے ایک سپاہی کا فوجی سفرنامہ سمجھنا چاہیئے جس میں اس نے دریائے دجلہ تک جانے اور وہاں سے واپس آنے کے حالات لکھے ہیں۔ واضح ہو کہ جب ایرانی شہزادی کا رُوس (یا سیروس) نے اپنے بڑے بھائی اردشیر ثانی پر فوج کشی کی تو ایشیائے کوچک میں تقریباً ۱۲ ہزار یونانی سپاہی بھی فراہم کئے اور ان پر اس کو بہت بھروسہ تھا۔ لیکن بابل کے قریب موضع کُناکسا کی لڑائی میں یہ شہزادہ مارا گیا (۴۰۱ ق م) اور اس کی تمام فوج نے شاہ ایران کی اطاعت قبول کر لی۔ مگر یونانی اجیر سپاہی اس امر پر کسی طرح آمادہ نہ ہوئے اور اُنھیں ایرانیوں کے علی الرغم وطن واپس آنا پڑا۔ اُس "پسپائی" میں اُن کو بڑی بڑی زحمتیں پیش آئیں جن کا زنوفن نے تفصیل سے ذکر کیا ہی۔

مؤرخوں کا قول ہی کہ زنوفن کی اس کتاب نے سلطنت ایران کی اندرونی کمزوری کو اہلِ یونان پر منکشف کر دیا اور اس کی وجہ سے فیلقوس اور اسکندر مقدونی کو خاص ایران فتح کرنے کی جسارت ہوئی ورنہ اس سے پہلے ایران کے نام سے یونانیوں کو دہشت ہوتی تھی۔ مگر ان اثرات سے قطع نظر مصنف نے اس کتاب میں جس خوبی سے اپنے کوچ کے حالات بیان کئے ہیں وہ انشا پردازی کا بہت عمدہ نمونہ ہی اور انجمن ترقی اُردو کو جب موقع مل سکے اس قدیم نثر کا عکس دکھانے کے لئے "اناباسیس" کے ساتوں یا کم سے کم آخری چار مقالات کا اپنی زبان میں ترجمہ کرا لینا چاہیئے۔

دو اور تاریخی کتابیں بھی زنوفن کی یادگار ہیں، گر وہ چنداں باوقعت نہیں، البتہ اس کے رسائل یا مضامین اپنی

وضع کی پہلی چیز ہیں۔کسی خاص عنوان پر جامع و مانع مختصر مضمون لکھنا حقیقت میں مستقل کتاب لکھنے سے کم دشوار نہیں۔
اور زنوفن پہلا شخص ہے جس نے اسپارٹہ کے نظام حکومت، شہ سواری، شکار وغیرہ مختلف عنوانوں پر اس قسم کے مضامین
لکھے۔ اس لئے وہ تحریریں بجائے خود اعلیٰ درجہ کی ہوں یا نہ ہوں۔ زنوفن کا یہ فخر کچھ کم نہیں کہ "نثر کا سب سے پہلا
مضمون نگار" اسی کو مانا جاتا ہے۔

افلاطون | اگر نثر یونانی کے یہ تمام نمونے، حکیم **افلاطون** کی انشاپردازی کے سامنے ہیچ ہوگئے اور بعد میں بھی
یورپ نے بہت کم انشا پرداز ایسے پیدا کئے جو حسنِ بیان میں سقراط کے اس نامور شاگرد کے مقابل سمجھے گئے ہوں۔

افلاطون ایتھنیز کے نہایت شریف النسب لوگوں میں شمار ہوتا ہے اور انتیس برس کی عمر سے حکیم سقراط کا پیرو ہو گیا
تھا۔ اپنے اُستاد کے مارے جانے کے بعد کچھ عرصہ وہ مصر و سقالیہ وغیرہ کی سیاحت کرتا رہا اور پھر غالباً ۳۸۶ ق م سے
اس نے اپنے گھر کے قریب ایک باغ میں درس دینا شروع کیا۔ اس باغ کا نام "اکادمی" (Academy) تھا جو افلاطون
کے حلقۂ درس کی بدولت آج بھی یورپ کی ہر زبان میں "علمی مجلس" کے معنی رکھتا ہے۔

افلاطون کا تمام فلسفۂ اخلاق "نظریۂ مثال" پر مبنی ہے یعنی وہ عالم اجسام اور اس کی ہر چیز کو ایک خیالی عالم یا
عالمِ مثال کا عکس مانتا ہے اور اگر انسان جسمانی خواہشوں کی پیروی میں منہمک نہ رہے اور تا امکان مکروہات دنیوی سے
الگ ہو کر غور و فکر سے کام لے تو خیال کی رسائی اس عالمِ مثال تک ہو سکتی ہے۔ بلکہ روحِ انسانی خود اس عالم تک پہنچنے
کی مشتاق رہتی ہے لیکن اس کا یہ قدرتی ولولہ (اُروس = جذبۂ محبت) عمدہ تعلیم و تربیت کے بغیر قایم نہیں رہتا اور اسی لئے
افلاطون کے نزدیک اربابِ حکومت کا سب سے مقدم فرض یہ ہے کہ اپنی رعایا کی بہترین تعلیم و تربیت کا انتظام کریں اور ہر
ایسی شے کو جو اس روحانی ولولے کی بگاڑنے والی ہو، اپنی حدودِ حکومت سے خارج کر دیں۔ نظر برایں خود حکومت اُنہی اشخاص
کے ہاتھوں میں ہونی چاہیئے جن میں عالمِ مثال کی پاک و کامل اشیا تک رسائی کا شوق اوروں سے زیادہ یا بیش از بیش موجود ہو
اس قسم کی حکومت اور آئینِ حکومت ہیں جن کا خاکہ اُس نے اپنی مشہور کتاب "حکومتِ جمہوری" (Republio) اور
"نوامیس" (Laws) میں کھینچا ہے۔

لیکن افلاطون کی انشا پردازی کا اصلی کمال وہ طریقِ مکالمہ ہے جسے اُس نے اظہارِ خیالات کے لئے اپنے اُستاد
حکیم سقراط کی تقلید میں اختیار کیا تھا۔ سقراط زبانی سوال جواب کے ذریعے مخاطب کو آہستہ آہستہ اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش

کیا کرتا تھا اور اس قسم کی مکالمت کے بعض تحریری نمونے بھی یونانی زبان میں پہلے سے موجود تھے[1] لیکن افلاطون نے اس طرزِ تحریر میں جو لطف و دلکشی پیدا کی وہ یونانی زبان میں نہ کبھی پہلے نظر آئی تھی نہ اس کے بعد پیدا ہوئی۔ عمدہ نظم و نثر کے علاوہ اُس وقت یونان میں ناٹک نویسی کا فن اوجِ کمال کو پہنچ گیا تھا اور وہاں کے جادو بیان خطیبوں نے اپنی تحریری تقریروں سے علم ادب کا ایک نیا شعبہ تیار کر دیا تھا۔ مگر حکیم افلاطون کی تحریر اظہارِ خیالات کی ان چاروں صورتوں کا عطر ہے۔ ان چاروں کے بہترین عناصر کا جلوہ اس میں نظر آتا ہے اور وہ خود سب سے ممتاز انشا پردازی کا نیا نمونہ ہے۔ یونانی علم ادب کا مشہور نقاد پروفسر جبب اس کی طرزِ تحریر کے متعلق لکھتے ہیں کہ "وہ نظم و نثر کے بین بین حسنِ بیان اور شستگی کا مکمل نمونہ ہے اسی کے ساتھ اُس کی تحریر میں کہیں کہیں وہ رفعت و بلند خیالی آجاتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے لکھنے والا حقیقت میں کسی دوسرے عالم پر نظر جمائے ہوئے ہے اور وہاں کے عجیب مناظر کا حال سُنا رہا ہے۔ ۔ ۔ ذاتِ واجب الوجود کی نسبت جو کچھ افلاطون نے لکھا ہے، خدا کا اس سے بہتر و لطیف تر تصور کسی بُت پرست کی تحریر میں نہیں مل سکتا۔ ۔ ۔"

افلاطون کے مکالمات کی کُل تعداد ۴۲ ہے مگر ان میں سے تحقیق طور پر صرف ۲۴، ۲۵ خود اُس کے لکھے ہوئے ہیں اور ان میں بھی سب سے اچھے رسالے وہ ہیں جو اس نے عمر کے آخری حصے میں تصنیف کئے تھے جیسے "حکومت جمہوری"، "نوامیس"، "تی میوس"، "کرِی تیاس"، جن میں بعد کا فلسفہ اور اُس کے وہ استقرائی نتائج درج ہیں جو پہلے رسالوں میں نہیں تھے یا مبہم تھے۔ افلاطون کی انشا پردازی کی جان یہی رسالے ہیں۔ انھیں میں اس کی قوتِ مناظرہ قدرتِ کلام اور شاعرانہ بلند خیالی کے جلوے نظر آتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ ان تحریروں میں کہیں بھی وہ سلاست و سادگی اور متانتِ بیان کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ افسوس ہے کہ ہماری زبان میں یورپ کے اس بے مثل نثار کی کسی کتاب کا عمدہ ترجمہ موجود نہیں[2]۔ مشنری لوگوں نے یا پنجاب کے بعض حضرات نے کسی کسی کتاب کا ترجمہ کیا بھی ہے تو وہ بہت ناقص ہے اور اس لیے مقبول نہ ہوا۔ حالاں کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اُردو زبان کا کوئی نثار جو صحیح معنی میں شاعرانہ طبیعت رکھتا ہو ایک عرصہ تک افلاطون کی تصنیفات کا مطالعہ کر کے انھیں نہایت سلیس اُردو میں ترجمہ کرے۔ سب مکالمات کا ترجمہ نہ ہو سکے تو آخری زمانہ کے مشہور مکالمات ہی کا ترجمہ کافی ہے جن پر جا بجا حاشیہ لکھ کر انھیں بالکل عام فہم اور دلچسپ بنایا جا سکتا

---

[1] افلاطون سے کچھ عرصہ پہلے خود اس کے اُستاد بھائی (الکسامنوس) نے اور نیز بعض اور فلسفیوں نے اس قسم کے مکالمات لکھے تھے مگر وہ مشہور و مقبول نہ ہوئے۔

[2] افلاطون کی ریپبلک (جمہوریہ) کا ترجمہ انجمن ترقی اُردو کرا رہی ہے (اڈیٹر)

ہے تاکہ اُردو نثر پر آیندہ اس تحریر کا اثر پڑے۔ باقی افلاطون کے تمام فلسفے کو اُردو میں منتقل کرنا اور اس کی ابتدا اور بعد کے تغیرات پر تاریخی نظر ڈالنا تو ایک عمر کا کام ہے اور اس کے واسطے جس قابلیت اور فراغت کی ضرورت ہے وہ بھی ہمارے ملک میں میسّر آنی دشوار ہے۔

ارسطو — اسے افلاطون کی خوش نصیبی کہئے کہ وہ جیسے نامور اُستاد کا شاگرد تھا ویسے ہی نامور شاگرد کا اُستاد بھی ہے۔ ارسطو اس کے شہر کا رہنے والا نہ تھا۔ لیکن سترہ برس کی عمر سے ایتھنز بھیجا گیا اور افلاطون کی وفات تک اس کے مدرسے میں داخل رہا۔ افلاطون اُسے اپنے مدرسہ کی "روح" کہا کرتا تھا لیکن افلاطون کی وفات کے بعد اُس کا بھتیجا اکاڈمی کا صدر معلم مقرر ہوا اور حکیم ارسطو پانچ سال اِدھر اُدھر پھرنے کے بعد مقدونیہ چلا آیا جہاں شاہ **فیلقوس** (فلپ) نے اپنے ہونہار لڑکے **سکندر** (اعظم) کی تعلیم و تربیت اس کے سپرد کی (۳۴۲ ق م) جب سکندر تخت نشین ہوا تو ارسطو پھر یونان کے علمی مرکز ایتھنز میں آ گیا اور مرتے دم تک یہیں درس و تصنیف میں مشغول رہا۔ اُس کا مدرسہ "لی سیئم" میں تھا اور وہاں مشی کے واسطے غلام گردشیں بنی ہوئی تھیں۔ مشی کی ایسی جگہ کو یونانی میں "پری پَتوس" کہتے تھے اور اسی مناسبت سے مدرسہ کا نام "پری پت تیک" یعنی "مدرسہ مشائیں" مشہور ہو گیا۔

ہمیں یہاں ارسطو کے فلسفے سے بحث کرنی نہیں ہے بلکہ یہ بات بتانی ہے کہ یونانی علم ادب کا پہلا دَور اس پر ختم ہوتا ہے اور وہی دوسرے دَور کا آغاز کرنے والا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ نثر یونانی کو نظم اور شاعری کے اثر سے قطعاً آزاد کرنے والا اور تحریری زبان میں غیر معمولی وسعت اور علمی شان پیدا کرنے والا وہی ہے۔ بے شبہ اُس کے اُستاد کے مکالمات میں ہر قسم کی علمی بحثیں موجود ہیں لیکن خاص کوئی علم ان کا موضوع نہیں۔ بلکہ وہ محض عام اخلاقی اصول اور فلسفیانہ کلّیات کو ثابت کرنا چاہتا ہے۔ برخلاف اس کے ارسطو نے جو کچھ لکھا وہ خالص علمی تصانیف ہیں اور مختلف علوم ان کا موضوع ہیں۔ درحقیقت اس نے اپنے زمانہ تک کی تمام علمی تحقیقات کو جمع کیا ہے اور اُن کی تین بڑی بڑی قسمیں کر دی ہیں۔ منطق[1]۔ اخلاق[2] (Ethics) اور سیاستِ[3] مدن (Politics) اور ان میں **منطق** یعنی "علم بحث و استدلال" کی ایجاد و تدوین کا فخر اس کو حاصل ہے۔

ایسے شخص کی تحریر میں جس کا ادبی نصب العین اتنا بلند و وسیع ہو، جس قدر جامعیت پائی جائے کم ہے۔ دوسرے ارسطو غیر معمولی دماغ کا شخص تھا اور ایسے حکیمانہ دماغ کا نتیجۂ فکر بھی نہایت عمیق و غامض ہوگا۔ کیوں کہ وہ جس مسئلے پر بحث

کرتا ہے اس کے ہر ممکن پہلو تک اس کی نظر گھس جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ارسطو کی تحریر نہایت دقیق و پُرمعنی ہوتی ہے اور سطحی دماغ کا شخص اس کے مطالب کا پوری طرح احاطہ نہیں کر سکتا۔ لیکن ہمارے۔لئے اُس کی تصانیف میں ایک نہایت مفید سبق مضمر ہے اور وہ یہ کہ زبان انسان کے قوائے دماغی کے تابع ہوتی ہے اور ہر قسم کے مضامین کے واسطے جو دماغ میں پیدا ہوتے ہیں، الفاظ کے نئے معنی اور نیا پیرایۂ بیان نکل آتا ہے۔ بشرطیکہ مضمون یا خیال صاف طور پر ذہن میں آگیا ہو بعض اہل فکر نے لکھا ہے کہ دماغ میں کوئی خیال ہی نہیں آسکتا جب تک اس کے لئے دماغ اور زبان میں پہلے سے لفظ موجود نہ ہوں۔ لیکن یہ نظریہ عوام الناس کے لئے صحیح مانا جا سکتا ہے ورنہ جو اہل علم نئے انکشافات و مشاہدات کرتے ہیں، یا عالم خیال کی پہلی سرحدوں سے آگے نکل جانے کی قوت رکھتے ہیں وہ کسی طرح اس کلئے کے ماتحت نہیں آسکتے۔

القصہ حکیم ارسطو ہی وہ شخص ہے جس نے "علمی نثر" کی بنیاد رکھی اور خاص خاص الفاظ کے معنی معین کئے، چنانچہ بہت سی علمی اصطلاحات آج تک عربی اور مغربی زبانوں میں اسی یونانی معلم کی یادگار موجود ہیں، اور گو اس کی تصانیف عرصہ تک اپنی قوم و ملک میں شہرت نہ پا سکیں لیکن اس کے شاگردوں نے ان سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا اور یونانی زبان میں خالص علمی تصانیف کا ایک نیا میدان کھل گیا۔ (باقی آیندہ)

مقدمۂ نکات الشعرا

جناب مولوی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی صدر الصدور امور مذہبی سرکار عالی

بزمِ سخن میں میر صاحب کی میرِ مجلسی مسلّم ہے۔ ع

آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

اُن کے بہتّر نشتر اب تک ہزاروں دلوں میں چبھ رہے ہیں۔ ع

سامان صد ہزار نمکدان کئے ہوئے

لیکن بہت ہی کم نگاہیں ہیں جنھوں نے میر صاحب کی انشا پردازی یا وقائع نگاری کا کوئی نمونہ دیکھا ہوگا۔ انجمن ترقی اُردو کا ہم کو ممنون ہونا چاہیے کہ اُس کی کوشش سے میر تقی صاحب میرؔ اکبر آبادی کا تذکرہ نکات الشعرا شائع ہوتا ہے۔ عام طور پر ابتداءً اس تذکرہ کا علم تذکرۂ "آبحیات" کے ذریعہ سے ہوا تھا۔ مگر نکات الشعرا کا جو چہرہ آبحیات میں نظر آتا ہے وہ اُن خط وخال کے بالکل برعکس ہے جو اب ہماری سامنے ہیں۔ اس کی بحث آگے ملاحظہ ہوگی۔

نکات الشعرا چھوٹی تقطیع کے ۱۰۰ صفحوں کا ایک مختصر سا رسالہ ہے۔ مگر چوں کہ ایک اُستادِ فن کی تصنیف ہے اس لئے ادبی۔ تاریخی اور معاشرتی معلومات اور فوائد سے مالا مال ہے۔ اس میں ایک سَو دو شعرا کا تذکرہ ہے جن میں بتیس دکنی و گجراتی ہیں۔ میر صاحب دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ اب تک شعرائے ریختہ کا کوئی تذکرہ نہیں لکھا گیا۔ اس بیان کے مطابق نکات الشعرا اُردو شعرا کا پہلا تذکرہ ہے۔ اُس زمانہ کے رواج کے مطابق یہ تذکرہ بھی زبانِ فارسی میں لکھا گیا ہے۔ اُس کا عہدِ تصنیف احمد شاہ بادشاہ دہلی کا زمانہ ہے۔ میر صاحب کے عہدِ شباب کی تالیف ہے جب کہ وہ دہلی میں تازہ وارد تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں "مولف این نسخہ متوطن اکبر آباد است بسبب گردش لیل ونہار از چندے در شاہجہان آباد دست"۔ اندازِ بیان کہہ رہا ہے کہ وطن کی یاد بھولی نہ تھی۔

مؤلف تذکرہ | اس تذکرے کی مدد سے میر صاحب کے جن حالات اور اوصاف پر روشنی پڑتی ہے اوّل اُن کا لکھنا خالی از دلچسپی

نہ ہوگا۔ میر صاحب آگرہ کے باشندے تھے اور خان آرزو کے تربیت یافتہ شاگرد۔ چنانچہ ایک موقع پر اُن کی نسبت لکھتے ہیں "اُستاد و پیر مرشد بندہ است" تحصیلِ علمی کا حال واضح نہیں ہوتا۔ مگر تذکرہ" شاہد ہے کہ فارسی میں استعداد کامل تھی اور اُستاد کی تربیت کا پورا فیض حاصل کیا تھا۔ بعض جگہ عربی کے فقرے بھی استعمال کئے ہیں مثلاً طابق النعل بالنعل"۔

آگرہ سے دلّی آئے اور خواجہ میر درد قدس سرہٗ اور اُن کے والدِ ماجد خواجہ ناصر صاحب عندلیب کے یہاں آنے جانے لگے۔ اُن کے یہاں اُردو مشاعرہ ہر مہینہ کی پندرھویں تاریخ کو ہوا کرتا تھا۔ میر صاحب اُس میں بھی شریک ہونے لگے خواجہ صاحب اندازِ طبیعت دیکھکر فرماتے "میر محمد تقی۔ تو میرِ مجلس خواہی شد"۔ میر صاحب کا عقیدہ ہے کہ اُن کا کمالِ سخن دعائے "درد" کے اثر کا منت کش ہے۔ اتفاقاتِ زمانہ سے مشاعرہ کا سلسلہ خواجہ صاحب کے یہاں درہم برہم ہوگیا تو انھوں نے میر صاحب سے فرمایا کہ اپنے یہاں مشاعرہ کیا کرو۔ چنانچہ اس ارشاد کی تعمیل میں ہر مہینہ کی پندرھویں تاریخ کو میر صاحب کے مکان پر مشاعرہ ہونے لگا۔ خواجہ صاحب بھی شرکت فرماتے۔ میر صاحب خواجہ صاحب کے حال میں لکھتے ہیں مجلسِ ریختہ کہ بخانۂ بندہ بتاریخ پانزدہم ہر ماہ مقرر ست واللہ بذاتِ ہمیں بزرگ ست"۔ میر صاحب ایک مرتبہ سرہند بھی گئے تھے۔ اور وہاں انعام اللہ یقین کے دادا سے ملے تھے۔ اُن کے اخلاق و تواضع کی تعریف لکھی ہے۔

میر صاحب کے اوصاف | نکات الشعرا کو غور سے پڑھنے کے بعد پورا یقین ہوجاتا ہے کہ میر صاحب نہایت پاک مشرب مؤدب و مہذب۔ زندہ دل۔ یار باش۔ انصاف پسند اور منکسر المزاج انسان تھے۔ دوستی کے مراتب اُن کے دستور العمل میں بہت وضاحت اور صفائی سے درج تھے۔ ہر موقع پر اس کی تصریح لازم ہے۔ بے تحقیق کسی بات کا لکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بیان ہائے ذیل پر غور کریں صفاتِ بالا عیاں ہونگے۔

پاک مشربی | خواجہ میر ناصر صاحب عندلیب کو ان الفاظ سے یاد کیا ہے "حضرت خواجہ ناصر صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کہ مقتدائے عالم ست"۔ خواجہ میر درد صاحب کی نسبت ان سے بھی زیادہ پاک الفاظ استعمال کئے ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو"۔ ایامے کہ فقیر بخدمتِ آں بزرگ وار شرف اندوز مے شد از زبان مبارک خود فرمود۔ "میر تقی میر۔ تو میرِ مجلس خواہی شد"۔ الحمد للہ والمنۃ کہ حرف آں سرِ سلسلۂ خدا پرستان مؤثر اُفتاد۔ باطن آں حضرت قبلۂ اہل عرفاں کہ از ظاہر ظاہر ترست زود کار کرد۔ مجلس ریختہ کہ بخانۂ بندہ بتاریخ پانزدہم ہر ماہ مقرر ست واللہ بذاتِ ہمیں بزرگ ست"۔ حضرت میرزا مظہر قدس سرہٗ کی نسبت لکھا ہے "سر دلیست مقدس۔ مظہر۔ درویش۔ عالم۔ صاحب کمال۔ شہرۂ عالم۔ بے نظیر۔ معزز۔ مکرم ..... اکثر اوقات

دریا وا آبی صرف میکند۔ خوش تقریر مرتبہ ایست کہ درتحریر نگنجد" چند نمونے اور ملاحظہ کیجئے (میاں شرف الدین کے حال میں) "از احفادِ حضرت شیخ فرید شکر گنج بود۔ نور اللہ مرقدہٗ" (شاہ مبارک آبرو کے حال میں) "بنیسہ حضرت غوث گوالیاری است۔ نور اللہ مرقدہٗ" "درعرس سید حسن رسول نما صاحب قدس سرہٗ العزیز" "حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ" "حضرت حافظ۔ قدس سرہ العزیز"

ادب وتہذیب | معاصرین کا ذکر عموماً ادب اور محبت سے کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو میرزا سودا "جوانیست خوش خلق و خوش خوئے گرمجوش۔ یار باش شگفتہ روئے.......غزل و قصیدہ و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی ہمہ را خوب میگوید۔ سرآمد شعرائے ہندی اوست بسیار خوش گوست چنانچہ ملک الشعرائے ریختہ او را شاید۔ اکثر اتفاقِ طرح غزل باہم می افتد۔ غرض از مغتنماتِ روزگار ست" میجا اکبر آبادی "بسیار آدمی خوبیست۔ سخن او بپایۂ اُستادی رسیدہ۔ ہر بیت خفیفش بر جگر نشتر زدہ" کرم اللہ خاں درد "بسیار خوش فکر و عاشقِ سخن۔ خالی از دردمندی نیست۔ خوب میگوید و خوب می فہمد......مرد خوش صحبت غداش زندہ دارد" میرحسن "جوان اہلبیت نوکر پیشہ۔ اکثر در بندہ خانہ بہ تقریبِ مجلس تشریف می آرد۔ وضع مرد آدمیانہ دارد" شاگردوں کو اس طرح یاد کیا ہے "میر عبد الرسول نثار از یاران فقیر مؤلف ست۔ چنانچہ شعر بمشورت من میسگوید۔ سید نجیب۔ جوان سعادت مند" محمد محسن (میر صاحب ...... کے بھتیجے بھی ہیں) "مصرعۂ ریختہ بمشورتِ من موزوں میکند۔ خوب خواہد گفت۔ انشا اللہ تعالیٰ" کسی جگہ شاگرد کو شاگرد نہیں لکھا بلکہ ہر جگہ دوست ہی لکھا ہے۔ بعض ایسے شعرا کا بھی ذکر ہے جو پہلے ان کے شاگرد تھے پھر دوسرے اُستادوں کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوگئے۔ ظاہر ہے کہ یہ برہمی کی ایک خاص صورت ہے۔ مگر میر صاحب اس پر بھی بد دماغ نہیں ہوتے نہ شکوہ کرتے ہیں۔ دیکھو بندرابن راقم کا ذکر فرماتے ہیں۔ "از شاہجہاں آباد ست۔ مشقِ سخن میرزا رفیع میکند۔ قبل ازیں با فقیر نیز مشورت شعر میکرد" اس کے بعد راقم کے بہت سے اشعار انتخاب کئے ہیں۔

تحقیق | نکات الشعرا گرچہ ایک شعرا کا تذکرہ ہے کوئی تاریخی کتاب نہیں ہے۔ تاہم میر صاحب نے یہ التزام کیا ہے کہ جو واقعہ تحقیق نہ ہوا اُس کو نہ لکھیں یا (اگر کسی وجہ سے لکھیں تو) اُس کا غیر محقق ہونا ظاہر کر دیں۔ جن شعرا کا حال معلوم نہ تھا وہاں صاف لکھ دیا ہے کہ اُن کا حال ہم کو معلوم نہیں۔ ولی دکنی کی بابتہ لکھا ہے "واحوالش کما ینبغی معلوم من نیست" دردمند کے حال میں لکھتے ہیں۔ "ہر چند کہ یک ملاقات با او کردہ ام لیکن خوب از احوالش مطلع نیستم" میرزا بیدل

عظیم آبادی کے ذکر میں لکھا ہے۔ "ریختہ بنام او شنیدہ می شود شاید بہ تقریبے گفتہ باشد" اسی طرح مرزا معز فطرت کے اُردو شعر کی نسبت لکھتے ہیں "ہمچو مسموع ست کہ ایں شعر ریختہ شاعر مرقوم گشتہ۔ واللہ اعلم" اسی کے ساتھ امیر خسرو کے کلام ریختہ کی بابتہ فرماتے ہیں "اشعار ریختہ آں بزرگ بسیار دارد۔ دریں خود تردد سے نیست" اس سے صاف ظاہر ہے کہ میر صاحب کے زمانہ تک امیر خسرو کا کلام ریختہ بہت ملتا تھا۔ افسوس ہے کہ اس زمانہ میں باوجود تلاش نواب حاجی محمد اسحٰق خاں صاحب مرحوم اُس کے حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

انکسارِ مزاج | تمام تذکرہ میں ایک لفظ بھی میر صاحب کے قلم سے ایسا نہیں نکلا جس سے اُن کی خود بینی و خود پسندی یا ید دماغی اور تعلّی عیاں ہو۔ برخلاف اس کے اپنا ذکر ہر جگہ منکسرانہ لہجے میں کیا ہے۔ اپنے آپ کو "بندہ۔ فقیر۔ احقر۔ عاجز ترین خلائق ہیچمدان" کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ اپنا ذکر جہاں لکھا ہے یوں لکھا ہے "فقیر حقیر میر محمد تقی میر مؤلف ایں نسخہ متوطن اکبر آباد ست" اپنے تذکرہ کو "مزخرفات" کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ تبسّم کے حال میں کہتے ہیں "پیشتر از نوشتنِ ایں مزخرفات آوازۂ او شنیدہ بودم" دوسروں کا ذکر جس تہذیب و ادب سے کیا ہے اُس کو آپ دیکھ چکے۔ اس انکسار اور ادب کی کیفیت دیکھکر ایک خاص اثر دل پر میر صاحب کے اوصاف کا پڑتا ہے۔

میر صاحب کے اعتراض کا انداز بھی دیکھ لو۔ شیخ حاتم کا ایک مصرع ہے۔ ع

یاد کر سبز رُویاں کو وہ اب پیتا ہے بھنگ

میر صاحب اس کی نسبت لکھتے ہیں "در لفظ سبز رُویاں تامل کردن ضرورست زیرا کہ آشنائے گوشِ ایں ہیچمدان نیست"

بے لاگ رائیں اور انصاف | باوجود اس تہذیب اور انکسار کے جہاں بلحاظ وقائع نگاری ردّ و قدح ضروری تھی وہاں بے لاگ رائے ظاہر کی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ انصاف کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ دونوں کے نمونے ملاحظہ فرمائیے۔ خاکسار کے حال میں لکھا ہے "شعر ریختہ میگوید۔ و خود را دُور میکشد و بسیار بدقلگی میکند بلکہ از ننگ آبی بنائے ریختہ را آب رسانیدہ" ثاقب کی نسبت "در ہمہ چیز دست دارد و ہیچ نمی داند" شیخ حاتم کی نسبت "مردیست جاہل و متمکن و مقطع وضع و بیرآشنا۔ غنا ندارد۔ دریافتہ می شود کہ ایں رگِ کہن بسببِ شاعریست کہ ہمچو من دیگرے نیست یا وضع او ہمین ست۔ خوب ست مارا باینہا چہ کار۔ شعر بسیار دارد" انعام اللہ یقین کے متعلق "القصہ پر و پوچ چندے کہ یافتہ است کہ مادشما نیز توانیم یافت ایں قدر برخود چسپیدہ است کہ رعونتِ فرعون پیش او پشتِ دست بر زمیں میگذارد۔ بعد ملاقات ایں قدر خود معلوم شد کہ ذائقہ

شعر فہمی مطلق ندارد" اب انصاف ملاحظہ ہو۔ انھیں یقین کی بابت لکھتے ہیں کہ "در بزرگ زادگی و شرافت میاں یقین سخنے نیست" میر عبدالحی تاباں کی نسبت "ہر چند عرصۂ سخن او ہمیں در لفظہائے گل و بلبل تمام ست۔ امابسیار رنگیں میگفت" میر علی نقی کی بابت "در ایام گزشتہ دو سہ ماہ خانۂ خود مجلس ریختہ مقرر کردہ بود آخراز وضع اَوْباشانۂ او برہم خورد در بزرگ زادگیِ او شبہ نیست۔ بافقیر رابطۂ دلی دارد" مذکورۂ بالا رایوں پر غور کرو۔ عیب وصواب بلا کم وکاست لکھدیئے ہیں۔ عیب پر اعتراض ہی تو خوبی کا اعتراف۔ دلی دوستی بے لاگ رائے ظاہر کرنے سے مانع نہیں۔ اَوْباشانہ وضع۔ بزرگ زادگی۔ ربط دلی۔ ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر قایم ہی۔

کمال انصاف | میر سجاد کے ساتھ تعلقاتِ ذاتی تو یہ تھے کہ گو پہلے ملاقات تھی۔ مگر پھر نوبت یہ پہنچی کہ طرفین کی کشش سے ایک گونہ ربط رہ گیا۔ صاف یوں سمجھو کہ بگاڑ ہو گیا۔ وضعداری رہ گئی۔ باوجود اس کے دیکھو میر تقی کے پایہ کا شاعر سجاد کے ایک شعر پر بیخود ہی۔ ان ہی سجاد کے ایک شعر کی داد میر صاحب کے قلم سے اس جوشِ قدردانی کے ساتھ نکلی ہی شعر یہ ہے

عشق کی ناؤ پار کیا ہووے   جو یہ کشتی تری تو بس ڈوبی

داد ملاحظہ ہو" ہمہ شعر سبحان اللہ۔ لیکن فقیر را از دیدنِ ایں شعر تواجد دست می دہد۔ ازبسکہ از خواندنِ ایں شعر حظے برمیدارم میخواہم کہ بصد جا بنویسم" میزانِ عدل کے دونوں پلّوں کو یوں مساوی رکھنا جناب میر صاحب ہی کا حصہ ہے

آفریں بر دست و بر بازوئے تو

یہ "بے تہذیبی" کا زمانہ تھا۔ آج "تہذیب" کے زمانہ میں رائے کا جو عالم ہی اُس پر بھی ایک نگاہ ڈال کر مقابلہ کر لیجئے شاید نتیجہ مفید نکلے۔

دوستی کے مراتب | ہم میر صاحب ہی کے الفاظ ایک ترتیب کے ساتھ لکھے دیتے ہیں۔ دوستی کے مراتب اور اُن کا لحاظ خود بخود عیاں ہو جائے گا اور آپ کہہ اُٹھیں گے کہ عیاں را چہ بیاں (دردمند) "ہر چند کہ یک ملاقات باو کردہ ام" (ناجی) "باو یک دو ملاقات کردہ ام" (شاغل) "پیش بندہ ہم دو سہ مرتبہ آمدہ" (پیام) "بندہ اکثر ملاقات کردم" (شیخ محمد قایم) "با من ہم آشنائے بیگانہ است" (یقین) "با بندہ ہم آشنائیِ سرسری دارد" (میر علی نقی) "با فقیر ربطے دلی دارد" (شیخ چند بہار) "با فقیر ہم آشنا ست" (کلیم) "یک اخلاص تہ دلی دارم و اکثر بحال ایں ہیچمدان شفقت میفرماید" (میر عبدالحی تاباں) "با فقیر یک صفائے درست داشت۔ از چندے بسبب کم اختلاطی ایں ہیچمدان کدورتے درمیان آمدہ بود جلسش

مہلت نداد کہ تلافیش کردہ آید" (میاں سعادت علی) "با بندہ ربط بسیار داشت" (میاں حسن علی) "بندہ را بخدمت او ربط کلیست اکثر اتفاق ملاقات می افتد" (غریب) "یار دش بخیر۔ یک آشنائے با مزہ داشتم۔ بسیار خوش ظاہر بود" (سلام) "فقیر را با او از تہ دل اخلاص ست چنانچہ اکثر اوقات باہم فکر شعر کردن دگپ زدن و مزاح نمودن می افتد۔ بجوانی خوب ست۔ خدا زندہ دارد"

سلام سے یہ اخلاصِ دلی کیوں تھا۔ اس لئے کہ سلام کے اوصاف یہ تھے۔ "چوں یار باشے و مخاطب صحیح حقیقت جمعیت لیاقت شخصیت آدمیت حرمت عظمت ہمہ دارد" دیکھو اس مرتبہ کو صرف یہی ایک خوش قسمت فرد پہنچ سکا وہ بھی مجموعہ صفات بنکر۔ ذرا آج کل کے "میرے دوست" اور "دلی دوست" اور "پرانے دوست" کے الفاظ و معانی پر بھی غور کر لیجئے۔

اصلاحیں | میر صاحب نے جا بجا شعرا کے کلام کی نسبت لکھا ہے کہ اس شعر میں بجائے فلاں لفظ کے یہ لفظ ہوتا تو خوب ہوتا ان اصلاحوں سے میر صاحب کے مذاقِ صحیح اور مرتبہ استادی کا پتا لگتا ہے۔ میر سجاد کا ایک شعر ہے۔

کافر بتوں سے داد نہ چاہو کہ یاں کوئی   مرجا ستم سے ان کے تو کہتے ہیں حق ہوا

میر صاحب نے لکھا ہے کہ کافر کی جگہ باطل ہوتا تو اچھا تھا۔ حق و باطل کے مقابلہ نے شعر میں جان ڈال دی۔ ٹیک چند بہار کا ایک شعر ہے۔

تھی زلیخا مبتلا یوسف کی اور لیلیٰ کا قیس   یہ عجب مظہر ہے جس کے مبتلا ہیں مرد و زن

میر صاحب فرماتے ہیں اگر دوسرا مصرع یوں ہوتا تو خوب ہوتا ع

حسن کیا مظہر ہے جس کے مبتلا ہیں مرد و زن

ذوقِ سلیم محسوس کرے گا کہ اب مصرعہ کس قدر زوردار اور چست ہو گیا۔ آبرو

نہیں تارے بھرے ہیں شک کے نقطے   اس قدر نسخۂ فلک ہے غلط

میر صاحب نے دوسرا مصرعہ یوں بدل دیا ہے۔ ع

کس قدر نسخۂ فلک ہے غلط

سبحان اللہ۔ ایک مد نے مصرعہ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ میر صاحب کے الفاظ یہ ہیں۔ "اگر بجائے اس قدر، کس قدر می گفت شعر بہ آسماں می رسید" میر سجاد۔

کس طرح کوہکن پہ گزریں گی — ہجر کی یہ پہاڑ سی راتیں

میر صاحب کی اصلاح۔

ہجر شیریں میں کیونکہ کاٹے گا — کوہکن یہ پہاڑ سی راتیں

اسی طرح بلیغ و اُستادانہ اصلاحوں کی طرف جابجا اشارے کئے ہیں۔ اسی سلسلہ میں ایک اِصلاح خانِ آرزو کی بھی سُن لو۔ میاں شرف الدین مضمون کا شعر تھا۔

مضمون تو شکر کر کہ ترا نام سن رقیب — غصہ سے بھوت ہو گیا لیکن جلا تو ہے

خانِ آرزو نے "نام" کی جگہ "اسم" بنا دیا۔ میر صاحب فرماتے ہیں "وہ چہ اصلاح۔ زیرا کہ اہلِ دعوت "اُسم" میخوانند نہ "نام"۔"

اتفاقی اصلاح | مضمون کے حال میں لکھتے ہیں "میں اُن کے اشعار انتخاب کر رہا تھا۔ کلیم میرے پاس بیٹھے تھے میں نے مضمون کا یہ شعر

میرے پیغام کو تو اے قاصد — کہو سب سے اُسے جدا کر کے

اس طرح پڑھا

میرا پیغام وصل اے قاصد — کہو سب سے اُسے جُدا کر کے

دیکھو شانِ اُستادی شعر غلط پڑھا تو بہتر ہو گیا۔ میرے خیال میں دوسرا مصرعہ بجائے کہو کے کہنا یا کیونکہ رہے

طرزِ تحریر | میر صاحب فارسی بامحاورہ لکھتے ہیں اکثر جگہ پُرلطف الفاظ قلم سے نکل جاتے ہیں۔ مثلاً خانِ آرزو کی نسبت لکھا ہے "چراغ دودمانِ صفائے گفتگو کہ چراغش روشن باد سراج الدین علی خان آرزو"۔ خاکسار شاعر کے حال میں "بلکہ از تنک آبی بنائے ریختہ بآب رسانیدہ"۔ خاکسار کے لئے "تنک آبی اور "بآب رسانیدہ" کس قدر موزوں ہے۔ رُسوا ایک شاعر تھا جو اکثر عُریاں رہتا تھا۔ اسی حال میں مر گیا۔ میر صاحب لکھتے ہیں "آخر در ہماں عُریانی جامہ گزاشت"۔ جامہ گزاشتن محاورہ ہے مرنے کے معنی میں۔ ٹیک چند بہار کے ذکر میں لکھا ہے "از لفظ لفظش ہزار ہزار رنگِ معنی گل میکند"۔ اربابِ ذوق اس موقع پر "گل میکند" کے محاورہ کی داد دیں گے۔ بیان۔ مبالغہ اور بیجا لفاظی سے پاک ہے۔ جابجا اُستادانہ اشارے کرتے جاتے ہیں۔ فائدے لکھتے جاتے ہیں۔

دیباچہ میں ریختہ کی تعریف کی ہے "ریختہ کہ شعریست بطورِ شعرِ فارسی بزبانِ اُردوئے معلّائے شاہجہاں آباد دہلی" خاتمہ میں ریختہ کی حسبِ ذیل چھ قسمیں لکھی ہیں۔ اوّل قسم ایک مصرعہ فارسی اور ایک ہندی۔ دوسری قسم آدھا مصرع فارسی آدھا ہندی۔ تیسری قسم فارسی کے حرف اور فعل استعمال کیے جائیں یہ قبیح ہے۔ چوتھی قسم فارسی ترکیبیں استعمال کی جائیں۔ ریختہ کے مناسبِ حال ترکیبیں مستعمل ہوں تو مضائقہ نہیں۔ مگر اس کے لئے سلیقہ شاعرانہ درکار ہے۔ یہ میرا مسلک ہے۔ پانچویں قسم ایہام۔ شعرائے سلف میں رائج تھا اب متروک ہے۔ چھٹی قسم وہ طرز ہے جو ہم (اہلِ عصر) نے اختیار کی ہے۔ اس میں جملہ صفتیں ہیں۔ تجنیس۔ ترصیع۔ تشبیہ۔ صفائے گفتگو۔ فصاحت و بلاغت۔ ادابندی و خیال وغیرہ سب اس کے ضمن میں آجاتی ہیں۔ میری بھی یہی طرز ہے۔ اس فن میں جو صاحبانِ طرزِ خاص ہیں وہ اس نکتہ کو سمجھتے ہیں یہ فائدہ اپنے دوستوں کے لئے میں نے لکھدیا ہے ورنہ میدانِ سخن بہت وسیع ہے۔ ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر ست

اکبر آباد اور اردو | دہلی و لکھنؤ کی ہنگامہ آرائیوں میں اگرچہ آگرہ گرہ درگلو ہے مگر اس کی بے زبانی صاف کہہ رہی ہے کہ تیسرے دَور تک جو بلاکشانِ محبت بزمِ سخن میں آئے اُن میں سے اکثر کے دماغ اسی کے بادۂ کہن سے پُر کیف تھے۔ شاہ مبارک آبرو۔ شیخ شرف الدین مضمون۔ سراج الدین علی خاں آرزو۔ حضرت میرزا مظہر قدس سرہٗ۔ میر تقی میر کی ذات پر اوّل اکبر آباد کو ناز ہے اس کے بعد دلّی یا لکھنؤ کو۔ جب مرزا غالب بھی بزم آرا ہو جائیں تو پھر آنکھ ملانا آسان نہیں رہتا۔ نکات الشعرا میں حسبِ ذیل اکبر آبادی شعرا کا ذکر ہے (۱) خانِ آرزو۔ میر صاحب ان کی نسبت لکھتے ہیں "ہمہ اُستادانِ مضبوط فنِ ریختہ ہم شاگردانِ آں بزرگوارند" اب اکبر آباد کی اُستادی سے کس کو انکار ہوگا (۲) میر تقی میر (۳) آبرو (۴) مضمون (۵) پیام (۶) سجاد (۷) ثاقب (۸) شوق (۹) انسان (۱۰) عارف (۱۱) بہار (۱۲) نثار (۱۳) محسن۔ میر صاحب کی شہادت ہے کہ یہ سب کے سب عمدہ شاعر تھے۔ سجاد کی نسبت لکھا ہے "سخن او بپایۂ اُستادی رسیدہ"

اس عہد کی معاشرت | یہ تذکرہ احمد شاہ بادشاہ کے عہد کی تالیف ہے جب کہ سلطنتِ مغلیہ کا چراغ گل ہو رہا تھا۔ خانہ جنگیوں اور لوٹ مار کے ہنگامے برپا تھے۔ بدامنی کا دَور دَورہ تھا۔ دائرہ معاش بہت کچھ تنگ ہو چکا تھا۔ اس پر بھی اُس زمانہ کی معاشرت کی مضبوطی کو دیکھو۔ تمام خطرات اور مصائب سے بالاتر ہو کر اپنی وضع اور صفت پر قائم تھی۔ میر صاحب کے بیان کو غور سے پڑھو تو صاف عیاں ہو جاتا ہے کہ اس عہد کے شرفا کی خصوصیات یہ تھیں۔ خوبی اخلاق۔ زندہ دلی

محبت اور محبت کا نباہ۔ علم و فن کا ذوق اور اُس کی خدمت۔ سپہگری اور خودداری و وضعداری۔ نکات الشعرا میں جن لوگوں کا تذکرہ ہے اُن کے ذکر میں ان اوصاف کے عدم اور وجود پر خصوصیت کے ساتھ نگاہ رکھتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اُس زمانہ میں ان ہی صفتوں پر نگاہیں پڑتی تھیں۔

فنِ ادب کی خدمت میں بزرگانِ دین۔ شعرا۔ اُمرا۔ طبقۂ اوسط۔ اہلِ قلم۔ اور اہلِ سیف سب کے سب یکساں توجّہ اور انہماک کے ساتھ مصروف تھے۔ جامعیت کو دیکھو۔ حضرت خواجہ میر درد اور حضرت میرزا مظہر قدس سرہما کمالِ درویشی و معرفت۔ علم۔ فارسی شاعری۔ اُردو شاعری۔ تربیتِ فنِ ادب۔ سپہگری اخلاق و محبت سب ہی اوصاف کے جامع تھے اور یہ صورتیں اُس دور میں مستثنیٰ صورتیں نہ تھیں۔ نکات الشعرا میں مذکورۂ بالا طبقات میں سے ہر طبقہ کے اصحاب و اشخاص مذکور ہیں۔ جابجا درگاہیں۔ اور ادبی مجالس قایم تھیں جہاں کمال کے جوہر چمکتے تھے اور اہلِ کمال پیدا ہوتے تھے۔ سیر اور تماشے کے موقعوں۔ اور مذہبی جلسوں میں اہلِ کمال جمع ہوتے تھے۔ اور اُن کے دَم سے علم و ادب کے چرچے رہتے تھے۔ چنانچہ قزلباش خان اُمیدؔ کے حال میں میر صاحب لکھتے ہیں۔ طبقۂ اُمرا میں داخل تھے۔ ہر سیر و تماشہ میں جاتے اور مجلس آراستہ کرتے۔ چنانچہ ایک روز دِلی دوستوں کی تحریک سے میں بھی سید حسن رسول نما صاحب قدس سرہٗ العزیز کے عُرس میں گیا تھا وہاں اُمید بھی تشریف رکھتے تھے۔ مجھکو دُور سے دیکھکر کہا۔ خوش باشد۔ میں نے بھی اس زمانہ ریختہ کے دو شعر موزوں کئے ہیں۔ سُنو ؎

درو دیوار سے اب صحبت ہے	یاربن گھر میں عجب صحبت ہے
تیری آنکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں	الحفیظ الحفیظ کرتا ہوں

دیکھنا ایک ایرانی نژاد کیسے صاف اور بامزہ اشعار اُردو کے کہہ گیا۔ بقول میر صاحب "یہ فیض سخن ہے"۔

ہم ذیل میں میر صاحب کی چند عبارتیں نقل کرتے ہیں اِن سے ہمارے بیان کی تائید ہوگی (اُمید) نکتہ پرداز، بذلہ سنج کوچک دل۔ عزیز دلہا۔ یارباش۔ خوش اختلاط۔ خنداں و شگفتہ (مضمون) حریف۔ ظریف۔ ہشاش باش۔ ہنگامہ گرم کنِ مجلسہا (یکرنگ) میگویند کہ بسیار چسپاں اختلاط و آشنائے درست بود (سعادت) با بندہ ربط بسیار داشت (کلیم) مردے سپاہی پیشہ (حشمت) یعنی میر محتشم علی خاں سپاہی عمدہ روزگار شاعر خوب فارسی و ریختہ ...... باہمہ بعجز و انکسار پیش می آید (عاصی) در شمشیر شناسی دستے تمامی دارد ...... در علم تاریخ مہارتے خوب پیدا کردہ۔ از مغتنمات

روزگار ست۔ اگرچہ روزگار با او مساعدت نمی کند (شوق، سپاہی پیشہ (میر حسن) وضع مرد آدمیانہ دارد (غریب) یادش بخیر یک آشنائے با مزہ داشتم۔ بسیار خوش ظاہر بود۔ بسبب پریشانی روزگار دو سال ست کہ بسمت بنگالہ رفت (بیتاب) بسیار مربوط مضبوط الاحوال (میر۔ یہ دوسرے ہیں۔ غالباً میر سوز) جوانیست بسیار اہلِ خوش طبع (حاتم) مرد بست جاہل و متکبر...... دیر آشنا۔ غنا ندارد (پاکباز) بسیار کم اختلاط گویا آشنا شدن نداند (خاکسار) خود را دُور میکشد و بسیار سفلگی میکند۔

اگر "جدید تہذیب" بد دماغ نہ ہو تو میں پوچھوں کہ آج کل بھی ان اوصاف کا "سوسائٹی" میں پتا ہے۔ رہے نام اللہ کا

آبحیات اور نکات الشعرا

آپ نکات الشعرا کے خط و خال دیکھ چکے۔ میر صاحب کے اوصاف بھی ظاہر ہو چکے۔ اب نکات الشعرا کا جو چہرہ آبحیات میں نظر آتا ہے اُس کو ملاحظہ کیجئے۔ شمس العلما میر محمد حسین آزاد آبحیات میں لکھتے ہیں۔ نکات الشعرا شایقِ شعر کے لئے بہت مفید ہے۔ اس میں سوائے اردو کے بہت سی باتیں اس زمانہ کے لوگوں کے دیکھنے کے قابل ہیں۔ مگر وہاں بھی اپنا انداز قائم ہے۔ دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے۔ اس میں ایک ہزار شاعر کا حال لکھوں گا۔ مگر اُن کو نہ لوں گا جن کے کلام سے دماغ پریشان ہو۔ ان ہزار میں ایک بیچارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا۔ ولی کہ بنی نوع شعرا کا آدم ہے اُس کے حق میں فرماتے ہیں "وے شاعریست از شیطان مشہور تر" (دیکھو آبحیات صفحہ ۱۹۵ مطبوعہ مفید عام پریس ۱۸۹۹ء) ایک جگہ لکھتے ہیں "اور خانِ آرزو کے پاس اُنھوں نے اور اُن کی شاعری نے پرورش پائی۔ مگر "خاں صاحب" حنفی مذہب تھے اور میر صاحب شیعہ۔ اُس پر نازک مزاجی غضب۔ غرض کسی مسئلہ پر بگڑ کر الگ ہو گئے" (دیکھو صفحہ ۱۸۰) پھر ایک جگہ لکھا ہے "بنا تھا اُس کے میر صاحب کی بلند نظری اس غضب کی تھی کہ دُنیا کی کوئی بڑائی اور کسی شخص کا کمال یا بزرگی اُنھیں بڑی نہ دکھائی دیتی تھی۔ اس قباحت نے نازک مزاج بنا کر ہمیشہ دنیا کی راحت اور فارغ البالی سے محروم رکھا" میر سوز کے حال میں لکھا ہے "سوز مرحوم پہلے میر تخلص کرتے تھے۔ جب میر تقی مرحوم۔ میر کے تخلص سے عالمگیر ہوئے تو سوز اختیار کیا" ایک دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ سوز نے ایک مشاعرہ میں کہا تھا۔ فقیر نے تخلص تو میر کیا تھا مگر وہ میر تقی صاحب نے پسند فرمایا فقیر نے خیال کیا کہ اُن کے کمال کے سامنے میرا نام نہ روشن ہو سکے گا۔ ناچار سوز اختیار کیا" میر تقی صاحب....

چُپ بیٹھے سُنا کئے"۔ جابجا آبحیات میں یہ بھی ذکر ہو کہ میر صاحب شاعری اور زبان اُردو صرف دلّی والوں کا حق سمجھتے تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے میر قمرالدین منّت کو شاگرد نہیں کیا۔ لکھنؤ کے شایقینِ سخن اُن کا کلام سننے آئے تو نہیں سُنایا" (دیکھو صفحات ۲۰۰ و ۲۰۲) ایک اور جگہ لکھا ہو "افسوس یہ ہو کہ اَوروں کے کمال بھی اُنھیں دکھائی نہ دیتے تھے۔ اور یہ "میر" سے شخص کے دامن پر نہایت بدنُما دھبہ ہو۔ جو کمال کے ساتھ صلاحیت اور نیکوکاری کا خلعت پہنے ہو..... خواجہ حافظ شیرازی اور شیخ سعدی کی غزل پڑھی جائے تو وہ سَر ہلانا گناہ سمجھتے تھے۔ کسی اور کی کیا حقیقت ہو" یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے بیان میں آبحیات میں دیکھتا ہوں تو غرقِ حیرت ہوجاتا ہوں۔ اور سمجھ میں نہیں آتا کہ ماجرا کیا ہو۔ سارے مضمون نکات الشعرا کے بالکل خلاف اور ضد ہیں۔ نکات الشعرا کے دیباچہ میں یہ نہیں ہو کہ اس میں ایک ہزار شاعروں کا ذکر لکھوں گا۔ یہ بھی نہیں ہو کہ اُن کا ذِکر نہیں لکھوں گا جن سے دماغ پریشان ہو۔ میر صاحب متعصب یا تنگ نظر نہ تھے بزرگانِ دین کا ذکر جس ادب سے کیا ہو اُس سے اُن کی وسعت مشرب اور پاک دلی صاف ظاہر ہو۔ پھر اُستاد سے کیوں لڑتے اور کیوں بگڑتے۔ میر صاحب۔ خانِ آرزو کو اپنا اُستاد بلکہ پیر و مرشد بتاتے ہیں۔ آزاد کہتے ہیں "بگڑ کر الگ ہوگئے" میر صاحب نے نکات الشعرا میں اپنے سامنے کے لڑکوں کے کلام کی خوبی بھی تسلیم کی ہو۔ میر سجاد اُن کے سامنے طالبِ علم تھے تاہم اُن کی نسبت فرماتے ہیں "سخن او بپایہ اُستادی رسیدہ"۔ اُن کے ایک شعر پر سر دُھنتے ہیں۔ وجد کرتے ہیں سو جگہ لکھنے کی تمنّا کرتے ہیں۔ آزاد کا بیان مانا جائے تو وہ سعدی و حافظ کی غزل پر سر ہلانا گناہ سمجھتے تھے مضمون قصبۂ چاچپُو ضلع آگرہ کے رہنے والے تھے اُن کی شاعری کا ذکر میر صاحب نے بہت خوبی سے کیا ہو۔ چاچپو کا باشندہ شاعر ہوسکتا تھا تو سوُن پت نے کیا گناہ کیا تھا۔ وَلی کی نسبت میر صاحب نے یہ ریمارک کیا ہو "از کمالِ شہرت احتیاجِ تعریف ندارد"۔ شیطان والا فقرہ سارے تذکرے میں کہیں نہیں۔ مثل مشہور ہو "وَلی کے گھر میں شیطان"۔ شاید اسی طرح یہ فقرہ آزاد کے ذہن میں پیدا ہوا ہو۔ میر سوز کے تخلص کی نسبت میر صاحب نکات الشعرا میں لکھتے ہیں "محمد میر، میر تخلص جوانیست بسیار اہل خوش طبع۔ ہرچند طرز علیحدہ دارد لیکن از خوش کردن تخلص من نصف دلم از دو خوش ست"۔ اس سے معلوم ہوتا ہو کہ میر صاحب نے تخلص پسند نہیں کیا بلکہ میر سوز نے پسند کیا۔ آزاد نے لکھا ہو کہ "ایک ہزار شعرا میں سے کوئی بیچارہ میر صاحب کے طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا"۔ حالاں کہ میر صاحب نے قریباً سب کو خوبی سے یاد کیا ہو بعض کی نسبت جہاں وقائع نگاری کے فرض نے مجبور کیا البتہ خلاف رائے لکھی ہو مگر وہ بھی طعن اور ملامت کے پیرایہ

میں نہیں۔ آزاد نے ہر جگہ میرزا مظہر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام "جان جاناں" لکھا ہے۔ حالاں کہ میر صاحب نے "جان جاں" لکھا ہی جو صحیح ہی۔ ایک شخص نے "جان جاناں" شعر میں باندھا تو میر صاحب نے ٹوکا کہ ایسا خواص کو نہیں چاہیئے صحیح نام لکھنا چاہیئے۔ عوام کا ذکر نہیں۔ آزاد نے نکات الشعرا کی نسبت لکھا ہی "اب بہت کم یاب ہی" (دیکھو صفحہ ۱۹۲)

میری بدگمانی معاف ہو تو میں کہوں گا کہ نکات الشعرا آزاد کی نظر سے نہیں گزرا۔ قیاس کی بلند پروازی نے طوطی مینا بنا کر اُڑائے ہیں اور اُن کی سحر بیانی سے سامعین کو خوش کیا ہی۔

انتخاب اشعار۔ میر صاحب نے جن اشعار کو منتخب کر کے درج تذکرہ کیا ہی دل نہیں مانتا کہ اُن کا نمونہ یہاں نہ دکھاؤں اگرچہ شائقین تذکرہ میں پڑھیں گے مگر قند مکرر ہو تو لطف دوبالا ہو جاتا ہی۔

آرزو

رکھے سپارۂ گل کھول آگے عندلیبوں کے — چمن میں آج گویا پھول ہیں تیری شہیدوں کے

وعدے تھے سب خلاف جو تجھ لب سے ہم سُنے — یہ لعل قیمتی دیکھو جھوٹا نکل گیا

مظہر

آتش کہو شرارہ کہو کوئلہ کہو — مت اس ستارہ سوختہ کو دل کہا کرو

اُمید

در و دیوار سے اب صحبت ہی — یار بن گھر میں عجب صحبت ہی

تیری آنکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں — الحفیظ الحفیظ کرتا ہوں

ابرو

مجلسِ رنداں میں مت لیجا دلِ بے شوق کو — شیشۂ خالی کی کیا عزت ہی میخواروں کے بیچ

کچھ ٹھہرتی نہیں کہ کیا ہوگی — اس دلِ بیقرار کی صورت

دل تو دیکھو آدمِ بیباک کا — عشق سے پُتلا بھرا ہی خاک کا

کیا ہوا مر گیا اگر فرہاد — رُوح پتھر سے سر پٹکتی ہے

اب دین ہوا زمانہ سازی — آفاق تمام دِہریا ہے

حُسن ہی پر خوبرویوں میں وفا کی بو نہیں — پھول ہیں یہ سب پر اِن پھولوں میں ہرگز بو نہیں

یکرنگ

خلق یکرنگ کی ہوئی دُشمن — جب سے تیرا وہ دستدار ہوا

اندھیر ہی جہاں میں کہ اب شامیوں کے ہاتھ — ہے سَر بُریدہ شمع شبستانِ کربلا

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہی — میرا صبر و قرار جاتا ہی

گر خبر لینی ہی تو لے صیاد ۔۔۔ ہاتھ سے پھر شکار جاتا ہی

سعادت ۔ ہوش کھو دیتی ہیں میرا اُس کی آنکھیں مَے پرست ۔۔۔ بسکہ ہوں کم ظرف دو پیالوں ہیں ہو جاتا ہوں مست

واللہ جو سرِ لوح ترا نام نہ ہوتا ۔۔۔ ہرگز کسی آغاز کا انجام نہ ہوتا

یار سے جو رقیب لڑتے ہیں ۔۔۔ یہ ہمارے نصیب لڑتے ہیں

پپیہے کی طرح دارو کے شیشے ۔۔۔ زبانِ حال سے کہتے ہیں پی پی

سودا ۔ بیکس کوئی مَرے تو جلے اُس پہ دل مرا ۔۔۔ گویا ہی یہ چراغ غریبوں کی گور کا

زباں ہی شکر میں قاصر شکستہ بالی کے ۔۔۔ کہ جن نے دل سے مٹایا خلش رہائی کا

سوداؔ قمارِ عشق میں شیریں سے کوہکن ۔۔۔ بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا

سوداؔ ہوئے جب عاشق کیا پاس آبرو کا ۔۔۔ سُنتا ہی اے دیوانے جب دل دیا تو پھر کیا

پھرے ہے شیخ یہ کہتا کہ میں دُنیا سے مُنہ موڑا ۔۔۔ الٰہی ان نے اب داڑھی سوا کس چیز کو چھوڑا

یا تبسّم یا نگہ یا وعدہ یا گاہے پیام ۔۔۔ کچھ بھی ای خانہ خراب اس دل کی سمجھانے کی طرح

رنگِ گُل سے بے طرح دہکی ہے سن لے ابرِ بہار ۔۔۔ آشیاں میرا چھڑک لگتی ہی اب گلشن کو آگ

قاتل کے دل سے آہ ۔ نہ نکلی ہوس تمام ۔۔۔ ذرہ بھی ہم تڑپنے نہ پائے کہ بس تمام

کس کی ہیں یہ چمن میں صبا بد شرابیاں ۔۔۔ ٹوٹی پڑی ہیں غنچوں کی ساری گلابیاں

نہ پوج سنگ و گِل اے شیخ اس صدا کو مان ۔۔۔ مرے صنم کی پرستش کر آ خدا کو مان

عاشق کی بھی کٹتی ہیں کیا خوب طرح راتیں ۔۔۔ دو چار گھڑی رونا دو چار گھڑی باتیں

اِس دردِ دل سی موت ہو یا دل کو تاب ہو ۔۔۔ قسمت میں جو لکھا ہی الٰہی شتاب ہو

اس کشمکش سے دام کے کیا کام تھا مجھے ۔۔۔ اے اُلفتِ چمن ترا خانہ خراب ہو

کہتا تھا بناگوش تری زلف کے آگے ۔۔۔ میں صُبحِ قیامت ہوں مری شام یہی ہی

نہ ضرر کفر کو نے دین کا نقصاں مجھسے ۔۔۔ باعثِ دشمنی اے گبر و مُسلماں سب مجھسے

مرجاں کا نخل ہوں نہ پھلوں برگ و بار سے ۔۔۔ نکلے ہمیشہ خون میری شاخسار سے

کلیم

خنجر طلب ہی مرگ سی ہر آہوئے حرم — دل پھر گیا ہی کس کی مژہ کا شکار سے
آتی ہی دل پہ قلقلِ مینا سی اب شکست — وہ دن گئے کلیمؔ کہ یہ شیشہ سنگ تھا
درازیِ شبِ ہجرانِ زلفِ یار کلیمؔ — نہ مجھسے پوچھ۔ کہ کاٹی ہی رات آنکھوں میں
پاسِ ناموسِ محبت ہی مجھے ازبس کلیمؔ — باغ میں جاؤں نہ ہرگز بے رضای عندلیب
جو صدا آتی ہی اس وادی سے ہی سینہ خراش — یہ کوئی دل روتا جاتا ہی۔ نہیں بانگِ جرس

درد

تو یار مل کے ہم سے جب ایک ہو گیا ہو — کس کو بعید مانیں کس کو کہیں قریں ہم
تم ہو تو ہم کہاں ہیں ہم ہیں تو تم کہاں ہو — یا تم ہی سب ہو ہم ہیں یا سب کے سب ہمیں ہم
نَے اور طنبور میں یہ سوز تو معلوم اے مُطرِب — کسی کا دل ہوا ہی شاید اس پردہ میں آنالاں
تری جناب میں آیا ہوں یا الٰہ نہ پوچھ — یہی کہ بخشدے اور مجھسے گناہ نہ پوچھ
غرورِ حُسن کیا ممکن کسی کو داد کو پہنچے — غرض تم سُن چکے احوال ہم فریاد کو پہنچے
تو ای بارانِ رحمت اوج میں آموج سے اپنی — کہ یک قطرہ میں میری کِشت کا بھی کام ہو جاوے
اکسیر پہ مُہوّس اتنا نہ ناز کرنا — ہی کیمیا سے بہتر دل کا گداز کرنا
جان سے ہو گئے بدن خالی — جس طرف تونے آنکھ بھر دیکھا
نالہ فریاد آہ اور زاری — آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا
دل بھی اے دردؔ قطرۂ خوں تھا — آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا
حرص کرواتی ہی رُو بہ بازیاں سب ورنہ یاں — اپنے اپنے بوریئے پر جو گدا تھا شیر تھا
کھینچے ہی دُور آپ کو میری فروتنی — اُفتادہ ہوں پہ سایۂ قدِ کشیدہ ہوں
ہم تجھسے کس ہوس کی فلک جستجو کریں — دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں
مٹ جائیں ایک دم میں یہ کثرت نمائیاں — گر آئینہ کے سامنے ہم آکے ہُو کریں
تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جا ابھی — دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
ہی اپنی یہ صلاح کہ سب زاہدانِ شہر — اے دردؔ آکے بیعتِ دستِ سبو کریں

اُس نے کیا تھا یاد مجھے بھول کر کہیں — پاتا نہیں ہوں تب سے میں اپنی خبر کہیں

فرصتِ زندگی بہت کم ہے — مغتنم ہے یہ دید جو دم ہے

دین و دنیا میں تو ہی ظاہر ہے — دونوں عالم کا ایک عالم ہے

تمنا ہے تیری اگر ہے تمنا — تری آرزو ہے اگر آرزو ہے

رُوندے ہے نقشِ پا کی طرح خلق یاں مجھے — اے عمرِ رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

اے گُل تو رخت باندھ اُٹھاؤں میں آشیاں — گلچیں تجھے نہ دیکھ سکے باغباں مجھے

پتھر تلے کا ہاتھ ہے غفلت کے ہاتھ دل — سنگِ گراں ہوئی ہے یہ خوابِ گراں مجھے

وحدت نے ہر طرف ترے جلوے دکھا دیئے — پردے تعینات کے جو تھے اُٹھا دیئے

یارب تھی کیا خرام وہ جس نے اک آن میں — کتنے ہی مُردے حشر سے آگے جلا دیئے

سیلابِ اشکِ گرم نے اعضا مرے تمام — اے درد کچھ بہا دیئے اور کچھ جلا دیئے

سجّاد

شتابی پلا دے کہ جاتا ہے ابر — جو کچھ باقی ساقی رہی ہو شراب

اس فصلِ گُل میں جوشِ جنوں کا ہوا ہے قہر — جنگل میں آ بھرا ہے نکل کر تمام شہر

اب تو ہم نے کیا گریباں چاک — تیرے دامن کو کس طرح چھوڑیں

کس طرح کوہکن یہ گزرینگی — ہجر کی یہ پہاڑ سی راتیں

میں جو اُس کی گلی میں جاتا ہوں — دل کو کچھ گم ہوا سا پاتا ہوں

لبِ شیریں پہ اُس کے مرتا ہوں — زندگی اپنی تلخ کرتا ہوں

رات اُس زلف کا وہ افسانہ — قصہ کوتہ بڑی کہانی ہے

عشق کی ناؤ پار کیا ہووے — جو یہ کشتی تری تو بس ڈوبی

ماہرو بن یہ شمع محفل میں — جیسی روشن ہے سب پہ روشن ہے

بیتاب

تڑپ کر مر گئی بلبل قفس میں — پڑی تھی ہائے کس ظالم کے بس میں

یقین

دل میں زاہد کے جو جنت کی ہوا کی ہے ہوس — کوچۂ یار میں کیا سایۂ دیوار نہ تھا

رُدا اگر دیجئے اس کو بھی تو کچھ عیب نہیں — آئینہ سے بھی گیا گیا دلِ حیراں میرا

نہ تھا عیش کی خسرو کو فرصت قصرِ شیریں میں — جو میں ہوتا تو جائے شیر جوئے خوں رواں کرتا

خال گورے مکھ کا لیتا ہے مرے دل کو چرا — اس نگر میں چاندنی راتوں کو بھی پڑتے ہیں چور

اس ہوا میں رحم کر ساقی کہ بے جامِ شراب — دیکھکر چھاتی بھری آتی ہے باراں کی طرف

مجنوں کی خوش نصیبی کرتی ہے داغ مجھکو — کیا عیش کر گیا ہے ظالم دِوانہ پن میں

دوبارہ زندگی کرنا مصیبت اس کو کہتے ہیں — پھر اُٹھنا بیدماغوں کا قیامت اس کو کہتے ہیں

زنجیر میں زلفوں کے پھنس جانے کو کیا کہئے — کیا کام کیا دل نے دیوانہ کو کیا کہئے

وَلی

دشمنِ دیں کا دین دشمن ہے — راہزن کا چراغ دشمن ہے

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اُس کو — کرتی ہے نگہ جس قدِ نازک پہ گرانی

کہاں ہے آج یارب جلوۂ مستانۂ ساقی — کہ دل سے تاب جی سے صبر سر سے ہوش لیجاوے

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شبِ خلوت میں دلبر سے — سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

عُزلت

بجز رفاقتِ تنہائی آسرا نہ رہا — سوائے بیکسی اب اور آشنا نہ رہا

سراج

نہیں ہے تاب مجھے سامنے تری جاناں — کہاں سراج کہاں آفتابِ عالمتاب

شکر للہ ان دنوں تیرا کرم ہونے لگا — شیوۂ جور و ستم فی الجملہ کم ہونے لگا

تاباں

قد حلقۂ کماں اسی حسرت میں ہو گیا — تیرِ ہدف کبھی نہ ہماری ہوئی جا

لگ رہی ہیں ترے عاشق کی جو آنکھیں چھت سے — تجھکو دیکھا مگر اُن نے ہے لبِ بام کہیں

بال اپنے کھولتا ہے جب تو اے خورشید رُو — چاند سے مُنہ پر تری اُس وقت آجاتا ہے ابر

ساقی ہو اور چمن ہو مینا ہو اور ہم ہوں — باراں ہو اور ہوا ہو سبزا ہو اور ہم ہوں

ایمان و دیں سے تاباں مطلب نہیں ہے ہم کو — ساقی ہو اور مئے ہو دُنیا ہو اور ہم ہوں

جوں برگِ گُل سے باغ میں شبنم ڈھلک پڑے — کیا ہو کہ برگِ تاک سے یوں مَے ٹپک پڑے

محفل کے بیچ سُن کے مرے سوزِ دل کا حال — بے اختیار شمع کے آنسو ڈھلک پڑے

ہاتھ بیغا ندہ زندہ میں نہ دوڑا مجنوں — طوق ہی تیرے گلے میں یہ گریباں تو نہیں

میں گورِ غریباں پہ جا کر جو دیکھا — بجز نقشِ پا لوحِ تربت نہیں ہے

نہ پائی خاک بھی تاباں کی ہم نے پھر ظالم — وہ ایک دم ہی ترے روبرو ہوا سو ہوا

ترے پاس عاشق کی عزت کہاں ہے — تجھے بے مروّت محبت کہاں ہے

تری ابرو سے نہ چھوٹے گا مرا دل ہرگز — گوشت ناخن سے بھلا کوئی جدا ہوتا ہے

قیامت مجھ پہ کل کی رات اُس کے ہجر میں لائی — نہ آیا یار میرا آج بھی وہ رات پھر آئی

شوق

بجھے گی آتشِ دل ہم نے جانا تھا گھٹا آئی — ہوای ابر نے دونی و لے یہ آگ بھڑکائی

رُسوا

ہر گلی میں گر پڑے ہیں مست ہو دیوار و در — ابر رحمت برستا ہے یا برستی ہے شراب

قایم

بھلا اے ابرِ مژگاں اب تو بس کر — ابھی تو کھل گیا تھا تو برس کر

بہارِ عمر ہے قایم کوئی دن — لے ہے جوں گل پیاری کاٹ ہنس کر

اے محنت آزمائے عاشق — تب خوش ہو کہ مر ہی جائے عاشق

دانا

بہر صورت خدا کو دیکھنا عنوان ہے میرا — یہی توحید میں مصرع سرِ دیوان ہے میرا

سلام

حدیثِ زلف چشمِ یار سے پوچھ — درازی رات کی بیمار سے پوچھ

بیا بیو قسم ہے تمھیں میری صبر کی — مسلخ میں بعد ذبح تحمل نہ کیجیو

بہار

ہمیں واعظ ڈراتا کیوں ہے دوزخ کے عذابوں سے — معاصی گو ہمارے بیش ہوں کیا مغفرت کم ہے

تمکیں

حسن اور عشق کو جس روز کہ ایجاد کیا — مجھکو دیوانہ کیا تجھکو پریزاد کیا

محسن

تعزیت دار حسرتِ دل ہے — یہ جو گریہ کا جامہ آبی ہے

دل پُر آبلہ مرا محسن — رشکِ آئینہ حبابی ہے

راقم

ابر ترے چشم گریاں کم نہیں — موج دریا ہے شکنج آستیں

مژگاں سے دل بچے تو ٹکڑے کرے ہے ابرو — یہ کہکے میں نے اُس سے جب دل کی داد چاہی

کہنے لگا کہ ترکش جس وقت ہووے خالی — تلوار پھر نہ کھینچے تو کیا کرے سپاہی

اے باغباں نہیں تری گلشن سے کچھ غرض — مجھکو قسم ہی چھیڑوں اگر برگِ و برکہیں
اتنا ہی چاہتا ہوں کہ میں اور عندلیب — آپس میں دردِ دل کہیں ٹک بیٹھکر کہیں
معصیت میری بہت ہی کہ تری بخشش بیش — اپنی رحمت پہ نظر کر مرے عصیاں کو نہ دیکھ
کہے کیا دردِ دل بلبل گلوں سے — اُڑا دیتے ہیں اُس کی بات ہنس کر
جو چاہے گوہرِ مقصود اے دل — صدف کی طرح تو پاس نفس کر

(محمد امیر) امیر
شہرۂ حسن سے ازبسکہ وہ محجوب ہوا — اپنے چہرے سے بگڑتا ہے کہ کیوں خوب ہوا

(میر محمد تقی) میر
کس طرح سے مانئے یاراں کہ یہ عاشق نہیں — رنگ اُڑا جاتا ہی ٹک چہرہ تو دیکھو میر کا
شب درد و غم سے عرصہ مری جیو پہ تنگ تھا — آیا شبِ فراق تھی یا روزِ جنگ تھا
مت کر عجب جو میر ترے غم میں مرگیا — جینے کا اس مریض کے کوئی بھی ڈھنگ تھا
ہونا نہ چارچشم دل اُس ظلم پیشہ سے — ہشیار زینہار خبردار دیکھنا
ہم اسیروں کو بھلا کیا جو بہار آئی نسیم — عمر گزری کہ وہ گلزار کا جانا ہی گیا
جو اے قاصد وہ پوچھے میر بھی ایدھر کو چلتا تھا — تو کہیو جب چلا ہوں میں تو اُس کا دم نکلتا تھا
کچھ میں نہیں اس دل کی پریشانی کا باعث — برہم ہی مرے ہاتھ لگا تھا یہ رسالا
یک قطرہ خون ہوکے مژہ سے ٹپک پڑا — قصہ یہ کچھ ہوا دلِ غفراں پناہ کا
مت پوچھ کس طرح سے کٹی رات ہجر کی — ہر نالہ میری جان کو تیغِ کشیدہ تھا
خواہ مجھسے لڑ گیا اب خواہ اُس سے مل گیا — کیا کہوں اے ہمنشیں میں تجھسے حاصل دل گیا
مت ڈھلک مژگاں سے میرے ای سرشکِ آبدار — مفت ہی جاتی رہیگی تیری موتی کی سی آب
میرے سنگِ مزار پر فرہاد — رکھکے تیشہ کہے ہے یا اُستاد
ہم تو اسیرِ کنجِ قفس ہوکے مرچلے — اے اشتیاقِ سیرِ چمن تیری کیا خبر
پاس رہنے کا نہیں ایک بھی تار آخرکار — ہاتھ سے جائیگا سررشتۂ کار آخرکار
ساقی تو ایک بار تو توبہ تڑا مری — توبہ کروں جو پھر میں تو توبہ ہزار بار

دل دماغ اور جگر یہ سب اکبار — کام آئے فراق میں اے یار

احوال نامہ بر سے مرا سن کے کہہ اٹھا — جیتا ہے وہ ستم زدہ مہجور کیا ہنوز

اللہ رے عندلیب کی آواز دلخراش — جیوہی نکل گیا جو کہا ان نے ہائے گل

بھلا تم نقد دل لے کر ہمیں دشمن گنو اب تو — کبھی کچھ ہم بھی کر لیں گے حساب دوستاں در دل

زبان نوحہ گر ہوں میں قضا نے کیا ملایا تھا — مری طینت میں یارب سودۂ دلہائے نالاں کو

سمجھے ہی نہ پروانہ نہ تھا نبے ہی زباں شمع — وہ سوختنی ہے تو یہ گردن زدنی ہے

میر پھر کہیو سرگزشت اپنی — بارے یہ کہہ مزاج تو خوش ہے

صد کارواں وفا ہے کوئی پوچھتا نہیں — گویا متاع دل کے خریدار مر گئے

آتش کے شعلے سر سے ہمارے گزر گئے — بس اے تپ فراق کہ گرمی میں مر گئے

ناصح نہ روویں کیونکہ محبت کے جیو کو ہم — اے خانماں خراب ہمارے تو گھر گئے

بے کلی مارے ڈالتی ہے نسیم — دیکھئے اب کے سال کیا ہووے

میرے تغیر حال پر مت جا — اتفاقات ہیں زمانے کے

رباعی

مسجد میں تو شیخ کو خروشاں دیکھا — میخانہ میں جوش بادہ نوشاں دیکھا

اک گوشۂ عافیت جہاں میں ہم نے — دیکھا سو محلۂ خموشاں دیکھا

تجویز بقائے اُردو

از

جناب مولوی سید غلام بھیک صاحب نیرنگ بی اے، ال ال بی

خیرپور میر کے سفر میں میں نے وعدہ کیا تھا کہ انجمن ترقی اُردو کے کام کے متعلق ایک خاص خیال آپ کی خدمت میں پیش کرونگا۔ آج تک کئی مرتبہ دھیان آیا کہ لکھوں مگر آج سے پہلے فرصت نہ ملی۔ آج ایفائے وعدہ کرتا ہوں۔

چونکہ کسی زبان اور کسی ادب کا مستقبل اس کے حال سے اور حال اس کے ماضی سے بے تعلق نہیں ہو سکتا اسلیئے اُردو میں بھی آیندہ جو کچھ ہوگا وہ اس کی موجودہ حالت سے متاثر ہوگا۔ اور اُس کی موجودہ حالت اس کی گزشتہ حالت سے یقیناً متاثر ہی۔ اس وقت اُردو کے ادب میں عربی اور فارسی کے الفاظ ترکیبیں بلکہ جملے کے جملے کثرت سے مستعمل ہیں نظم و نثر کی کتابوں میں ایسی تلمیحات بکثرت موجود ہیں جن کے سمجھنے کے لیئے کبھی کبھی عربی ادب کی واقفیت اور زیادہ تر فارسی ادب کی شُدبُد کی ضرورت ہی۔ اُردو کے گزشتہ اور موجودہ شعراء اور دیگر مصنفین کی تصنیفات کو ٹھیک طور سے سمجھنے اور اُن سے لطف اندوز یا مستفید ہونے کے لیئے عربی و فارسی زبان و ادب کی فی الجملہ واقفیت اور مذاق ضروری ہی۔

ایک طرف تو واقعات یہ ہیں۔ دوسری طرف تعلیم جدید کی ضرورتوں نے محض ذبانہ مذاق کی تعلیم کو بے سود ثابت کردیا ہی۔ اُمید نہیں کہ ہم آیندہ محض زبان و ادب کو اتنا وقت دے سکیں کہ ہمارے بچے نہ صرف اُردو زبان و ادب بلکہ عربی و فارسی زبان و ادب بھی حاصل کیا کریں۔ خاص خاص لوگ عربی زبان و ادب بھی سیکھا کرینگے

اور ضرورت ہے کہ سیکھیں۔ خاص ہی خاص لوگ فارسی زبان و ادب بھی حاصل کیا کرینگے۔ مگر ایسے لوگوں کی فیصدی تعداد بہت ہی کم ہوا کریگی۔ اب بھی بہت کم ہے مگر آیندہ یقیناً اس سے بہت کم ہوا کریگی۔ زیادہ تر علوم تجربیہ سیکھنے پڑینگے۔ بہت سا وقت ریاضیات و معقولات کی نذر ہوا کریگا۔ تاریخ وغیرہ بھی اپنا حصّہ لینگی۔ اور زباندانی اور تحصیل علم ادب کے لیے بہت کم وقت بچ سکیگا۔ ایسے حالات میں اگر ہمارے بچے اُردو زبان و ادب بھی اچھی طرح سیکھ جایا کرینگے تو کافی ہوگا۔

لیکن اُردو زبان و ادب کو فارسی و عربی زبان کی واقفیت کے بغیر سیکھیں گے کیونکر؟ غالب کو رہنے دیجیے میر تقی اور خواجہ حالی کا کلام یا مرزا داغ اور امیر مینائی کا کلام ادق نہیں ہے پھر بھی کون ہے جو فارسی زبان و ادب کے مذاق کے بغیر ان حضرات کے کلام کو بھی سمجھ سکے؟

اس مشکل کا علاج میرے نزدیک یہ ہے کہ اُردو میں لغات اور قواعد کی کتابیں اُس نمونے پر لکھی جائیں جیسی انگریزی میں کثرت سے موجود ہیں۔ دیکھئے انگریزی زبان و ادب کے جاننے اور سمجھنے کے لیے بھی یونانی و لاطینی اور بعض دیگر زبانوں کی کچھ واقفیت اور اُن زبانوں کے ادب کا کچھ مذاق ضروری ہے۔ مگر انگریزوں نے اس مشکل کو حل کر لیا ہے۔ انگریزی گرامر کی کتابوں میں اشتقاق الفاظ کے متعلق ایسے ابواب موجود ہیں جن کے مطالعے سے یونانی و لاطینی الفاظ کی پہچان اور ان کا طریق اشتقاق بخوبی معلوم ہو جاتا ہے۔ غیر زبانوں کی جو ترکیبیں یا جملے متداول و مستعمل ہیں ان کی فہرست بہ ترتیب حرف تہجی مع ترجمہ انگریزی لغت کی کتابوں میں موجود ہے۔ الفاظ دخیلہ کا اشتقاق کتب لغت میں اس قدر تشریح اور وضاحت کے ساتھ درج ہے کہ جو شخص صرف انگریزی جانتا ہے وہ اُن کی جڑ کھوج سے پوری واقفیت حاصل کر سکتا ہے۔ تلمیحات کے حل کے واسطے لغات قصص الگ موجود ہیں۔

ضرورت ہے کہ اُردو میں بھی ایسی کتابیں تصنیف کی جائیں۔ قواعد اُردو کی کتابوں میں فارسی کی ترکیب اضافی ترکیب توصیفی اسم فاعل ترکیبی وغیرہ کے قواعد اور اُن کی مثالیں داخل کی جائیں۔ عربی کے اسم فاعل اسم مفعول صفت مشبہ اسم ظرف اسم آلہ وغیرہ کے قواعد بھی درج کیے جائیں۔ فارسی کے ایسے مصادر کی ایک فہرست بھی لگائی جائے جن کے مشتقات اُردو میں مستعمل ہوتے ہیں۔ اِس وقت تمام ضروری امور کا استقصا کرنا میرا مقصد نہیں ہے۔ میں نے اشارۃً و مختصراً چند باتیں لکھدی ہیں۔ انگریزی میں (Hints on the Study of English by Rowe and Webb

یا (Nesfield's English Grammar) اور فارسی میں آزاد کی جامع القواعد نمونے کے واسطے عمدہ کتابیں ہیں - اِن نمونوں کو سامنے رکھ کر اُردو کی ایک جامع و مانع گریمر تیار کی جائے - جب ایک دفعہ ایک عمدہ نمونہ تیار ہو گیا تو آیندہ اُس سے بہتر کتابیں بھی تصنیف ہونگی - اِسی طرح انگریزی میں (Dictionary of Phrase & Tables Rogets, Thesaurus of English words and phrases) اور کوئی عمدہ ڈکشنری مثلاً (Webster's Dictionary یا Ogilvie's Imperial Dictionary) ہمارے لغات کے لیئے نمونہ بن سکتی ہیں - ان میں الفاظ اور محاورات انتہائے جامعیت کے ساتھ مع اشتقاق و معانی مختلفہ و امثلہ استعمالات مختلفہ جمع اور درج کیئے جائیں اور آخر میں عربی جملے اور ضرب المثلیں فارسی جملے اور ضرب المثلیں جو اُردو ادب میں پائی جاتی ہیں بترتیب حروفِ تہجّی مع ترجمہ اُردو درج کی جائیں - علاوہ ازیں اساتذہ شعرائے اُردو اور بہترین تصانیف نثر اُردو کے عمدہ لائبریری ایڈیشن تیار کیئے جائیں جن میں مکمّل اور شرح طلب مقامات پر واضح اور عمدہ حواشی لکھے جائیں -

میں جانتا ہوں کہ یہ اور اسی قسم کے کام سخت محنت اور بڑے مصارف کے محتاج ہیں - لیکن گریمر سے شروع کیا جائے اور اِس کے بعد لغت پر توجّہ کی جائے - لائبریری ایڈیشن کا کام بعد میں کیا جا سکتا ہے - گریمر کے واسطے غالباً کوئی معقول انعام تجویز کر کے اشتہار دینا مفید ہوگا - لغت کے واسطے چار پانچ اعلیٰ قابلیت سے اشخاص کو مل کر کام کرنا ہوگا - یہ لوگ تنخواہ دار ہوں اور صرف یہی کام کریں اور ایک میعادِ معیّنہ کے اندر حسبِ اطمینان تکمیل لغت کر دیں تو اُن کو ایک معقول انعام کا متوقع بھی کیا جائے -

انجمن ترقی اُردو لازمی طور پر انجمن بقائے اُردو بھی ہے - اگر خدانخواستہ زبان اُردو نذر فنا ہو گئی تو ترقی کس کی ہوگی ؟ اس لیئے ترقی سے پہلے بقا کی فکر ضروری ہے - میرے خیالِ ناقص میں جو کچھ آیا وہ عرض کر دیا - اب اس کی فکر کرنا آپ کا کام ہے - زبانِ اُردو اور انجمن ترقی اُردو کی بیدار بختی ہے کہ اعلیٰ حضرت سلطان دکن خلّد اللہ ملکہٗ کے دامانِ کرم کا سایۂ ہما پایہ اِن کے سر پر ہے - اُمید ہے کہ مصارف کے متعلق جو مشکلات ہیں وہ انشاء اللہ آسان ہو جائینگی - آپ از راہِ کرم جلد سے جلد میری اس تجویز کے متعلق کوئی عملی کارروائی کریں - زیادہ نیاز - والسّلام

تجویز

دربارۂ اِصلاحِ رسمُ الخط

(از جناب عبد اللہ یوسف علی صاحب سی بی ای - ایم اے - ایل ایل ایم)



مسٹر عبد اللہ یوسف علی بلحاظ اپنی علمی قابلیت اور فضیلت کے ہماری قوم کے ممتاز لوگوں میں سے ہیں اور اس لیئے کسی تعارف کی ضرورت نہیں۔ کچھ عرصہ ہوا آپ نے مجھ سے اُردو رسم الخط کی اصلاح کے متعلق خط و کتابت کی۔ اس کے بعد لندن کے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کے رسالہ "بلیٹن" میں ایک مختصر سا مضمون لکھا۔ میں اُن کی تجویز کو اُنھیں کے الفاظ میں یہاں درج کرتا ہوں۔ اُمید ہے کہ اُردو کے انشا پرداز اور ادیب اپنی رائے اور تنقید سے ہمیں مستفید فرمائینگے۔ ہم نہایت خوشی سے اُردو رسم خط کی اصلاح کی بحث کو اس رسالہ میں جاری رکھینگے۔

(اڈیٹر)

میں یہاں اُردو رسمِ خط پر ایسی بحث کرنا نہیں چاہتا جو اس مسئلہ کے ہر پہلو اور جزو پر حاوی ہو بلکہ صرف دو امور کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

اوّل یہ کہ اُردو رسمِ خط میں یکسانی ہونی چاہیئے۔ دوم یہ کہ بعض حروف میں صحیح طور سے آوازوں کے اظہار کے لیئے کچھ خفیف سا تغیر کیا جائے۔

یکسانی کا سوال خصوصاً اُس وقت پیش آتا ہے جب کہ ہم مرکب افعال یا ایسے مرکب الفاظ سے بحث کرتے ہیں جن میں لاحقے لگے ہوتے ہیں۔

میں ہندوستان کے سنگی مطبع کی چھپی ہوئی ایک کتاب لیتا ہوں اور ایک ہی صفحہ میں مفصلۂ ذیل الفاظ دیکھتا ہوں۔

ترقی کرتا جائے گا　　رہیگا　　ہو جائیں گے　　رہے گی

دودھ پلانے والا حیوان　　دیکھتے دیکھتے　　کردیجائے

سنگی مطابع کی چھپی ہوئی کتابوں میں الفاظ کے درمیانی فصل کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ لیکن ٹائپ کی چھپی ہوئی اور خاصکر یورپ کی مطبوعہ کتابوں میں اِس کا بہت خیال کیا جاتا ہے۔ تاہم اس کے متعلق چند ایسے اصول قایم کئے جاسکتے ہیں جو تمام صورتوں پر حاوی ہوں۔

"دیکھتے دیکھتے" ہی کو لیجئے۔ یہ کیوں بلا فصل لکھے یا چھاپے جائیں؟ یہ دو جُدا جُدا لفظ ہیں اور محض نحوی تکرار کی وجہ سے انھیں بلا فصل لکھنا جائز نہیں۔

"کردی جائے" ایک مرکب فعل ہے۔ جو تین مختلف افعال سے مل کر بنا ہے۔ ان میں سے ہر ایک الگ الگ لکھا جانا چاہیئے۔ "کرتا جائیگا" میں دو فعل ہیں۔ یعنی کرتا اور جائیگا، اگرچہ جائیگا خود مرکب ہے جس میں ایک لاحقہ لگا ہوا ہے۔ چونکہ لاحقہ خود کوئی مستقل معنے نہیں رکھتا لہذا ہم اُسے اُس لفظ سے ملا کر لکھتے ہیں جس سے وہ متعلق ہے۔

میں اس کے متعلق یہ قاعدہ قایم کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ جن مرکب افعال یا الفاظ کے اجزائے ترکیبی مستقل الفاظ ہیں تو اُن کے ہر جز کو الگ الگ لکھا اور چھاپا جائے۔

۲۔ جہاں کوئی ایسا لاحقہ یا سابقہ ہے جو مستقل معنی نہیں رکھتا تو اُسے اُس لفظ سے ملا کر لکھا جائے جس سے وہ متعلق ہے۔

وہ سات مثالیں جو میں نے شروع میں لکھی ہیں اس قاعدے کے رو سے یوں لکھی جائینگی۔

رہیگی	ہو جائینگے	رہیگا	ترقی کرتا جائیگا
دودھ پلانے والا حیوان	دیکھتے دیکھتے	کردی جائے

اگر ہم حروفِ ربط و جار کو مستقل الفاظ قرار دیں تو شاید جائز خیال نہ کیا جائیگا، لیکن جب دوسری ترقی یافتہ زبانوں کو دیکھتے ہیں تو یہ اُصول صحیح معلوم ہوتا ہی۔ مثال کے طور پر ہم چند الفاظ لکھتے ہیں۔

صحیح		غیر صحیح
گھاٹ پر	نہ کہ	گھاٹپر
دوپہر سے	نہ کہ	دوپہرسے

یہاں دوپہر ایک مرکب لفظ ہی۔

لڑکے کو	نہ کہ	لڑکیکو
بہ دستور	نہ کہ	بدستور

حروفِ اضافت کے معاملہ میں بھی کسی قاعدے کی پابندی نہیں کی جاتی۔ میری رائے میں انھیں مثل دوسرے حروف ربط و جار کی طرح الگ لکھنا چاہیئے۔ مثلاً

صاحب کا	نہ کہ	صاحبکا

اب تیسرے قاعدے کی صورت یہ ہوگی۔

۳۔ حروفِ ربط و جار مستقل الفاظ کی طرح الگ الگ لکھے اور چھاپے جائیں۔

اُردو میں بہت سے مرکب اسماء اور صفات ہیں۔ انگریزی میں اس قسم کے مرکبات کو خطِ فصل کے ساتھ لکھتے ہیں۔ (مثلاً کن پھٹا انگریزی میں (Kau-phata) لکھا جائیگا۔ لیکن ہمارے لیئے ایسی صورتوں میں صحیح اُصول یہ ہوگا کہ ہم دونوں لفظوں کو پاس پاس بلا فصل لکھیں۔ یعنی جب ہم دو مختلف لفظ ایک ساتھ لکھتے ہیں تو اُن میں تھوڑا سا فصل رکھتے ہیں۔ ان مرکبات میں کے الفاظ میں کوئی فصل نہ ہونا چاہیئے، لیکن ایک کے حروف دوسرے میں نہ ملا دیئے جائیں۔ مثلاً

کن پھٹا	نہ کہ	کنپھٹا

کام چور	نہ کہ	کاپچور

گویا چوتھا قاعدہ ہوا۔

۴۔ ایسے مرکب الفاظ جو دو مستقل الفاظ سے مل کر بنیں (جو عموماً اسما یا صفات ہوتے ہیں) تو اُن کے درمیان کوئی فصل نہ ہونا چاہیئے، لیکن ایک کے حروف دوسرے کے حروف میں نہ ملا دیئے جائیں۔

اب میں دوسرے امر کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اس سے میرا مطلب یہ ہی کہ صحیح آوازوں کے اظہار کے لیئے بعض اُردو حروف کی شکلوں میں خفیف سا تغیر ضروری ہی۔

اوّل ی کو لیجئے۔ اِس کی تین آوازیں ہیں۔

معروف	جیسے	دہلی
مجہول	جیسے	لڑکے کو
ماقبل فتح	جیسے	ہی۔ بیا

یہ تین صورتیں پہلے سے مستعمل ہیں۔ لیکن یہ اُسی وقت کام آسکتی ہیں جب کہ ی لفظ کے آخر میں ہو۔ مگر اس قاعدے کی بھی عموماً پابندی نہیں کی جاتی۔ عام طور پر صرف پہلی دو صورتیں استعمال کی جاتی ہیں اور مطبوعہ کتابوں میں بھی یہی رائج ہی۔ تیسری صورت کو بھی وہ دوسری صورت ہی سے ظاہر کرتے ہیں۔ میری رائے میں تینوں صورتوں کو لفظاً کے ساتھ قایم رکھنا چاہیئے۔ اور ٹائپ بھی اِسی اُصول کے مطابق بنایا جائے۔

اب مشکل اس صورت میں پڑتی ہی جب ی الفاظ کے بیچ میں آتی ہی، شروع میں اِس کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔

اِس بارے میں میری تجویز یہ ہی کہ نقطوں کے ذریعہ سے اِن آوازوں کا امتیاز ظاہر کیا جائے۔ اِس طریقہ میں بڑا فائدہ یہ ہی کہ ایک اجنبی شخص بھی پڑھنے میں غلطی نہ کریگا۔

یاے معروف کے لیئے ہم ی کے دو نقطے پاس پاس لکھینگے جیسا کہ عام طور پر یَ کے نقطے لکھے جاتے ہیں۔ جیسے کھیر، ہیرا۔

مجہول کے لیئے بے نقطوں کے ایک چھوٹا سا باریک خط کھینچ دیا جائے۔ جیسے گھیرا ڈیرا۔

ماقبل فتح کے لیئے مجھے سرای ڈینیسن راس نے ایک بات سمجھائی جس کے لیئے میں اُن کا ممنون ہوں کہ نقطے ایک دوسرے کے نیچے لکھے جائیں۔ جیسے پپیا کہیا۔

اُردو میں ایسے الفاظ کچھ کم نہیں ہیں جن کی صورت تو ایک ہی مگر محض درمیانی حروفِ علّت کی آواز کے اختلاف سے اُن کے معنی مختلف ہو جاتے ہیں۔ مثلاً

بیر (بہادر، سورما)

بیر (ایک قسم کا پھل)

بیَر (عداوت)

بہ نظرِ صحت لکھنے میں مناسب امتیاز کا اظہار ضروری ہے۔

یہی حالت و کی ہے۔ اِس کی بھی تین آوازیں ہیں۔ اور امتیاز پیدا ہو سکتا ہے۔

معروف کے لیئے معمولی و لکھا جائے۔ مثلاً تھوک۔

مجہول کے لیئے و کا نیچے کا سرا ذرا آگے کو بڑھا دیا جائے دو۔ رو۔

ماقبل فتح کے لیئے نیچے کے حصّہ کو حلقہ بنا دیا جائے۔ جیسے جو (اناج)

اِس حرف میں ابتدائی اور درمیانی صورتوں کے امتیاز کی ضرورت نہیں پڑتی۔

اب ن کا معاملہ رہ گیا۔ اِس کی دو آوازیں ہیں ایک تو معمولی دوسری غنّہ۔ غنّہ کی بھی دو حالتیں ہیں ایک جب نون لفظ کے آخر میں آتا ہے دوسرے جب وہ درمیان میں استعمال ہو۔ آخر کی صورت تو آسان ہے کہ وہ بغیر نقطے کے لکھا جاتا ہے۔ جیسے کریں نہیں

درمیانی نون غنّہ کے لیئے کوئی اور صورت پیدا کرنی چاہیئے۔ میری رائے میں ایسے نون کے لیئے اوپر خالی حلقہ بنا دیا جائے۔ جیسے گنوار اینٹ کنور

ہندی حروف جن میں ہ الگ آواز دیتی ہے اور دوسرے حرف سے مل کر ایک حرف ہو جاتے ہیں انھیں دوچشمی (ھ) سے لکھا جاتا ہے اور جو ہ الگ آواز دیتی ہے اُس کی صورت دوسری ہے۔ مثلاً

بھائی (برادر) بہائی (بہا کا پیرو)

تحریر میں اِس قاعدے کی پابندی ضرور ہونی چاہیئے۔

یورپ کے مطابع میں ٹ ڈ ڑ میں بجائے ط کے چار نقطے دیتے ہیں مثلاً

ٹ ڈ ڑ

میری رائے میں یہ درست نہیں۔ ہمارے ہاں جو قاعدہ رائج ہے وہ زیادہ بہتر ہے۔ اور اُنہیں بھی یہی اختیار کرلینا چاہیئے۔

(باقی آئندہ)

مُصنّفین و شعرائے تیموریہ

(از تاریخ ادبیات ایران جلد سوم مؤلّفہ پروفیسر ای جی براؤن کیمبرج)

پائدار حکومت شاعرانہ بلند پروازی کے لیئے ضروری چیز نہیں

گزشتہ سطور میں اشارہ کر چکے ہیں کہ بہترین شاعری عموماً آشوب و تلاطم کے زمانوں میں پیدا ہوا کرتی ہے، بخلاف اس کے امن و خوشحالی اور پائداری حکومت کے زمانوں میں شاعری کی زمین بنجر ہو جاتی ہے۔ یہ صورت جس قدر عجیب و غریب ہے اُسی قدر اعتراض سے پاک اور حقیقت سے قریب ہے اور کم از کم ایران کی تاریخ اس کی شاہد ہے۔ عہدِ صفویہ (۱۵۰۲ - ۱۷۳۶) خاص کر سولھویں صدی میں اضلاع عجم کو جو طاقت و توانائی، اتفاق و یکجہتی اور سکون و فارغ البالی میسر تھی وہ ازمنۂ جدید میں اِس کو کبھی نصیب نہ ہوئی۔ اگرچہ یہ زمانہ ایران کے فوجی عظمت و عروج، قومی ایتلاف و فروغ تجارت و صنعت خصوصاً فنِ تعمیر و مصوری طبعیات و علوم اور مخصوص طور پر دینیات کے لحاظ سے شہرۂ آفاق تھا۔ لیکن اس میں تقریباً ایک شاعر بھی ایسا نہ ہوا جو بلحاظ ذہانت اقلیم شعر کی فرمانروا، اور جس کی شہرت اکناف زمین کی ایک مالک تسلیم کی جاتی۔ اِس خصوصیت کے اسباب کی بحث اُس مقام پر آئیگی جہاں دورِ صفویہ کی داستان درج ہوگی، لیکن بخلاف اس کے دورِ تیموریہ میں، جس کے علمی کارناموں کو ہم اس باب میں چھیڑنا چاہتے ہیں اور جس کے حالات گزشتہ باب میں ناظرین پر ہویدا ہو چکے ہیں، بدامنی و فساد، اور خونریزی و عناد کا ایک طوفان برپا تھا، تاہم اس کے مقابلے میں مشکل سے ستّر سال (۱۳۲۵ - ۱۴۰۰) کا کوئی مسلسل دور پیش کیا جا سکتا ہے جس نے جلیل القدر شعرا کی اسقدر کھچا کھچ محفل تیار کی ہو۔ یہ وہ محفل ہے جس کا ایک ایک سخن طراز اپنا جواب نہ رکھتا تھا اور حافظ اعظم اُن میں صرف ایک فرد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگرچہ اس کا مرتبہ سب سے سوا ہے، غالباً بہت سے چھوٹے چھوٹے درباروں کا وجود شاعرگری کے لیئے مفید ہے، سبب یہ ہے کہ ان میں رقابت کی چوٹیں چلتی رہتی ہیں، ایک دربار دوسرے کو مسابقت کی دوڑ میں پیچھے چھوڑنا چاہتا ہے، شاعر بھی اگر ایک جگہ سے ناکام پھرتا ہے

تو دوسری جگہ آسانی سے داد و صلہ حاصل کر لیتا ہے، لیکن جب ملک بھر میں ایک ہی دربار ہو تو بات کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے، جو مدعیٔ فن موقعہ نہ پانے یا بدبختی و مصائب اور حاسدوں کی دراندازی نہ کہ اپنی بدلیاقتی سے یہاں تشنہ لب و مایوس ہو جاتا ہے وہ غالباً ہمیشہ کے لیے بیٹھ جاتا ہے، یا کم از کم حلقۂ احباب سے باہر گمنام رہتا ہے۔

طاقتِ مغلیہ کے زوال اور تیمور کے عروج تک ایران کی پُرآشوب حالت

اِس نقطۂ نظر سے ایران انقراضِ مغلیہ کے بعد اور غلبہ تیمور سے قبل گشت آشنا شاعر کے لیے بہترین میدان بن گیا تھا، شمال مشرق میں کرت شہزادوں کا دربار ہرات میں قایم تھا، سبزہ وار اور اُس کے نواح میں خاندان سربہ دار (اگر یہ خاندان اِس لقب سے موسوم کیا جا سکتا ہے) حکومت کرتا تھا، خوانین ایل خانی یعنی شیخ حسن بزرگ، اِس کا بیٹا سلطان اویس اور اِس کے جانشین اُس عجیب و بیضوی سلطنت پر قابض تھے جس کا شمالی پایۂ تخت تبریز میں تھا اور جنوبی بغداد میں۔ ایران کا جنوب خاندانِ مظفریہ کے وارثوں میں تقسیم تھا جو اکثر ایک دوسرے سے آزاد اور کبھی برسرِ پیکار رہتے تھے، کسی کا مستقر شیراز تھا، کسی کا اصفہان تھا، کسی کا یزد اور کسی کا کرمان، یہ چھوٹی چھوٹی سیّال حکومتیں گھٹتی بڑھتی رہتی تھیں۔ آج ان کا رقبہ کچھ ہی تو کل کچھ، نقشہ ان کی حدود معیّن نہیں کر سکتا۔ اگر ہم اس دور کا سیاسی جغرافیہ مرتّب کرنا چاہیں تو ہمیں سات یا آٹھ مرکز تصور کرنے چاہئیں جہاں سے اسی قدر جنگ جو اپنے اقتدار و اثر کی شعائیں مختلف طاقتوں کے ساتھ ہر سمت میں پھیلاتے رہتے تھے۔ لیکن اکثر حالتوں میں ان کا مشغلۂ شمشیر ان کے پاکیزہ علمی ذوق کے ساتھ پرورش پاتا تھا۔

اِس دور کے شعرا کی قابلیت اور تعداد

اس دور کے سخن سنجوں میں کم از کم دس توجّہ کے مستحق ہیں، استحقاق کی بنیاد یا تو اُن کی مستند جدّت طرازی اور حسنِ کلام ہی یا اُن کی شہرت و وسعت نام جو اُن کو اپنے وطن میں حاصل ہی، شہرت و قابلیت اگرچہ عام طور پر لازم و ملزوم نہیں لیکن ہمارے نزدیک ان میں سے ہر چیز ایک شاعر کو مسند اعزاز کا حقدار بنا دیتی ہی، غیر ملکی ناقد کو چاہیئے کہ وہ اپنے فیصلوں کو ہرگز اٹل نہ سمجھے اور ہمیشہ یاد رکھے کہ باوجود کد و کاوش اُس کی نگاہ مذاق میں وہ موشگافی اور نزاکت شناسی نہیں پیدا ہو سکتی جو ایک ملکی ناقد کا خاص حصّہ ہی، محض یہ خیال کہ ایک شاعر نے اپنے ملک میں صدیوں تک اپنی شہرت کو سرنگوں نہ ہونے دیا اُس کو تعظیم و توجّہ کا مستحق کر دیتا ہی۔

اِس خصوصیت کا اطلاق خواجو، عماد کرمانی اور کمال خوجندی جیسے غزل سراؤں پر ہوتا ہے جن کی نسبت یہ دھوکا ہو سکتا ہے کہ وہ حافظِ بے عدیل کے ادنیٰ زلہ خوار ہیں اور جدت و تازگی سے ناآشنا لیکن امرِ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے پہلا حافظ سے ۳۰ اور دوسرا ۱۰ سال پیشتر مر چکا تھا اور کچھ بعید نہیں کہ دونوں نے حافظ کی پاکیزہ ترجمانیوں کے لیئے غزل کا میدان صاف کر دیا ہو، رہا تیسرا جو حافظ کا معاصر تھا اُس کا پایہ خود حافظ نے ذیل کے شعر میں تسلیم کیا ہے:۔

چوں غزلہائے تر و دلکش حافظ شنود — گر کمالیش بود شعر نہ گوید بہ خجند

اِسی دور کے دوسرے شعرا مثلاً عبید زاکانی اور ابو اسحاق نکات آفرینی و جدت طرازی میں اسقدر ید طولیٰ رکھتے ہیں کہ اُن کے ابنائے وطن نے خواہ اُن کو فہرست کمالات میں جگہ دی ہو یا نہ دی ہو لیکن ادبیات عجم کا محقق اِن کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

ایرانی تذکرہ نویسوں کی غلط بیانی

لہٰذا اس باب میں ہم شعرائے ذیل پر تبصرہ کرنا چاہتے ہیں، تقدیم و تاخیر بیان کا انحصار یا تو اصل قابلیت پر ہوتا یا تاریخوں پر لیکن تاریخوں میں کامل صحت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا، باعث یہ ہے کہ تذکروں میں اکثر شاعروں کی صرف تاریخ وفات مذکور ہے اور وہ بھی قیاس کی آلودگی سے معرّا نہیں، اس کے سوا بہت سی حالتوں میں معلوم نہیں ہو سکتا کہ آیا ایک شاعر کس عمر میں فوت ہوا، صرف جوان ہو کر یا پوری عمر ہو کر۔ دولت شاہ، آتش کدہ، ہفت اقلیم اور اسی قبیل کی مشہور تالیفوں میں درجنوں کاملین فن کے حالات زندگی اور اُن کے عادات و خصائل درج ہیں، لیکن نقص استناد سے قدم قدم پر ٹھوکر لگتی ہے اور محقق کی جان عذاب میں پھنس جاتی ہے، اِن تذکروں کے اکثر قصے پوچ و لچر ہوتے ہیں یا بے بنیاد اور فرضی اشعار سے کہیں کہیں واقعات کا جھوٹ سچ کھل جاتا ہے لیکن پھر یہاں بھی ایک مشکل سامنے آجاتی ہے۔ دیوان و کلیات کی دو نقلیں آپس میں نہیں ملتیں، آخر ہار کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ شعر گویان عجم کی نسبت ہم جو کچھ جانتے ہیں وہ بہت کم ہے۔ یہ لوگ عموماً غریب و نادار ہوتے تھے، سوسائٹی میں ان کا نام گمنامی کا شکار رہتا تھا اور اس بنا پر مورخین معاصران کو قلم انداز کر دیتے تھے، بعد کی نسلیں جب ان کے جوہر کو پہچانتیں تو وہ عموماً اُن کے کلام کے بعض مشکل مقامات کو حل کرنے کی غرض سے کم و بیش معمولی قصے گھڑ کر اُن کے نام سے مشہور کر دیا کرتیں، تاہم

تاہم اس اعتراض سے ایک قلمی مگر نایاب نسخہ کو مستثنیٰ کر دینا چاہیئے یعنی "مجملِ" فصیحی خوانی کو جو تقریباً ایک ہزار صفحے کی ایک تاریخ ہی اور ۸۴۵ھ / ۱۴۴۱-۴۲ء میں تالیف ہوئی تھی، اِس میں بہت سی قیمتی چیزیں ہیں جو کہیں میسّر نہیں آسکتیں، صوبہ خراسان کے حالات عموماً اور شہر ہرات کی سوانح خصوصاً قابل دید ہیں۔

دس شاعروں کا حال اس دور کے جن شعرا سے ہم بحث کرنی چاہتے ہیں وہ یہ ہیں[1]:-

(۱) ابنِ یمین (۲) خواجو کرمانی (۳) عبید زاکانی (۴) عماد کرمانی

(۵) سلمان ساوجی (۶) حافظ شیرازی (۷) کمال خوجند (۸) مغربی

(۹) ابو اسحٰق شیرازی (۱۰) محمود قاری

شمس الدین محمد حافظ اِس دور کے شاعروں کی نسبت کی معلومات کے باب میں اوپر جو کچھ بیان ہو چکا ہی وہ ان میں بلکہ ایران کے تمام شاعروں میں سب سے زیادہ ممتاز اور سب سے زیادہ مشہور، غیر فانی اور فقید الدہر حافظ شیرازی پر خصوصیت کے ساتھ منطبق ہوتا ہی، جس نے اپنے مداحوں کی زبان سے لسان الغیب اور ترجمان الاسرار کا خطاب حاصل کیا ہی۔ یہ قدرتی بات تھی کہ اِس کی وفات کے بعد دولت شاہ سے (جو حافظ کے سو برس بعد ہوا ہی) بالکل جدید زمانہ تک مجمع الفصحا اور ریاض العارفین میں اس کا ذکر آیا ہی لیکن ان میں حافظ کی تفصیلِ زندگی اعتبار کے لائق نہیں۔ حالات کا بڑا حصّہ قصّوں پر مشتمل ہی جو اُس کے بعض اشعار کے ساتھ مخلوط کر دیئے گئے ہیں اور سب نہیں تو اکثر قصّے اشعار کی تمثیل یا تشریح کی نیت سے وضع ہوئے ہیں، جہاں تک ہمیں معلوم ہی حافظ کا معاصرانہ ذکر اس کے دوست اور جامع کلام محمد گل اندام کے دیباچہ میں پایا جاتا ہی۔ اس نے شاعر کی بے نظیر ذہانت اور عالمگیر ہمدردی کی تعریف کے بعد لکھا ہی کہ خواجہ کی نظم کا آوازہ خود اُس کی زندگی میں ہر طرف گونج اُٹھا تھا، نہ صرف ایران فارس سے خراسان و آذربایجان تک بلکہ ہند و ترکستان اور عراق عرب بھی اِس کے افکار پر سر دُھنتا تھا، گل اندام آگے چل کر بیان کرتا ہی:-

محمد گل اندام کا بیان "لیکن میں قرآن کی متواتر تلاوت، امور سلطانی کی مسلسل تعمیل، کشاف[2] و مصباح[3]

---

[1] ترجمہ کے لیے، صرف حافظ کو انتخاب کیا گیا ہی، مترجم [2] مشہور تفسیر القرآن الزمخشری۔

[3] المسطرزی (متوفی ۶۱۰ - ۱۲۱۲ء) نے صرف و نحو عربی پر اس نام کی متعدد کتابیں لکھی ہیں، غالباً ان میں کسی تالیف سے مراد ہی۔

کی حاشیہ نویسی، مطالع[1] و مفتاح[2] کے مطالعہ، اُصول تنقید علمی کی تحصیل اور شعر عرب کی لطف اندوزی میں اسقدر مصروف رہتا تھا کہ حافظ کے غزل و اشعار کو جمع نہ کرسکا اور اُن کی ترتیب و تحشیہ سے عہدہ برآنہ ہو سکا۔ جس زمانہ میں حافظ آقائے نامدار اُستاد یگانۂ روزگار محمد قوام الدین عبداللہ کے درس میں شریک ہوتے تھے تو میں اثناءِ گفتگو میں ہمیشہ اور پے درپے اُن سے کہا کرتا تھا کہ وہ (حافظ) ان نادر جواہرات کو ایک لڑی میں پرودیں اور ان چمکدار موتیوں کو ایک سلک میں جمع کردیں تاکہ وہ ان کے معاصرین کے لیئے ایک گلوبند بیش بہا یا عروسانِ ہم عہد کے لیئے ایک کمربند بن جائیں، مگر حافظ اس درخواست پر عمل پیرا نہ ہوسکے، عذر یہ تھا کہ شعراءِ معاصر قدرشناس نہیں ہیں، تا آنکہ اُنھوں نے ۷۹۱ ہجری (۱۳۸۹ء) میں اس زندگی کو خیرباد کہا ...."

حافظ کی سوانح عمریاں

سرگوراوسلے کی دل پسند تالیف "تذکرہ شعراءِ ایران"[3] میں اکثر وہ واقعے درج ہیں جو حافظ کے اشعار سے پیوند کردیئے گئے ہیں اور جن کا حوالہ اوپر آچکا ہے، اس کے زمانہ کے حالات اور اس کی شاعری کی خصوصیات پر مس جرٹ روٹ لوتھی اَن بِل نے اپنے معرکۃ الآرا کتاب "انتخابِ دیوانِ حافظ" (مطبوعہ لندن، ۱۸۹۷ء) میں بحث کی ہے۔ مس صاحبہ کی تالیف لیاقت و فراست، ذوقِ سلیم اور دقتِ نظر کا مجموعہ ہے، اس کے ذریعہ سے حافظ کا کلام انگریزی طبقے کے ہاتھ میں پہنچ گیا ہے، لیکن جہاں تک راقم الحروف کو معلوم ہے شبلی نعمانی کی اُردو تصنیف شعر العجم[4] میں حافظ کا تنقیدی مطالعہ جامعیت و خوبی کی آخری منزل تک پہنچا دیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے لیئے اس سے بہتر صورت نہیں کہ یہاں شعر العجم کے کم از کم اُس حصّہ کو جو شاعر کی زندگی سے متعلق ہے اور اُن چند واقعات کو جو اُس کے ذاتی حالات اور معاصرین کے تعلقات پر مشتمل ہیں اور جو اس کے اشعار سے اخذ کیئے جا سکتے ہیں، تلخیص کرکے ہدیۂ ناظرین کروں، ساتھ میں سوانح حافظ کے اُن عجمی ماخذوں کو بھی

---

[1] غالباً مطالع الانظار بیضوی (متوفی ۶۸۳ - ۱۲۸۴) سے مراد ہے۔ [2] غالباً مفتاح العلوم مصنفہ الکلی (متوفی ۶۲۶ = ۱۲۲۹ء) مراد ہے۔ [3] صفحہ ۲۳ - ۴۲

[4] جلد دوم صفحہ ۲۱۲ - ۲۹۷

ظاہر کردوں جن کی طرف علامہ موصوف نے شعر العجم میں اشارہ کیا ہے، ماخذوں میں شبلی نے مشہور حبیب السیر میخانہ عبد النبی فخر الزمانی (مؤلفہ ۱۰۳۶ = ۲۷ - ۱۶۲۶ء بعہد جہانگیری) کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے لیکن آخر الذکر کا کوئی نسخہ ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ فارسی تذکروں میں، جن سے ہم نے استفادہ کیا ہے، معلومات کا بڑا توڑا ہے بقول شبلی، ایرانی تذکرہ نویس عموماً ایک دوسرے سے نقل کرتے چلے آئے ہیں اور اکثر حالتوں میں ایسے بیانات کو تسلیم کر لیتے ہیں جو نہ صرف معقول شہادتوں کے محتاج ہیں بلکہ باہمی تکذیب سے خود مسترد ہو جاتے ہیں، اس نوع کی تالیفات میں تذکرۃ الشعرا دولت شاہ ہے، بہارستانِ جامی، نفحات الانس، آتش کدۂ لطف علی بیگ جو تمام تر دولت شاہ سے ماخوذ ہے، ہفت اقلیم اور تازہ ترین مجمع الفصحا ہے جس میں چند نئی مگر مشتبہ باتیں اضافہ کی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ خواجہ حافظ کا اصلی وطن تویسرکان تھا اور انھوں نے قرآن کی ایک تفسیر بھی لکھی تھی۔

حافظ کا نسب اور بچپن

شبلی نے اپنے مواد کو باقاعدگی سے ترتیب دیا ہے، حافظ کا ذکر اُن کے نسب و تعلیم سے شروع کرتے ہیں ان کی تفصیل میخانہ بالا سے ماخوذ ہے، لیکن بظاہر وہ اس کتاب کو پایۂ اعتبار سے گرا ہوا سمجھتے ہیں ان کا بیان ہے کہ حافظ کے والد ماجد بہاؤ الدین نامی نے اتابکانِ فارس کے عہد میں ترک وطن کیا اور اصفہان سے شیراز آئے جہاں انھوں نے تجارت کے ذریعے سے بڑی دولت پیدا کی لیکن انتقال پر اپنے کاروبار کو ابتری اور بیوی بچّہ کو مفلسی میں چھوڑتے گئے، حتیٰ کہ کم سن حافظ کو معاش کے لیئے محنت و عرق ریزی پر مجبور ہونا پڑا، تاہم انھوں نے محلّہ کے ایک مکتب میں تعلیم پانے کے لیئے وقت اور خرچ کا انتظام کر لیا۔ یہاں معقول لیاقت پیدا کی اور قرآنِ مجید حفظ کر لیا، اسی نسبت سے انھوں نے بعد میں حافظ کا تخلّص اختیار کیا، اصطلاح حافظ اُن لوگوں کے لیئے مخصوص ہے جو اسلام کی مقدّس کتاب کو حفظ کر لیتے ہیں اور اسے صحیح سنا سکتے ہیں، حافظ بہت جلد شعر کہنے لگے اور مشاعروں میں آنے جانے لگے، لیکن ابتداً انھیں کامیابی نہ ہوئی، آخر ایک شب شیراز کے شمال میں بابا کوہی کے مزار پر حاضر ہوئے اور شب بیداری کی تو امام علی کی زیارت سے مشرف ہوئے، امام نے اُن کو ایک عجیب اور ربانی غذا کھلائی اور بشارت دی کہ جاؤ آج سے تم کمالات شاعری اور کلید علوم کے مالک ہو۔

---

[1] جلد سوم، حصّہ دوم، صفحہ ۷۳، لیتھو ایڈیشن، مطبوعہ بمبئی ۱۸۵۷ء [2] صفحہ ۹ مطبوعہ قسطنطنیہ (۱۲۹۴ = ۱۸۷۷)
[3] مرتّبہ سے نسولیز، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۹ صفحہ ۱۵۔

حافظ کے ممدوح | اِس کے بعد مولانا شبلی اُن سلاطین و اکابر کا ذکر کرتے ہیں جو حافظ کے مُربّی اور قدردان تھے، ان میں پہلا شخص شاہ یا شیخ ابو اسحاق انجو تھا جس کا باپ محمود انجو[۱] غازانی خاں کے عہد میں فارس کا گورنر مقرر ہوا تھا، ابو اسحاق[۲] خود شاعر تھا اور شاعروں کا قدردان تھا، مگر لاپروا، عیش پسند اور فرایض حکومت سے اِس قدر غافل تھا کہ آخر میں مشکل سے جب اس کے مقرب خاص شیخ امین الدین نے شاہ مظفر کے لشکر پر جو پایۂ تخت کو محصور کیے پڑا ہوا تھا متوجہ کیا تو اُس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ دشمن بڑا احمق ہے کہ بہار کے دلفریب موسم کی اس طرح تضیع کرتا ہے اور یہ شعر زبان پر لایا:-

بیا تا یک امشب تماشا کنیم ‌‌ ‌‌ ‌‌ چو فردا شود کارِ فردا کنیم

ابو اسحٰق کے مختصر لیکن فرحت انگیز عہد کی نسبت خواجہ صاحب کہتے ہیں:-

راستی خاتم فیروزۂ بو اسحاقی ‌‌ ‌‌ ‌‌ خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود

دربار ابو اسحٰق کے پانچ ارباب کمال | ذیل کے اشعار جن میں ابو اسحٰق کے ارباب کمال کا ذکر قلمبند ہے اِسی زمانہ کی تصنیف ہیں:-

بعہدِ سلطنتِ شاہ شیخ ابو اسحاق ‌‌ ‌‌ ‌‌ بہ پنج شخص عجب مُلک فارس بود آباد

نخست پادشہے ہمچو او ولایت بخش ‌‌ ‌‌ ‌‌ کہ گوئے فضل ربود او بعدل و بخشش و داد

دوم بقیۂ ابدال[۳] شیخ امین الدّین ‌‌ ‌‌ ‌‌ کہ بود داخلِ اقطاب و مجمعِ اوتاد

سوم چو قاضیِ عادل اصیلِ ملّت و دیں ‌‌ ‌‌ ‌‌ کہ قاضی بہ از و آسماں ندارد یاد

دگر چو قاضیِ فاضل عضد کہ در تصنیف ‌‌ ‌‌ ‌‌ بنائے شرح مواقف بنامِ شاہ نہاد

دگر کریم چو حاجی قوامِ دریا دل ‌‌ ‌‌ ‌‌ کہ او بجود چو حاتم ہمی صلا در داد

---

[۱] فارس نامہ کے مطابق ارپہ کے ہاتھ سے ۷۳۶ھ / ۱۳۳۵-۳۶ء میں قتل ہوا اور ارپہ کو اس کے بیٹے مسعود انجو نے تہ تیغ کیا۔ [۲] فارس نامہ میں تحریر ہے کہ اس نے ۷۴۳ھ / ۱۳۴۲-۴۳ء میں شیراز فتح کیا اور یہیں ۷۵۳ھ / ۱۳۵۲-۵۳ء میں مبارز الدین محمد بن مظفر نے اس کو گھیر لیا، لکم بن یحیٰ علی سہل کے قتل پر اصفہان کی جانب پسپا ہوا اور بالآخر ۷۵۸ھ / ۱۳۵۷ء میں حریف کے ہاتھ سے گرفتار اور قتل ہوا۔ [۳] ابدال، اقطاب و اوتاد رجال الغیب کے تین طبقے ہیں، صوفیہ کا عقیدہ ہے کہ یہ حضرات نظام عالم اور فلاح انسان کے حامل ہیں، اِن کی تعداد فرایض اور اختیارات کی نسبت شریف جرجانی نے "تعریفات" کی بحث میں صراحت کی ہے، شریف کو شاہ شجاع نے شیراز میں پروفیسری کے عہدہ پر مامور کیا تھا، یقین ہے کہ یہ حافظ سے واقف ہوگا، اس نے ۸۱۶ = ۱۴۱۳ میں انتقال کیا۔ [۴] عضد الدین عبد الرحمن بن احمد الایجی نے مذہب و دینیات اور فلسفہ و اخلاق وغیرہ پر کئی تصانیف چھوڑی ہیں، اِن میں مواقف فی علم الکلام (شریف جرجانی مذکور حاشیہ نمبر ۳ نے اس کی ایک شرح لکھی ہے)

(بقیہ صفحہ ملاحظہ ہو)

نظیرِ خویش نہ بگزاشتند و بگزشتند　　خدائے عزّ وجل جملہ را بیامرزاد

مبارز الدین بن مظفر

مبارز الدین محمد بن مظفر نے ۷۵۴ھ سے ۷۵۹ھ (۱۳۵۲ - ۱۳۵۷ء) تک فارس پر حکومت کی لیکن وہ اپنے پیشروئے مقتول عیش پسند ابو اسحاق سے بالکل مختلف تھا، مزاج پر گرمی اور سخت گیری مستولی تھی، شعار و احکام کی تعمیل رہبانیت کی سرحد سے ٹکراتی تھی، شیراز پر قابض ہوتے ہی اُس نے تمام میخانوں کو اُجاڑ دیا، اور حتی الامکان مے نوشی کا خاتمہ کر دیا، حافظ اِس ورع و احتساب سے جل کر خاک ہوگیا، چنانچہ اشعار میں ان بے رونق ایام کا جا بجا تذکرہ کیا ہے۔ اور اشعارِ ذیل بھی اِس واقعہ کا نوحہ ہیں :-

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گل بیزست　(۱)　ببانگِ چنگ مخور مے کہ محتسب تیزست

در آستینِ مرقع پیالہ پنہاں کن　　کہ ہمچو چشمِ صراحی زمانہ خونریزست

ز رنگِ بادہ بشوئید خرقہا از اشک　　کہ موسمِ ورع و روزگارِ پرہیزست

بود آیا کہ درِ میکدہا بکشایند　(۲)　گرہ از کارِ فروبستۂ ما بکشایند

گیسوئے چنگ ببرید بمرگِ مۓ ناب　　تا ہمہ مغبچہ ہا زلفِ دوتا بکشایند

نامۂ تعزیتِ دخترِ رز بنویسید　　تا حریفاں ہمہ خوں از مژہا بکشایند

درِ میخانہ ببستند خدایا مپسند　　کہ درِ خانۂ تزویر و ریا بکشایند

اگر از بہرِ دلِ زاہدِ خودبیں بستند　　دل قوی دار کہ از بہرِ خدا بکشایند

شاہِ شجاع میخانوں کی اجازت دیتا ہے

شاہِ شجاع جب اپنے باپ مبارز الدین کا جانشین ہوا تو اُس نے تمام قیود کو اُٹھا دیا، اس موقع پر ذیل کی رباعی اِسی کا نتیجۂ فکر ہے :-

---

(بقیہ نوٹ صفحہ ۷) سب سے بلند پایہ ہے ۷۳۶ھ (۱۳۳۵ء) میں فوت ہوا، دیکھو بروکلمان "ادبیاتِ عرب" صفحہ ۲۰۸ - ۲۰۹ - [۵] خواجہ نے حاجی قوام کو متعدد اشعار میں یاد کیا ہے، ذیل کا شعر اس لحاظ سے بدرجۂ غایت مشہور ہے ؎ دریائے اخضرِ فلک و کشتیِ ہلال + ہستند غرقِ نعمتِ حاجی قوام ما۔ فارس نامہ میں حاجی موصوف کی تاریخ وفات ۷۵۴ھ (۱۳۵۲ء) منقول ہے۔

[۱] یعنی تار　[۲] اسلامی ممالک میں شراب کی تجارت یہودی، عیسائی یا زرتشتیوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے، حافظ اور اُس کے ہمنواؤں کے لیئے پیرِ مغاں (مجوسیوں کا سردار) اور مغبچہ (مجوسی بچہ) شراب خانوں کے عناصر لاینفک ہیں۔

[۳] یعنی شراب، عربوں کے ہاں بھی شراب اسی طرح بنت العنب کہلاتی ہے۔

در مجلسِ دہر سازِ مستی پست ست   نہ چنگ بقانون نہ دف بر دست ست

رنداں ہمہ ترکِ مے پرستی کردند   جز محتسبِ شہر کہ بے مے مست ست

حافظ نے بھی اماکنِ شراب کے دوبارہ افتتاح پر قہقہے لگائے ہیں :-

سحر ز ہاتفِ غیبم رسید مژدہ بگوش   کہ دورِ شاہِ شجاع است مے دلیر بنوش

شد آں کہ اہلِ نظر بر کنارہ می رفتند   ہزار گونہ سخن بر دہان ولب خاموش

بہ بانگِ چنگ بگوئیم آں حکایتہا   کہ از شنیدنِ آں دیگ سینہ میزد جوش

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند   گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

قسم بحشمت وجاہ وجلالِ شاہِ شجاع   کہ نیست باکسم از بہرِ مال وجاہ نزاع

بہ بیں کہ رقص کناں میرود بنالۂ چنگ   کسے کہ اذن نمی داد استماعِ سماع

چنگ در غلغلہ آمد کہ کجا شد منکر   جام در قہقہہ آمد کہ کجا شد منّاع

عمرِ خسر و طلب ار نفع جہاں مے طلبی   کہ وجود یست عطا بخش و کریمے نفّاع

مظہرِ لطفِ ازل روشنیِ چشمِ امل   جامعِ علم وعمل جانِ جہاں شاہِ شجاع

شاہِ شجاع کا خواجہ سے حسد

اگرچہ حافظ نے اشعار بالا اور دیگر مقامات پر شاہ شجاع کی مدحت سرائی کی ہی لیکن کہتے ہیں کہ شہزادہ شاعر کی طرف سے دل میں بیر رکھتا تھا۔ شجاع کو کرمان کے ایک شاعر عماد فقیہ سے نہایت عقیدت تھی، اِس کی نسبت بیان کیا جاتا ہی کہ اس نے ایک بلّی کو نماز کی تعلیم دی تھی اور جس وقت بادشاہ رکوع و سجود ادا کرتا تو بلّی بھی ہو بہو اس کی پیروی کرتی، بادشاہ اس کا رنامہ کو اعجاز سے تعبیر کرتا تھا لیکن خواجہ اس کو مداری کا کھیل سمجھتا تھا، چنانچہ وہ اپنے خیال کو نظم کرتا ہی :-

صوفی بجلوہ آمد و آغازِ ناز کرد   بنیادِ مکر با فلکِ حقہ باز کرد

اے کبکِ خوش خرام کہ خوش میروی بناز   غرّہ مشو کہ گربۂ عابد نماز کرد

---

۱ صفحات بالا ۲۴۳ اور ۲۵۰ میں اس تلمیح کا مفہوم بیان ہو چکا ہے **Rosenweig-Schwannan** کی ایڈیشن جلد اول صفحہ ۲۱۱ نمبر ۳

عماد کرمانی سے حافظ کی نفرت

روایت ہو کہ عماد سے حافظ کا تنفر شاہ شجاع کی خفگی کا اصلی سبب تھا لیکن میدان شاعری میں شجاع کی حزیمتیں رنجش کا باعث مزید ثابت ہوئیں، ایک موقع پر اس تاجدار نے حافظ کے کلام پر تعدد مذاق تنوع عنوان کا اعتراض کیا اور کہا کہ اس میں مقصد واحد کی بُو نہیں، کبھی صوفیانہ ہو تو کبھی عاشقانہ، کہیں بادۂ وجام کا شور ہو کہیں متانت و تورّع کا جوش، ایک شعر میں زبانِ رازی ہو، تو دوسرے میں دُنیا سازی، اور تیسرا اس سے بھی بدتر، حافظ نے جواب دیا "بجا ہو لیکن باوجود اس کے ہر شخص میرے اشعار سے واقف ہو، ان کی تعریف کرتا ہو اور لُطف لیکر پڑھتا ہو، بخلاف اس کے بعض شاعروں کا کلام (جن کو میں جانتا ہوں) شہر کے دروازہ سے باہر نہیں جاتا" اِس جواب سے شاہ شجاع نہایت برہم ہوا۔ چند ہی روز بعد حافظ کے اِس شعر پر اس کی نظر پڑی اور بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ حافظ اِس کے شکنجہ میں پھنس گیا اور اب اِس کی خیر نہیں ؎

گر مُسلمانی ہمیں ست کہ واعظ دارد

وائے گر از پسِ امروز بود فردائے

حافظ الزامِ کفر سے بچ نکلتا ہو

احباب نے حافظ کو خبر دی کہ دربار میں اس شعر کو بدعت و کفر یا الحاد و لا ادریت کے جرم کے لیئے ڈھالا جا رہا ہو، یہ سُن کر خواجہ بہت پریشان ہوئے اور مولانا زین الدین ابوبکر تائبادی کے پاس گئے جو اتفاق سے اُس وقت شیراز میں فروکش تھے، اِن سے پوچھا آپ کیا صلاح دیتے ہیں، اُنھوں نے فرمایا شعر پر دوسرا شعر بڑھا دو تا کہ متنازعہ فیہ کسی دوسرے کی زبان کا معلوم ہونے لگے اور تم نقلِ کفر کفر نباشد کے دامن میں محفوظ ہو جاؤ، خواجہ صاحب نے برجستہ کہا:-

ایں حدیثم چہ خوش آمد کہ سحر گہ می گفت

بر درِ میکدۂ با دف و نے ترسائے

اور جس وقت فردِ جُرمِ الحاد اِن کے خلاف باضابطہ طور پر مرتب ہوئی تو اُنھوں نے یہ شعر دوسرے شعر کے ساتھ پیش کر کے عرض کیا کہ پہلا شعر ایک عیسائی کا ہو، اور میں عیسائی کی رائے کا ذمّہ دار نہیں۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۹، ردیف د) میں اِن اشعار کا متن شبلی کے متن سے کسی قدر مختلف ہو، ہم نے یہاں شبلی سے نقل کیا ہو۔

۱۰۔ اقوال حبیب السیر جلد سوم، حصہ دوم، صفحہ ۳۷ وغیرہ میں منقول ہو۔

شاہِ منصور شاہ شجاع نے ۷۸۵ھ / ۱۳۸۳ء یا ۸۶ ہجری میں قضا کی، اُس کی جگہ اُس کا بیٹا زین العابدین تخت پر بیٹھا، مگر زین العابدین کو اُس کے چچازاد بھائی شاہ منصور نے ۷۸۹ھ / ۱۳۸۷ء میں معزول و مقید کر دیا، حافظ نے آخر الذکر کی کامیابی کی مبارک باد میں ایک غزل لکھی جس کا مطلع ہے

بیا کہ رایتِ منصور پادشاہ رسید
نوید فتح و ظفر تا بمہر و ماہ رسید

تیمور اور حافظ کی ملاقات زین العابدین نے جو بعد میں اندھا کر دیا گیا تھا، معزول ہونے سے قبل تیمور کی سیادت قبول کر لی تھی اور اِس کے سفیر قطب الدین کو اپنے دربار میں جگہ دے کر تاتار اعظم کا نام خطبے اور سکوں میں داخل کر لیا تھا، خود امیر تیمور بھی زین العابدین کے عزل سے پہلے ۷۸۹ھ / ۱۳۸۷ء میں شیراز آیا تھا، اگر تیمور اور حافظ کی ملاقات ایک افسانہ نہیں تو اس کا موقع یقیناً یہی ہونا چاہیئے اگرچہ دولت شاہ اور اُس کے متبعین اس ملاقات کو ۷۹۵ھ / ۱۳۹۳ء کا واقعہ بتاتے ہیں جب کہ تیمور دوسری مرتبہ شیراز میں داخل ہوا، لیکن اس سن میں شاعر کو انتقال کے تین یا چار سال گذر چکے تھے، ملاقات کا قصہ جتنا مشہور ہے اُتنا مستند نہیں۔

دولت شاہ پہلی ملاقات کی تاریخ ۷۹۵ھ / ۱۳۹۳ء لکھتا ہے اور پھر عجب بے احتیاطی سے حافظ کا سال وفات ۷۹۴ھ / ۱۳۹۲ء دیتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ حافظ نے ۷۹۱ھ / ۱۳۸۹ء میں انتقال کیا یا ممکن ہے کہ اِس کے ایک سال بعد، اوّل الذکر اعداد حافظ کی تاریخِ لوحِ مزار سے اخذ ہوتے ہیں جس کو ہرمن بک نیل نے کمال ذہانت سے انگریزی میں ترجمہ[۳] کیا ہے:-

تاریخ

چراغِ اہلِ معنی خواجہ حافظ — کہ شمعِ بود از نورِ تجلّی
چو در خاکِ مصلّٰی ساخت منزل — بجو تاریخش از خاکِ مصلّٰی

Chronogram.

On spiritual man the lamp of Hafiz gleamed,
Mid rays from Glory's Light his brilliant taper beamed;

---

۱ مؤخر تاریخ ان الفاظ سے (حیفا زشاہ شجاع) نکلتی ہے جو مجمل فصیحی میں درج ہے۔ ۲ دیکھو صفحہ ۳۰۵-۳۰۶ مرتبہ راقم

۳ دیکھو "حافظ شیرازی" ترجمہ ہرمن بک نیل (ٹروب نراینڈ کو، لنڈن ۱۹۰۵) صفحہ مقدمہ ۴۹

Musalla was his home: a mournful date to gain
Thrice take thou from Mosalla's Earth its
richest grain.

اعداد خاکِ مصلیٰ کی میزان ۹۱، ہوتی ہے اور MLL = ۱۱۰۰ش، میں سے III C = ۳۰۹)
کو تفریق کیا جائے تو بھی یہی تاریخ نکل آتی ہے، جامع دیوانِ حافظ، محمد گل اندام نے بھی یہی تاریخ لکھی ہے لیکن جامی نے
نفحات الانس، خواندمیر نے حبیب السیر اور فصیحی خوانی نے مجمل میں ۹۲، سال وفات درج کیا ہے۔

زندگی میں شہرت | بیان ہو چکا ہے کہ حافظ کی شہرت خود اس کی زندگی میں ہر طرف پھیل گئی تھی، وہ خود بھی
اس کا اشارہ کرتے ہیں :-

بشعر حافظِ شیراز می گویند و می رقصند
سیہ چشمانِ کشمیری و ترکان سمرقندی

ایک دوسرے مقام پر وہ اپنی ایک تازی غزل کے ذکر میں کہتے ہیں :-

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند | زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود
طیِّ مکاں بہ بین و زمانِ سلوکِ شعر | کیں طفلِ یک شبہ رہ یکسالہ می رود

حافظ کے تعلقات صرف مظفریانِ شیراز تک ختم نہیں ہوتے بلکہ وہ دوسرے سلاطینِ معاصر سے بھی نامہ و
پیام رکھتے تھے، سلطان احمد ابن اویس جلائر جو بغداد کا ایلخانی فرماں روا تھا اور فنونِ لطیفہ یعنی شاعری، موسیقی صناعی
اور مصوری میں کامل دستگاہ رکھتا تھا، بارہا حافظ کے سر ہوا کہ وہ بغداد تشریف لائیں اور اُس کے دربار کو زینت
بخشیں، لیکن جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں :-

نمی دہند اجازت مرا بسیر و سفر | نسیمِ بادِ مصلّیٰ و آبِ رکنا باد

تاہم خواجہ نے اس شہزادہ کو اپنی تحسین سے محروم نہ کیا، اس کی مدح کے بعض اشعار یہاں نقل کرتے ہیں :-

الحمد للہ علی معدلۃ السلطان | احمدِ شیخ اُویسِ حسنِ ایلخانی

لہ تاریخ ادبیاتِ ایران، مؤلفہ راقم جلد دوم صفحہ ۲۰۰۔

ٹہ مرتبہ Rosenweig-Schwannau جلد اوّل صفحہ ۱۶۴

خانِ بن خان و شہنشاہ شہنشاہ نژاد — آں کہ می زیبد اگر جانِ جہانش خوانی

از گلِ فارسیم غنچۂ عیشے نہ شگفت — حبذا دجلۂ بغداد و مئے رُوحانی

بر سخن کاکلِ ترکانہ کہ در طالعِ تست — دولتِ خسروی و منصبِ چنگیز خانی

گو خواجہ کو بغداد کا سفر نصیب نہ ہوا لیکن سفر کی آرزو دل میں جاگزیں تھی :-

رہ نبردیم بمقصودِ خود اندر شیراز

خرّم آں روز کہ حافظ رہِ بغداد کند

ہندوستان کی طلبیاں ہندوستان کے بھی دو مسند آراؤں نے خواجہ کو ہندوستان بُلانے کی کوشش کی، اِن میں ایک تو دکن کا والی محمود شاہ بہمنی تھا جس کا دربار بُلبلانِ شعر کا ملجا و ماوی بنا ہوا تھا، اِس نے اپنے مقرب خاص میر فضل اللہ کی وساطت سے حافظ کو ارضِ دکن کی دعوت دی اور سفر کے لیئے خرچ بھیجا، حافظ نے اس رقم کا بڑا حصّہ شیراز میں نیگ لگا دیا اور خلیجِ فارس آتے ہوئے جس وقت لار میں مقام کیا تو باقی کا روپیہ اپنے ایک مُفلس دوست کی نذر کر دیا، دو ایرانی سوداگر خواجہ زین الدین ہمدانی اور خواجہ محمّد کازرونی ہندوستان آرہے تھے اُنھوں نے خواجہ کی لُطفِ صحبت کے بالعوض خواجہ کی کفالت کا تہیّہ کیا، خواجہ اُن کے ساتھ بندرگاہ ہرمز تک آئے جہاں ایک جہاز ہندوستان کے مسافروں کا انتظار کر رہا تھا، لیکن اُن کے پہونچتے ہی سمندر میں طوفان آگیا اور خواجہ کے ہوش اُڑ گئے، حتیٰ کہ اُنھوں نے اپنا ارادہ ترک کیا اور شیراز واپس لوٹ آئے، محمود شاہ کے پاس ایک غزل لکھ بھیجی جس کے ابتدائی شعر یہ ہیں :-

دمے با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد — بمے بفروش دلقِ ما کزیں بہتر نمی ارزد

شکوہِ تاجِ سلطانی کہ بیمِ جاں درو درج است — کلاہِ دلکش است امّا بترکِ سر نمی ارزد

بکوئے مے فروشانش بجامے در نمی گیرند — زہے سجّادۂ تقویٰ کہ یک ساغر نمی ارزد

بس آساں می نمود اوّل غمِ دریا بہوئے سود — غلط کردم کہ یک موجش بصد من زر نمی ارزد

اِس غزل کا منظوم ترجمہ مس جرٹ روڈ لوتھی ان بیل کی نفیس کتاب ”انتخابِ دیوانِ حافظ“ (نمبر ۲۱ صفحہ ۹۱-۹۴)

سلہ یہ قصّہ ہندوستانی مورّخ محمّد قاسم فرشتہ استرآبادی سے ماخوذ ہی جو $\frac{۱۰۱۵}{۱۶۰۶-۱۶۰۷}$ میں موجود تھا۔ سلہ۲ لندن ، ولیم ہی نے مان

میں موجود ہی اگرچہ مترجمہ اشعار کی ترتیب ترتیبِ بالا سے مختلف ہی۔

دوسرا ہندوستانی فرماں روا جس نے حافظ کو اپنے دربار میں طلب کیا سلطان غیاث الدین ابن سلطان سکندر والیِ بنگال تھا۔ شبلی، جن کی سند سے یہ قصہ نقل کیا جاتا ہی[۱]، تحریر کرتے ہیں کہ غیاث الدین ۷۶۸ھ (۱۳۶۷ء) میں تخت پر متمکن ہوا اور اُس نے خواجہ صاحب سے خط و کتابت کی۔ ذیل کے تین اشعار اُس غزل میں وارد ہوئے ہیں جو اُس کے نام شیراز سے موصول ہوئی تھی:۔

ساقی حدیثِ سرو و گل و لالہ میرود   وین بحث با ثلاثۂ غسالہ میرود

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند   زین قندِ پارسی کہ بہ بنگالہ میرود

حافظ ز شوقِ مجلسِ سلطان غیاثِ دین   غافل مشو کہ کارِ تو از نالہ میرود

حافظ کے خانگی حالات سلاطین کے ساتھ حافظ کے تعلقات بیان کرنے کے بعد اب ہم اُن حالات پر توجہ کرتے ہیں جو اُن کی خانگی زندگی سے علاقہ رکھتے ہیں اور جو تعداد میں بہت تھوڑے یا محض قیاسی ہیں، اس بات کا پورا ثبوت نہیں ملتا کہ خواجہ کو ایک کسی شاخِ نبات سے عشق تھا جس کے ساتھ اُنھوں نے بعد میں عقد کرلیا تھا، عجمی تذکرہ نویس مناکحت کے معاملات پر عموماً قلم کو خاموش رکھتے ہیں، چنانچہ خواجہ کے اس معاملہ میں بھی ان کی طرف سے کسی تفصیل کی توقع نہیں کی جاسکتی، یہ کہ خواجہ نے شادی کی اور صاحبِ اولاد تھے، قرینِ قیاس ہی، بعض سوانح نویسوں کا خیال ہی کہ اُنھوں نے ایک غزل میں اپنی بیوی کی وفات کا صدمہ نظم کیا ہی جس کا مطلع ہی[۲]:۔

آں یار کزو خانۂ ما جائے پری بود

سرتا قدمش چوں پری از عیب بری بود

لیکن غزل میں کوئی ایسی چیز نہیں پائی جاتی جس سے بیوی کا ثبوت پیدا ہوتا ہو، تاہم اس سے زیادہ واضح اشارہ ذیل کے شعر میں ہی جو ایک بیٹے کی اوائل موت کی خبر دیتا ہی:۔

---

[۱] مولوی عبدالمقتدر کی معرکۃ الآرا "فہرست بانکی پور" (شعراے ایران، ۱، حافظ صفحہ ۲۵۳-۲۵۴) میں اس قصہ کا بادشاہ وہی شخص ہی جس کا نام اوپر آچکا ہی یعنی محمد شاہ بہمنی ان سے ۷۸۰ھ سے ۷۹۹ھ (۱۳۷۸-۱۳۹۶ء) تک حکومت کی یہاں قصہ کی شکل بدل گئی ہی اور اس میں تفصیل بھی زیادہ ہی۔

[۲] مرتبہ (Rosenweig-Schwannau) جلد اوّل صفحہ ۵۹۶-۵۹۸ اور حاشیہ صفحہ ۸۱۹

دلا دیدی کہ آں فرزانہ فرزند | چہ دید اندر خمِ ایں طاقِ رنگیں
بجائے لوحِ[1] سیمیں در کنارش | فلک بر سر نہادش لوحِ[2] سنگیں

قطعۂ ذیل کی نسبت بھی عام خیال ہے کہ وہ مذکورالصّدر یا کسی اور بیٹے کے رنج میں کہا گیا ہے، صدمہ کی تاریخ ۱۰ ربیع الاوّل ۷۶۴ھ (= ۲۴ دسمبر ۱۳۶۲ء) ہے:-

صباحِ جمعہ بُد و سادسِ ربیعِ نخست | کہ از دلم رُخِ آں ماہ روئے شد زائل
بسالِ ہفتصد و شصت و چہار از ہجرت | چو آب گشت بمن حلِ حکایتِ مشکل
دریغ و درد و تاسّف کجا دہد سودے | کنوں کہ عمر بہ بازیچہ رفت بے حاصل

ایک تذکرہ کے مُطابق، جس کا نام خزانۂ عامرہ ہے اور جس کو ۱۱۷۶ھ ۶۳-۱۷۶۲ء میں بمقام ہندوستان میر غلام علی آزاد نے مرتب کیا ہے، حافظ صاحب کا ایک بیٹا شاہ نعمان ہندوستان آیا اور برہان پور میں انتقال کے بعد اسیر گڈھ میں دفن کیا گیا۔

حافظ کا مبلغ علم | حافظ کی علمی قابلیت کے متعلق صرف اُن کے دو لسانی اشعار ہی سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ عربی زبان کی معقول استعداد رکھتے تھے، محمد[3] گل اندام کا بیان اِس پر مستزاد ہے کہ خواجہ نے اس زبان میں ایک عالمانہ تصنیف چھوڑی ہے، خواجہ خود کہتے ہیں:-

زحافظانِ جہاں کس چو بندہ جمع نہ کرد
لطائفِ حکما با کتابِ قرآنی

حفظِ قرآن کا ثبوت اِس شعر میں موجود ہے:-

ندیدم خوشتر از شعرِ تو حافظ
بقرآنے کہ اندر سینہ داری

صلوں کی خواہش | مولوی شبلی نعمانی متوجہ کرتے ہیں کہ لوگ خواجہ کو سلاطین و امرا کے عطیوں سے بے نیاز

---

١ سلیٹ کی مثل کوئی چیز جس پر بچہ مشق و حساب کرتا ہے۔ ٢ یعنی قبر کا پتھر۔ ٣ مرتبہ Rosenweig-Schwannau جلد سوم صفحہ ۲۸۰
٣ مرتبہ Rosenweig-Schwannau جلد سوم صفحہ ۲۸۰۔
٤ صفحہ بالا ۲۶۲۔

بتاتے ہیں، مگر ان کے اشعار سے اس خیال کی تصدیق نہیں ہوتی، برخلاف اس کے اکثر معاصر فرماں رواؤں کے ذکر میں ان کے اشعار موجود ہیں، شاہ شجاع، شیخ ابو اسحاق، سلطان محمود، شاہ منصور اور حاکمان یزد و ہرمز سب ان کے ممدوحوں میں تھے :-

شاہ ہرموزم ندید و بے سخن صد لطف کرد — شاہِ یزدم دید و مدحش گفتم و ہیچم نداد
کارِ شاہاں این چنیں باشد تو اے حافظ مرنج — داورِ روزی رساں توفیق و نصرت شان دہاد

حاکمِ یزد کی بے توجہی کی شکایت وہ ایک اور مگر نہایت مشہور اور پاکیزہ غزل میں کرتے ہیں[1] :-

عمرتاں باد و مراد اے ساقیانِ بزمِ جم[2] — گرچہ جامِ ما نشد پُر مے بدورانِ شما
اے صبا با ساکنانِ شہرِ یزد از ما بگو — کاے سرِ حق ناشناساں گوئے چوگانِ شما
گرچہ دُوریم از بساطِ قرب ہمت دور نیست — بندۂ شاہِ شمائیم و ثنا خوانِ شما

ان اشعار کو ہرمن بک نیل نے انگریزی میں نظم کیا ہے[3] :-

دوسرے شعراء سے حافظ کا فرق

خواجہ حافظ اور ایران کے دوسرے قصائد گو میں فرق ہے، شبلی نعمانی نے خوب کہا ہے کہ انوری، ظہیر فاریابی اور سلمان جیسے جلیل القدر شعرا کے برخلاف خواجہ صاحب ادنیٰ اور پاجیانہ طریق سے معاش نہیں پیدا کرتے تھے یا مدح سے کام نہ چلتا تو ہجو پر نہیں اترتے تھے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ خواجہ شیراز پر جان دیتے تھے، رکنا باد کے چشمہ اور مصلّیٰ کے باغات کی تعریف سے ان کی زبان نہیں تھکتی :-

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت — کنارِ آبِ رکنا باد و گلگشتِ مصلّا را

پھر کہتے ہیں :-

---

[1] مرتبہ Rosenweig-Schwannau جلد اول صفحہ ۴۔
[2] جم یا جمشید ایران کے سلاطین روایت میں سے ہے، اس کا عہد انتہا درجہ عظمت و جلال سے وابستہ کیا جاتا ہے، اس کو اوستا اور کہا دیوں کے یمہ کا مثنیٰ سمجھنا چاہیے، "ساقیان بزم جم" سے یزد کا بادشاہ اور اس کے درباری مراد ہیں۔
[3] کتاب مذکور صفحہ ۶۔

فرق ست زآبِ خضر کہ ظلمات جائے اوست[1] تا آبِ ما کہ منبعش اللہ اکبر ست[2]

اگرچہ خواجہ صاحب بہار و گلاب، بلبل و شراب اور حسن و شباب کے رموز میں سرشار رہتے تھے اور گاہ گاہ اُس جمالِ ازلی کے گیت بھی گاتے تھے جس کا عالم کی تمام حسین و مطلوب چیزیں ایک ہلکا سا پرتو ہیں۔ لیکن بعض وقت وہ اپنے قدرداں اربابِ فضل و تدبر کو بھی یاد کرتے ہیں[3]۔ ان میں سلاطین کبار کے علاوہ، جن کا بیان اوپر گزر چکا ہی، حاجی قوام تھے[4] قوام الدین حسن تھے، خواجہ جلال الدین، شاہ یحییٰ نصرت الدین اور دوسرے حضرات شامل تھے نیز گو خواجہ صاحب نے مثنوی و مقطعات اور قصائد و رباعیات میں بھی طبع آزمائی کی ہی۔ لیکن اُن کا خاص میدان غزل ہی جس میں اُن کی جولانی کو نظر لگتی ہی، اس کا اعتراف اُن کے بہت سے پس آمدوں نے بھی کیا ہی، صائب، سلیم اور عرفی[5] وغیرہ سب خواجہ کی تعریف کرتے آئے ہیں مگر سرگوراوسلے کی تعریف سب تعریفوں پر بھاری ہی وہ لکھتا ہی[6]

حافظ کی بلند پایگی پر سرگوراوسلے کی رائے

"حافظ کا اسلوبِ بیان صاف، بے تکلف اور یکساں ہی، ساتھ ہی اس سے فضل و تبحر، پختہ علوم کی واقفیت اور اشیا کی باطنی و ظاہری حقیقت کا گہرا علم ظاہر ہوتا ہی لیکن ان سب چیزوں سے بڑھ کر اسلوب میں ایک قسم کی ایسی دل آویزی ادا پائی جاتی ہی جو کسی شاعر کو نصیب نہ ہو سکی۔"

تاہم خواجہ کے متعلق بہترین تبصرہ وہ ہی جو مس جرٹرڈ لوتھی ان بیل نے کیا ہی، اس میں اصابت تنقید، ژرف نگاہی اور شاعر کے ساتھ ہمدردی پائی جاتی ہی، مس صاحبہ نے بغایت نکات آموز پیرایہ میں خواجہ کا ڈانٹے سے جو اُن کا ہم عہد و ہم سن تھا موازنہ کیا ہی۔ ڈینٹے کے کلام کی خصوصیات گنانے کے بعد وہ لکھتی ہیں:-

موازنہ حافظ و ڈینٹے

"بخلاف اس کے خواجہ کی نظر میں اس زمانہ کی نظیریں (؟) ہیچ ہیں، اُس کے زمانہ کی تاریخ اُس کو اس درجہ معمولی واقعہ معلوم ہوتا ہی کہ وہ اس پر التفات نہیں کرتا، اس کی زندگی میں اس کا شہر جیسے وہ اتنا ہی محبوب سمجھتا تھا جتنا کہ ڈینٹے فلورنس کو، پانچ یا چھ بار محصور ہوا اور اتنی ہی بار تسخیر بلکہ اس سے بھی زیادہ حاکم آئے

---

[1] یعنی آبِ حیات جس کی متعلق خیال ہی کہ وہ ظلمات کے ملک میں موجود ہی، سکندر اعظم نے اسے تلاش کیا تھا مگر ناکام رہا، اس کے ربانی رفیق و رہبر خضر (جو بعض اوقات الیاس بیان کئے جاتے ہیں) نے اس کو ڈھونڈھ نکالا اسے پیا اور حیاتِ ابدی حاصل کی۔ [2] تنگ اللہ اکبر ایک تنگ سی وادی ہی شمال سے آنے والا اسی سے پہلے شیراز کو یہیں سے دیکھتا ہی، اس کی تصویر "ترجمہ حافظ از بکنیل" مقدمہ، صفحہ ۲۱ میں دیکھنی چاہیئے۔ [3] اشعار مدحیہ شعر العجم جلد دوم صفحہ ۲۳۲ میں منقول ہی۔ [4] شعر العجم صفحہ ۲۳۴۔ [5] تذکرۃ الشعراء ایران" (لندن ۱۸۲۶) صفحہ ۲۳۔ [6] کتاب مذکور صفحہ ۵۸-۶۰۔

اور گئے، ایک فاتح نے اِس کو خون سے تر کیا، دوسرے نے عیش و نشاط سے بھرا، اور تیسرے نے زہد و رہبانیت کے شکنجہ میں کسا، حافظ نے سلاطین و امرا کو یکے بعد دیگرے عروج پر چڑھتے اور صحرا کی خاک آلود سطح پر گرنے والی برف کے مانند پستی میں آتے ہوئے دیکھا، افسوسناک انجام، وسیع جشن، سلطنتوں کا زوال، لڑائیوں کی جھنکار، ان تمام چیزوں کو اُس نے دیکھا اور سُنا ہوگا، لیکن اُن کی آواز بازگشت اُس کے اشعار میں کتنی ہے؟ تقریباً بالکل نہیں، زیادہ سے زیادہ ایک آدھ حوالہ جس کو حافظ کے فاضل شارح کسی سیاسی واقعہ سے منسوب کرتے ہیں، ایک دھندلا سا آواز پہلے ایک بادشاہ کے لیئے، کسی فتح کی مبارکباد اور کسی تاجدار جرنیل کی شجاعت کا اعتراف لیکن صرف اتنا جو ایک خوددار درباری شاعر کے فرایض میں داخل تھا، اس سے زائد نہیں۔

مگر ہم میں سے بعض کا خیال ہوگا کہ حافظ کی بے التفاتی اس کے فلسفہ کو صرف ایک ایسی چیز سے متصف کر دیتی ہے جو ڈینٹے کے ہاں موجود نہیں ہے، (اس سے زائد کیا لیکن نہیں) اطالوی اپنے فلسفہ کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، عالم کی نسبت اُس کا وہی خیال ہے جو اُس کے زمانہ میں رائج تھا، جو چیز اُس کے لیئے اصل حقیقت تھی وہ آج ہم میں سے اکثروں کے لیئے ایک خوبصورت خیال یا ایک خوفناک تصور ہے، حافظ کی تصویر میں دُور دُور کے منظروں کا احاطہ ہے۔ اگرچہ قریب کا منظر اتنا نمایاں نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ گویا اُس کی نگاہ تصور جو حیرت انگیز تیزیِ بصیرت سے آراستہ تھی، اُن اقالیم خیالات کے پار ہو گئی تھی جنھیں ہم کئی سو برس بعد کے لوگ آباد کرنے والے تھے، ہم خواجہ کو معاف کر سکتے ہیں کہ اُس نے اپنے زمانہ کی مجموعی حالت اور انفرادی زندگی کا خاکہ اس قدر دُھندلا چھوڑا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایسے عمیق خیالات گڑھنے میں مصروف ہے جیسے کہ یہ وصیت کہ:-

"(حافظ کے سوا) دنیا میں کوئی گویا ایسا نہیں جس کی آواز پر رند و زاہد دونوں ناچنے لگیں۔"

مترجم

اصطلاحاتِ علمیہ

انجمنِ ترقی اُردو کی سالانہ رپورٹ میں تفصیل سے ذکر ہو چکا ہی کہ مختلف علوم و فنون پر کم و بیش چھ ہزار اصطلاحات تیار ہو چکی ہیں۔ انجمن نے یہ کام سررشتۂ تالیف و ترجمہ (حیدر آباد دکن) کی امداد و اتحاد سے انجام دیا ہی۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ اصطلاحات کتاب کی صورت میں شایع کی جائیں یہ مناسب معلوم ہوتا ہی کہ اس رسالہ کے ذریعہ سے اہلِ ملک کے سامنے پیش کی جائیں تاکہ اہلِ ذوق و اہلِ علم کو اُن پر رائے دینے اور تنقید کرنے کا موقع ملے۔

مجھے اُمید ہی کہ جو حضرات اپنے اپنے فن میں ماہر اور بعض بعض علوم میں خاص مہارت اور بصیرت رکھتے ہیں وہ اِن اصطلاحات کو بنظرِ غور ملاحظہ فرمائینگے اور اگر اُن کی رائے میں کسی لفظ کے بدلنے کی ضرورت ہی تو اس سے مطلع فرمائینگے۔ اُن کی رائیں اِس رسالہ میں شایع کی جائینگی۔ اگر اہلِ علم نے ان الفاظ کو پسند کیا تو ہم بلا تامل موجودہ الفاظ نکال کر مجوّزہ الفاظ داخلِ لغت کر دینگے۔ اس مشورہ اور تنقید کے بعد یہ اصطلاحات کتاب کی صورت میں شایع ہونگی۔

عبدالحق

آنریری سکرٹری انجمنِ ترقی اُردو

Physics

A		**Air pump**	ہواپمپ
Absolute	مطلق	**Alcohol**	غول
Acceleration	اسراع	**Algebraic sum**	الجبری مجموعہ
Acting force	قوتِ عاملہ	**Aluminium**	زاجیہ
Action	عمل	**Amplitude**	حیطۂ اہتزاز
Adhesion	چپک	**Angle**	زاویہ
Affinity	الفت	**Angle of oscillation**	زاویۂ اہتزاز

Antimony	کحلیہ
Apex	راس
Apparatus	آلہ
Apparent time	ظاہر وقت
Archimedes	ارشمیدس
Area	رقبہ
Arm (of a lever)	بازو
Atmosphere	کرۂ ہوائی
Atom	جوہر
Average	اوسط
Axis	محور
Axis of abscissane	(محور) فصلہ
Axis ol ordinates	(محور) معین

B

Balloon	غبارہ
Barometer	بارپیما
Base	قاعدہ
Beaker	گلاس
Bending	خماؤ
Bisection	تنصیف
Block (of a pulley)	بُلاق
Breadth	عرض
Brittle	پھونک
Buoyancy	اُچھال
Burette	نزنک
Burner	مشعل

C

Calibration	تعبیر
Calipers	چاپ
Capacity	گنجایش
Capillarity	قوت شعری
Capallary action	عمل شعری
Capillary tube	شعری نلی
Centi	سنتی
Centigrade scale	پیمانۂ سنتی
Centimetre (c. m.)	سنتی میتر (سمر)
Centre	مرکز
Centre of Gravity	مرکز جاذبہ
Chalk	کھریا
Change	تغیر۔ تبدیلی
Chemical action	کیمیائی عمل
Circle	دائرہ

Circumference	محیط
Circumscribing cylinder	پیرامونی اُستوانہ
Cistern barometer	حوضکدار بارپیمانہ
Clamp	شکنجہ
Clip	چٹکی
Cohesion	اتصال
Collision	تصادم
Common Point	نقطۂ مشترک
Common pump	معمولی پمپ۔ دمکلا
Components of force	قوتوں کے اجزائے ترکیبی
Composition (of velocities or forces)	
Compound	مرکب
Compressiblity	پچکاؤ
Concave	مقعر
Condensation	تکثیف۔ بستگی
Cone	مخروط
Conservation of energy	بقائے توانائی
Constant	مستقل
Contact	تماس
Convex	محدب
Cork-squeezer	کاک بیلن، کاک بھیچنے کا آلہ
Cross section	تراشِ عمودی
Crucible	کٹھالی
Crystal	قلم
Cube	مکعب
Curvature	انحنا ر
Curve	منحنی
Curved line	خطِ منحنی
Cylinder (jar)	اُستوانی
Cylinder (in Geometry)	استوانہ

D

Deca	دِکا
Deci	دِسی
Decimal	اعشاریہ
Degree	درجہ
Dense	کثیف
Density	کثافت (مطلق)
Depth	عمق (گہرائی)
Diagonal	وتر
Diameter	قُطر
Dimension	بُعد
Direction	سِمت

Disc	قرص
Displacement	ہٹاؤ
Distillation	کشید
Distilling flask	کشید کی صراحی
Divisibility	انقسام
Ductile	متمدّد
Ductility	تمدّد
Dynamics	علم حرکات
Dyne	ڈائین

E

Efficiency	استعداد
Elasticity	لچک
Electric current	برقی رَو
Electricity	برق
Element	عنصر یا بسیط
Energy	توانائی
Equality / Equation	مساوات
Equator	خطِ استوا
Equilibrant	متعادل
Equilibrium	تعادل
Evaporation	تبخیر
Expansion	پھیلاؤ
Extension	کھنچاؤ
External calipers	بروں چاپ

F

Figure	شکل
File	ریتی
Filter-paper	تقطیری کاغذ
Filteration	تقطیر۔ چھاننا
Fixed pully	ثابت چرخی
Flask	صراحی
Fluid	سیّال
Fluid pressure	سیّالی دباؤ
Foot pound	فٹ پونڈ
Foot poundal	فٹ پونڈل
Force	قوت
Forceps	چمٹی
Forcing pump or force pump	داب پمپ
Four sided figure	ذو اربعۃ الاضلاع
Friction	رگڑ
Fulcrum	لضاب
Fundamental quantities	بنیادی مقداریں

G

Gallon	گیلن
Gas	گیس
Geometric centre	مرکزِ ہندسی
Geometrical solids	مجسماتِ ہندسی
Geometry	ہندسہ
Glycerin	گلسرین
Graduation	درجہ بندی
Gram	گرام
Graph	ترسیم
Graphite (Plumbage)	سرمان
Gravitation	تجاذب
Gravitational units	تجاذبی اکائیاں
Gravity	جاذبہ
Groove	نالی

H

Hardness	سختی
Heat	حرارت
Hecto	ہکتو
Height	ارتفاع
Hemisphero	نصف کرہ
Hexagon	مسدس
Hollow	مجوف۔کھوکھلا
Hook	ہک
Horizontal	افقی
Horse-power	اسپی طاقت
Hour	ساعت۔گھنٹہ
Hydraulie press	شکنجۂ آبی
Hydrogen	حمضین
Hydrometer	مائع پیما
Hydrostatics	علمِ سکونِ سیالات

Ice	یخ
Impure	غیر خالص
Inclination	میلان
Inclined plane	سطحِ مائل
Index	نمائندہ
Inertia	جمود
Internal calipers	درون چاپ
Inverse proportion	معکوس تناسب
Iodine	بنفشین
Irregula	غیر منتظم

Isosceles triangle	مثلث مساوی الساقین

J

Jaw	جبڑا

K

Killo—	کلو
Kinetic energy	توانائی بالفعل

L

Laboratory	معمل
Law	کلیہ
Lead	سیسا
Length	طول
Lever	بیرم
Light	نور
Like parallel forces	موافق قوائے متوازی
Limiting friction	انتہائی رگڑ
Limit of elasticity	لچک کی انتہا
Line	خط
Line of action	خطِ عمل
Linear motion	حرکتِ مستقیم
Liquid	مایع
Litre	لیتر

M

Machine	مشین
Magnet	مقناطیس
Malleability	تورّق
Malleable	متورّق
Magnetic attraction	مقناطیسی کشش
Magnetisation	مقناطیسیت
Manometer	فشارپیما
Many sided figure	کثیرالاضلاع
Mass	کمیتِ مادہ
Matter	مادہ
Maximum value	قیمتِ اعظم
Mean solar day	اوسطِ روزِ شمسی
Mean time	اوسطِ وقت
Mechanical advantage	مفادِ حیلی
Mechanical equivalent	معادلِ حیلی
Mechanics	علمِ حیل
Meniscus	ہلالی سطح
Mercurial barometer	سیمابی بارپیما
Mercury	پارا
Metric system	میتری نظام

Micrometer screw-gauge	خردہ پیما پیچ
Microscope	خردبین
Milli	ملی
Millimetre (m m)	ملی میٹر (مم)
Minerals	معدنیات
Minute	دقیقہ
Mixture	آمیزہ
Mobile	سریع السیلان
Molecule	سالمہ
Moment (of a force)	قوت کا معیار حرکت
Momentum	حرکت کا معیار اثر
Motion	حرکت
Motion in a curve	حرکتِ مستدیر، حرکتِ منحنی
Movable pulley	متحرک چرخی
Multiple	ضعف

N

Negative	منفی
Neutral Equilibrium	تعادلِ تعدیلی
Nitre	شورہ
Normal (Pressure, etc.)	طبعی (دباؤ وغیرہ)
Nut-cracker	سروتہ

O

Origin	مبداء
Oscillation	اہتزاز
Oxygen	مائیں

P

Pan	پلڑا
Parallax	اختلافِ منظر
Parallelepiped	مجسّم متوازی السطوح
Parallel forces	متوازی قوتیں
Parallelogram	متوازی الاضلاع
Particle	ذرّہ
Pendulum	رقّاص
Perfectly elastic	کامل لچکدار
Perfect machine	کامل مشین
Perimeter	گھیر
Perpendicular	عمود
Physical	طبعی
Physics	طبعیات
Pint	پائنٹ
Pipette	نالچہ
Piston	فشارہ

English	Urdu
Pitch (of a screw)	گھائی
Plain surface	سطحِ مستوی
Platinum	نقریہ
Plumb line	شاقول
Pointer	نمائندہ
Point of action	نقطۂ عمل
Point of intersection	نقطۂ تقاطع
Pole	قطب
Polygon of forces	قوتوں کا کثیر الاضلاع
Porosity	تخلخل
Porous	متخلخل
Positive	مثبت
Potential energy	توانائی بالقوہ
Poundal	پونڈل
Powder	سفوف
Pressure	دباؤ
Principle	اُصول
Prism	منشور
Product	حاصل ضرب
Property	خاصیت
Proportion	تناسب
Protector	گونیہ
Pulley	چرخی
Pump	پمپ
Pure	خالص
Pyramid	مینار

Q

English	Urdu
Quantity	مقدار

R

English	Urdu
Radius	نصف قطر
Rare	لطیف
Rate	شرح
Ratio	نسبت
Re-action	ردِ عمل
Rebound	واجستگی
Rectangle	مستطیل
Regular	منتظم
Relation (as in relative motion)	اضافت
Relative density	کثافت اضافی
Resin	بیروزہ
Resistence	حرکتِ اضافی
Resisting force	مزاحمت

Resolution (of force etc) قوتِ مزاحم
Resultant تحلیلِ قواے
Retardation حاصل
Rhombus ابطاء
Right angled triangle معین
Rigid مثلث قایم الزاویہ
Rigid scale استوار پیمانہ
Rigidity استواری
Ring حلقہ
Rod سلاخ
Rotation گردشِ محوری

S

Scale پیمانہ
Screw پیچ
Screw-gauge پیچ دار پیمانہ
Second ثانیہ
Section تراش
Shaft دھری
Shell خول
Side ضلع
Sidereal day روزِ فلکی
Similar triangles متشابہ مثلث
Simple pendulum سادہ رقاص
Sine جیب (جب)
Siphon سیفن یا خمدار نلی
Slant height ارتفاعِ مائل
Sliding calipers سرل چاپ
Slope ڈھلوان
Smooth چکنا۔ املس
Smoothness چکنائی۔ ملاست
Snow برف
Soft ملائم
Solar day روزِ شمسی
Solid ٹھوس
Solution محلول
Space فضاء
Specific gravity وزنِ نوعی
Speed چال
Sphere کرہ
Spherometer کرویت پیما
Spirit (of wine) روحِ شراب
Spring-balance کمانی دار ترازو

Square	مربع
Squared paper	مربعدار کاغذ
Square root	جذر
Stability	قیام
Stable equilibrium	تعادلِ قایم
Stand	ٹیکن
Standard	معیار
State	حالت
Steam	بھاپ
Steelyard	تک
Stopper	ڈاٹ
Stop watch	چلرکنی گھڑی
Straight line	خطِ مستقیم
Stretch	کھنچاؤ
Sublimation	صعود۔ تصعید
Sulphuric acid	گندک کا تیزاب (بازاری نام)
Support (in balance)	مسند۔ بیٹھک
Surface	سطح
Surface tension	سطح کا تناؤ
Swing	جھونٹا
Symmetry	سڈولپن
Syringe	پچکاری
System	نظام
System of pulleys	چرخیوں کا نظام

T

Tangent	خطِ مماس
Temperature	تپش
Tenacious	لوچدار
Tenacity	لوچ
Tension	تناؤ
Theory	نظریہ
Thermometer	تپش پیما
Thread (of a screw)	چوڑی
Three dimensions	ابعادِ ثلاثہ
Time-period	وقتِ دوران
Tin	قلعی
Toricellian Vacuum	خلائے طریسلی
Torsion	مروڑ
Total pressure	مجموعی دباؤ
Transformation of energy	توانائی کا استحالہ
Transit	مرور
Trapezium	منحرف

Triangle مثلث

Triangle of forces قوتوں کا مثلث

Tripod تپائی

Turpentine تاربین

U

Uniform ہموار

Unlike parallel forces. مخالف قوائے متوازی

Unit اکائی

Unstable equilibrium تعادلِ غیر قایم

U-tube لا نما نلی

V

Vacuum خلا

Valve کھلندن

Variable متغیر

Velocity رفتار

Velocity ratio رفتاری نسبت

Vernier کسر پیما

Vertex راس

Vertical line عمودی خط

Vibration ارتعاش

Viscosity لزوجت

Viscous لزج

Visible motion حرکت مرئی

Volume حجم

W

Wedge فانہ

Wedge gauge فانہ نما پیما

Weight وزن یا ثقل

Wheel and axle چرخ و محور

Wheel barometer چرخی دار بارپیما

Wind-mill پون چکی

Work کام

Z

Zone منطقہ

جامعۂ عثمانیہ (حیدرآباد، دکن)

یعنی

اُردو یونیورسٹی

ہندوستان میں آج کل یونیورسیٹوں کا دور ہی۔ میسور یونیورسٹی کئی سال ہوئے بن چکی۔ ہندو یونیورسٹی بنارس کو بھی قایم ہوئے چار سال ہوتے ہیں۔ ڈھاکہ یونیورسٹی بن گئی۔ پٹنہ یونیورسٹی کا وجود میں آنا مسلّم اور یقینی ہی مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا بل مجلس وضع قوانین میں پاس ہو چکا ہی۔ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے لفٹنٹ گورنر لکھنؤ میں یونیورسٹی قایم کرنے کا ڈول ڈال رہے ہیں۔ اور کوئی دن جاتا ہے کہ دہلی، ناگپور اور رنگون میں بھی یونیورسٹیاں قایم ہو جائیں گی۔ یہ سب کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کی برکت ہی۔

لیکن ان سب سے نرالی ایک اور یونیورسٹی ہی جو حیدرآباد دکن میں قایم ہوئی ہے اور جس نے اب دوسرے سال میں قدم رکھا ہی۔

تعلیم کا مسئلہ ہندوستان میں ہر روز زیادہ نازک اور پیچیدہ ہوتا جاتا ہی۔ اگرچہ علم کے لئے قوم و ملت، گورے کالے، آب و ہوا کا کوئی امتیاز نہیں، لیکن کسی ملک کے باشندوں کو قابل اور مفید بنانے کے لئے ان تمام امور کا لحاظ ضروری ہی۔ اب ایک مدت کے بعد ہم میں یہ احساس پیدا ہوا ہے کہ جس ڈھنگ پر ہماری تعلیم جاری ہی وہ ہمیں بہتر انسان بنانے کے لئے کافی نہیں وہ دنیاوی جدوجہد میں ہمارے زیادہ کام نہیں آتی وہ ہمارے اخلاق وخصائل کی اصلاح میں کچھ بہت مفید ثابت نہیں ہوئی۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی یونیورسیٹوں کی ہمہ داں و ہیچمداں تعلیم ہمارے حالات کے مناسب نہیں اور نہ غالباً یہ ہمارے لئے وضع کی گئی ہی۔ جن اغراض کو مدِنظر رکھکر یہ طریقہ رائج کیا گیا تھا، گو اس کا تعلق بظاہر ہم سے معلوم ہوتا ہی۔ لیکن حقیقت میں ان کا منشا کچھ اور

تھا۔ اس سے انکار نہیں کہ موجودہ طریقۂ تعلیم سے ہمیں فائدہ پہنچا ہے مگر وہ فائدہ سرسری، اوپری اور ضمنی تھا۔ ابتدا ابتدا میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا انگریزی تعلیم کے جاری کرنے سے ایک مقصد یہ تھا کہ سستے محرر اور ماتحت عہدہ دار آسانی سے بہم پہنچیں گے اور اُن کی عظیم الشان تعمیر میں قُلی کا کام دیں گے۔ لیکن بعد کے انگریز مدبروں کی نظر اس سے بھی دُور پہنچی اور انھوں نے اپنی تعلیمی پالیسی کی بنیاد ایک ایسی مصلحت پر رکھی جس کا سمجھنا اُس وقت ہمارے وہم وگمان سے بھی پرے تھا۔ اس کا اعادہ انھوں نے بارہا اپنی تحریروں میں کیا۔ در حقیقت یہ ہے کہ اُن کی اس دُور اندیشی، ذہانت اور فراست کی داد دینی پڑتی ہے۔ اُن کا یہ خیال تھا کہ ہندوستانی انگریزی پڑھکر انگریزی طرزِ معاشرت اور تمدن اختیار کریں گے اور انگریزی مصنوعات کے دلدادہ ہو جائیں گے۔ اُن کا یہ خیال بالکل صحیح نکلا۔ وہ ایک ایک چیز میں غیروں کے محتاج اور دست نگر ہیں۔

عیسائی مشنریوں نے بھی اس تعلیم کی اشاعت میں بہت کوشش کی اور اُن کی اس سعی سے ملک کو ایک گونہ فائدہ بھی پہنچا۔ لیکن ان کا مقصد بھی دوسرا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانی انگریزی پڑھکر سب عیسائی ہو جائیں گے ان کی رائے میں اہلِ ہند کی اخلاقی اور روحانی تعلیم مٹی کا ایک گھروندا تھی کہ پانی پڑتے ہی گھُل کر بہ جائے گا مشنریوں کو اپنے اس قیاس میں بہت دھوکا ہوا اور اُن کی مُراد خاطر خواہ بر نہ آئی۔

لیکن انگریز مُدبّرین کا قیاس بالکل صحیح تھا اور حرف بحرف پُورا نکلا۔ ہمارے طریقۂ تعلیم پر غلامی کا داغ جو ابتدا سے لگا ہے وہ اب تک نہیں مٹا۔ افریقہ کے غلاموں کی طرح جنھیں دُنیا میں سوائے غلامی کے دوسرا طریقہ رہنے سہنے کا نہیں آتا تھا ہم بھی مُروجہ طریقہ کو جو سالہا سال سے چلا آتا ہے چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ عادت ایسی بُری چیز ہے کہ سمجھنے پر بھی نہیں چھوٹتی۔ بے بسی کی یہ نوبت ہے کہ اسے بدلنے یا چھوڑنے کے خیال کے ساتھ یہ فکر ہوتی ہے کہ اگر اسے چھوڑ دیا تو پھر کیا کریں گے۔

ہماری قدیم تعلیم سراسر قومی، مذہبی، اخلاقی اور مُلکی تھی۔ آج یہ حالت ہے کہ ہم **قومی تعلیم** کے لفظ کو ایک نئی چیز سمجھتے ہیں اور اہلِ ملک کو اس کا مفہوم سمجھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ نیرنگیِ زمانہ کی یہ مثال قابلِ غور ہے۔

قومی تعلیم کا پہلا اور ابتدائی اصول یہ ہے کہ تعلیم اپنی زبان کے ذریعہ سے دی جائے۔ یہ ایسا سیدھا سادہ

اور فطری اصول ہے کہ اگر کسی غیر ملک والے سے کہیں تو وہ ہنسے گا اور کہے گا کہ یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔ یہ بالکل ایسی بات ہے جیسے کسی سے کہیں کہ پاؤں سے چلنا چاہیئے اور آنکھوں سے دیکھنا چاہیئے۔ لیکن ایک ہمارے ملک والے ہیں کہ اُن سے کہنے ہی کی نہیں بلکہ سمجھانے اور مباحثہ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس پر بھی بہت سے ایسے ہیں جنھیں اس کے تسلیم کرنے میں تامّل ہے اور متذبذب ہیں۔

ہمارے نظامِ تعلیم میں دیسی زبانوں کا کیا حصّہ رہا ہے اور ان زبانوں کی ترقی کے کیا وسائل اختیار کئے گئے۔ یہ ایک ایسا دلچسپ اور قابلِ بحث مضمون ہے کہ اس کے لئے ایک جداگانہ کتاب کی ضرورت ہے لیکن یہاں ہم اس پر ایک سرسری سی نظر ڈالتے ہیں۔

ابتدا میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے کبھی اس کا خیال نہیں کیا کہ اس ملک میں مغربی یا انگریزی طریقۂ تعلیم رائج کرے۔ اور ایسے خیال کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ کیوں کہ خود انگلستان میں جو تعلیم اس وقت رائج تھی وہ ہمارے ہاں کی تعلیم سے کچھ مختلف نہ تھی۔ وہاں بھی ہمارے مدارس کی طرح السنۂ قدیم اور دینیات کی تعلیم پر زور دیا جاتا تھا اور سائنس کو وہ قوت اور حکومت حاصل نہ ہوئی تھی جو اس وقت ہے۔ اس لئے اگر مدبرانِ کمپنی کوئی تغیر و تبدل بھی کرتے تو کیا کرتے۔ لارڈ وارن ہیسٹنگز جو ہندوستان میں انگریزی سلطنت کا بانی ہوا ہے اور جسے اُس زمانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں وہ قوت و اقتدار حاصل تھا جو ایک بادشاہ کو ہوتا ہے۔ ہندوستان کی السنۂ قدیم و قوانین کا بڑا قدردان تھا۔ اس نے ۱۷۸۱ء میں عربی تعلیم کا ایک مدرسہ قایم کیا جو اب تک کلکتہ مدرسہ (مدرسۂ عالیہ کلکتہ) کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۷۹۱ء میں بنارس میں سنسکرت کالج قایم ہوا۔ سب سے اوّل چارلس گرانٹ نے جو ہندوستان میں رہ چکا تھا اور کمپنی کے ڈائرکٹروں میں سے تھا، انگریزی تعلیم کی اشاعت پر زور دیا۔ اس کا یہ خیال مشنریوں کی نئی تحریک کا نتیجہ تھا۔ لیکن کمپنی نے اس پر کوئی توجہ نہ کی۔ اور اس کے مدبرین اپنے قدیم خیال پر قایم تھے۔ ۱۸۱۳ء کے ایکٹ میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ ہندوستان کی تعلیم پر ایک لاکھ روپیہ صرف کیا جائے لیکن اس کے معنی وہ ہمیشہ یہی لیتے رہے ہے کہ یہ رقم مشرقی تعلیم کے لئے مخصوص ہے۔ گورنمنٹ نے بھی اس پر کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ البتہ ۱۸۲۳ء میں ایک مجلسِ تعلیمات (کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن) قایم ہوئی تو اس نے یہ رقم مختلف مدارس اور انجمنوں کی امداد میں صرف کی۔

اس زمانہ میں ہندوستان کی تعلیم کے متعلق اختلاف رائے پیدا ہوا۔ اس میں دو گروہ ہوگئے۔ ایک مشرقی دوسرا مغربی۔ ایک کا خیال یہ تھا کہ اہلِ ہند کو مشرقی طرز کی تعلیم دی جائے اور دوسرے کی یہ رائے تھی کہ ہندوستان میں انگریزی طریقۂ تعلیم رائج کیا جائے۔ ایک مدت تک مشرقیوں کا پلہ بھاری رہا۔ لیکن آخر ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے کی آتش بیانی اور فصاحت نے اس جھگڑے کا ہمیشہ کے لئے فیصلہ کر دیا۔ مغربی کامیاب ہوئے اور گورنمنٹ نے اس اصول کو اختیار کیا اور یہ طے کر دیا کہ آیندہ تمام تعلیمی رقوم اُن مدارس اور کالجوں پر صرف کی جائیں گی جن میں مغربی تعلیم دی جاتی ہے۔

اس کے دوسرے سال ہی فارسی سرکاری دفاتر سے خارج کر دی گئی اور اس کی جگہ انگریزی اور اُردو کو دی گئی۔

۱۸۳۵ء کے فیصلہ نے یہ بھی طے کر دیا کہ ذریعۂ تعلیم انگریزی ہوگی۔ سنسکرت یا عربی نہیں ہو سکتی اور اب تک اسی فیصلہ پر عملدرآمد چلا آرہا ہے۔ اگرچہ عربی یا سنسکرت کو بھی ذریعہ تعلیم قرار دینا چنداں مفید نہ تھا لیکن اس سے یہ توقع ہو سکتی تھی کہ آگے چل کر بجائے عربی یا سنسکرت کے دیسی زبانیں ذریعہ تعلیم ہو جائیں گی۔ لیکن انگریزی کو ذریعہ تعلیم قرار دیدینے سے دیسی زبانوں کے لئے کوئی اُمید باقی نہ رہی۔ یہ فیصلہ درحقیقت ہماری زبانوں کے لئے موت کا فتویٰ تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ۱۸۳۵ء میں جو تعلیمی پالیسی قرار پائی اس میں ضمنی طور سے دیسی زبانوں کی ترقی کی بھی ترغیب دی گئی ہے۔ اور خود لارڈ میکالے نے بھی اپنی یادداشت میں ان غریب زبانوں کے حال پر نظرِ عنایت فرمائی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ۱۸۵۴ء کے مشہور ڈسپیچ میں بھی جس نے ہندوستان میں موجودہ طریقۂ تعلیم کی بنیاد ڈالی اور ابتدائی تعلیم سے لے کر یونیورسٹی تک کی تعلیم کا زبردست خاکہ کھینچا ہے، دیسی زبانوں کی تعلیم و ترقی کا ذکر آیا ہے اور انگریزی کے ساتھ ساتھ مقامی زبانوں کی تعلیم پر بھی زور دیا ہے۔ لیکن یہ تمام نصیحتیں اور ہدایتیں اور احکام جو غالباً اور یقیناً نیک نیتی اور دانشمندی پر مبنی تھے کبھی عمل میں نہ آئے۔ اور دیسی زبانیں اب تک پڑی سسک رہی اور بیچارگی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔

حال میں کلکتہ یونیورسٹی کی اصلاح اور اس کی تعلیم پر غور کرنے کے لئے ایک کمیشن کا تعین کیا گیا جس کے ارکان

نامور ماہران تعلیم تھے۔ اگرچہ اس کا تعلق کلکتہ یونیورسٹی سے تھا لیکن انھوں نے ہندوستان کے موجودہ طریقہ تعلیم پر ایک وسیع نظر ڈالی ہی اور بہت سے ایسے امور جن کا تعلق صرف کلکتہ یونیورسٹی سے ہی دوسرے یونیورسٹیوں سے بھی متعلق ہوسکتے ہیں۔ اس کمیشن نے تعلیم کے ہر پہلو کو بڑے غائر نظر سے دیکھا ہے اور اُن کا کام ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہی گا۔ انھوں نے ذریعہ تعلیم اور دیسی زبانوں سے بھی بحث کی ہی۔ ہندوستان کے اہل الرائے کی شہادتیں جمع کی ہیں۔ ذریعہ تعلیم کے متعلق اختلاف رائے ہی۔ لیکن دیسی زبان کی تعلیم و ترقی کو عام طور پر سب تسلیم کرتے ہیں۔ ارکان کمیشن بعد غور و فکر کے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔

۱۔ ان کی رائے میں انگریزی کو ذریعۂ تعلیم ضرورت سے زیادہ بنایا گیا ہے اور دیسی زبانوں کی طرف سے سخت غفلت کی گئی ہی۔

۲۔ ہائی اسکولوں میں سوائے انگریزی اور ریاضیات کے دوسرے مضامین دیسی زبان کے ذریعہ سی سکھائے جائیں اور ذریعۂ تعلیم کے بارے میں طلبہ کو کامل اختیار دیا جائے۔

۳۔ تعلیم یونیورسٹی میں ماسوائے قدیم السنہ (سنسکرت، عربی، فارسی) اور دیسی زبانوں کے باقی تمام مضامین کی تعلیم انگریزی زبان کے ذریعہ سے دی جائے۔

یہ بہت غنیمت ہی اور اب ہماری تعلیم میں دیسی زبانوں کا درجہ تسلیم کرلیا گیا ہے اور اُمید ہی کہ آیندہ ایسا زمانہ آئیگا کہ ہماری زبانیں یونیورسٹی کی تعلیم کا بھی ذریعہ قرار دی جائیں گی۔

لیکن کے ساتھ ہی کمیشن نے دیسی زبانوں کی ادبی تعلیم کو یونیورسٹی میں قدیم السنہ کے ساتھ ساتھ رکھا ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی بڑی خوش قسمت ہی کہ اس نے بنگالی زبان کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کرلیا ہے اور اس کے لئے ایک فاضل بنگالی ادیب کا بھی تقرر ہوچکا ہے۔ ہمیں اُمید ہی کہ اُردو زبان کو بھی وہی درجہ دیا جائے گا کیوں کہ بنگال میں مسلمانوں کی تعداد نصف سے زائد ہی اور وہ اُردو کو اپنی قومی اور تعلیمی زبان خیال کرتے ہیں۔ بعض دوسرے یونیورسٹیوں نے بھی

[illegible] میں شریک کیا ہی۔ لیکن ابتدا میں جو غلطی انگریزی تعلیم کے متعلق ہوئی تھی کہ زیادہ تر

[illegible] گئی اور ابتدائی تعلیم کو زیادہ قابل التفات خیال نہ کیا گیا وہی غلطی دیسی زبانوں

[illegible] زمانہ کے بعد اس غلطی

کی اصلاح بھی ہوگی۔ خصوصاً جب کہ ثانوی تعلیم میں ایک ذریعۂ تعلیم دیسی زبان بھی قرار دیا گیا ہے۔

ڈیڑھ سو برس کے عرصہ میں ہماری زبانوں کا ذکر صرف اس قدر آیا ہے اور اس میں بھی ہمارا حصّہ بہت کم ہے۔ اکثر و بیشتر بلکہ ہمیشہ تحریک دوسری طرف سے ہوئی ہے۔ ہم نے انگریزی تعلیم کی اشاعت کے لئے سرکار میں بڑے بڑے پرزور میموریل بھیجے، بڑی بڑی فیاضیاں دکھائی ہیں، قربانیاں کی ہیں، لیکن کبھی اپنی زبان کی ترقی کے لئے کوئی باضابطہ اور متفقہ کوشش نہیں کی۔ اور جب کبھی کوئی ایسی کوشش ہوئی تو وہ بھی اکثر اجنبیوں کی طرف سے۔ البتہ ہم نے انگریزی کے شوق میں اس کی مخالفت ضرور کی ہے۔ اپنی زبان کی طرف سے یہ غفلت خودکشی تک پہنچ گئی ہے۔

ابھی چند سال کے عرصہ میں یہ مسئلہ امپیریل لیجس لیٹو کونسل میں بھی پیش ہوا تھا۔ رعایا کے اکثر فاضل نمایندوں نے اس سے اختلاف کیا اور سب سے زیادہ مخالفت کی آواز بنگال سے بلند ہوئی۔ یہ ہیں ہمارے نمایندے جو شاہی مجلس وضع آئین و قوانین میں ہماری نیابت کرتے ہیں۔ انھیں اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انگریزی کو ٹھیس لگ جائے۔ اللہ اللہ! انگریزی اس قدر عزیز اور اپنی زبان اس قدر حقیر۔

نتیجہ اس کجروی اور بے پروائی کا یہ ہوا کہ ہمارے دل و دماغ، ہمارے خیالات، ہمارے کاروبار پر انگریزی کی حکومت ہوگئی۔ اندر باہر، گھروں میں اور مدرسوں میں، تحریر میں اور تقریر میں خط و کتابت میں اور ملاقاتوں میں یہاں تک کہ قومی مجلسوں اور انجمنوں میں اس کا جلوہ نظر آتا ہے۔ انگریزی بولنا اور لکھنا فخر سمجھا جاتا ہے۔ علم کے معنی انگریزی جاننے کے ہوگئے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ہم خیال میں، عمل میں، تمدن میں، اخلاق میں مصنوعی آدمی ہو گئے ہیں اور ہمارا طرز عمل بالکل بہروپیے کا سا ہے۔ اور اس طرز عمل کا اثر یہ ہے کہ ہماری زبان جنگل کے ایک خود رو درخت کے مانند رہ گئی ہے جس کی پرورش قدرت کی عنایت پر ہے اور جس کا دیکھنے والا سوائے متلون مزاج فطرت کے اور کوئی نہیں۔

ایک مدت کے بعد اور وہ بھی دردناک مثالیں دیکھ کر بعض ہمدردانِ ملک کو۔۔۔
تعلیم کو ہم سرمایۂ حیات خیال کئے ہوئے تھے وہ قاطع حیات نکلا۔

ہوئے ہیں۔ اعضا میں توانائی نہیں، نشو و نما رک ہی گئی ہے، آنکھوں میں نور نہیں، دل میں اُمنگ نہیں، رہا دماغ بیچارہ سو تھکا ماندہ، مستعدی، شوخی، بے چینی، اُمنگ، حوصلہ اور ہمت جو اس سن کا مقتضا ہے، سب مدّھم پڑ گئے ہیں۔ اگر اعداد و شمار جمع کئے جائیں تو معلوم ہوگا کہ بہت سے منزل مقصود پر پہنچنے سے پہلے ہی رستہ میں تھک کر بیٹھ گئے۔ بہت سے منزل مقصود پر پہنچتے پہنچتے ایسے چور ہو گئے کہ بیٹھے تو پھر نہ اُٹھے۔ اور جو سب مصیبتیں جھیل کر نکل آئے اُن میں سے بھی بہت ایسے ملیں گے جو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ ضعف بصارت، ضعف معدہ، سل، ضعف دماغ یہ امراض ہمارے طلبا اور تعلیم یافتہ اصحاب کے ساتھ کچھ مخصوص سے ہو گئے ہیں۔ بعض صاحبوں نے حساب لگا کر دریافت کیا ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ اصحاب کی اوسط عمر بہت کم ہوتی ہے اور ان میں سے اکثر عالم جوانی ہی میں رخصت ہو جاتے ہیں مستثنیٰ حالتوں کا ذکر نہیں لیکن ان میں سے کوئی کوئی جو بڑے قابل اور فاضل کہلاتے ہیں اگر وہ اپنے گریبانوں میں مُنہ ڈال کر دیکھیں تو خود معلوم ہو جائے گا کہ ہم کتنے پانی میں ہیں۔ ہمارے طالب علم فی الحقیقت تعلیم کے پیچھے مجنون ہو جاتے ہیں، سب کچھ نذر کر دیتے ہیں مگر لیلائے علم پھر بھی نہیں ملتی۔ اور ملتی بھی ہے تو ایسے وقت میں جب ہم کام کے نہیں رہتے۔

اس میں طریقۂ تعلیم کا بھی قصور ہے، لیکن اصل نقص اور تمام عیوب کی جڑ یہ ہے کہ ذریعۂ تعلیم ایک غیر اور بالکل اجنبی زبان قرار دیا گیا ہے۔ اس سے بڑھکر کوئی ظلم تعلیم کے حق میں نہیں ہو سکتا۔ یہ دردناک منظر جو ہم اپنے طالب علموں کا دیکھتے ہیں اسی خرابی کا نتیجہ ہے۔ انگریزی کو ہماری زبان سے مطلق کوئی مناسبت نہیں، اوّل تو اس ٹیڑھی اور کٹھن زبان کا حاصل کرنا ہی ایک آفت ہے اس پر اسے تمام مضامین اور علوم کی تحصیل کا ذریعہ قرار دینا آفت پر آفت ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ نہ زبان ہی اچھی طرح آتی ہے اور نہ علم۔ خیر اگر یہیں تک ہوتا تو کچھ بُرا نہ تھا۔ غضب یہ ہے کہ اس کے بجائے وہ تمام جسمانی اور دماغی خرابیاں ملتی ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ یہ سب تسلیم کرتے ہیں کہ اس کی وجہ سے دماغ اور حافظہ پر بہت بیجا بار پڑتا ہے۔ طالب علم مجبور ہو کر الفاظ اور عبارت رٹنے لگتے ہیں اور مفہوم سے ناآشنا رہ جاتے ہیں۔ اور یہ پہلا زینہ ہے اُس ذہنی خودکشی کا جس کے مرتکب ہمارے طلبہ ہوتے ہیں یہیں سے الفاظ مفہوم عبارت و معانی میں بیگانگی شروع ہو جاتی ہے بے معنی تقلید اور دماغی غلامی کی بنیاد پڑ جاتی ہے اور روز بروز قوت اجتہاد زائل ہونے لگتی ہے یعنی علاوہ جسمانی اضمحلال اور دماغی بار اور ضعف کے

بداخلاقی بھی شریک حال ہوجاتی ہے۔

زبان صرف اظہارِ خیالات کا آلہ ہی نہیں بلکہ اس کا بہت بڑا تعلق فکر وعقل سے بھی ہے۔ جو زبان ہم بولتے ہیں جس میں ہم ابتدا سے پرورش پاتے ہیں وہ صرف بات چیت ہی کا ذریعہ نہیں بلکہ وہ ہمارے روایات، تمدن معاشرت، اخلاق ومذہب اور قومیت وروحانیت کی بھی حامل ہے۔ اسے ترک کرنا یا اس کی طرف سے غفلت کرنا ان سب چیزوں کو جو مایۂ حیات بلکہ جان سے زیادہ عزیز ہیں، صدمہ پہنچانا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ عرصہ سے اہلِ ملک اس طرف کسی قدر متوجہ ہوئے ہیں، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ دل سے اپنی زبان کی قدر کرتے ہیں بلکہ اس کی تہ میں سیاسی انقلاب ہے اس پر لاالحب علی بل لبغض معاویہ کی مثل صادق آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود اس کے کوئی باقاعدہ کوشش اپنی زبان کی ترقی کے لئے نہیں کی گئی۔ جو لوگ سوراج کے حاصل کرنے پر آمادہ ہیں اور اس کے لئے جان ومال عزت آبرو سب کچھ تج دینے کے لئے تیار ہیں انھیں پہلے اپنی زبان کی خبر لینی چاہیئے۔ سوراج کی مقدم شرط "سوبھاکا" ہے۔ جن کی اپنی زبان نہیں وہ گونگے ہیں اور دربارِ اقوام میں گونگے بار نہیں پا سکتے اور نہ سوراج کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ سیاسی آزادی سے پہلے دماغی آزادی کی ضرورت ہے۔

اعلیحضرت میر عثمان علی خاں خلد اللہ ملکہ کی یہ اعلیٰ درجہ کی دور اندیشی ہے کہ انھوں نے سب سے اوّل اس مرض کو پہچانا اور اپنی ریاست میں ایک ایسی یونیورسٹی کی بنیاد قایم کرائی جس میں اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ اردو زبان ہے اور بقول آنریری سکرٹری انجمن ترقی اردو وہ کارنامہ "جو ہندوستان کے اس دورِ جدید میں جو گوناگوں خیالات وتوقعات سے گونج رہا ہے، علمی نظر سے سب سے زیادہ انقلاب انگیز ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام ہے جس کی ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ تمام علوم وفنون کی تعلیم اردو زبان کے ذریعہ سے دی جائے گی۔ یہ یونیورسٹی مشرق ومغرب کا سنگم ہوگی، جہاں طالبانِ علم وتحقیق اپنی پیاس بجھائیں گے اور اپنی زبان وملک کو بیش بہا معلومات اور جدید تحقیقات سے مالا مال کریں گے۔ یہ پہلا وقت ہے کہ ایک دیسی زبان کو یہ رتبہ نصیب ہوا ہے۔ یہ پہلا وقت ہے کہ ہندوستان کے علمی کارخانے میں تقلید کے بندھن توڑے گئے ہیں۔ یہ پہلا وقت ہے کہ اس عہد میں فطری اور حقیقی اصول پر تعلیم کے اجرا کا موقع دیا گیا ہے، جو قومی تعلیم کی عمارت کا سنگِ بنیاد ہے۔"[1]

---

[1] سالانہ رپورٹ انجمن ترقی اردو بابت ۱۹۱۷ء

عام طور پر تعلیم کے دو طریقے ہیں۔ ایک بذریعہ پیرا فریز (Para phrase) یعنی کتاب کے مطالب کو اُسی زبان میں ادا کرنا جس میں کتاب لکھی ہے۔ دوسرا بذریعہ ترجمہ۔

ہمارے مدارس اور کالجوں میں پہلا طریقہ رائج ہے۔ یعنی تمام مضامین انگریزی میں پڑھائے جاتے ہیں اور انگریزی ہی میں اس کے مطالب و معانی بیان کئے جاتے ہیں۔ چوں کہ یہ طریقہ ابتدائے تعلیم سے رائج ہے لہٰذا اس کا نتیجہ دماغی، اخلاقی اور جسمانی ضعف ہوتا ہے جس کا بیان اوپر ہو چکا ہے۔ مادری زبان ذہنی تربیت کا بہت بڑا ذریعہ ہوتی ہے اور چوں کہ ہمارے مدارس اور کالجوں میں اس کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں لہٰذا عام ذہنی تربیت ناقص ہو جاتی ہے اور اس سے تمام تعلیم کو نقصان پہنچتا ہے اور طلبا میں فہم و شعور کی کافی ترقی نہیں ہوتی اور وہ کسی زبان میں بھی اپنے مافی الضمیر کے ادا کرنے پر قادر نہیں ہوتے۔ بخلاف اس کے مادری زبان کے ذریعہ سے تعلیم دینے میں اُن کی دماغی تربیت قدرتی طور سے ہوتی ہے ذہن میں روشنی اور رسائی پیدا ہوتی ہے۔ سمجھ تیز ہو جاتی ہے۔ توجہ کرنے کی عادت پڑتی ہے۔ صحیح اور غیر صحیح بُرے اور بھلے میں امتیاز ہونے لگتا ہے۔ مفہوم پر قدرت ہوتی ہے۔ طالب علم رٹنے کی بیجا مشقت سے بچ جاتا ہے اور اُسے اپنے پر اعتماد پیدا ہو جاتا ہے جو اخلاق اور علم دونوں کے لئے ضروری ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مادری زبان کے ذریعہ سے تعلیم و تربیت تعلیم کی اصل بنیاد ہے علاوہ اس کے یہ بات بھی قابل غور ہے کہ صحیح علم ہمیں ہمیشہ مقابلہ سے حاصل ہوتا ہے اور جب تک ہم انگریزی زبان کو بجائے اس زبان میں دُہرانے کے بذریعہ ترجمہ نہ پڑھیں گے ہم صحیح مفہوم کے حاصل کرنے سے قاصر رہیں گے یہ ممکن ہے کہ طالب علم انگریزی میں صفائی سے کسی لفظ یا اصطلاح کی تشریح و تصریح کر دے لیکن جب تک اُسے یہ نہ معلوم ہوگا کہ خود اس کی زبان میں اُسے کیا کہتے ہیں اس کے دماغ میں کبھی اس کا صحیح مفہوم نہ آئیگا۔ اس میں ایک اور بات قابل غور یہ ہے کہ "پیرا فریز" کے ذریعہ سے پڑھانے میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کے خیالات اور اعلیٰ درجہ کی عبارت کو کمزور ناقص اور پھسپھسی زبان میں ادا کیا جاتا ہے اور اُن کی ادبی خوبیاں ذہن میں نہیں آتیں۔ اس طرح سے پڑھانا گویا اُن انمول موتیوں کو خاک میں ملانا اور اُن لطیف خیالات کا خون کرنا ہے۔ اگر تعلیم ترجمہ کے ذریعہ سے ہو تو خیالات کی خوبی اور نزاکت، ادبی نکات اور قوت بیان اور عبارت کی خوبیاں زیادہ اچھی طرح ذہن نشین ہو سکتی ہیں مادری زبان کی تعلیم سے جو غفلت ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے تعلیم کا ذریعہ

انگریزی رہا اور اس سے انگریزی کی تحصیل میں بھی زیادہ فائدہ ہوا۔ اور تجربہ سے یہ ثابت ہوگیا ہے اور ماہران تعلیم کی شہادت موجود ہے کہ جن طلبہ کی تعلیم مادری زبان سے ہوئی ہے وہ زیادہ سمجھدار اور مستعد ہوتے ہیں غیر زبان کو ضرورت سے زیادہ اور قبل از وقت ذریعۂ تعلیم بنا دینے سے دماغ پریشان اور کند ہو جاتا ہے اور اس کی تلافی حافظہ سے کی جاتی ہے اور آخر میں وہ بھی جواب دیدیتا ہے۔ اور سب سے بڑا غضب یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں خود ہمارے قدیم السنہ (عربی، سنسکرت، فارسی) اور دیسی زبانیں انگریزی کے ذریعہ سے پڑھائی جاتی ہیں۔ یہ طریقہ کس قدر بے عقلی پر مبنی ہے اور اس سے بڑھ کر کیا بدنصیبی ہو سکتی ہے۔

یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ابتدا سے انگریزی پڑھانے اور انگریزی کے ذریعہ سے تمام مضامین پڑھانے میں انگریزی زبان کی تحصیل میں بہت بڑی سہولت متصور ہے۔ یہ خیال بھی غیر ممالک سے مستعار لیا گیا ہے۔ یہ وہیں ممکن ہے جہاں اندر باہر اُسی زبان کا رواج ہو اور ہم جماعت، عزیز اقارب، دوست آشنا اُسی زبان کا استعمال کرتے ہوں۔ ہمارے مدارس میں صرف گھنٹہ دو گھنٹے تو انگریزی پڑھائی جاتی ہے باقی طالب علم جہاں جاتا ہے اُسے اپنی زبان بولنی پڑتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ خیال کچھ زیادہ قابل وقعت نہیں۔

دُنیا میں شاید ہندوستان ہی ایک ایسا بدنصیب مُلک ہے جہاں ذریعۂ تعلیم غیر زبان ہے اور یہی نہیں بلکہ اپنی زبان کی طرف سے نہایت بے پرواہی اور غفلت کی جاتی ہے اور اُسے حقیر خیال کیا جاتا ہے۔ کیا انگلستان، جرمنی یا فرانس میں کوئی نوجوان تعلیم یافتہ کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے جو اپنی زبان پر قدرت نہ رکھتا ہو یا اپنے ادب سے واقف نہ ہو اور اپنے خیالات و جذبات کو صحیح طور سے ادا نہ کر سکتا ہو؟ پھر کس اصول اور کس بنیاد پر ہمارے نوجوان جو کالجوں سے پڑھ کر نکلتے ہیں تعلیم یافتہ کہلا سکتے ہیں۔

ایک خیال یہ بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ دیسی زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دینے سے انگریزی کمزور رہ جاتی ہے۔ میرے خیال میں یہ رائے بغیر غور کئے قایم کی گئی ہے اور تجربہ پر مبنی نہیں ہے۔ اس سے انگریزی کو نقصان نہیں پہنچتا بلکہ اس سے انگریزی کی تحصیل میں مدد ملتی ہے اور دیسی زبان اس کا تکملہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس طریقہ سے انگریزی روزمرہ اور محاورات ذرا دیر سے ذہن نشین ہوتے ہیں مگر جب ایک دفعہ ذہن نشین ہو گئے تو پھر عمر بھر نہیں نکل سکتے۔ علاوہ اس کے مادری زبان کی تعلیم سے جو دماغی تربیت ہوتی ہے اس سے انگریزی زبان کی تحصیل

میں بڑی مدد ملے گی۔

ہمارا مقصد انگریزی تعلیم کا گھٹانا یا اسے نقصان پہنچانا نہیں ہے بلکہ ہم انگریزی یا یورپی زبان کی تعلیم لازم ولابد خیال کرتے ہیں۔ کیوں اس زمانہ میں اس کے بغیر تعلیم مکمل نہیں ہو سکتی۔ مگر اس کے ساتھ ہی ہم صحیح طریقۂ تعلیم پر زور دینا چاہتے ہیں جو عقل و تجربہ پر مبنی ہے اور جو بغیر مادری زبان کے ہمیشہ ناقص اور نامکمل رہیگا۔ اور بغیر مادری زبان کی باقاعدہ اور اعلیٰ تعلیم کے انگریزی یا کسی دوسرے یورپی زبان کی تحصیل بھی مفید نہیں ہو سکتی۔

ہمارے ملک میں تعلیم کی بڑی غرض سرکاری ملازمت یا نوکری کا حاصل کرنا ہے۔ یہ اس تعلیم کی گھٹی میں پڑی ہے۔ اس کی ابتدا بھی اسی نیت سے ہوئی اور غالباً انتہا بھی یہی معلوم ہوتی ہے۔ اس سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو بڑی غایت تحصیلِ علم یا اشاعتِ ہے۔ علم اس طریقۂ تعلیم سے جو ہمارے ہاں رائج ہے۔ جیسا کچھ آتا ہے ظاہر ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ صورت کچھ ایسی آپڑی ہے کہ اس کا منشا علم کی تحصیل رہا ہی نہیں جب تک مدارس یا کالجوں میں ہیں، بڑا مقصد امتحان میں کامیاب ہونا ہے اور مدارس اور کالجوں سے نکل کر نوکری حاصل کرنا۔ اس تعلیم کی بنیاد کچھ ایسے وقت اور ایسی نیت سے پڑی تھی کہ علم کی برکت بالکل اُٹھ گئی ہے۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ غیر زبان جو ذریعۂ تعلیم قرار دی گئی ہے ہماری سنگ راہ ہے۔ دوسرے ہمارے نصاب تعلیم میں دیسی زبانوں کا کہیں پتہ نہیں۔ قدیم روایات، اپنے اخلاق و خصائل، اپنے ہاں کے ادبا و شعرا کے کلام کی خوبیوں سے بے بہرہ و بیگانہ رہنے کے علاوہ ذہنی تربیت بھی نہیں ہونے پاتی اور ہم مدارس میں مشین کی طرح ایک مدت معین تک گھاس کاٹتے رہتے ہیں اور اس کے بعد ایک کارخانہ سے دوسرے کارخانہ میں جا پہنچتے ہیں جہاں پھر وہی مشین کا سا کام کرنا پڑتا ہے۔ علم نہ اس تعلیم کا مقصد ہے اور نہ تعلیم پانے والے کا۔ اب اگر کوئی باوجود ان رکاوٹوں کے ایسا نکل آتا ہے جو کچھ جانتا اور سمجھتا ہے تو اس کا جاننا اور سمجھنا ایسا ہی ہے جیسا گونگے کا گڑ کھانا کہ وہ دل ہی دل میں مزے لیتا ہے اور کچھ کہہ نہیں سکتا۔ انگریزی تعلیم خود مقصود بالذات نہیں ہے۔ بلکہ ذریعہ و آلہ ہے اس بات کا کہ اپنی مادری زبان میں علم کی اشاعت کریں اور جو کچھ حاصل کیا ہے وہ اپنی زبان کے ذریعہ سے اپنے بھائیوں تک پہنچائیں۔ اس سے بڑھ کر کوئی ملک اور قوم کی خدمت نہیں ہو سکتی۔ لیکن موجودہ حالات میں یہ بہت دشوار ہے کیوں کہ ہم نے اپنی زبان اور اور ادب کا کبھی غور اور تحقیق سے مطالعہ نہیں کیا، کبھی اس کی تحصیل میں دل سے سعی نہیں کی۔ زبان پڑھی تو غیر اور

علوم پڑھتے تو غیر زبان میں۔ اب اپنی زبان میں ادا کریں تو کیوں کر۔ اگر اب سے ڈیڑھ سو برس پہلے جب ہندوستان میں جدید تعلیم کا آغاز ہوا تھا ہمیں تعلیم اپنی زبان میں دی جاتی اور اُن نامورا دبا اور یکتائے روزگار شعرا کا کلام جو داخل نصاب ہی ہمیں اپنی زبان میں سمجھایا جاتا اور تمام علوم و فنون کی تحصیل ہماری زبان میں ہوتی تو آج ہماری زبان کہاں سے کہاں پہنچ جاتی اور کچھ نہیں تو کم سے کم اس ذلت و گمنامی کی حالت میں نہ رہتی۔ اُس وقت ہمارے تعلیم یافتہ کیسے کیسے کام کرتے اپنے علم سے قوم کی خدمت کرتے اور ملک میں روشنی پھیلاتے اور جو عام جہالت اور تاریکی اس وقت پائی جاتی ہے وہ کبھی نہ ہونے پاتی۔

ان حالات پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں جامعۂ عثمانیہ کی قدر ہوتی ہے جس میں تمام علوم و فنون اُردو کے ذریعہ سے پڑھائے جاتے ہیں اور انگریزی زبان و ادب کی تعلیم لازم قرار دی گئی ہے۔ تاکہ ایک طرف ہم انگریزی سے استفادہ کر سکیں اور دوسری طرف ہر قسم کے علوم و مضامین کو اپنی زبان میں ادا کر سکیں۔ جو لوگ اس یونیورسٹی سے تعلیم پاکر نکلیں گے اُن سے بجا طور پر یہ توقع ہو سکتی ہے کہ وہ علم کی نشر و اشاعت سے اپنے ملک کی خدمت کریں گے جو کچھ انھوں نے خود حاصل کیا ہے اُسے اپنے بھائیوں تک پہنچائیں گے اور علم کی منزل کو جو اس وقت غیر زبان کے حائل ہونے سے سخت دشوار گزار ہے، آسان کریں گے۔

اُنیسویں صدی کے آغاز یعنی ۱۸۰۰ء میں مارکوئیس آف ولزلی نے فورٹ ولیم کالج کی بنیاد ڈالی اور اس میں ہمارے قدیم و جدید زبانوں اور ہندو مسلمانوں کے قوانین وغیرہ کی تعلیم کا انتظام کیا۔ اگرچہ اس کالج میں بعض اور زبانیں بھی پڑھائی جاتی تھیں لیکن سب سے زیادہ اہمیت اور وقعت اُردو زبان کی تعلیم کو دی جاتی تھی کیوں کہ وہ ہندوستان کی عام اور مشترک زبان خیال کی جاتی تھی۔ چنانچہ اس کالج میں جس قدر کام اُردو زبان کے متعلق ہوا اور جس قدر اُردو میں کتابیں لکھی گئی ہیں اور عام طور سے جو وقعت اسے حاصل تھی وہ کسی دوسری زبان کو نہ تھی۔ بلکہ دوسری زبانوں کا انتظام بھی کافی طور پر نہ تھا۔ یہ کالج اُن نوجوان انگریزوں کے لئے جو نئے نئے انگلستان سے آتے تھے نیز یہاں کے ملازم انگریزوں کے لئے قایم کیا گیا تھا تاکہ وہ یہاں کی زبان، رسم و رواج اور قانون وغیرہ سے واقفیت حاصل کریں۔ کمپنی کے ڈائرکٹر ابتدا سے اس کالج کے مخالف تھے اور آخر وہ تین چار سال سے زیادہ قایم نہ رہ سکا۔ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۳۲ء میں فارسی سرکاری دفاتر سے خارج کی گئی اور اُردو اس کی قایم مقام ہوئی یعنی اُردو کو علاوہ

ملک کی عام زبان ہونے کے سرکاری رسوخ اور درباری ہونے کی عزت بھی حاصل ہوئی۔ اگر ہماری تعلیم ابتدا سے غلط اصول پر قایم نہ ہوتی تو اس میں شک نہیں کہ آج اُردو کا ستارہ اوج پر ہوتا۔ یہی ایک زبان تھی جس پر نظر انتخاب پڑتی اور جو ملک میں عام طور پر رائج تھی اور ملک کے بیشتر حصّے کے لئے یہی ذریعۂ تعلیم قرار دی جاتی لیکن بدنصیبی سے انگلستان کے طریقۂ تعلیم کی تقلید میں وہ موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ اب سوا سو برس کے بعد دکن میں جہاں اُردو نے سب سے پہلے ادبی صورت اختیار کی تھی، اس افسوسناک فروگزاشت کی تلافی ہوئی ہے۔ ہندوستان جیسے وسیع اور عظیم الشّان ملک میں جہاں "بھانت بھانت" کی بولیاں بولی جاتی ہیں یہی ایک زبان اس عزت کی مستحق ہوسکتی ہے۔ جو اکثر جگہ بولی اور ہر جگہ سمجھی جاتی ہے۔ جو ہندو مسلمانوں کے اتحاد اور میل جول کی مُبارک یادگار ہے۔ اتحاد جس کے خمیر اور سرشت میں ہے اور یقین ہے کہ وہ آیندہ بھی اس مقدس فرض کو انجام دیگی اور ہندوستان کی مختلف اقوام میں رابطۂ اتحاد و اتفاق کو قایم اور مستحکم رکھے گی۔ خاص کر ریاست حیدرآباد دکن میں جہاں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں اس سے زیادہ کسی کو ذریعۂ تعلیم ہونے کا حق نہیں۔ یہ ریاست میں ہر جگہ بلاتکلف سمجھی اور بولی جاتی ہے سرکاری اور درباری زبان ہے۔ ہندو مسلمان دونوں لسے شوق سے پڑھتے اور استعمال کرتے ہیں اور عدالتوں، دفتروں، مجلسوں اور انجمنوں میں یہی ذریعہ اظہار خیلات ہے۔ اور اس لئے سب سے پہلے اعلی تعلیم کا ذریعہ اسے قرار دینا ہر طرح قرین مصلحت تھا۔ قطع نظر اس کے یہ پہلا اور نیا تجربہ ہے اور اس کی کامیابی پر دوسری زبانوں کی ترقی کا بہت کچھ دارومدار ہے اور اس تجربہ سے دوسری زبانوں کو بہت سے نئے اور عجیب سبق ملیں گے۔

اس کے متعلق ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اُردو زبان میں اتنی سکت کہاں ہے جو اعلیٰ تعلیم کی متحمل ہو۔ یہی عذر ۱۸۳۵ء میں کیا گیا تھا اور یہی اعتراض ۱۸۵۴ء کے ڈسپیچ میں وارد ہوا تھا اور آج سوا سو برس بعد پھر یہی اعتراض کیا جاتا ہے۔ اور آیندہ جب کبھی اس کا موقع آئیگا تو یہی اعتراض کیا جائے گا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اُردو یا ہندوستان کی کوئی زبان بھی کبھی اس قابل نہیں ہوسکتی کہ وہ اعلی تعلیم کا ذریعہ قرار پاسکے۔ اگر ہمارا نظام تعلیم یہی رہیگا جو اس وقت ہے، اگر ہماری غفلت اپنی زبانوں کی طرف سے یہی رہے گی جو اب ہے تو شاید کبھی ایسا زمانہ نہ آئیگا کہ ہم اپنی کسی زبان کو علمی دُنیا میں سُرخرو دیکھیں۔ اگر ہم ابتدا سے اس کا خیال رکھتے یا ہماری تعلیم صحیح

اُصول پر ہوتی تو آج ہماری زبان ادبی اور علمی لحاظ سے مالامال ہوتی۔ جب تعلیم غیر زبان اور غیر زبانوں کے ذریعہ سے ہوتی ہے تو زبان میں قوت کہاں سے پیدا ہوتی۔ جب مانگ ہی نہ تھی تو کتابیں کہاں سے آتیں۔ اب ضرورت ہوئی ہے تو اس کا سامان بھی ساتھ ساتھ مہیا ہو جائے گا۔

کیا اب اس وقت تک انتظار کرنا مناسب ہوگا کہ یہ اس قابل ہو جائے؟ اور اس انتظار کی کوئی حد کوئی وقت؟ محض انتظار کوئی چیز نہیں۔ اور نہ وہ کسی شے میں صلاحیت یا قابلیت پیدا کر سکتا ہے۔ ہر زبان کی ابتدا میں یہی حالت ہوتی ہے۔ زبانیں بنانے سے بنتی اور محنت سے ترقی کرتی ہیں۔ پچاس برس قبل جاپانی زبان اُردو سے زیادہ وسیع نہ تھی۔ خود انگریزی زبان چند صدی پہلے کیا تھی۔ اس کے نامور مؤرخ اور فلسفی لاطینی اور فرانسیسی میں لکھنا زیادہ باعث فخر سمجھتے تھے۔ اردو اگر کم مایہ ہے تو ہماری سعی سے صاحب سرمایہ ہو سکتی ہے۔ اگر وہ کمزور ہے تو ہماری محنت سے قوی بن سکتی ہے۔ اور یہ عین مصلحت پر مبنی تھا کہ عثمانیہ یونیورسٹی قایم کرنے سے قبل تالیف و ترجمہ کا ایک سررشتہ قایم کر دیا گیا جو بقول سکرٹری انجمن ترقی اُردو اُس یونیورسٹی کے لئے بمنزلہ ریڑھ کی ہڈی کے ہے"۔ چنانچہ اس سررشتہ نے نصاب تعلیم کی کتابیں ترجمہ اور تالیف کیں اور اس وقت تک برابر اس کام میں مصروف ہے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ محض ترجمہ کافی نہیں۔ یہ بھی سچ ہے۔ لیکن موجودہ حالت میں سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں خصوصاً جب کہ ملک میں ایسے قابل مصنف نہیں جو ہر فن میں ایسی کتابیں تصنیف کر سکیں جو یونیورسٹی میں پڑھانے کے لایق ہوں۔ ہم مولوی عبدالحق (ناظم سررشتۂ تالیف و ترجمہ) کے اس خیال سے بالکل متفق ہیں جو انھوں نے مطبوعات یونیورسٹی کے مقدمہ میں ظاہر کیا ہے۔

"دُنیا میں ہر قوم کی زندگی میں ایک ایسا زمانہ آتا ہے جب کہ اُس کے قوائے ذہنی میں انحطاط کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں، ایجاد و اختراع اور غور و فکر کا مادّہ تقریباً مفقود ہو جاتا ہے۔ تخیّل کی پرواز اور نظر کی جولانی تنگ اور محدود ہو جاتی ہے، علم کا دارومدار چند رسمی باتوں اور تقلید پر رہ جاتا ہے۔ اُس وقت قوم یا تو بیکار اور مُردہ ہو جاتی ہے یا سنبھلنے کے لئے یہ لازم ہوتا ہے کہ وہ دوسری ترقی یافتہ اقوام کا اثر قبول کرے۔ تاریخ عالم کے ہر دَور میں اس کی شہادتیں موجود ہیں۔ خود ہمارے دیکھتے دیکھتے جاپان پر یہی گزری اور یہی حالت اب ہندوستان کی ہے۔

جس طرح کوئی شخص دوسرے بنی نوع انسان سے قطع تعلق کرکے تنہا اور الگ تھلگ نہیں رہ سکتا اور اگر رہے تو پنپ نہیں سکتا، اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ کوئی قوم دیگر اقوام عالم سے بے نیاز ہو کر پھولے پھلے اور ترقی پائے جس طرح ہوا کے جھونکوں اور ادنیٰ پرندوں اور کیڑے مکوڑوں کے اثر سے وہ مقامات تک ہرے بھرے رہتے ہیں جہاں انسان کی دسترس نہیں اسی طرح انسانوں اور قوموں کے اثر بھی ایک دوسرے تک اُڑ کر پہنچتے ہیں جس طرح یونان کا اثر روما اور دیگر اقوام یورپ پر پڑا جس طرح عرب نے عجم کو اور عجم نے عرب کو اپنا فیض پہنچایا جس طرح اسلام نے یورپ میں تاریکی اور جہالت کو مٹا کر علم کی روشنی پہنچائی، اسی طرح آج ہم بھی بہت سی باتوں میں مغرب کے محتاج ہیں۔ یہ قانونِ عالم ہی جو یوں ہی جاری رہا اور جاری رہیگا ع

دیے سے دیا یوں ہی جلتا رہا ہی

جب کسی قوم کی نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے اور وہ آگے قدم بڑھانے کی سعی کرتی ہی تو ادبیات کے میدان میں پہلی منزل ترجمہ ہوتی ہی۔ اس لئے کہ جب قوم میں جدت اور اپج نہیں رہتی تو ظاہر ہے کہ اس کی تصانیف معمولی، ادھوری، کم مایہ اور ادنیٰ ہوں گی۔ اس وقت کی بڑی خدمت یہی ہے کہ ترجمہ کے ذریعہ سے دنیا کی اعلیٰ درجہ کی تصانیف اپنی زبان میں لائی جائیں۔ یہی ترجمے خیالات میں تغیر اور معلومات میں اضافہ کریں گے، جمود کو توڑیں گے اور قوم میں ایک نئی حرکت پیدا کریں گے اور پھر آخر یہی ترجمے تصنیف و تالیف کے جدید اسلوب اور ڈھنگ سجھائیں گے۔ ایسے وقت میں ترجمہ تصنیف سے زیادہ قابل قدر، زیادہ مفید اور فیض رساں ہوتا ہی۔

اس ضمن میں انجمن ترقی اُردو سررشتہ تالیف و ترجمہ کی مدد سے ایک بہت بڑا کام انجام دے رہی ہے وہ کام اصطلات علمیہ کا وضع کرنا ہی۔ ظاہر ہے کہ یہ کام کس قدر اہم اور کس قدر ضروری ہے۔ ہر شخص جسے علمی کتاب کے ترجمے یا تالیف کا تجربہ ہے اس امر کی شہادت دیگا کہ اصطلاحات کی لغت نہ ہونے سے کیسی کیسی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ بعض قابل قابل لوگ جنھیں اپنے فن میں اچھی دستگاہ ہی اور قلم کے ذریعہ سے ملک کی خدمت کا بھی ارادہ رکھتے ہیں، انھوں نے بڑے شوق سے کام شروع کیا مگر قدم قدم پر اصطلاحات اُن کی سنگ راہ ہوئیں اور آخر مایوس ہو کر ارادہ ترک کرنا پڑا۔ یا اگر ہمت کرکے انجام کو پہنچا بھی دیا تو نتیجہ یہ ہوا کہ جو اصطلاحات انھوں نے وضع کی ہیں ان میں سے یا تو اکثر اصول و قواعد زبان کے لحاظ سے غلط ہیں یا ایسی غیر مانوس ہیں کہ ان کا استعمال

گراں گزرتا ہے۔ یا وہ مجوزہ لفظ اس قسم کا ہے کہ اُس موقع پر تو کام دیتا ہے لیکن جب اس اصطلاح کے اشتقاق وترکیب کا سلسلہ آگے چلتا ہی تو رہ جاتا ہے اور اس میں توسیع کی صلاحیت نہیں پائی جاتی۔ اس لغت کے تیار ہونے سے یہ مشکلات خود بخود رفع ہوجائیں گی اور اس سے مُلک کو جو فوائد پہنچیں گے اور علوم کے نشر و اشاعت میں جو بیش بہا مدد ملے گی وہ محتاج بیان نہیں[1]۔"

اصطلاحات کے وضع کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے اُس کی کیفیت ہم مطبوعات یونیورسٹی کے مقدمہ سے یہاں نقل کرتے ہیں جو دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔

اُس میں سب سے کٹھن اور سنگلاخ مرحلہ وضع اصطلاحات کا تھا۔ اس میں بہت کچھ اختلاف اور بحث کی گنجائش ہی۔ اس بارے میں ایک مدت کے تجربہ اور کامل غور و فکر اور مشورہ کے بعد میری یہ رائے قرار پائی ہی کہ تنہا نہ تو ماہر علم صحیح طور سے اصطلاح وضع کر سکتا ہی اور نہ ماہر لسان۔ ایک کو دوسرے کی ضرورت ہی۔ اور ایک کی کمی دوسرا پورا کرتا ہی۔ اس لئے اس اہم کام کو صحیح طور سے انجام دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دونوں یک جا جمع کئے جائیں تاکہ وہ ایک دوسرے کے مشورہ اور مدد سے ایسی اصطلاحیں بنائیں جو نہ اہلِ علم کو ناگوار ہوں نہ اہلِ زبان کو۔ چنانچہ اس اصول پر ہم نے وضع اصطلاحات کے لئے ایک ایسی مجلس بنائی ہی جس میں دونوں جماعتوں کے اصحاب شریک ہیں۔ علاوہ ان کے ہم نے اُن اہلِ علم سے بھی مشورہ کیا جو اس کی خاص اہلیت رکھتے ہیں اور بُعدِ مسافت کی وجہ سے ہماری مجلس میں شریک نہیں ہوسکتے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض الفاظ غیر مانوس معلوم ہوں گے اور اہلِ زبان انھیں دیکھکر ناک بھوں چڑھائیں گے۔ لیکن اس سے گزیر نہیں۔ ہمیں بعض ایسے علوم سے واسطہ ہی جن کی ہوا تک ہماری زبان کو نہیں لگی۔ ایسی صورت میں سوائے اس کے چارہ نہیں کہ جب ہماری زبان کے موجودہ الفاظ خاص خاص مفہوم کے ادا کرنے سے قاصر ہوں تو جدید الفاظ وضع کریں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم نے محض ٹالنے کے لئے زبردستی الفاظ گھڑ کر رکھ دیئے ہیں، بلکہ جس نہج پر اب تک الفاظ بنتے چلے آئے ہیں اور جن اصولِ ترکیب و اشتقاق پر اب تک ہماری زبان کاربند رہی ہے، اس کی پوری پابندی ہم نے کی ہی۔ ہم نے اُس وقت تک کسی لفظ کے بنانے کی جرأت نہیں کی جب تک اُس قسم کی متعدد مثالیں ہمارے

[1] سالانہ رپورٹ انجمن ترقی اُردو بابت ۱۹۱۸ء

پیش نظر نہ رہی ہوں۔ ہماری رائے میں جدید الفاظ کے وضع کرنے کی اس سے بہتر اور صحیح صورت کوئی نہیں۔ اب اگر کوئی لفظ غیر مانوس یا اجنبی معلوم ہو تو اس میں ہمارا قصور نہیں۔ جو زبان زیادہ تر شعر و شاعری اور قصص تک محدود ہو، وہاں ایسا ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں جس ملک سے ایجاد و اختراع کا مادہ سلب ہو گیا ہو، جہاں لوگ نئی چیزوں کے بنانے اور دیکھنے کے عادی نہ ہوں۔ وہاں جدید الفاظ کا غیر مانوس اور اجنبی معلوم ہونا موجب حیرت نہیں۔ الفاظ کی حالت بھی انسانوں کی سی ہے۔ اجنبی شخص بھی رفتہ رفتہ مانوس ہو جاتے ہیں۔ اوّل اوّل الفاظ کا بھی یہی حال ہے۔ استعمال آہستہ آہستہ غیر مانوس کو مانوس کر دیتا ہے اور صحت و غیر صحت کا فیصلہ زمانہ کے ہاتھ ہوتا ہے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ لفظ تجویز کرتے وقت ہر پہلو پر کامل غور کر لیں۔ آیندہ چل کر اگر وہ استعمال اور زمانہ کی کسوٹی پر پورا اترا تو خود ٹکسالی ہو جائیگا اور اپنی جگہ آپ پیدا کر لے گا۔ علاوہ اس کے جو الفاظ پیش کئے گئے ہیں وہ الہامی نہیں کہ جن میں ردّ و بدل نہ ہو سکے، بلکہ فرہنگِ اصطلاحات عثمانیہ جو زیر ترتیب ہے پہلے اس کا مسودہ اہلِ علم کی خدمت میں پیش کیا جائیگا اور جہاں تک ممکن ہوگا اس کی اصلاح میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جائیگا۔"

غرض ہمارے ملک کے نظامِ تعلیم میں ایک نئے اور مبارک دَور کا آغاز ہوا ہے۔ اور ہمیں پورا یقین ہے کہ یہ ریاست حیدرآباد دکن ہی تک محدود نہ رہیگا بلکہ اس کی تقلید ملک کے دوسرے حصّوں میں بھی کی جائیگی۔ اس اصول کو تسلیم سب کرتے ہیں، لیکن اسے عمل میں لانے کی ہمت اب تک کسی کو نہ ہوئی تھی۔ اس کا سہرا حیدرآباد ہی کے سر رہا۔ اور اس پر اُسے جس قدر فخر ہو بجا ہے۔ کوئی تجویز ابتدا میں کامل نہیں ہوتی۔ اسی طرح یہ نظامِ تعلیم بھی نقص سے خالی نہیں۔ عمل اور تجربہ سے چھپے ہوئے نقص ظاہر ہوں گے اور ذمہ دار جماعتوں کا فرض ہوگا کہ اُن کی اصلاح کریں۔ سرِ دست اس بات کی ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ سررشتۂ تالیف و ترجمہ کو زیادہ قوی اور وسیع کیا جائے تاکہ اس کا کام محض کتبِ نصاب ہی کی ترجمہ و تالیف تک محدود نہ رہے بلکہ وہ ہر فن اور علم پر متعدد اعلیٰ درجہ کی کتابیں ترجمہ اور تالیف کر سکے۔ تاکہ طلبا اور دوسرے اہلِ ملک کو اپنے معلومات کے وسیع کرنے کا موقع ملے۔ اور جب تک یہ نہ ہوگا کوئی معتدبہ فائدہ نہیں ہو سکتا اور نہ زبان کی ترقی میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

دوسری چیز جو نصاب تعلیم کے مرتب کرتے وقت نظر انداز کر دی گئی ہے کہ مدارس فوقانیہ (عثمانیہ ہائی اسکولوں) میں اردو زبان کی تعلیم مطلق نہیں رکھی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو طالب علم فوقانیہ مدارس سے کامیاب ہوکر کالج میں داخل ہوں گے انھیں کتب نصاب کے سمجھنے میں دشواری ہوگی۔ یہ کہنا کہ چوں کہ ان مدارس میں ذریعۂ تعلیم اُردو ہے اور تمام مضامین کی کتابیں اردو ہی میں پڑھائی جاتی ہیں لہذا اُردو زبان کی تعلیم کی چنداں ضرورت نہیں، صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ معلومات کی کتابیں پڑھنے سے صحیح ذوق ادب کا نہیں پیدا ہوتا جب تک زبان کی تعلیم نہ ہو۔ اور جب تک ادبی ذوق طلبہ میں پیدا نہ ہو تو نہ تو وہ کتب معلومات کا لطف حاصل کر سکتے ہیں اور نہ اُن کے دل و دماغ میں وہ شائستگی اور لطافت پیدا ہو سکتی ہے جو تعلیم کا بہت بڑا مقصد ہے اور اگر اُردو تعلیم صرف مدارس وسطانیہ (مڈل) ہی تک محدود رہے تو اُن میں کافی قابلیت پیدا نہ ہوگی۔ لہذا اس کی شدید ضرورت ہے کہ کم سے کم مدارس فوقانیہ میں ہر طالب علم کے لئے اُردو زبان کی تعلیم لازم کی جائے یا اگر فی الحال یہ ممکن نہ ہو تو کوئی ایسا انتظام کیا جائے کہ یہ خامی رفع ہو جائے اُسے کم سے کم وہ رتبہ تو دیا جائے جو مدارس ثانویہ میں دوسری دیسی زبان کو حاصل ہے۔ اُردو زبان کے سوا باقی دوسرے تمام دیسی زبانوں میں سے طالب علم کوئی ایک زبان لے سکتا ہے ورنہ آگے چل کر یہ بڑا نقص رہ جائے گا۔

تیسرے سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ اور تجربہ خانہ (لیبوریٹری) تیار کیا جائے تاکہ پروفیسروں اور طلبہ کے لئے مطالعہ اور تحقیق کا دروازہ کھُل جائے۔ محض چند کتابوں کا پڑھ لینا کافی نہیں جب تک طالب علموں میں مطالعہ اور تحقیق کا ذوق پیدا نہ ہو۔ محقق کالجوں میں نہیں بنتے بلکہ کتب خانوں اور تجربہ خانوں میں بنتے ہیں۔

لیکن ان سب سے بڑھ کر اس بات کی ضرورت ہے کہ یونیورسٹی کے لئے اعلیٰ درجہ کے پروفیسر مہیا کئے جائیں در اصل یونیورسٹی عبارت ہی فاضل اور محقق پروفیسروں سے ایسے پروفیسر جن کی آواز صرف یونیورسٹی کے کمروں تک محدود نہ رہے بلکہ اس کی گونج ہندوستان کے ہر کونے میں بلکہ اس کے باہر بھی پہنچے۔ تاکہ طلبہ اُن کی شہرت سُن کر دُور دُور سے جوق جوق یونیورسٹی میں داخل ہوں اور اُن کے علم و فضل اور تحقیق سے استفادہ

کریں، غور و فکر کی عادت پڑے، تحقیق کی نئی راہیں نکالیں اور آیندہ زندگی کے لئے تیار رہوں۔

علاوہ اس کے یہ انتظام بھی کیا جائے کہ ہندوستان اور غیر ممالک کے باکمال علما اور اساتذہ کو معقول معاوضہ دے کر طلب کیا جائے تاکہ وہ کچھ دنوں رہ کر اپنے اپنے فن پر لکچر دیں اور اپنی تحقیقات پیش کریں اس سے طلبہ اور پروفیسروں پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔ دوسرے کی تحقیقات پر غور کرنے کا موقع ملے گا معلومات میں اضافہ ہوگا، دماغ میں ایک نئی روشنی پہنچے گی۔ ذہن اور تخیل کو پر لگ جائیں گے اور جدت طرازی کے لئے ایک میدان کھل جائے گا۔ ان کاموں کے لئے اہل کمال کی صحبت کیمیا کا اثر رکھتی ہے سالہا سال کی محنت اور مطالعہ سے وہ بات حاصل نہیں ہوتی جو ایک باکمال کی چند روزہ صحبت سے حاصل ہو جاتی ہے۔ حصول کمال کے لئے اہل کمال کی صحبت نہایت ضروری ہے۔ طلبہ پر ان کی عادت و خصائل، ان کی محنت ایثار، شوق، تحقیق و جستجو اور محویت کا نہایت عمدہ اثر ہوگا۔

چوں کہ اس یونیورسٹی میں تمام مروجہ دیسی زبانوں کی تعلیم کا ابتدا سے انتہا تک انتظام کیا گیا ہے لہذا ہماری درخواست ہے کہ ان کی تعلیم برائے نام یا ادھوری نہ ہو۔ ان کی تعلیم میں خاص طور پر بڑی احتیاط کی جائے اور یہ تعلیم لسانی، ادبی، تنقیدی، تاریخی اور محققانہ ہونی چاہیئے تاکہ وہ چیز جو طلبہ کو دوسری یونیورسٹی میں نصیب نہیں یہاں حاصل ہو سکے اور حقیقی طور پر وہ ملک و قوم کی خدمت ادا کر سکیں اور ملک میں تہذیب ذوق اور علم و تحقیق کی روشنی پھیلا سکیں۔

اس یونیورسٹی کو حقیقی طور پر یونیورسٹی بنانے کے لئے ان انتظامات کا عمل میں لانا لازم ہے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ یہ ایک معمولی تعلیم گاہ یا مدرسہ بن کر نہ رہ جائے۔ اس کام میں روپیہ کا منہ کرنا یا محنت سے جی چرانا سخت ظلم ہوگا۔ ہر قسم کی ترقی جو ہو سکتی ہے کی جائے اور ہر اصلاح جو ممکن ہو عمل میں لائی جائے۔ اور اسے مکمل کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے۔

یہ یونیورسٹی مغرب و مشرق کا سنگم ہے۔ اس میں قدیم و جدید کو سمویا گیا ہے۔ دونوں طریقوں کی خوبیاں اس میں یکجا جمع کی جائیں گی اور ان کے عیوب سے بچنے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ تہذیب ذوق اور حصولِ کمال کا مرکز ہوگی۔ اشاعتِ علم اور استیصالِ جہالت کرے گی۔ گزشتہ تجربے اور غلطیاں ہماری

رہنمائی کریں گی اور آیندہ کی اُمیدیں اور اُمنگیں ہمیں اصلاح و ترقی پر آمادہ کریں گی۔ اس مقدس فرض کی تکمیل میں بانیان و منتظمین یونیورسٹی کو کوئی چیز عزیز نہیں رکھنی چاہیئے۔ نہ کسی کی رائے اور تنقید سے ڈرنا چاہیئے اور نہ جدید اصلاحات کے رواج دینے میں پس و پیش ہونا چاہیئے۔ اسے کامیاب بنانا اُن کا سب سے بڑا نصب العین ہونا چاہیئے اس میں جس قدر خرچ ہو جائز ہے اور جس قدر محنت و مشقت برداشت کی جائے کم ہے۔

تمام اہلِ ہند اور بہی خواہانِ ملک کو خوش ہونا اور فخر کرنا چاہیئے کہ ایک مدت کے بھٹکے ہوئے صحیح رستہ پر آئے ہیں اور اس طریقۂ تعلیم کو رائج کرنا چاہتے ہیں جو فطرت کے مطابق حالات کے مناسب، کمال کا ذریعہ اور ملکی بہبودی کا وسیلہ ہے۔ فقط

معلّم

مختصر روداد

گزشتہ سالوں میں انجمن کا دستور تھا کہ اپنی کارگزاریوں کی مختصر رپورٹ ماہ دو ماہ کے فصل سے شائع کیا کرتی تھی لیکن کچھ عرصہ سے بعض موانع کی بنا پر یہ سلسلہ جاتا رہا تھا، اس رسالہ کے اجرا سے اشاعت مختصر رپورٹ کی بہت بڑی سہولت نکل آئی ہے، اس لئے ذیل میں پچھلے چھ ماہ یعنی جنوری سے جون تک کی مختصر رپورٹ حوالہ قلم کی جاتی ہے۔

۱ - ادبیات ایران - اس سال طبع کے لئے ضرور بھیجدی جائے گی۔

۲ - مصطلحات اہل حرفہ - آیندہ سال طبع ہوگی۔

۳ - اصول وضع اصطلاحات علمیہ (از مولوی وحیدالدین صاحب سلیم) صاف ہونے کے بعد مطبع کو بھیجدی گئی، یقین ہے کہ بہت جلد شایقین کے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔

۴ - تاریخ ملل قدیم - زیر طبع ہے مگر تصاویر کی مشکلات کے باعث خلاف توقع تاخیر پیدا ہوگئی ہے۔

۵ - بجلی کے کرشمے - نظر ثانی ہو چکی ہے، عنقریب مطبع کے حوالہ کردی جائے گی۔

۶ - ادبیات عرب (مترجمہ خواجہ عبدالواحد صاحب) کی نظر ثانی ہو رہی ہے۔

۷ - انٹلکچوال ڈیولپمینٹ (مترجمہ مولوی اشرف علی صاحب بی اے) دو باب ترجمہ ہو چکے ہیں۔

۸ - تاریخ ایران - (مترجمہ سید سجاد) کی پہلی جلد کا ترجمہ ختم ہو چکا ہے دوسری جلد بھی ختم پر آگئی ہے۔

۹ - نفح الطیب - مطبع میں بھیجدی گئی۔

۱۰ - علم حشرات الارض - زیر تالیف ہے۔

۱۱ - نفسیات - زیر تالیف ہے۔

۱۲ - تاج خسروی - زیر تالیف ہے۔

۱۳ - تاریخ اردو - زیر تالیف ہے۔

۱۴- فلسفۂ تعلیم - دوبارہ چھپ رہی ہے۔

۱۵- علم المعیشت - دوبارہ چھپ رہی ہے۔

۱۶- انتخاب کلام میر - دوبارہ چھپ رہا ہے۔

۱۷- مسٹر سید راس مسعود ناظم تعلیمات حیدرآباد دکن اُردو کے مشہور پروفیسر گارسن دتاسی کے لکچروں کا ترجمہ فرانسیسی زبان سے انجمن کے لئے کر رہے ہیں۔ یہ لکچر اُردو زبان وادب کے متعلق ہیں۔

شعبہ اصلاح زبان کے قیام ومفہوم کا حال گزشتہ سالانہ رپورٹ میں عرض کیا جا چکا ہے افسوس ہے کہ اس کے مزید جلسہ کا موقع پیدا نہ ہو سکا لیکن یہ رسالہ اس تجویز کو عمل میں لانے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوگا، نامانوس غلط اور متروک الفاظ کی فہرست موصول ہونے پر رسالہ میں پیش کی جائے گی تاکہ اُس پر غور و تنقید ہو سکے۔

گزشتہ سال کی تجویزوں میں ایک تجویز محبان اُردو کی تھی، اگرچہ اس کی تکمیل میں نہ خاص ایثار مطلوب تھا اور نہ مال وزر، صرف معمولی توجہ کے ذریعہ سے پانچ سال کے عرصہ میں ایک ناخواندہ شخص کو اُردو کی معمولی تعلیم دینے کا فرض ادا کرنا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ مدعیان اُردو نے اس تجویز پر التفات نہ فرمایا، اقرارنامے چھپے ہوئے تیار ہیں، جو صاحب اُردو زبان سے ہمدردی رکھتے ہیں اور اپنے عزیز وقت کا کچھ حصہ اس کام میں صرف کر سکتے ہیں وہ اقرارنامہ صدر دفتر سے طلب فرمائیں۔

تدوین لغت کے لئے روپیہ فنڈ کا کام جاری ہے۔ بعض بہی خواہ خاص توجہ اور سرگرمی سے اعانت کر رہے ہیں، ان کی مساعی تحسین اور شکریہ کے لائق ہیں، تاہم کام کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ رپورٹ میں اس موضوع کی تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا کہ یہ کام کس قدر کثیر سرمایہ چاہتا ہے۔ اس لئے اگر انگریزی کی لغت ویبسٹر کے ارکان کی طرح اس کے معاونین کی تعداد ایک لشکر جرار کے برابر نہ ہو تو کم از کم ایک معقول جماعت ضرور ہونی چاہیئے جو استقلال وہمت کے ساتھ سرمایہ کی فراہمی میں مصروف رہے، کام کرنے والے حضرات کے اسماء گرامی شکریہ کے ساتھ انجمن کی سالانہ رپورٹ میں شائع جائیں گے۔

انجمن کی آمد وخرچ، اراکین اور شاخوں کی تعداد اور دیگر ابواب وحالات منسلکہ گوشوارہ میں درج کئے جاتے ہیں۔

اصحاب ذیل کی توجہات شکریہ کے لایق ہیں :-

جناب مولوی سید محمدؐ مہدی صاحب، مددگار رجسٹرار انجمن ہائے اتحادی حیدرآباد دکن۔

جناب مولوی وحیدالدین صاحب تعلقہ دار بیڑ۔

گوشوارہ جمع خرچ انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد دکن — من ابتدائے یکم جنوری لغایۃ ۳۰ جون سنہ ۱۹۲۰ء

جمع				خرچ				کیفیت
نمبر	ابواب	سکہ کلدار	سکہ عثمانیہ	نمبر	ابواب	سکہ کلدار	سکہ عثمانیہ	
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹
	سلک بابتہ سنہ ۱۹۱۹ء	[illegible]	[illegible]	۱	صلہ مصنفین و مؤلفین	ماصہ		
۱	چندہ اراکین	[illegible]	[illegible]	۲	صلہ مترجمین	[illegible]		
۲	چندہ اراکین دوامی	[illegible]	[illegible]	۳	طباعت	[illegible]		
۳	فروخت کتب ذریعہ صدر دفتر	[illegible]	[illegible]	۴	جلدبندی	الـ ر		
۴	فروخت کتب ذریعہ ایجنسی	[illegible]	·	۵	کرایہ ریل	·	[illegible]	
۵	کتب خانہ	[illegible]	·	۶	تنخواہ عملہ	[illegible]	[illegible]	
۶	عطیہ دولت آصفیہ	[illegible]	·	۷	اخراجات صادر از فرنیچر و کرایہ مکان وغیرہ	[illegible]	[illegible]	
۷	عطیہ دربار بھوپال	سار	·	۸	خرچ ٹکٹ	ماسہ	[illegible]	
۸	لغت فنڈ	[illegible]	سماعہ	۹	سفیر انجمن	[illegible]	·	
				۱۰	خرید کتب	[illegible]	[illegible]	
				۱۱	متفرق	[illegible]	·	
				۱۲	ایجنٹوں کو کمیشن	[illegible]		
				۱۳	ادائے قرض	[illegible]		
				۱۴	کاغذ برائے رسالہ	الـ ر		
	آمدنی	[illegible]	[illegible]			[illegible]	سماصہ	
	خرچ	[illegible]	سماصہ					
	باقی	[illegible]	[illegible]					

مبلغ [illegible] سکہ عثمانیہ کے [illegible] کلدار لئے گئے۔

فہرست کتب

(سلسلۂ انجمن ترقی اُردو)

بیرونی

کمالات ذہنی میں ابو ریحان بیرونی کا مرتبہ تعریف سے مستغنی ہے دسویں صدی کا فاضل ہے مگر تبحر علمی اور دقیق النظری میں بیسویں صدی کا محقق معلوم ہوتا ہے ہندوستان آیا اور ہندوستان کے فلسفہ تاریخ اور مذہب و معاشرت پر ایک بےمثل کتاب لکھی البیرونی اس کے حالات زندگی اور کمالات علمی پر مشتمل ہے۔ قیمت مجلد ... عہ

فلسفہ اجتماع

تالیف ہے اور اس کا موضوع نفس اجتماعی یعنی جماعت کے اعمال و قوائے دماغی کی تحلیل و تشریح ہے موجودہ انقلابات میں اس کا مطالعہ دلچسپی اور فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ اس پر انگلستان و ہند کے علما و اخبارات نے اچھے اچھے ریویو لکھے ہیں۔

قیمت .. ... ایک روپیہ

قاعدہ وکلید قاعدہ

مدت کے غور و خوض کے بعد اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہے۔ ڈائرکٹر تعلیمات بمبئی نے اپنے صوبہ کے گورنمنٹ سے تحریک کی ہے کہ اس قاعدہ کو نصاب میں داخل کیا جائے جس اصول اور طریقہ پر اس کی تعلیم ہونی چاہیئے۔ ان کی تشریح کے لئے ایک کلید بھی تیار کی ہے قاعدہ ۲/ کلید قاعدہ ۴/

دریائے لطافت

ہندوستان کے مشہور سخن سنج میر انشاء اللہ خاں کی تصنیف ہے اردو صرف و نحو اور محاورات و الفاظ کی پہلی کتاب ہے اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب و غریب نکات جمع ہیں

قیمت . . . . ایک روپیہ چار آنے

طبقات الارض

اس فن کی پہلی کتاب ہے تین سو صفحوں میں تقریباً

جملہ مسائل قلمبند ہیں انگریزی اور اردو داں دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور اُن کے مرادفات کی فہرست بھی منسلک ہے۔ قیمت عہ

مشاہیر یونان و روما

پلوٹارک لائوز کا ترجمہ ہے سیرت نگاری اور انشا پردازی میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس سے آج تک مسلم الثبوت چلا آتا ہے ادیبانِ عالم بلکہ شکسپیر تک نے اس چشمہ سے فیض حاصل کیا ہے وطن پرستی و بے نفسی، عزم و جوانمردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ لبریز ہے ہماری قوم کے ہر نوجوان کے ہاتھ میں اس کا ایک نسخہ ضرور رہنا چاہیئے۔ دنیا کی تمام مہذب زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے مجلد اول غیر مجلد ۸؍ جلد دوم مجلد ۸؍

اسباق نحو

دو حصے ملک کے ادیب کامل مولانا مولوی حمید الدین صاحب بی اے کی تالیف سے ہیں۔ اختصار کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک ضروری مسئلہ درج ہے عربی خواں طلبہ کے لئے نادر تحفے ہیں قیمت فی رسالہ ۴؍

علم المعیشت

اسرار تمدن کے سمجھنے کے لئے اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمد الیاس برنی صاحب ایم اے نے ملک پر بڑا احسان کیا ہے۔ حجم (۴۲۵) صفحے قیمت صرف چار روپے للعہ

تاریخ اخلاق یورپ

اصل مصنف لیکی کا نام علم و تبحر تحقیق و صداقت کا مرادف ہے یہ کتاب کئی ہزار برس کے تمدن و معاشرت اصول اخلاق مذہبی خیالات کا مرقع ہے۔ ترجمہ مولوی عبدالماجد صاحب بی اے حصہ اول مجلد للعہ حصہ دوم مجلد للعہ

مبادی سائنس

فرانسیسی سے انگریزی اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی گئی ہے اس کا بیان سلیس اور مقبول عام ہے اردو ترجمہ صرف ایک حصہ کا ہے اور آخر کتاب میں فرہنگ مصطلحات بھی ہے قیمت ... ... عا

تاریخ یونان قدیم

یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند کتابوں کا خلاصہ ہے اور زبان کے لحاظ سے سلاست و شگفتگی کا نمونہ۔ اس کا نقطہ خیال خالصاً ہندی ہے۔ ایف اے کلاس کے طلباء جو یونان قدیم کی تاریخ سے گھبراتے ہیں اس کتاب کو انتہا درجے مفید پائیں گے۔ مجلد قیمت ... ... عہ

انتخاب کلام میر

میر تقی سرتاج شعرائے اردو کے کلام کا انتخاب ہے مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو نے یہ انتخاب

ایک مدت کی سعی و محنت کے بعد کیا ہو اور شروع میں مصنف صاحب کی خصوصیات شاعری پر ۲۴۰ صفحے کا ایک مقدمہ بھی ہے۔ قیمت ۸عہ

رسالہ نباتات اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے علمی اصطلاحات سے معرا۔ سلاست روانی سے مملو اور دلچسپ مفید ہے۔ طلبار نباتات جس مسئلہ کو انگریزی میں نہ سمجھ سکیں وہ اسی رسالہ میں مطالعہ کریں ۔ قیمت مجلد ۸عہ

دیباچہ صحت اس کتاب میں مطالبات صحت مثلاً ہوا، پانی، غذا، لباس وغیرہ پر مبسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ہے زبان عام فہم اور پیرایہ موثر و دل پذیر ہے۔ ملک کی بہترین تصنیف ہے اس کا مطالعہ طبیبوں کے کئی ہزار نسخوں سے زیادہ قیمتی ثابت ہوگا۔ حجم (۵۵۰) صفحے مجلد قیمت ... ... للعہ

قواعد اردو ارباب فن کا اتفاق ہے کہ اردو زبان میں اس سے بہتر قواعد نہیں لکھی گئی بسیط و شرح کے علاوہ اس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ فارسی قواعد کا تتبع نہیں کیا گیا ہے اس کو ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم بمبئی نے نصاب میں داخل کرنے کی تجویز کی ہے قیمت عہ

القول الاظہر ابن مسکویہ کی معرکۃ الآرا تصنیف الفوز الاصغر کا اردو ترجمہ ہے ابن مسکویہ آسمان علم و فضل کا آفتاب تھا یہ کتاب فلسفہ الٰہیہ کے اصول پر لکھی گئی ہے اور مذہب اسلام پر انھیں اصول کو منطبق کیا گیا ہے اس کو بمبئی یونیورسٹی نے سرکاری کتب خانوں کے لئے تجویز کیا ہے۔ قیمت ... ... عہ

امرائے ہنود پانسو سے زیادہ ہندو امرا کے حالات قلمبند ہیں۔ یہ امرا سلاطین مغلیہ کے زمانے میں بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز تھے کتاب گویا ان متعصب اور ناواقف مورخوں کا جواب ہے جو اسلامی حکومت پر تعصب کا الزام لگاتے ہیں ۔ قیمت حصہ اول عہ حصہ دوم ۸عہ

القمر قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی صراحت اور چاند کے متعلق قطعی جدید انکشافات ہوئے ہیں ان سب کو جمع کر دیا ہے طرز بیان دلچسپ اور کتاب ایک نعمت ہے قیمت ۸عہ

تاریخ تمدن مسٹر ٹامس بکل کی شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ ہے الف سے یے تک تمدن کے ہر مسئلہ پر کمال جامعیت سے بحث کی گئی ہے

ہر بحث کے لئے ایک عجیب [illegible] پرزور اصول اخذ کیا گیا ہے اور ہر اصول کی تائید میں تاریخی انتقاد سے کام لیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے معلومات میں انقلاب اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ بمبئی میں سرکاری لائبریریوں کے لئے تجویز کی گئی ہے۔ قیمت حصہ اول غیر مجلد عہ حصہ دوم مجلد عار

مقدمات الطبیعات یہ ترجمہ ہے مگر انگلستان کے مشہور سائنس داں حکیم ہکسلی کی کتاب کا ترجمہ ہے جسکا نام کتاب کی کافی ضمانت ہے۔ اس میں مظاہر فطرت کی بحث درج ہے لیکن کتاب علم و فضل کا مرقع ہے۔ متعلمان سائنس اور عام شائقین کے لئے بہت مفید ہے قیمت ۸ عہ/

فلسفہ جذبات کتاب کا مصنف ہندوستان کا مشہور نفسی ہے۔ جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت لیاقت اور زبان آوری کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ متعلمان نفسیات اسے نہایت مفید پائیں گے قیمت مجلد ...... ۸ عار

نکات الشعرا یہ اردو شعرا کا تذکرہ میر تقی میر کی تالیفات سے ہے اس میں میر صاحب نے کیا ہے اور زبان کے بعض بعض نکات پڑھنے کے قابل

ہیں مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شیروانی نے اس پر ایک ناقدانہ اور دلچسپ مقدمہ لکھا ہے۔ قیمت سے/

نپولین اعظم ایبٹ کی مستند کتاب کا اردو ترجمہ ہے کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ نپولین کی زندگی بشری جد و جہد کا آخری باب ہے، واقعات کی داد یا تو سکندر کی زبان ادا کر سکتی ہے یا تیمور کی زبان، ترجمہ آسان اور عام فہم ہے مکمل پانچ جلد قیمت ... عہ

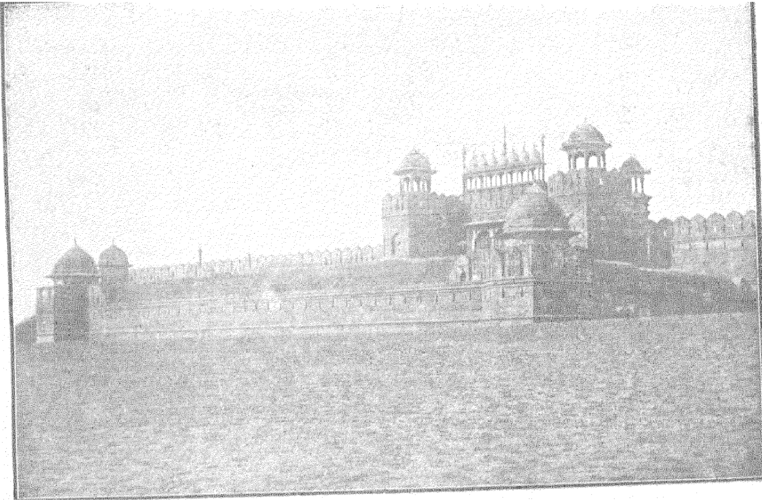
فلسفہ تعلیم ہربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلہ تعلیم کی آخری کتاب ہے۔ غور و فکر کا بہترین کارنامہ اور والدین و معلم کے لئے چراغ ہدایت ہے۔ تربیت کے زبانی قوانین کو اس قدر صحت کے ساتھ مرتب کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہے اس کا نہ پڑھنا گناہ ہے۔
قیمت ...... سے/

رہنمایان ہند مشہور کتاب ہیروز آف انڈیا کا ترجمہ ہے شروع میں ہندو مذہب کے برگزیدہ عقائد کا بیان فاضلانہ مگر دلکش پیرایہ میں لکھا ہے اس کے بعد سری کرشن جی مہاراج کی سوانح اور گوتم بدھ کے پُراثر حالات آتے ہیں آخری حصہ میں شنکر اچاریہ رامانج اور رامانند کا ذکر ہے قیمت ۸ عہ/

آنریری سکرٹری، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد (دکن)

جلد اوّل　　　بابت اپریل سنہ ۱۹۲۱ء　　　حصّہ دوم

اُردُو



انجمنِ ترقی اُردو

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرستِ مضامین

مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر

جس طرح دنیا میں کوئی قوم بغیر خارجی اثرات اور غیر اقوام کے میل جول کے ترقی نہیں کر سکتی اسی طرح دنیا میں شاید ہی کوئی زبان ایسی ہو کہ اس میں غیر زبانوں کے الفاظ آ کر نہ مل گئے ہوں اور جو مخلوط نہ ہو۔ ورنہ کسی زبان کا علمی میدان میں آنا یا آگے بڑھنا دشوار ہو جائے بعض صورتوں میں ان بیرونی الفاظ نے ایسے قدم جمائے کہ زبان کی اصل ہیئت کو بدل دیا اور اصل ملکی زبان کے الفاظ سے ان کی تعداد بڑھ گئی۔ مثلاً موجودہ ترکی زبان جو تاتاری الاصل ہے اور اس کی صرف و نحو بھی اسی پر مبنی ہے، اس میں عربی، فارسی الفاظ اس کثرت سے داخل ہو گئے ہیں کہ ایک دیہاتی عثمانی اسے بہ مشکل سمجھ سکتا ہے۔ عربی، فارسی الفاظ کی یہ بہتات ملک کے ادبی، سیاسی اور مذہبی اثرات کی وجہ سے ہے۔ ایک حد تک یہی حالت مرہٹی زبان کی ہے۔ اور یہ بھی قدرتی طور پر اس قانون کے اثر سے نہ بچ سکی جو دو قوموں یا دو زبانوں کے یکجا ہونے پر اپنا عمل کرتا ہے۔

مسلمانوں کے قدم اس ملک (مہاراشٹر) میں اوّل اوّل تیرھویں صدی کے آخر میں آئے جب کہ علاء الدین آندھی اور طوفان کی طرح یلغار کرتا ہوا دفعۃً دولت آباد کے سامنے آموجود ہوا اور راجہ رام دیو راؤ جو اب تک غفلت کی نیند میں تھا اور اپنے زعم میں یہ سمجھے ہوئے تھا کہ اوپر کی طرف سے دشوار گزار پہاڑ، دریا اور گھاٹیاں طے کر کے یہاں کون پہنچ سکتا ہے ایسا مجبور ہوا کہ صلح کرتے بنی اور بے شمار مال و دولت نذر کر کے اپنا پیچھا چھڑایا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد تخت دہلی کے ایک شہنشاہ نے جو اپنے رنگ میں دنیا کے بادشاہوں سے نرالا اور اپنے خیال میں سب سے

الگ تھا ادھر توجہ کی اور توجہ کیا کی دولت آباد کو سارے ہندوستان کا دارالخلافہ بنا دیا اور یہی نہیں بلکہ ساری دلی کو یہیں گھسیٹ لایا۔ یوں دیکھئے تو یہ بڑی خوبیوں کا آدمی تھا عالم، فاضل، خوشنویس، بہادر ایسا کہ اچھے اچھے سورما اُس سے شرماتے تھے لیکن تخیل میں وہ بلند پروازی تھی کہ کسی شاعر کو بھی نصیب نہ ہوئی ہوگی بہت دور کی سوچتا تھا مگر عمل میں نہیں لا سکتا تھا۔ جب کبھی اپنے خیال کو عملی صورت میں لایا تو رہی سہی بات بھی بگڑ جاتی تھی۔ ان پریشاں خیالیوں اور پریشان اعمالیوں نے اُسے ہمیشہ پراگندہ رکھا۔ اور اس وجہ سے دکن کی سلطنت اُس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اب بہمنیوں کا دَور دَورہ شروع ہوا۔

بہمنی سلطنت نے تھوڑے ہی عرصے کے بعد بڑی شان و شوکت اور سطوت حاصل کر لی۔ یہ گویا یہیں کی سلطنت ہوگئی۔ اس کا تعلق باہر سے مطلق نہ تھا۔ اہل ملک بھی رفتہ رفتہ اس میں برابر کے حصّہ دار ہو گئے۔ اُس کی شان خود اُس کے نام سے ظاہر ہے۔ حسنؔ نے اپنے نام کے ساتھ گنگوئے بہمنی کا خطاب شریک کر کے اُس عجیب احسانمندی کا ثبوت دیا جو سلطنت بہمنی کے نام کے ساتھ دنیا میں ہمیشہ یادگار رہیگی۔ اُس نے اپنے قدیم محسن گنگو کو بلا کر وزیر خزانہ بنایا۔ اور یہ پہلی اینٹ تھی اُس بنیاد کی جو ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی اس ملک میں قایم ہوئی۔ اس کے بعد دلّی کے اور برہمن اور کھتری آئے اور شاہی ملازمت میں داخل ہوئے لیکن رفتہ رفتہ اُن کی جگہہ ملکی برہمنوں اور پربھوؤں[1] نے لے لی۔ مالگزاری کا انتظام اُنھیں کے ہاتھ میں رہا بلکہ جب بہمنی سلطنت کا انتزاع ہوا اور اُس کی بجائے بیجاپور۔ احمدنگر۔ برار۔ بیدر، اور گولکنڈہ میں الگ الگ سلطنتیں قایم ہوگئیں تو اُس وقت بھی دیہات اور محالات کے حسابات مالگزاری ہندؤں ہی کے ہاتھ میں رہے۔ اور اُنھیں کی اپنی زبان میں لکھے بھی جاتے تھے۔ غرض ایک خالص دیسی حکومت ہوگئی جس پر "غیریت" کا گمان تک بھی نہ ہوتا تھا مسلمان بادشاہوں کی فوج میں بھی مرہٹے کثرت سے داخل تھے۔ اور وہ بہت کارآمد ثابت ہوئے۔

غرض مرہٹے مالی اور فوجی صیغوں میں اچھا خاصہ رسوخ رکھتے تھے اور بعض اوقات تو وہ ایسے مقتدر ہو گئے کہ سلطنت کی تمام قوت اور حکومت اُن کے ہاتھ میں آگئی اور اس طرح گویا در پردہ اُس ترقی اور عروج کی تربیت اور تیاری ہو رہی تھی جو اُنھیں آیندہ حاصل ہونے والا تھا۔ پھر شادی بیاہ کے رشتہ نے بھی تعلقات میں استحکام کی نئی

---

[1] پربھو۔ یعنی مرہٹے کایتھ جو اکثر چاندر سینی ہیں کایستھ پربھو کہلاتے ہیں۔

صورت پیدا کر دی۔ اور باہمی تعصّبات اس قدر ضعیف ہو گئے کہ معاملات دنیوی میں قومی امتیاز بالکل اُٹھ گیا۔
ہندو مسلمانوں میں باہم برابر کا برتاؤ تھا مختلف تعلقات آپس کے میل جول اور کاروبار سلطنت نے تکلف کا پردہ
اُٹھا دیا تھا مسلمان ہندؤں کے ساتھ اور ہندو مسلمانوں کے ساتھ لڑائیوں میں برابر لڑتے تھے۔ اسلامی سلطنتوں
میں مرہٹے بڑے بڑے اُمرا اور سپہ سالاروں کا درجہ رکھتے تھے اور اسی طرح مسلمانوں کو بعد میں مرہٹہ سلطنت
میں بھی امتیاز اور شرف حاصل تھا۔ یہ تعلقات اور ربط ضبط اور رواداری کے آثار اب تک باقی ہیں اور بیشمار انعامات
و جاگیرات جو برہمنوں اور مندروں اور دیگر ہندؤں کو مسلمان بادشاہوں نے عطا کیں وہ اب بھی کہیں نہ کہیں نظر
آجاتے ہیں۔ اور اُس کا سب سے بڑا اور زندہ ثبوت دولت آصفیہ ہے جہاں اب تک وہ روایات برابر قائم ہیں
اور حق یہ ہے کہ رواداری اور بے تعصّبی میں دنیا کی کوئی حکومت یا ریاست اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہندو مسلمانوں
کے اتحاد و مودت کا منظر اگر کسی کو دیکھنا ہو تو "وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں" ہمارے ملک کے بڑے بڑے
مدبّر اور دوربین معاملہ فہم جو ہمیشہ اس مضمون پر سر دھنتے رہتے ہیں اور اُنھیں کوئی صورت آپس کے اتفاق کی نظر
نہیں آتی وہ ہندو مسلمانوں کے اس سنگم کو دیکھیں جہاں قدیم زمانہ سے یہ دونوں قومیں بھائی بندوں کی طرح
رہتی سہتی ہیں۔

ان تعلقات کا اثر جہاں تمدّن کے مختلف شعبوں پر پڑا وہاں زبان کیونکر بچ سکتی تھی۔ یہ قاعدہ ہے کہ جب دو
قوموں کا اتصال ہوتا ہے تو جس قوم کا تمدّن اعلیٰ، زیادہ قوی اور پائدار ہوتا ہے اُس کا اثر دوسری قوم پر جو کم متمدّن
ہے زیادہ ہوتا ہے۔ مسلمان جب دکن میں آئے تو بہ مقابلہ یہاں والوں کے زیادہ متمدّن تھے اور یہی وجہ ہے کہ
مرہٹوں پر مسلمانوں کے تمدن کا زیادہ اثر ہوا۔ خصوصاً ایسی صورتوں میں فاتح کا اثر مفتوح پر زیادہ پڑتا ہے۔ اور اسی
وجہ سے فارسی زبان کا اثر جو فاتحوں کی زبان تھی مرہٹی پر بہت زیادہ پڑا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرہٹی زبان میں
سینکڑوں عربی فارسی الفاظ اور محاورے داخل ہو گئے۔ مرہٹی میں عربی الفاظ بھی بکثرت پائے جاتے
ہیں لیکن وہ سب فارسی کے ذریعہ سے پہنچے ہیں یہ موجودہ فصیح مرہٹی زبان کا حال ہے۔ اگر اس کے قبل کی یعنی
پیشواؤں کے زمانہ کی زبان دیکھی جائے تو اُس میں فقرے کے فقرے اور جملے کے جملے فارسی کے ملیں گے۔
اور فارسی الفاظ مختلف قسم کے اِس کثرت سے پائے جائیں گے جس قدر ایک بدمذاق انگریزی تعلیم یافتہ ہندی

کی گفتگو میں انگریزی الفاظ۔

اب ہم یہاں مختصراً اُن اسباب وحالات پر الگ الگ نظر ڈالتے ہیں جو اِس کا باعث ہوئے۔

۱۔تقریباً تمام سرکاری دفاتر میں فارسی زبان رائج تھی۔سرکاری ملازموں کی زبان پر جس میں مرہٹے بھی بکثرت شریک تھے بوجہ تعلق ملازمت بہت سے عربی فارسی کے لفظ چڑھے ہوئے تھے اور وہ اپنی بات چیت اور کاروبار اور دیگر معاملات میں یہ الفاظ بے تکلف بول جاتے تھے۔رفتہ رفتہ اُن میں کے بہت سے لفظ مرہٹی زبان میں اس طرح گھُل مل گئے کہ جزو زبان بن گئے اور عام طور پر مرہٹی بولنے والوں کو اس کا مطلق خیال تک نہیں گزرتا کہ یہ کسی غیر زبان کے لفظ ہیں۔

۲۔جو لوگ اپنے مقدمات کی پیروی کے لئے عدالتوں میں آتے جاتے رہتے تھے، یا جنہیں اپنے معاملات کی خاطر دوسرے سرکاری محکموں میں آمدورفت رکھنی پڑتی تھی اُن کی زبان خود بخود بغیر کسی ارادے کے فارسی عربی الفاظ سے آشنا ہو جاتی تھی اور ضرورتاً اُن کا استعمال کرنا پڑتا تھا اور اِس طرح زبان پر چڑھتے چڑھتے وہ خود ملک کی زبان میں داخل ہو گئے۔

۳۔مسلمان فقیر جو گاؤں گاؤں اور قصبے قصبے مانگتے کھاتے پھرتے تھے اگرچہ وہ ہندوؤں کی زبان بولتے اور ہندوؤں ہی کے گیت گاتے تھے لیکن بہ تقاضائے فطرت اِس میں بہت سے الفاظ فارسی عربی کے تھے جو اُن کی صداؤں اور گیتوں میں استعمال ہوتے تھے۔اور یہ الفاظ لَے کی دلکشی اور صداؤں کی موزونیت کی وجہ سے عام لوگوں کے خیال اور حافظے میں رہ گئے۔

اسی طرح درویش وصوفی اور واعظ جو مذہب اسلام کی تلقین واشاعت کرتے تھے گو اُن میں سے اکثر ملکی زبان ہی کے ذریعہ سے اِس فرض کو انجام دیتے تھے لیکن مضمون کی نوعیت کے لحاظ سے اُن کے لئے فارسی عربی الفاظ کا استعمال ناگزیر تھا۔یہ ممکن نہ تھا کہ یہ الفاظ بار بار زبان سے نکلیں اور دوسروں تک نہ پہنچیں۔غرض اُن میں سے بہت سے الفاظ خیال وحافظے سے نکل کر زبان میں گھر کر گئے۔اور اب تک اِسی طرح استعمال ہوتے ہیں جیسے ٹھیٹ مرہٹی کے لفظ۔

۴۔بہت سے ہندو مسلمان ہو گئے کچھ تو اپنی خوش اعتقادی سے اور کچھ دنیاوی اغراض وطمع کی خاطر۔اُنکی

مادری زبان مرہٹی تھی۔ لیکن چونکہ یہ نئے نئے مسلمان تھے خواہ مخواہ بھی یا مسلمانوں کے میل جول اور ارتباط کی وجہ سے بہت سے فارسی عربی الفاظ اپنی گفتگو میں بولنے لگے۔ جس طرح آج کل دیسی عیسائی اپنی زبان میں انگریزی الفاظ استعمال کرتے اور اس پر اتراتے ہیں۔ اس کا اثر مرہٹی زبان پر ہونا لازمی تھا۔

۵۔ چونکہ فارسی کا جاننا سرکاری ملازمت کے لئے ضروری تھا تو جو لوگ فارسی اچھی طرح جانتے تھے اور جنھیں اس شیریں اور من موہنی زبان کا چسکا پڑ گیا تھا وہ اپنی گفتگو میں فارسی عربی الفاظ استعمال کئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ کچھ تو طبعی ذوق کی وجہ سے ایسا کرتے تھے اور بعض اوقات مجبوری ہوتی تھی اس لئے کہ بعض خیالات کے ادا کرنے کے لئے وہ اپنی مادری زبان میں مناسب الفاظ نہیں پاتے تھے۔

۶۔ جن لوگوں کا بہت سا وقت فارسی زبان کی تحصیل میں گزرا تھا اور انھیں اس زبان میں اچھی خاصی مہارت یا کافی ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ تو ان کا طریقہ خیال اور طرز ادا بھی بہت کچھ فارسی کا سا ہو گیا تھا یا کم سے کم اس قدر ضرور تھا کہ اگرچہ ان کی تحریر و تقریر کا ظاہری لباس مرہٹی تھا لیکن زبان کے طور جملوں کی نشست اور الفاظ کی ترکیب و ترتیب سے صاف فارسی کی جھلک نظر آتی تھی، جس طرح آج کل انگریزی خواں نوجوانوں کی تحریر سے انگریزیت کی بو آتی ہے۔

۷۔ بہت سے مسلمان جنھوں نے ہندو عورتوں سے شادی بیاہ کر لیا انھیں اپنی بیویوں کی اور بیویوں کو اپنے شوہروں کی زبان سیکھنی اور بولنی پڑی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے فارسی لفظ مرہٹی زبان میں بڑی سہولت سے دخیل ہو گئے۔

۸۔ بہت سی صنعتیں جو مسلمانوں کے ساتھ آئی تھیں یا مسلمانوں نے ایجاد کی تھیں اور وہ یہاں رائج ہوئیں تو ان کے ساتھ ان کے مخصوص الفاظ اور اصطلاحات بھی رواج پا گئے۔

۹۔ خصوصاً فن جنگ اور انجنیری ایسے دو فن تھے جن کو مسلمانوں نے ہندوستان میں بہت رواج دیا اور اہل ملک کو بھی ان کا اتباع کرنا پڑا ان کے طفیل میں بہت سے فارسی عربی یا ترکی لفظ مرہٹی زبان میں پہنچ گئے اسی طرح مالگزاری اور قانون کے الفاظ بھی ضرورت کے اقتضا سے خود بخود رائج ہو گئے۔

۱۰۔ کثرت استعمال و مرور زمانہ سے فارسی الفاظ زبان میں اس طرح جڑ پکڑ گئے تھے کہ بعض سنسکرت اور پراکرت

الفاظ جو فارسی کے مترادف تھے اُن کے سامنے نہ ٹھیر سکے اور اُنھیں فارسی الفاظ کے سامنے ہتیار ڈال دینے پڑے۔ خود اہل زبان کو یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ ان جدید غیر ملکی الفاظ میں ایسا زور اور اثر ہے جو اُن کے مرادف سنسکرت یا پراکرت الفاظ میں نہیں اور حقیقت بھی یہ ہے کہ جب کوئی لفظ کسی خاص خیال یا خیال کے کسی خاص پہلو کو ادا کرتا ہے تو محض اُس کی آواز سے جو تصوّر اُس کے مفہوم کا پیدا ہوتا ہے وہ کسی جدید لفظ یا اُس کے مرادف سے پیدا نہیں ہو سکتا اور نہ اُس میں وہ زور آ سکتا ہے۔ اور اس لئے فارسی عربی الفاظ اس قدر مقبول ہو گئے کہ اُن میں سے جس کسی کا مرادف پراکرت یا سنسکرت میں بھی موجود تھا تو وہ اُن کے سامنے رونق نہ پا سکا۔

غرض اس طرح فارسی عربی الفاظ مرہٹی زبان میں جڑ پکڑتے گئے اور اس طور سے گھُل مل گئے کہ اپنے پرائے کا امتیاز اُٹھ گیا اور نہ اہل زبان کی طرف سے کوئی ایسی کوشش ہوئی کہ اِن کو زبان سے خارج کر کے بجائے اُن کے سنسکرت یا پراکرت الفاظ کو رواج دیا جائے۔ البتہ شیواجی نے شاہی لقب اختیار کرنے سے ذرا پہلے یعنی سنہ ۱۶۷۴ء میں رگھوناتھ پنڈت کو یہ حکم دیا کہ وہ راج اُدّھار کوش یعنی سرکاری کاروباری الفاظ کی لُغت تیار کرے اور یہ ہدایت کی کہ اس میں ان فارسی عربی الفاظ کی بجائے جو اصل مرہٹی یا سنسکرت الفاظ کی جگہہ مستعمل ہونے لگے ہیں سنسکرت الفاظ استعمال کئے جائیں۔ لیکن باوجود اس کے فارسی عربی الفاظ کی رَد کا کچھ زیادہ سدِّباب نہ ہو سکا ایک حد تک کی ضرور ہو گئی خاص کر شیواجی کے وزرا اور عہدہ داروں کے عہدوں کے نام فارسی سے سنسکرت میں ترجمہ ہو گئے وہ بھی ترجمہ ہوئے کوئی نئے نام تجویز نہیں کئے گئے (ملاحظہ ہو فہرست خطابات جو آیندہ صفحات میں درج ہے) یہ حالت شیواجی کی زندگی کے آخری چھ سال (سنہ ۱۶۸۰ء) اور اُس کے جانشین سنبھاجی کے عہد (۱۶۸۰ تا ۱۶۸۹ء) تک رہی۔ سنبھاجی کو خود اِس معاملہ میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔

اس کے بعد راجہ رام کے عہد (۱۶۸۹ تا ۱۷۰۰ء) میں معاملات کی حالت بالکل دگرگوں ہو گئی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اُس نے اپنے "اماتیہ" یعنی وزیر رامچندر پنت کو "حکومت پناہ" کا خطاب دیا۔ اُس کا خاندان اب تک وشال گڈھ میں حکمراں ہے۔ راجہ رام کے عہد میں اس قسم کے اور فارسی خطابات بہت سے عطا ہوئے۔

شاہو مہاراج کے عہد میں (۱۷۰۸ - ۱۷۴۹ء) علی باغ کے انگریاؤں کو "سرخیل" کا اور گائیکواڑوں کو "شمشیر بہادر" اور "سینا خاص خیل" کا اور وٹھل شنکر کو "راجہ بہادر" کا خطاب مرحمت ہوا۔ اور اسی طرح بہت سے خطابات دوسرے

لوگوں کو دیے گئے (ملاحظہ ہو فہرست خطابات)

اسی طرح مسلمان بادشاہوں نے اپنے ہندو باج گزار فرماں رواؤں اور اُمرا کو فارسی یا فارسی سنسکرت کے مخلوط خطابات دیے (ملاحظہ ہو فہرست خطابات)

حیدرآباد میں اب تک یہ رواج چلا آرہا ہے مثلاً "آصف نواز ونت"، "یمین السلطنت وغیرہ"

حال میں کچھ عرصہ ہوا ایک تحریک اس قسم کی پیدا ہوئی تھی کہ فارسی عربی الفاظ مرہٹی زبان سے خارج کر دیے جائیں لیکن اُن لوگوں نے جنھیں خدا نے فہم و دُور اندیشی عطا کی ہے اس تحریک کی تائید نہیں کی مسٹر تلک کے مشہور اخبار کیسری نے اس قسم کی کارروائی کی مخالفت کی اور اپنی تائید میں اس امر پر زور دیا کہ اگر فارسی عربی الفاظ خارج کر دیے گئے تو مرہٹی زبان کی قوت میں ضعف پیدا ہو جائے گا۔ اور زبان بے مزہ ہو جائے گی۔ مثلاً "فوج"، "قلعہ"، اور اس قسم کے سینکڑوں الفاظ نکال دیے جائیں اور اُن کی بجائے دوسرے ہم معنی لفظ داخل کر لئے جائیں تو اُن سے کبھی وہ تصوّر اور مفہوم پیدا نہیں ہوگا جو پُرانے فارسی الفاظ سے اس وقت ہو سکتا ہے اور اس سے سوائے نقصان کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

جس طرح شیواجی مہاراج کی تحریک ناکام رہی حالانکہ اُس وقت کامیابی کا بہت کچھ موقع حاصل تھا۔ اُسی طرح اس زمانے کی آخری کوشش بھی بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ اس کے بعد سے پھر کبھی اس طفلانہ حرکت کا اعادہ نہیں ہوا جو اہل زبان کی دانشمندی پر دلالت کرتا ہے۔ زبانیں الفاظ کے خارج یا متروک کرنے یا انھیں پاک اور پوتر رکھنے سے نہیں بنتیں بلکہ ان کی ترقی الفاظ کا ذخیرہ بڑھانے اور دوسری زبانوں کے میل سے طرز ادا کی نئی راہیں نکالنے سے ہوتی ہے۔ ہندوستانی زبانوں کو ابھی یہ گُر سیکھنا باقی ہے۔

کاش شمالی ہند والے اس سے سبق حاصل کرتے۔ جنوب و شمال میں یہ فرق کچھ کم سبق آموز نہیں ہے۔

خود شیواجی جو اس تحریک کے بانی اوّل تھے اپنے خطوط میں بلا تکلف فارسی الفاظ اور محاورے استعمال کرتے تھے۔ اور اُن کے گُرو رام داس نے ان کے استعمال سے کبھی احتراز نہیں کیا۔ اور شاید میرا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ رام داس نے بہ نسبت دوسرے مرہٹی شعراء کے اپنی پُر زور شاعری میں فارسی الفاظ کا استعمال زیادہ تر کیا ہے۔

اب میں مرہٹی زبان میں فارسی الفاظ کے گھٹنے بڑھنے کے دوروں کی سرسری سی تقسیم ذیل میں دکھاتا ہوں۔

۱۲۹۰ء میں مرہٹی زبان کے نامور شاعر دانسور نے اپنی مشہور و معروف کتاب دانسوری تصنیف کی اِس سنہ سے قریب ایک صدی بعد تک تمام مہاراشٹر میں خالص مرہٹی بولی جاتی تھی۔ اور ملک کے اُن حصّوں میں جہاں اسلامی حکومت کے قدم نہیں پہنچے تھے اِس کے بعد بھی خالص مرہٹی کا راج رہا۔ اوّل اوّل مہاراشٹر میں اسلامی حکومت ۱۳۱۸ء میں قایم ہوئی۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ سمجھ لینا چاہئے کہ فارسی الفاظ کی آمد بھی شروع ہوئی۔ لیکن ۱۳۱۸ء سے ۱۳۴۷ء تک حکومت کا تعلق دہلی سے رہا اور تمام انتظامات سلطنت شاہ دہلی کے فرمان و اشارہ سے انجام پاتے تھے مگر محمدؐ تغلق کی بے چین اور عجیب و غریب طبیعت نے چین نہ لینے دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ دکن کا رشتۂ حکومت دہلی سے ٹوٹ گیا۔ اور ۱۳۴۷ء میں حسن گنگو بہمنی سلطنت بہمنی کا بانی اور پہلا تاجدار ہوا۔ یہ سلطنت (۲۰۰) سال تک بڑے شان و شوکت، امن و امان اور عدل و انصاف کے ساتھ اس ملک میں رہی اُس نے دکن میں ایک نئے اور عظیم الشان دور کا آغاز کیا۔ لیکن آخر اس کا شیرازہ جمعیت بھی انتشار کا شکار ہوا اور یہ پانچ حصّوں میں الگ الگ تقسیم ہوگئی اور یہ پانچوں بھی اُنھیں اسباب کا شکار ہوے جو خاتمہ سے پہلے اپنا کام کر چکے تھے اور جو اب تک ہماری سلطنتوں کی جڑوں میں گھن کی طرح لگے ہوئے ہیں اور جنھیں ہم نے اُس وقت تک نہ پہچانا جب تک کہ غیروں نے ہمیں نہ جتایا۔ اور وہ بھی بعد از خرابی بصرہ۔ ان سب کا خاتمہ ۱۵۷۲ء سے ۱۶۸۶ء تک ہوگیا۔ ان سب میں بڑی اور باوقعت سلطنت نظام شاہی تھی جو ۱۶۳۷ء میں آخر ہوگئی۔ قطب شاہی ۱۶۸۶ء تک حق فرمانروائی ادا کرتی رہی اور عادل شاہی نے ایک سال بعد یعنی ۱۶۸۷ء میں حکومت کا قصہ پاک کر دیا۔ ۱۴۵۰ء تک مرہٹوں کی بہت سی چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں تھیں لیکن وہ سب بہمنی سلطنت میں ضم ہوگئی تھیں اور گویا بہمنی سلطنت ان سب کی مشترکہ سلطنت تھی۔ اس زمانہ سے فارسی الفاظ مرہٹی زبان میں بے روک ٹوک داخل ہوتے چلے گئے۔

اوائل سلطنت بہمنیہ میں مہاراشٹر میں مسلمانوں کی تعداد کوئی ایک لاکھ نفوس سے زیادہ نہ ہوگی اور اُن میں اکثر فوجی لوگ ہوں گے۔ کیونکہ امن قایم رکھنے کے لئے اس کی ضرورت تھی۔ علاوہ ان کے قاضی، مفتی، طبیب اور دیگر عمال بھی مسلمان ہوں گے۔ کچھ تاجر پیشہ بھی ہوں گے۔ غرض ان سب کو ملا کر دیکھا جائے تو اُن کی تعداد لاکھ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس ایک لاکھ میں ستر اسّی ہزار فوجی سمجھ لینے چاہئیں۔ جن میں اکثر ان پڑھ اور اُجڈ ہوں گے۔ اور باقی بیس ہزار ایسے جن کے ہاتھ میں کاروبار سلطنت و معاملات عدالت و مالگزاری ہونگے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مرہٹے

ہر شعبۂ حکومت میں بہ کثرت داخل ہو گئے۔

مذہب، شاستر، اور ذات پاک کے معاملہ میں غیر زبان کے الفاظ کا کوئی زیادہ دخل نہ تھا۔ اور نہ ان امور میں اہل ملک کو غیروں کے الفاظ کی ضرورت تھی لیکن بنج بیوپار، بازار، فوج، عدالت، مالگزاری وغیرہ کی معاملات میں سینکڑوں فارسی الفاظ بے تکلف مرہٹی زبان میں داخل ہو گئے۔ غرض ان فارسی الفاظ کا مدوجزر مرہٹی زبان میں اس طرح ہوا۔

سنہ ۱۲۹۰ء اور اس سے ایک صدی بعد تمام مہاراشٹر میں خالص مرہٹی بولی اور لکھی جاتی تھی۔

سنہ ۱۳۹۰ء سے سنہ ۱۶۳۶ء تک فارسی الفاظ کی رو بڑے زوروں پر رہی اور بکثرت فارسی عربی الفاظ مرہٹی زبان میں مل گئے یہ اس دخل و تصرف کے بڑے عروج کا زمانہ تھا۔

سنہ ۱۶۵۶ء کے بعد سے سنہ ۱۸۲۸ء تک فارسی الفاظ کا زور گھٹنا شروع ہوا یعنی جس تیزی اور کثرت سے وہ پہلے مرہٹی زبان میں آئے تھے اب وہ بات نہیں رہی تھی۔

سنہ ۱۸۲۸ء سے سنہ ۱۸۱۸ء تک زیادہ تر فارسی الفاظ یا تو اس وقت استعمال ہوتے تھے جب کہ مسلمان ریاستوں سے مراسلت ہوتی تھی یا دفتری کاروبار میں، گویا یہ وہ زمانہ تھا جب کہ نئے الفاظ کی آمد بند ہو گئی تھی۔ اور پہلے سے جو الفاظ زبان میں آچکے اور قایم ہو گئے تھے وہی رہ گئے۔

غرض سنہ ۱۳۱۸ء سے جب کہ اوّل اوّل اسلامی حکومت نے مہاراشٹر میں استقلال کی صورت اختیار کی، فارسی الفاظ کی رفتار سیلاب کی طرح رفتہ رفتہ بڑھنی شروع ہوئی۔ اور سنہ ۱۶۳۶ء میں اُس کا زور شور انتہائے عروج کو پہنچ گیا۔ سنہ ۱۶۵۶ء سے یہ زور گھٹنا شروع ہوا۔ اور سنہ ۱۸۲۸ء میں اس کی قوت بالکل ٹوٹ گئی۔ لیکن تقریباً تین سو پچاس سال تک فارسی اور مرہٹی کا چولی دامن کا ساتھ رہا۔ یہ ایک بڑی مدّت ہے۔ اس میں بہت سے انقلاب ہو گئے۔ بہت سی سلطنتیں بگڑیں اور بنیں۔ حالات و واقعات نے نئے نئے رنگ دکھائے۔ اطوار اور طریقوں میں بہت کچھ فرق پیدا ہو گیا۔ حکومتوں اور قوموں کے باہمی تعلقات نے بہت کچھ پلٹا کھایا۔ دول کے حدود بدلے اور پھر نئے سرے سے قایم ہوئے۔ آئین و انتظام میں تغیر و تبدّل ہوا۔ مذہب و رواج کی سختی اور ذات پات اور قومی امتیاز کی بندشیں ڈھیلی ہو گئیں لیکن ان تمام تغیرات میں فارسی مرہٹی کا ساتھ نہ چھوٹا۔ اور یہ اُسی فیضان

صحبت کا نتیجہ ہے کہ مرہٹی زبان میں اب تک اس کثرت سے فارسی الفاظ اور محاورے پائے جاتے ہیں۔

ساڑھے تین سو سال کی یک جائی سے سینکڑوں فارسی الفاظ کا مرہٹی زبان میں آجانا کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن تعجب اس امر کا ہے کہ مرہٹی پر فارسی کا ایسا گہرا رنگ چڑھا کہ یہ اثر الفاظ ہی تک محدود نہ رہا بلکہ فارسی ترکیبیں تک اس میں داخل ہو گئیں۔ اس کے علاوہ ہم اس زبان میں جا بجا دیکھتے ہیں کہ جملوں کی ساخت تک فارسی ہے۔ اور کثرت سے فارسی محاوروں کا ترجمہ مرہٹی میں آگیا ہے۔ ماسوائے اس کے فارسی حروف جار، ربط و عطف، دفجائیہ وغیرہ بھی بلا تکلف مرہٹی میں استعمال ہونے لگے۔ اور اب تک ہوتے ہیں ان تمام امور کا بیان ہم آگے چل کر تفصیل سے کریں گے۔

یہاں ہم ہر دَور کی تحریریں بطور نمونے کے پیش کرتے ہیں۔ جن سے اوپر کے بیان کی کسی قدر تصدیق ہوگی۔ ہر نمونے کے ساتھ مختصر طور پر ضروری تشریح بھی کر دی گئی ہے۔

वोखटे का गोमटें । हें कांहींचि तयानुमटे । राजिदिवस न घटे । सूर्यासि जेंवी ॥ १

ऐसा बोधुचि केवलु । जो होऊनि असे निष्कुलु । त्याहीवरी भजन शीलू । माझ्या ठायीं ॥ २

तरि तया ऐसें दुसरें । आम्हां पढियंतें सोयरें । नाहीं गा साचोकारें । तुझी आसा पांडवा ॥ ३

पायीं जयाचिया ठायीं । वैषम्याची वार्ता नाहीं । रिपु मजी दोहीं । सरिसा पांडु ॥ ४

कां घरींचिया उजिपेड करावा । पारखियां आधार पाडावा । हें नेणेंचि गा पांडवा । दीप जैसा ॥ ५

जो खांडावया धाव घाली । कां लावणी जयानें केली । दोघां एकचि साउली । वृक्षु जैसा ॥ ६

ना तरी इक्षुदंड । पालितया गोडु । गालितया कडु । नो हे चि जेंवी ॥ ७

अरि मित्रीं तैसा । अर्जुना जया भाव ऐसा । मानापमानीं सरिसा । होत जाय ॥ ८

तिहीं ऋतु समान । जैसें कां गगन । तैसा एकचि मान । शीतोष्णा जया ॥ ९

दक्षिण उत्तर मारुता । मेरु जैसा पांडुसुता । तैसा सुख दुःख माझा मध्यस्थु ॥ १०

माधुर्यें चंद्रिका । सरिशी राया रंका । तैसा सकळी कां । भूता समु ॥ ११

||

अवधिया जगा राक । सेव्य जैसें उदक । तैसें जयोतें तिन्ही लोक । आकांक्षिती ॥१२

जो निंदेतें नेघे । स्तुतीतें न श्लाघे । आकाश न लगे । लेपु जैसा ॥१३

तैसे निंदे आणि स्तुती । मान करून राके पंक्ती । विचरे प्राण वृत्ति । जनीं वनीं ॥१४

ज्ञानेश्वरी—अध्याय १२

اوپر کا اقتباس مرہٹی کے مشہور شاعر دیانشور کی کتاب دیانشوری تفسیر بھگوت گیتا سے لیا گیا ہے۔ یہ شاعر راجہ رام دیو (فرماں رواے دیوگڑھی) کے عہد میں ہوا۔ اس کا زمانہ تیرھویں صدی کا ہے اور دیوگڑھی (دولت آباد) کی فتح سے قبل کا ہے۔ مسلمانوں کا تسلّط اُس وقت تک یہاں نہیں ہوا تھا البتہ یہ اغلب ہی کہ مسلمان تجار اور درویش یہاں ہوں۔ اس نمونے سے ظاہر ہوتا ہی کہ اُس وقت تک فارسی نے مرہٹی پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ وجہ ظاہر ہی کہ مسلمانوں کی حکومت دکن میں قایم نہیں ہوئی تھی۔ یہ تمام کتاب اُس وقت کی ٹھیٹ مرہٹی میں ہی اور کوئی لفظ فارسی عربی کا اُس میں نہیں پایا جاتا۔

دیانشور کی تاریخ پیدائش سنہ ۱۲۷۵ء

دیانشور کی تاریخ وفات سنہ ۱۲۹۶ء

१ स्वस्ति श्री हिजरत ६६ सकु संवतु १२८६ प्लवंग संवत्सरे आधेय + +

२ श्री मत्य प्रौढि प्रताप चक्रवर्ति माहाराजाधिराज श्री हंबिरु राओ

३ ठागें कोंकण राज्यं क्रोति सत्ये तस्मिन काले प्रवर्तमाने धरमादि

४ पत्र लिखितं राणा सर्व व्यापारि सिहि प्रो तं निरोपित अठागर अधि

५ कारि आ कुसना आह्मसण नाकाचा सेणबै देऊं प्रोण्होह् वेलित स

६ + रंध चिचावली माम पैकि तेथिला मिजिगिति सिहि प्रोकेलि तेथें मरगी

७ आ लावेया लागी आठागर समंथ मुख्य नारवें आगरू पैकि कोतल वाडि

८ १ नारदे कवलि आ पैकि भाटालि १ उरी वाडि आ २ ससिम फल भोगास -

९ हित श्री रायाजा प्रधातु सिहिं प्रो विकति सडाउनि चिचवलिये चिये मिजिगिति

१० वर मिया मलिया कातिक वाडी विक्रिता द्रामा १६० नारदे कवलि आ जि

११-ये भाटालिये विक्रिता द्रुम ४० उरे वाडिआ २ विक्रिता द्रुमासते २०० –

१२ हे द्रुमवरत सकोश कवलिआ मुख्य करुनि समली आगरियांस मागिउ –

१३-डिली घा अढासाल गोपाल वादनिचे तले अठि आवा दातु रुह नाहीं वाडि -

१४ आदातोरें हिन करुनि जालिआ म्हणौनि समलि आगरियांस त्यातिवि –

१५ कलितेगुंति केवाह सोडवुनि सिहिप्रोला गौनि वाडिआ विकिली आहे –

१६ वाडिआ कोण्हि दातारु ठमठेलित गुंती करितर समस्तिम आगरियांहि प्रति –

१७(का) रावें ह्या धरमु सिहिप्रोचा तितिवड समस्ति आगरियाहिं समाग्रि प्रति पालावें -

१८ भाड़े आघि जमैनिस जेतुक आगरि साहि आडरेव पाठ तेतुके आगरास आ प्र -

१९ भाडावें ति रोपडवा वाडि सिहिप्रो सासन विषय भोगवारिह्या धरमु समग्रि प्र -

२०-तिपालावा आघाटारों पूर्व दिसें नाऊ म्हातोरे याचि वाडि उत्तर दिसे चोरेत वाडि पच -

२१-चिम दिसे पाठियारा वाड़ि दसिरा दिसे कोणिष्टि या चि वाड़ी रेसि आघाटरों चि -

२२ - आ रविवारति आहि पालक वरत अ काण्हा कवलिआ पेणुबाअ राम देऊ -

२३ वेद म्हातारियाचा धरमु देउ विउ म्हातोरे आया वाडेर पैकि बावंदे उकघाट –

२४ - आ अंबेयारि सोम्हाल म्हातारा राढत नागदेऊ भाई दायुभसदे सेठि

२५ साउ म्हातारा ताहदेउ का वंदे म्हातारा सवद म्हातारा गोरु म्हातारा –

२६ साजकार सामदेअ जोटा देअ बौकरु वरत अ भुपल पाठेलु नागला पाठेलु -

२७ वेडाकरु हेजन १८ मुख्य करुनि समग्रि प्रतिपालावें अ ग्रन्थें साक्षिता –

२८ नागावें जमैनि पैकि : रैगु माह्याभद दाउवार आया राजि दाउवार आया –

یہ ایک کتبہ کی نقل ہے جو ناگاؤں ضلع قلابہ (جنوب بمبئی) کے مندر بھیم ایشور میں کندہ ہے۔

اس کا سنہ پہلی ہی سطر میں درج ہے۔ اور قابل لحاظ بات یہ ہے کہ اوّل سنہ ہجری دیا ہے اور اس کے بعد سالباہن کا سنہ (شکے) ہے۔

اصل الفاظ یہ ہیں "ہجرت ۶۹ سکو سموت (سمت) ۱۲۸۹"

یہ ظاہر ہے کہ ہجری سنہ ۶۹ نہیں ہو سکتا۔ یا تو اوّل کا ہندسہ مٹ گیا ہے یا محض اختصار کے خیال سے سینکڑہ کا ہندسہ چھوڑ دیا گیا ہے جیسے آج کل عام طور پر رواج ہے کہ ۵۱ء لکھ دیتے ہیں۔ اور اس کے قبل بخیال اختصار ۱۹ کا ہندسہ ترک کر دیتے ہیں۔

سالباہن سمت سے مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۶۶۹ھ ہجری ہے۔

دوسری بات اس میں دیکھنے کے لایق یہ ہے کہ اس مختصر کتبے میں ایک دو فارسی الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ ایک لفظ تو "جمعیت" کا ہے۔ جو دو بار آیا ہے۔ دوسرا لفظ "سازکار" ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اس میں تین مسلمانوں کے نام آئے ہیں۔ دو تو جمعیت سے تعلق رکھتے ہیں جو غالباً فوجی افسر ہونگے جن کے نام محمد داور محمد، شجوار (یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اصل لفظ کیا تھا جسے بگاڑ کر شجوار بنا لیا گیا ہے) تیسرا نام شہپر و ہے جو مدار المہام تھا۔ اور جس کے متعلق کتبہ میں یہ لکھا ہے کہ وہ ہر چیز میں بیوپار کرتا تھا۔ اس وقت یہ صحیح طور سے معلوم کرنا مشکل ہے کہ اصل نام کیا تھا۔ اس تعریف سے کہ وہ ہر چیز میں تجارت کرتا تھا اُس کے مسلمان ہونے کا یقین ہوتا ہے اس لئے کہ اس زمانہ میں نیز اُس کے بعد بھی ضلاع کوکن و ملابار میں اس قسم کے تاجر سب عرب مسلمان ہوتے تھے۔ علاوہ اس کے یہ نام آریائی اور دراوڑی زبان کا نہیں معلوم ہوتا۔

چوتھی بات غور کے قابل یہ ہے کہ ۶۶۹ھ ہجری عربی الفاظ میں تحریر ہے۔

پانچویں بات دیکھنے کی یہ ہے (جیسا کہ اس کتبہ سے معلوم ہوتا ہے) کہ اگرچہ اس ریاست کا فرماں روا دولت آباد کے جادو خاندان کا خود مختار راجہ تھا۔ اور وہاں اسلامی حکومت کا مطلق کوئی اثر نہ تھا۔ تاہم فارسی الفاظ وہاں بھی پہنچ گئے۔

अर्जदास्त

अर्जदास्त अर्जदार । बंदगी बंदे नवाज

अलेकं सलाम । सहि वांच सेवसी

बंदे शरियाकार । जीवाजी शेखदार

बुधाजी कारकून । झागो रुधिराबाद

किल्ले कायापुरी । सरकार साहेबांची

आज्ञा घेऊन स्वार जालों तो झगरो मजकुरीं येऊन सरकार काम करावयास लागतों तो झगरों मजकूरचे जमेदार दंभाजी शेटये व कामाजी महाजन व मनीराम देशमूख व ममताई देश पांडीण क्रोधाजी नाईक वाडी ऐसे हरामजादे फार आहेत ते सरकार कामाच्या कयास चालूं देत नाहींत· दंभाजी शेट्या कचेरीस येऊन लोभ धरून बसतो· मनीराम देशमूख आपलें काम परभारें करून घेतो· ममताई देशपांडीण इणें तमाम तफरका केला· तो साहेबापासून जरासंध चोपदार आला त्यानें खबर केली कीं भागून यमाजी पंताची तलब होणार त्यास, त्या धास्तीनें तमाम परगणा वोस झाला· बितपशील कलम डोलस वाडीस मात्र कांहीं रुई भुई वस्ती राहिली कानगांव तें बंद जालें· दोन्ही वेशींचीं कवाडें लागलीं· नाकापुरास वहाव सुटले· तोंडापुर तो तफरका झालें· दंतालवाडी वोस पडली· दिवे लागडी देखील राहिली नाहीं· केस गांवची पांढर जाली शिरापुरचा लोक दरोबस थरथरा कापतो· हातगांव कसाल्यांमुळे आंबस जालें· त्यांच्यानें आतां कांहीं लावणी होत नाहीं· पायगांवची मेटें बसलीं· ढोपर पूरची राहिलीं· चरण गांव चाली सरली· ऐसी झागण्यांत कीर्दी बुडाली· यावर सरकारी काम सुरू करील होतों तों यमाजी पंताची परवानगी आली कीं, हुजूर येणें· आपणास साहेबाचा - आश्रय आहे· एका जनार्दन बंदा । बंदगी रोशन होय ।

हे अर्जदास्त.

ایکناتھ پٹن (ضلع اورنگ آباد) کا مشہور مرہٹی شاعر، سادھو، اور مصلح گزرا ہے۔ اُس نے تیرہویں صدی کے اوائل میں انتقال کیا۔

یہ ایک عرضداشت ہے جو روح نے خدا کے نام لکھی ہے اور جس میں یہ بتایا ہے کہ دنیا میں آکر مجھ پر کیا واردات گزری۔ ایکناتھ نے اُس کا نام "عرضداشت" ہی رکھا ہے۔ اور یوں شروع کیا ہے۔

"عرضداشت عرض دار، بندگی بندہ نواز، علیکم سلام"

یہ خاص اُسی کے الفاظ ہیں۔ اس کے بعد اصل عرضداشت کا مضمون شروع ہوتا ہے جس میں بہت سے عربی، فارسی الفاظ آئے ہیں۔ مثلاً صاحب، بندہ، سیکھدار (شقدار) کارکن، شہر آباد، قلعہ کا یا پوری (اضافت کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے) سرکار، سوار، مذکور، زمیندار، و، حرام زادہ، قیاس، تمام، زبردست، تفرقہ، چوبدار، جز، طلب، بہ تفصیل کلام، دخیل، درو بست، شروع، پروانگی، حضور، بندگی، روشنی

خاتمہ ان الفاظ پر کیا ہے "بندگی روشن ہوئی۔ ہے عرضداشت" اس ملک میں اب تک مرہٹی درخواست کے خاتمہ پر یہی الفاظ لکھے جاتے ہیں۔

یہ نمونہ ہے اُس وقت کی مرہٹی درخواستوں کا۔ اس عرضداشت کا سنہ تحریر تقریباً ۱۵۸۸ء ہے۔

पौष शुद्ध १० शाके १४६८

अज रख्तखाने राजश्री अंकुशराव राजे गोसावी बजानेबू कारकुनानी तपे खेडबारे बिदानद सुरु सीत सबैन व तिसा मया देश मुरवानी तपे मजकूर व दूनामती व हकलाजिमा व बाजे दूनामती व सेते संभूजी व बाबरोजी व देसकु तपे मजकूर बार भोगवटे तसरफाती वजिरानी कारकीर्दी दर कारकीर्दी पेसजी ता मलिक सर्क मलिक कामन मुलूक चालिले आहे तैसे चालविणें - ऐसी खुर्द खताची रजा होए · मालूम जाहाले देसमुखाची इसाबती व दूनामती व हक लाजिमा व बाजे दूनामती व सेत संभूजी व बाबरोजी व देसकु तपे मजकूर वग कौल भोगवटे तसरफली ना। कारकीर्दी पेसजी व जिरानी चालिले आहे तेणें प्रमाणें चालविजे · असेली खुबरवत देसमुखासी असो दीजे · तालीक लिहून घेईजे · मोतिब · तेरीख

८ माहे सौवाल सलास ·

اوپر کا خط راجہ انکوش راؤ نے ۱۶۱۸ء میں اپنے کارکن کو لکھا ہے۔ اس مختصر خط میں مفصلہ ذیل فارسی، عربی، الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

از رخست خانہ، بجانب، کارکنان، تپِ کھیڑ بارے (اضافت استعمال کی گئی ہے)، بداند، شروع سنہ، ست سبعین و تسع مایتہ، دیشکھاں (فارسی طریقۂ جمع) تپ مذکور، انعام، حق لازمہ، بعضے، تصرفات، وزیر، درکارکرد، پیشگی، مِلک، مُلک، خوردخط، رضا، معلوم، اصابت، قول، اصل، تالیق، مرتب، تاریخ ۸ ماہ شوال ثلاث۔

اس میں صرف چند مرہٹی الفاظ ہیں باقی سارا خط فارسی، عربی الفاظ سے بھرا پڑا ہے۔ اس کے علاوہ طرزِ تحریر فارسی ہے اور بعض جگہ مرہٹی میں فارسی محاورات کا لفظی ترجمہ ہے۔

इ. स. १६१८ ला एक लेख

अज दीवाणे रखतखाने खास बजानेबू कारकुनानी व देसमुखानी पा पुणें व मुकासाइयानी व हुदेदारानी अजहली मुकासाई हाल व इस्तकबाल व मोकदमानी मौजे देऊलगौ नजदीक असिगौ कर्याती पाटस पा मजकूर बिदानद सुा सन निसा असर अलफ दर्मीदर भट बिन नारायन भट व रामेस्वर भट बिन नारायन भट साकिन आरवी मुवूल बंदगी-हजरती मालूम केलें जे, आपणीयासी बनाम जमीन सेत खुद खासा देणे सवादर सवाद मौजे देऊलगौ नजदीक आलेगौ कार्याती पाटस परगणे मजकूर व॥ हुज्जती हैं खतखान सलास अलफ आहे· येणें प्रमाणें फर्मान करून देणें म्हणून गोरवा पमलकत मदाणी

मलकंबर एकंदर बुनामदारानी तिसा अशर अलफ छ २० माहे सौवालु आहे

फर्मान मन्शामतनि होये मालूम जाले - बा। दु आ॥ ती दिवाण खासा बराये दु

रुके ७ देखविले दामोधर भट बिन नारायनभठ व रामेस्वर भठ बिन नारायन भठ साकिन

अमरवी मुल्क. यासी बुनाम ज़मीन सेत खुद खासा दोरी सवाद सवाद मौजे

देऊलगौ न ॥ असैगौ कर्याती पाटस पा मजकूर बा हुज्जती हैबती हैबतखान

सलास अलफ दिघले आहे - तेणें प्रमाणें करार केले असे त ॥ सबा असर

अलफ जैसा भोगवटा व तसरुफाती चालत असेल तेणें प्रमाणें दुभाला

कीजे दर हर साल फ़रमानाचा उजर न कीजे · तालीक घेऊन असली फिराऊन

दीजे · बा। तेरवा मा मा मलकंबर एकंदर बुनामदारानी तिसा अशर अलफ

छ २० सौवालु मा दामोधर भट व रामेस्वर भट सेत दोरी सवा बा सवाद

दफतर पाष्ठ भोतब सूद

یہ خط ملک عنبر نے شاہ جی (والدِ شیواجی) کے پروہت داموھر بھٹ بن نارائن بھٹ اور اُس کے
سپاہی رامیشور بھٹ کو عطائے جاگیر کے متعلق لکھا ہے (سنہ تحریر ۱۶۱۸ء ہے) مگر اصل سنہ جو اس خط
میں درج ہے وہ ہجری ہے اور اصل عربی الفاظ کو مرہٹی حروف میں لکھا ہے۔ یعنی تسع عشر الف ۲۰ شوال
یہ خط شروع سے آخر تک فارسی الفاظ سے بھرا ہوا ہے اور اس میں فارسی مرہٹی الفاظ کا تناسب
(قطع نظر اعلام کے) یہ ہے۔

فارسی الفاظ ۱۲۷

مرہٹی ۳۸

فارسی الفاظ کے نیچے امتیاز کے لئے خط کھینچ دیا گیا ہے۔

ہم اس خط کو فارسی حروف میں لکھتے ہیں اور مرہٹی الفاظ کو قوسین کے اندر دکھاتے ہیں۔ اس سے صحیح اندازہ ہو سکے گا کہ اس ایک خط میں کس قدر فارسی الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔

از دیوانِ رخت خانہ خاص بجانب کارکنان ودیسکھاں پرگنہ، پونہ مقاسائیان وعہدہ داران از ہتی حال واستقبال ومقدمان موضع دیول گاوں نزدیک (آسے گو) قریاتی (پاٹس پاٹیل) مذکور بداند۔ شروع سنہ تسع عشر الف داموہر بھٹ بن نارائن بھٹ ورامیشور بھٹ بن نارائن بھٹ ساکن اردی مدگل بندگی حضرتی معلوم (کیلے زے آپن یاسی) انعام زمین (سیت) خود خاصہ دوری سوادر سواد موضع دیول گاؤں نزدیک (آسے گو) قریاتی (پاٹس) پرگنہ مذکور بدّل حجتی ہیبت خاں ثلاث الف (آہے سینے پرمانے) فرمان (کرون دینے مہوں) روخا مملکت مدار ملک عنبر (ایک اندر) انعام داران تسع عشر الف ۲۰ ماہ شوال (آہے) فرمان مرحمتی (ہوسے) معلوم (جھالے) بدّل انعام (اکارتی) دیوان خاصہ برائے رقعہ (ساتھ دِی دِیے) داموہر بھٹ بن نارائن بھٹ ورامیشور بھٹ بن نارائن بھٹ ساکن اردی مُدگل انعام زمین (سیت) خود خاصہ دوری سوادر سواد موضع دیول گاؤں نزدیک (آسے گو) قریاتی (پاٹس) پرگنہ مذکور بدّل حجتی ہیبتی ہیبت خاں ثلاث الف (دِدھلے آہے سینے پرمانے) قرار (کیلے آسے تے) سبع عشر الف (جیا بھوگ دِٹا) وتصرفاتی (چالت ایسل سینے پرمانے) دنبالہ (کیزے) درہرسال فرمان (چا) عذر نہ کیزے یتعلیق (گھیوں) (صلی پھراؤں دیزے) بدّل رخا مذکور ملک عنبر (اک اندر) انعام داراتی تسع عشر الف ۲۰ ماہ شوال (پرمانے) داموہر بھٹ ورامیشور بھٹ (.. ت دوری سوا بدّل سواد دفتر (پاس) مرتب سد۔

श्री ९६५६ इ.स.

अखंडित लक्ष्मी प्रसन्न परोपकार मूर्ति राजमान्य राजश्री मिलोपंत गोसावी यांस-

॥छ- सेवकें दिपानतराऊ नमस्कार विनंति उपरी - मौजे उभांडे किल्ले नंदन

माह्ताजी गांव चालत असतां संप्रत नूरखानास खा जालाह् होता - यावरी

हुजूर मालूम होऊन माहातीचे देहे माहालास मोकरर केले असे तरी मौजे

मा किल्लेचे किल्लेस दुंबाला केले पाहिजे · पहिलें नूरखानाचे विषयीं लिहिलें

होतें · त्यावरी न च जातां किल्ले मजकूरास दुंबाला करणें पुढें नूरखानाचे

विषयीं लिहिलेया त्यास दुंबाला न करणें · माह्ताजी गांवा विषयीं विनाजी कोन्हेरी·

पंत सांगतील त्या सारिखें न्याय पत्य देखील (केलें) पाहिजे · किल्ले वंदन आमचें

वतनस्थल आहे - त्याचे मदत करायास अंतर पडो न देणें बहुत लिहिणें नलगे (मोर्तब सूद)

یہ خط دیانت راؤ وزیرِ بال سلطان علیؒ عادل شاہ نے نیلو سوندیو موزمدار (معتمدِ مالگزاری) شیواجی مہاراج کو لکھا ہے۔ ۱۶۵۶ء

اس خط سے یہ معلوم ہوگا کہ مرہٹی طرزِ تحریر میں ایک نئی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ اب تک فارسی الفاظ اور جملے بعینہ مرہٹی زبان میں استعمال ہوتے تھے۔ لیکن اس خط کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا کہ فارسی عربی الفاظ کا استعمال کچھ کم ہوتا جاتا ہے۔ لیکن فارسی محاورات اور جملوں کا لفظی ترجمہ مرہٹی زبان میں شروع ہوگیا ہے۔ اور گو الفاظ مرہٹی ہیں مگر طرزِ تحریر اور اسلوبِ بیان میں فارسی زبان کا رنگ صاف نظر آتا ہے۔ مثلاً

”اکھنڈت لکشمی پرسن“ आखंडित लक्ष्मीप्रसन्न دام دولتہ کا لفظی ترجمہ ہے

”پروپکار مورتی“ परोपकार मूर्ति احسان مجسم کا ترجمہ ہے۔

”سیوک“ सेवक بندہ کا ترجمہ ہے۔

موضعِ اُجھارڈا اور قلعۂ دندن یہ دونوں اضافت کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔

”معلوم ہوؤں“ اور ”مقرر کے لئے“ یہ معلوم شد اور مقرر شد کا لفظی ترجمہ ہے۔

خط کا خاتمہ فارسی کے ان الفاظ کے ترجمہ پر ہوا ہے ”زیادہ چہ نویسم“ یہ جملہ اُس وقت سے اب تک

مرہٹی خطوں کے آخر میں استعمال ہوتا ہے۔

श्री   २६ जुलै १६७७

स्वस्ति श्री राज्याभिषेक शक ४ पिंगल संवत्सरे आषाढ शुद्ध ७ सप्तमी गुरुवासरे क्षत्रिय कुलावतंस श्रीराजा शिवछत्रपति यांणीं यशवंतराऊ शहाजी कदम नामजाद कोट बालगुडानूर यासी आज्ञा केली ऐसीजे :—

कोट मजकूरीं हसमें नामजाद आहे व एक जिन्नस ही शिल्लक थोड़ा बहुत आहे· ऐसियासी त्याच्या लिहिणियासी लिहिणार पाहिजे म्हणून· त्यावरी तिम्माजी नारायण यासी जमा करून पाठविलें आहे· तैनात दरमाहे होंन प्रार ३ तीन रास केले असेत· १॥ प्रो पासून बजावाटा अंबेदी प्रो वजा करून बाकी बेरीज माहे दर माहे आदा करीत जाणें· आणि त्याचे हातें कूद मजकुरी लिहिणियाचे काम घेत जाणें - कायद बाब लिहिणियाचा फक देत जाणें - मजुरा असे - लेखन सीमा·

(श्री शिव चरणीं तत्पर
त्र्यंबक सुत मोरेश्वर)

मर्यादेयं
विराजते

یہ خط شیواجی مہاراج نے ۲۶ جولائی ۱۶۷۷ء میں اپنے ایک سردار یشونت راؤ شاہ جی کدم کے نام لکھا ہے۔ یہ خط خاص طور پر قابل توجہ اور قابل لحاظ ہے۔ شیواجی مہاراج نے یہ فرمان جاری کیا تھا کہ فارسی عربی الفاظ استعمال نہ کئے جائیں۔ اور ایک لغت بھی اس غرض سے تیار کی گئی تھی کہ فارسی عربی الفاظ مروّجہ کے بجائے سنسکرت الفاظ بنائے جائیں۔ یہ خط شیواجی مہاراج کی وفات سے دو ڈھائی سال قبل کا ہے لیکن باوجود اس احتیاط اور احتراز کے اس چار سطر کے مختصر سے خط میں مفصلہ ذیل الفاظ عربی فارسی کے استعمال کئے گئے ہیں۔

(۱) مذکور (۲) حشم (۳) نامزد (۴) جنس (۵) سلک (۶) جمع (۷) تعینات (۸) درماہ (۹) راس

(۱۰) وضع (۱۱) باقی (۱۲) ماہ درماہ (۱۳) ادا کرنا (۱۴) کاغذ (۱۵) باب (۱۶) موافق (۱۷) مجرا

قطع نظر اس کے ایک قابل غور امر یہ ہے۔ کہ ان فارسی عربی الفاظ کے علاوہ جو عبارت اس خط میں مندرج ہے وہ فارسی طرزِ تحریر کی نقل ہے۔ اور فارسی کے جملوں اور محاورات کا لفظی ترجمہ ہے۔ مثلاً خط کے عنوان کا ترجمہ یہ ہے۔

"سن جلوس ۴۔ ساون تاریخ ۷۔ روز پنجشنبہ۔ فخرِ خاندانِ چھتریاں شری راجہ شیو چھتر پتی (شہنشاہ) الشوکت راؤ شاہ جی کدم نامزد قلعہ دال گڈانو رحکم فرمود کہ"

خاتمہ پر جو مہر ہے اُس کے الفاظ بھی فارسی مُہروں کی نقل ہیں۔

श्री

१० जुलै १०८५ ई. स.

विनंति विज्ञापना · मूस रेमू आपले जमयत व तोफखान्या सुद्धां संगारडी पेठेस गेले· संगारडी भागानगराहून १८ कोस आहे · त्यास मूस मजकूर यांनीं पेठेस मोर्चे लावून तोफांची मारगिरी करून पेठ घेतली · तिकडील लोक फार जाया झाले · पेठेंत वस्ती नव्हती · प्यादे मात्र होते · ते निघून गेले · सांप्रत भागानगराहून · अजम साहेब व घासिमिया यांस जमियत सुद्धां रवाना केलें त्यास अवघे मिळून सध्यां पांचशें स्वार आहेत · त्यास पांच सात दिवस दरगाह्यावर भागानगराहून तीन कोसावर मुक्काम होता · रात्रं दिवस चौकी पहारा हुशारी नें होते · प्रस्तुत दरगाह्या वरून कुच करून पुढे संगारडी पेठेचे समोरं गेले· कोणेंही प्रकारें मुसारेम पास जाऊन मिळावें · नाहीं तर शिद्दी अबदुल्ला खान ठार झाले · लोक मारत होऊन राहिले · ते परागंद। झाले जरवमी अद्यापि येथें येतात · सांप्रत वर्तमान कीं बेदरचा किल्ला घेतल्यानंतर सदाशिव रड्डी आपले जमयत सुद्धां लागभाग पाहून गायब आहे · रा छ २८ जिल्हेज हे विज्ञापना ·

گوبند راؤ کالے (وکیل پیشوا بہ دربار حیدرآباد) خط موسومہ نانا فرنویسی جولائی سنہ ۱۷۹۵ء کا لکھا ہوا۔

اِس خط میں تاریخ ہلالی عربی الفاظ میں لکھی ہوئی ہے۔ سنہ ۱۸۴۳ء تک سنہ و تاریخ تمام مرہٹی خطوط و فرامین میں ہجری اور عربی الفاظ میں لکھے جاتے تھے۔ اس خط سے ایک امر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اٹھارہویں صدی میں فارسی عربی الفاظ بلا تکلف استعمال ہوتے تھے۔ مگر پہلے کی نسبت کم ہو گئے۔ چنانچہ اس خط میں فارسی عربی الفاظ کی تعداد (۲۸) اور مرہٹی الفاظ کی تعداد (۸۴) ہے اور تقریباً یہی تناسب مرہٹی اور فارسی الفاظ کا اب تک مرہٹی زبان میں پایا جاتا ہے۔

اب میں اُن اثرات کا ذکر کرتا ہوں جو فارسی نے مرہٹی زبان کی صرف و نحو پر ڈالے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ فارسی کا اثر محض اسماء و صفات تک محدود نہیں رہا۔ بلکہ زبان کے بنیادی عنصر تک پہنچ گیا تھا اور یہ اثر ثابت کرتا ہے اس بات کو کہ دکن کی اسلامی حکومت میں ہندو مسلمانوں کے تعلقات کس قدر گہرے تھے۔

(۱) تمام ہندی زبانوں میں صفت اسم کے پہلے آتی ہے جیسے اچھا آدمی، شریر لڑکا۔ مرہٹی میں بھی یہی ہوتا ہے لیکن فارسی کے اثر سے بعض اوقات صفت اسم کے بعد آتی ہے۔ اس کا استعمال خاص کر سرکاری اور دفتری تحریرات میں زیادہ ہوتا تھا۔ مثلاً

इसम मजकूर	اسم مذکور
पंडित मशार निल्हे	پنڈت مشارنلے (مشارٌ الیہ)
राव अजम	راؤ اعظم
साल गुदस्त	سال گذست (سالِ گزشتہ)
आंग्रे वजारत मा आब । गाइकवाड समशेरबहादूर	انگرے وزارت مآب گائیگواڑ شمشیر بہادر
कंपनी बहादर	کمپنی بہادر
वडगांव बुद्रुक	ڑگاؤں بُدرُک (بزرگ)
वतन दरोबस्त	وطن دروبست
इस्टुर फाकडा	ایشٹر پھاکڑا

पंडित पंत प्रधान	پنڈت پنت پردھان
वड़गांव खुर्द	وڑگاؤں خورد

اگرچہ اوپر کی مثالوں میں اکثر فارسی و عربی کے صفات ہیں لیکن وہ مرہٹی اسماکے ساتھ مل کر استعمال ہوئے ہیں اور اُس کی تتبع میں بعض مرہٹی صفات بھی اسم کے آخر میں استعمال ہونے لگیں۔

جب اس قسم کے اسماکے ساتھ جو صفات کے اوّل ہیں اُن اسما کی حالت بتانے کے لئے کوئی علامت لگائی جاتی ہے تو وہ بھی باتباع فارسی صفت کے آخر آتی ہے نہ کہ اسم کے آخر میں۔

शिकंदर सानीला	سکندر ثانی لا (لا علامت مفعول بمعنی کو)
राव बहादूराना	راؤ بہادرانا (نا علامت مفعول بمعنی کو)
पंडीत मशार निल्हेस	پنڈت مشار نلہیس (ہیں علامت مفعول بمعنی کو)

(۲) کسی ہندی زبان میں اضافت نہیں ہے۔ لیکن فارسی کے اثر سے مرہٹی میں بھی بعض الفاظ کے ساتھ اضافت کا استعمال ہوتا ہے۔ یہ استعمال بھی زیادہ تر سرکاری اور دفتری تحریرات میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً

किल्ले रायगड	قلعۂ رائے گڑھ
बंदर दाभोल	بندر دابھول
शहर पुणें	شہرِ پونہ
इलाखा मुंबई	علاقۂ بمبئی
जिल्हा कुलाबा	ضلعِ قلابہ
सुभा गुलबुर्गा	صوبۂ گلبرگہ

یہاں بھی حالت فاعلی و مفعولی وغیرہ کی علامت آخری لفظ کے ساتھ آئیگی۔ مثلاً

किल्ले रायगडास	قلعۂ رائے گڑاس
बंदर दाभोलास	بندر دابھولاس

(۳) مرہٹی میں حالت مفعولی کی علامت ला (لا) ہے جیسے रा मा ला را ما لا (یعنی رام کو)

یہ درحقیقت فارسی لفظ "را" ہے۔ "ر" اور "ل" کا بدل عموماً ہر زبان میں پایا جاتا ہے اس لئے اغلب یہی ہے کہ فارسی کا "را" مرہٹی کا "لا" ہو گیا۔ اس کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ قدیم مرہٹی میں یہ لفظ نہیں پایا جاتا اس کا استعمال علاقۂ گھاٹ ماتھا یعنی اضلاع پونا، ستارا، احمد نگر و شولا پور میں ستّر اسّی برس قبل بہت زیادہ تھا۔ اور یہ مسلم ہے کہ کوکن پر اسلامی حکومت، رسم و رواج، اوضاع و اطوار اور زبان کا اثر بہ نسبت دوسرے اضلاع مرہٹواری کے بہت کم ہوا۔

فارسی کا یہ حیرت انگیز اور عجیب اثر ہے کہ اُس نے اپنی علامت مفعولی کو مرہٹی میں داخل کر دیا۔ حالانکہ مرہٹی میں اس کے لئے دوسری علامتیں بھی موجود تھیں۔

(۴) فارسی کے بعض حروف جار بھی مرہٹی میں بلا تکلف استعمال ہوتے ہیں اور مستند اور فصیح انشا پرداز انھیں اسی طرح استعمال کرتے ہیں جیسے مرہٹی حروف جار کو مثلاً

दर दिवस ، दररोज ، दर दिवर्षी — در (در دیوس، در روز، در ورشی)

"در" مرہٹی میں وہی معنی دیتا ہے جو اردو فارسی "ہر"

देखील — دےکھیل یعنی دخیل۔ یہ مرہٹی میں بطور حرف جار آتا ہے اور اس کے معنی "بھی" کے آتے ہیں۔

चालीस ते पचास — تے (فارسی تا) چالیس تے پچاس یعنی چالیس تا پچاس

तुलजापूर ते उसमानाबाद — تلجا پور تے عثمان آباد

बादज बरसात — بعداز۔ بعداز برسات (قدیم مرہٹی)

अज रख्त खाने — از۔ از رخت خانہ

بعض فارسی حروف جار مرہٹی میں اسم متعلق کے بعد آتے ہیں اردو میں بھی اُن کا استعمال اسی طرح ہے مثلاً

बद्दल بدل، ऐवजीं عوض، बराबर برابر، बरोबर بروبر، शिवाय سوائے

नजदीक نزدیک، नजीक نزیک، माफक موافق، बरहुकूम برحکم، बाबत بابت

"تحت" کا لفظ مرہٹی میں بطور حرف جار "تا" (تک) کے معنوں میں زور پیدا کرنے کے لئے آتا ہے یعنی

از پارلیمنٹ تا کلکٹر۔ पार्लमेन्ट पासून कलेक्टर पर्यंत ان مثالوں میں اگر تحت کا لفظ استعمال نہ بھی کیا جائے تو مضایقہ نہیں۔ یہ حرف تک (تا) کے معنوں میں زور پیدا کر دیتا ہے۔

(۵) فارسی کے اکثر حروف عطف بھی مرہٹی میں استعمال ہوتے ہیں۔ ایک دو ایسے بھی ہیں جو قدیم مرہٹی میں استعمال ہوتے تھے مگر اب متروک ہو گئے ہیں۔ जैसे

व (و) मगर (مگر) अगर (اگر) बलके (بلکہ) या (یا)

बाकी (باقی) चुनाचे (چنانچہ) सबब (سبب) लेकिन (لیکن) وغیرہ

की کیں فارسی (کہ) کاف بیانیہ ہے۔ باقی مرہٹی میں حرف عطف کا بھی کام دیتا ہے

(چنانچہ) قدیم مرہٹی ہے۔

سبب بھی (بہ معنی لہذا) قدیم مرہٹی ہے۔

لیکن بھی قدیم مرہٹی ہے۔

(۶) فارسی حروف فجائیہ بھی مرہٹی زبان میں بکثرت مستعمل ہیں مثال کے طور پر چند لکھے جاتے ہیں۔

बस بس हां ہاں अलबत البت (البتہ) बेशक بے شک बेलाशक بلاشک

खूब کھوب (خوب) खूप کھوپ (خوب) वाह واہ वाहवा واہ وا अफ़सोस افسوس

शाबास شاباس हाय ہائے हाय हाय ہائے ہائے खबरदार خبردار

افسوس۔ آج کل اس کا استعمال بہت کم ہوتا ہے۔

(۷) فارسی کے بہت سے متعلقات فعل بجنسہ مرہٹی میں مستعمل ہوتے ہیں بعض الفاظ میں لہجہ و تلفظ کی وجہ سے خفیف سا تغیر ہو گیا ہے مثلاً چند الفاظ نیچے لکھے جاتے ہیں۔

हमेश ہمیش हरहमेश ہرہمیش बिलकुल بالکل वारंवार وارم وار

एकवार ایک وار बेहत्तर بہتر ध्यान دھیان जलद جلد मुस्कील مشکل

अलाहिदा علیحدہ वगैरे وغیرے पेश्तर بیشتر वापस واپس तमाम تمام

गुदस्ता گدستہ कुल کُل यंदा ینده सकटा ایک ٹا दुकटा دکٹا अव्वल اوّل

दुअम دویم सियम سیم देखील دیکھیل

ہمیش یعنی ہمیشہ ہرہمیش، محض زور دینے کے لئے آتا ہے، وارم وار، وار، بار سے ہے اور بارم بار سے مطلب بار بار سے ہے۔

چھان فارسی کا شان ہے۔

ینده کے معنی مرہٹی میں امسال کے ہیں۔ یہ لفظ غالباً فارسی کے لفظ آینده کا بگاڑ ہے اور معنی بجائے مستقبل کے حال کے ہو گئے ہیں۔

گدستہ یعنی گزشتہ۔

• ایکٹا فارسی کا یکتا۔ اس کے معنی مرہٹی میں تنہا اور اکیلے کے ہیں یعنی یکہ و تنہا۔

دکٹا فارسی دوتا۔

دیکھیل عربی لفظ دخیل ہے۔ مرہٹی میں اس کے معنی بھی یا نیز کے ہیں۔ چونکہ بھی کے آنے سے ایک شے کے ساتھ دوسری شے بھی داخل ہو جاتی ہے اس لئے اس کے یہ معنی قرار پا گئے۔

(۸) فارسی کے بعض ضمائر یا صفات ضمیری بھی مرہٹی میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً

खुद خود

फलाना فلانا (فلاں)

हर ہر

हर एक ہریک وغیرہ

(۹) جس طرح فارسی میں اسما کے آخر میں ی بڑھا دینے سے صفات بن جاتی ہیں اسی طرح مرہٹی میں ی کے اضافہ سے صفات بنائی جاتی ہیں۔ یہ قاعدہ بھی فارسی سے لیا گیا ہے۔ جیسے۔

तोंडी تونڈی (زبانی) डोंगरी ڈونگری (پہاڑی) दगडी دگڑی (پتھریلا)

(۱۰) فارسی میں یہ قاعدہ ہے کہ اسما یا صفات کے آخر (ی) لگا کر اسمائے کیفیت (یا حاصل مصدر) بنا لیتے ہیں

یہی طریقہ فارسی سے مرہٹی میں پہنچا ہے۔ اور مرہٹی الفاظ کے آخر میں بھی (ی) بڑھا کر اسمائے کیفیت بنائے جاتے ہیں غیر زبان کے لفظ کے ساتھ بھی جو مرہٹی میں مستعمل ہیں، یہی عمل ہوتا ہے مثلاً

वैद्यकी ویدکی	मास्तरी ماستری	मांत्रिकी مانترکی	दोस्ती دوستی
बहादरी بہادری	मैत्री میتری	साक्षी ساکشی	भाई बंदी بھائی بندی
कारागिरी کاراگری (کاریگری)			

(۱۱) بعض اوقات مرہٹی میں اسمائے کیفیت بنانے کے لئے کی یا گی اسم عام کے آخر میں اضافہ کرتے ہیں فارسی میں اس غرض کے لئے علامت گی صرف انھیں اسما یا صفات کے آخر بڑھائی جاتی ہے جن کے آخر ہ ہوتی ہے جیسے بندہ سے بندگی، بیچارہ سے بیچارگی، لیکن مرہٹی میں اس کی کوئی قید نہیں مثلاً

मास्तरकी ماسٹرکی	फुशारकी پھوشارکی	शाबासकी شاباسکی	देणगी دین کی
पोटगी پوٹگی	पाठिलकी پاٹھیلکی	माहारकी ماہارکی	बिदागी بداگی
निमकी نیمکی (نیم سے)	पावकी پاؤکی وغیرہ وغیرہ		

(۱۲) بعض اوقات فارسی علامات دار، باز، خور، گار، گری، چی یا چی، دان یا دانی، خانہ، باد، وار، مرہٹی کے الفاظ کے آخر میں بڑھائی جاتی ہیں اور وہی کام دیتی ہیں جو فارسی میں مثلاً

دار	دل دار	تجیل دار	ایٹ دار	ٹم دار	پیل دار
दार	दलदार	तजेलदार	ऐटदार	टूमदार	पीलदार
باز (باج)	چین باز	کاوے باز	کائیدے باز	ایٹ باز	کلّے باز
बाज	चैनबाज	कावेबाज	कायदेबाज	ऐटबाज	कल्लेबाज
خور	بذات خور	شنکے خور	ادھل خور	چہار خور	بھانڈ خور
खोर	बपातखोर	शंकेखोर	उधळखोर	चहाडखोर	भांडखोर
گار	کرتب گار	کامگار	پائیگار	ماہت گار	
गार	कतबगार	कामगार	पालेगार	माहितगार	

گری نٹوے گری پھسوے گری مارگری کُلام گری

गिरी नटवे गिरी फसवेगिरी मारगिरी गुलामगिरी

جی (چی) گھڑیال جی

घड़ियालजी

دان یا دانی چہادانی مچھردان دیپ دان پاندان

चहादाणी मच्छरदान दीपदान पानदान

خانہ بھوت خانہ भूतखाना ہتی خانہ हत्तीखाना رتھ خانہ रथखाना

وار ٹھانے وار دھندے وار مانسوار مہینے وار

वार ठाणेवार धंदेवार माणसवार महीनेवार

حالانکہ ساکی کے معنی گواہ کے ہیں لیکن اس کے ساتھ دار کا لفظ بھی لگا دیا گیا ہے یہ عموماً انگریزی اور پرتگالی الفاظ کے ساتھ بھی آتا ہے جیسے پگار دار (تنخواہ دار) पगारदार کانٹریکٹ دار (یعنی ٹھیکہ دار) कंत्राटदार

(۱۳) جس طرح فارسی میں ایک لفظ کا تکرار درمیانی الف وصل کے ساتھ ہوتا ہے اور اس سے ایک خاص معنی پیدا ہو جاتے ہیں اسی طرح مرہٹی میں بھی یہ استعمال بکثرت جاری ہے اور یقیناً فارسی سے لیا گیا ہے مثلاً

ہانکا ہانک हांकाहांक ٹوٹا ٹوٹ तुटातूट باچا باچ बाचाबाच ٹھوکا ٹھوک ठोकाठोक

مارا مار मारामार

یہ الفاظ جن کے ساتھ درمیانی الف وصل واقع ہوتا ہے عموماً دو حرفے سہ حرفے ہوتے ہیں۔

(۱۴) بہت سے الفاظ مرہٹی میں ایسے ہیں جو دو لفظوں سے مرکب ہیں اور اُن کی ترکیب فارسی حرف وصل وَ کے ذریعہ سے عمل میں آئی ہے بعض اس قسم کے فارسی مرکب الفاظ بجنسہ مرہٹی میں لے لئے گئے ہیں مثلاً

رانومال रानोमाल راتورات रातोरात مدھومدھ मधोमध بھارو بھار भारोभार

تیرتھو تیرتھی तीर्थी तीर्थी تنتو تنت ततो तत

(۱۵) فارسی میں بعض ایسے حروف اور الفاظ ایسے ہیں جو اسما کے شروع میں آتے ہیں اور اُن کی ترکیب سے یہ الفاظ یا تو منفی صفات یا منفی اسماے صفات بن جاتے ہیں مرہٹی میں بھی یہ حروف و الفاظ اسی طرح استعمال

ہوتے ہیں مثلاً

بے — बेताल بے تال — बेडौल بے ڈول — बेढब بے ڈھب — बेडर بے ڈر

बेचव بے چو — बे समज بے سمجھ — बेधड़क بے دھڑک — बेदरकार بے درکار

نا — नापत ناپت — नापीक ناپیک — नाकर्ते ناکرتے — नासमजूत ناسمجھوت — नासमज ناسمجھ

غیر — गैरसोय غیرسوے — गैरसमजूत غیرسمجھوتہ — गैरचाल غیرچال — गैररीत غیرریت

गैरमनुष्य غیرمنش — गैरसमज غیرسمجھ

لیکن عموماً اس قسم کے فارسی مرکب الفاظ بجنسہ مرہٹی میں مستعمل ہوگئے ہیں کہیں کہیں تلفظ میں کچھ فرق ہوگیا ہی یا بعض اوقات معنی میں بھی خفیف سا فرق پیدا ہوگیا ہے مثلاً

कम कुव्वत کم قوت — कमअक्कल کم عقل — बेलाशक بیلاشک (بلاشک)

बे अक्कल بے عقل — कंबख्त کم بخت، नालायक نالایق — बेमान بے ایمان — गैरवाजवी غیرواجب وغیرہ

(۱۶) مرہٹی میں بعض الفاظ ایسے بھی پائے جاتے ہیں کہ فارسی لفظ کے آخر میں سنسکرت علامت ونت یا وان لگادی گئی ہے مثلاً

नशीबवान نصیب وان — अक्कलवान عقل وان — दौलतवान دولت وان

गरजवंत غرض ونت — अक्कलवंत عقل ونت — किंमतवान قیمت وان۔

عقل مند کے معنی فارسی میں عقل والے کے آتے لیکن مرہٹی میں اُس شخص کو کہتے ہیں جس میں عقل کم ہو، یہاں غالباً مند وہی لفظ ہی جو ہندی میں مندا ہی۔

(۱۷) اسی طرح سے مرہٹی علامت ئیشر یا وا ئیک فارسی عربی الفاظ کے آخر میں آتی ہے مثلاً

तऱ्हेवाईक طرح وائک (عجیب وغریب) مزے شیر (مزیدار) ہوا شیر (ہوادار) قاعدے شیر

(۱۸) اسی طور پر فارسی الفاظ کے آخر میں اسم کیفیت بنانے کے لئے مرہٹی علامت پنا لگادیتے ہیں جیسے

پاجی پنا، سفید پنا، نرم پنا وغیرہ

(۱۹) سنسکرت میں تا بمعنی پن یا پنا آتا ہے مرہٹی میں فارسی صفت کلمہ کے آخر میں تا لگا کر اسم کیفیت

کے معنی پیدا کیے گئے ہیں جس کے معنی کمی کے ہیں مگر اس کی کوئی اور مثال مرہٹی میں نہیں ملتی۔

(۲۰) مرہٹی میں کثرت سے ایسے مرکب الفاظ پائے جاتے ہیں جن میں ایک لفظ فارسی عربی ہے۔ اور دوسرا مرہٹی مثال کے طور پر چند الفاظ ذیل میں لکھے جاتے ہیں۔

چِلّر خرچ، نظر چوک، بازار بھاؤ، انگ زور، عقل ڈاڑھ، اوماس تبرک (بمعنی بجبٹ۔ اوماس آزمایش کا بگاڑ ہی) انگ محنت، قاعدے پنڈت، چور گشت، رنگ محل، راج رستہ، نگدی (نقدی) مال، جنگم جندگی (مال منقولہ۔ جندگی یعنی زندگی) زمین آپتی، جن جاہر یا جگ جاہر (جاہر یعنی ظاہر)

(۲۱) علاوہ اس کے کثرت سے ایسے فارسی مرکب الفاظ مرہٹی میں پائے جاتے ہیں جو خاص اغراض و معانی کے لئے مرہٹہ اہل زبان نے وضع کئے ہیں اور فارسی میں ان معنوں میں استعمال نہیں ہوتے وہ صرف مرہٹی کے لئے مخصوص ہیں۔

ذیل میں کچھ الفاظ اسی قسم کے لکھے جاتے ہیں۔

زمین سررشتہ یعنی (زمین کا لگان) قرض بازاری (جس پر بازار میں ہر جگہہ قرض ہے) کلم قسائی (یعنی قلم سے دوسروں پر ظلم کرنے والا) کلم بہادر۔ کاغذی جوان (دُبلا پتلا) خریدی خط (دستاویز خرید) زمین کتبہ (دستاویز زمین) سرکار جمع (سرکار میں ضبط) بازار بنگاہ (بیکار لوگ۔ جو لڑائی کے کام کے نہیں) غیر مرجی (غیر مرضی بمعنی خفگی) بکھیڈلال (قضیہ دلال بہ معنی لڑاک، جو ہر ایک سے لڑتا ہے)۔

(۲۲) بہت سے ایسے مرکب الفاظ ہیں جن میں ایک لفظ فارسی ہے اور دوسرا مرہٹی مگر ایک دوسرے کے مترادف ہیں اس قسم کے الفاظ کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں مثلاً

علاج اُپائے، کاٹ کسر، کوٹ قلعہ، خط پتر، خُبر باتی، گلی کوچہ، کھیل تماشا، چیز وبست، تو ند زبانی، ٹھانگ پتہ، دانہ غلّہ، دولت سمپتی، دھن دولت، دھندا روزگار، نیائے انصاف، پرانت ملک، پانڈرا سفید۔ پیوَلا زرد فوج سشبندی، بل زور، بازار ہاٹ، بھیڑ روت، بھیٹ ملاکھت (ملاقات) مرد مانوس (بہادر آدمی) مگن مست، معمول وہیواٹ، مول مزدوری، ریت رواج، وگ وسیلہ، واٹ رستہ، ویل وقت، وچار مسلت (مصلحت)، شادی پرادا، سینھی سوہتی (صحبت) سردار مانکری،

(۲۳) اسی طرح مرہٹی میں ایسے مرکب الفاظ بھی بکثرت مستعمل ہیں جن میں ایک فارسی دوسرا عربی ہے اور دونوں معنیً مترادف ہیں مثلاً

عقل ہوشیاری، آبرو عزت، ایمان اعتبار، علم دنیا (عالم) عیش آرام، ظلم زبردستی، زور زبری، نشان پتہ، فند فتور، فصل ہنگام، بندہ غلام۔

(۲۴) بعض ایسے دو لفظی مرکب الفاظ بھی پائے جاتے ہیں جن میں ایک دوسرے کی ضد ہے ان میں یا تو دونوں عربی فارسی ہوتے ہیں یا ایک مرہٹی اور دوسرا عربی یا فارسی۔ مثلاً

کم جاست (زیادہ) کم پیش (بیش)، جمع خرچ، زمین آسمان، جاب سال (جواب سوال) تیزی مندی، نفع ٹوٹا، نفع نقصان، نرمادی، بحالی برطرفی، نرم گرم، زنانہ مردانہ،

(۲۵) مرہٹی زبان میں کثرت سے ایسے محاورات یا مرکب مصادر پائے جاتے ہیں جو فارسی محاورات یا مرکب مصادر کا لفظی ترجمہ ہیں۔ بلکہ اکثر اوقات اصل لفظ وہی رہنے دیا ہے اور صرف مصدر کا ترجمہ کر دیا ہے یہ بھی ایک قوی ثبوت فارسی اثر کا ہے ذیل میں اس قسم کے الفاظ بطور مثال کے درج کئے جاتے ہیں۔

قسم خوردن	शपथ खाणें	دوستی داشتن	दोस्ती ठेवणें
بانگ زدن	हांक मारणें	تہمت زدن	तोहमत घेणें
یادداشتن	आठवण राखणें	صحبت داشتن	सोबत ठेवणें
خالی کردن	खाली करणें	کلید دادن	किल्ली देणें
راہ دادن	रस्ता देणें	پشتک زدن	उडी मारणें
معاف کردن	माफ़ करणें	منع کردن	मना करणें
ہلّہ کردن	हल्ला करणें	زیر کردن	ज़ेर करणें
رد کردن	रद्द करणें	بمیدان آوردن	मैदानान्त आणणें
جمع شدن	जमा होणें	کمر بستن	कमर बांधणें
بازو گرفتن	बाज़ू धरणें	ناخن گرفتن	नखें काढणें

ظاہرساختن	ज़ाहीर करणें
زبرشدن	जबर होणें
دست دادن	हात देणें
دم درکشیدن	दम घेणें
تعلیم دینے	तालीम देणें
دغا دینے	दगा देणें
دغا کھانے	दगा खाणें
درواسنے	
درخواست کرنے	दरखास्त करणें·
دہشت کھانے	दहशत खाणें
داد گھینے	दाद घेणें
دعا دینے	दुआ देणें
درست کرنے	दुरुस्त करणें
نقل کرنے	नक्कल करणें
نظربند کرنے	नजरबंद करणें
نظر لاگنے	नज़र लागणें
نمود کرنے	नमूद करणें
نصیب سکندر اسنے	नसीब सिकंदर असणें·
نقشہ کاڑھنے	नकाशा काढणें·
(انصاف مانگنے) نیائے مانگنے	इनसाफ मागणें· न्याय मागणें·
نیست نابود کرنے	नेस्त नाबूद करणें·

پتہ لاونے	पता लावणें
پائمالی کرنے	पाय मल्ली करणें
پانڈہریاور کالے کرنے	मांढऱ्यावर काळे करणें·
فرق پڑنے	फरक पडणें·
فارخط ہونے	फारकत होणें·
فکر کرنے	फिकर करणें·
آبرو راکھنے	अब्रू राखणें·
اندازہ کرنے	अंदाजा करणें·
امانت رکھنے	अमानत ठेवणें·
امید کرنے	उमीद करणें·
قرض گھینے	कर्ज घेणें·
کسر کاڑھنے	कसर काढणें·
قابض کرنے	काबीज करणें·
قابوت آننے	काबूत आणणें·
(قلعہ) سر کرنے	(किल्ला) सर करणें
خراب کرنے	खराब करणें·
خریدی کرنے	खरीदी करणें·
چاکری کرنے	चाकरी करणें·
زمین دوست کرنے	जमीन दोस्त करणें·
زمین آسمان ایک کرنے	ज़मीन आसमान एक करणें·
جادو کرنے	जादू करणें

زور کرنے	जोर करणें	فتور کرنے	फितूर करणें
زور لاونے	जोर लावणें	ماہیت کرنے	माहित करणें
تقاوا کرنے (تقاضا)	तकाजा (तगादा) करणें	ملاما دینے (ملمع)	मुलामा देणें
تلوار چالونے	तलवार चालवणें	لاچار ہونے	लाचार होणें
تعاقب کرنے	ताकूब करणें	شابوت اسنے یا ثابوت اسنے	शाबूत (साबूत) असणें
تازہ کرنے	ताजे करणें	شابت کرنے (ثابت)	साबित असणें
تلاش کرنے	तलाश करणें	سفارش کرنے	सिफारिश करणें
تعلیم کرنے	तालीम करणें	حق لاونے	हक्क लावणें
فکر لاگنے	फिकर लागणें	حکم کرنے	हुकुम करणें

(۲۶) جدید خیالات یا قانونی اصطلاحات وغیرہ کے اظہار کے لئے یا تو فارسی عربی الفاظ لے لئے گئے ہیں یا عربی فارسی کی امداد کی امداد سے نئے الفاظ وضع کئے گئے ہیں۔ ذیل میں اس قسم کے الفاظ درج کئے جاتے ہیں جن کا مطالعہ دلچسپی اور فائدہ سے خالی نہوگا۔ اُردو کے اہلِ زبان غور کریں کہ مرہٹے تو ان جدید الفاظ و اصطلاحات کو فارسی عربی الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر کرتے ہیں اور ہم ابھی تک انگریزی الفاظ کے دلدادہ ہیں۔

توضیح	مرہٹی لفظ اُردو تحریر میں	مرہٹی	انگریزی
فطری حق	نے سرگِک حق	नैसर्गिकहक्क	
اقبال یا اقبالی جواب	قبولی یا قبولی جباب	कबूली ; कबूली जबाब	
	مقطعہ	मक्ता	
سرزور	شرزور	शिरजोर	
قانون انعقاد مجالس	سبھا بندی چا قاعدہ	सभाबंदी च्या कायदा	
قانون اسلحہ	ہتیار چا قاعدہ	हत्यारांचा कायदा	
آئینی	سند شیر	सनद शीर	

توضیح	مرہٹی لفظ اردو تحریر میں	مرہٹی	انگریزی
قانونی یا از روئے قانون			
مطابق قانون	قاعدے شیر	कायदेशीर	
تعمیل وصیت	عمل بجاونی	अमल बजावणी	
انتظامی سررشتے	عمل بجاونی کھاتے	अमल बजावणी खाते	
خودغرض	آپ مطلب	आप मतलब	
دستاویز انعام	انعام پتر یا انعام خط	इनाम पत्र: इनाम खत	
	یک طرفی فیصلہ یا یک طرفی انصاف	एक तर्फी फैसला या एक तर्फी निकाल	
وہمی بہ معنی مشتبہ ہی	وہمی پڑھاری	वहमी पुढारी	
	قبولایت	कबूलायत	
بہت ہشیار وکیل	قاعدے پنڈت	कायदे पंडीत	
قانونی شخص	قاعدے باز	कायदे बाज	
	ضامن	जामीन	
گوشوارہ حلیہ	چہرے پٹی	चेहरे पट्टी	
	جمع بندی	जमाबंदी	
ظاہر سے ہے	جاہرات	जाहिरात	
ضمانت نامہ	ضامن کتبہ	जामीन कतबा	
	ضلع	जिल्हा	
مستقل-ثابت قدم	ٹیک دار	ठेकदार	
قید محض	نظر قید	नजरकैद	

توضیح	مرہٹی لفظ اُردو تحریر میں	مرہٹی	انگریزی
قید بامشقت	سخت مزوری چی شکسا	सक्त मजूरीची शिक्षा	
نقد لگان	نقدی شرستہ	नगदी शिरस्ता	
مقدمہ	فریاد۔ دعویٰ	फिर्याद : दावा	
مقدمہ دائر کرنا	فریاد لاؤنی دعویٰ لاؤنی	फिर्याद : दावा लावणें	
تبادلۂ اشیاء	پھیر بدل : پھیر بدلی	फेरबदल : फेर बदली	
مبادلہ	پھیرمو بدلہ	फेर मो बदला	
عیّار	مصلتی (مصلحتی)	मसलती	
شاہراہ عام (شارع عام)	راج رستہ	राजरस्ता	
سیاسیات (پالیٹکس)	راج کارستہان	राजकारस्थान	
مسلسل عبارت (جو فقرے فقرے الگ نہ ہو)	لگت مذکور	लगत मजकूर	
امر یا (امر زیر بحث)	مدّا (مدعا)	मुद्दा	
مطلق العنان	ظلمی	जुलमी	
بلا وجہ	ناحق	नाहक	
جوش۔ مردانہ پن۔ غیرت۔ جمعیت	مردانی پنا	मर्दानीपणा	
	کھچی کرنے (خصّی)	खच्ची करणें	
	گمان	गुमान	
غیر ذمّہ دارانہ طور پر	بگیان پنانے	बेगुमान पणानें	
	خاطر۔ پرواہ	खातर पर्वा	
	کارخانہ	कारखाना	

انگریزی	مرہٹی	مرہٹی الفاظ اُردو تحریر میں	توضیح
	प्रांतिक सरकार	پرانتک سرکار	صوبہ واری حکومت
	हिंदुस्थान सरकार	ہندوستان سرکار	حکومت عالیہ
	सरकार	سرکار	حکومت
	बेदरकार	بے زواب دار (زواب یعنی جواب)	غیر ذمہ دار
	जलूम, जुलमी पद्धती चें राज्य	ظلمی پدھتی چے راج یا ظلم	مطلق العنان حکومت
	जुलूम	ظلم	
	दडपशाही	ڈرپ شاہی	استبدادی حکومت
	सफेदी	سفیدی	مکان یا دیواروں پہ سفیدی کرنا
	जुलमी	ظلمی	ظالم
	जुलमी अधिकारी वर्ग	ظلمی ادہی کاری ورگ	جابر جماعت عہدہ داران
	रद्द करणें	رد کرنے	
	गुलामगिरी	غلام گیری	غلامی
	दुवा देणें	دعا دینے	
	इशारत	اشارہ	
	जाहिरनामा	جاہرنامہ	اعلان
	राजकीय हक्क	راجکی حق	سیاسی حقوق
	जबाबदारी	زوابداری	ذمہ داری
	सक्ती	سکتی	سختی

انگریزی	مرہٹی	مرہٹی لفظ اُردو تحریر میں	توضیح
	फायदा घेणे	فائدے گھنے	فائدہ اُٹھانا یا حاصل کرنا
	हक्क	حق	
	जुलमी सत्ता	ظلمی ستّا	ظالمانہ حکومت
	मुत्सद्दी	متصدی	مرہٹی میں اس کے معنی مُدبّر و پالیٹیشن کے ہیں
	खुषमस्करे ; खुशामते	خوش مسخرے۔ خوشامتی	خوشامدی
	सरकारी कायदा	سرکاری قاعدہ	قانون ملک
	जबानी	زبانی	شہادت
	साक्ष	شاہدی	شاہد
	जबाब	زواب (جواب)	اظہار
	बादशाही अंमल	بادشاہی عمل	حکومت شاہی
	राज्यकारभार	راج کاربھار	انتظام سلطنت
	आप मतलबी पणा. अप्पलपोटेपणा	آپ مطلبی پنا	خودغرضی
	लश्करी सत्ता	لشکری ستّا	فوجی قوت
	दहशत बस विण्याकरितां केले लें कायदे	دہشت بسونیا کرتا کے لیں قاعدے	رُعب داب بٹھانے کا قانون
	वहिमी	وہمی	مشتبہ
	सलामी	سلامی	
	सरकत वांटणी	شرکت واٹنی	مشارکت
	नफा तोटा	نفع ٹوٹا	نفع نقصان

انگریزی	مرہٹی	مرہٹی لفظ اردو تحریر میں	توضیح
	फौजदारी	فوجداری	
	दिवाणी	دیوانی	
	मुल्की खाते	ملکی کھاتے	محکمہ مالگزاری
	फैसला	فیصلا	فیصلہ
	वकीलपत्र	وکیل پتر	وکالت نامہ
	सुलतानी अंमल	سلطانی عمل	حکومتِ جور
	हद्दपारी	حدّپاری	عبور دریائے شور
	जहर फळें	زہر پھلے	میوۂ تلخ
	मुत्सद्दे गिरी	متصدی گری	تدبّر۔ مدبّری
	रयत वारी पद्धत	رعیت واری پدّت	رعیت واری طریقہ
	जमीनदारी पद्धत	زمینداری پدّت	زمینداری طریقہ
	कायमधारयाची पद्धती	قایم دھارے چی پدّت	طریقۂ بندوبستِ استمراری
	अमलदार	عملدار	عہدہ دار
	हक्कशीर, हक्कदार	حق دار	
	गैरसनदी	غیر سندی	غیر آئینی
	संरक्षक जकात	سنور کشک جکات (زکوٰۃ)	محصول
	सवल तीची जकात	سولتی چی جکات (زکوٰۃ)	میونی سپلٹی (محکمہ صفائی)
	शहर सफाई खाते		
	वर्गणीदार	ورگنی دار	چندہ دہندہ
	सरकार जमा	سرکار زما	زما یعنی جمع۔ ضبط سرکار
	नामदार	ا،ا،ا	

توضیح	مرہٹی لفظ اُردو تحریر میں	مرہٹی	انگریزی
	نیک نامدار	नेकनामदार	
یجسلیٹو کونسل (مجلس وضع قوانین)	قاعدے کونسل	कायदे काउन्सील	
غیر ذمہ دار	بے درکار	बे दरकार	
پولیس تعزیری	زیادہ پولیس	जादा पोलिस	

(۲۷) فارسی عربی کے بہت سے ایسے لفظ ہیں جو مرہٹی میں مستعمل تو ہیں مگر اُن کے معنوں میں کم وبیش فرق آگیا ہے مثال کے طور پر ایسے لفظ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

अगर	اگر	مرہٹی میں اگر کے معنی یا کے آتے ہیں
अद्ल	عدل	مرہٹی میں اس کے معنی "سبق ملنے" عبرت حاصل ہونے یا خفیف سی سزا کے ہیں
अमदानी	آمدانی	مرہٹی میں اس کے معنی عہد یا زمانہ کے ہیں جیسے عہد مغلیہ وغیرہ
इतराजी	اتراجی	یعنی اعتراض۔ ناخوشی کے معنوں میں آتا ہے
इभ्रत	عبرت	بمعنی اثر۔ اعتبار
इभ्रतदार	عبرت دار	صاحب اثر
इमला	املا	بمعنی عمارت، شاید یہ وہی لفظ ہے جو اُردو میں اَملا ہے
इरसाल	ارسال	بمعنی عمدہ بہترین۔ شاید یہ معنی اس وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں کہ جو چیز بھیجی جاتی ہے وہ اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے اسی طرح سے اردو میں "تحفہ" کے معنی اعلیٰ درجہ کی شے کے ہو گئے ہیں۔
उमेदवार	امیدوار	بمعنی نوجوان غالباً اس لئے کہ امید زیادہ تر نوجوانی کے ساتھ ہے اور امیدوار اکثر نوجوان ہوتے ہیں۔
कतबा	کتبہ	بمعنی دستاویز

कज़ाग	قزّاق	سرکش
कारस्थान	کارستھان	منصوبہ
किफायत	کفایت	فائدہ، تجارتی نفع، چونکہ کفایت کا نتیجہ فائدہ ہوتا ہی
खलबत	خلبت	یعنی خلوت، راز کی بات چیت
खास	خاص	بلاشبہ، یقیناً
खाशी	خاشی	خاص یا خاصا سے بمعنی خوب، شاباش
खुलासा	خلاصہ	بمعنی تشریح و توضیح (اردو و فارسی کے معنی کی ضد)
खुशाली	خوش حالی	
गप	گپ	خاموش
गिल्ला	گِلّہ	سخت شکایت
चमन	چمن	راحت و عیش
छान	چھان	یعنی شان، خوبصورت اور دلکش کے معنوں میں آتا ہے
जहाँबाज़	جہاں باز	یعنی جاں باز بمعنی سرکش سرزور
जालिम	جالم	یعنی ظالم بمعنی تیز، گلو سوز، عموماً دواؤں وغیرہ کے لئے استعمال ہوتا ہی ظالم کے معنوں میں مرہٹی میں ظلمی استعمال ہوتا ہی
जिकीर	جیکر	یعنی ذکر، مرہٹی میں اس کے معنی بیزاری کے ہیں یعنی جس کا بار بار ذکر کیا جاتا ہی اس سے جی بیزار ہو جاتا ہی
जिंदगी	جندگی	معاشی جائداد
जिनगी	جنگی	معاشی جائداد
जिंदगानी	جندگانی	معاشی جائداد
जिनगानी	جنگانی	معاشی جائداد

तजबीज	تزویز	تدبیر، انتظام، مداوا
तमाशा	تماشا	مرہٹی میں لڑکے کے ناچ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔
तुफान	طفان	موے کے معنی میں مستعمل ہے
दर्दी	دردی	یہ لفظ درد سے ہے مگر ماہر فن کے معنون میں آتا ہے اس لئے کہ کسی چیز کا درد اسی کو ہوتا جو اُسے سمجھتا بھی ہے
दसखत·दस्तक	دستخط، دستک	دستخط سے بمعنی پروانہ، پروانہ راہ داری، گورمنٹ کی طرف سے چنگی کی معافی
दाखल	داکھل	یعنی داخل اس کے معنی فرض کرلئے جانے کے ہیں
दाखला	داکھلہ	داخلہ، مثال، توضیح، مشاہدہ
दानत	دانت	دیانت سے اخلاقی خوبی
दावण	داون	یعنی دامن، ایک قطار میں باندھنا (جیسے مویشیوں کو)
पन्हा	پنھا	یعنی پہنا، کپڑے وغیرہ کا عرض
पर	پر	رُواں
परागंदा	پراگندہ	وہ لوگ جنھوں نے اپنا وطن ترک کردیا ہے۔
पसंत	پسنت	عمدہ، اچھا
पोक्त	پوکتا	یعنی پختہ بمعنی عمر رسیدہ آزمودہ اور دور بنی رائے اور مشورہ کے لئے بھی مستعمل ہے
फंद	فند	جھگڑا، بکھیڑا جیسے میں ایسے جھگڑوں یا بکھیڑوں میں نہیں پڑتا
फर्मास	فرماس	(فرمائش) عمدہ، نفیس
फाजील	فاجیل	فاضل آگے آگے، پیش پیش، اس میں ہمیشہ ذم کا پہلو ہوتا ہے
फेरिस्ता	پھرستہ	فرشتہ، مسافر

नादार	نادار	
नामदार	نامدار	کونسل کے آنریبل ممبر
नामोहरम	ناموہرم	نامحرم۔ کشتہ جنگ۔ غالباً یہ نامحروم ہے۔ جیسے عوام بجائے محروم کے استعمال کرتے ہیں۔ مرہٹی میں اس کے خاص معنی ہو گئے ہیں
निखालस	نکھالس	نخالص، بمعنی خالص
नेक नामदार	نیک نامدار	رائٹ آنریبل
मख्खी	مکھّی	مخفی، خاص بات
मजलीस	مجلس	ناچ رنگ اور تماشے کا مجمع
मतलब	مطلب	غرض
मतलबी	مطلبی	خودغرض
मातबर	ماتبر	معتبر، دولت مند
मातबरी	ماتبری	معتبری، اہمیّت
मामलत	ماملت	معاملت، اہمیت
मायना	مائنہ	معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ عنوان سے بگڑ کر بنا ہے اس کے معنی مرہٹی میں القاب و مزاج پُرسی کے ہوتے ہیں جو خط کے ابتدا میں لکھتے ہیں۔
मिस्कीन	مسکین	بدمعاش
मुकद्दम	مکادم	مقدّم، مزدوروں کی جماعت کا سردار
मुबलक	مبلک	مبلغ، بہت، کثیر، جاندار و بیجان دونوں کے لئے مستعمل ہے
मुभा	مبھا	مُباح، اجازت
मोहरा	مُہرہ	فوج کے حصّہ ہراول کا سردار
मौज	موز	موج، لطف، مزہ، تماشا

यंदा	یندہ	آیندہ، سال رواں
यादी	یادی	یاد
रद्दबदली	ردبدلی	ردّوبدل، شفاعت یا سفارس (کیونکہ سفارش طرفین سی کچھ کہنا سننا پڑتا ہی)
रग	رگ	تکبّر تجبّر
वस्ताद	دستاد	اُستاد، ہوشیار، کامل، اُستادِ فن (معلّم کے معنی میں نہیں آتا سوائے گانے، ناچنے، اور ورزش وغیرہ کے معلّم کے)
वासलात	واصلات	کسی معاملہ کا آخری تصفیہ
शर्यत	شریت	بمعنی دور، مسابقتہ
शिकस्त	شکست	انتہائی کوشش
शिक्का	شکّا	سکّہ مُہر وغیرہ کا نقش یا چھاپ
सद्दीचा जोर	سدّی چازور	اقبال
समई	شمئی	شمع، فتیلہ سوز (پیتل کا بنا ہوا)
सुमार	شمار	شمار، تخمیناً یا طرف
सईल	سئیل	سہل، ڈھیلا
हमी	ہمی	ذمہ داری۔ غالباً یہ لفظ اہم یا اہمیت کا بگاڑ
हलाख	ہلاکھ	بہت کم زور
हलाखी	ہلاکھی	کمزوری۔ناتوانی
हाल	حال	جسمانی یا روحانی تکلیف
हिकमत	حکمت	ترکیب
हिमायत	حمایت	قوت
हैवान	حیوان	کم زور

हौस ہاؤس ہوس، خواہش، شوق، (اسمیں ذم کا پہلو کبھی نہیں ہوتا)

(۲۸) ضرب الامثال قوم کے حقیقی خیالات اور خصائص کو ظاہر کرتی ہیں اور اُن کی زبان بھی ٹھیٹ ہوتی ہے ذیل میں ہم کچھ مرہٹی ضرب الامثال لکھتے ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ اُن میں فارسی الفاظ کس بے تکلفی سے استعمال کیے گئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فارسی کا اثر مرہٹی زبان میں کہاں تک سرایت کرگیا تھا۔ اس میں بعض فارسی ضرب الامثال کا ترجمہ ہیں۔ فارسی عربی الفاظ پر خط کھینچ دیا گیا ہے۔

فہرست ضرب الامثال

ضرب المثل	
(۱) ज्याला नाहीं अक्कल , त्याची घोोधीं नक्कल	عقل۔نقل
(۲) आधीं जाते अक्कल , मग जाते भांडवल	عقل
(۳) खुदा रंजीस , मशीद रंजीस	خدا رنجس (رنجیدہ) مشد (مسجد) رنجس
(۴) मारा साची हिंमत , खुदाचीमदत	
(۵) जशी नीयत ,तशी बरकत	
(۶) मिया बीबी राजी काय करील काजी	
(۷) मिया मूठ भर , दाढी हात भर	
(۸) चोर तो चोर आणि शिरजोर	سرجور (سرزدار)
(۹) धन्याला धत्तूरा चाकराला मलीदा	چاکر

(१०) धन्याचें नांव गण्या चाकरांचें नांव रुद्राजी बुवा

(११) जुलमाचा रामराम — ظلم

(१२) तेली जमवी धारोधार, खुदा ने तो एकच बार — جمعی (جمع) — خدا - بار

(१३) गरजवंताला अक्कल नाहीं — گرج ونت (غرض مند)

(१४) कसायाला गाय धार्जिणी — قصائی

(१५) हलवायाचे घरावर तुलसी पत्र — حلوائی

(१६) साधली तर शिकार, नाहीं तर भिकार — شکار

(१७) घोड़ा मैदान जवळ आहे· — میدان

(१८) चुकला फ़कीर मशीदींत — فقیر

(१९) ताज्या घोडया वरच्या गोमाशा — تازہ

(२०) आजा मेला नातू झाला जमा खर्च बरोबर· — جمع خرچ برابر

(२१) आदा पाहून खर्च करावा — خرچ

(२२) एक नूर आदमी दसनूर कपड़ा — ایک نور آدمی دس نور کپڑا

(२३) कर्ज फार त्याला लाज नाहीं, उवा फार त्याला खाज नाहीं· — قرض

(२४) करणी कसाबाची, बोलणी मानभावाची

(२५) हातापायाची काहिली, तोंडात काय जाईल

(२६) करणी कैफती, आंधळी हिकमती — کیفیتی حکمتی

(२७) पायींची वहाण, पायींच छान — جہاں (شان)

(२८) शहाण्याचें व्हावें चाकर, पण मूर्खाचें होऊं नये धनी — چاکر

(२९) आपला दाम खोटा, दुसऱ्याशीं का झगडा ? — دام

(३०) दुरून डोंगर साजरे

(३१) तोंड पाहून मुशारा, घोडा पाहून खरारा. — مشارا (مشورہ)

(३२) उपर से खूब बने, अंदर का राम जाने — کھوب (خوب)

(३३) चाकराला चुकर, चुकराला येस कर

(३४) दाम करी काम — دام

(३५) हाजर तो वजीर

(३६) कोल्हा काकडीला राजी — راجی (راضی)

ضرب المثل نمبر ۱۷ فارسی کی اس ضرب المثل کا لفظی ترجمہ ہے ہمیں میداں ہمیں گوے۔

نمبر ۲۴ فارسی کی ضرب المثل ہمتِ مرداں مددِ خدا کا لفظی ترجمہ ہے (مانساچی ہمت خداچی مدت)

ضرب المثل نمبر (۳۵) حاجر (حاضر) تو وزیر

چکلا فقیر مشدیت (مشد یعنی مسجد) - اُردو - مُلّا کی دوڑ مسیت تک

(نمبر ۶) میاں بیوی راجی (راضی) کاے کریل کاجی (قاضی) مشہور مثل ہے

(نمبر ۷) جسی نیت تسی برکت (معنی ظاہر ہیں)

(نمبر ۸) چور تو چور آنی سرزور (یعنی چوری اور سینہ زوری)

(۲۹) خفی ابتدا میں یہ لکھ چکا ہوں کہ دفتری کاروبار میں فارسی، عربی الفاظ بکثرت استعمال ہوتے تھے اس کا ایک ثبوت ان خطابوں سے بھی ملتا ہے جو ہندوؤں نے وقتاً فوقتاً اپنے امیروں اور سرداروں کو عطا کئے مثلاً راجہ رام (۱۶۸۹ء تا ۱۷۰۰ء) شیواجی کے فرزند ثانی نے اپنے برہمن وزیر رام چندر پنت اماتیہ کو "حکومت پناہ" کا خطاب عطا فرمایا۔ اس کی اولاد اب تک کولھاپور ریاست میں اس خطاب و جاگیر کے ساتھ ممتاز ہے۔

اسی راجہ نے ایک سردار اداجی چوہان کو "ہمت بہادر" اور "مملکت مدار" کا خطاب دیا۔

سنتاجی گھورپڑے کو "ضبط الملک" کا خطاب ملا - یہ ایک بڑا بہادر مرہٹہ سردار تھا اور جب راجہ رام کو جنجی کے قلعہ میں مغلوں نے محصور کر لیا تھا تو اس نے اور دھناجی جادھو نے مغلوں کو بہت کچھ ستایا تھا۔

سنتاجی پانڈھرے کو اسی راجہ نے "شرف الملک" کے خطاب سے ممتاز کیا۔

کھانڈوجی یکم کو "شمشیر بہادر"، ایک دوسرے مرہٹہ سردار کو "ہمت راؤ"، ہیبت راؤ نمبالکر کو "سرلشکر" - گھورپڑے کو "ہندو راؤ"، کھنڈے راؤ دبھاڈی کو "سنا خاص خیل" کے خطاب عطا کئے۔

اب سیواجی مہاراج کے خطابات ملاحظہ فرمایئے۔

اُس نے اپنے سپہ سالار ہنساجی موہیت کو "سرلشکر" کا خطاب عطا فرمایا۔

اپنے وزیر کو پیشوا کا مشہور خطاب دیا۔ اگرچہ ۱۶۷۴ء میں شاہی شان اختیار کرنے کے بعد یہ خطاب بدلدیا گیا مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد اُس نے پھر عود کیا اور شیواجی کی قوت بھی اُس کی مقبولیت کو نہ دبا سکی اور آجتک شیواجی اور اُس کے جانشینوں کے وزیر اسی نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ پنت پردھان کا لفظ جو اس کی بجائے قایم کیا گیا تھا اُس کے سامنے رونق نہ پا سکا۔

شیواجی کے اُن فوجی عہدہ داروں کو جو جنرل کا درجہ رکھتے تھے "سیناپتی" کا خطاب حاصل تھا۔ راجہ شاہو (۱۷۰۸ء تا ۱۷۴۹ء) نے بھی اپنے عہد میں اسی قسم کے مفصلہ ذیل خطابات عطا کئے۔

۱۔ گائیکواڑ بڑودہ کو "سینا خاص خیل" اور بعد ازاں ۱۷۲۱ء میں "شمشیر بہادر" کا خطاب عطا فرمایا۔ مہاراجہ گائیکوار اب تک ان خطابات کو فخر و عزت کے ساتھ اپنے نام کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔

۲۔ خاندان بھوسلہ (ناگپور) کے بانی کو "سینا صاحب صوبہ"

۳۔ انگریاؤں کو جو مرہٹہ حکومت کے امیر البحر اور ساحل کوکن کے امیر تھے "سرخیل" اور "وزارت مآب" کا خطاب ملا۔

۴۔ وٹھل شیودیو کو جو برہمن سردار تھا خطاب "راجہ بہادر"

۵۔ بابو راؤ دابھاڑے کو "سینا خاص خیل"

۶۔ دیواجی کو "ہندو راؤ" اور "سرلشکر"

۷۔ بسونت راؤ کو "خاص خیل"

اور اسی قسم کے بہت سے خطابات مختلف اشخاص کو دیے۔

اسی طرح اس امر کا بیان بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مسلمان فرماں رواؤں نے اگرچہ اپنے ہندو اُمراء کو فارسی خطابات بکثرت دیے ہیں لیکن اُن کی قومیت کے لحاظ سے کبھی کبھی سنسکرت خطابات بھی عطا کئے ہیں اس سے باہمی رواداری کا پتہ لگتا ہے۔ مثلاً شاہان بہمنی نے گھاٹگے خاندان کے سردار کو "سرجے راؤ" کا خطاب عطا کیا اسی طرح ابراہیم عادل شاہ بیجاپور نے ۱۶۲۶ء میں اسی خاندان کے سردار بالاجی گھاٹگے کو "زہن زار راؤ" کا خطاب[15] دیا۔ ۱۶۴۰ء میں ابراہیم عادل شاہ شیواجی کے خسر مودھوجی نبالکر کو نائک کا خطاب دیا گیا۔

شولاپور کے قریب سلطنت بیدر و بیجاپور میں جو لڑائی ہوئی اُس میں سے سدھوجی مانے نے کارنمایاں کیا اور ابراہیم عادل شاہ نے اُس کی بہادری سے خوش ہو کر اُسے "باجی" کا خطاب عطا کیا۔ اور اُس کے برہمن سکرٹری نرسوں کیسکر کو "شواسی راؤ" (معتمد راجہ) کا خطاب ملا۔

---

[15] گرانٹ ڈف نے اپنی تاریخ مرہٹہ میں لکھا ہے کہ یہ خطاب ناگوجی گھاٹگے کو دیا گیا تھا۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔

اورنگ زیب کی طرف سے ناگوجی مانے کو "راجہ" کا خطاب ملا۔ اور مورچھل مرحمت ہوا۔

۱۶۸۵ء میں اورنگ زیب نے رگھوناتھ کھتری کو "راجہ راے رایاں" کا خطاب عطا فرمایا۔

اسی شہنشاہ نے تلوک چند نامی ہندو کو "راجہ" اور "راے رایاں" کا خطاب مرحمت فرمایا۔ یہ خطاب اُسے اُس موقعہ پر ملا تھا جب کہ اُس نے پہاڑ سنگھ کو جو بادشاہ کے بیٹے اعظم شاہ کو ہلاک کرنا چاہتا تھا قتل کیا تھا۔

ہیمو کو اُس کے آقا نے "وکرماجیت" کا خطاب دیا تھا۔

عادل شاہ کے برہمن دفتردار کا خطاب "دیانت راؤ" تھا۔

۱۵۲۲ء میں نظام شاہ سلطان احمدنگر نے جنجیرہ کے رام پٹیل کو "اعتبار راے" کا خطاب اور چھتر اور نشان عطا فرمایا۔ یہ شخص احمدنگر آگیا۔ اور اس کے بعد مسلمان ہوگیا۔ یہ ذات کا کوئی (ماہی گیر) تھا۔ یہ چھتر اور نشان وغیرہ اب تک اس کے خاندان میں موجود ہیں (تاریخ جنجیرہ از بھوسلے)

جاؤلی (قریب مہابلیشور) کے خاندان مورے کو شاہان بیجاپور کی طرف سے "چندر راؤ" کا خطاب تھا۔

شاہ عالم نے مادھو راؤ ثانی کو "وکیل مطلق" کا خطاب عطا کیا تھا۔ اور مادھو راؤ سندھیا کو "عالی جاہ بہادر" اور "فرزند ارجمند" کا خطاب مرحمت ہوا تھا۔

"راجہ راؤ رمبھا" جادھو خاندان کے اس سردار کا خطاب ہے۔ جو ساہو مہاراج سے ناراض ہو کر مغلوں کے پاس آگیا تھا۔ یہ خطاب نظام الملک آصف جاہ اوّل نے عطا کیا تھا۔ یہ خاندان اب تک حیدرآباد دکن میں ہے۔

نظام علی خان بہادر نے نانا فرنویس کو "مدارالمہام" کا اور پیشواؤں کے برہمن جنرل ہری پنت پھڑکے کو "وزارت مآب" کا خطاب دیا۔

نظام علی خان بہادر نے اپنے وزیراعظم وٹھل سندر کو "راجہ پرتاب ونت" کا خطاب عطا کیا۔ یہ شخص مرہٹوں کے راکشس بھون میں (۱۷۶۳ء میں) لڑتے ہوئے مارا گیا۔

راجہ راے رایان کا خاندان اب تک حیدرآباد میں ہے۔ اور یہ خطاب بھی اسی سلطنت کا عطا کیا ہوا ہے۔ اس خاندان کے سردار وہاں کے اُمراے عظام میں سے ہیں۔

اسی طرح سرکار نظام کی طرف سے "دھرم ونت"، "آصف نوازونت" وغیرہ خطابات وہاں کے ہندو اُمرا کو

عطا ہوئے ہیں۔

اگرچہ یہ کسی قدر غیر متعلق ہے، لیکن اس کا معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہیں کہ جب اعظم شاہ نے کچھ آم اورنگ زیب کو نہیں بھیجے تو بادشاہ نے اُن کے نام "سدھارس" اور "رسنا ولاس" رکھے یہ دونوں نام ٹھیٹ سنسکرت کے دو لفظ ہیں۔

ذیل میں ہم شیواجی کے بڑے بڑے عہدوں کے نام درج کرتے ہیں ان کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوگا کہ جس وقت شیواجی مہاراج نے شاہی کا لقب اختیار کیا اور تاج پہنا، اس وقت ان عہدوں کے کیا نام تھے۔ اور تاج پوشی (۱۶۷۴ء) کے بعد یہ نام بدل کر کیا ہوگئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تاج پوشی کے بعد سے سیواجی مہاراج کے خیالات میں کیا تغیر پیدا ہوگیا تھا۔ اگرچہ یہ ایک معمولی سی بات ہے۔ لیکن انھیں معمولی باتوں سے انسان کی طبیعت اور اُس کے کاموں کا اندازہ ہوتا ہے۔

قبل تاج پوشی	بعد تاج پوشی	عہدہ کی تصریح
پیشوا	پنت پردھان	وزیر اعظم
موزمدار	پنت امتیا	معتمد مالگزاری، وزیر مالیہ و صدر محاسب
سورنس	پنت سچِو	صدر دفتر
واک نیس	منتری	پرائیویٹ سکریٹری
سرنوبت	سیناپتی	سپہ سالار
دبیر	سومنت	وزیر خارجیہ

ان کے علاوہ "پنڈت راؤ" وزیر امور مذہبی اور "نیا یادھش" چیف جسٹس کے عہدہ کا نام تھا۔ یہ نام تاج پوشی کے بعد تجویز ہوئے تھے۔ ان عہدوں کے نام سے صاف ظاہر ہے کہ قبل تاج پوشی تمام فارسی تھے اور اُس کے بعد بدل کر سنسکرت کر دیے گئے۔

موزمدار غالباً موازنہ دار اور "واک نس" واقعہ نویس ہے۔

اسی طرح ایک عہدہ پارسی نس تھا جو اصل میں فارسی نویس ہے۔ اور یہ بھی شیواجی مہاراج سے ۱۸۴۸ء تک ان کے خاندان میں ایک عہدہ تھا۔

(۳۰) دفتری، فوجی اور انتظامی معاملات وکاروبار سے نکلکر فارسی الفاظ معاشرت اور تمدن میں داخل ہوئے اور ان کی رسائی یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ اعلام یعنی اشخاص اور خاندانوں کے نام تک اُن کے اثر سے نہ بچ سکے ذیل میں ہم ایسے اعلام کی ایک مختصر فہرست درج کرتے ہیں۔

شیخ جی راؤ۔ کوکن کے ایک فرمانروا انگریا کا نام تھا۔

ہیبت راؤ۔ شیواجی کے ایک جنرل (سپہ سالار) کا نام تھا اور خطاب "سرلشکر" تھا۔

سرفوجی راؤ۔ یہ لفظ درحقیقت شریف جی ہے۔ مرہٹے اس کا تلفظ سرفوجی اور بعض انگریز مورّخ سربوجی تلفظ کرتے ہیں۔ یہ شاہ جی کے بھائی یعنی شیواجی کے چچا کا نام تھا۔ شاہ جی کے خاندان کی جو شاخ تنجور میں تھی اُس میں سرفوجی نام کے دو فرمانروا گزرے ہیں۔

شاہ جی۔ شیواجی کے باپ کا نام تھا۔ شیواجی کے خاندان کی جو شاخ کولھاپور میں ہے۔ اُس میں کئی راجوں کا نام شاہ جی تھا۔ حال راجہ کولھاپور کے ولیعہد کا نام بھی شاہ جی ہے۔

فتح سنگھ راؤ۔ حال مہاراجہ گائیکواڑ کے فرزند اکبر کا نام تھا جس کا چند سال ہوئے انتقال ہوگیا خاندان اکلکوٹ کے بانی کا نام بھی یہی تھا۔

سیاجی راؤ۔ ریاست بڑودہ کے کئی فرمانرواؤں کا نام سیاجی راؤ تھا یہ لفظ غالباً سیاح جی راؤ ہی ہے۔ سیاح نام کے ایک بزرگ گزرے ہیں جو مرشد مانے جاتے تھے۔

دولت راؤ۔ حال مہاراجہ سندھیا کا نام ہے۔ اس سے قبل بھی مہادوجی سندھیا کے بیٹے اور راجہ کا نام بھی یہی تھا۔ ان کے علاوہ ایسے بکثرت نام ہیں مثلاً "صاحب راؤ"، "سلطان راؤ"، دیانت راؤ، ہندو راؤ (گوالیار کے ایک سابق وزیر اعظم کا نام) جان راؤ، دریاجی راؤ ہیجب راؤ (حاجب راؤ) خاصے راؤ، نقیب راؤ، رستم راؤ، پیرجی راؤ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ان سب میں پُرلطف اور دلچسپ نام وہ ہے جو تنجور کے راجہ تلاجی راؤ نے جو شیواجی کے بھائی دیامنکوجی کی خاص اولاد سے ہے اور جس کی حکومت (۱۷۶۳ء سے ۱۷۸۶ء) تک رہی اپنے بیٹے کا رکھا تھا۔ یہ نام "عبدالپرتاپ راؤ" ہے۔

اسی طرح مرہٹے اور برہمن خاندانوں کے نام بھی ہیں۔ مثلاً پیشوا، وکنیس (واقعہ نویس) پھڑنس (فرد نویس) سرنِس (سرنویس)، کارکھانِس (کارخانہ نویس) چِٹ نِس (چٹ نویس) کوٹ نِس، فرزند، دفتردار، حوالدار، صرّاف مشرف، دیوان، خاصگی والا، صوبہ دار، سردار، سردیسائی، سردیسکھ، قلعہ دار وغیرہ وغیرہ

(۳۱) جس طرح خطاب اور اعلام تک فارسی کے زیر اثر آ گئے تھے اسی طرح خطوط میں آداب و القاب کا رنگ بھی فارسی آمیز تھا۔

دولت آباد کے شاہی خاندان یا دھو کے وقت کے خطوط مرہٹی زبان میں دستیاب نہیں ہوتے سنکرت کے ایک دو ڈراموں میں جو ایک ایکٹر نے دوسرے کو خط لکھے ہیں اُن میں آداب و القاب و مزاج پُرسی وغیرہ کچھ نہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ طریقہ بعد میں رائج ہوا۔

۱۶۵۶ء میں سلطنت ویجاپور کے برہمن دفتردار، دیانت راؤ نے شیواجی کے ایک وزیر نلوسوندیو موز مدار کو دو خط لکھے ہیں۔ اُن میں یہ القاب و آداب ہیں۔

١ अखंडित लक्ष्मी प्रसन्न परोपकार मूर्ति

२ सेवकें दियानतराव

پہلی سطر میں अखंडित लक्ष्मी प्रसन्न اور परोपकार मूर्ति فارسی الفاظ "دام دولتہ" اور "مشفق مہربان" کا لفظی ترجمہ ہیں ان کے بعد کے تین الفاظ معہ ترجمہ یہ ہیں۔

राजमान्य (مقبول دولت) राजश्री (صاحب گنج شاہانہ) गोसावी (قادر بر نفس خود)

دوسری سطر کا ترجمہ یہ ہوگا (بندہ دیانت راؤ" کی کورنش اور التجا)

یہ لفظ بندہ کا لفظی ترجمہ ہے۔ سنسکرت کے خطوط میں (بندہ) کا لفظ کبھی نہیں آیا اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ لفظ (بندہ) کا ترجمہ ہے۔

خط کے خاتمہ پر یہ الفاظ ہیں बहुत काय लिहिणे न लगे جن کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ "زیادہ چہ نویسم؟ حاجت نیست"

۲ اپریل ۱۶۶۳ء کو شیواجی نے اپنے پیشکار مورو ترمل کو ایک خط لکھا ہے اس میں

آداب و القاب کے تین لفظ ہیں۔ پہلا خالص عربی معلوم ہوتا ہے۔
مرہٹی میں "مسر الحضرت" ہے۔ شاید مشہور الحضرات[1] ہو۔ باقی دو لفظ وہی ہیں جو اس سے اوپر کے خط میں آچکے ہیں۔ فارسی الفاظ کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں خط کے آخر میں اس قسم کا کوئی لفظ نہیں لیکن تاریخ و سنہ خالص عربی الفاظ میں ہیں۔ "۴ رمضان ثلاثہ ستین"

اس زمانہ کا یہ عام قاعدہ تھا کہ تاریخ و سنہ عربی لکھتے تھے۔ یعنی اُن کے الفاظ بھی عربی ہی ہوتے تھے البتہ حروف جن میں یہ الفاظ لکھے جاتے تھے مرہٹی ہوتے تھے۔

۸ ستمبر سنہ ۱۶۷۱ء میں شیواجی تکارام صوبہ دار پربھاولی کو یوں لکھتا ہے۔
"مشہور الحضرات راج شری تکارام" خط کے خاتمہ پر سلام و آداب نہیں۔ صرف تاریخ ہے۔
۱۸۔ جنوری سنہ ۱۶۷۵ء کو شیواجی صوبہ دار پربھاولی جیواجی ونایک کو اس طرح لکھتا ہے۔
"مشہور الحضرات جیواجی ونایک صوبہ دار پربھاولی کو شیواجی کی ڈنڈوت"

سنہ ۱۶۷۴ء سے شیواجی کے خطوط کی شان دہلی کے شاہی فرامین کی سی ہوگئی تھی مثلاً شیواجی کا ایک خط جو ۲۰۔ جولائی سنہ ۱۶۷۷ء کو ناگوجی بھوسلے کے نام لکھا گیا ہے۔ اس طرح شروع ہوتا ہے۔

स्वस्ति श्री राज्याभिषेक शक ४ पिंगल नाम संवत्सरे श्रावण शुध ११ इंदुवासरे क्षत्रिय कुला-
वंतस श्री राजा शिव छत्रपति यांणीं नागोजी भोंसले कोट उढलू यासी आज्ञा केली ऐसीजे-

اس کا ترجمہ یہ ہے۔ سنہ جلوس ۴ (سال کا نام پنگل ہے) ۱۱ر تاریخ ماہ شراون (ساون) روز دوشنبہ فخر قوم چھتریان، سری راجہ شیو چھترپتی نے ناگوجی بھوسلے (قلعدار قلعہ اتلوار) کے نام حکم صادر فرمایا کہ:۔
احکام کی یہی شان شیواجی، راجہ رام، اور اُس کی اولاد میں (جو ستارا یا کولھاپور کی گدّی پر بیٹھے) سنہ ۱۸۴۸ء تک قایم رہی۔ اور یہ قریب قریب "فارسی شاہی فرامین" کی نقل ہے۔ اگرچہ شیواجی نے فارسی الفاظ نکالکر سنسکرت الفاظ قایم کئے تھے مگر تاہم وہ فارسی کے اثر سے نہ بچ سکا۔ جہاں الفاظ نہیں۔ وہاں اُن کا

---

[1] صحیح طور سے معلوم نہ ہوا کہ کس لفظ کا بگاڑ ہے۔

ترجمہ ہے۔ چنانچہ مرہٹی کا یہ جملہ فارسی کا پورا ترجمہ ہے۔ فارسی میں یوں کہیں گے

"اوراحکم فرمود کہ" यासी आज्ञा केली ऐसीजे

۱۱۔ مئی ۱۶۹۰ء کو راجہ رام اپنے وزیر نارو پنڈت کو یوں لکھتا ہے۔

स्वस्ति श्री राज्याभिषेक शके २७ प्रमोदी नाम संवत्सरे वैशाख शुध १४ भौम वासरे क्षत्रिय कुलावंतस श्री राजा राम छत्रपति यांणी समस्त राजकार्य धुरंधर विश्वास निधि राज्य मान्य राज श्री नारो पंडित यांस आज्ञा केली ऐसीजे

ترجمہ "سال جلوس ۲۷ تاریخ ۱۴ بدرماہ وشاک (بیساکھ) روز دوشنبہ، زینت قوم چھتریاں راجہ رام چھتری بہ نارو پنڈت کہ مدارمہات سلطنت و مخزن اعتماد کلی است، حکم می فرماید"

اس کے بعد اصل خط شروع ہوتا ہے۔ خاتمہ اس جملے پر ہے۔

बहुत काय तिहिरोंतरी सुज्ञ असा

جس کا ترجمہ یہ ہوا "زیادہ چہ نویسم؟ شما خود عاقل ہستید"

۲۶۔ جنوری ۱۷۴۵ء کو ساہو مہاراج بھگونت راؤ پنڈت اماتیے حکومت پناہ کو اس طرح تحریر کرتے ہیں

स्वस्ति श्री राज्याभिषेक शके ७१ रक्ताक्षी नाम संवत्सरे माघ शुध ५ मंद वासर क्षत्रिय कुलावंतस राजा शाहू छत्रपति स्वामी यांणीं समस्त राज कार्य धुरंधर विश्वास निधि राजमान्य राज श्री भगवंत राव पंडित अमात्य हुकूमत पन्हा यांसीं आज्ञा केली ऐसीजे -

ترجمہ "سال جلوس ۷۱ (رکتاشی) ۵۔ ماہ ماگھ، روز پنجشنبہ، زینت قوم چھتریاں سری راجہ شاہو چھتری چنیں حکم فرماید بہ مدارمہاتِ سلطنت و مخزن اعتماد و مقبول دربار شاہی بھگونت راؤ پنڈت اماتیا حکومت پناہ"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ خطوط کی طرز تحریر اور آداب والقاب میں شیواجی کی تاج پوشی کے بعد سے مرہٹہ حکومت کے آخر تک کوئی فرق نہیں آیا۔ کولھاپور کے راجہ بھی اسی طرز کا اتباع کرتے تھے

سنہ کا شمار شیواجی کی تاجپوشی کے سال یعنی ۱۶۷۴ء سے کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ مساوی مرتبہ کے اشخاص ایک دوسرے کو اپنے خطوں میں کون سے آداب و القاب سے یاد کرتے تھے۔

राजश्री पंत अमात्य स्वामी चे सेवेशी–

सकल गुणालंकरण अखंडित लक्ष्मी आलंकृत राजमान्य राजश्री स्नेहांकित संताजी घोरपडे सेनापति

जय उन्मुलूक दंडवत

ترجمہ۔ بخدمت عالیجناب پنت اماتیا۔ تمام عمدہ صفات و دولت جاوید سے آراستہ، مقبول حکومت صاحب گنجینہ شاہانہ سنتاجی گھوڑپڑے ضبط الملک و سپہ سالار کا سلام

خاتمہ خط "تاکید بداند"، تاریخ۔

یہ سب کے سب جملے فارسی کا لفظی ترجمہ ہیں۔ یہاں تک کہ "بخدمت" کا بھی لفظی ترجمہ مرہٹی میں کر لیا گیا ہے۔ رگھوجی بھوسلے بانیٔ خاندان ناگ پور، ساہو مہاراج کے ایک وزیر کو اس طرح لکھتا ہے (۷ جولائی ۱۷۴۳ء)

राजश्री कानेर राम मजमदार गोसावी यासी:–

मशहूल अनाम अखंडित लक्ष्मी अलंकृत राजमान्य स्नेो रघाजी भोसले सेना साहेब सुभा दंडवत

विनंति उपरी.

ترجمہ۔ بخدمت کونر رام موزمدار مشہور الانام، آراستہ بدولت جاوید، و مقبول دربار شاہی بندۂ دولت صاحب گنجینہ شاہانہ مہربان رگھوجی بھوسلے سینا صاحب صوبہ کو ڈنڈوت بھیجتا ہے اور التجا کرتا ہے۔

خاتمہ۔ زیادہ چہ نویسم؟ یہ درخواست

बहुत कायाले हीतों विनंति

جن الفاظ پر خط کھنچا ہوا ہے وہ لفظ اصل مرہٹی خط میں اسی طرح لکھے ہوئے ہیں۔

باجی راؤ اوّل بھگونت راؤ پنت اماتیہ حکومت پناہ کو یوں تحریر کرتے ہیں

सकल गुणालंकरण अखंडित लक्ष्मी आलंकृत राजमान्य राजश्री भागवन्तराव पंडित स्वामी गोसावी यांसी:-

पोष्य बाजीराव बल्लाल कृतानेक नमस्कार विनंति उपरिये थील कुशल जाणून स्वकीय कुशल लिहीत

असलें पाहिजे. विशेष.

ترجمہ۔ بخدمت آراستہ بہمہ صفات ودولت جاوید راجان، راج شری (مقبول بارگاہ شاہی صاحب گنجینۂ شاہانہ) بھگونت راؤ پنڈت قادر برنفس خود۔

منجانب باجی راؤ بالاجی بعداز سلام وکورنش بے شمار عرض مدعا یہ ہے۔ یہاں خیروعافیت ہے آپ کی خیروعافیت مطلوب۔

ان خطوط وفرامین سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مرہٹی مراسلت پر فارسی زبان کا کس قدر گہرا رنگ چڑھ گیا تھا تمام مثالیں خاص مرہٹے لوگوں کی خط وکتابت کی دی گئی ہیں ورنہ جہاں مراسلت مسلمانوں سے ہے وہاں جملے کے جملے اور فقرے فارسی کے ہیں۔

مرہٹی خط وکتابت میں اب سے دس پندرہ برس پہلے تک آداب والقاب اور مزاج پرسی وغیرہ کا وہی طریقہ جاری تھا جو ہندوستان میں فارسی یا اردو خط وکتابت میں تھا۔ یا اب بھی ہے۔ مثلاً "دام دولتہ"، بندہ، یہاں خیروعافیت ہے آپ کی خیروعافیت مطلوب وغیرہ لکھنے کا طریقہ عام طور پر رائج تھا۔

(۳۲) مرہٹے راجاؤں اور سرداروں کی مہریں بھی مسلمان بادشاہوں یا اُمرا کی مہروں کی نقل تھی۔ اوّل اوّل ان کی مہریں فارسی میں ہوتی تھیں لیکن شیواجی نے جب تاج پہنا۔ اور خودمختار راجہ کی حیثیت اختیار کی تو اور تبدیلیوں کے ساتھ مہروں میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی اور بجائے فارسی کے مرہٹی یا سنسکرت میں مہریں کندہ ہونے لگیں لیکن یہ تبدیلی بھی مثل دوسری تبدیلیوں کے جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں، صرف ظاہرا تھی۔ ان مہروں پر حروف اگرچہ مرہٹی یا سنسکرت کے ہوتے تھے، لیکن اصل عبارت فارسی کا ترجمہ ہوتی۔ مثلاً فلاں بندہ فلاں راجہ، یا اسی مطلب کو فارسی طرز پر مبالغہ یا استعارات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

مسلمانوں سے قبل بھی مہریں ضرور ہونگی، مگر اُن کا حال فی الحال ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ لیکن اس میں ذرا شبہ نہیں کہ مرہٹوں نے مہروں کا یہ طریقہ مسلمانوں سے لیا۔ اور اُن کے دیکھنے سے یہ امر صاف طور سے معلوم ہوتا ہے۔ ذیل میں ہر دو قسم کی چند مہروں کی عبارت نقل کی جاتی ہے۔

شیواجی کی والدہ کی مُہر فارسی میں تھی اور اُس کے الفاظ یہ تھے "جیجا بائی والدہ راجہ شیواجی"

دیانت راؤ جو علی عادل شاہ کا دفتردار تھا اُس کی مہر بھی فارسی میں تھی۔ اور اُس کے الفاظ یہ تھے۔

"دیانت راؤ بندۂ علی عادل شاہ"

مُہر راجہ شیواجی مہاراج

मति पच्चन्द्र लेखेव वर्धिष्णु विम्ब वंदिता

शाह सूनोः शिव स्यैषा मुद्रा भद्राय राजते

ترجمہ۔ شواجی ابن شاہ جی کی یہ مہر ہلال یک شبہ کی مانند خوبصورت ہے۔ جو ہر روز بڑھتا ہے اور جس کی تمام دنیا عزت کرتی ہے۔

فارسی:۔ "ایں مہر شواجی ابن شاہ جی خوش نما ہمچو ہلال یک شبہ کہ ہر روز فزاید و مقبول ہمہ عالم است"

مُہر بالاجی باجی راؤ پیشوا (۱۷۴۰ء تا ۱۷۶۱ء)

श्री राजा साहू छत्र पति हर्ष निधान। बालाजी बाजी राव मुख्य प्रधान॥

ترجمہ۔ راجہ ساہو چھتر پتی منبع ہمہ بہجت و مسرت بالاجی باجی راؤ وزیر اعظم او

مُہر جوتیاجی کیسر کر جو ساہو مہاراج کے ساتھ قید میں تھے۔

राजा साहू चरणीं तत्पर। कृष्णाजी सुत जो त्याजी सुत के सरकर।

ترجمہ۔ خاکپائے قدوم راجہ ساہو، جوتیا کیسر کر ابن کرشناجی

مُہر۔ پرشرام ترنبک پرتیندھی وزیر راجہ رام مہاراج

श्री आई आदि परूष

श्री राजा शिव छत्रपति स्वामी कृपा निधि। तस्य परशुराम त्रिंबक प्रतिनिधि॥

ترجمہ۔ شری راجہ شواجی چھتر پتی منبع مسرّت و بہجت، وزیر او پرتیندھی پرشرام ترنبک

مُہر۔ بھیرو مورلیشور پیشوا مہاراجہ شاہو۔

श्री राजा शाहू नरपति हर्ष निधान। मोरेश्वर सुत भैरव मुख्य प्रधान॥

ترجمہ۔ شری راجہ شاہو، صاحب عالمیان، منبع مسرّت و بہجت، بھیرو ابن مورلیشور وزیر اعظم او

غرض اس قسم کی مُہریں دوسرے مرہٹے سرداروں کی بھی ہیں اور ان کے دیکھنے سے ہمارے بیان کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔

موڑی طریقۂ تحریر

(۴۳) مرہٹی میں کتابت کے دو طریقے ہیں۔ ایک بالبدہ دوسرا موڑی۔

بالبدہ صاف اور خوش خط ہے۔ جو ہاتھ روک کر لکھنا پڑتا ہے۔ موڑی رواں اور تیز خط ہے جو مسلسل لکھا جاتا ہے گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ بالبدہ ہمارا نستعلیق ہے۔ اور موڑی خط شکستہ۔

عام طور پر یہ روایت مشہور چلی آرہی ہے کہ موڑی حروف بالبدہ یا ناگری حروف سے کسی قدر تغیر کے ساتھ بنائے گئے ہیں۔ اور اس کا موجد ہمادری پنت یا ہماد پنت دفتردار راجہ راؤ اور راجہ رام دیوراؤ، راجگان دولت آباد تھا۔ ان دونوں مرہٹے راجاؤں کی حکومت ۱۲۶۰ء سے ۱۳۱۰ء تک رہی۔

یہ روایت تاریخی لحاظ سے بھی صحیح معلوم ہوتی ہے۔ ۱۲۶۰ء سے قبل کے جتنے خطوط اور فرامین مرہٹہ سرداروں کے پائے گئے ہیں وہ یا تو پتھروں اور تانبے کے پتروں پر کندہ ہیں یا تاڑ کے پتوں پر لکھے ہوئے ہیں۔ غرض یہ تحریریں اسی قسم کی چیزوں پر پائی جاتی ہیں، جن پر لکھتے وقت ہر حرف کے وسط اور آخر میں ہاتھ روکنا پڑتا ہے۔ اس امر کا کافی ثبوت موجود ہے کہ اُس زمانہ میں معمولی خط وغیرہ بھی تاڑ کے پتوں، چمڑوں وغیرہ پر لکھے جاتے تھے۔ ایسی چیزوں پر لکھنے کے لئے بالبدہ ہی کا طریقۂ تحریر زیادہ مناسب اور موزوں ہے۔ ایک ایسا طریقۂ کتابت جو موڑی کی طرح آسانی اور تیزی کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے ہرگز پتھروں، تانبے کے پتروں، چمڑے، کپڑے، یا تاڑ کے پتوں کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُس وقت سوائے بالبدہ کے کوئی دوسرا طریقہ رائج نہ تھا اور نہ اس کی ضرورت تھی۔ اور اسی لئے کسی کو موڑی جیسے کسی دوسرے طریقۂ کتابت کے ایجاد کا خیال بھی نہ آیا۔ علاؤ الدین نے دیوگڑھی یا دولت آباد کو ۱۲۹۳ء میں فتح کیا ہرپال راؤ دولت آباد کا آخری راجہ اور رام دیو کا داماد ۱۳۱۸ء میں سلطان مبارک کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اور دولت آباد ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ اُس زمانہ کی ایک قلمی کتاب جس کا نام پرشورام آپدیش ہے۔ اب پائی گئی ہے۔ اور اس وقت مسٹر راجواڑے کی ملک ہی۔ یہ کتاب علم نجوم کے متعلق ہے۔ اور اس میں تاڑ کے پتوں اور پارچہ وغیرہ پر ضروری نجومی اشکال کھینچنے کے متعلق ہدایات درج ہیں۔ اس پر اختتام کتاب کا سن ۱۲۷۸ شکے لکھا ہوا ہے جو عیسوی سنہ ۱۳۵۶ ہوتا ہے یہ کتاب انتزاع حکومت

دولت آباد (۱۳۱۸ء) سے آٹھ سال بعد شروع کی گئی اور بیس سال میں ختم ہوئی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ۱۳۲۶ء میں اور اس سے قبل تاڑ کے پتوں اور پارچہ پر لکھنے کا طریقہ رائج تھا۔ بھگوت گیتا کی مشہور مرہٹی تفسیر دیانشوری ۱۲۹۰ء یعنی راجہ رام دیو کے زمانے میں ختم ہوئی۔ اس میں تاڑ کے پتّوں اور چمڑے وغیرہ پر لکھنے کے بارے میں ضمناً بارہا ذکر آتا ہے۔ دوامی اسناد، یا عطیات ۱۳۲۶ء میں اور اس کے قبل تانبے کے پتروں پر دیے جاتے تھے۔ چنانچہ اس زمانہ کے اس قسم کے تانبے کے پتر بہت سے دستیاب ہوئے ہیں بلکہ یہ رواج اس سے تین سو چار سو برس بعد تک بھی جاری رہا۔ فرماں روایان اسلام، شیواجی، اور پیشواؤں کے وقت کے اکثر تانبے کے پتر جو اس زمانہ میں سے ہیں اُن سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ غرض یہ کہ ۱۳۲۶ء میں اور اس کے بعد بھی کچھ مدّت تک خاص خاص حالتوں میں تاڑ کے پتّے، پارچہ، چمڑا وغیرہ تحریر کے لئے کام آتے تھے لیکن اس زمانہ کے لگ بھگ یعنی ۱۳۲۶ء میں یا اس سے ذرا قبل کتابت کی غرض سے ایک اور نئی شے کا رواج بھی شروع ہو گیا تھا۔ اور یہ کاغذ تھا۔

بھگوت گیتا کی مرہٹی دیانشوری میں جو ۱۲۹۰ء میں ختم ہوئی، کئی مقام پر بعید سا کنایہ کاغذ کے متعلق پایا جاتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ آیا ہے۔

पाटिया वरितीं आखरें । पुसतां येतीं जैसीं करें [1]

ترجمہ۔ پاٹ کے لکھے ہوئے حروف جیسے ہم ہات سے مٹا سکتے ہیں۔

مسٹر راج واڑے جو ایک مشہور مرہٹی مورّخ ہیں۔ وہ پاٹ کے معنے کاغذ کے لیتے ہیں۔

یہ محض قیاسی بات نہیں ہے کہ کاغذ کا استعمال اُس زمانے میں اِس طرف شروع ہو گیا تھا۔ مکند راج دیانشور کا ہمعصر تھا بلکہ اس سے کچھ پہلے ہی ہوا ہے۔ اس کی کتاب دیویک سندھو کا اصل نسخہ کاغذ پر لکھا ہوا ہے وہ اب تک مومن آباد میں اُس کے شاگردوں کی اولاد میں چلا آرہا ہے۔ اس کتاب کے حروف بالبدہ یا ناگری ہیں اور اسی طرح کے لکھے ہوئے ہیں جیسے کہ ہم یادہو راجاؤں کے زمانے کے تحریریں پتھروں یا تانبے کے پتروں پر پاتے ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ دیانشور اور مکند راج کے عہد کے لوگوں کا کسی قدر رجحان کاغذ کے استعمال کے متعلق اس سے بھی کچھ پہلے ہو چلا تھا یعنی تیرہویں صدی کی ابتدا میں۔ اسی زمانے میں ہادری نے جو یادو راجاؤں کے دفاتر کا افسر اعلیٰ تھا، مرہٹواڑی میں موڑی طریقۂ تحریر کا رواج دیا۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موڑی کا رواج دیانشوری سے قبل ہو چکا تھا۔ کیونکہ شاعر ایک جگہہ لکھتا ہے کہ

(باب ۴ بیت ۲۴) (غلط حروف پھاڑ ڈالے) खोटाची तिहिती फाडी।

یہ ظاہر ہے کہ تانبے کے پتر اور بھوج پتر نہیں پھٹ سکتے۔ اور غلط حروف کا ان میں سے پھاڑ کر پھینک دینا بھی ممکن نہیں۔ اس سے مطلب کاغذ کا ہے۔ کیونکہ کاغذ ہی پر سے غلط الفاظ آسانی سے پھاڑ کر پھینک سکتے ہیں۔

دیانشوری ۱۲۹۰ء میں اتمام کو پہنچی۔ اور ہمادی یا ہمادپنت ۱۲۶۰ء سے یادھوراجاؤں کا دفتردار تھا۔ اُس وقت مسلمانوں کی حکومت کو شمالی ہند میں قائم ہوئے اسّی نوّے برس گزر چکے تھے۔ یہ امر یقینی ہے کہ یادوؤں کے زمانے میں مرہٹے مسلمانوں کو جاننے پہچاننے لگے ہونگے اور اُن کا کاغذ بھی مسلمان تاجروں کے ذریعہ مرہٹوں کے ملک میں پہنچ گیا ہوگا، یا خود مرہٹوں نے کاغذ بنانا سیکھ لیا ہوگا۔ موڑی اسی زمانے میں پہلے پہل رائج ہوئی اور اس کے رواج کی ایک وجہ کاغذ بھی قرار دی جاسکتی ہے۔ کیونکہ جب تک کاغذ کا رواج نہ ہوا ہوگا اس کی ضرورت بھی محسوس نہ ہوئی ہوگی۔ کیونکہ جو اشیا اس وقت تک تحریر کے لئے مستعمل تھیں وہ موڑی کے لئے مناسب نہ تھیں لیکن بالبدہ سے موڑی طریقہ کتابت کے پیدا کرنے کا خیال کیونکر پیدا ہوا۔ ذرا سے غور کے بعد یہ صاف ظاہر ہو جائیگا کہ اس خیال کا باعث فارسی کا خط شکستہ ہوا ہے۔

اوّل۔ موڑی کا لفظ شکستہ کا لفظی ترجمہ ہے۔ اور کوئی دوسرا لفظ اُس کے لئے مرہٹی یا سنسکرت میں نہیں پایا جاتا۔

دوم۔ مسلمانوں کے قبل اس کا مطلق رواج نہ تھا۔

سوم۔ کاغذ مسلمانوں نے رائج کیا۔ اور جب کاغذ مرہٹوں کے ملک میں پہنچا تو اُس وقت موڑی کی ایجاد کا موقع پیدا ہوا۔ کیونکہ پارچہ، چمڑے، بھوج پتر، یا تانبے کے پتروں پر موڑی کا لکھنا ممکن نہ تھا۔ یہ ثبوت اس امر کا ہے کہ خط موڑی کی ایجاد مسلمانوں کے آنے سے قبل نہیں ہوسکتی تھی۔ کیونکہ اگر ہوتی بھی تو بیکار ہوتی۔ اس لئے کہ استعمال کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔

چہارم۔ چونکہ فارسی کا خط شکستہ موجود تھا۔ لہٰذا اُسی طرز اور نمونے پر موڑی کی کتابت بھی ایجاد کرلی گئی۔
غرض موڑی کے وجود میں آنے کا اصل اور صحیح باعث فارسی کا خط شکستہ ہوا۔ اور چونکہ خود

خط شکستہ بھی اسی غرض سے ایجاد ہوا تھا کہ تحریر کا کام آسانی اور تیزی سے ہو سکے جو نستعلیق سے ممکن نہ تھا اسی غرض اور نمونے پر موڑی کا طریقہ کتابت بھی مرہٹوں نے وضع کیا۔ فارسی نے جہاں مرہٹی زبان پر اور بہت سے اثرات ڈالے تھے وہاں اس کے طریقہ کتابت پر بھی ایسا اثر ڈالا کہ اس وقت تک قایم رہیگا جب تک مرہٹی زبان دنیا میں قایم ہے۔

عوام میں ایک یہ روایت بھی مشہور ہے کہ ہادری موڑی سیلون سے لایا۔ یہ روایت محض بے بنیاد اور تاریخی لحاظ سے بالکل غلط ہے۔ سیلون میں نہ موڑی تھی، نہ بالبدہ۔ اس لئے اس کا وہاں سے آنا ایک بے جوڑ سی بات ہے۔ دوسرے موڑی حروف کچھ نئے یا غیر نہیں ہیں۔ یہ شکستہ کی تتبع میں بالبدہ حروف سے تھوڑے سے تغیر کے ساتھ آسانی کے لئے بنا لئے گئے ہیں۔ بعینہ جیسے خط شکستہ کے حروف نستعلیق سے۔ اگر گزشتہ چار پانچ صدیوں کے موڑی حروف کو غور سے دیکھا جاے تو ہمارے بیان کی پوری پوری تصدیق ہو جائیگی۔ چودہویں اور پندرہویں صدی کی موڑی آج کل کی موڑی کی نسبت بالبدہ سے بہت زیادہ قریب تھی۔ چودہویں صدی سے لے کر اب تک کے بیس پچیس خطوط و فراین کو بہ نظر غور دیکھا جاے تو اس کا کامل یقین ہو جائیگا کہ موڑی بالبدہ کے حروف کی دوسری صورت ہے۔ جو محض آسانی اور تیز نویسی کی غرض سے بنائی گئی ہے۔ اب جو ہمیں موڑی اور بالبدہ میں فرق معلوم ہوتا ہے تو وہ جادو قلم منشیوں کا اعجاز ہے جو پانسو سال سے برابر اس میں تصرف کرتے چلے آتے ہیں۔

یادہو (یاجادہو) سلطنت کی حدود جنوب میں دور تک پہنچ گئے تھے۔ اور ممکن ہے کہ اس سلطنت کا مشہور دستر دار جو موڑی کا بانی ہوا ہے وہ جنوب کی طرف گیا ہو۔ اور اس نے وہاں کے دفاتر کا معائنہ کیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ جاترا کے لئے رامیشور پہنچا ہوے جہاں اب بھی خوش عقیدہ اور متقی ہندو جاتے ہیں" اور وہاں سے واپسی کے بعد عام حکم تمام دفاتر میں موڑی کی ترویج کا جاری کیا ہو۔ اس پر سے لوگوں نے مشہور کر دیا کہ یہ نیا تحفہ سیلون سے آیا ہے۔ چونکہ عام لوگوں کے خیال میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ یہ فارسی کے خط شکستہ کی نقل ہے، اس لئے سیلون والی روایت آسانی سے مشہور ہو گئی۔

مرہٹی شاعر

شاعری طبعاً انسان کو مرغوب ہے اور اُس نے قوموں پر بڑا اثر ڈالا ہے اور بعض اوقات بڑے بڑے انقلاب پیدا کئے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہر زبان کے علم ادب میں اوّل درجہ شاعری کا ہے اور اس کے بعد نثر کا۔ علاوہ اس کے تقدم زمانی بھی شاعری ہی کو حاصل ہے۔ ادبیات کے میدان میں اوّل شاعری ہی کا قدم آتا ہے۔ یہی کیفیت مرہٹی زبان اور مرہٹی علم ادب کی ہے۔ مرہٹی علم ادب کی ابتدا بارہویں صدی کے شروع سے ہے اور سب نظم میں ہے۔ بارھویں، تیرھویں اور چودھویں صدی کی مرہٹی ملی جُلی تھی۔ یعنی آدھی مرہٹی اور آدھی پراکرت۔ مرہٹی کے ابتدائی شاعر کلیتہً مان بھاؤ تھے۔ یہ لوگ مذہبی تھے اور ان کا اپنا الگ فرقہ تھا۔ یہ اپنے مذہبی کلام کو غیروں سے چھپاتے تھے۔ اس لئے اس کی اشاعت نہ ہوئی۔ لیکن جہانتک ان کی کتابیں یا نظمیں دیکھنے میں آئی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت ہی معمولی درجہ کی ہیں اور مطلق قابل لحاظ نہیں۔ مگر مان بھاؤن کا یہ بڑا احسان ہے کہ اُنہوں نے بجائے سنسکرت کے اپنے تمام خیالات مرہٹی میں ادا کئے۔ اس سے اُن کی دوراندیشی کا اندازہ ہوتا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اس فرقہ کے پیرو غیر برہمن ہیں۔ حالانکہ اس کا بانی ایک برہمن تھا جو ذات باہر کردیا گیا تھا۔ بہرحال مان بھاؤں کو یہ فضیلت اور تقدم حاصل ہے کہ سب سے اوّل اُنہوں نے اس زبان میں لکھنا شروع کیا جو مہاراشٹر میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی۔

مرہٹی شعرا اکثر درویش اور صوفی منش لوگ تھے۔ ان کا زمانہ تیرھویں صدی کے بعد کا ہے۔ اُنہوں نے اپنی نظموں میں کہیں اپنا ذکر نہیں کیا۔ شاذونادر کنایتہً یا اشارتہً ایک آدھ بات آگئی تو آگئی ورنہ اُن کی نظمیں ان باتوں سے بالکل خالی ہیں۔ لہذا اُن کے حالات کا معلوم کرنا دشوار ہے۔ البتہ پُرانی روایتیں اور کراماتیں مشہور چلی آرہی ہیں لیکن وہ درجۂ اعتبار سے ساقط ہیں۔ اس لئے بہت کچھ قیاس سے کام لینا پڑتا ہے۔ یہ لوگ دنیا سے بےتعلق یا دنیوی واقعات سے بالکل بے خبر تھے اور خبر بھی ہوتی تو انہیں اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ اپنی نظموں میں اُن کا ذکر کریں وہ پرمیشر کی بھگتی میں مصروف رہتے اور اُسی کی حمد وثنا کے گیت گاتے تھے۔ اور یہ نظمیں محض خدا یا اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی کے لئے لکھتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کا دیوتا الگ تھا مثلاً

ایکناتھ اور داسوپنت (۱۵۵۰ - ۱۶۱۵) کا دیوتا دتّا تریا تھا۔ تکارام اور نام دیو پنڈھر پور کے دیوتا وٹھوبا کی پرستش کرتے تھے۔ رامداس اور مورو پنت، رام کے پجاری تھے۔

ان شعرا کی ساری شاعری اپنے اپنے دیوتاؤں کی صفت وثنا یا پند و موعظت پر مشتمل تھی۔ مرہٹی شاعری میں عشق و محبت، شراب و کباب، گل و بلبل نام کو نہیں۔ یہ مہا پرش عورت کو راہ نجات میں حائل اور اپنی بھگتی کا ہارج سمجھتے تھے اور اس لئے اس کے ذکر سے ہمیشہ احتراز کرتے تھے۔ حالانکہ عشق و محبت سنسکرت اور ہندی شاعری کی جان ہے۔ اور انکے شعرانے اس مضمون پر ایسے پُر درد اور لطیف خیالات کا اظہار کیا ہے جو دوسرے ملک کی شاعری میں مشکل سے ملیں گے۔ مرہٹی شاعر کا سب سے بڑا مقصود دیوتا یا خدا کی پرستش اور عبادت ہے۔ وہ کہتا ہے "مجھے کھانا نہیں چاہیے، مجھے اولاد نہیں چاہیے مگر میں چاہتا ہوں کہ نارائن میرے دل میں بسا رہے" (تکارام)

شیواجی نے بہت سے بیش قیمت تحفے تکارام کو بھیجے اور اپنے دربار میں بلایا۔ لیکن اُس نے وہ تمام روپیہ پیسہ اور نذرانے وہیں غربا و مساکین میں تقسیم کر دیے اور مہاراج کو یہ جواب کہلا بھیجا "میں تمہارے پاس آؤں تو کیوں آؤں؟ اس میں صرف آنے جانے کی زحمت ہوگی۔ میں تم سے کھانا نہیں مانگتا، بھیک میری سب سے بڑا داتا ہے، اب رہے کپڑے، سو میرے پاس بہت سے چیتھڑے موجود ہیں۔ پتھر میرا بچھونا ہے اور آسمان میرا اوڑھنا ہے۔ لوگ شاہی درباروں میں عزت کے لئے جاتے ہیں، لیکن کیا انھیں وہاں اطمینان قلب بھی حاصل ہے؟ شاہی دربار میں صرف امیروں کی عزت ہوتی ہے دوسروں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ جب میں لوگوں کو فاخرہ لباس پہنے دیکھتا ہوں تو مجھے موت یاد آتی ہے۔ اگر تم میرے اس جواب سے ناخوش ہو تو ہری (خدا) مجھے نہیں چھوڑ دے گا........... میں غریب و بیکس نہیں ہوں کیونکہ میں نے ہمیشہ کے لئے اپنے تئیں خدا کے حوالہ کر دیا ہے۔ وہ میرا محافظ اور مجھے غذا پہنچانے والا ہے۔ میں تمہارے پاس آ کر کیا کروں؟ اُمید کو میں نے کم کرتے کرتے صفر تک پہنچا دیا ہے"۔ غرض اس قسم کی متعدد مثالیں بیان کی جا سکتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ درویش شاعر مال و دولت اور جاہ و ثروت کی مطلق پرواہ نہیں کرتے تھے۔

حبِّ وطن کا خیال، جیسا کہ آج کل سمجھا جاتا ہے، بالکل جدید ہے۔ تاہم دنیا میں ہر جگہ یہ پایا جاتا ہے کہ لوگوں کو اپنے ملک و قوم سے خاص محبت ہوتی ہے۔ مہاراشٹر کا سب سے بڑا شاعر مکتیشور کہتا ہے کہ

"مہاراشٹر تمام ممالک کا بادشاہ ہے۔ اس کے خوف سے دیوتا تک شرمندہ ہیں"

اسی طرح ایک دوسرا شاعر کرشنا دیا رکھتا ہے کہ

"جب مہاراج شیو (شیواجی) نے نجات حاصل کی (یعنی انتقال کیا) تو تامرے (یعنی سرخ لوگ) جنوب میں آئے اور انھوں نے بلدہ فتح (بیجاپور) کی سلطنت کا خاتمہ کردیا۔ اس سے قوم پر بڑی مصیبت نازل ہوئی"

یہاں "سرخ لوگوں" سے مراد مسلمان ہیں۔ اور اس مصیبت سے مراد اورنگ زیب کی فتح و کامیابی ہے جسے شاعر "سرخ لوگوں کا بادشاہ" کہتا ہے۔

اس قسم کے اشعار مرہٹی شاعروں کے ہاں بہت کم بلکہ شاذ ہیں ورنہ ان کا "تکیۂ خیال" زیادہ تر عقبےٰ اور آخرت ہے۔ دنیاوی معاملات سے بہت کم بحث کرتے ہیں۔

مرہٹی شاعر نہ تو عالم تھے اور نہ اُن کا شمار اچھے پڑھے لکھے لوگوں میں ہو سکتا ہے۔ مثلاً رام داس، تکارام، نام دیو، سشری دھر وغیرہ جن کی شہرت عام ہے اور جن کا نام بڑے ادب و احترام سے لیا جاتا ہے، اسی قسم کے شاعر تھے۔ مورو پنت، ایکناتھ، مکتیشور وغیرہ سنسکرت سے واقف تھے، لیکن عالم انھیں بھی نہیں کہہ سکتے۔ البتہ رگھوناتھ پنڈت اور وامن پنڈت بڑے عالم تھے اور انھوں نے عموماً سنسکرت کی شاعری کی تقلید کی ہے یا سنسکرت کی بعض نظموں کا ترجمہ کیا ہے۔ اب تک یعنی تیرہویں صدی سے اُنیسویں تک چھوٹے بڑے تین سو شاعروں کے نام معلوم ہوئے ہیں۔ اُن میں سے مشکل سے چھ سات ایسے نکلیں گے جنھیں عالم یا اچھے پڑھے لکھے کہہ سکیں۔ مرہٹی شاعری کا بڑا سرچشمہ سنسکرت کی مشہور آفاق نظمیں رامائن و مہابھارت ہیں۔ اکثر شعرا نے انھیں دو مقدس کتابوں سے خوشہ چینی کی ہے یہ درویش شاعر فصاحت اور صرف و نحو کے قواعد کی بہت کم پرواہ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ برہمن شاعر رام داس بھی اس کی پابندی نہیں کرتا۔

اسی سات صدی کے عرصہ میں جو مرہٹی شعرا ہوئے اُن کی تقسیم اُن کے کلام کے لحاظ سے سرسری طور پر

اسی طرح ہو سکتی ہے۔

۱- ویدانتی شعرا۔مثلاً دانیشور، مکندراج، ایکناتھ، وامن پنڈت وغیرہ ان کی شاعری ویدانت سے تعلق رکھتی ہے اور وہ اہل دنیا کو راہ نجات کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

۲-بھکتی شعرا۔یعنی وہ شاعر جو پرمیشر یا دوسرے دیوتاؤں کی حمد و ثنا کا گیت گاتے ہیں۔اُن کی شاعری کا مقصد محض عبادت ہے۔ ان میں سربرآوردہ نام دیو، تکارام، رام داس، مہی پتی وغیرہ ہیں ان میں سے رام داس اور تکارام کبھی کبھی لوگوں کو پند و نصیحت کی شیرینی سی سے رجھاتے ہیں اور گاہ گاہ دنیاوی معاملات پر بھی کچھ کہہ جاتے ہیں۔

۳- وہ شعرا جن کی شاعری بیانیہ ہے، وہ ہیں جن کا ماخذ راماین اور مہابھارت ہیں اور انھیں کے مناظر یا قصوں کو مرہٹی نظم میں بیان کرتے ہیں۔ اُن میں مکتیشور، مورو پنت، رگھوناتھ پنڈت زیادہ مشہور ہیں۔ وامن پنڈت اور ایکناتھ کی شاعری کا بھی ایک درجہ اس تحت میں آجاتا ہے۔

لیکن ایک نہایت عجیب بات ان مرہٹی شعرا کے متعلق یہ ہے کہ ان میں سے تقریباً سب کے سب اور خاص کر اعلیٰ درجہ کے شاعر اُس زمانہ میں ہوئے جبکہ اُن کے ملک کے فرماں روا مسلمان بادشاہ تھے۔ البتہ نامور اور ممتاز شعرا میں مکندرائے اور دانیشور دو ایسے شخص ہیں جن کا زمانہ تیرھویں صدی کا ہے یعنی وہ زمانہ جبکہ مسلمانوں کا تسلط مہاراشٹر پر نہیں ہوا تھا اور مورو پنت پیشواؤں کے عہد میں تھا ورنہ نامدیو، ایکناتھ، جناردھن، مکتیشور، وامن، رگھوناتھ پنڈت، کرشن دیایو، مادھومنیشور، سری دھر، رام داس، تکارام، اننت تنیا وغیرہ یہ سب اسلامی عہد ہی میں پھولے پھلے اور اُسی زمانہ حکومت میں اس دنیا سے سدھار گئے۔

دوسرا عجیب واقعہ یہ ہے کہ مرہٹی کے اکثر بھکتی شاعر موجودہ رقبۂ ریاست حیدرآباد دکن میں یا اس کے آس پاس کے علاقہ میں گزرے ہیں۔ نام دیو اور پرکھا دباوا پرندہ پور کے رہنے والے تھے۔ مادھومنیشور، سندور واڑہ قریب بھوکن واقع ضلع اورنگ آباد کا متوطن تھا۔ امرت رائے خاص اورنگ آباد کا تھا۔ کرشنا دیانو اور مکندراج، امباجوگائی یعنی مومن آباد ضلع بیڑ (ریاست حیدرآباد) کے باشندے تھے، رام داس جام کا رہنے والا تھا جو راکھشس بھون کے قریب ضلع بیڑ میں واقع ہے۔ واسو پنت، نارائن پیٹھ کا، رام دلبھ داس اور

رام جوشی شولاپور کے، رگھوناتھ اور سری دھرنازرے (قریب پنڈھرپور) کے، اچیت گت کاشی بھرم ضلع ناسک کا، شیخ محمد چارگندہ ضلع احمد نگر کا، دیوناتھ سری نور واقع برار کا، اور گورا کمار تیر ضلع عثمان آباد کا رہنے والا تھا یہ درویش شاعر تقریباً سب کے سب طبقۂ متوسط کے لوگ تھے۔ ان میں اکثر دیشستھ برہمن پائے جاتے ہیں خصوصاً کلکرنی اور دیش پانڈے۔ کانکنستھ برہمنوں کا نام ان درویش شاعروں اور سادھوؤں کی فہرست میں نہیں آتا۔ اس میں شک نہیں کہ علاوہ برہمنوں کے ان میں دوسری ذات کے لوگ بھی شریک ہیں مثلاً ساتوتیا مالی، روہی داس چمار، گورا کمہار، چوکھلا میلا مہر (ڈھیڑ) اور راس کی بیوی، بوڈلا باوا مرہٹہ، نامدیو درزی، شیخ محمد اور محمد سلطان دونوں مسلمان۔ ان لوگوں کی شاعری اب تک موجود ہے۔ یہ سب فقرا یا سادھو تھے۔ یہاں تک کہ ان کی وجہ سے مرہٹی زبان میں شاعر کا لفظ درویش یا سادھو کے ہم معنی ہو گیا ہے۔

مرہٹی کے فلک شاعری پر یہ چھ شاعر آفتاب و ماہتاب کی طرح چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دنانشور، تکارام، رام داس۔ ان تینوں کے کلام میں شاعرانہ آمد اور بے ساختہ پن پایا جاتا ہے اور فطرتاً شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ باقی تین، وامن پنڈت، مورو پنت اور مکتیشور ہیں۔ ان کے کلام میں تکلّف اور صنعت کا دخل زیادہ ہے۔

میں ان شعرا کے کلام پر زیادہ تبصرہ کرنا نہیں چاہتا کیونکہ یہ میرے مقصد سے باہر ہے لیکن یہاں ایک خاص امر کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جسٹس رانا ڈے مرحوم اور اُن کے مقلّدین نے جہاں مرہٹہ حکومت کی ابتدا اور فروغ پر بحث کی ہے وہاں منجملہ دیگر اسباب کے ایک سبب ان شعرا کو بھی قرار دیا ہے۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ یہ مرہٹی شاعر اور سادھو تھے جنھوں نے اس انقلاب کی داغ بیل ڈالی۔ لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا، انھیں قومیت کا خیال سمجھایا اور شیواجی جیسے اُولوالعزم شخص کو پیدا کیا جس نے آخر ملک میں مرہٹوں کی حکومت قائم کی۔ ہمیں اُن کی اس رائے سے اتفاق نہیں۔ اوّل تو ہندوستان میں شاعروں کو ایسی باتوں سے کچھ واسطہ [illegible]یں۔ وہ سیاسیات کے کوچہ میں بھولے سے بھی قدم نہیں رکھتے، اُن کی جولانیوں کے میدان ہی دوسرے [illegible]۔ دوسرے مرہٹی شعرا کی شاعری اور بھی زیادہ محدود ہے، انھیں تو اس کی ہوا تک نہیں لگی تھی۔ ان کے [illegible] کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے (جس کا مختصر ذکر میں اوپر کر چکا ہوں) کہ یہ لوگ درویش صفت اور [illegible] منش تھے، اُنھوں نے یا تو رامائن مہابھارت کے قصے نظم کیے، یا اپنے دیوتاؤں اور پرمیشور کی حمد

کے گیت گائے یا مذہبی اور اخلاقی نصیحتیں لوگوں کو کیں۔ وہ پرمیشور سے لَو لگائے اپنے دھیان اور بھگتی میں مگن رہتے تھے، انھیں دنیاوی معاملات اور خاص کر سیاسیات سے کچھ سروکار نہ تھا۔ فرنچ ریوُلیوشن (انقلاب فرانس) کی تاریخ پڑھتے وقت جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مورخین اس کے اسباب کا کھوج لگاتے لگاتے روسیو اور والٹیر وغیرہ تک پہنچتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ یہی انشا پرداز اور حکیم تھے جن کے خیالات نے اس انقلاب عظیم کا بیج بویا، جو اُگا، بڑھا، پھلا اور پھولا اور اس عجیب وغریب انقلاب کا باعث ہوا، تو ہمارے دل میں بھی گدگدی ہوتی ہے اور ہم بھی اپنے ملک کے واقعات و تغیرات کو اُسی نظر سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُس وقت ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارے اور اُن کے حالات میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ حال کے مرہٹے مورّخوں نے یہی غلطی کی اور اپنے شاعروں اور سادھوؤں کو روسیو اور والٹیر وغیرہ کا قایم مقام فرض کرلیا حالانکہ ان کے اور اُن کے خیالات اور کلام میں کوئی نسبت نہیں۔ یہ محض تقلید ہے اور تقلید بھی ایسی کہ واقعات اُس کی مطلق تائید نہیں کرتے۔ اُس زمانہ کے شعرا اور خاص کر مرہٹی شاعروں سے یہ توقع کرنا کہ اُنھوں نے لوگوں کے دلوں میں حُبّ وطن اور حُبّ قوم کا جذبہ پیدا کیا اور اُن کے دلوں کو اپنے پُرتاثیر کلام اور انقلاب انگیز خیالات سے گرمایا اور سیاسی انقلاب کا باعث ہوئے، ایک خیالی اور فرضی تصویر ہے جو دل خوش کن تو ہے مگر واقعات کے سراسر خلاف ہے۔

بعض مرہٹی اور دوسرے مورّخوں نے بار بار اس کا اعادہ کیا ہے کہ شیواجی کا بنانے والا اُس کا گرو رام داس تھا۔ اور شیواجی نے جو یہ عروج حاصل کیا وہ اُسی کی کرامات تھی۔ لیکن کوئی مورّخ، خواہ وہ اس خیال کا کیسا ہی ماننے والا کیوں نہ ہو۔ اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ رام داس سے شیواجی کی ملاقات اُس وقت ہوئی جبکہ اُس کی عمر اکیس بائیس برس کی تھی۔ حالانکہ شیواجی اس سے کہیں پہلے اُس میدان میں قدم رکھ چکا اور لوٹ مار شروع کرچکا تھا۔ وہ اس سے بہت قبل اپنے منصوبے طے کرچکا اور اپنی زندگی کا مقصد قرار دے چکا تھا۔ اپنے آیندہ طرز عمل کے متعلق کوئی خاص بات ایسی نہ تھی جس کا فیصلہ وہ اس وقت نہ کرچکا ہو۔ چنانچہ اسکی مُہر کے "نقش نگیں" سے صاف ظاہر ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے

"وہ ہلال کی مانند بڑھتی ہوئی اور دنیا بھر کی مقبول ومحبوب یہ مُہر مہاراج شاہ جی کے فرزند کی خوبصورت

معلوم ہوتی ہے"

مہر کے یہ الفاظ اُس زمانے کے ہیں جبکہ شیواجی کی عمر ۱۳ یا ۱۴ برس کی تھی یا ایک آدھ مہینہ زیادہ سمجھ لیجئے اُس زمانے کے کاغذات کے دیکھنے سے یہ بخوبی ثابت ہے کہ اس وقت ان کی عمر اس سے زاید نہ تھی۔

رام داس کی ملاقات سے کہیں پہلے شیواجی اپنے منصوبے سوچ چکا تھا۔ اور یہ ولولہ اُس کے دل میں ملک کی پریشان اور خستہ حالت دیکھ کر پیدا ہوا تھا۔ احمد نگر کی سلطنت اُس وقت بیجاپور اور شاہجہان کے ہاتھوں کشمکش میں تھی (جنوری ۱۶۳۷ء) اور کوکن اور گھاٹ ماتھا (یعنی اضلاع پونا و سوپا وغیرہ) جو سلطنت احمد نگر کا حصہ تھے سلطنت بیجاپور کے قبضے میں آ گئے تھے۔ مرہٹے سردار بیجاپور کی اس نئی حکومت کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور اوّل اوّل ۱۶۴۵ء یا اس سے کسی قدر قبل شیواجی نے یہیں سے اپنی لوٹ مار اور غارت گری کا آغاز کیا۔ اُس وقت اُس کی عمر سترہ یا اٹھارہ برس کی ہو گی۔

غرض جس چیز نے شیواجی کے سر میں غارت گری اور بعد ازاں حکومت کا سودا پیدا کیا وہ ملک کی بدانتظامی اور حکومت کی پریشان حالی تھی۔ یہ اثر نہ مہا بھارت اور راماین کی کہانیوں کا تھا اور نہ رامداس کی تلقین کا۔ رام داس نہ اس وقت تک اُس کے گرو تھے اور نہ شیواجی اُن کا چیلا۔ اس میں شک نہیں کہ بعد میں گرو کی تلقین نے اُسے اور اُبھارا اور اس کے خیالات میں زیادہ وسعت پیدا کی اور اُسے ہندو قوم کا نجات دہندہ اور ہندو حکومت کا بانی قرار دیا۔ لیکن اس خیال کی ابتدا نہ گرو سے ہوئی اور نہ مرہٹی شعرا اور سادھوؤں سے، اُس وقت کی تاریخ پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی ابتری نے شیواجی کو یہ موقع دیا کہ وہ رفتہ رفتہ غارت گری اور لوٹ مار سے مسند حکومت تک پہنچ گیا، اور یہ کوئی بعید از قیاس بات نہیں ہے، ایسے وقتوں میں اکثر ایسا ہوا ہے اور ہمارے ملک کی تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ یہ کہنا کہ مرہٹی سادھو ۱۲۰۰ء سے مرہٹوں کو اس انقلاب کے لئے تیار کر رہے تھے اور مہابھارت اور راماین کے قصوں نے (جو شعرا نے اپنی نظموں میں بیان کئے) اور رام داس کی تلقین نے شیواجی سے شخص کو پیدا کیا محض فسانہ ہے جو انگریزی تعلیم یافتہ تاریخ نویسوں کے قیاسات کا نتیجہ ہے۔ یہ قصے یہ کتھائیں یہ نظمیں زمانہ قدیم سے تمام ہندوستان اور مہاراشٹر میں گائی اور سنائی جاتی ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس انقلاب کی تیاری اور

شیواجی کے بنانے کے لئے چار صدی کا عرصہ درکار ہوا! اگران سادھوؤں اور شعرا نے اہل ملک کے جذبات کو اُبھارا تھا اوراُن میں حب وطن اور حب قوم کا ولولہ پیدا کیا تھا اور لوگ انقلاب کے لئے تیار بیٹھے تھے تو کیا وجہ ہے کہ جب شیواجی نے اوّل اوّل اپنا کام شروع کیا تو لوگوں نے عموماً اس کا ساتھ نہیں دیا اور مرہٹی امرا میں سے تو ایک بھی اس کے ساتھ نہ تھا؟ جب اُس نے اپنی غارت گری اور لوٹ مار سے نام پیدا کر لیا تو لوگ اس کا ساتھ دینے لگے۔ لیکن یہ حب قوم یا حب وطن کے جذبات کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ ہر دلیر غارت گر کی کامیابی پر یہی ہوتا ہے اور اب تک ایسا ہوتا چلا آتا ہے۔ اگر شیواجی کی کامیابی جمہور کی عام رائے اور حب وطن کے جذبات پر تھی تو کیا وجہ ہے کہ شیواجی کے مرتے ہی رنگ بدل گیا اور یہ قومی جذبات ایک دو نسل تک بھی قایم نہ رہے؟ رامداس شیواجی کی وفات کے بعد دو سال تک زندہ رہے وہ کیوں نہ سنبھاجی کو اپنے ڈھب پر لے آئے؟ اُس کے زمانے میں بھی بہت سے سادھو اور شاعر تھے اور خود اُس نے اپنے باپ کے زمانے میں بہت سوں کو دیکھا تھا۔ پھر کیوں اُن کی تلقین اور قوم کے جذبات نے اُس پر اثر نہ کیا؟!

غرض رام داس کی تلقین اور مرہٹی سادھوؤں اور شعرا نے شیواجی کو نہیں بنایا بلکہ اس کا باعث ملکی حالات و اسباب تھے جن پر مفصل بحث کرنے کا یہ موقع نہیں۔

البتہ ان سادھو شاعروں نے ایک بڑا قابل قدر کام یہ کیا کہ اُنھوں نے مرہٹی زبان کو زندہ رکھا اور اُسے خراب نہ ہونے دیا۔ سنسکرت داں پنڈت مرہٹی کو حقارت سے دیکھتے تھے اور اس میں لکھنا پڑھنا اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ دنانشور سے لیکر شری دھر تک (۱۲۹۰ تا ۱۷۲۸ء) ہر شاعر نے مرہٹی میں لکھنے کے متعلق معذرت کی ہے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اُن کی قوم کے شاعر اُسے بُرا خیال کرتے ہیں۔ فارسی سرکاری اور درباری زبان تھی اور سنسکرت علما کی زبان۔ اس لئے مرہٹی زبان کی اشاعت کا کوئی موقع ہی نہ تھا اگر یہ درویش شاعر اپنے جذبات کا ذریعہ اسے نہ بناتے۔ سرکار دربار میں شعرا کی کوئی زیادہ قدر نہ تھی، ایک دو معمولی درجہ کے شاعر راجہ یا کسی امیر کے دربار میں ملازم تھے، باقی نہ کسی کے ملازم تھے نہ کسی کے زیر بار منت وہ محض اپنی قوم کی نجات اور خدا کی خوشنودی کے لئے نظمیں لکھتے تھے انہیں نہ کسی سے صلہ کی پروا تھی اور نہ ستایش کی تمنا۔ لیکن بلا واسطہ ایک فائدہ یہ پہنچا کہ مرہٹی زبان

اُن کی بدولت پاک صاف رہی۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر سنسکرت سے بے بہرہ تھے یا سنسکرت کا علم انھیں اس قدر نہ تھا کہ وہ اپنی نظموں کو پنڈتوں کی طرح سنسکرت کے ثقیل الفاظ سے بوجھل بنا دیتے۔ اس زمانہ کی نثر کہیں نہیں ملتی اور غالباً نثر اُس وقت تھی ہی نہیں۔ بعض نامور اشخاص کے خطوط سترھویں صدی کے قبل کے یا سترھویں صدی کے اور اکثر اٹھارھویں صدی کے اب تک موجود ہیں، ان میں مرہٹی سے زیادہ فارسی اور عربی کے الفاظ ہیں اگر ان شاعروں کا کلام نہ ہوتا تو آج اُس زمانہ کی مرہٹی کی اصل اور صحیح صورت کا سراغ لگانا بھی مشکل ہو جاتا اس لحاظ سے مرہٹی زبان پر اُن کا بڑا احسان ہے۔

ان شعرا کے متعلق ایک بات سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ کہ ان میں سے اکثر نے[۵] "ہندوستانی" یا ہندی زبان میں بھی نظمیں لکھی ہیں۔ یہ ہم سب جانتے ہیں اور اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ ملک کے اس حصّے کی زبان ہندوستانی نہیں تھی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ اس زبان میں شعر کہتے تھے؟ ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ چونکہ اُس وقت مرہٹوں کے ملک پر مسلمان حکمران تھے اس لئے بہت سے لوگوں نے "ہندوستانی" یا ہندی سیکھ لی ہو۔ جیسے آج کل ہر مذہب و ملّت کے لوگ ممالک محروسہ سرکار عالی میں اُردو بولتے اور سمجھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمان فرمانرواؤں اور اُن کی دربار کی زبان فارسی تھی لیکن اُن کے ساتھ بہت سے ہندو مسلمان شمال سے آ گئے تھے اور اس لئے ممکن ہے کہ یہاں کسی قدر ہندی کا چرچا ہو گیا ہو۔ یا ممکن ہے کہ مرہٹی شعرا کو بھی تلسی داس اور کبیر کی طرح ہندی میں کہنے کا شوق پیدا ہوا ہو۔ یہ محض قیاس ہے۔ کوئی تاریخی شہادت اس کے متعلق تائید میں نہیں ملتی۔ میں نے اکثر مرہٹی ادیبوں اور عالموں سے اس بارے میں دریافت کیا لیکن کسی نے تشفی بخش جواب نہیں دیا۔ اُن کی رائے بھی قریب قریب وہی ہے جو میں نے ظاہر کی ہے اور محض قیاس پر مبنی ہے۔

اُس زمانے میں فارسی زبان کا وہ زور تھا کہ شاید ہی ہندوستان کی کوئی زبان اُس کے اثر سے بچی ہو مرہٹی بھی اُس کے حلقہ بگوشوں میں تھی اور غالباً بعض دوسری زبانوں کی نسبت وہ زیادہ متاثر ہوئی۔ جیسا کہ

---

[۵] اُن مرہٹی شعرا کے نام جنھوں نے ہندی زبان میں بھی شاعری کی۔

میں نے گذشتہ اوراق میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ۔ مرہٹے بحیثیت قوم کبھی صاحب علم وفضل نہیں ہوئے جو مختلف زبانیں حاصل کرتے اور اُن کے پاکیزہ اور عمدہ خیالات کو اپنی زبان میں لاتے اور اپنی زبان کو ان موتیوں سے مالامال کرتے ۔ حالانکہ مسلمانوں کی حکومت مدتوں اُن کے ملک پر رہی اور اُن کے تعلقات ہمیشہ مسلمانوں سے رہے لیکن انہیں کبھی عربی فارسی زبانوں کی تحصیل کا شوق پیدا نہ ہوا ۔ سنسکرت کے عالم تو گنتی کے چند تھے بھی لیکن عربی فارسی کا عالم ایک بھی نہ تھا ۔ اُنہوں نے کبھی کسی عربی فارسی کتاب کا ترجمہ اپنی زبان میں نہیں کیا اور نہ عربی فارسی ادب کے چمنستان سے وہ پھول چنے جو ہر ملک کے باشندوں کے دماغ معطر کر دیتے ہیں ۔ مرہٹوں میں پچھلی چار صدیوں میں بہت سے مدبر بہت سے وزیر اور بہت سے بہادر سورما پیدا ہوئے ہیں، لیکن حقیقی صاحب علم وفضل اتنے بھی نہیں ہوئے جو اُنگلیوں پر گنے جا سکیں ۔ باوجود اس کے فارسی الفاظ مرہٹی زبان میں بلا تکلف داخل ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ مرہٹی شاعروں کا کلام بھی محفوظ نہ رہ سکا صرف دیانندیو ایک ایسا شاعر ہے (۱۲۷۵ - ۱۲۹۶ء) جس کا کلام فارسی الفاظ سے پاک ہے ۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اُس زمانہ میں تھا جبکہ مسلمانوں کے قدم اس حصہ ملک میں نہیں آئے تھے ۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ مرہٹی نظم میں بہ نسبت نثر کے فارسی عربی الفاظ بہت کم استعمال ہوئے ہیں حالانکہ اس زمانہ کی مکتوبات دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرہٹی کے مقابلہ میں فارسی کہیں زیادہ غالب ہے ۔ نظم کے محفوظ رہنے کی وجہ یہ ہے کہ مرہٹی شاعر درویش اور صوفی منش لوگ تھے انہیں دنیا اور دنیوی معاملات سے کچھ سروکار نہ تھا اُن کی شاعری مذہب، پران کے قدیم قصوں، دیدانت اور بھکتی وغیرہ مضامین سے بھری پڑی ہے اور یہ ایسے مضامین ہیں جن کے ادا کرنے کے لئے کسی غیر زبان کے الفاظ کی بہت کم ضرورت پڑتی ہے ۔ البتہ سیاسی اور تمدنی معاملات میں بغیر فارسی عربی الفاظ کے چارہ نہ تھا ۔ کیونکہ مرہٹوں کا تمدن بہت محدود اور کم درجہ کا تھا اور جدید خیالات و حالات کے ادا کرنے کے لئے الفاظ بھی انھیں کی زبان سے لینے پڑتے تھے جن کا وہ تمدن تھا ۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ مرہٹی شاعروں نے اپنی نظموں میں فارسی عربی الفاظ کا کم استعمال کیا ہے ۔ تاہم وہ اس زبان کے عالمگیر اثر سے نہ بچ سکے ۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ مرہٹی زبان ان شعرا کی بہت ممنون ہے

انہوں نے حتی الامکان اُسے غیر زبان کے اثر سے محفوظ رکھا اور آیندہ نسلوں کے لیے پاک صاف زبان چھوڑ گئے۔ یہی ایک بڑی بات ہے جو مرہٹی شعرا کے متعلق یاد رکھنے کے قابل ہے ورنہ جن چیزوں پر ہمارے بعض واجب التعظیم مرہٹہ مورخوں نے زور دیا ہے وہ زیادہ تر اُن کے قیاس و تخیل کا نتیجہ ہیں۔

خاتمہ

ہر قوم خواہ وہ کیسی ہی حقیر کیوں نہ ہو دنیا میں ایک حیثیت رکھتی ہے۔ یہی حال زبان کا ہے۔ زبانیں بھی قوموں کی طرح بڑھتی گھٹتی اور بدلتی ہیں۔ پھر وہ افراد اور اقوام کی طرح گرد و پیش کے حالات و اثرات اور دوسری زبانوں سے متاثر ہوتی ہیں جس طرح قومیں مختلف تعلقات کی وجہ سے ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اسی طرح زبانوں میں بھی ایک دوسرے سے رشتے ناتے ہیں۔ ایک زمانہ آئے گا جبکہ دنیا کی تمام قوموں کو نوع انسان کے حلقہ میں آکر ایک ہونا پڑے گا لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ وہ وقت کب آئے گا۔ یہ تخیل کی جولانیاں ہیں جو آیندہ کی تاریکی میں پنہاں ہیں اور اُن کے ظہور کی پیشین گوئی کرنا انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ زمانہ ایک روز آئے گا جب بنی نوع انسان ایک قوم اور ایک ذات ہو نگے اور تمام سفیہانہ اور شرمناک اختلافات جو اُس وقت ادنیٰ خود غرضیوں کی بدولت بہت اہم نظر آتے ہیں مٹ جائیں گے۔ لیکن زبانوں کا اختلاف پھر بھی باقی رہیگا۔ مگر اختلاف معاندانہ یا منافقانہ نہ ہوگا بلکہ تمدن اور علم و تہذیب کو فروغ دیگا اور ایک زبان دوسری زبان سے تقویت اور روشنی حاصل کریگی۔

مرہٹی اور ہندوستانی (اُردو) بہنیں بہنیں ہیں۔ دونوں ہندی نژاد اور دونوں آریائی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ کم و بیش دونوں نے فارسی کا دودھ پیا ہے اور آج کل دونوں پہلو بہ پہلو آباد ہیں۔ اس سے مرہٹوں اور مسلمانوں کے تعلقات کا صاف پتہ لگتا ہے۔ زبانوں کے قریبی تعلقات سے اُن قوموں میں بھی جو اُن زبانوں کو بولنے والی ہیں، قریبی تعلق اور ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے اور ہمدردی حیات کی روح رواں ہے۔

عبدالحق

اصول وضع اصطلاحات

حضرات محترم - میں آپ کے حسب الحکم آج اس مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ علمی اصطلاحات جو انگریزی زبان میں ہیں، اُن کے لئے اُردو میں نئی اصطلاحات وضع کی جائیں، یا اُنھیں اصطلاحات کو بدستور قایم رکھنا چاہیئے۔

جناب والا - میں اس رائے کا حامی ہوں کہ یورپین زبانوں کی تمام اصطلاحات کے لئے اُردو اصطلاحات وضع کرنی چاہیئں ۔ اس مسئلہ پر میں تیس برس سے غور کر رہا ہوں۔

میرے دلایل حسب ذیل ہیں۔

(اوّل) یہ کہ ہم انگریزی اصطلاحات یا الفاظ کو اُردو زبان میں صحیح طور سے نہیں لکھ سکتے۔ اس باب میں پنجاب اور بعض دیگر صوبوں میں بہت کوشش کی گئی ہے۔ مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

(دوم) یہ کہ انگریزی زبان کی اصطلاحات یا الفاظ کو اس ملک کے عام آدمی صحیح طور سے نہیں بول سکتے وہ ہماری زبان اور لب لہجہ کے لحاظ سے کرخت اور ناموزوں ہیں۔

(سوم) یہ کہ وہ الفاظ اصطلاحی جن مادّوں سے بنائے گئے ہیں، یا جن اجزاء سے مرکب کئے گئے ہیں، وہ مادّے اور وہ اجزا اس ملک کے باشندوں کے لئے غیر مانوس ہیں اور کسی طرح گوش آشنا نہیں ہیں۔ سائکالوجی یا نفسیات کے لحاظ سے اُن الفاظ کے یاد رکھنے میں زیادہ آسانی ہوتی ہے۔ جن کے مادّے یا اجزا پہلے سے مانوس اور گوش آشنا ہوں۔

(چہارم) یہ کہ ہم نے یونیورسٹی کے صرف چند طلبا ہی کو تعلیم دینا اپنے ذمّے نہیں لیا ہے، بلکہ ہماری دلی تمنّا یہ ہے کہ علوم جدیدہ ہمارے گھروں کے اندر داخل ہوں اور عوام کو بھی جو انگریزی زبان نہیں جانتے اُن علوم تک دسترس ہو۔ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے۔ جب کہ علمی اصطلاحات ہماری مادری زبان میں ہوں اور وہ ایسے مادّوں اور اجزا سے بنائی گئی ہوں جن سے عام پڑھے لکھے آدمی پہلے سے

مانوس ہوں۔

(پنجم) یہ کہ علوم جدیدہ کی تعلیم اُردو زبان میں دینے سے ہمارا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اُردو زبان ترقی کرے اور اُس کا دایرہ وسیع ہو۔ اگر ہم اُردو زبان میں اصطلاحات نہ بنائیں، بلکہ انگریزی اصطلاحات بجنسہ اس میں داخل کر دیں تو اس سے زبان کی ترقی نہیں ہوگی۔ بلکہ اُس کے قدرتی خط وخال اور حسن وجمال پر پانی پھر جائے گا ہر مہذب اور شایستہ زبان میں ایسے الفاظ جو باہر سے آکر داخل ہوتے ہیں اور جو اس زبان کی قدرتی ساخت کے مطابق نہیں ہوتے اور اس لئے ناموزوں اور کرخت معلوم ہوتے ہیں، بمقابلہ اُس زبان کے اصلی الفاظ کے ہمیشہ نہایت کم ہوتے ہیں۔ اُردو زبان میں اس وقت تقریباً پچپن ہزار الفاظ شامل ہیں۔ انگریزی زبان کے علمی الفاظ اس تعداد سے بہت زیادہ ہیں۔ اگر ہم اُن الفاظ کو داخل کریں گے، تو ہماری زبان میں ایسا عظیم الشان انقلاب ہوگا، جس کا یہ زبان کسی طرح تحمل نہیں کر سکتی۔ زبان کی ترقی کے معنے ہمیشہ یہ لئے گئے ہیں کہ جو نئے الفاظ زبان میں داخل ہوں، وہ اس زبان کی قدرتی ساخت اور گرامر کے مطابق بنائے گئے ہوں اور اُنکے مادّے یا اجزا حتی الامکان پہلے سے گوش آشنا اور مانوس ہوں۔

اگر کہا جائے کہ انگریزی کے الفاظ بجنسہ داخل نہ کئے جائیں، بلکہ پہلے اُردو زبان کی خراد پر چڑھائے جائیں اور اُن میں تغیّر وتبدّل کر لیا جائے تو اس کی نسبت بھی یہی دلیل کافی ہے، کیونکہ ان الفاظ میں کیسی ہی تراش خراش کی جائے، اجنبیت کی بو اُن میں ضرور باقی رہے گی اور ایسے الفاظ ہمیشہ ہر مہذب اور ترقی یافتہ زبان میں اُس زبان کے اصلی اور طبعی الفاظ کے مقابلہ میں بہت کم ہوتے ہیں۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو اس صورت میں بھی ہماری زبان میں ایسے الفاظ کی تعداد اصلی الفاظ سے بہت بڑھ جائے گی۔ اور اس سے زبان کی قدرتی لطافت ملیامیٹ ہو جائے گی۔

(ششم) یہ کہ یورپ کی زبانیں ایرین ہیں اور ہماری زبان بھی ایرین ہے، مگر لاطینی اور یونانی زبانیں جن سے علمی اصطلاحات بنائی گئی ہیں، اُن کو ہماری زبان سے بہت بُعد ہے۔ برخلاف اُس کے یورپ کی زبانوں سے وہ بہت قریب ہیں، اس لئے کہ لاطینی اور یونانی زبانوں کے ہزاروں مادّے ادل بدل کر یورپ کی اکثر زبانوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ اس بنا پر لاطینی اور یونانی زبانیں ممالک یورپ کے لئے مشترک علمی

زبانیں تسلیم کی جاسکتی ہیں، مگر اُردو بولنے والے ملک کے لئے وہ مشترک علمی زبانیں نہیں ہوسکتیں۔

(ہفتم) یہ کہ ہم نے اُردو زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا ہے اور اس کے ساتھ انگریزی زبان کو لازمی رکھا ہے۔ اس طریقۂ تعلیم سے دو فائدے ہونگے۔ پہلا فائدہ یہ ہوگا کہ ہماری یونیورسٹی کے طلبا تمام علوم کو مادری زبان میں آسانی کے ساتھ سیکھ سکیں گے اور اُن کو عوام میں جو انگریزی زبان نہیں جانتے اور جن کی تعداد بہت زیادہ ہے سہولیت کے ساتھ پھیلا سکیں گے اور اس روشنی کو ہمارے گھروں کے اندر داخل کرسکیں گے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ انگریزی زبان جاننے کے سبب ہماری یونیورسٹی کے طلبا یورپ کی جدید تحقیقات اور معلومات پر ہمیشہ مطلع ہوتے رہیں گے۔ اُن کو انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں کی علمی اصطلاحیں بالمقابل معلوم ہونگی۔ اُن کا دایاں ہاتھ اُن علمی خزانوں تک پہنچ سکے گا، جو یورپ کے علمانے فراہم کئے ہیں اور بائیں ہاتھ سے وہ اُن خزانوں کے جواہر کو اس ملک کے عام باشندوں پر نثار کریں گے۔ غرضکہ یہ طلبا مشرق اور مغرب کے درمیان واسطہ ہونگے اور ایک طرف سے علمی روشنی حاصل کریں گے اور دوسری طرف اس روشنی کو عوام میں پھیلائیں گے۔

اگر اس موقع پر کہا جائے کہ انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں کی علمی اصطلاحوں سے طلبا کے حافظہ پر بار پڑیگا، تو میں کہوں گا کہ اس بار کا برداشت کرنا ناگزیر ہے اور یہ اس عظیم الشان فائدے کے مقابلہ میں بالکل ہیچ ہے، جو اس طریقہ سے ہمارے ملک کو حاصل ہوگا آخر ہم اب بھی اپنے طلبا کو دو اور بعض اوقات تین زبانیں سکھاتے ہیں، مثلاً اگر وہ جانتے ہوں کہ ایک خاص قیمتی دہات کو اُردو میں سونا، فارسی میں زر، عربی میں ذہب اور انگریزی میں گولڈ کہتے ہیں، تو اس بات کی شکایت نہیں کی جاتی کہ ایک مفہوم کے لئے ان مختلف الفاظ کا جاننا اُن کے حافظہ پر بار ڈالنا ہے۔

(ہشتم) کہا جاتا ہے کہ انگریزی اصطلاحات جن معنوں کو ادا کرتی ہیں، وہ معنے ہماری نئی اصطلاحات سے سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ کیونکہ انگریزی اصطلاحات ایک مدت دراز کے استعمال کے بعد اپنے معنے بتانے لگی ہیں۔ نئی اصطلاحوں کو یہ بات حاصل نہیں ہوسکتی۔ مگر نئی اصطلاحات کے خلاف یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔ انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں میں جو اصطلاحات موجود ہیں، وہ ہمیشہ سے نہیں پائی جاتیں۔ ہر اصطلاح ایک خاص وقت میں وضع کی گئی ہے۔ اُس وقت یہی اعتراض بجنسہ اُن اصطلاحات پر بھی ہوسکتا تھا۔ اس کے علاوہ یورپ

کی زبانوں میں اصطلاحات کا بننا رُک نہیں گیا۔ ہر روز نئی اصطلاحات بنتی رہتی ہیں اور یہی اعتراض اُن پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ اصلی بات یہ ہے کہ یہ کام ملک کے صیغۂ تعلیمات کا ہے کہ جو علمی الفاظ خاص معنوں کے لیے وضع کیے جاتے ہیں وہ اُن الفاظ کو اُن معنوں کے ساتھ رائج کرتا ہے۔ تعلیم پانے کے بعد چند ہی روز میں وہ الفاظ ہر طالب علم کی زبان پر جاری ہوتے ہیں۔ طلبا اپنی تحریر اور تقریر میں اُن الفاظ کو برابر استعمال کرتے ہیں۔ پھر عام آدمی بھی اُن الفاظ کو اُنھیں معنوں میں سمجھنے لگتے ہیں۔ مثلاً پنجاب کے مدارس میں سائنس کی جو کتابیں اردو میں پڑھائی جاتی ہیں، اُن کے اصطلاحی الفاظ اُن تمام طلبا کی زبانوں پر ہیں، جنھوں نے اُن مدارس میں تعلیم پائی ہے۔ اس ملک کا صیغۂ تعلیمات بھی یہ کام اُسی طرح انجام دے سکتا ہے، جس طرح ممالک یورپ کے صیغہ ہائے تعلیم انجام دے رہے ہیں۔ ہماری یونیورسٹی کے طلبا کی زبان اور قلم سے جب ہماری نئی اصطلاحیں نکلیں گی، تو اُن اصطلاحی سے بے تکلف وہ معنی سمجھ میں آنے لگیں گے، جن کے لیے وہ وضع کی گئی ہیں۔ پھر عام آدمی بھی اُن کی تقلید کریں گے اور لوگوں کے گھروں میں بھی وہ اصطلاحیں جاری ہو جائیں گی۔ یہی طریقہ ہے جس سے اصطلاحیں اپنا مفہوم قایم کرتی ہیں۔ ورنہ اصطلاحیں خود بخود اپنی معنے نہیں بتایا کرتیں اور لوگوں پر آسمان سے اصطلاحوں اور اُن کے معنوں کے متعلق کوئی وحی نازل نہیں ہوا کرتی۔

(نہم) یورپین اصطلاحات کے حامی ان اصطلاحات کی حمایت میں ایک لطیفہ بھی بیان کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جب علوم جدیدہ کے ایجاد کرنے والے یورپ کے علما ہیں، تو جو خیالات اُنھوں نے ایجاد کیے ہیں، یا جو معلومات اُنھوں نے پیدا کی ہیں، اُن کے نام رکھنے کا حق اُن کو اسی طرح حاصل ہے جس طرح والدین کو اپنی اولاد کے نام رکھنے کا حق ہوتا ہے۔ اس بنا پر یورپ کی اصطلاحیں بغیر کسی تغیّر و تبدّل کے دوسرے ملکوں میں جاری ہونی چاہئیں۔ میں اس لطیفہ کا جواب بجز اس کے اور کچھ دینا نہیں چاہتا کہ جب کوئی یورپ کا باشندہ مسلمان ہوتا ہے تو اُس کا وہ نام بدل دیا جاتا ہے جو والدین نے بچپن میں عطا کیا تھا اور ایک نیا اسلامی نام اس کو عطا کیا جاتا ہے۔

(دہم) کہا جاتا ہے کہ سب سے بڑی مشکل کیمیائی ناموں، علامتوں اور اُن کے فارمولوں میں ہے اگر ہماری زبان میں کیمیائی نام جداگانہ رکھے جائیں، تو اُن کی علامتیں بھی جو اُن کے ناموں کے شروع کے حرفوں کو مختصر

کرنے سے مقرر کی جاتی ہیں، یورپ کی کیمیائی علامتوں سے جداگانہ ہونگی اور اس صورت میں جو فارمولے
بنائے جائیں گے، وہ اُن فارمولوں سے الگ تھلگ ہونگے، جو یورپ کے کیمیا دانوں میں مستعمل اور رائج ہیں
ایسا کرنے سے ہمارے طلبار کا رشتہ یورپ کی علمی دنیا سے باقی نہیں رہیگا اور وہ ایک اُلجھن اور پریشانی
میں پڑجائیں گے اور اُن کو یورپ کے کیمیائی فارمولوں کا سمجھنا جو جدید کیمیائی مرکبات کے لئے بنائے جائیں گے
نہایت مشکل ہوگا۔ مگر میرے نزدیک یہ اشکال کچھ زیادہ اہم نہیں ہے اور جو درجہ اس اشکال کو دیا جاتا ہے،
وہ اس درجہ کا مستحق نہیں ہے۔ ہم میں سے بہت سے آدمی ہیں، جو ابجد کے حرفوں کی ترتیب اور اُن حرفوں
کی اعدادی قیمتوں سے واقف ہیں۔ اگر اُن کے سامنے کوئی تاریخ پیش کی جاتی ہے، تو وہ بے تکلف اُس
تاریخ کے حرفوں کے اعداد اپنے ذہن میں جمع کر لیتے ہیں اور بغیر لکھے ہوئے وہ آپ کو زبانی طور سے وہ سنہ
بتا دیتے ہیں، جو اس تاریخ سے نکلتا ہے۔ ابجد کے حرفوں کی ترتیب اور اُن حرفوں کی اعدادی قیمتیں تھوڑی سی
مشق سے یاد ہو جاتی ہیں اور وہ ہر وقت بغیر کسی دقت کے حرفوں کو اعداد میں اور اعداد کو حرفوں میں تبدیل
کر سکتے ہیں۔ کیمیائی عناصر کے نام محدود ہیں اور اُن کی علامتیں بھی محدود ہیں جو علامتیں ہم نے اپنے وضع کئے
ہوئے کیمیائی ناموں کے لئے تجویز کی ہیں، وہ انگریزی کیمیائی علامتوں کے ساتھ طلبار کو تھوڑی سی
محنت سے یاد کرائی جا سکتی ہیں اور تھوڑی سی مشق اور مزاولت سے یہ بات اُن کو حاصل ہو سکتی ہے کہ جب
کوئی انگریزی کیمیائی فارمولہ اُن کی نظر سے گزرے، تو وہ اُس کو اُردو کیمیائی فارمولے میں تبدیل کر سکیں اور
جب کوئی اُردو کیمیائی فارمولہ اُن کی نظر کے سامنے ہو، تو اُس کو انگریزی کیمیائی فارمولے میں تبدیل کر دیں
مثلاً ہیڈروجن کی انگریزی علامت H ہے جو اُردو میں حمضین کی علامت ح کے ساتھ یاد کرائی جا سکتی ہے۔
اسی طرح کلورین کی انگریزی علامت CL ہے اور اس کے مقابل اُردو نام سبزین کی علامت س ہے
نائیٹروجن کے انگریزی علامت N ہے اور اس کے مقابل اُردو نام شورین کی علامت ش ہے۔ آکسیجن کی
انگریزی علامت O ہے اور اس کے مقابل اُردو نام مائین کی علامت م ہے۔ آیوڈین کی انگریزی علامت I
ہے۔ اور اس کے مقابل اُردو نام بنفشین کی علامت ب ہے۔

گویا H بمقابلہ ح، CL بمقابلہ س، N بمقابلہ ش، O بمقابلہ م، I بمقابلہ ب اور اسی طرح

باقی علامات بالمقابل یاد کرائی جاسکتی ہیں اور یہ تھوڑی سی محنت سے حافظہ پر نقش ہوسکتی ہیں اور تھوڑی سی مشق سے یہ بات حاصل ہوسکتی ہے کہ فارمولوں میں ایک قسم کی علامات کو دوسری قسم کی علامات سے ہمارے طلبا تبدیل کرسکیں۔ کیمیائی فارمولوں کے لکھنے کا طریقہ ہماری زبان میں بجنسہ وہی رکھا گیا ہے، جو انگریزی زبان میں ہے فرق اگر ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ انگریزی میں بائیں طرف سے دائیں طرف لکھا جاتا ہے اور ہماری زبان میں دائیں طرف سے بائیں طرف اس طریقۂ تعلیم سے نہ ہمارے طلبا کسی اُلجھن میں پڑیں گے اور نہ مغربی اصطلاحات کی انٹرنیشنلٹی (بین قومیت) کو کوئی صدمہ پہنچے گا۔ اس طریقہ سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ کیمیائی علوم جن پر آجکل کی صنعتوں اور حرفتوں کا مدار ہے، آسان ہوکر ہمارے گھروں میں داخل ہوجائیں گے اور عام لوگ جو انگریزی نہیں جانتے اُن کو بے تکلف سیکھ سکیں گے۔ برخلاف اس کے اگر ہم انگریزی کیمیائی مرکبات کے نام بجنسہ رہنے دینگے اور کیمیائی عناصر کے نام اور ان کی علامات بھی وہی رہنے دیں گے، جو انگریزی میں ہیں، تو اُس سے کیمیائی معلومات ایک خاص طبقہ میں محدود رہیں گی جو انگریزی جانتا ہے اور اُن سے اس ملک کے عام باشندے جو انگریزی زبان سے نابلد ہیں، مستفید نہیں ہوسکیں گے۔ ہماری یونیورسٹی برخلاف ہندوستان کی دیگر یونیورسٹیوں کے اس غرض سے قایم کی گئی ہے کہ وہ علمائے سائنس کی ایک ایسی جماعت تیار کرے جو علوم جدیدہ کی تعلیم عام لوگوں میں پھیلائے اور ان علوم سے مستفید ہونے کا موقع اُن کے لئے بہم پہنچائے۔ اگر یہ مقصد ہماری یونیورسٹی کا تسلیم نہ کیا جائے تو پھر ہماری یونیورسٹی اور ہندوستان کی دیگر یونیورسٹیوں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ یہ کام یعنی چند ایسے طلبا کا مہیا کرنا جو خود تو علوم جدیدہ سے واقف ہوں، مگر اپنے عام ہموطنوں تک اُن علوم کی روشنی کو نہ پہنچا سکیں، ہندوستان کی تمام یونیورسٹیاں انجام دے رہی ہیں۔ اُن کے ہوتے اس یونیورسٹی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر یورپ کی صرف وہ اصطلاحیں اُردو میں قایم رکھی جائیں، جو کیمیا یا کسی خاص علم کے متعلق ہیں اور باقی علوم کی نسبت اجازت دی جائے کہ اُن کی اصطلاحات کے مقابل اُردو اصطلاحیں وضع کرلی جائیں تو یہ اُس یکسانیت کے خلاف ہوگا جو علوم میں درکار ہے۔ اس صورت میں ایک طرف تو ایک علم یا چند علوم کی اصطلاحیں ہمارے ہاں انگریزی کی ہونگی جن کے سمجھنے میں دقت ہوگی اور جو ہماری زبانوں پر مشکل سے چڑھینگی اور دوسری طرف علوم کی وہ اصطلاحیں ہونگی جن کے الفاظ کے مادّے اور اجزا ہمارے لئے مانوس اور گوش آشنا ہونگے۔ کیا ہمارے

اس طریقۂ تعلیم پر "آدھے تیتر آدھے بٹیر" کی مثل صادق نہیں آئیگی۔ اگر دوسری صورت یہ اختیار کی جاے کہ تمام اصطلاحات انگریزی سے لی جائیں اور وہ بجنسہ اُردو میں رائج کی جائیں تو وہ تمام دشواریاں پیش آئینگی، جن کو میں پہلے بیان کرچکا ہوں۔ کیا ان مشکلات سے بچنے کا یہی آسان طریقہ نہیں ہوگا کہ ہم اُردو زبان کو ذریعۂ تعلیم نہ قرار دیں، بلکہ انگریزی زبان ہی میں ان علوم کی تعلیم اپنے طلبا کو دیں۔ اس حالت میں بھی ہماری یونیورسٹی کا وجود محض بیکار ہوگا اور اس مطلب کے لئے ہندوستان کی دیگر یونیورسٹیاں کافی خیال کی جائیں گی۔

(یازدہم) جدید اصطلاحات کے برخلاف ایک اور بات بھی سُنی جاتی ہے۔ مغربی اصطلاحات کے حامی کہتے ہیں کہ کیمیا دانوں نے جو نام کیمیائی چیزوں کے رکھے ہیں، انھیں ناموں سے وہ چیزیں بازار میں مل سکتی ہیں۔ اگر اُن چیزوں کے نئے نام لئے جائیں، تو اُن کو تاجر اور دکاندار نہیں سمجھیں گے اور تجارت میں مشکلات پیش آئیں گی۔ مگر یہ اعتراض بھی صحیح نہیں ہے۔ ہزاروں چیزیں اب بھی ایسی موجود ہیں، جن کے نام انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں ہیں۔ جب ہم یورپ سے وہ چیزیں طلب کرتے ہیں، تو مطالبہ اشیا کی درخواست انگریزی زبان میں ہوتی ہے اور اُس میں وہی نام استعمال کئے جاتے ہیں، جو انگریزی زبان میں رائج ہیں برخلاف اس کے جب ہم اُن چیزوں کو اپنے ہموطنوں کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں، تو اُن کے وہ نام لیتے ہیں، جو ہماری زبان میں ہیں۔ ہماری جدید اصطلاحات جب طلبا کے ذریعہ سے عام اور رائج ہوجائیں گی، تو ہمارے تاجر اور دکاندار بھی اُن ناموں سے رفتہ رفتہ واقف ہوجائیں گے اور اُن کو آسانی سے یاد کرلیں گے۔ انگریزی نام اُن کو تجارتی ضرورت نے یاد کرائے ہیں۔ یہی تجارتی ضرورت اُن کو مجبور کرے گی کہ جو نئے نام اشیاء کے ہماری زبان میں رکھے گئے ہیں، اُن پر وہ اطلاع حاصل کریں اور گاہکوں کو اپنی دکانوں سے ناکام نہ جانے دیں۔ بازار کی یہ مشکلات بس اُسی وقت تک باقی رہیں گی، جب تک کہ ہمارے بنائے ہوئے نام عام اور رائج نہ ہوں۔ اُنکے عام اور رائج ہونے کے بعد پھر کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔

(دوازدہم) بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ جاپان میں یورپ کی علمی اصطلاحوں کو جاپانی زبان میں تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس میں جاپانیوں کو ناکامی ہوئی ہے۔ مجھے اس واقعہ کا صحیح علم نہیں ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو میں اس ناکامی کے معنے نہیں سمجھا۔ اگر جاپانیوں نے یہ کوشش کی ہوگی کہ اُن کی بنائی ہوئی

اصطلاحوں کو جو انھیں کی زبانوں میں تھیں، یورپ کے لوگ اختیار کریں، تو اس میں ذرا شبہ نہیں ہے کہ اُن کو ضرور ناکامی ہوئی ہوگی۔ لیکن اگر انھوں نے اپنی زبان کی اصطلاحات کو اپنے ہی ہموطنوں میں پھیلانا چاہا ہوگا، تو اُس میں ناکام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے یہ کام جاپان کا صیغۂ تعلیمات نہایت آسانی سے انجام دے سکتا تھا۔ اسی ذیل میں مصر اور شام کی ناکامی کا ذکر بھی کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ مصریوں اور شامیوں نے مجبور ہو کر یورپ کی علمی اصطلاحوں کو عربی زبان میں معرب کر لیا ہے اور وہ اپنی خاص اصطلاحات ان اصطلاحات کے مقابل قایم نہیں کر سکے۔ یہ ناکامی دوسری قسم کی ہے۔ علمی زبان میں جہاں بہت سے مفرد مادّوں کی ضرورت پیش آتی ہے، وہاں اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ اُن مفرد مادّوں کو مرکب کر سکیں اور اُن مرکبات کی گردان کر کے اُن سے اور نئے نئے مشتقات پیدا کر سکیں۔ یہ قابلیت ایرین زبانوں میں ہے۔ شامی زبانوں میں جن میں سے ایک عربی ہے، یہ لچک نہیں ہے۔ اس بنا پر مصری اور شامی یورپ کی اصطلاحات کے مقابلہ میں عربی زبان کی اصطلاحات وضع نہ کر سکے۔ برخلاف اس کے ہماری زبان "اُردو" ایرین ہے۔ اُس میں وہ تمام طریقے مفرد اور مرکب الفاظ وضع کرنے کے موجود ہیں جو یورپ کی زبانوں میں ہیں اور اُس میں علمی زبان بننے کی کافی قابلیت موجود ہے۔ اگر ہم اس لچک سے کام لیں جو قدرتی طور سے ہماری زبان میں موجود ہے تو ایک دن ہماری زبان یورپ کی ترقی یافتہ علمی زبانوں کی ہمسری کریگی اس خاص مسئلہ پر میں نے ایک بسیط کتاب لکھی ہے، جو اس وقت میرے ہاتھ میں ہے۔ اس میں اُردو زبان کی قدرتی بناوٹ پر بحث کی گئی ہے۔ وہ تمام طریقے تفصیل کے ساتھ معہ مثالوں کے درج کئے گئے ہیں، جو مفرد اور مرکب الفاظ وضع کرنے کے لئے ہمارے اسلاف نے ہم کو بتائے ہیں۔ پھر انھیں طریقوں کو پیش نظر رکھکر مفرد اصطلاحات اور مرکب اصطلاحات بنانے کے قاعدے شرح و بسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ یہ مسوّدہ عنقریب چھپنے والا ہے اور آپ حضرات کے ملاحظہ سے اور تمام ملک کی نظر سے گزرے گا۔ اس وقت اس کتاب کے مطالب کا خلاصہ بیان کرنا طوالت اور ملامت کا باعث ہوگا۔ اس لئے میں نے اس ارادہ کو ترک کر دیا ہے اور صرف مسئلہ زیر بحث پر اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔

اس موقع پر اے حضراتِ محترم! میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ کروڑوں باشندے جو اُردو زبان

بولتے یا سمجھتے ہیں اُن کی نظریں آپ کی طرف اُٹھی ہوئی ہیں۔ اعلیٰ حضرت تاج دارِ دکن خلد اللہ ملکہ کی توجہ سے خدا نے صدیوں کے بعد یہ ایک نادر موقع آپ کو دیا ہے کہ آپ اُردو زبان کو علوم جدیدہ کے لئے ذریعۂ تعلیم قرار دیں اور عثمانیہ یونیورسٹی سے آپ ایک ایسی جماعت طلبا کی تیار کریں، جو ایک طرف تو انگریزی زبان جاننے کی وجہ سے یورپ کے علوم سے اور یورپ کے علما کی نئی تحقیقات سے بے تکلف مطلع ہو سکیں۔ اور دوسری طرف اپنے ہموطنوں کو جو انگریزی زبان نہیں جانتے، ان علوم کی قدیم اور جدید تحقیقات سے فیضیاب کر سکیں اور علم کو بادلوں سے اُتار کر ہمارے گھروں کی چار دیواری میں داخل کر سکیں پھر یہ موقع بھی آپ کو حاصل ہے کہ اُردو زبان کی پیشانی پر علمی لحاظ سے مفلس ہونے کا جو داغ نمایاں ہے، اُس کو اپنے مبارک ہاتھوں سے مٹا سکیں اور اس زبان کے دائرہ کو وسیع کر کے اُس کو ترقی کے اُس بلند درجہ پر پہنچا سکیں، جس کا حق اُس کو اپنی قدرتی بناوٹ اور طبعی لچک کی وجہ سے حاصل ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہنا چاہیئے کہ جو خواب سر سید مرحوم، نواب محسن الملک مرحوم، نواب وقار الملک مرحوم اور ہماری قوم کے دیگر بزرگوں نے دیکھا تھا، اُس خواب کا سچا کر دکھانا اور اُس کی تعبیر کا نمایاں کرنا آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ہماری تمام قوم اس وقت گردنیں اُٹھائے آپ کی طرف نہایت اشتیاق اور اضطراب سے دیکھ رہی ہے کہ آپ اس نادر موقع سے کیا کام لیتے ہیں اور ہماری قوم کے علمی مستقبل اور اُردو زبان کی قسمت کی نسبت آپ کیا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ آپ حضرات کے نام ہماری قوم کی آیندہ تاریخی صفحات پر زرّیں حروف میں لکھے جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ آیندہ نسلیں جو کسی کی رعایت نہیں کرینگی اور جو اپنی رائے دینے میں آزاد ہونگی، آپ کی نسبت دوسرا فتویٰ دیں۔ غرضکہ یہ سب کچھ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

آخر میں اگر گستاخی نہ خیال کی جائے تو میں یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس بات کا فیصلہ کہ انگریزی زبان کی علمی اصطلاحات اُردو زبان میں بجنسہٖ قایم رکھی جائیں یا اُن کے مقابل اُردو اصطلاحات وضع کی جائیں، پہلے کئی بار غلبۂ آرا سے ہو چکا ہے اور وہ فیصلہ یہ تھا کہ انگریزی زبان کے علمی اصطلاحات کے مقابل اُردو زبان میں اصطلاحات وضع کی جائیں۔ اس سے علم کیمیا یا کوئی دوسرا علم مستثنیٰ نہیں کیا گیا تھا۔ اسی فیصلہ کی بنا پر اب تک کام ہوتا رہا ہے اور کام کا ایک معتد بہ حصہ انجام پا چکا ہے۔ آج پھر یہ مجلس اسی فیصلہ پر نظر ثانی کرنے اور شاید اس کے خلاف نیا فیصلہ صادر کرنے کے لئے منعقد ہوئی ہے اور اس کے ارکان

وہ نہیں ہیں، جو پہلے جلسوں کے ارکان تھے۔ اگر پہلے جلسوں کا فیصلہ اس مجلس کے ذریعے مسترد ہو سکتا ہے اور اس کو قطعی فیصلہ نہیں سمجھ سکتے، حالانکہ اس فیصلہ کے مطابق بہت سی کتابیں تیار ہو چکی ہیں اور بہت سا روپیہ محض اصطلاحات کے وضع کرنے پر صرف کیا جا چکا ہے، تو پھر موجودہ مجلس کا فیصلہ، اگر پہلے فیصلہ کے برخلاف ہو کس دلیل سے قطعی خیال کیا جائیگا؟ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آیندہ کوئی اور مجلس قایم ہو اور اس میں آپ حضرات جلوہ افروز نہ ہوں، بلکہ دوسرے حضرات ان کرسیوں پر متمکن ہوں اور وہ اس فیصلہ کو الٹ دیں اور دار الترجمے اور جامعہ کو اس طرح نئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے، جس طرح کہ اب آپ کے سنئے فیصلہ پر کرنا پڑے گا۔ حضرات کرام کو اس بات کا خاص طور سے لحاظ فرمانا چاہئے کہ اگر ہم نے اپنے فیصلوں میں تلوّن کا ثبوت دیا، تو پھر جمہور کا خیال ہماری نسبت، ہمارے دار الترجمہ کی نسبت، ہمارے جامعہ کی نسبت اور ہمارے طریقۂ تعلیم کی نسبت کیا ہوگا۔ چونکہ یہ مسئلہ کسی شخصی رائے سے تعلق نہیں رکھتا اور اہل دکن کے لئے بھی محدود نہیں ہے، بلکہ یہ مسئلہ وسیع معنوں میں ایک قومی اور ملکی مسئلہ ہے اور اس پر ہندوستان کے تمام مسلمانوں، بلکہ سارے ہندوستانیوں کی نظر ہے، اس بنا پر میں نے ان آخری کلمات کے عرض کرنے کی جسارت کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ حضرات کرام اس مسئلہ کی اہمیت پر لحاظ کر کے میری اس جسارت کو معاف فرمائیں گے۔

وحید الدین سلیم

یونانی علم ادب (۲)

ارسطو نے "حیوانات" کے متعلق جو تحقیقات شایع کی اُس نے علوم تجربی کا ایک نیا باب کھول دیا تھا اور اُس کے جانشین شاگرد تھیو فراسطو (س) نے اسی طرز پر "نباتات" کے متعلق دو ضخیم کتابیں تحریر کیں۔ لیکن اوّل تو خود اُس کی ادبی شہرت کا اصلی سبب وہ رسالے ہیں جن میں اُس نے "خوشامدی" "شیخی باز" "کم ظرف" وغیرہ بری صفات کے اشخاص کا خاکہ اُڑایا ہے۔ دوسرے اصل یہ ہے کہ اہل یونان پر مدرسۂ مشّائین کی جن تصانیف کا سب سے زیادہ اثر پڑا وہ "فلسفۂ اخلاق" کے موضوع پر تھیں۔ اِن میں سب سے بڑی کتابیں "اخلاق یو دموسی" اور "اخلاق کبیر" ہیں[۱] جن میں ارسطو کے شاگردوں نے اپنے اُستاد کی اخلاقی تعلیم بیان کی ہے اور فلسفۂ سقراط و افلاطون کے خلاف ثابت کرنا چاہا ہے کہ نیکی یا عمدہ اخلاق "ذوق سلیم" سے پیدا ہوتے ہیں "عقل سلیم" سے ان کا کچھ تعلق نہیں!

ابی کیور اور زینو | ارسطو کے فلسفۂ اخلاق کا دوسرا اصول یہ تھا کہ انسان کے تمام کاموں کا مقصود "مسرّت" ہے اور مسرّت اُس کیفیت کو کہتے ہیں جو انسانی قوتوں کے بہترین اور مناسب ترین استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ اُس کی اسی تعلیم پر ابی کیور (س ۳۴۱ تا ۲۷۰ ق م) نے اپنے خطرناک فلسفہ اخلاق کی بنیاد قایم کی، ارسطو کی وفات کے وقت اس کی عمر بیس سال کی تھی لیکن تھوڑے ہی دن بعد سے اس کی تعلیم کا چرچا ہونے لگا اور اتھنز کے باغات یا سیر و تفریح کے مقامات میں جا جا کر وہ اپنے شاگردوں کو وقتی لذات کے حصول کا وہ سبق دینے لگا جس کی بنا پر اس تعلیم کو "فلسفہ لذاتیہ" کہنے لگے ہیں اگرچہ مذکورہ بالا سیر گاہوں کی خصوصیت سے اول اوّل اسے "فلسفہ بستانیہ" بھی کہتے تھے!

اس تعلیم نے جس کا اصلی ''... چاہیے اہل یونان کے اخلاق کی بنیادیں ہلا دیں۔ یونانی بالطبع دنیا پرست تھے اور ا... ... ق م) مقدونیہ نے اُن کی آزادی چھین کر، اُن کے وطنی اور قومی جذبات کو بھ... ...یور کا فلسفہ اُن میں بہت مقبول ہوا اور اس کے مقابلے میں زینو

---

[۱] پہلی کتاب ...ema کا بڑا حصہ ارسطو کے شاگرد یو دموس (س) نے لکھا تھا مگر دوسری کتاب ...oralia ...ف کے نام کا اب پتہ نہیں چلتا۔

کے "فلسفہ رواقیہ" کو یونان میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی، یہ حکیم اپی کیورکا ہمعصر تھا (۳۴۲ء تا ۲۷۰ء ق م)
اور اس نے سقراطی فلسفے کی تجدید کرنی چاہی تھی مگر یونان خاص میں بہت کم لوگوں نے اس کی پیروی کی اور
"فلسفہ رواقیہ" کو جو کچھ فروغ ہوا وہ ایک عرصہ بعد شہر رومہ میں حاصل ہوا۔

شام و مصر میں یونانی علم ادب کی ترقی

الغرض کچھ تو اپی کیورکی تعلیم کے اثر سے اور کچھ غیروں کی محکومی کی بدولت یونان کی علمی سرگرمی کم ہوگئی، قوموں کے بُرے اخلاق و اعمال قوائے ذہنی کو ضعیف کر دیتے ہیں۔ محکومی سے اُن کے خیالات و جذبات پست ہوجاتے ہیں۔ اہل یونان سے بھی اب کسی اعلیٰ درجے کے دماغی کام کی توقع نہ ہوسکتی تھی اور آیندہ عرصہ دراز تک "یونان خاص" میں کوئی بڑا شاعر یا انشا پرداز عالم پیدا نہیں ہوا۔ البتہ سکندر کے بعد شام و مصر میں جو یونانی یا نیم یونانی سلطنتیں قایم ہوئیں اُن کے درباروں میں علم و ہنر کی بہت قدر تھی اور تیسری صدی قبل مسیح علیہ السلام سے شہر سکندریہ علم و فضل کا مرکز بن گیا تھا۔ شاہ بطلیموس اوّل نے یہاں جو عظیم الشان "میوزیوم"* تعمیر کیا تھا، یونانی زبان کی شاید کوئی کتاب ایسی نہ ہوگی جو اُس کے کتب خانے میں موجود نہ ہو۔ اور مشہور ہے کہ اسی شاہانہ سعی و اہتمام کی بدولت کچھ عرصے بعد یہاں قریب قریب سات لاکھ قلمی نسخے جمع ہوگئے تھے! یونانی مصنفین معلّمین اور طلبہ کی کمال دریادلی کے ساتھ سلطنت کی جانب سے امداد کی جاتی تھی اور آیندہ چار صدی میں یہاں کے مدارس نے بہت سے نامور فاضل پیدا کئے جن کی محنت و عرق ریزی سے قدیم علم ادب کا بہت سا حصہ محفوظ رہا اور علم کے بعض نئے شعبے وجود میں آئے۔

شاعری

لیکن سکندریہ کے یونانی شعرا میں جن کا کلا[م] ... ظ ہے، صرف دو یعنی رودیوس اور
لی کوف رون قابل ذکر ہیں۔ پہلے کی رزمیہ مثنوی "ارگونوٹیکا" ا ... سے اچھی نظم سمجھی جاتی ہے
اور اس کا موضوع وہی قدیم افسانہ ہے جس میں ایک یونانی سورما (... می جہاز میں جانے اور
بہت سی مشکلات کے بعد "سنہری اون" لانے کا بیان کیا جا[تا] ... اگرچہ آورد سے
خالی نہیں تاہم خاصی دلچسپ ہے اور اس کے مقابلے میں لی کوف ر[ون] ... نے کے نقاد

---

* "میوزیوم" (میوزئم) آج کل مغربی زبانوں میں "عجائب خانہ" کا مرادف ہوگیا ہے لیکن اصل یونانی میں اس کا مفہو[م] ... دیویوں کا مقام یا معبد تھا۔

چنداں وقعت نہیں دیتے۔ اصل یہ ہے کہ عمدہ الفاظ اور نادر طرزِ بیان شاعری کا محض لباس اور سامان آرایش ہیں اس کی جان، پاکیزہ مذاق اور بلند خیالی کو سمجھنا چاہئے۔ اور یہ صفات اُن لوگوں میں کبھی پیدا نہیں ہوسکتیں جو ادنےٰ درجہ کی مادّی اغراض یا جسمانی لذّات کی تلاش میں منہمک ہیں یہی سبب ہے کہ نہ صرف یونان، بلکہ تمام یورپ کی شاعری میں شاذونادر کوئی نظم ایسی نظر آئے گی جس کا ذوق و وجدان پر کوئی عمدہ اور مستقل اثر پڑتا ہو ورنہ وہاں کے شعرا کا بڑا کمال یہی ہے کہ پرجوش الفاظ اور پراثر طرزِ بیان کے زور سے دلوں میں ہیجان و ولولہ پیدا کردیتے ہیں اور یہ وہ کام ہے جس میں شاعر کی حیثیت محض ایک "خطیب" کی سی رہ جاتی ہے۔ دورِ جاہلیت کی عربی شاعری میں بھی اِسی قسم کی خصوصیت موجود ہے لیکن قدیم اہلِ یونان کے متعلق تو یہ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ اُن کی تہذیب میں فنِ خطابت کا ابتدا سے بہت کچھ دخل تھا اور اُن کی، نیز بعد میں یورپ کی، شاعری میں ڈراما کو جو فروغ حاصل ہوا اس کا سب سے قوی سبب بھی یہی سمجھنا چاہئے کہ اس شاعری کا بنیادی عنصر خطابت تھی۔

اس قسم کی شاعری کے لئے ظاہر ہے کہ قومی حکومت و آزادی نہایت ضروری شے ہے جس کے بغیر خطیبانہ ولولے سرد پڑجاتے ہیں۔ پس حقیقت یہ ہے کہ یونانیوں کے مفتوح و محکوم ہونے کے ساتھ ہی اُن کی عمدہ شاعری کا دَور ختم ہوگیا۔ اور مصر و رومہ کی شاہانہ قدردانی بھی کوئی ایسا یونانی شاعر نہ پیدا کرسکی جو پنڈار یا سفاکلیس کا ہمرتبہ ہوتا۔ اور یہ دونوں پانچویں صدی قبل مسیح علیہ السلام کے شاعر تھے!

نثر البتہ مدارسِ سکندریہ میں یونانی زبان کے نثر نگار مصنفوں کی کچھ کمی نہ تھی جن کی سعی و قابلیت سے یونانی اوّل اوّل اسی زمانے میں متمدن دنیا کی علمی زبان بنی۔ اسکندریہ کے یونانی علما کی سب سے مفید ادبی خدمت یہ تھی کہ اُنھوں نے قدیم زبان کے تلفظ اور قواعد صرف و نحو کو محفوظ رکھنے کے لئے متعدد کتابیں لکھیں اور علم نحو کے ساتھ ساتھ فنِ تنقید و تحشیہ کی بنیاد ڈالی۔ اس کے علاوہ دوسری زبانوں کی جو مشہور کتابیں انھیں ملیں اُن کا یونانی میں ترجمہ کیا اور عبرانی توراۃ اسی دوسری صدی قبل مسیح علیہ السلام میں ترجمہ ہوکر یونانی زبان میں شایع ہوئی۔

سکندریہ کے اہلِ علم کی سرگرمی نیز یونانی نسل کے بادشاہوں کی سرپرستی نے جنوب مشرقی یورپ، مصر

اور مغربی ایشیا کے ممالک میں یونانی علوم کو ایسا رواج دیا کہ اب غیر قوم کے لوگ بھی یونانی زبان سیکھنا اور اس میں تصنیف و تالیف کرنا زیادہ مفید اور باعث فخر سمجھنے لگے۔ چنانچہ مانتھو (مصری) اور بروسوس (بابلی) نے مصر و خالدیہ کی قدیم تاریخیں یونانی زبان میں لکھکر شایع کیں (تیسری صدی ق م) اور یہ بروسوس وہی شخص ہے جسے ہماری عربی تاریخوں میں فیروز کلدانی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

علوم ریاضی

لیکن سکندریہ کا سب سے بڑا علمی کارنامہ حکیم اُقلیدس اور اراتوس تینیں کی تصانیف تھیں (تیسری صدی ق م) جو ریاضی کے دو اہم شعبوں کے بانی ہوئے ہیں۔ [۵] پہلے کے نام پر ایک پورا علم "اُقلیدس" کہلاتا ہے مگر دوسرے نے "تقویم نجومی" اور "ہیاتِ ریاضی" کی بنیاد رکھی۔ اور اس کی ایک تاریخ کا حصّہ بھی محفوظ ہے جسے واقعات وسنین کی فرہنگ کہنا بجا ہوگا۔

آخری دَور

دوسری صدی ق م کے وسط میں یونان کو رومیوں نے فتح کرلیا (۱۴۶ق م) اور اس کے کچھ عرصہ بعد مصر و شام پر بھی اسی نوخیز سلطنت کا تسلط ہوگیا۔ رومی قوم نے اپنی انتظامی قابلیت، سپاہیانہ شجاعت، عمدہ اطوار و عادات اور جمہوری نظام حکومت کی بدولت غلبہ حاصل کیا تھا اور ابھی تک اُن کے پاس کوئی علمی سرمایہ نہ تھا۔ پس اُنھوں نے قدرتی طور پر یونانیوں کو اپنا علمی اُستاد مان لیا اور اب رومہ کی سرپرستی میں یونانی زبان اور علوم پہلے سے بھی زیادہ فروغ پانے لگے۔ چنانچہ ایتھنز و سکندریہ کے علاوہ انیاکس (شام) ترسوس، پرگاموس اور ربای زنطہ (ایشیائے کوچک)، مارسلیز، لیون (فرانس) اور روڈس میں بڑے بڑے یونانی مدارس قایم ہوئے اور خاص پائے تخت رومہ یونانی علما اور اساتذہ کا مرکز بن گیا۔

پولی بیوس

اس "رومی دَور" کا سب سے پہلا مشہور مصنّف پولی بیوس گزرا ہے جس نے چالیس حصّوں میں رومی فتوحات (۲۶۴تا۱۴۶ق م) کی تاریخ لکھی وہ غالباً ۲۰۶ق م پیدا ہوا اور تیس پینتیس برس کی عمر میں قید ہوکر رومہ آیا جہاں طبقۂ اعلیٰ کے بعض افراد سے اس کی شناسائی ہوگئی۔

---

[۵] یہ لکھنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ "جرثقیل" کا مشہور موجد و ماہر ارشمیدس بھی ان کا ہمعصر تھا۔

شہر قرطاجنہ (کارتھیج) کی کامل تباہی اور یونان کی محکومی کے واقعات (۱۴۶ ق م) اُس نے بچشم خود معائنہ کئے تھے لیکن افسوس ہے کہ اسکی کتاب کا بیشتر وہی حصہ (جلد ۶ تا ۳۹) تلف ہو گیا جس میں اُس نے اپنے عہد کے واقعات و مشاہدات تحریر کئے تھے اور چھٹی اور چالیسویں جلد یا حصے کے بھی صرف چند اجزا محفوظ ہیں ورنہ پہلے پانچ حصوں کے سوا پولی بیوس کی ضخیم تاریخ کا بڑا حصہ مفقود و بے نشان ہو گیا۔

اِس تاریخ کی دو خصوصیتیں قابل ذکر ہیں:- اوّل تو یہ کہ بیرونی اقوام وابستہ کے میل سے یونانی زبان پر جو اثر پڑ رہا تھا وہ پولی بیوس کی تحریر میں صاف صاف نظر آتا ہے۔ یعنی گو اس کی تحریر بہت سادہ اور شگفتہ ہے تاہم اس میں جابجا ایسے غیر الفاظ ملتے ہیں جو نصف صدی پہلے کے یونانی مصنّفوں کی زبان پر نہ تھے۔ دوسرے پولی بیوس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہیرودوٹس کی طرح اس کی تمام تاریخ کا ایک خاص مقصد ہے اور وہ یہ کہ تمام دنیا پر اہل روما کی انتظامی اور یونانیوں کی علمی فضیلت ثابت کی جائے۔ اور مصنّف کی اس خیال نے پوری کتاب میں ایک خاص تسلسل اور تناسب پیدا کر دیا ہے جس کی بعد کی یونانی تواریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

دیگر مورخین

گو پہلی صدی ق م میں دیودورس اور دیونی سیوس نے دو ضخیم تاریخیں لکھکر انشا پردازی کا حق ادا کیا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ یہ محض پہلی تواریخ کے مجموعے یا خلاصے ہیں اور اُن میں وہ خوبی جسے "صنعت تاریخ نویسی" کہنا چاہیئے مفقود ہے۔ البتہ ان تالیفات نے خاص کر ایریان کی تاریخ "سکندر اعظم کی ایشیائی مہم" نے بہت سی کارآمد معلومات کو جو مختلف کتابوں میں منتشر تھی، ایک جگہ جمع اور محفوظ کر دیا اور کم سے کم آخر الذکر کتاب اس قابل ہے کہ ہیرودوٹس کے ترجمے کے بعد اردو میں اس کا ترجمہ کرا لیا جائے۔

ایریان

یاد رکھنا چاہیئے کہ ایریان بہت بعد کا یعنی دوسری صدی عیسوی کا آدمی ہے اور اس لئے تقریباً پانچ صدی قبل کے جو حالات اس نے جمع کئے ہیں، ان میں نہ وہ دلکشی ہو سکتی ہے نہ صحت واقعات کا وہ اطمینان جو صرف ایک ہمعصر تحریر ہی پیدا کر سکتی ہے۔ بایں ہمہ ایریان بہت ذی علم اور سلیقہ مند مؤلف ہے اور مذکورہ بالا تاریخ کے علاوہ اس کی ایک "تاریخ ہند"، اور بعض فلسفیانہ رسائل بھی یونانی علم ادب میں محفوظ ہیں۔

یوسف یہودی

اسی زمانے میں رومہ کی ایک اور تاریخ اے پیان نے یونانی زبان میں لکھی تھی لیکن اس عہد کی شاید سب سے بہتر و مفید کتابیں یوسف یہودی (جوزیفوس) نے بنی اسرائیل کے حالات اور اُن آخری لڑائیوں کے متعلق تحریر کی ہیں جن میں سے بعض اس کی چشم دید تھیں وہ پہلی صدی عیسوی کا مصنف ہے جس کے اواخر میں یہودیوں کی آخری جدوجہد کے بعد رومیوں نے دوبارہ بیت المقدس پر قبضہ کر لیا اور اس قوم کی حکومت و آزادی کا گویا ہمیشہ کے واسطے خاتمہ کر دیا۔

ست رابو اور پلوٹارک

اسی پہلی صدی عیسوی میں تاریخ کے دو اہم شعبوں یعنی جغرافیہ و سوانح پر دو کتابیں ایسی لکھی گئیں جو یونانی علم ادب کی بہترین کتابوں میں داخل ہیں۔ ان میں سے پہلی ست رابو (اسٹ ریبو) کا "جغرافیہ عالم" ہے اور اس کی اب صرف تاریخی حیثیت رہ گئی ہے لیکن پلوٹارک کی "مشاہیر یونان و رومہ" کی آج بھی مغربی ممالک میں بہت قدر و منزلت کی جاتی ہے اور اس میں مصنف نے سیرت نگاری اور سبق آموز واقعات کو بیان کرنے میں علم و فضل اور انشا پردازی کا کمال دکھایا ہے۔ یہ بہت ضخیم کتاب ہے اور انجمن ترقی اردو نے چند سال سے اس کا ترجمہ شروع کیا ہے اور دو جلدیں (اردو) شایع ہو چکی ہیں۔

پلوٹارک کے مختلف فلسفیانہ مضامین کا ایک مجموعہ "موریلیا" بھی محفوظ ہے اور اس میں "زیادہ گوئی" "جھوٹی شرم" "خدائی انصاف کی تاخیر" وغیرہ عنوانات پر چند لاجواب مضامین ایسے موجود ہیں کہ اردو میں ان کا ترجمہ کرا لینا بھی فائدے اور دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

بعد کے جغرافیہ و سوانح نویس

دوسری اور تیسری صدی عیسوی میں تاریخ کے اُن شعبوں میں اور بھی کئی کتابیں لکھی گئیں لیکن ان میں "سیرت الفلاسفہ" اور "دوہ سوفسطائی" زیادہ مشہور ہیں۔ پہلی کتاب میں قدیم حکماے یونان کے حالات زندگی اور اصولی مسائل بیان کئے ہیں اور تاریخی حیثیت سے یہ نہایت کارآمد کتاب ہے۔ انجمن ترقی اردو چاہے تو اسے بھی بجنسہ ترجمہ کرا سکتی ہے، مگر ان دونوں کتابوں سے کہیں زیادہ قبولیت بطلیموس کے جغرافئے کو حاصل ہوئی جو سکندریہ میں پیدا ہوا (سنہ ۱۶۰ع) اور وہیں ہیئت و جغرافیہ پر وہ معرکہ آرا کتابیں شایع کیں جو صدیوں تک ایشیا اور یورپ میں

داخل درس تھیں۔ بلکہ بعض عربی مدارس میں اب تک "نظام بطلیموسی" کے مطابق ہیأت کی تعلیم دی جاتی ہے۔

حکیم جالینوس اسی نامور جغرافیہ نویس کا ہمعصر و ہم وطن حکیم جالینوس تھا جس نے بقراط یونانی کی قدیم طب کی تجدید کی اور وہ عالمانہ شرحیں اور طبّی اصول اپنی یادگار چھوڑ گیا جو کم سے کم ہندوستان میں آج تک مروج و مستند ہیں۔

تیسری صدی عیسوی کے اوائل کی ایک اور ضخیم کتاب "دِٹپ نوسوفستی" یعنی "خوان حکما" بھی قابل ذکر ہے جس میں شاعری، فلسفہ، اخلاق، تاریخ، طب، طبیعات، قواعد صرف و نحو، غرض کوئی علم ایسا نہ ہوگا جس پر بحث نہ کی گئی ہو۔ اور اسی ضمن میں فاضل مؤلف نے تقریباً سات سو ایسے مصنفوں کا حوالہ دیا ہے جن کی تصانیف درکنار، نام بھی اور کہیں نہیں ملتا۔

اس کتاب سے نیز دیگر تصانیف اور مختلف مدارس و مکاتب کے حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسری اور تیسری صدی عیسوی میں یونانی علم ادب نے کیسی قابل تعجب وسعت و ترقی حاصل کرلی تھی۔ علم و فن کی بے شمار کتابوں کے علاوہ نثر میں اس قسم کے عشقیہ قصّوں کا (جنھیں بعد میں "ناول" کہنے لگے) اسی عہد میں عام رواج ہوا اور گو یہ سب کتابیں یا مصنّف ایسے بلند رتبہ نہیں ہیں کہ اس مختصر مضمون میں ان کا ذکر کیا جائے تاہم اس زمانے کے سب سے مشہور ادیب لوسیئن (پیدائش ۱۲۰ء) کا تذکرہ کرنا ضروری ہے جو عراق کی مغربی سرحد (وادی فرات) کا رہنے والا تھا، مغربی یورپ کے دو مشہور انشا پردازوں کو یعنی سٹفٹ اور والٹیر کو اس ایشیائی یونانی سے تشبیہ دیتے ہیں اور وہی پہلا شخص ہے جس نے نثر نگاری کا ایسا شوخ و سبق آموز طرز اختیار کیا اور "دیوتاؤں کا بحث مباحثہ"، "مردوں کی باتیں"، "حکیموں کا نیلام"، وغیرہ بہت سی ہجو یہ کتابیں لکھیں اپنے زمانے کے اوہام کی ہنسی اُڑائی تھی۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ رنگینی بیان کے اعتبار سے اس کی بعض تحریریں سٹفٹ کی تصانیف سے بھی زیادہ دلچسپ اور مزہ دار ہیں۔

فلاسفہ لوسیئن کی کتابوں سے بالواسطہ معلوم ہوتا ہے کہ اس "رومی دَور" میں ارسطو و افلاطون کے فلسفے کی چنداں قدر و منزلت باقی نہیں رہی تھی اور یونان کے باہر خاص کر اپنے تخت

رومہ میں اوّل ہی سے فلسفۂ رواقیہ کا زور تھا۔ پہلی صدی عیسوی کے آخیر میں اس فلسفے کا مشہور معلم ایپک تتوس گزرا ہے جو وسط ایشیائے کوچک کا باشندہ اور ایک عیش پرست وظالم رومی کا غلام تھا۔ اُس نے خود کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن مورخ ایریان جس کا اوپر ذکر آچکا ہے اس کا شاگرد تھا اور اُس نے زینوفن کی طرح (جس نے اپنے اُستاد کا تذکرہ لکھا ہے) ایپک تتوس کی فلسفیانہ تعلیم پر دو نہایت عمدہ کتابیں تحریر کی ہیں۔

انتونی نوس ایپک تتوس کے فلسفے کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک موحد شخص ہے اور عجب نہیں کہ ایک حد تک مسیح علیہ السلام کی تعلیم سے مستفید ہوا ہو۔ اس قسم کی مذہبی جھلک ہمیں اس عہد کے دوسرے فلسفی مرقس انتونی نوس کی تصانیف میں نظر آتی ہے جو دوسری صدی عیسوی میں رومہ کا شہنشاہ یا قیصر تھا اور جس نے "مراقبات" کے نام سے یونانی زبان میں بہت ضخیم کتاب اپنی یادگار چھوڑی ہے۔

اشراقیئین لیکن جس وقت ان حکیموں کی صبر وعفو قناعت و توکل کی اخلاقی تعلیم کا چرچا تھا، یونانی اہل فن کا ایک نیا گروہ پیدا ہوا جس نے حکیم افلاطون کے نظریۂ "عالم مثال" کو ترقی دے کر فلسفۂ اشراقیہ کی عمارت تیار کی۔ اس فلسفے کے سب سے نامی مصنف پلوتی نوس اور اس کا شاگرد فرفیری تیسری صدی عیسوی کے آدمی ہیں اور ان کے درس و تدریس کا زیادہ تر زمانہ رومہ میں گزرا۔ پہلے کو "افلاطونِ ثانی" بھی کہتے تھے اور بعض مشرقی مصنفوں نے اس کو پہلے افلاطون کے ساتھ خلط کر دیا ہے۔ دوسرے کو مسلمان علما فرفوریوس کے نام سے یاد کرتے ہیں اور ہماری قدیم عربی تصانیف میں اس فلسفے کا بہت سا مواد محفوظ ہے۔

اشراقیئین کا دعویٰ تھا کہ زہد و ریاضت اور مراقبات کی مشق سے انسان کی روح اسی زندگی میں حواس ظاہری کی قید سے آزاد ہو کر ذاتِ باری تعالےٰ کے ساتھ "پیوست" (یعنی واصل بحق) ہو سکتی ہے۔ چنانچہ پلوتی نوس اپنی کشف و کرامت کے علاوہ یقین دلاتا ہے کہ زندگی میں چار مرتبہ وہ یہ شرف (وصال بحق) بھی حاصل کر چکا ہے!

ان دعاوی کے ساتھ پلوتی نوس اور اس کے شاگردوں نے دین مسیحی کی بھی مخالفت شروع کی اور یہ ثابت کرنا چاہا کہ مسیح علیہ السلام کی تعلیم میں کوئی ایسی خوبی یا نئی بات نہیں ہے جو یونانی فلسفے میں موجود نہ ہو، اس کے

جواب میں مسیحی علمانے دعویٰ کیا کہ فلسفہ یونانی میں جو کچھ بھی کام کی بات نظر آتی ہے وہ درحقیقت یونانیوں نے توراۃ یا انجیل مقدّس سے چُرائی ہے! اس مباحثے اور مقابلے میں آخرکار فلسفۂ یونانی کو شکست ہوئی اور جنوبی یورپ مغربی ایشیا، نیز مصر میں مسیحیت کو غلبہ حاصل ہوگیا، فلسفہ یونانی پر اوس پڑگئی اور اسی کے ساتھ یونانی علم ادب کو بھی زوال آگیا، بول چال کی زبان علمی یونانی سے پہلے ہی بدل گئی تھی، دین مسیحی کے غلبے نے اہل علم کو یونانی علوم کی طرف سے رفتہ رفتہ بالکل بیگانہ بنا دیا اور گو چھٹی ساتویں صدی تک بعض مفید تالیفات یونانی زبان میں ہوتی رہیں لیکن سچ یہ ہے کہ چوتھی صدی ہی سے یونانی کو ہٹا کر لاطینی یورپ کی علمی زبان بننے لگی تھی اور آیندہ کوئی ایسا بلند پایہ یونانی مصنّف نہیں پیدا ہوا جس کی تصانیف یونانی علم ادب کے اس مختصر مضمون میں قابل ذکر ہوں۔

۱۵ر نومبر ۱۹۲۰ء
حیدرآباد دکن

سیّد ہاشمی فریدآبادی

حضرت امیر خسروؒ کے کلام میں ہندی الفاظ

تاجِ خسروی[۱] کا ایک ادھورا[۲] مضمون

از

جناب سید افتخار عالم صاحب۔ مصنف حیات النذیر وغیرہ

یہ بات مسلّم ہے کہ زمانہ جاہلیت میں تجارت کے رستے سے ہندوستان کے بہت سے الفاظ عرب میں پہنچ کر کچھ ایسے گھل مل گئے ہیں کہ لوگ اُن کو عربی زبان کی ملکیت سمجھتے ہیں۔ لیکن ہزار ہا برس کے بعد اب کہیں جاکر فلسفہ زبان کی دُوربین سے پتا چلا ہے کہ عربی زبان میں بعض الفاظ اپنے حسب ونسب کے شجرے سے ہندی الاصل ہیں۔ اور اہل عرب نے اُن کو صرف اپنا جامہ تلفّظ پنہا کر معرّب کرلیا ہے۔

اَبْہُلْ = ادہبیر یا ہوبیر، اُمْلَجْ = آنولہ، اَنبج = آنب، اہلیلج یا ہلیلج = ہڑہ، باذنجان = بیگن، بلیلج = بہیڑہ، صندل = چندن، فلفل مویہ = پیپلا مول یا پیپلا مور، نیلوفر = نیلا آپت، نیلج = نیل، ہلہل = ہرہرہ، ناقیصر = ناگیسر، نارجیل = ناریل، مُج = مونگ، جزر = گاجر، قنبیل = کمیلہ، خولنجان = کلیجن، قرطم = کُسم، کات = کتھہ، کثیرا = کتیرا، کافور = کپور، ساج = سال، دُخان = دہواں، فودج یا فوتنج = پودینہ، فان = پان، عین = نین یا آنکھ، عاقرقرحا = اکرکرہ، اقباقبا = اکاکیا، بنج = بھنگ یا بھانگ، گاذی = کیوڑا، خیار = کھیرا، کشف = کچھوا، طمال = تلّی،

---

[۱] تاج خسروی حضرت امیر خسرو کی زیر تالیف سوانح عمری کا نام ہے ۱۲

[۲] یہ مضمون بالکل ناممکل ہے۔ حضرت امیر خسرو کی اکثر تصانیف مطالعہ کرنے کے بعد اس عنوان کا خیال پیدا ہوا۔ خیال پیدا ہونے کے بعد حضرت امیر خسرو کی جتنی ادر کتابیں پڑھیں اُن میں سے یہ چند الفاظ منتخب کرلئے گئے ہیں۔ اس ادھورے مضمون کی طلبی میں مولوی عبدالحق صاحب کے چار پانچ خط آئے۔ چونکہ مضمون ناقص تھا اور ناممکل اس لئے راقم مضمون نہیں چاہتا تھا کہ حضرت مولانا کے اُردو جیسے رسالے میں طبع ہو مگر مولوی صاحب اتنی سی بات پر اتنے خفا ہوگئے کہ راقم کو ترک موالات کی چلتی ہوئی دھمکی دی۔ ترک موالات کے ڈر کے مارے بالآخر جو کچھ بھی تھا بھیجنا پڑا۔ اس لئے مضمون ہٰذا میں جتنے بھی اسقام ہوں اُن کا بار مولوی عبدالحق صاحب کی گردن پر ہے بندہ بری الذمّہ ہے ۱۲

قندول = کاٹھل، جَوَار = جُوارے، ارم = آرام، ذات = جات، رشحہ = رسنا، قحف = کھاپڑ یا کھوپڑی، دار = دُوار، سرشف = سرسوں، میغ = مینہ وغیرہ۔ یہ کہاں کے الفاظ ہیں؟ ان میں سے ایک ایک کو دیکھو اور شجرۂ نسب کا پتہ چلاؤ تو یقیناً سب کو ہندی الاصل پاؤ گے۔

واقعہ یہ ہے کہ قدیم الایّام سے عرب و ہند میں لین دین کا بازار گرم تھا۔ شیوع اسلام کے ساتھ ساتھ یہ رشتۂ تجارت اور بھی مضبوط و مستحکم ہو گیا۔ عربی مسلم یقیناً پہلی ہی صدی ہجری سے یہاں تشریف لانے لگے وہ سب کے سب تجارت پیشہ تھے۔ یہاں آئے تو اپنے ملک کی پیداوار بھی اپنے ساتھ لائے اور یہاں سے اُس کے معاوضے میں قدرتی اشیا اور دیگر انسانی مصنوعات زنبیلوں میں بھر بھر کر اپنے گھر لے گئے۔ عرب کی پیداوار جو یہاں دے گئے تھے اُس کے ساتھ ساتھ اپنی زبان کے چند الفاظ بھی یہاں چھوڑ گئے اور اسی طرح یہاں کے سامان کے ساتھ یہاں کی زبان کے بھی چند الفاظ اپنے ساتھ لیتے گئے۔ مگر اپنے گھر لے جا کر اُن کا ہندی لباس اُتار پھینکا اور اپنے ملک کا لباس پہنا دیا جس کو معرب کہتے ہیں۔

اپنے ملک کے جو الفاظ یہاں چھوڑ گئے اُن کے ساتھ دیکھو ہندیوں نے کیا برتاؤ کیا۔ جناب کو جن آؤ، انتقال[1] کو انت کال، اختیار کو ادھی کار، انتہا کو انت کار، برجیس کو برہسپت، مریخ کو منگل کر دیا۔

اِسی طرح آج تک ہم یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ عربی کی طرح فارسی نے بھی سنسکرت سے اور سنسکرت نے فارسی سے مبادلۂ الفاظ بالالفاظ کے طور پر ایک دوسرے سے قرض حسنہ لے کر اپنی اپنی زبان کو پھیلایا ہے مگر

؎ پس از سی سال ایں معنی محقق شد بہ خاقانی کہ بورانی است باذنجان و باذنجان بورانی

خدا اُس فلسفی زبان کو جنت نصیب کرے جس نے ایک نیاریئے کی طرح چھان بین کر کے یہ ثابت کر دیا کہ فارسی اور سنسکرت دو مُنہ بولی نہیں بلکہ دو حقیقی اور سگی بہنیں ہیں۔ بدقسمتی نے دونوں کو ایک ساتھ دیس نکالا دیا۔ اگر ایک کو ایران اور دوسرے کو ہندوستان اپنے گھر میں نہیں بلکہ اپنے دل میں جگہہ نہ دیتا تو یہ دونوں غریب الوطنیں خدا معلوم کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتی پھرتیں۔

---

[1] میری رائے میں یہ صحیح نہیں ہے انت کال مرکب لفظ ہے انت کے معنی انتہا اور کال بمعنے وقت یعنی آخری وقت اسے انتقال سے کچھ تعلق نہیں۔ (اڈیٹر)

بہر حال اس انکشاف نے ہم کو بڑے مغالطے سے بچا لیا ورنہ ہم خالق سے مخلوقات تک بلکہ انسانی مصنوعات تک ایک بڑی لمبی فہرست ایسے سنسکرت الفاظ کی تیار کر سکتے تھے جو فارسی زبان میں ایرانی لباس پہنے کتابوں میں دیکھے اور کانوں سے سُنے جاتے ہیں۔ ہزاروں برس کی جدائی، سکونت میں بُعدالمشرقین، آب و ہوا کا اثر کلوں جبڑوں کی بناوٹ، لب و دہان کی جنبشیں، گلوں کی آوازیں، انقلاب کا طوفان اور رسم و رواج کے اختلاف نے ایک لفظ نیلا آہستہ کو نیل ہر، نیلوہل، نیلوفل، نیلو ہر اور نیلوفر کر دیا۔ ورنہ اصل میں یہ ایک ہی درخت کے پھول ہیں ایک ہی درخت کی شاخوں میں کھلتے ہیں۔ سونگھو تو وہی ایک خوشبو۔ دیکھو تو وہی ایک رنگ روپ۔ چکھو تو وہی ایک مزا۔ مصرف میں لاؤ تو وہی ایک اثر۔ یہ مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ ورنہ اعضائے بدن، اجناس، درندے، پرندے، مویشی، اعداد شمار، اور دیگر مصنوعات انسانی کے نام لیتے چلے جاؤ دونوں زبانوں کے الفاظ میں صرف وہی لب و دہان کی جنبشوں کا تھوڑا تھوڑا اثر پاؤ گے مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ فارسی اور سنسکرت کے تمام تر لغات اصل میں ایک ہی ہیں صرف تلفظ کا تھوڑا بہت فرق ہو گیا ہے نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ دونوں زبانوں میں ہزار ہا الفاظ ایسے بھی ہیں جو مشترکہ نہیں بلکہ اپنی اپنی ذاتی ملکیت اور اپنا اپنا ذاتی مال ہے اور ہم کو اس وقت اسی قسم کے الفاظ سے غرض ہے۔ لہٰذا اس قسم کے ہندی الفاظ جن لوگوں نے فارسی زبان میں استعمال کئے ہیں وہ تین گروہوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں۔

(۱) ایک وہ گروہ جو کبھی ہندوستان میں نہیں آیا۔

(۲) دوسرا وہ گروہ جو ہندوستان آیا اور چلا گیا یا یہیں رہ پڑا۔

(۳) تیسرا خاص ہندوستانی گروہ۔

گروہ اوّل میں ہم کو اس وقت تک صرف حکیم سنائی ملے ہیں۔ یہ حضرت یقیناً کبھی ہندوستان تشریف نہیں لائے۔ مگر آج سے نو سو برس پہلے یعنی پانچویں صدی ہجری میں ہندوستان۔۔۔ طرح استعمال فرماتے ہیں ؎

نہ در آں معدہ جز حسد زندہ نہ در آں دیدہ قطرہ پا[1]

---

[1] سخندانِ فارس ۱۲

گروہ دوم میں ایک سلسلہ ناتمناہی ہے جو ہنوز منقطع نہیں ہوا۔لیکن یہاں ہم اُن لوگوں کے نام بتائیں گے جنھوں نے حضرت امیر خسرو کے پہلے اپنی تصانیف میں ہندی الفاظ استعمال کئے ہیں۔

گروہ دوم میں حضرت شیخ سعدی کا نام لیا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان میں تشریف لائے تھے۔ اُن کا ہندوستان آنا گو صحیح ہو مگر یہ قطعی غلط ہے کہ حضرت نے (سعدی کہ گفتہ ریختہ در ریختہ دُر ریختہ + شیر و شکر آمیختہ ہم ریختہ ہم گیت ہی) یہ غزل تصنیف فرمائی تھی۔

حضرت شیخ فرید الحق المشہور بہ گنج شکر۔ یہ حضرت ایک جگہہ فرماتے ہیں "راستا بگوید، آدھانتوں جہا بگو آدھانتوں پیش بگوید، آدھانتوں در دل بہ قوت تمام ضرب کند، ایہنانتوں بعدہٗ، چوں بگفتن ایں ذکر بدل ذوق آید یک ضربے بدیں طور کند، ایہنی ہی"

حضرت شاہ بوعلی قلندر نے ایک موقع پر حضرت امیر خسرو سے فرمایا تھا "از ہیرے ہائے خود چیزے بگو" یعنی اپنی غزلیں سناؤ۔ امیر خسرو نے وہ اپنی مشہور غزل سنائی جس کا مطلع یہ ہے ؎

اے کہ گوئی ہیچ مشکل از فراق یار نیست — گر امید وصل باشد ہمچناں دشوار نیست

حضرت امیر خسرو کے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیا نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ کلام حق را در روزِ میثاق بہ آہنگِ پوربی شنیدم۔

گروہ سوم میں ہم کو محمود غزنوی کے زمانے کا ایک راجہ ملا ہے جس نے شاہ ممدوح کی اطاعت قبول کرلی تھی اور زبان سنسکرت میں ایک قصیدہ لکھکر پیش کیا تھا جس میں بہت سے عربی و فارسی الفاظ استعمال کئے گئے تھے۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ امیر خسرو سے پہلے گجرات کے کسی ہندو نے صنعت ملمع میں ایک نظم اور سنسکرت دو ہ ہم جس میں عربی و فارسی و بھاشا اور سنسکرت کے الفاظ استعمال کئے گئے تھے۔ ان دونوں کو ایران اور دو بر کچھہ پتا چل گیا ہے مگر ہنوز قصیدہ اور نظم پردۂ خفا میں ہے۔

خدا معلوم کہاں کہاں سرحد پر پہنچ گئے ہیں جہاں ہم کو ٹھیرنا ہے اور وہ سرحد خسروی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں

ل۵ میری رائے میں یہ صحیح نہیں جن لوگوں نے ہندی کے دو ایک لفظ اپنی گفتگو یا اپنی تصنیفات میں استعمال کئے اگرچہ برابر ہے تاہم وہ قابل توجہ اور قابل شکریہ ضرور ہیں۔ مگر حضرت امیر خسرو ان انتقال سے کچھ تعلق نہیں۔

لوگوں میں ایک نمایاں اور ممتاز بزرگ ہیں۔ انھوں نے الفاظ ہندیہ کا استعمال فارسی زبان میں اس کثرت سے کیا ہے کہ اس کا احصار مشکل ہے۔ بہرحال حضرت امیر خسرو نے ہندی الفاظ کو فارسی زبان میں طرح طرح سے استعمال کیا ہے۔ کہیں اسم کی صورت میں کہیں فعل کی صورت میں کہیں فقرے کی صورت میں کہیں صنعت ایہام میں کہیں صنعت ترجمۃ اللفظ میں کہیں صدا کی صورت میں کہیں ظرافت کے پیرایے میں۔ نمونے کے طور پر چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) بیڑہ :- پان کا بیڑہ

صفتِ بیڑۂ تنبول کہ نزدِ ہمہ خلق　　بہ ازاں نیست نباتے ہمہ ہندوستاں

(۲) بیلا :- پھول کی قسم

یک گُلِ بیل وده دیگر درون　　گُل زگُل وگُل زگُل آید بروں

(۳) بہاری :- قسمِ جامہ

لرزۂ یک نوئے بہاری بہ تن　　برگُلِ صدبرگ دریدہ کفن

(۴) پترہ :- چاندی سونے وغیرہ کا پتر

کہربا را کدام دولت ازاں بالاتر کہ گوہر شاہی سوئے خودش کشد، پترہ وارے ازاں برائے خویش نگاہ ندارم کہ چوں طینت بندہ ازاں کوب مہابت شمشیر شاہ کا فرشکن بشکستہ است ؎

داند ہمہ کس کہ چوں سفالے بشکست　　از پترۂ زرد رست نتواں کردن

(۵) پلہ :- پھول کی قسم

پنجہ کشادہ گُلِ لعل از پلہ　　غرق بخوں ناخنِ شیر پلہ

(۶) پگ :- پاگ، پگڑی

اے دہلی واے بتانِ سادہ　　پگ بستہ وچیرہ کج نہادہ

(۷) تل اور تیل اور تیلی

تیلی پسرے کہ می فروشد تیلے　　از دست وزبانِ چربِ او واویلے

خالے بہ لبش دیدم و گفتم کہ تل است   گفتا کہ برو، نیست دریں تل تیلے

(۸) جائی :- جوہی یا جوئی- پھول کی ایک قسم

جائے نہ در باغ ز گل ہائے جائے   مرغ و رافغاں کہ بگیرند جائے

(۹) جھمّرلی :- قسم جامہ

جھمّرلی د بہاری خوب   چوں تحفۂ نو بہار مرغوب

(۱۰) چندنا :- پھول کی قسم

چندنہ در شہر کہ در روم و روس   جمع شود بر سرِ شاہ و عروس

(۱۱) چنپا :- پھول کی ایک قسم

طرفہ گلِ چنپہ بہ عالم کہ دید   کانِ زمرد کہ زر آرد پدید

(۱۲) دہی لیہو دہی :- دہی بیچنے والیوں کی صدا

گجری تو کہ در حسن و لطافت چو مہی   آں دیگِ دہی بر سر تو چتر شہی

از ہر دو لبت شہد و شکر می ریزد   ہر گاہ بگوئی کہ دہی لیہو دہی

(۱۳) ڈونا :- پھول کی قسم

دگر دونہ کہ آں ریحانِ ہند است   ز تری بوئش در خورد پسند است

(۱۴) ڈولا :- سواری کی قسم

بہ ڈولہ در نشست آں در کرم نشر   چو خیلِ مومناں در پلہ حشر

(۱۵) رلے چنپا :- پھول کی ایک قسم

دگر آں رلے چنپا شاہِ گل ہا   کہ بویش مشک بار آمد چو گل ہا

(۱۶) سی وسی :- سیو سیو، شیو شیو، چھیو چھیو- کپڑا دھونے کے وقت دھوبی یہی آوازیں اپنی زبان سے نکالتے ہیں-

"باز از پائے دام ماہی گیراں بپائے آب گازراں گزشتم، ہر یک را دیدم کہ در ہر ہفتہ صد درم فی الغنحہ

وسی وسی فریاد می کرد، پرسیدم کہ ماہی گیر چوں از شست می جنبد مصرعہ
نہ گاز ہست از نیے کہ سی وسی ہمی گوید

(۱۷) سیوتی :- پھول کی ایک قسم

سیوتی خوش کہ کنندش گلاب　　　از ہمہ سوا و بہمہ روے آب

(۱۸) کتہ گر :- کٹھ گھر

"در فرمان دادند کہ ہر کسے در عقب خیمۂ خویش کتہ گر یعنی حصار چوبیں کشد،،

(۱۹) کیوڑا

کیوڑہ ہر برگ چو سیم سپید　　　عود از و سوختہ چوں مشک بید

(۲۰) کرنہ :- پھول کی ایک قسم

دگر کرنہ کہ چوں زد جست بوئے　　　معطّر گرد از یک خانہ کوئے

(۲۱) ندی :- دریا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت امیر خسرو نے نہ صرف فارسی زبان کے ساتھ بلکہ عربی زبان کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی سلوک کیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

"مگر نمی دانی کہ جواں مردیِ ابر بر دریا چناں باشد کہ جود اللئیم علی اللّی در یختین باراں بر خشکی چناں کہ ندی البرّ علی السائل،،

مطلب یہ ہے کہ دریا میں بارش کا ہونا ایسا ہی بیکار ہے جیسے لئیم الطبع کی سخاوت تو انگر پر اور خشک زمین پر مینہ کا برسنا ایسا ہی مفید ہے جیسے کوئی کریم محتاج سائل کو دے۔ ندی البر علی السائل میں ذرا ندی کو تو دیکھو کیسا صاف ہندی دریا بہتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

(۲۲) مار مار :- بزن بزن

" اژدراں نبرد را فرمان داد تا گرداگرد حصار حلقہ بستند از بروں تیر اندازاں تیری انداختند و از دروں ہندواں مار مار فریاد می کردند،،

(۲۳) مارے مارے

ہندو بچہ ببر کشیدم بارے — از زلف کجش گسستہ دیدم تارے
گفتم صنما بگو چہ باشد ایں تار — فریاد برآورد کہ مارے مارے } ایہام لسانین

(۲۴) بول سری :- مول سری

بول سری خرد و بزرگ از ہنر — خورد و بزرگ از ہنرش بہرہ ور

(۲۵) نائی :- حجّام

یک طفل ہمی رفت بصد زیبائی — حجّام بدنبال وے از رعنائی
گفتا کہ بیایم و ببرّم سر موت — فریاد برآورد کہ نائی نائی } ایہام لسانین

اب ہم ذیل میں حضرت امیر خسرو کی دو ایسی غزلیں لکھتے ہیں جن میں فقرے کے فقرے ہندی الفاظ کے موجود ہیں۔

(۲۶) فقرے کے فقرے ملاحظہ ہوں۔

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
چو شمع سوزاں چو ذرّہ حیراں ز مہرِ آں مہ بگشتم آخر
نہ نیند نیناں نہ انگ چینا نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں
بحقِ روزِ وصالِ دلبر کہ داد مارا فریب خسرو
سپیت منکے ورائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں

(۲۷) اِس غزل میں بھی فقرے کے فقرے ہیں

خار[۵۱] شدم زار شدم لٹ گیا — در غمِ ہجر تو کمر توتہ ہے
یار نہیں دیکھتا ہی سوئے من — بے گنہ ہم ساتھ عجب روتہ ہے
روے تو رونق شکن آفتاب — سرو بہ پیش قدِ تو بوتہ ہے
گاہ زخسرو تو نہ گفتہ کہ بیٹھ — دہ چہ کند بھاگ مرا ھوتہ ہے

(۲۸) اس میں بھی فقرے اور الفاظ ہیں

ہندو بچہ[۵۲] بیں کہ عجب حسن دھرے چھے — بر وقت سخن گفتن مُکھ پھول جھرے چھے
گفتم زلبِ لعلِ تو یک بوسہ بگیرم — گفتا کہ ارے رام ترک کاہین گرے چھے

(۲۹) برما:- سوراخ کرنے کا آلہ

برماست نظمِ خسرو ناوک زنی نہ دانم — کا ہوے ہندیم من سنے اُشترے ججیزم

(۳۰) لات :- ترجمۂ قدم

عاشقِ صورتِ خوبیم کہ خلقے ہمہ سر — بر درِ کعبہ و ما برقدم لات نہیم — ایہام لسانین

(۳۱) اس میں بھی فقرے کے فقرے ہیں اور دیکھو کہ کس قدر صاف ہیں۔

زرگر[۵۳] پسرے چو ماہ پارا — کچھ گھڑیے سنواریے پکارا
نقدِ دل من گرفت و بشکست — پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

(۳۲) حضرت امیر خسرو اب ان تصرفات سے بھی آگے قدم بڑھاتے ہیں اور اجتہاد کی صورت

---

۵۱ اس غزل میں اور بھی شعر ہیں مگر وہ صحیح نہیں پڑھے گئے۔ ماسوی اس کے یہ غزل جامی کی طرف بھی منسوب ہے، مگر بہ تغیر الفاظ۔ میرے پاس ایک خاندانی کشکول ہے اُس میں امیر خسرو کے نام سے یہ غزل لکھی ہوئی ہے ۱۲

۵۲ فرہنگ آصفیہ ۱۲

۵۳ نکات الشعراء میر تقی میر ۱۲

اختیار کرتے ہیں۔ چلنا ایک ہندی مصدر ہے۔ حضرت نے اس کا فارسی مصدر چلیدن[1] بنا لیا۔ بنا لیا تو استعمال بھی ضرور کیا ہو گا۔ مثال ہنوز دستیاب نہیں ہوئی۔

اِس مضمون میں حضرت امیر خسرو کی خالق باری کو بالکل نہیں چھوا گیا۔

ناقص نگار

افتخار

---

[1] فرہنگ آصفیہ ۱۲

انگریزی الفاظ کی تذکیر و تانیث

مراسلہ منجانب مولوی نعیم الرحمٰن صاحب ایم اے۔ پروفیسر پریزیڈنسی کالج مدراس
معتمد محفل عزاز (مدراس)

تذکیر و تانیث کا مسئلہ اوّل تو اردو زبان میں یونہیں بہت ٹیڑھا ہے لیکن اُن انگریزی الفاظ نے جو زبان میں داخل ہو گئے ہیں یا داخل ہوتے جاتے ہیں اس مسئلہ کو اور مشکل کر دیا ہے۔ زبان کے الفاظ میں تو اہل زبان کا تتبع کیا جاتا ہے اور یہ کافی ہے۔ لیکن انگریزی دخیل الفاظ کے لئے ہمیں کوئی سند نہیں ملتی اور اس لئے ہر شخص اپنے اختیار تمیزی سے مذکر یا مونث لکھ دیتا ہے۔ اس سے اردو لکھنے اور بولنے والوں کو بہت پریشانی ہوتی ہے۔ یا تو ان الفاظ کی تذکیر و تانیث کا تعین کر دیا جائے یا ایسے قاعدے منضبط کر دیے جائیں کہ آیندہ کے لئے یہ مسئلہ بالکل صاف ہو جائے۔

محفل عزاز مدراس نے سب سے پہلے اس طرف انجمن کو توجہ دلائی اور اب اس کی قابل سکرٹری نے ایسے الفاظ کی ایک فہرست مرتب کر کے بھیجی ہے جو شایع کی جاتی ہے۔ ملک کے قابل اور مستند ادیبوں اور انشا پردازوں سے التجا ہے کہ وہ براہ کرم اس کے متعلق اپنی رائے کا اظہار فرما کر ممنون فرمائیں۔ اوّل تو جو الفاظ اس فہرست میں درج ہیں اُن کی تذکیر و تانیث کا تعین فرما دیں دوسرے اگر ایسے قواعد منضبط ہو سکتے ہوں جو اس مسئلہ پر حاوی ہوں تو عنایت فرما کر اُن سے آگاہ فرمائیں تاکہ یہ مسئلہ آسانی سے اور متفقہ طور پر طے ہو سکے۔

میری رائے میں قواعد ذیل اس معاملہ میں تھوڑی بہت رہنمائی کر سکتے ہیں۔

۱۔ اردو زبان کا یہ عام قاعدہ ہے کہ جن الفاظ کے آخر میں الف یا ہ ہوتی ہے وہ مذکر سمجھے جاتے ہیں اور جن کے آخر یاے معروف ہوتی ہے وہ مونث۔ یہی قاعدہ ان نئے الفاظ پر بھی حاوی ہوگا۔

۲۔ یہ دیکھنا ہوگا کہ دخیل لفظ کا کوئی مرادف یا قریب مرادف یا ہم شکل پہلے سے ہماری

زبان میں موجود ہی یا نہیں - اگر ہے تو اسی سے اس کی تذکیر و تانیث کا قیاس کیا جائے - مثلاً اسکالرشپ کو اُردو میں وظیفہ کہتے ہیں اس لئے اسکالرشپ بھی مذکر ہوگا - اسی طرح اسٹیشن (ریل گھر) پوسٹ آفس (ڈاک خانہ) مذکر سمجھے جائیں گے - پارلیمنٹ ایک قسم کی مجلس ہے اس لئے وہ مونث ہوگی - اسی طرح کانگرس اور کانفرنس بھی مونث ہونگی - یہی حال لیمپ - فوٹو وغیرہ کا ہے - چاک اُردو کے لفظ چاک کا ہم شکل ہے وہ مذکر ہے تو یہ بھی مذکر ہوگا -

۳ - لفظ کی ہیئت (شکل) اور صوت اور معانی کا بھی لحاظ کرنا پڑے گا - بعض الفاظ اپنی صوت اور ہیئت سے اپنی تذکیر و تانیث بتاتے ہیں اور بعض اپنے معانی سے - مثلاً جو چیزیں نازک، کم زور اور چھوٹی ہیں وہ مونث ہونگی اور جو قوی اور بڑی ہیں وہ مذکر - مثلاً انسٹیٹیوٹ اپنی ہیئت اور صوت سے خود بخود مذکر معلوم ہوتا ہے - اسی طرح پن مونث - یا ڈپو مذکر اور روکٹ مونث -

۴ - جو الفاظ تفعیل کے وزن پر آتے ہیں وہ عموماً مونث ہوتے ہیں اور اسی طرح اکثر وہ ہندی الفاظ جن کے آخری حرف سے پہلے یائے معروف ہوتی ہے - جیسے کھیر - بھیڑ - بھیر - نکسیر - ڈھیل - کیل - نیند - کھیل وغیرہ - اسی قیاس پر انگریزی الفاظ مثل ٹیم، اسٹیم، ریل، بیر وغیرہ بھی مونث ہونگے -

معتمد صاحب محفل غراز نے اپنی فہرست میں بعض ایسے انگریزی الفاظ بھی درج کر دیے ہیں جو اُردو میں اب تک داخل نہیں ہوئے اور نہ اہل زبان کی زبان سے کبھی سنے گئے - ممکن ہے کہ مدراس میں بولے جاتے ہوں -

اڈیٹر

مدراس - مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۹۲۰ء

من جانب معتمد محفل غزاز - مدراس

بخدمت اقدس جناب سکرٹری صاحب انجمن ترقی اُردو - اورنگ آباد دکن

معظم و مکرم بندہ - السلام علیکم

جناب کے والا نامہ نمبر ۱۵۰۴ مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۹۲۰ء کے جواب میں میں علیحدہ ذیل میں اُن انگریزی الفاظ کی فہرست حسب طلب جناب ارسال خدمت کر رہا ہوں جو اُردو میں استعمال ہوتے ہیں۔ اُسی تلفظ میں استعمال ہوتے ہیں (ما کم و بیش دہی) جو انگریزی میں ہے۔ مگر اُردو بولنے اور لکھنے والے اُن کو مختلف اوقات میں مختلف جنس کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ یعنی کبھی مذکر اور کبھی مؤنث۔ ایسے الفاظ کے متعلق خصوصًا اور دیگر انگریزی الفاظ جو اُردو میں مستعمل ہوتے ہیں اُن کے متعلق عمومًا جناب سے استدعا ہے کہ براہ کرم انجمن ترقی اُردو کے جلسے میں (بہ اثنا ء اجلاس محمدن ایجوکیشنل کانفرنس) پیش فرما کر اُن کی تجنیس کی نسبت قواعد و ضوابط کی تعیین کے لئے تحریک فرمائیں۔ اس کے متعلق جو کچھ فیصلہ ہو اور جس طریق سے وہ اس کا ہمیشہ کے لئے تصفیہ کرنا چاہیں اُس سے خاکسار کو بھی اطلاع دے دی جائے تو عین سرفرازی ہوگی۔

اراکین محفل غزاز کے خیال میں جس طرح یہ علیٰ بناء الفطرۃ ناممکن ہے کہ انگریزی الفاظ (خواہ بالاصالۃ خواہ بہ تغیر شکل) اُردو میں نہ آئیں ویسے ہی ہندوستان کے تمام صوبجات (ماسوا دہلی و اودھ) کے لئے واحد اور صحیح اُردو بولنے اور اُس سے اُتر کر دنیا کے دیگر اہل زبان کے اُردو پڑھنے اور ضبط تحریر و معرض تقریر میں لانے کے لئے اس نوع کے انگریزی الفاظ کی تعیین جنس بھی از بس لابدی امر ہے۔

اُمید کہ جناب ضرور اس کی طرف توجہ فرمائیں گے۔ والسلام

خاکسار:- محمد نعیم الرحمٰن (ایم - اے)
معتمد محفل غزاز

فہرست الفاظ مشکوک الجنس

جو انگریزی سے اُردو میں داخل ہو گئے ہیں

شمار	لفظ بصورت اُردو	صورت انگریزی
۱	اپیل	Appeal
۲	اراروٹ	Arrowroot
۳	اسٹیشن	Station
۴	اگزبیشن	Exhibition
۵	آکسیجن	Oxygen
۶	اکنالجمنٹ	Acknowledgment
۷	انسٹیٹیوٹ	Institute
۸	اَونس	Ounce
۹	بابَن نیٹ	Babylonic net
۱۰	بک پوسٹ	Book-post
۱۱	بُلبُل ٹین	Velocteen
۱۲	بُنیان	Banian
۱۳	بوٹ	Boat
۱۴	پارلیمنٹ	Parliament
۱۵	پالش	Polish
۱۶	پائپ	Pipe (تمباکو پینے کا)
۱۷	پتلون	Pentaloon
۱۸	پٹاس	Potash
۱۹	پلٹس	Poultice
۲۰	پِن	Pin
۲۱	پِنس پینس	Pinnance
۲۲	پولیس	Police
۲۳	ترپال	Tarpaulin
۲۴	تُرم۔ تُرئی	Trumpet
۲۵	ٹیلی گراف	Telegraph
۲۶	جنوری	January
۲۷	جیل	Jail
۲۸	چاک (کھریا)	Chalk
۲۹	جولائی	July
۳۰	چیف کورٹ (کورٹ)	Chief Court
۳۱	ڈامَج	Damage
۳۲	ڈپازٹ	Deposit

شمار	لفظ بہ صورت اردو	صورت انگریزی
۳۳	ڈپو	Depot
۳۴	ربڑ	Rubber
۳۵	روڈ	Rod
۳۶	ریل (پٹڑی)	Rail
۳۷	ریل	Reel
۳۸	ساس پان	Sauce-pan
۳۹	سرکل	Circle
۴۰	سفیر مینا	Sappers and miners
۴۱	اسکالرشپ	Scholarship
۴۲	سکنڈ (وقت)	Second
۴۳	سلیپر	Sleeper
۴۴	سنیٹ	Senote
۴۵	سول سروس	Civil Service
۴۶	سول کورٹ	Civil Court
۴۷	سیونگ بنک	Savings bank
۴۸	فائل	File
۴۹	فروری	February
۵۰	فیملی	Family
۵۱	کاربان	Carbon
۵۲	کاٹرائی	Cartry
۵۳	کانشنس	Conscience
۵۴	کانفرنس	Conference
۵۵	کانگرس	Congress
۵۶	کلاک (گھڑی)	Clock
۵۷	کمپاس	Compass
۵۸	کمسریٹ	Commissariat
۵۹	کمیشن	Commission
۶۰	کوتل گارد	Quarter guard
۶۱	کیش	Cash
۶۲	گاچ	Gauze
۶۳	گارد	Guard
۶۴	سائنس	Science
۶۵	بائیسکل	Bicycle
۶۶	سائیسکل	Cycle
۶۷	اسٹول	Stool
۶۸	پلیٹ فارم	Platform
۶۹	اسٹیم	Steam
۷۰	رن (کرکٹ میں)	Run

شمار	لفظ بہ صورت اردو	صورت انگریزی	شمار	لفظ بہ صورت اردو	صورت انگریزی
۷۱	ٹایم پیس	Time-piece	۸۵	مئی (مہینہ)	May
۷۲	گڈ ایوننگ	Good-evening	۸۶	میگزین	Magazine
۷۳	گڈ بائی	Good-bye	۸۷	میل (ٹرین)	Mail
۷۴	گڈ مارننگ	Good-morning	۸۸	میل (ڈاک)	Mail
۷۵	گڈ نائٹ	Good-night	۸۹	ناول	Novel
۷۶	گرس	Gross	۹۰	مارکیٹ	Market
۷۷	گیٹس	Garters	۹۱	موٹر	Motor
۷۸	لاسٹک	Elastic	۹۲	وکٹوریا کراس	Victoria cross
۷۹	فوٹو	Photo	۹۳	ویفر	Wafer
۸۰	لالٹین	Lantern	۹۴	ہومیوپیتھک	Hom eopathic
۸۱	لین کلیر	Line clear	۹۵	ہیٹ	Hat
۸۲	مسکوٹ	Mess in court	۹۶	ووٹ	Vote
۸۳	مسمریزم	Mesmerism	۹۷	وکٹ	Wicket
۸۴	مشن	Mission			

ذیل میں میں وہ الفاظ درج کرتا ہوں جن کی جنس کے متعلق اردو کی زبردست لغت "فرہنگ آصفیہ" بالکل خاموش ہے۔

(۱) اسٹابری (۲) انسٹیٹیوٹ (۳) اولش (۴) بٹلر ٹین (۵) پوسٹ آفس (۶) پوسٹل گائیڈ (۷) پمفلٹ (۸) ٹرم (۹) ٹیل (یا ٹیٹر) پیج (Title-page) (۱۰) ٹیلی گراف (۱۱) ٹیلی گرام (۱۲) ٹین (۱۳) دریس (۱۴) ساٹن (۱۵) سارٹی فکٹ (۱۶) سٹابری (۱۷) فلالین (۱۸) فنر (۱۹) کاگ یا ڈکاگ (۲۰) کلندرا

(۲۱) (Calendar) کمان (۲۲) (command) کنٹر (۲۳) کوٹ (Court) (۲۴) کیک (۲۵)
گارڈ (۲۶) کلوٹ (Cloth) (۲۷) لنجی (Linsey) (۲۸) لیمپ (۲۹) لاٹ (Lord)

خاکسار

نعیم الرحمٰن معتمد محفل عنبر از
مدراس

مرزا غالب[1] کے کلام کی بعض خصوصیات

از

جناب مولوی محمد مہدی صاحب

مرزا غالب کے پانچ مضامین خاص ہیں جن پر انھوں نے خوب خوب طبع آزمائی کی ہے۔ ان میں دو مضمون ایسے ہیں جن میں یک رنگی ہے اور تین مضمون ایسے ہیں جن میں تنوع ہے۔ ہم یہ پانچوں مضامین جدا جدا عنوانات کے تحت میں لکھتے ہیں۔

ارتقائے رشک

رشک پر شعرائے فارسی نے خوب طبع آزمائی کی ہے اُردو کے بھی تمام شعرا نے یہ مضمون باندھا ہے اور بعض نے بہت اچھے اچھے مضمون پیدا کئے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس مضمون میں کوئی جدت اور تازگی نہ پیدا کرسکے۔ مرزا غالب کی ایجاد پسند طبیعت نے جو جو لطیف و نازک مضامین پیدا کئے ہیں اس کے لحاظ سے وہ نہ صرف شعرائے اُردو پر تفوق رکھتے ہیں بلکہ شعرائے فارسی سے بھی ممتاز نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اس مضمون میں بالکل اچھوتے اور اتنے پہلو نکالے ہیں کہ ان سے ایک پورا سلسلہ ارتقا مرتب ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ شاعرانہ تخیل اور بھی درمیانی کڑیاں پیدا کرسکے۔ مرزا غالب کے دیوان میں رشک کے تمام مراتب ابتدا سے

---

[1] مولوی محمد مہدی صاحب نے مرزا غالب کی شاعری پر ایک مبسوط تبصرہ "بیان غالب" کے نام سے لکھا ہے۔ اس کا آخری حصہ قابل مؤلف کی اجازت سے یہاں درج کیا جائے۔ کتاب بعد میں شائع ہوگی۔ مرزا صاحب کے مضامین خاص پر جس نہج سے بحث کی گئی ہے وہ قابل دید ہے۔ (اڈیٹر)

انتہا تک موجود ہیں۔ چنانچہ ہم ذیل میں اِس مضمون کے اشعار ترتیب وار لکھتے ہیں۔

رشک کا ابتدائی درجہ یہ ہے کہ محبوب کی بے مہری دیکھکر یہ تو اطمینان ہے کہ اُس کو غیر کے ساتھ کوئی حقیقی ربط نہیں لیکن ظاہری برتاؤ میں جو ارتباط کی شان پائی جاتی ہے وہ گوارا نہیں ہے ؎

رشک کہتا ہے کہ اُس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

دوسرا درجہ یہ ہے کہ اگرچہ بدآموزی کا خوف نہیں لیکن دشمن محبوب سے ہم کلام کیوں ہوتا ہے ؎

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بدآموزیِ عدو کیا ہے

پھر اس بات کا رشک ہوتا ہے کہ محبوب غیر کا تذکرہ کرتا ہے گو کہ وہ بر سبیل شکایت ہوتا ہے ؎

ہے مجھکو تجھسے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیل شکایت ہی کیوں نہو

یہ تمام مدارجِ رشک خود معشوق کے طرز عمل سے پیدا ہوتے تھے خواہ غیر کے ساتھ محبوب کا ظاہری اخلاص موجب رشک ہو یا ہم کلامی کا شرف یا غیر کا تذکرہ شکایت کا باعث ہو لیکن اب شاعر اس سے زیادہ ترقی کرتا ہے اور گو محبوب کے طریق عمل اور راہ و رسم میں کوئی امر ایسا نہیں ہے جو رشک انگیز ہو لیکن شاعر اپنے زور تخیل سے خواہ مخواہ وجوہ رشک پیدا کرتا ہے ؎

یا میرے زخم رشک کو رُسوا نہ کیجئے
یا پردۂ تبسّمِ پنہاں اُٹھائیے

یعنی معشوق رشک کو خلاف واقعہ ظاہر کر کے عاشق کو مطمئن کرنا چاہتا ہے لیکن عاشق اُس کے تبسّم پنہاں سے پھر بدگمان ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ اطمینان دہی تصنّع سے خالی نہیں ورنہ تبسّمِ پنہاں کی کیا وجہ۔

اس کے بعد بھی یہ صورت ہے کہ گو محبوب سے غیر کے دوستانہ مراسم نہیں پیدا ہو سکتے لیکن غیر کے دل میں اُس کی آرزو بھی کیوں ہے۔

نہیں گر ہمدلی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے ‌ نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

یہ تمام مراتب رشک غیر سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے بعد اپنے دوستوں اور بہی خواہوں کی باری ہے۔
چنانچہ اب شاعر قاصد پر رشک کرتا ہے ؎

گزرا اسدؔ مسرّتِ پیغام یار سے
قاصد پہ مجھکو رشک سوال و جواب ہے

اس رشک نے پیغام یار کی تمام مسرّت خاک میں ملا دی کہ قاصد محبوب کے سوال و جواب سے لطف اندوز ہوا۔
اب یہ بھی گوارا نہیں کہ کوئی اُسے دیکھے اگرچہ خود بھی اُس کے نظارگی ہیں۔ دیکھنے والوں میں دوست و
دشمن سب ہو سکتے ہیں۔

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن ‌ وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھسے

دیکھا جائے کی تکرار نہایت پرلطف ہے۔ یہ مرزا صاحب کی مخصوص طرز بندش ہے۔
اغیار سے مخاطبت، قاصد کی ہم کلامی، اپنی محرومی اور غیروں اور دوستوں کا دیکھنا اگر باوجہ رشک ہو تو
چنداں تعجب نہیں لیکن اس سے ترقی کرکے اب یہ پہلو نکالا ہے کہ اغیار کے ساتھ ظلم وستم، جور وجفا اور عداوت و
دشمنی بھی موجبِ رشک ہے۔ اس مضمون کو نئے نئے اسلوب سے باندھا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو + کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

اور کہتے ہیں ؎

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک ‌ بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لئے

یہی مضمون واضح پیرایہ میں نہایت خوبی سے اس طرح ادا کیا ہے ؎

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاش کے تم مرے لئے ہوتے

بنائے رشک محبت پر ہے اس لحاظ سے اغیار پر رشک بیجا تھا قاصد اور دوستوں کے پہلو میں بھی دل تھا
اس لئے اگر اُن پر بھی رشک ہو تو کچھ بیجا نہیں لیکن اب ایسی چیزوں پر رشک شروع ہوتا ہے جن میں کسی قسم کی صلاحیت

موجود نہیں چنانچہ فرماتے ہیں ؎

مرجاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تنِ نازک آغوشِ خمِ حلقۂ زنّار میں آوے

اب تک جس قدر اشعار نقل کیے گئے ہیں اُن میں یہ خواہش تھی کہ معشوق کی تمام حرکات و اداؤں کا مرکز ہم رہیں اور جہاں ذرا عمومیت پیدا ہوئی وہ موجب رشک ٹھیری ۔ یہاں سے اب اور ترقی شروع ہوئی ۔ شاعر اب خود اپنی مختلف حیثیتوں کا لحاظ کرکے خود اپنے آپ کو غیر تصوّر کرتا ہے اور اب اُسے یہ بھی گوارا نہیں کہ معشوق کا یا اُس کے گھر کا نام بھی زبان پر آئے ۔ کہتے ہیں ؎

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

اس میں بھی ترقی کی ہے کہ خود بھی وصل محبوب کی تمنّا نہیں کرتے ۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے مرتے ہیں وے اپنی تمنّا نہیں کرتے

اپنے اوپر رشک کی بھی آخری حد ہے یہ کہ وصل ایک طرف اُس کا دیکھنا بھی نہیں چاہتے ۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

اب اس درجہ سے تجاوز کرکے خواہشمند ہیں کہ خود معشوق بھی اپنی اداؤں سے لطف اندوز نہ ہو سکے حتیٰ کہ آئینہ میں اپنا عکس رُخ بھی نہ دیکھے ؎

دشنۂ غمزہ جاں ستاں ناوکِ ناز بے پناہ + تیرا ہی عکسِ رُخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

یہاں تک بھی غنیمت تھا ۔ اب فرماتے ہیں ؎

رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں
نالۂ مرغِ سحر تیغ دو دم ہے مجھ کو

یعنی عاشق جُدا ، معشوق جُدا ، صرف اشتراکِ محبت ہی موجب رشک ہے کہ دُنیا میں کوئی کسی کے ساتھ کیوں محبت کرے اور کیوں کسی کی آواز میں سوز و گداز ہو ۔

اب پورا سلسلہ کامل ہوگیا اور کوئی پہلو رشک کا باقی نہیں رہا لیکن شاعر کی جدت آفریں طبیعت کو اب بھی قناعت نہیں ہے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب   وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھسے

اسی ایک مضمون سے مرزا صاحب کے رُتبۂ شاعری کا اندازہ ہو سکتا ہے اور اُن کی جدت آفرینی اور قوت تخیل پر حیرت ہوتی ہے

الم دوستی

ہم نے ظلم و جور، عداوت پسندی اور ایذا دوستی وغیرہ کے لئے ایک لفظ "الم دوستی" استعمال کیا ہے۔ یہ ایک نہایت دل نشین اور دلپذیر مضمون ہے اور مرزا صاحب نے اس میں ایسے ایسے دلکش انداز اور نئے نئے پہلو نکالے ہیں کہ یہ مرزا صاحب ہی کا خاص مضمون ہوگیا ہے رشک کی طرح اس میں بھی ایک سلسلہ ارتقا مرتب ہو سکتا ہے لیکن چوں کہ اشعار بہت زیادہ ہیں اور ہمیں دو مضمون کسی قدر تفصیل سے لکھنا ہیں اس لئے سب کا نقل کرنا بیکار طوالت ہے۔ ہم خاص خاص شعروں پر اکتفا کرتے ہیں

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہو

یعنی ہمارا یہ خیال نہیں ہے کہ تم ہم سے محبّت ہی کرو اگر محبت نہیں کر سکتے تو عداوت ہی کرو مطلب یہ ہے کہ قطع تعلق نہ ہونا چاہیئے۔ چنانچہ دوسرے شعر میں یہ مضمون صاف کر دیا ہے۔ کہتے ہیں

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے   کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

اور کہتے ہیں:-

ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز   نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

یعنی وہ ہم پر ظلم و ستم کرتا ہے لیکن چوں کہ ہم کو اُس کا ظلم و ستم ہی پسند ہے اس لئے وہ ہماری خیال سے نامہرباں نہیں ہے

گو سمجھتا نہیں پر حسن تلافی دیکھو　　شکوۂ جور سے سرگرم جفا ہوتا ہے

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا　　اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

شکایت کرتے ہیں کہ اے ستمگر تو کسی کا بھی دوست نہیں ہے دوسروں پر تو وہ ظلم کر رہا ہے جو مجھ پر نہیں کئے تھے۔ یعنی دوستی کا اقتضا تو یہ تھا کہ تمام مظالم معمولی اور غیر معمولی تو مجھ ہی پر کرتا۔ رشک کا مضمون ہے ؎

ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو
تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

نہایت نازک مضمون ہے۔ کہتے ہیں کہ تو اپنے تغافل اور بے پروائی میں کسی شیوہ سے معذور نہیں ہے تو چاہے تو اسی تغافل کے عالم میں لطف بھی کر سکتا ہے اور ستم بھی لیکن اگر تجھ کو لطف و مہربانی میں دریغ آتا ہو تو ظلم ہی کر یعنی تغافل محض نہ ہو۔ اور کہتے ہیں ؎

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں　　ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب　　حسرت میں رہے ایک بتِ عربدہ جو کے

دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو　　خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ　　ہم کو حریص لذتِ آزار دیکھ کر

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی　　لکھ دیجیو یا رب اُسے قسمت میں عدو کی

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن　　غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذتِ فراغ　　تکلیف پردہ داریِ زخمِ جگر گئی

حسرتِ لذت آزار رہی جاتی ہے　　جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

کہتے ہیں عشق کا راستہ سوائے تلوار کی باڑھ کے اور کوئی نہیں ہے جو آسانی سے طے ہو جاتا ہے ہم کو ایسے

راستے کی ضرورت ہی جہاں تکالیف و مصائب ہوں۔

واقعات

مرزا غالب کا اصلی اور امتیازی وصف جو کہا جاسکتا ہی وہ یہی واقعات ہیں ان سے روزمرہ کے معمولی واقعات مُراد نہیں ہیں جنھیں ہر شخص سمجھتا اور بیان کیا کرتا ہے بلکہ وہ خاص واقعات مُراد ہیں جن کا احساس ایک شاعر ہی کرسکتا ہی اور وہ اُسے دل نشین الفاظ میں ادا کرتا ہی۔ یہ ایسے واقعات ہوتے ہیں جو لوگوں کے ذہن کے اندرونی تہوں میں تو موجود ہوتے ہیں لیکن زبان پر نہیں آتے اور جب کوئی انھیں الفاظ میں بیان کرتا ہی تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک بھولی ہوئی بات یاد دلادی، ایسے ہی کسی واقعہ کا جو شعر ہوا کرتا ہے وہی سہل ممتنع ہوتا ہی۔ مثلاً مرزا غالبؔ ہی کا شعر ہے کہ

نالہ پابند نَے نہیں ہی

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہی

ہر شخص یہ بات جانتا ہی کہ نالہ نَے کا پابند نہیں ہوتا اور فریاد کی کوئی لَے نہیں ہوتی لیکن ذہن سے زبان پر نہیں آتا۔ شاعر نے اُسے دل نشین الفاظ میں ادا کرکے بھُولی ہوئی بات دلادی۔ ایسے ہی واقعات سے مرزا غالبؔ کا دیوان بھرا پڑا ہی اور اس لحاظ سے مرزا غالب کی شاعری ایک کارآمد شاعری ہی اور شعرائے اُردو کا کلام بھی ان واقعات سے خالی نہیں ہی مگر مرزا غالب کے یہاں جو کثرت ہی وہ اور کسی کے یہاں نہیں اور انھوں نے ایسے واقعات اور حالتوں کا نقشہ کھینچا ہی جو ہر شخص کو عموماً پیش آیا کرتی ہیں یہی وجہ ہی کہ تحریر و تقریر میں جس کثرت کے ساتھ مرزا غالب کے اشعار مستعمل ہیں اُتنے اور کسی کے نہیں۔ ہم مثالاً کچھ اشعار اس جگہ لکھتے ہیں۔ ان میں مرزا صاحب کی یہ عام خصوصیت ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ وہ بجائے خبر کے ہر مضمون کو عموماً انشا میں ادا کرتے ہیں:۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہی ——— کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

کی وفا ہم سے تو غیر اُس کو بُرا کہتے ہیں ——— ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی کیا فائدہ کہ جیب کو رُسوا کرے کوئی
کیا، کیا خضر نے سکندر سے اب کسے رہنما کرے کوئی
جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے
بے خودی بے سبب نہیں غالب کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں سُبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو[1]
وفا کیسی، کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

---

[1] ہمارے لیڈران قوم کی حالت پر یہ شعر خوب چسپاں ہوتا ہے۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا — لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد — گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب — خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہیئے

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ — ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے — کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا — یوں ہو تو چارۂ غم فرقت ہی کیوں نہو

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے — مرا ہر داغِ دل اِک تخم ہے سروِ چراغاں کا

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا — فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

خاک میں ناموس پیمانِ محبت مل گئی — اُٹھ گئی دنیا سے راہ و رسم یاری ہائے ہائے

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں — بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم غیر ہمیں اُٹھائے کیوں

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید — مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

ان میں سے اکثر اشعار جیسا کہ خود ناظرین پر مخفی نہ ہوگا داد و تحسین سے بالا ہیں اس قسم کے اشعار جو ہر موقع اور محل پر کام آسکتے ہیں "دیوان غالب" کے ہر صفحہ پر نظر آئیں گے۔ مثالیں کہاں تک نقل کی جائیں۔

تصویر زندگی

مرزا غالب کا ایک اور امتیازی وصف یہ ہی کہ اُن کا کلام، اُن کی زندگی کا ایک مرقع ہے یوں تو قریباً ہر شاعر کے کلام کی اُس کی زندگی کے بعض واقعات مصرح یا مبہم طور پر موجود ہوتے ہیں لیکن مرزا غالب کی یہ خصوصیت ہی کہ انھوں نے اپنے ذاتی حالات و واقعات سے ہر قسم کے شاعرانہ و فلسفیانہ مضامین پیدا کئے ہیں اس سے اُن کی وسعتِ نظر اور شاعری کی حقیقت شناسی کا پتہ چلتا ہی۔ وہ جب کہ عرش سے تارے توڑ کر لاتے تھے تو اپنے نفس سے کیوں کر غافل ہو سکتے تھے۔ کیوں کہ ان کو اپنی شاعری کے لئے یہیں معتد بہ ذخیرہ مل سکتا تھا۔

افسوس ہی کہ مرزا غالب کی کوئی مکمل اور مبسوط سوانح عمری نہیں ہی جو کچھ ہے وہ ایک تذکرہ سے زیادہ نہیں۔ اگر ایسی سوانح عمری موجود ہوتی جس میں اُن کی زندگی کا ہر خط و خال نمایاں ہوتا اور یہ بھی پتہ چل سکتا کہ کون غزل کس وقت کہی گئی تو دیوان سے مرزا غالب کی مکمل تصویر زندگی تیار ہو سکتی تھی مجبوراً جو کچھ ہی اسی سے ایک خاکہ تیار کیا جاتا ہی۔

شادی یا افکار | مرزا صاحب ابھی پانچ ہی برس کے تھے کہ داغِ یتیمی نصیب ہوا اور نو برس کے تھے جب چچا کا انتقال ہو گیا۔ ایک تو یہ واقعہ ہے دوسرا واقعہ یہ ہی کہ مرزا صاحب صرف تیرہ برس کے تھے جب ان کی شادی ہوئی گویا بقول ان کے حبس دوام کا حکم آگیا اور ایک بیڑی پاؤں میں ڈال دی گئی یا پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا۔ انھیں دو واقعات میں سے کسی واقعہ کی طرف اس شعر میں اشارہ کرتے ہیں ؎

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانہ کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

جس واقعہ کی طرف اشارہ ہو۔ فلسفیانہ مطلب اس شعر کا یہ ہی کہ سنِ شعور حاصل ہونے سے قبل ہی انسان افکار و مصائب میں مبتلا ہو جاتا ہی۔

زنگار رنگ بزم آرائیاں | مرزا صاحب کا شباب بہت عیش و فراغت سے بسر ہوا۔ اس زمانہ میں رنگین صحبتوں کا شوق ہو گیا تھا اور ایک ستم پیشہ سے مراسم محبت بھی پیدا ہو گئی تھی۔ ان ہی رنگین صحبتوں کا ایک شعر میں ذکر کرتے ہیں[۹]

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

وہ ستم پیشہ جس سے محبت تھی نقاب خاک میں چھپ گئی۔ مرزا صاحب کے دل پر اس سانحہ سے جو کچھ گزری ہو گی اُسے وہی جان سکتے تھے غالباً اسی کا مرثیہ کہا ہے جس کا مطلع یہ ہے[۵]

درد سے میرے ہے تجھکو بیقراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

اگرچہ یہ مرثیہ اچھا ہے لیکن سوز و گداز سے خالی ہے جو دلوں کو تڑپا دے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ دل پہ زخم کاری نہ لگنے پایا تھا اور عشق نے ابھی وحشت کا رنگ اختیار نہ کیا تھا جیسا کہ خود مرزا صاحب اس مرثیہ میں فرماتے ہیں[۹]

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا　　دل پہ اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے
عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ　　رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوق خواری ہائے ہائے

تاہم مرزا صاحب کے دل سے اس کی یاد کبھی نہ گئی۔ مرزا حاتم علی بیگ "مہر" کے نام ایک خط میں جوان کی محبوب چُنّا جان کی تعزیت میں ہے لکھتے ہیں:-

"شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے۔ فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اُس کے سامنے مری تھی، تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری۔ بلکہ تم اُس سے بڑھکر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں مری تھی اور تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں جس پہ مرتے ہیں اُس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں عمر بھر میں ایک ...... کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے با آں کہ یہ کوچہ چھٹ گیا اس فن سے میں بیگانہ محض ہو گیا ہوں لیکن کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا"

دیوان میں ایک غزل ہے جس میں فرماتے ہیں ؎

وہ فراق اور وہ وصال کہاں | وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے | ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل وہ دماغ ہی نہ رہا | شورِ سودائے خط و خال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے | اب وہ رعنائیِ خیال کہاں
ایسا آساں نہیں لہو رونا | دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

"ز" کی ردیف میں ایک شعر اور ہے ؎

ہی نازِ مفلسان زرِ از دست رفتہ پر
ہوں گلفروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز

جس طرح مفلس گزشتہ امارت پر فخر کیا کرتے ہیں اسی طرح میں بھی اپنے داغِ عشق کا تذکرہ کیا کرتا ہوں جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے وہ زمانہ مرزا صاحب کی آسودہ حالی کا زمانہ تھا اور اب ناداری و تنگدستی میں بسر ہوتی تھی اس لئے کہتے ہیں ؎

ہم سے چھوٹا قمارخانۂ عشق
واں جو جادیں گرہ میں مال کہاں

ایک جگہ اور فرماتے ہیں ؎

غمِ زمانے نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اُٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

مے نوشی غالباً اسی زمانہ میں مرزا صاحب کو آتشِ سیّال کا چسکہ پڑ گیا تھا جو عمر بھر رہا۔ اور شعرا کے یہاں شراب کے مضمون محض خیالی ہوں لیکن مرزا صاحب کے یہاں خالی ہیں ایک پوری غزل شراب کی تعریف میں لکھی ہی جس کی ردیف "موجِ شراب" ہی۔ جس وجہ سے پیا کرتے تھے وہ خود مرزا صاحب کی زبان سے سُننا چاہیئے۔

مے سے غرض نشاط ہی کس رُوسیاہ کو | اِک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

خودی میں غم وافکار پیچھا نہیں چھوڑتے اور مرزا صاحب کی زندگی ان افکار سے حرام ہو گئی تھی ؎

مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں   غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام

حرام چیز، حرام چیز میں مل جائے تو کیا برائی ہے اور فرماتے ہیں ؎

بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے   غلام ساقی کوثر ہوں مجھکو غم کیا ہے

فرماتے ہیں دنیا کے افکار گو زیادہ ہوں لیکن ان کی تلافی کے لئے شراب کیا کم ہے۔ رہ گئی اس گناہ کی سزا اس کی فکر نہیں۔ ساقی کوثر اپنے غلام کی شفاعت کریں گے۔

بہشت اس لئے عزیز تھی کہ وہاں بادۂ گلفام پینے کو ملے گی ؎

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے

میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"میری مہدی! صبح کا وقت ہے۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں ہاتھ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی سہی مگر وہ آتش سیال کہاں کہ جب دو جرعے پئے فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی دل توانا ہو گیا، دماغ روشن ہو گیا، نفس ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا۔"

اسی حالت کو شعر میں اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

مولانا حالی مرحوم "یادگار غالب" میں لکھتے ہیں کہ

"(مرزا صاحب کی) فکر شعر کا یہ طریقہ تھا کہ اکثر رات کو عالم سرخوشی میں فکر شعر کیا کرتے تھے اور جب کوئی شعر سرانجام ہو جاتا تھا تو کمر بند میں ایک گرہ لگا لیتے تھے۔ اسی طرح آٹھ آٹھ دس دس گرہیں لگا کر سو رہتے تھے اور دوسرے دن صرف یاد پر سوچ سوچ کر تمام اشعار قلمبند کر لیتے تھے۔"

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں

شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دُور دُور تک میرا جواب نہیں لے اب تو قرضداروں کو جواب دے سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد، بڑا کافر مرا۔ ہم نے از راہِ تعظیم جیسا بادشاہ ہوں کو بعد اُن کے "جنت آرام گاہ" و "عرش نشیمن" خطاب دیئے ہیں چوں کہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا سقر مقر اور ھاویہ نہاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آیئے نجم الدولہ بہادر ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں اُن سے پوچھ رہا ہوں۔ اجی حضرت نواب صاحب، نواب صاحب کیسے اور فلاں صاحب آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے، کچھ تو اُکسو کچھ تو بولو۔ بولو کیا بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لئے جاتا ہے یہ بھی تو سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔"

اس پورے خط کا ماحصل اس شعر میں آگیا ہے ؎

قرض کی پیتے تھے مَے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں + رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مولانا آزاد "تذکرہ آبحیات" میں لکھتے ہیں کہ:۔

"ایک دفعہ مرزا بہت قرضدار ہو گئے، قرضخواہوں نے نالش کر دی۔ جواب دہی میں طلب ہوئے مفتی صاحب کی عدالت تھی جس وقت پیشی میں گئے یہ شعر پڑھا ؎ قرض کی الخ۔"

زمانہ عیش کی یاد | مرزا صاحب کا زمانہ شباب بہت فراغ بالی سے بسر ہوا اس کے بعد کچھ نہیں رہا۔ بجائے عیش و فراغت کے مصیبت و تنگی سے گزرتی تھی اس لئے گزشتہ زمانے کی یاد ہمیشہ دل کو ستایا کرتی تھی۔ اسی کی یاد میں یہ فلسفیانہ شعر موزوں کیا ہے ؎

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے + متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

گردشِ دَوران سے جو زمانہ عیش جاتا رہا اس کی پھر توقع رکھنا ایسا ہے جیسا کوئی لوٹی ہوئی پونجی کو رہزن پر قرض خیال کرے۔

زندانِ غم کی تاریکی | "یادگارِ غالب" میں لکھا ہے کہ مکان کے جس کمرے میں مرزا دن بھر بیٹھتے اُٹھتے تھے وہ مکان کے دروازے کی چھت پر تھا اور اس کے ایک جانب ایک کوٹھری تنگ و تاریک تھی جس کا دروازہ اس قدر

چھوٹا تھا کہ کوٹھری میں جھک کر جانا پڑتا تھا۔

جس غمزدہ کی نشست گاہ اس قدر تاریک ہو اُسی کو یہ مضمون سوجھ سکتا ہے

کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم اندھیر ہے + پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

قید کا واقعہ | مرزا صاحب کو چوسر اور شطرنج کی بہت عادت تھی اور ہمیشہ کچھ بد کر کھیلا کرتے تھے اسی بنا پر کوتوال شہر نے جو مرزا صاحب سے دشمنی رکھتا تھا مرزا صاحب کو قید کرا دیا تھا۔ غالباً اسی واقعہ سے مرزا صاحب نے یہ مضمون پیدا کیا ہے

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی + یہ جنونِ عشق کے انداز چھُٹ جائیں گے کیا

مولانا آزاد مرحوم آبحیات میں لکھتے ہیں کہ

"مرزا صاحب کو ایک آفت ناگہانی کے سبب چند روز جیل خانہ میں اس طرح رہنا پڑا کہ جیسے حضرت یوسف کو زندانِ مصر میں۔ کپڑے میلے ہو گئے جوئیں پڑ گئیں تھیں۔ ایک دن بیٹھے ان میں سے جوئیں چُن رہے تھے۔ ایک رئیس وہیں عیادت کو پہنچے۔ پوچھا کیا حال ہے؟ آپ نے یہ شعر پڑھا

ہم غمزدہ جس دن سے گرفتارِ بلا ہیں + کپڑوں میں جوئیں بخیئے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

جس دن وہاں سے نکلنے لگے اور لباس تبدیل کرنے کا موقع آیا تو وہاں کا کرتہ وہیں پھاڑ پھینکا اور یہ شعر پڑھا

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قیمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

صعوبات سفر | سوانح عمری اور مرزا صاحب کے خطوط میں کلکتہ، لکھنؤ، مُراداباد، رامپور اور ہاپوڑ وغیرہ کے سفر کے واقعات مذکور ہیں لیکن کسی سفر میں صعوبات راہ اور ہمراہیوں کے برتاؤ کا ذکر نہیں۔ تاہم ان ہی مقامات میں سے کسی مقام کے سفر میں راستے کی تکالیف اور ہمراہیوں کی بدسلوکی سے سابقہ پڑا تھا جس پر یہ شعر کہا ہے

ناچار بیکسی کی بھی حسرت اٹھائیے + دشواریِ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

جب ہمراہی موجود ہیں تو پھر بیکسی نہیں ہو سکتی اس لئے راہ کی دشواری اور ہمراہیوں کے ستم کے ساتھ

اس کی حسرت اُٹھانا پڑی۔

غربت میں خبر حوادث | اسی طرح مرزا صاحب کو مسافرت میں وطن سے کسی کی خبر مرگ پہنچنے کا حال مذکور نہیں لیکن ایک شعر سے پتہ چلتا ہی کہ کئی لوگوں کے مرنے کی خبر پہنچی تھی۔ وہ شعر یہ ہی ؎

کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال + نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

موت کی خبر کھلے ہوئے خط میں بھیجی جاتی تھی۔

نظم و نثر کی بربادی | مرزا صاحب چودھری عبدالغفور خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"بندہ پرور! میرا کلام کیا نظم، کیا نثر، کیا اردو، کیا فارسی، کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ دو چار دوستوں کو اس کا التزام تھا کہ وہ مسودات مجھسے لے کر جمع کر لیا کرتے تھے سو اُن کے لاکھوں روپئے کے گھر لُٹ گئے، جن میں ہزاروں روپئے کے کتاب خانہ بھی گئے۔ اسی میں وہ مجموعہ ہائے پریشان بھی غارت ہوئے۔ میں خود اس مثنوی کے واسطے خون جگر ہو رہا ہوں ہائے کیا چیز تھی۔"

شاید اسی واقعہ سے مرزا صاحب کا ذہن اُس مضمون کی طرف منتقل ہوا ی ؎

نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل بباد
یادگارِ نالہ اِک دیوانِ بے شیرازہ تھا

شاعر (نالہ) کی یادگار ایک دیوان بے شیرازہ (اوراقِ لختِ دل) تھا جسے خود اس نے برباد کر دیا۔

کہنہ مشقی | مرزا صاحب کی عمر آٹھ نو برس کی تھی جب ہی سے شاعری شروع کر دی تھی اور اسی عمر میں پتنگ پر ایک مثنوی لکھی تھی۔ تیرہ چودہ برس کی عمر میں میر تقی "میر" نے ان کے اشعار سُن کر کہا تھا کہ "اگر اس لڑکے کو کوئی اُستاد کامل مل گیا اور اُس نے اس کو سیدھے رستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا"۔ میر صاحب کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی اور (سلامتی طبع) ایک اُستاد کامل مل گیا جس نے سیدھے رستے پر ڈال دیا اور لاجواب شاعر بنا دیا۔

مرزا صاحب نے اس کہنہ مشقی کے متعلق ایک خط میں اظہار کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہی کہ ۱۲۷۶ھ میں ۲۵ برس

فکرِ سخن میں گزرے تھے۔ دو شعروں میں اس واقعہ کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں ؎

تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے　　　　تریاکیِ قدیم ہوں دودِ چراغ کا

کہتے ہیں میں قدیم سے کلام روشن (چراغ) کی فکر (دود) کرتا رہتا ہوں ؎

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں

مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

کہتے ہیں ابھی خیالات میں پختگی اور جمعیت نہیں پیدا ہوئی تھی یعنی کم سنی کا زمانہ تھا جب ہی سے میں غزلیات وغیرہ (نسخہ ہائے وفا) تالیف کر رہا ہوں۔

نکتہ چینی | مرزا صاحب کے ابتدائی کلام پر سخت نکتہ چینیاں ہوا کرتی تھیں اور لوگ مُنہ پر کہدیا کرتے تھے کہ کلام مہمل ہوتا ہے۔ اسی پر خفا ہو کر کہتے ہیں ؎

نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

مولانا حالی مرحوم نے اس شعر کو بھی اسی واقعہ سے متعلق بتایا ہے ؎

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے　　　　خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

خامشی سے یہی فائدہ ہوتا ہے کہ اپنا حال کسی پر ظاہر نہیں ہونے پاتا۔ میں خوش ہوں کہ بغیر خامشی کے مجھے یہ مقصد حاصل ہے کہ میری بات کوئی سمجھتا ہی نہیں۔ کنایہ اس میں یہ ہے کہ میں اسرار بیان کرتا ہوں جنھیں لوگ سمجھ نہیں سکتے۔

دوستوں کی فہمائش پر یہ رباعی کہی ہے ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　　　سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

کلام پر رائے | مرزا صاحب اپنی شاعری کی تعریف و رائے زنی میں کسی کے محتاج نہیں۔ وہ خود اپنے کلام کی صحیح تعریف کرتے ہیں۔ یہ دو شعر عنوانوں کے نیچے لکھے گئے ہیں ؎

ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے ۔ کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

جو یہ کہے کہ ریختہ، کیونکہ ہو رشک فارسی + گفتۂ غالب ایک بار پڑھکے اُسے سُنا کہ یوں

ابتدائی ناقابلِ فہم کلام کے متعلق کہتے ہیں ؎

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے ۔ مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

یعنی عقل جس قدر کوشش کرے، ہماری تقریر کا مطلب سمجھ میں نہیں آسکتا۔ خصوصیت کثرتِ معنی کا ان

اشعار میں اظہار کرتے ہیں ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے ۔ جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

ایک قطعہ کا شعر ہے ؎

فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر ۔ کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل

ناقدردانی کی شکایت | مرزا صاحب جس رُتبہ کے شاعر تھے اس کے شایانِ ان کی قدردانی نہ ہوئی۔

"مہرِ نیمروز" میں بہادر شاہ کو خطاب کر کے ظاہر کیا ہے کہ "شاہجہاں کے عہد میں کلیم شاعر سیم و زر میں تولا گیا تھا لیکن

میں صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ اور کچھ نہیں تو میرا کلام ہی ایک دفعہ کلیم کے کلام کے ساتھ تول لیا جائے"

لیکن یہ آرزو پوری نہ ہوئی اُس ناقدردانی کی اکثر شکایت کیا کرتے تھے اور بالکل بجا شکایت تھی۔

منشی حبیب اللہ ذکا کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"ایک کم ستر برس کی عمر ہوئی سوائے شہرتِ خشک کے فنِ شعر کا کچھ پھل نہ پایا فرمانروایانِ عصر معتقد

ہوئے مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ احسنت و مرحبا کا شور سامعہ فرسا ہوا۔ غیر ستائش کا حق ستائش سے ادا ہوا"

اس شکایت کا دو ایک شعروں میں اس طرح اظہار کرتے ہیں ؎

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد ۔ کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

ہمارے شعر اب صرف طبیعت کے تقاضے یا دل بہلانے کے لئے ہیں اُن سے کوئی فائدہ اُٹھانا مقصود نہیں

ہے کیوں کہ یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ اظہارِ ہنر میں کچھ نفع نہیں ؎

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا　　سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ سخن کو میں

جس طرح میں متاعِ سخن کو دلپذیر سمجھتا ہوں اسی طرح میں نے قیاس کر لیا ہے کہ اور لوگ بھی دلپذیر سمجھتے ہوں گے حالاں کہ یہ محض غلط خیال ہے۔

سخن فہم کی قدر | مولانا حالی مرحوم لکھتے ہیں۔

"حُسنِ اتفاق سے ان کو کوئی سخن سنج اور سخن فہم میسّر آجاتا تھا تو اُس کو ایک نعمتِ غیر مترقبہ سمجھتے تھے۔ منشی نبی بخش حقیر تخلص جو ایک زمانے میں کول میں سررشتہ دار تھے اور جن کی سخن فہمی اور سخن سنجی کی بڑے بڑے لوگوں سے تعریف سُنی گئی ہے کہیں وہ دلی میں آئے ہیں اور مرزا کے مکان پہ ٹھہرے ہیں۔ ان کی نسبت منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ خدا نے میری بے کسی اور تنہائی پر رحم کیا اور ایسے شخص کو میرے پاس جو میرے زخموں کا مرہم اور میرے درد کا درماں اپنے ساتھ لایا اور جس نے میری اندھیری رات کو روشن کر دیا، اُس نے اپنی باتوں سے ایک ایسی شمع روشن کی جس کی روشنی میں میں نے اپنے کلام کی خوبی جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود میری نگاہ سے مخفی تھی دیکھی۔ میں حیران ہوں کہ اس فرزانۂ یگانہ یعنی منشی نبی بخش کو کس درجے کی سخن فہمی اور سخن سنجی عنایت ہوئی ہے۔ حالاں کہ میں شعر کہتا ہوں اور شعر کہنا جانتا ہوں مگر جب تک میں نے اس بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے اور سخن فہم کس کو کہتے ہیں؟ مشہور ہے کہ خدا نے حسن کے دو حصّے کئے۔ آدھا یوسف کو دیا اور آدھا تمام بنی نوع انسان کو کچھ تعجب نہیں کہ فہم سخن اور ذوقِ معنی کے بھی دو حصّے کئے ہوں اور آدھا منشی نبی بخش کے اور آدھا تمام دنیا کے حصّے میں آیا ہو۔ گو زمانہ اور آسمان میرا کیسا ہی مخالف ہو میں اس شخص کی دوستی کی بدولت زمانے کی دشمنی سے بے فکر اور اس نعمت پر دنیا سے قانع ہوں"

اپنی طبیعت کے اس خاصّہ کا ایک شعر میں اس طرح اظہار کیا ہے ؎

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبع خریدار دیکھ کر

پہلے مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ میرے کلام کا جو خریدار ہوتا ہے میں اُس کے ہاتھ خود بک جاتا ہوں اور دوسرے مصرعہ میں یہ اشارہ ہے کہ میرے کلام کا مذاق صحیح ہونا دلیل ہے اس شخص کے اہلِ کمال ہونے کی اور یہ باعث ہے میرے خود اس کے ہاتھ بک جانے کا۔

(شرح طباطبائی)

شکایت ابنائے زمان | مرزا صاحب کے ساتھ ابنائے زماں نے جو بدسلوکیاں کیں وہ اُن کی سوانح عمری میں صرف اس قدر مذکور ہیں کہ ان کی شاعری پر لوگوں نے سخت اعتراضات کئے "قاطع برہان" کی بے حد مخالفت ہوئی اور اس سلسلے میں فحش اور دشنام سے بھرے ہوئے خطوط لوگوں نے بھیجے۔ اس قدر شدید مخالفت مرزا صاحب کو نہایت تکلیف پہنچاتی تھی یا کوتوال کی دشمنی جس نے قید کرایا یا ان کے چچا نے جاگیر میں سے پورا حصہ نہ دیا یا مرزا صاحب نے ایک شخص پر جس نے "قاطع برہان" کے جواب میں ایک رسالہ لکھا تھا اور فحش و دشنام سے بھرا ہوا تھا ازالۂ حیثیت عرفی کی نالش کی تھی مولویوں نے جو ان سے ملتے جلتے تھے ان کے خلاف شہادت دی۔

ان کے علاوہ اور واقعات ہوں گے جن کی شکایت مرزا صاحب ذیل کے اشعار میں کرتے ہیں ؎

کہوں کیا خوبیِ اوضاع ابنائے زماں غالبؔ + بدی کی اُس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ   ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

کرتے کس مُنہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ   تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

یہ شعر غالباً کلکتہ کے مجادلہ پر کہا ہوگا یا وطن سے مُراد آگرہ ہو۔

لوگوں کے جھوٹے اور نمائشی اخلاق کی شکایت ان شعروں میں کرتے ہیں ؎

دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلّی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ لفظ "وفا" لکھا اور بولا تو جاتا ہے لیکن اس کے معنی کا ظہور نہیں ہوتا پھر خالی استعمال سے

کیا تسلی ہو سکتی ہے اس لئے یہ وہ لفظ ہے جس کو اپنے معنی پر شرمانا چاہیئے کہ ظہور اس کے خلاف ہوتا ہے۔

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھکر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا

میرا کام یہی رہ گیا ہے کہ بجائے شگفتگی کے افسردگی کی آرزو کیا کروں کیوں کہ دل اہل دنیا کا ظاہری تپاک دیکھکر متنفر ہو گیا ہے۔

لوگوں سے ان کے نفاق، جھوٹی ہمدردی اور دل آزاری سے جو بیزاری ہو گئی تھی اُسے اس قطعہ میں ظاہر کیا ہے ؎

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو — ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیئے — کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار — اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

رہِ ثواب سے انحراف مرزا صاحب نے ساری عمر نہ کبھی نماز پڑھی اور نہ روزہ رکھا۔ ایک دفعہ مولانا حالی نے ایک تحریر پیش کی تھی جس میں نصیحت کی تھی کہ آپ پنج وقتہ نماز پڑھ لیا کیجئے یہ تحریر مرزا صاحب کو ناگوار گزری تھی۔ تفصیلی واقعہ "یادگار غالب" میں دیکھنا چاہیئے۔

اس حالت کا نقشہ مرزا صاحب نے ان اشعار میں کھینچا ہے ؎

دل گزرگاہ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادہ سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا

کہتے ہیں اگر دل میں تقویٰ اور پرہیزگاری کے خیالات نہیں آتے تو نہ سہی شراب و ساغر کے خیالات ہی سہی

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ایک شعر میں اس کی وجہ بیان فرماتے ہیں ؎

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے — ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو

انحراف کا کیا اچھا ثبوت ہے کہ ہماری سرنوشت جس قلم سے لکھی گئی ہے اُس پر ٹیڑھا قط لگا تھا۔

شوقِ حج | ہاں مرزا صاحب کو حج کی تمنا تھی۔ لکھنؤ میں ایک غزل لکھی تھی اُس میں کہتے ہیں ؎

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی — ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر — عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

دیباچہ سراج المعرفت میں لکھتے ہیں۔

"جی میں آیا کہ اس کتاب مستطاب پر ایک دیباچہ لکھئے اور پھر میں برگ سفر ساز کروں اور عزم سفر حجاز کروں۔ زمزم کے پانی سے وضو کروں اور اُس کاشانہ ملائک کے گرد پھروں اور حجر اسود کو چوموں اور پھر وہاں سے مدینہ منورہ کو جاؤں اور خاک تربت اطہر کا سُرمہ آنکھوں سے لگاؤں۔ بادشاہ سے کیا عجب ہے کہ دو برس کی تنخواہ دے کر مجھکو خانۂ خدا کے طواف کی رخصت دیں کہ یہ گنہگار وہاں جاوے اور اگر زیست باقی ہے تو پھر وہاں جاکر اور اپنے ستاون برس کے گناہ کہ جن میں سوائے شرک کے سب کچھ ہے بخشوا کر پھر آوے۔" ؎

غالب ہوائے کعبہ بسر جا گرفتہ است
رفت آنکہ عزم خلخ و نوشاد کردمے

ایک دفعہ بادشاہ دہلی نے بیت اللہ جانے کا ارادہ کیا تھا مرزا صاحب بھی ہمراہ چلنے کے آرزومند تھے

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں — حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

غالباً اسی کے بعد ایک غزل کہی ہے جس کا مقطع یہ ہے ؎

کعبہ کس مُنہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

یہاں کیا کیا بقول اُن کے تمام عمر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو مسلمان نہیں۔ ایسی صورت میں کس مُنہ سے کعبہ جائیں گے۔

آلام و صدمات | مرزا صاحب کی سوانح عمری پر غور کیا جائے تو ان کی زندگی آلام و صدمات کا ایک سلسلہ نظر آتی ہے۔ مالی حالت زمانۂ شباب تک اچھی رہی اس کے بعد کبھی فراغت سے بسر نہ ہوئی۔ اگرچہ آمدنی تھی لیکن اُن کی

فراخ حوصلگی کے مقابلہ میں کچھ نہ تھی ہمیشہ تنگدست رہا کرتے تھے۔ غدر کے زمانہ میں یہ مصیبت نازل ہوئی کہ تمام مال و اسباب برباد ہو گیا بڑی تنگی اور عسرت سے بسر ہوتی تھی۔ مرزا صاحب لکھتے ہیں کہ

"اس ناداری کے زمانہ میں جس قدر کپڑا، اوڑھنا بچھونا گھر میں تھا سب بیچ بیچ کر کھا گیا گویا اور لوگ روٹی کھاتے تھے اور میں کپڑا کھاتا تھا"۔

فلاح کی بہت تدبیریں اور کوششیں کیں لیکن عمر تمام ہو گئی اور کامیابی نصیب نہ ہوئی خود فرماتے ہیں۔

کوئی امید بر نہیں آتی + کوئی صورت نظر نہیں آتی

غالبؔ کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے + خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

کہتے ہیں مجھے اپنی کوشش سے کوئی ثمرہ نہیں مل سکتا۔ اگر ملخ سے کھیت محفوظ رہ گیا تو خرمن جل جاتا ہے ؎

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

کہتے ہیں میری کوشش ایسی ہی جیسے کوئی مرغ اسیر قفس میں آشیاں کے لئے گھاس فراہم کرے جس سے اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور فرماتے ہیں ؎

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

یعنی خواہش و آرزو کے خلاف ہوتا ہے، چاہتے ہیں بھلا اور ہوتا ہے برا اس لئے اچھا ہوتا کہ ہم برا چاہتے تو اچھائی ہوتی۔

گھر کی تباہی میں مرزا صاحب کا بھی ہاتھ تھا اس پر یہ شعر موزوں ہوا ہے ؎

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی + لکھدیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

تضعلے نے تھا مجھے چاہا خراب بادۂ الفت + فقط خراب لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے

قضا و قدر نے یہ چاہا تھا کہ میں خراب بادۂ الفت رہوں لیکن جب میری سرنوشت لکھی جانے لگی تو قلم صرف "خراب" یعنی تباہ و برباد لکھکر رہ گیا آگے نہ بڑھ سکا یعنی بادۂ الفت نہ لکھ سکا۔

خوبیِ قسمت سے کوئی اُمید فلاح کی پیدا ہوئی تو اس کے پورا ہونے سے پہلے ہی نا اُمیدی کے اسباب جمع ہو گئے جیسا انھوں نے اس شعر میں ظاہر کیا ہے ؎

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے — سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

فلاح دنیوی کے علاوہ اور جو تمنائیں اور آرزوئیں پیدا ہوئیں اُن کی حسرت ہی دل میں رہی جس کی شکایت ان اشعار میں کی ہے۔

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ — جانتے ہیں سینۂ پرخوں کو زنداں خانہ ہم

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں — چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان ولیکن پھر بھی کم نکلے

کہتے ہیں میرے ارمان بہت نکلے لیکن پھر بھی بہت کم نکلے۔ اب بھی اتنے ارمان باقی ہیں اور ایسے کہ ان ہی کے پورے ہونے پر زندگی کا انحصار ہے ؎

لب خشک در تشنگی مردگان کا
زیارت کدہ ہوں دل آزردگان کا

میں ان لوگوں کا لب خشک ہوں جو تشنگی میں مر گئے، اس لئے دل آزردہ لوگوں کا زیارت کدہ ہو گیا ؎

ہمہ نا اُمیدی ہمہ بدگمانی — میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

میں سراپا یاس و نا اُمیدی ہوں جس طرح فریب وفا کھائے ہوئے لوگوں کا دل ہوتا ہے پھر بلند ہمتی کے جوش میں لکھتے ہیں ؎

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویاں ہوں جواہر کے + جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنّا مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم اے خانماں خراب نہ احساں اُٹھائیے

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

اور کیا خوب فرماتے ہیں ؎

نسیۂ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے

یعنی میری ہمت نے گوارا نہ کیا کہ میں دنیا (نقد) و عاقبت (نسیہ) کے نذر ہو جاؤں. مطلب یہ ہے کہ میں ان دونوں کو بے حقیقت سمجھتا ہوں۔

مالی پریشانیوں اور خوشیوں سے محرومی کے سوا مرزا صاحب کو جو سخت سے سخت جاں کاہ صدمات اُٹھانا پڑے وہ علیحدہ ہیں. باپ اور چچا کا سایا بچپن ہی میں سر سے اُٹھ گیا تھا۔ ان کے بھائی مرزا یوسف تیس برس دیوانہ رہے اور زمانہ غدر میں نہایت بیکسی کے عالم میں انتقال کر گئے۔ غالباً مرزا صاحب نے انھیں کی وفات کا اس شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالب یوسفِ ثانی مجھے

اس شعر میں موت کو از سرِ نو زندگی سے تعبیر کیا[1] ہے۔

سات بچے پے در پے ہوئے لیکن ایک بھی زندہ نہ رہا۔ بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف کا انتقال ہو گیا جن سے مرزا صاحب کو نہایت محبت تھی۔ ایک غزل جس کا مطلع ہے ؎

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

انھیں کا مرثیہ ہے۔

---

[1] بیضہ آسا ننگ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس + از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

انھیں غموں اور اندوہ کے جذبات تھے جو شعر بن کر ٹپک پڑے۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا دل بھی یا رب کئی دیئے ہوتے

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز

ظلمت کدہ میں میری شبِ غم کا جوش ہے اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو

یوں ہی دُکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا کہ مرے عدو کو یا رب ملے میری زندگانی

یارب زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لئے لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بُری بلا ہے مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

خزاں کیا فصلِ گل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو وہی ہم ہیں، قفس ہے، اور ماتم بال و پر کا ہے

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

نہ دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیئے

ان صدمات و آلام نے مرزا صاحب کو بالکل پیسیمسٹ (الم پرست) بنا دیا تھا۔ دنیا اُن کی نظروں میں تاریک ہوگئی تھی اور یہاں کی دلچسپیوں سے اُن کا دل سرد ہوگیا تھا ؎

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں سوائے خونِ جگر سو جگر میں خاک نہیں

ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیت شادی کہ صبحِ عید مجھکو بدتر از چاکِ گریبان ہے

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

مےُ عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے لئے بیٹھا ہے اِک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

''الم دوستی'' کا مضمون اُن کے اسی خیال کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ بہت اشعار پہلے نقل ہوئے دو تین اشعار جو اس موقع سے تعلق رکھتے ہیں یہاں لکھے جاتے ہیں ؎

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسدؔ وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

نام کا ہے مرے وہ دکھ کہ کسی کو نہ ملا کام کا ہے مرے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

اُس شخص کی دُنیا کے عیش راحت سے محرومی کا کون اندازہ کرسکتا ہے جو نوحۂ غم اور نغمۂ شادی میں فرق نہیں کرتا اور فرماتے ہیں ؎

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے — بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

اپنے دل کو تسکین دیتے ہیں کہ نغمہ ہائے غم کو بھی غنیمت سمجھنا چاہیئے ایک دن وہ آئے گا کہ اس سازِ ہستی میں کوئی نغمہ نہ باقی رہے گا۔ اسی مضمون کا ایک شعر اور ہے ؎

دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر — نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے

موت کی آرزو آخر مرزا صاحب بھی انسان تھے کہاں تک ان جانکاہ صدمات کا تحمل کر سکتے تھے مجبوراً موت کی آرزو کی ؎

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام — ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

مولوی عبدالغفور صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"حضرت سچ تو یہ ہے کہ غم ہائے روزگار نے مجھے گھیر لیا ہے۔ سانس نہیں لے سکتا اتنا تنگ کر دیا ہے۔ ہر بات سو طرح سے خیال میں آئی پر دل نے کسی طرح تسلی نہ پائی اب دو باتیں سوچا ہوں۔ ایک تو یہ کہ جب تک جیتا ہوں یوں ہی رویا کروں گا۔ دوسرے یہ کہ آخر ایک نہ ایک دن مروں گا۔ صغریٰ، کبریٰ دل نشین ہے۔ نتیجہ اس کا تسکین ہے۔ ہیہات" ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیئے

مرنے سے بیس برس پہلے موت کا خیال پیدا ہوا تھا۔ ہر سال مادۂ تاریخ کہتے تھے لیکن ہر سال غلط ہو جاتے تھے۔ ۱۲۷۷ھ میں انھوں نے اپنے مرنے کی تاریخ کہی "غالب مرد" اس سے پہلے کئی مادّے غلط ہو چکے تھے۔ منشی جواہر سنگھ جوہر جو مرزا صاحب کے مخصوصین میں سے تھے ان سے مرزا صاحب نے اس مادہ کا ذکر کیا۔ اُنھوں نے کہا "حضرت انشاءاللہ یہ مادہ بھی غلط ثابت ہوگا۔"

مرزا صاحب نے کہا "دیکھو صاحب تم ایسی فال مُنہ سے نہ نکالو اگر یہ مادہ مطابق نہ نکلا تو میں سر پھوڑ کر مر جاوں گا"

(یادگار غالب)

دیوان میں کئی شعر ہیں جن میں مرنے کی آرزو کی گئی ہے۔

کہتے ہیں جیتے ہیں اُمید پہ لوگ + ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے + تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

ساتھ ہی اس کے یہ بھی فرماتے ہیں ؎

خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنا میں ہے اِک صیدِ زبوں وہ بھی

آخر جب اس قیدِ زبوں کے انتظار میں بہت دن گزر گئے تو فرماتے ہیں ؎

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی + موت آتی ہے پر نہیں آتی

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے + ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہوا

بالآخر یہ اُمید برآئی اور مرزا صاحب نے ۲؍ ذیقعد=۱۵؍ فروری ۱۸۶۹ء کو ۷۳ برس ۴ مہینے کی عمر میں دُنیا سے رحلت فرمائی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ؎

عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

مختصر سالانہ رپورٹ انجمن ترقی اُردو

بابت سنہ ۱۹۲۰ع

اس سال کتب ذیل طبع ہوئیں

۱- اصول وضع اصطلاحات علمیہ .... ۴- فلسفہ تعلیم .... دوسری بار

۲- تاریخ ملل قدیمہ .... ۵- علم المعیشت .... ایضاً

۳- محاسن کلام غالب اُردو .... ۶- انتخاب کلام میر .... ایضاً

کتابیں جو زیر طبع ہیں

۱- بجلی کے کرشمے .... از مولوی معشوق حسین خاں صاحب بی۔ اے

۲- نفح الطیب .... مترجمہ مولوی خلیل الرحمٰن صاحب؛ اس کی کتابت ہو رہی ہے

۳- تاریخ ادبیات ایران .... سنہ ۱۹۲۱ء کی پہلی چھ ماہی میں ضرور طبع ہو جائے گی۔

کتابیں جو تیار ہیں

۱- اصطلاحات اہل حرفہ .... ۳- تاریخ تمدن یورپ .... از گزد

۲- تاریخ ایران، از سائکس .... ۴- ادبیات عرب

کتابیں جو زیرِ تالیف یا زیرِ ترجمہ ہیں

۱ - علم حشرات الارض .... ۴ - نفسیات

۲ - نامۂ دانشوران .... ۵ - تاریخ زبان اُردو

۳ - ان ٹلکچوئل ڈیولپمنٹ آف یورپ (یورپ کی دماغی ترقی) ...... ۶ - تاج خسروی

کتابیں جو عثمانیہ یونیورسٹی کے لئے انجمن نے ترجمہ کرائیں یا زیرِ ترجمہ ہیں

۱ - برطانوی ہند	از لائل	۶ - عروج فرانس	از ویکمین
۲ - تاریخ ہندوستان	از مارشمین	۷ - موجودہ یورپ	از ایلس فلپ
۳ - ڈلہوزی	رولرز آف انڈیا سیریز	۸ - نظام حکومت انگلشیہ	از یج ہارٹ
۴ - مادھوجی سندھیا	ایضاً	۹ - تاریخ ہند (عہد انگلشیہ)	از مارشمین
۵ - تاریخ انقلاب یورپ	از مورس اسٹون	۱۰ - امپیریل گزٹیر آف انڈیا (جلد اوّل آٹھواں اور نواں باب)	

شعبہ اصلاح زبان کے قیام و مفہوم کا حال گزشتہ سالانہ رپورٹ میں عرض کیا جا چکا ہے۔ افسوس ہے کہ اس کے مزید جلسوں کا موقع پیدا نہ ہو سکا لیکن انجمن کا رسالہ اُردو اس تجویز کو عمل میں لانے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوگا۔ نامانوس، غلط اور متروک الفاظ کی فہرست موصول ہونے پر رسالہ میں پیش کر دی جائے گی تاکہ اس پر غور و تنقید ہو سکے۔

گزشتہ سال کی تجویزوں میں ایک تجویز محبان اُردو کی تھی۔ اگرچہ اس کی تکمیل میں نہ خاص ایثار مطلوب تھا نہ مال و زر، صرف معمولی توجہ اور انضباط کے ذریعہ سے پانچ سال کے عرصہ میں ایک ناخواندہ شخص کو اُردو کی معمولی تعلیم دینے کا فرض ادا کرنا [illegible] لیکن افسوس ہے کہ مدعیان اُردو نے اس تجویز پر التفات نہ فرمایا۔ اقرار نامے چھپے ہوئے تیار ہیں، جو صاحب اُردو زبان سے ہمدردی رکھتے ہیں اور اپنے عزیز وقت کا کچھ حصہ اس کام میں صرف کرنا چاہیں، وہ اقرار نامہ صدر دفتر سے طلب فرما سکتے ہیں۔

تدوین لغت کے لئے روپیہ فنڈ کا کام جاری ہے۔ فراہم شدہ رقم گوشوارہ میں ملاحظہ کی جائے بعض ہی خواہ خاص توجہ اور سرگرمی سے اعانت کر رہے ہیں۔ ان کی مساعی تحسین اور شکریہ کے لایق ہیں، تاہم کام کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ سابق رپورٹ میں اس موضوع کی تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا کہ یہ کام کس قدر کثیر سرمایہ چاہتا ہے، اس لئے انگریزی کی ویبسٹر کے ارکان کی طرح اس کے معاونین کی تعداد ایک لشکر جرار کے برابر نہ ہو تو کم از کم ایک معقول جماعت ضرور ہونی چاہیئے جو استقلال اور ہمت کے ساتھ سرمایہ کی فراہمی میں مصروف رہے۔ کام کرنے والے حضرات کے اسماء گرامی شکریہ کے ساتھ انجمن کی سالانہ رپورٹ میں درج کئے جائیں گے۔

کتب نصاب تعلیم | دفعہ ۶ مقاصد انجمن کے مطابق اس سال اکناف و اطراف ہند کی تمام یونیورسٹیوں کی ایک مکمل اور جامع فہرست کتب نصاب مرتب کر لی گئی ہے تاکہ ان کتابوں کو بہم پہنچا کر ان پر ادبی تنقید کی جائے اور اگر ان میں نقائص ہوں تو یونیورسٹی کمیٹیوں کو ان سے آگاہ کیا جائے۔

انجمن کا رسالہ | انجمن کے مقاصد میں ابتدا سے یہ داخل تھا کہ سرمایہ مساعدت کرے تو انجمن کی طرف سے ایک رسالہ جاری کیا جائے لیکن انجمن اس مقصد کو عمل میں لانے سے قاصر تھی، اوّل تو اس وجہ سے کہ خود اس کی حالت میں استحکام پیدا نہ ہوا تھا دوسرے سرمایہ اس قدر کم تھا کہ انجمن اس ذمہ داری کو اپنے سر لیتے ہوئے جھجکتی تھی اب چوں کہ یہ دونوں رُکاوٹیں باقی نہ رہی تھیں، لہٰذا اس دیرینہ مقصد کی تعمیل میں تاخیر مناسب نہ تھی، چنانچہ ارکان شوریٰ سے مشورہ کرنے کے بعد گزشتہ جون میں یہ قرار پایا تھا کہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء سے اُردو نام کا رسالہ جاری کر دیا جائے اور فی الحال اسے سہ ماہی رکھا جائے اور اس کا حجم کم و بیش دو سو صفحے ہو، بعد تجربہ کے اسے دو ماہی یا ماہانہ کر سکتے ہیں۔ یہ رسالہ مثل دوسرے رسالوں کے کشکول نہو جس میں ہر قسم کے مضامین بلا لحاظ مناسبت و ربط درج کر دیئے جاتے ہیں بلکہ اس میں زیادہ تر زبان و ادب کی بحث ہو، اور اُردو زبان، اس کی تاریخ، اصطلاحات، لغت الفاظ و محاورات اور تنقید کے متعلق مضامین ہوں۔ وہ نہ صرف انجمن کے مقاصد کی اشاعت اور توسیع کا آلہ ہو، بلکہ اہل ملک میں صحیح ذوق ادب پیدا کرنے میں بھی مدد دے۔ الغرض کاغذ اور مضامین اور طباعت کا انتظام کر کے اکتوبر میں رسالہ بالکل تیار

کرالیا گیا تھا لیکن اس کے سرورق کا بلاک گورنمنٹ پریس کے اہتمام سے بنوایا جا رہا تھا کہ اسی زمانہ میں اسٹرائک کی وبا شملہ کی بلندیوں پر بھی جا چڑھی، بلاک تعویق میں پڑ گیا اور مجبوراً اکتوبر کے بجائے اس کے اجرا کا مہینہ جنوری ۱۹۲۱ء کو قرار دیا گیا۔ یقین کامل ہے کہ حوادث کا مطلع اس وقت تک صاف رہیگا اور انجمن کی یہ دیرینہ مراد بر آئے گی۔ اس وقت خریداروں کی تعداد ۳۰۰ تک پہونچی ہے مگر یہ تعداد بہت کم ہے۔ حامیان اُردو کا فرض ہے کہ اس رسالہ کی کامیابی پر خاص طور سے متوجہ ہوں۔

اصطلاحات علمیہ | انجمن گزشتہ دو سال سے اصطلاحات علمیہ کا جو کام دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی امداد و اہتمام سے انجام دے رہی ہے اُس کا مختصر ذکر ۱۹۱۹ء کی رپورٹ میں آچکا ہے بلکہ اس وقت تک اس شعبہ میں جس قدر کام ہو چکا تھا اس کی تصریح بھی کر دی گئی تھی۔ مسرت کا مقام ہے کہ یہ چیز تصنیف و تالیف کے لئے جس قدر اہم اور ضروری ہے اُسی قدر تسلسل اور کامیابی کے ساتھ اس کی تکمیل ہو رہی ہے، اس اثنا میں علمائے فن نے اصول وضع اصطلاحات کی بحث و تصفیہ کے جلسے کئے اور اُردو زبان کی خصوصیات پر غائر نظر ڈال کر بہت سی کارآمد باتیں دریافت کیں۔ اس سال کی جدید مطبوعات میں آپ اصول وضع اصطلاحات کا نام ملاحظہ فرمائیں گے۔ یہ کتاب نہایت بلند پایہ اور معرکتہ الآرا ہے۔ کئی سو صفحوں پر ختم ہوتی ہے، اس میں الفاظ کی ترکیب، سابقوں اور لاحقوں کا استعمال کمال وضاحت اور تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اصطلاحات علمیہ کے متعلق اب تک ایک بات کی بڑی کمی تھی کہ جو اصطلاحی الفاظ وقتاً فوقتاً طے ہوتے ہیں یا وضع ان کی نسبت مشہور اہل قلم اور ماہران فن کی رائے نہیں لی جاتی اگرچہ ابتدا میں بعض علمائے فن کی خدمت میں الفاظ کی فہرست بغرض مشورہ بھیجی گئی لیکن بعض نے تو مطلق اعتنا نہ کیا اور ایک دو صاحبوں نے توجہ فرمائی تو اپنی رائے اس قدر دیر میں بھیجی کہ وقت پر اس سے استفادہ نہ کیا جا سکا۔ بالآخر یہ طریقہ بے سود سمجھکر ترک کر دیا گیا لیکن اب یہ نقص بہت جلد رفع ہو جائے گا جیسا کہ میں کسی اور جگہ عرض کر چکا ہوں۔ انجمن ایک سہ ماہی رسالہ شائع کر رہی ہے، اس کی ہر اشاعت میں چند اوراق ان اصطلاحات کے لئے بھی مخصوص کر دیئے جائیں گے تاکہ جو اصطلاحات وضع کی جائیں ان سے پبلک بھی آگاہ ہو جائے اور صاحبان تنقید کو بھی بحث و مباحثہ کا کافی موقع مل جائے جب تمام اصطلاحات

اس طرح پیش ہو چکیں گی تو کتاب کی صورت میں شائع کردی جائیں گی۔

اس کے علاوہ اس سال مفصلۂ ذیل اصطلاحات مختلف علوم و فنون میں وضع ہوئیں:۔

تشریح	۲۹۲	فلسفہ	۱۸
حیوانات	۹۵	برقیات	۲۱۱
جراحی	۲۴	طبعیات	۱۳۸
طب	۶۳۰	فارماکوپیا } فارماکولوجی }	۴۰۴
عضویات	۵۲		
کیمیا	۲۷۶	جرمیات	۱۹۰
نباتات	۶۳۹	متفرقات	۱۳۴
مقنائیات	۸۵		

انجمن کی شاخیں اور کتب خانے | گزشتہ سال ان کی تعداد ۳۷ تھی اس سال ۲۹ نئے کتب خانے قایم ہوئے، رپورٹ کے ضمیمہ نمبر۵ میں ان کی فہرست معہ مختصر کیفیت درج ہے۔ اس وقت کل تعداد ۶۶ ہے۔

ارکان انجمن | ۱ دائمی۔ گزشتہ سال ان کی تعداد ۳۴ تھی اس سال ۱۸ رکنوں کا اضافہ ہوا اور مجموعی تعداد ۵۲ ہے۔

۲ اعانت۔ گزشتہ سال تعداد ۳۳۴ تھی اس سال ۲۸۵ ہے، لیکن چوں کہ اس سال ۱۵ اردسمبر کو حساب بند کردیا گیا ہے اس لئے آخر دسمبر تک کے نام اس تعداد میں شامل نہیں کئے گئے اور کمی تعداد کا بڑا سبب یہی ہے۔

فروخت مطبوعات | گزشتہ سال [illegible] سکہ انگریزی اور [illegible] عالی کی کتابیں فروخت ہوئیں، اس سال [illegible] سکہ انگریزی اور [illegible] عالی کی فروخت ہوئیں۔

شکریہ | حضرات ذیل نے انجمن کے مقاصد کی اشاعت میں علمی فیاضی اور ہمدردی سے کام فرمایا اور وہ ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں:۔

۱۔ جناب سید راس مسعود صاحب بی۔ اے (آکسن)، ناظم تعلیمات حیدرآباد دکن۔

۲ - جناب مولوی وحیدالدین صاحب، اوّل تعلقدار، بیڑ حیدرآباد دکن

۳ - جناب مولوی عبدالقادر خاں صاحب تحصیلدار ہنگولی ایضاً

۴ - جناب مولوی مبارزالدین صاحب (حقانی نواب) دوم تعلقدار ہنگولی حیدرآباد دکن

۵ - جناب مولوی سید محمد مہدی صاحب مددگار ناظم انجمن ہائے اتحادی ایضاً

۶ - جناب موی سید ہاشم علی صاحب، ناظم عدالت ضلع عثمان آباد (ریاست حیدرآباد)

۷ - جناب حکیم محمد یوسف صاحب بیڑ ایضاً

۸ - جناب مولوی سجّاد علی صاحب تحصیلدار اجنٹہ ایضاً

۹ - جناب مولوی سید محبوب علی صاحب، مہتمم کروڑگری، جالنہ ضلع اورنگ آباد

۱۰ - جناب مولوی محمد مقتدیٰ خاں صاحب شروانی منیجر انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ

۱۱ - جناب مولوی سید نورالحسنین صاحب، ناظم عدالت ضلع بیڑ

فہرست کتب

(سلسلۂ انجمن ترقی اردو)

البیرونی

کمالات ذہنی میں ابوریحان بیرونی کا مرتبہ تعریف سے مستغنی ہے دسویں صدی کا فاضل ہے مگر تبحر علمی اور دقیق النظری میں بیسویں صدی کا محقق معلوم ہوتا ہے ہندوستان آیا اور ہندوستان کے فلسفہ تاریخ اور مذہب و معاشرت پر ایک بے مثل کتاب لکھی البیرونی اس کے حالات زندگی اور کمالات علمی پر مشتمل ہے۔ قیمت مجلد ... ... عہ

فلسفہ اجتماع

تالیف ہے اور اس کا موضوع نفس اجتماعی یعنی جماعت کے اعمال و قوائے دماغی کی تحلیل و تشریح ہے موجودہ انقلابات میں اس کا مطالعہ دلچسپی اور فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ اس پر انگلستان و ہند کے علما و اخبارات نے اچھے اچھے ریویو لکھے ہیں۔

قیمت ... ... ایک روپیہ

قاعدہ و کلید قاعدہ

مدت کے غور و خوض کے بعد اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہے۔ ڈائرکٹر تعلیمات بمبئی نے اپنے صوبہ کے گورنر سے تحریک کی ہے کہ اس قاعدہ کو نصاب میں داخل کیا جائے جن اصول اور طریقہ پر اس کی تعلیم ہونی چاہیئے۔ ان کی تشریح کے لئے ایک کلید بھی تیار کی ہے۔ قاعدہ ۲ر کلید قاعدہ ۴ر

دریائے لطافت

ہندوستان کے مشہور سخن سنج میر انشاء اللہ خاں کی تصنیف ہے اردو صرف و نحو اور محاورات و الفاظ کی پہلی کتاب ہے اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب و غریب نکات درج ہیں

قیمت ... ... ایک روپیہ چار آنے

طبقات الارض

اس فن کی پہلی کتاب ہے۔ تین سو صفحوں میں تقریباً

جملہ مسائل فلسفہ ہیں انگریزی اور اردو داں دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور اُن کے مرادفات کی فہرست بھی منسلک ہے۔ قیمت ۸ عہ

مشاہیر یونان و روما

پلوٹارک لائوز کا ترجمہ ہے سیرت نگاری در انشا پردازی میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس سے آج تک مسلم الثبوت چلا آتا ہے ادیبانِ عالم بلکہ شکسپیر تک نے اس چشمہ سے فیض حاصل کیا ہے وطن پرستی و بے نفسی، عزم و جوانمردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ لبریز ہے ہماری قوم کے ہر نوجوان کے ہاتھ میں اس کا ایک نسخہ ضرور ہونا چاہیئے۔ دنیا کی تمام مہذب زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ جلد اول غیر مجلد ۸ عہ جلد دوم مجلد عہ ۸

اسباق نحو

دو حصے ملک کے ادیب کامل مولانا مولوی حمید الدین صاحب بی اے کی تالیف ہیں۔ اختصار کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک ضروری مسئلہ درج ہے عربی خواں طلبہ کے لئے نادر تحفے ہیں قیمت فی رسالہ ۴ ر

علم المعیشت

اسرار تمدن کے سمجھنے کے لئے اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمد الیاس برنی صاحب ایم اے نے ملک پر بڑا احسان کیا ہے۔ حجم (۵۲۰) صفحے قیمت صرف چار روپئے للعہ

تاریخ اخلاق یورپ

اصل مصنف لیکی کا نام علم و تبحر تحقیق و صداقت کا مرادف ہے یہ کتاب کئی ہزار برس کے تمدن و معاشرت اصول اخلاق مذہب و خیالات کا مرقع ہے۔ ترجمہ مولوی عبد الماجد صاحب بی اے حصہ اول مجلد ... حصہ دوم مجلد ...

مبادی سائنس

فرانسیسی سے انگریزی اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی گئی ہے اس کا بیان سلیس اور مقبول عام ہے اردو ترجمہ صرف ایک حصہ کا ہے اور آخر کتاب میں فرہنگ اصطلاحات بھی ہے قیمت .. .. عا ر

تاریخ یونان قدیم

یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند کتابوں کا خلاصہ ہے اور زبان کے لحاظ سے سلاست و شگفتگی کا نمونہ، اس کا نقطہ خیال خالصاً ہندی ہے۔ ایف اے کلاس کے طلباء جو یونان قدیم کی تاریخ سے گھبراتے ہیں اس کتاب کو انتہا درجے مفید پائیں گے۔ مجلد قیمت .. .. .. عا ر

انتخاب کلام میر

میر تقی سرتاج شعرائے اردو کے کلام کا انتخاب ہے مولوی عبد الحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو نے یہ انتخاب

ایک مدت کی سعی و محنت کے بعد کیا ہے اور شروع میں میر صاحب
کی خصوصیات شاعری پر ۲۴۰ صفحے کا ایک مقدمہ
بھی ہے۔ قیمت ۸عہ

رسالہ نباتات

اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے علمی اصطلاحات سے معرا۔ سلاست
روانی سے مملو اور دلچسپ و مفید ہے۔ طلبار نباتات جس مسئلہ کو
انگریزی میں نہ سمجھ سکیں وہ اسی رسالہ میں مطالعہ کریں۔
قیمت مجلد ۸عہ

دیباچہ صحت

اس کتاب میں مطالبات صحت مثلاً ہوا، پانی، غذا، لباس
وغیرہ پر مبسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ہے زبان عام فہم
اور پیرایہ موثر و دل پذیر ہے۔ ملک کی بہترین تصنیف ہے
اس کا مطالعہ طبیبوں کے کئی ہزار نسخوں سے زیادہ قیمتی
ثابت ہوگا۔ حجم (۵۵۰) صفحے مجلد قیمت .. .. للعہ

قواعد اردو

ارباب فن کا اتفاق ہے کہ اردو زبان میں اس سے بہتر قواعد نہیں لکھی گئی
بسیط و شرح کے علاوہ اس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ فارسی
قواعد کا تتبع نہیں کیا گیا ہے اس کو ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم
بمبئی نے نصاب میں داخل کرنے کی تجویز کی ہے قیمت عار

القول الاظہر

ابن مسکویہ کی معرکۃ الآرا تصنیف الفوز الاصغر کا اردو ترجمہ ہے
ابن مسکویہ آسمان علم و فضل کا آفتاب تھا یہ کتاب فلسفہ انھیں
کے اصول پر لکھی گئی ہے اور مذہب اسلام پر انھیں اصول کو
منطبق کیا گیا ہے اس کو بمبئی یونیورسٹی نے سرکاری کتب خانوں
کے لئے تجویز کیا ہے۔ قیمت .. .. عہر

امرائے ہنود

پانسو سے زیادہ ہندو امرا کے حالات قلمبند ہیں۔ یہ امرا سلاطین
مغلیہ کے زمانے میں بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز تھے
کتاب گویا ان متعصب اور ناواقف مورخوں کا جواب ہے جو
اسلامی حکومت پر تعصب کا الزام لگاتے ہیں۔
قیمت حصہ اول عار حصہ دوم ۸عہ

القمر

قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی تصریحات اور چاند کے متعلق تحقیقی جدید انکشافات
ہوئے ہیں ان سب کو جمع کر دیا ہے طرز بیان دلچسپ اور
کتاب ایک نعمت ہے قیمت ۸عہ

تاریخ تمدن

سرٹامس بکل کی شہرہ آفاق کتاب کا ترجمہ ہے الف سے ے
تک تمدن کے ہر مسئلہ پر کامل جامعیت سے بحث کی گئی ہے

ہر بحث کے لئے ایک عجیب گمپ پرزور اصول اختیار کیا گیا ہی اور ہر اصول کی تائید میں تاریخی انتقاد سے کام لیا گیا ہی اس کے مطالعہ سے معلومات میں انقلاب اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہی، بمبئی میں سرکاری لائبریریوں کے لئے تجویز کی گئی ہی۔ قیمت حصہ اول غیر مجلد عہ حصہ دوم مجلد عا

مقدمات الطبیعات

یہ ترجمہ ہی مگر انگلستان کے مشہور سائنس دان حکیم ہکسلی کی کتاب کا ترجمہ ہی جسکا نام کتاب کی کافی ضمانت ہی۔ اس میں مظاہر فطرت کی بحث درج ہی لیکن کتاب علم و فضل کا مرقع ہی متعلمان سائنس اور عام شائقین کے لئے بہت مفید ہی قیمت ۸ عہ

فلسفۂ جذبات

کتاب کا مصنف ہندوستان کا مشہور نفسی ہی۔ جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت لیاقت اور زبان آوری کے ساتھ بحث کی گئی ہی متعلمان نفسیات اسے نہایت مفید پائیں گے قیمت مجلد ...... ۸ عا

نکات الشعرا

یہ اردو شعرا کا تذکرہ میر تقی میر کی تالیفات سے ہی اس میں میر صاحب کی رائے اہل زبان کے بعض بعض نکات پڑھنے کے قابل ہیں مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے اس پر ایک ناقدانہ اور دلچسپ مقدمہ لکھا ہی قیمت مے

نپولین اعظم

ایبٹ کی مستند کتاب کا اردو ترجمہ ہی کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ نپولین کی زندگی بشری جد و جہد کا آخری باب ہی، واقعات کی داد یا تو سکندر کی زبان ادا کر سکتی ہی یا تیمور کی زبان، ترجمہ آسان اور عام فہم ہی مکمل پانچ جلد قیمت ... عے

فلسفۂ تعلیم

ہربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلہ تعلیم کی آخری کتاب ہی۔ غور و فکر کا بہترین کارنامہ اور والدین و معلم کے لئے چراغ ہدایت ہی تربیت کے زبانی قوانین کو اس قدر صحت کے ساتھ مرتب کیا ہی کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہی اس کا نہ پڑھنا گناہ ہی۔
قیمت ...... مے

رہنمایان ہند

مشہور کتاب ہیروز آف انڈیا کا ترجمہ ہی شروع میں ہندو مذہب کے برگزیدہ عقائد کا بیان فاضلانہ مگر دلکش پیرایہ میں لکھا ہی اس کے بعد سری کرشن جی مہاراج کی سوانح اور گوتم بدھ کے پراثر حالات آتے ہیں آخری حصہ میں شنکر اچاریہ رامانج اور رامانند کا ذکر ہی قیمت ۸ عہ

آنریری سکریٹری، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد (دکن)

اُردو

۱۔ انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوا کریگا۔

۲۔ یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی حجم کم سے کم ۱۵۰ اور زیادہ سے ۲۰۰ صفحہ ہوگا۔

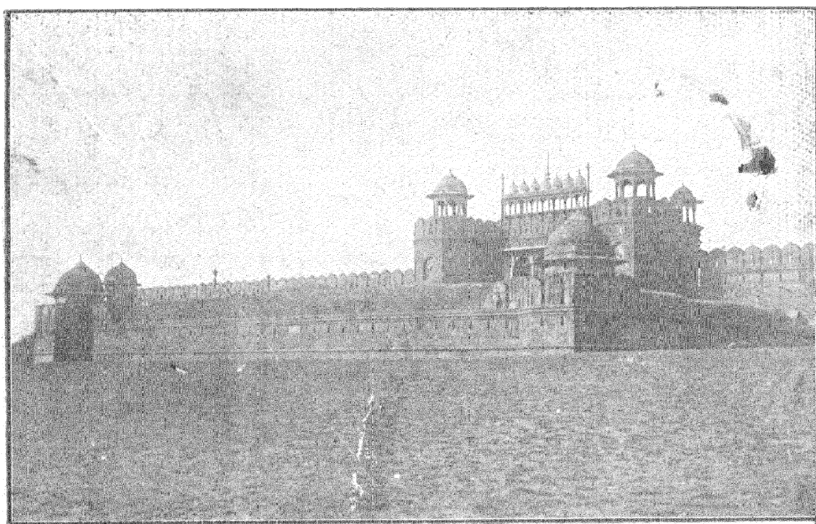
۳۔ قیمت سے ۱۲ر سالانہ مع محصول ڈاک اور ارکان انجمن ترقی اُردو سے ۸ر۔

۴۔ تمام خط و کتابت:۔ آنریری سکرٹری انجمن ترقی اُردو و اڈیٹر اُردو اورنگ آباد، دکن سے ہونی چاہیئے۔

(باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں چھپا اور وہیں سے شایع ہوا)

جلد اوّل　　بابت جولائی سنہ ۱۹۲۱ء　　حصّہ سوم

اردو



انجمنِ ترقی اردو

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرستِ مضامین

اُردو زبان کی ترقی کے متعلق چند خیالات[1]

از

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم

یہ امر ہمیشہ سے تسلیم کیا جا رہا ہے کہ دنیا میں زبان ہی وہ چیز ہے کہ جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے۔ علمائے قدیم انسان کو حیوانِ ناطق سے تعبیر کرتے تھے اب منطقِ جدید نے اُسے حیوانِ عاقل خطاب دیا ہے۔ لیکن ذرا غور سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں تعریفوں میں صرف خفیف لفظی اور ظاہری فرق ہے۔ یہ کچھ نہیں کیونکہ عقل کے

---

[1] انجمن ترقی اُردو کا ایک غیر معمولی سالانہ جلسہ ۱۹۱۶ء کے آخری ہفتے میں لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے میری درخواست پر جلسہ میں پڑھنے کے لئے یہ مضمون بھیجا تھا۔ لیکن ڈاک خانہ کی غلطی سے وقت پر نہ پہونچا اور اب تک یوں ہی پڑا رہا مرحوم نے مضمون کے آخر میں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اعلیٰ پیمانہ پر انجمن ترقی اُردو کی جانب سے ایک رسالہ جاری کیا جائے۔ افسوس کہ یہ رسالہ اُس وقت شایع ہوا جب کہ وہ عزیز اس دارِ ناپائدار سے رخصت ہو چکے تھے۔ (ان کی بے وقت موت کا صدمہ ہمیشہ رہیگا) ورنہ ان کی ادیبانہ قابلیت، اُن کے علم و فضل اور تنقیدی نظر سے اس رسالہ کو بے انتہا مدد ملتی! اُردو کے حامیوں اور بہی خواہوں سے اُمید ہے کہ وہ اس مضمون کو بغور پڑھینگے اور اُن مسائل پر جن پر اس میں بحث کی گئی ہے اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے۔ (اڈیٹر)

اظہار کا ذریعہ منطق ہی ہے اور نطقِ انسانی کا شرف پیرایۂ عقل ہے۔ اس لیئے حقیقت میں صفات انسانی میں نطق اور عقل ایک دوسرے کے لیئے لازم اور ایک دوسرے کی متمم ہیں۔

اقوامِ انسانی کی تفریق اور تقسیم بھی زیادہ تر اختلاف السنہ ہی پر مبنی ہے اور قوموں کے باہمی اتحاد میں ہمزبانی کا تعلق بھی نہایت قوی اور مضبوط رشتہ ہے۔ وہ لوگ جو ایک ہی بولی بولتے ہیں خواہ دنیا کے کتنے ہی دور دراز حصوں اور کیسے ہی مختلف حالات میں کیوں نہ رہتے ہوں پھر بھی ایک ہی قوم کے متفرق ٹکڑے ہیں اور بُعدِ مکان ان کو اُس وقت تک ایک دوسرے سے جدا نہیں کرسکتا جب تک کہ اختلافِ زبان کا پردہ سدِ سکندری بن کر اُن میں حائل نہ ہوجائے۔ دیکھئے جب اسلام کی جہانگیری نے بادیہ نشینانِ عرب کی زبان کو اندلس سے لے کر چین تک ملک الکلام بنادیا اور سمرقند اور بخارا سے قرطبہ اور غرناطہ تک علمی دنیا ہمزبانی کے رشتۂ انتظام میں منسلک ہوگئی تو اس تعلق نے عجم و عرب کا تفرقہ مٹا کر ترکوں اور ایرانیوں۔ قبطیوں اور بربریوں کو ایک قوم بنا دیا۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جو دولت اسلام سے بہرہ اندوز نہ ہوئے تھے وہ بھی اپنی عقل اور نطق کی بدولت بنی اعمام رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہمنشین بن گئے۔ وہ لوگ جو انگلستان سے نکل کر اقصائے عالم میں پھیل گئے ہیں اُن کو اگرچہ ترکِ وطن کیئے صدیاں گزر گئیں اور تغیر حالات نے ان میں ہر طرح کی تبدیلیاں کردیں تاہم اتحادِ زبان نے ابھی تک ان کی قومیت کا شیرازہ بکھرنے نہیں دیا اور اُن کی ہمدردیاں اب تک باہم متحد اور مشترک ہیں علم الاصول میں ملت کا لفظ استعمال ہی اس گروہ یا جماعت کے لیئے کیا جاتا ہے جس کی زبان اور ملکی اور مذہبی تاریخ ایک ہو گویا اس علم کے مطابق جب تک ہمزبانی کا علاقہ نہ ہو تب تک لوگوں میں خواہ اور کیسے ہی قریبی تعلقات کیوں نہ ہوں پھر بھی وہ ایک قوم یا ایک ملت کے افراد کہلانے کے مستحق نہیں ہوسکتے۔ زبان ہی وہ معیار ہے جس سے یگانگوں اور بیگانگوں میں امتیاز ہوتا ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر سیاست کا اساس قایم ہے۔ پان اسلامزم کا نصب العین اور گریان رایش کا خواب اشتراکِ زبان ہی کا نتیجہ ہے۔ اور ہندوستان میں باوجود اتحادِ ملک و حکومت قومیت کا وجود نہ ہونے کی اصل وجہ اختلافِ السنہ ہی ہے۔ یہی سبب ہے کہ جو لوگ اپنے ابنارِ نوع میں قومیت کی روح پھونکنا چاہتے ہیں وہ سب سے پہلے ان میں یک زبانی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی سب سے زیادہ عجیب مثال یہ ہے کہ ایک مشہور یہودی مصلح قوم نے بنی اسرائیل کی حکومت دوبارہ قایم کرنے کے لیئے اقصائے فرنگ میں ایک

جزیرہ خرید لیا ہی اور اُسے گویا ایک عظیم الشان گروکل بنا دیا ہی۔ یہاں پر مُلک کی بہبودی۔ بچّوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام ہی جو اپنے والدین کی آغوشِ شفقت سے جدا ہو کر تکمیلِ تعلیم تک اسی جزیرہ میں رہتے ہیں اور پھر یہاں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہی کہ اس کی تمام تعلیم عبرانی میں ہوتی ہی اور عبرانی کے سوا اور کسی زبان سے بچّوں کے گوش لب آشنا نہیں ہوتے۔

انتہا تو یہ ہی کہ مذہب بھی زبان کے اثر سے محفوظ نہیں ہی۔ کسی نے خوب کہا ہی ؎

ذاتِ پاکِ تو دریں مُلکِ عرب کردہ ظہور ۔۔۔ زاں سبب آمدہ قرآں بہ زبانِ عربی

خود کلامِ پاک کا ارشاد ہی۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِہٖ لِیُبَیِّنَ لَھُمْ (سورۂ ابراہیم ع ۱)

جس طرح نطق انسان کا خاصہ ہی ویسے ہی زبان قوم کا نشان اور سلطنت اور مذہب کی روح رواں ہی۔ اور جس طرح ایک جان دوسرا قالب اختیار نہیں کر سکتی اسی طرح کوئی قوم بھی اپنی زبان نہیں بدل سکتی۔ چنانچہ بہت سی قوموں نے جو بزورِ شمشیر یا بزورِ قلم دوسری قوموں سے مغلوب ہو گئیں غالب قوم کی زبان اختیار کرنے کی کوشش کی ہی۔ لیکن یہ سعی ہمیشہ لاطائل اور بے حاصل رہتی ہی۔ جب روما نے میدانِ تیغ میں یونان پر فتح پائی اور میدانِ علم میں یونان سے شکست کھائی تو یونان کی علمیت کے رعب و اثر میں آکر روما کے بہت سے علمی حلقوں نے مادری زبان کو ترک کر کے یونانی زبان میں جدّ و جہد شروع کی۔ اس عبث کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ روما کی تہذیب میں انحطاط شروع ہو گیا اور علوم و فنون میں بجائے ترقی کے تنزل کے آثار نمایاں ہو گئے۔ یہ روما کی خوش قسمتی تھی کہ اہلِ روما وقت پر اس شدید غلطی سے آگاہ ہو گئے ورنہ ممکن نہ تھا کہ ان کی ہستی بربادی سے محفوظ رہ سکتی۔ انگلستان میں ملٹن اور شیکسپیر کے زمانہ میں لاطینی زبان میں شعر گوئی مستحقِ داد سمجھی جاتی تھی اور مادری زبان کے عمدہ سے عمدہ کلام کی کوئی قیمت نہ تھی۔ آج ہم دریافت کرتے ہیں کہ وہ لاطینی شاعری کہاں ہی۔ عجائب خانوں کی مقفل الماریوں کے سوا ان دیوانوں کا کہیں نام و نشان تک نہیں۔ ان بے معنی دفاترِ اشعار کی نسبت لاطینی السنہ اہلِ زبان کی رائے ہی کہ یہ فضول مجموعہ طلبا کی مشق سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ لیکن وہ "فردوسِ گم شدہ" (پیراڈائز لاسٹ) جس کا حقِ تصنیف ملٹن کو بہ دقت دو تین پونڈ ملا تھا۔ اور وہ "کلیاتِ شیکسپیر" جس کو ایک غیر مُلک کے باشندوں نے اوّل مرتبہ قدر کی نگاہ سے دیکھا اور رائج کیا ہی دونوں کتابیں آج انگریزی علم ادب

کی جان ہیں اور انھیں پر انگریزی ملت کی ہستی مبنی اور موقوف ہے۔

پرانے زمانہ کی یہ بھولی بسری داستانیں ہم نے صرف اس لیئے دُہرائی ہیں کہ آج ہماری قوم کی بھی وہی افسوسناک حالت ہے جو ایک زمانہ میں روما اور انگلستان کی تھی اور جس کا تذکرہ ہم نے اوپر کیا ہے۔ آج کل ہمارا ملک یورپ کی طفلانہ تقلید میں مبتلا ہے۔ بلکہ فی الواقع رومانیوں کا اور انگلستان روما کا اس درجہ غلامانہ مقلد نہ تھا جس قدر ہم یورپ کے کورانہ کفش بردار بنے ہوئے ہیں ان دونوں ملکوں میں علمی تقلید کا اثر سیاسی آزادی اور قومی برتری نے ایک حد تک باطل کر دیا تھا اور اگر قلم تعلیم دشمن کے ہاتھ میں تھا تو تیغ حکومت خود اہلِ ملک کے قبضہ میں تھی۔ یہاں چونکہ اس قسم کی بھی کوئی تلافی نہیں ہے اس لیئے اگر ہم اپنی زبان کی طرف سے اس غفلت میں پڑے رہے تو اس کا انجام ہماری یقینی قومی اور ملی موت ہے کیسی سخت غلطی ہے کہ وہ تمام کوششیں جو ہم کو اپنی مادری زبانِ اُردو کی نشو و نما۔ ترقی اور تہذیب میں کرجانی چاہئیں ایک مغربی زبان کی بے نتیجہ تحصیل میں صرف ہو رہی ہیں کیا یہ بات کچھ قرین قیاس ہے کہ مشرقی آب و ہوا میں مغربی زبان کا درخت بارآور ہوسکتا ہے۔ زبان فاتح کی تلوار کی آواز کا نام نہیں ہے۔ فاتح اپنا خطبہ اور سکہ جاری کرسکتا ہے۔ لیکن اپنی زبان جاری نہیں کرسکتا۔ مفتوح فاتح کا مذہب اختیار کرسکتا ہے لیکن اُس کی زبان اختیار نہیں کرسکتا۔ زبان ملک و ملت کی حرکت کی صدا ہے۔ اور غیر زبان کو رواج دینے کی کوشش خواہ وہ اہل حکومت کی جانب سے ہو ایک فعلِ عبث ہے۔

انگریزی کے سراب کے تعاقب میں آنکھیں بند کرکے دوڑنا قوم کی دائمی تشنہ کامی اور شور بختی کا موجب ہوگا اور جب تک سرکردگانِ ملک اِس غلط راہ کو جلد سے جلد خیرباد کہہ کر صرف اُردو کی حمایت۔ حفاظت اور اشاعت میں مصروف نہونگے اُن کی تمام رہنمائی غلط اور تمام کوشش ملک و ملت کے حق میں مُفید ہونے کی بجائے مضر بلکہ مہلک ثابت ہوگی۔ زبان سے غفلت کا الزام تمام ملک اور قوم کے سر پر ہے۔ کوئی طبقہ ایسا نہیں ہے جس کو اس بارہ میں مستثنیٰ سمجھا جائے۔

اُردو کا سب سے پہلا اور بڑا دشمن ہندو مسلمانوں کا باہمی نفاق ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ ہندوستان کی مادری زبان ہندی ہے۔ مسلمان کہتے ہیں کہ اُردو ہے۔ محض الفاظ نے دونوں کو کیا مغالطہ دیا ہے۔ اگر دونوں برادرانِ وطن تعصب کی عینکیں اُتار ڈالیں تو حقیقتِ حال روشن ہو جائے کہ اُردو ہندی سے اور ہندی اُردو سے الگ

کوئی زبان نہیں بلکہ اردو ہندی کا اور ہندی اردو ہی کا نام ہے۔ جب اردو کو سنسکرت خط میں لکھتے ہیں تو اس کو ہندی کہتے ہیں۔ جب ہندی کو عربی خط میں لکھتے ہیں تو وہی اردو بن جاتی ہے۔

یہ امر نہایت افسوس ناک ہے کہ مسلمان اردو میں ہندی الفاظ کی تعداد کو کم اور عربی اور مشکل فارسی الفاظ کی تعداد کو زیادہ کرتے جاتے ہیں اور ہندو ہندی سے سہل اور رائج عربی اور فارسی الفاظ کو خارج اور غیر مانوس اور ادق سنسکرت الفاظ کو ان کی جگہ داخل کرتے جاتے ہیں۔ اگر یہ افراط و تفریط یوں ہی جاری رہی تو اردو اور ہندی سچ مچ دو جدا اور مختلف زبانیں بن جائینگی۔ ہندو اور مسلمانوں کو اس غلطی سے متنبہ ہونا واجب ہے۔ کیونکہ دونوں کی یہ نادان دوستی زبان اور ملک دونوں کے حق میں عین دشمنی ہے۔

جیسا کہ میں نے یہاں کہا ہے زبان خیالات کا بیرونی پردہ ہے۔ اس قسم کا اختلاف دلوں کے اختلاف کی دلیل ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ مسلمان شعرا بسنت اور ہولی کے قصائد لکھتے تھے۔ کنہیا جی کی مداحی میں نظیر اکبرآبادی کا درجہ سورداس جی سے کم نہیں۔ ہندو شعرا اپنا کلام ہمیشہ حمد الٰہی کے بعد جناب رسالتمآب صلعم کی نعت اور جناب امیر کی منقبت سے شروع کرتے تھے۔ کیا کوئی بھول کر بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ مسلمان شعرا مسلمان نہ تھے یا یہ ہندو شعرا ہندو نہ تھے۔ سچے مذہب کو کبھی بلند نظری اور رواداری سے نقصان نہیں پہونچتا بلکہ کوتہ بینی اور تنگ خیالی ہی اس کی اصلی دشمن ہے۔

دیکھئے۔ براعظم یوروپ میں کس قدر مختلف النسل اقوام آباد ہیں اس اختلاف کے باوجود جن اسباب نے مغربی تہذیب کی بنیاد ڈالی ہے ان میں اہم ترین عیسوی مذہب۔ یونانی علوم اور لاطینی زبان کا عام رواج ہیں اطالوی فرانسیسی، رومانی اقوام کے علاوہ جو لاطینی النسل ہیں نہ صرف اینگلو سیکسن اور ٹیوٹن بلکہ سلیو اور مجار (ہنگرین) اقوام تک لاطینی زبان ضرور سیکھتی ہیں۔ جو حالت لاطینی کی یوروپ میں ہے قریب قریب وہی فارسی کی ہندستان میں تھی۔ فارسی مختلف اقوام میں رشتۂ اخوت تھی۔ نہ صرف ممالک شمالی اور مغربی میں بلکہ اقصائے ملک میں سب اقوام فارسی کی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ لیکن اب ہندو فارسی کو رفتہ رفتہ ترک کر رہے ہیں۔ مہارشی دیوندرناتھ ٹیگور اور راجہ رام موہن رائے فارسی کے ادیب تھے۔ لیکن سر رویندر ناتھ ٹیگور افسوس کہ فارسی سے نابلد ہیں۔ ایسی امثال زمانہ کی ہوا کا رخ بتاتی ہیں۔

ہر زبان پر تشبیہات کا بھی نہایت گہرا اثر پڑتا ہے۔ جو زبان جس ملک کی تشبیہات کام میں لاتی ہے اسی ملک کے حالات سے مناسب اور متعلق ہو جاتی ہے۔ اُردو کے شعرا اس باب میں نہایت قابلِ الزام ہیں۔ ہندوستان کے شاعر ایران کی تشبیہات کی پابندی کرتے ہیں اور "شنیدہ" کو "دیدہ" پر ترجیح دیتے ہیں۔ جن مناظر و واقعات اور معاملات سے وہ تشبیہیں پیش کرتے ہیں اُن کو ہمارے مرز بوم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ اصل میں مغلوں کی قصیدہ گوئی کا اثر ہے۔ چنانچہ جو شعرا کہ درباروں کے بُرے اثرات سے دُور رہے ہیں اُن کی شاعری از سرتا پا ملکی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ کبیر، کمال اور ملک محمد جائسی کی زبان تمام غیر ملکی اثرات سے آزاد ہے۔ دکن میں بھی جہاں ترکی فارسی کو رواج نہ تھا بیرونی تشبیہات کم پھیلی ہیں۔ یہ دکنی ادب اس کا بہترین ثبوت ہے۔ شاہ ولی گو دہلی کے مقلد ہیں لیکن پھر بھی ملکی رنگ رکھتے ہیں۔ کیا خوب شعر ہے ؎

پکڑا ہے تری لٹ نے مجھ دل کے کبوتر کو
یہ کام دھرم کا ہے ٹک اس کو چھڑاتی جا

جس طرح ہر بات کا پہلے ایک دور ہوتا ہے اور پھر دوسرا دور شروع ہوتا ہے اُردو شاعری کو بھی فارسی کے اس اثر کے دور سے نکل کر ایک نئے دور میں قدم رکھنا چاہیئے۔ اُردو شاعروں کو استعارات کی تلاش میں فارسی کے دواوین کی بجائے اپنے گرد و پیش کے مناظر قدرت اور مظاہر حیات سے مستفید ہونا چاہیئے۔ اس سے نہ صرف شاعری میں ایک تازہ روح پیدا ہو جاویگی بلکہ اُس ادبی فروگزاشت کی تلافی ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد اور اتفاق کا ایک ذریعہ ثابت ہوگی۔

مجموعۂ شاعری کو زبان کی ٹکسال کہا جاتا ہے۔ جو الفاظ اشعار میں مستعمل ہوں اُن سے سند لی جاتی ہے اور جو متروک ہوں وہ ٹکسال باہر خیال کیئے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک نہایت دلچسپ بات قابل غور ہے شاعری بحروں کی پابند ہے۔ بحریں اوزان پر مبنی ہیں اور اوزان کی بنیاد موسیقی پر قایم ہے۔ ہر ملک کی موسیقی اور بحریں جدا ہیں عربی بحریں جدا ہیں۔ فارسی جدا، اُردو جدا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض عربی بحروں میں فارسی شعر نہیں کہا جا سکتا اور بہت سی فارسی بحروں میں عربی شعر موزوں نہیں ہو سکتا۔ اُردو شاعری نے اپنی بحریں فارسی سے مستعار لی ہیں۔ اس وجہ سے اُردو اشعار میں فارسی الفاظ آسانی سے موزوں ہو جاتے ہیں اور ہندی الفاظ اکثر آسانی

سے موزوں نہیں ہوتے۔ اس کا نتیجہ رفتہ رفتہ یہ ہوا ہے کہ شدہ شدہ فارسی الفاظ اشعار کے ذریعہ سے روز بروز زبان زدِ عام ہوتے گئے ہیں اور ہندی الفاظ اشعار میں راہ نہ پانے کی وجہ سے ٹکسال باہر ہو گئے ہیں۔ اُردو زبان کا گو فارسی سے بہت قریبی تعلق ہے لیکن بھاشا سے اس کا رشتہ اس سے بھی زیادہ قریبی ہے۔ اس لیئے جہاں اُردو اشعار فارسی بحروں میں موزوں ہو سکتے ہیں ہندی بحروں میں بھی ہو سکتے ہیں اور ہونے چاہئیں۔ صرف رسم و رواج نے ہندی بحروں کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ چنانچہ نظیر اکبر آبادی نے بدرجۂ کمال اس کا ثبوت دیا ہے۔ دولتِ عثمانیہ میں ترکی شاعری بھی اُردو شاعری کی طرح نامق کمال بے کے زمانہ تک فارسی بحروں کے حصار میں گرفتار تھی لیکن اب ترک رفتہ رفتہ فارسی موسیقی کو شاعری میں ترک کرتے جاتے ہیں اور چغتائی بحروں کو جن کو "پرحق حامی" نے عروض پر قایم کیا ہے رواج دے رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی ضرورت ہے کہ کوئی نامور شاعر محمد امین بے کی طرح اُردو زبان کو اس بے جا تقلید اور نازیبا قیود سے آزاد کرے۔ اس کا نتیجہ جلاوت کلام اور وسعتِ زبان کے علاوہ یہ بھی ہوگا کہ زبانِ اُردو خود بخود سلیس اور آسان ہو جاویگی اور ہندی اور فارسی سے اس کا تعلق باہم متناسب اور موزوں ہو جائیگا۔

ہندو مسلمانوں کے نفاق کے علاوہ ایک اور نہایت اہم مانعِ اُردو کی ترقی میں مدارس اور مدرسین کی عدم توجہی ہے۔ ہندوستان تعلیم گاہیں عموماً دو قسم کی ہیں۔ اوّل قدیم۔ دویم جدید۔ اگر قدیم درسگاہوں کی حالت پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کو عربی کے مقابلہ میں غیر ضروری اور کم وقعت جان کر اُردو کی جانب خیال نہیں کیا جاتا۔ اگر جدید درسگاہوں کی کیفیت کا معائنہ کریں تو ثابت ہوتا ہے کہ اُردو کو انگریزی کے مقابلہ میں بیکار اور غیر مفید سمجھ کر اسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ قدیم معلمین نے جہاں اُردو کو اور طریقوں سے نقصان پہنچایا ہے وہیں ایک یہ بھی بات ہے کہ وہ عربی عبارت کو ہمیشہ خلاف محاورہ اُردو میں ترجمہ کرتے ہیں۔ دیوبند اور ندوۃ العلما اور تمام عربی فارسی مدارس اور مدرسین پر یہ کتنا بڑا الزام ہے کہ آج تک تفاسیر۔ حدیث۔ فقہ۔ اُصولِ فقہ۔ منطق۔ عام فہم فلسفہ اور ادب کی ضروری سے ضروری کتابیں بھی اُردو میں ترجمہ نہیں ہوئیں۔ طبیب ہندوستان میں آج تک فارسی میں نسخہ لکھتے ہیں۔ دولتِ عثمانیہ میں بھی یہی طریقہ رائج تھا۔ اب سلطانی حکم سے وہاں نسخہ جات ترکی زبان میں تحریر ہونے لگے ہیں۔ جب تک دیوبند، ندوۃ العلما اور دیگر عربی اور

فارسی دارالعلوم ان تمام امور کا تدارک نہ کرینگے اُردو کو کیونکر فروغ ہو سکتا ہے اور جب تک علوم دینی اور مشرقی اُردو میں رواج نہ پائینگے ملک اور قوم میں کس طرح ہمارے مذہبی اور قومی علوم و فنون کی اشاعت ہو سکتی ہے۔

جدید تعلیم گاہوں کی حالت قدیم تعلیم گاہوں سے زیادہ خراب ہے تمام مدارس کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم غیر زبان میں ہوتی ہے۔ اُردو کی تعلیم پانچ سات ابتدائی جماعتوں کے بعد قطعاً بند ہو جاتی ہے۔ اِس کے علاوہ تمام علوم کی تعلیم کا ذریعہ انگریزی ہے۔ ریاضی۔ تواریخ۔ جغرافیہ۔ منطق۔ سائنس۔ فلسفہ ہر مضمون کی تعلیم انگریزی کے توسل سے ہوتی ہے۔ جو قوم یوں اپنی مادری زبان سے غافل ہو وہ دنیا میں کیا فروغ پا سکتی ہے۔ جس ملک کے لوگ اپنی مادری زبان کو یوں پس پشت ڈال دیں اس کی خاک سے بھلا کب کوئی فرزانہ اُٹھ سکتا ہے۔ جو ملت اپنی زبان کو باعث ننگ اور دوسروں کی زبان کو مایۂ ناز خیال کرتی ہے اس میں کیا خودداری آسکتی ہے۔

جب تک طلبا کو مادری زبان میں تعلیم نہ دی جائے تعلیم کسی طرح جزو حیات بن ہی نہیں سکتی۔ اور تاوقتیکہ اُردو کو ذریعۂ تدریس نہ بنایا جائے اگر ہمارے طلبا میں سے ہر ایک کے سر میں ہزار دماغ ہوں تب بھی بیکار ہیں۔ ہمارے موجودہ طلبا طوطے کی طرح محض آواز لگاتے ہیں اور صوت پرست ہیں۔ اور ان کا عدم اور وجود برابر ہے بلکہ ان کا وجود ان کے عدم سے بدتر ہے۔ اگر وہ تعلیم یافتہ نہ ہوتے تو شاید قوائے جسمانی سے تنازع للبقا میں اپنی ہستی کو قایم رکھنے کے زیادہ قابل ہوتے۔ اس ناممکن اور ناممکل تعلیم نے اُن کو اس قابل بھی نہیں رکھا۔

ہندوستان کے مسلمان جو فی زمانہ علمی جدوجہد کر رہے ہیں اس کا بہترین نتیجہ علی گڑھ ہے لیکن کارکنان مدرسۃ العلوم اُردو زبان کی خدمت سے جس قدر بے پرواہ ہیں شاید ہی کوئی اور طبقہ ہو۔ علی گڑھ کے ماہران تعلیم نے مجوزہ مسلم یونیورسٹی کے متعلق جو پروفیسروں کی طویل فہرست شایع کی ہے اس میں زبان اُردو کے پروفیسر کا ذکر تک بھی نہیں۔ وہ یونیورسٹی جس میں کم از کم دو پروفیسر ایک نثر اور ایک نظم اُردو کے موجود نہ ہوں کن معنوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کی یونیورسٹی کہلانے کی سزاوار ہے۔ مجوزین نصاب مسلم یونیورسٹی نے عربی اور سنسکرت۔ انگریزی اور یورپی فارسی اور ایرانی علم اللسان کی تعلیم کے اسباب کا مہیا کرنا تجویز کیا ہے لیکن اُردو اور ہندوستانی علم اللسان کو اس فہرست میں شامل نہیں کیا۔ اراکین علی گڑھ کو اپنے

اپنے اس عین فرض کا احساس لازم ہے۔ علی گڑھ میں بھی آکسفورڈ کے نثر و نظم کے پروفیسروں کی طرح اُردو نثر اور نظم کے پروفیسر ہونے چاہئیں اور اس فہرست کے لئے ملک کے مشہور ادیب اور شعرا کا ایک سالہ سہ سالہ پنج سالہ انتخاب ہونا چاہیئے اور اُن کے لکچروں کا مجموعہ کتاب کی صورت میں یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہونا چاہیے۔ عربی اور سمیطقی۔ انگریزی اور یورپی۔ فارسی اور ایرانی علم اللسان کی تحقیق اور تعلیم بہت سی یورپ کی یونیورسٹیوں میں ہوتی ہے لیکن اُردو اور ہندوستانی علم اللسان کی تعلیم اور تحقیق کا کہیں دنیا بھر میں انتظام نہیں۔ یہ وہ خاص کام ہے جس کو میں مسلم یونیورسٹی کے قیام کا اہم ترین منشا خیال کرتا ہوں۔ علم اللسان کی رُو سے اُردو دنیا بھر کی موجودہ زبانوں سے زیادہ اہم اور دلچسپ حیثیت رکھتی ہے اُردو کو مکمل حیثیت سے بھاشا اور سنسکرت سے تواریخی اور سیاسی حیثیت سے فارسی ترکی اور انگریزی سے اور مذہبی حیثیت سے عربی سے رابطہ ہے۔ زبان اُردو کی تواریخ ممالک ہندوستان۔ ایران۔ عرب۔ روم اور فرنگ کی زمانہ موجودہ اور گزشتہ کی تاریخ سے متعلق ہے۔ یہ علی گڑھ کا کام ہے کہ اِس عظیم الشان علم اللسان کی عمارت قایم کرے جس کی محض ابتدائی بنیاد کا ایک پتھر مولوی محمد حسین آزاد نے رکھا ہے اور زبانِ اُردو کو محفوظ اور مرتّب کرنے کے علاوہ دنیا کی معلومات میں اضافہ کرے جو یونیورسٹیوں کے قیام کا اصلی منشا ہے۔

تیسرا گروہ جو اُردو کی جانب سے غفلت کا قصوروار ہے وہ ہمارے نام نہاد جدید تعلیم یافتگان کا گروہ ہے۔ ہمارے ملک کے مصنف اور مؤلف انگریزی زبان میں تصنیف و تالیف کرتے ہیں۔ اُن کا وقت دن رات انگریزی اور مغربی علم ادب کے مطالعہ میں صرف ہوتا ہے۔ ان کے کتب خانوں میں عربی اور فارسی کتابوں کا وجود کمیاب بلکہ نایاب ہے۔ اُن میں سے بہت کم ایسے ہیں جو عربی علوم اور فارسی شاعری سے واقفیت رکھتے ہیں اور جن کو علوم مشرقیہ کی معلومات میں اضافہ کا شوق ہے۔ گفتگو میں وہ علوم فنون اور حکمت کی اصطلاحات پر تو کیا روزمرہ کے الفاظ تک پر قدرت نہیں رکھتے۔ اُن کی زبان اُردو و انگریزی الفاظ کا ایک عجب آمیزہ ہے۔ اُن کی تقریروں میں جس قدر ریطوریقا کا زور بڑھتا جاتا ہے انگریزی الفاظ کی تعداد میں اُس ہی نسبت سے اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اُن کے اُردو اور علوم مشرقیہ سے اجتناب کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ بزعم خود مشرقی علوم کو پارینہ اور کہنہ خیال کرتے ہیں۔ اُن کے خیال میں مغربی علوم ہی جو جدید ہیں تحصیل کے مستحق

ہیں اور جدید کو چھوڑ کر قدیم میں وقت صرف کرنا تضیع اوقات کرنا ہے۔ اُن کی مجالس میں اکثر اس انداز کی گفتگو ہوتی ہے۔
"یہ نئی تحقیقات اور جدید علوم کا دَور ہے پُرانے اور بے کار علوم میں وقت کھونے سے کیا فائدہ ہے ع
وہ رات ہو چکی وہ فسانے گذر گئے"

افسوس یہ حضرات یہ نہیں جانتے کہ جس مغرب کے آستانہ پر وہ شبانہ روز سجدہ کناں ہیں وہ مشرق ہی کا ادنےٰ شاگرد ہے۔ جو بات قدیم مصری کاہن سائیس نے یونانی مقنن سولن سے کہی تھی وہ نہایت سبق آموز اور ہمارے حسب حال ہے۔

"اے اہل یونان تم ہمارے سامنے بچے ہو۔ افلاطون جس پر تم کو ناز ہے ہمارے ہی مکتب کا فرزند ہے۔ تھیبس کے دبستان ہی میں تم سب نے تربیت پائی ہے تمہارا فیثاغورثی فلسفہ ہم ہی نے تم کو تعلیم کیا ہے۔ اور تم کو جو عقل و دانش سے عاری تھے ہم نے ہی غور و فکر کے جوہر سے مزین کیا ہے۔ تمہارا ایپکیورین فلسفۂ ابتہاج اور تمہارا اسٹوئک فلسفۂ غم ہمارا ہی عطا کردہ ہے۔ ہم ہی نے تم کو رونا اور ہنسنا سکھلایا ہے۔ الف سے لے کر یے تک جو کچھ تمہارا سرمایۂ ناز ہے ہمارا ہی دیا ہوا ہے"

کیا ہمارے نوجوان یہ خیال کرتے ہیں کہ جدید علوم و فنون کی وحی خاص طور پر یورپ میں اُتری ہے یا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یورپ اور ایشیا کے آدمی اپنی دماغی ساخت اور عقلی قوائے میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور دونوں ملکوں کے لوگ جُدا جُدا قسم کی مٹی سے بنائے گئے ہیں کہ وہ جب تک اپنی تمام عادات و اطوار یہاں تک کہ اپنی زبان اور قومیت کو خیرباد نہ کہدیں تب تک ایک دوسرے کے علوم و فنون سے واقف و آگاہ ہی نہیں ہوسکتے اگر یہ خیال ہے تو قطعاً اور یقیناً غلط ہے۔ خدا نے ہم کو بھی اُن ہی اجزا سے بنایا ہے جن سے اہلِ مغرب بنے ہیں اور ہمارے دل و دماغ میں بھی وہی طاقتیں ودیعت رکھی ہیں جنھوں نے اقوام فرنگ کو اوجِ کمال پر پہنچا دیا ہے نہیں۔ بلکہ ایک زمانہ وہ بھی گذرا ہے جب کہ فلسفۂ جدید کے اُستاد مشرق کے مکاتب میں کسب کمال کرتے تھے اور فنون مغرب کے موجد ہمارے اسلاف کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے تھے۔ جب تک دُنیا میں تاریخ اور تاریخ میں صداقت کی بُو باقی ہے تب تک مغرب کی گردن مشرق کے ربقۂ شاگردی سے آزاد نہیں ہوسکتی اور یورپ کا سر ایشیا کے بارِ احسان سے سبکدوش نہیں ہوسکتا۔ لیکن ہاں چونکہ اب ہم نے خود اپنے اِن مایۂ ناز علوم و فنون

کو فراموش کردیا ہے جو ہم کو اپنے بزرگوں سے ترکے میں ملے تھے۔ اس لئے تعجب ہی کیا ہے کہ اغیار نے
ان علوم و فنون میں صدہا قسم کی موشگافیاں اور جدت طرازیاں کر کے اُن کو اپنا کر لیا ہے۔ ایسی ہی غلط فہمیوں کا یہ
نتیجہ ہے کہ ہمارے نئے تعلیم یافتہ یورپ کے جدید ترین مسئلہ ارتقاء سے جو حقیقت میں خود اُن ہی کے بزرگوں کا دریافت
کردہ مسئلہ ہے قطعاً ناواقف ہیں۔ اور یوں وہ اپنے علوم سے قطعاً متنفر ہو کر محض مغربی علوم کے گرویدہ و دلدادہ
ہو گئے ہیں۔ یہ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ جس چیز سے اُسے خود واقفیت ہوتی ہے اُس پر ہمیشہ حصر اور ناز کرتا ہے
اور دُنیا کو اپنی حدِ نظر سے محدود جانتا ہے۔ انگریزی طب سے واقف ڈاکٹر جو عموماً بہت معمولی علم نظریات کا رکھتے
ہیں اور محض روزمرہ کی کارآمد عملیات سے واقف ہوتے ہیں طب یونانی کی ہنسی اُڑاتے ہیں وہ یہ نہیں جانتے کہ
کہ خود اُن کا معلم یورپ محمد ابن زکریا الرازی۔ علی ابن عباس اور الشیخ الرئیس کی آرا کا آج تک پابند ہے۔
مقیاس الحرارت جس پر اُس کو اتنا ناز ہے ہمارے ہی اطبا کی ایجاد ہے۔ انگریزی مقیاس کے خلاف جس میں
درجہ صحت ۹۹ دقیقہ ۵ ثانیہ کے قریب ہے مذکورہ مقیاس میں درجہ صحت ایک مقرر کیا گیا تھا لیکن مجتہدین کی
رائے سے مقیاس الحرارت کا استعمال ترک کیا گیا کیونکہ لمس کے اندرونی بخار مقیاس سے نہیں دریافت ہو سکتے۔
قاناطیر جو یونانی سے معرب ہے اور کتابت کی غلطی سے بقول مولوی وحید الدین صاحب سلیم قاناطیر مشہور ہو گیا اور
جس کو انگریزی میں کے تھے ٹر کہتے ہیں عرب اطبا کے استعمال میں تھا لیکن چونکہ نرم سے نرم قاناطیر بھی احلیل کو
جو ایک نازک ترین حصہ جسم ہے صدمہ پہونچائے بغیر نہیں رہ سکتا اس لئے اس کے استعمال کو بھی ناجائز قرار دیا
گیا۔ وہ امراض مزمنہ جن کی تشخیص میں مغربی اطبائے اعظم آج مصروف ہیں اور شعاعیہ (ریڈیم) اور الفیا
شعاعوں (Alpha Rays R870) کی امداد سے کام لینے پر بھی کامیاب نہیں ہوئے اُن کا علاج طب یونانی
میں موجود ہے۔ مغربی اور یونانی مخزنوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو جائیگا کہ یونانی ادویات کے
مرکبات اور مفردات کی فہرست کتنی بڑی ہے ہم یہ پوچھتے ہیں کہ کیا عقلِ سلیم اس کو تسلیم کرتی ہے اور مسئلہ ارتقا
کی موجودہ تحقیقات اس کو قرین قیاس کہتی ہے کہ قدرت نے گرم آب و ہوا کے رہنے والوں کا علاج وہاں کی ہزارہا
بلکہ صدہزارہا نباتات میں نہ پیدا کیا ہو اور ان کو سرد آب و ہوا کے ممالک مغربی کی تجربات کا محتاج رکھا ہو۔
علمِ فقہ کو لیجئے۔ روما کی قدیم فقہ پر آج تمام یورپی فقہ کی بنیاد قایم ہے۔ روما کے مشہور و معروف قانونی

ادب میں سے صرف چند کتابیں پانڈکٹ، ناول، گائیس یسطینیان وغیرہ ہم تک پہونچی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اسلامی فقہ گو مذہبی مسائل سے مخلوط ہے ایک بحرِ ذخار ہے۔ اس وقت یورپ اور ایشیا کے کتب خانہ ہمارے فقہ کی ہزاروں کتابوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ اگر روما والے دو چار مذاہب میں تقسیم ہیں تو ہمارے فقہا میں کم از کم سو مدارس ہیں۔ اگر کوئی خلیفہ وقت یسطینیان کی طرح ان تمام مدارس سے ایک نئے مدرسے کے ترتیب دیئے جانے کا حکم دے تو موجودہ زمانہ کے جدید ترین قوانین سے بہتر ایک مجموعۂ قانون مدون ہو سکتا ہے۔ کیا عقل سلیم یہی مشورہ دیتی ہے کہ روما کی چار گنی چنی کتابوں کا مطالعہ قانونی علم حاصل کرنے کے لیئے کافی ہے اور اسلامی فقہ کی ہزاروں میں انتخاب کردہ کتابوں کا مطالعہ ناکافی رہے۔ کیا ذہن کا یہی تقاضا ہے کہ مسلمان طلبا اپنے قانونی علم کی بنیاد روما کی درسیات پر رکھیں اور اسلامی کتب کو طاقِ نسیان ہی پر رہنے دینا چاہیئے۔ روما کے قوانین کی تحقیق اور جستجو سے ہمیں کیا حاصل ہے اسلامی شرع کی چھان بین تنقید اور تحقیق سے ہم اسلامی قوانین میں ایک تازہ روح پھونک سکتے ہیں۔ فلسفہ جس کے ساتھ ہمیشہ لفظ جدید کارآمد کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے نہ معلوم کن معنوں میں نیا اور پرانا ہو سکتا ہے اور کس طرح مغرب سے موسوم ہو سکتا ہے۔ وحدت الوجود (Monism) اور تصوف (Mysticism) میں آج تک کوئی عجمی مسلمانوں سے سبقت نہیں لے گیا۔ اپنشدوں کی تعلیم لافانی ہے۔ جہاں یورپی فلسفی آکر رک جاتے ہیں اور اپنے عجز کا اقرار کرتے ہیں۔ ہندو فلسفی ذی خوف محیط کی انتہا اور بسیط کی ابتدا تک چلے جاتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ میں جو قومی خصوصیات پر مبنی ہیں مغربی تقلید اگر جنون نہیں تو کیا ہے لیکن تمام ہندوستان قدیم ساز وغنا کو ترک کر کے مغربی باجوں اور گانوں پر فدا ہے۔ سر نیندر و موہن ٹیگور۔ ڈاکٹر کمار سوامی جیسے ماہرین کی رائے سے عام طور پر واقفیت تک نہیں اس پر عمل کجا۔ افلاطون نے اپنی کتاب "سلطنت جمہور" میں کیا خوب لکھا ہے "غیر موسیقی کو اپنے ملک میں دخل نہ پانے دو کیونکہ یہ رفتہ رفتہ تمام نظام قومی اور آئینِ سلطنت تک کو تبدیل کر دیتی ہے۔ قوانین کو درہم برہم کر دیتی ہے اور ملت کے شیرازہ کو پراگندہ کر دیتی ہے"۔ کچھ موسیقی پر ہی موقوف نہیں جہاں حقیقی لذت گوش نہیں وہاں ذوق بصر بھی مفقود ہے۔ صنم سازی اور مصوری میں ہمارے نوجوان جدید تعلیم یافتہ ان مجسمات اور تصاویر کو دیکھ کر جو عکاسی کے درجہ سے بہت کم بلند ہیں بے خود ہو جاتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ قدیم یونانی اور جدید اطالوی

زمانہ احیا کا فن جس پر وہ جان دیتے ہیں قدیم مصر اسیریا اور قدیم ہندوستان کے فن کی گرد کو بھی نہیں پہونچا۔ اجنتا کے غاروں میں جو تصویریں ہیں اُن کے رنگوں کی نقل آج تک بے حد کوشش کے بعد بھی یورپ کے مصوروں سے نہیں ہوئی۔ تمام یورپ کے نگار خانوں میں پھر جائیے وہ رنگ کسی مصوّر کے موقلم نے نہیں دکھلایا۔ نئے آرٹ اجا یا گیا یونانی بڈہاسے مائلو کی زہرہ (Vorsus de mils) کو کچھ نسبت نہیں۔ لیکن بہت سے جدید تعلیم یافتہ جو یونانی زندگی میں زہرہ کی حیثیت سے بھی واقف نہیں اور اُس کو محض ایک بازو شکستہ عریاں عورت کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اس پر غش ہیں۔ حق یہ ہے کہ فدیث (Phidias) اور پالگناطس Polygnatus قدیم ہندوستان۔ مصر اور اسیریا کے اہل فن کی شاگردی کا بھی دعویٰ نہیں کر سکتے۔

اگر ہم تنازع البقا میں اپنی ہستی برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو ہمارے لیئے ضروری ہے کہ ہم اپنے فلسفہ۔ اپنی طب اپنے فنون۔ اپنی فقہ۔ اپنے علوم۔ اپنی حکمت کو زندہ کریں۔ اگر ہمارا فلسفہ ہماری تعلیم کا جزبن کر زندہ ہو جائے تو وہ خود ہی رفتہ رفتہ مغربی فلسفہ کے اختلاط سے اپنے تمام نقائص سے پاک ہو جائے گا۔ اگر ہماری طب کا احیا ہو تو خود بخود وہ مغربی جرّاحی کے ان اُصولوں کو جو حقیقت میں خود اُس کے ہی اُصول ہیں اور جن میں یورپ نے صرف اضافہ کیا ہے پھر جزو حکمت بنا لیگی اور امراضیات کی جدید ترین تحقیقاتوں پر غور کرنے کے بعد اُن میں سے بہت سی باتوں کو اختیار کر لیگی۔ جب ہمارے فنونِ لطیفہ جن کی بنیاد علویت اور روحانیت پر ہے مغربی فنون کے اُصولوں پر غور کے بعد وسیع تر بنیاد پر قایم ہونگے تو اس سے لازمی ہے کہ یورپ اور ایشیا دونوں کے موجودہ فن سے ایک زیادہ عظیم الشان فن کی بنیاد قایم ہوگی۔ جب ہم مغربی فقہ کی تدوین کرینگے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم مثل اہل روما یا جدید اقوام کے ایک یادگار زمانہ جدید قانون اسلامی کے بانی نہوں۔

ہمارے ایشیائی اور اسلامی علوم ہی ہماری ملت اور قومیت کی اصلی بنیاد ہیں۔ اگر ان کا احیا نہ ہوا تو ہم دنیا میں یورپ کی ایک پژمردہ نقل بن کر رہ جائینگے جس کی یورپ کو کوئی ضرورت نہیں اور زمانہ ہمارے نام اور ہماری ہستی کو مٹا دیگا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہم مغربی اور جدید علوم کی ضرورت سے آزاد ہیں۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ جب تک مشرقی اور مغربی علوم ساتھ ساتھ نہ پڑھائے جائینگے تعلیم ہمارا جزو زندگی نہ ہوگی ہمارا تمام نام نہاد فضل و کمال نقش بر دیوار رہوگا اور ہمارا وجود دنیا کے لیے بیکار محض رہیگا۔ میں یہ کہتا ہوں

کہ علوم شرقیہ اور غربیہ کی تعلیم پہلو بہ پہلو ہونی چاہیئے۔ اگر یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو میرا دعویٰ ہی کہ بیس برس کے اندر اندر ایسی ایسی تصانیف اور تحقیقاتیں ہم سے ممکن ہونگی جن کی یورپ قدر کرے گا اور جو دنیا کے علم میں اضافہ کا باعث ہونگی۔

لیکن خود مغربی علوم کی تحصیل کے لیئے بھی ضروری ہی کہ ان کی تعلیم اردو تراجم کے ذریعہ سے دی جائے۔ جب تک ایسا نہ ہوگا جدید علوم انگریزی دانوں کے محدود حلقہ میں محصور رہینگے اور قوم میں بحیثیت قوم اُن کی اشاعت ممکن نہ ہوگی۔ اگر ہم اس امر کے خواہشمند ہوں کہ فریڈرش نطشے کے فلسفہ کے مطالعہ سے، ہماری قوم میں جو عصبی کمزوری آگئی ہی اس کا علاج کیا جائے تو جب تک اُس کی کتابیں اردو میں ترجمہ ہوکر شایع نہ ہوں یہ ممکن نہیں۔

بعض اشخاص ایک نہایت غلط دلیل انگریزی کو ذریعہ تعلیم قایم رکھنے کی یہ دیتے ہیں کہ انگریزی علوم کو انگریزی ہی میں تحصیل کرنا مناسب ہی۔ علوم بحر و بر کے حصص نہیں ہیں جو ممالک کے حدود اربعہ کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ منقسم کیئے جاسکیں۔ انگریزی اور علوم یہ دونوں الفاظ مشکل سے جمع ہوسکتے ہیں اور اگر ان کو یکجا کیا جائے تو ایک حد تک بے معنی ہوجاتے ہیں۔ اگر یہ اصول قرار دیا جائے کہ جملہ علوم کی کتابوں کا مطالعہ اصل زبان میں کرنا چاہیئے تو ہر جدید علم کے جاننے کے لیئے ضروری ہی کہ یورپ کی جملہ زبانوں سے واقفیت ہو اور جسے تمام السنہ مغربیہ پر عبور نہ ہو گویا وہ کسی جدید علم کے مطالعہ کا حق ہی نہیں رکھتا۔ فی زمانہ کسی معرکۃ الآرا بحث کو لے لیجئے خواہ وہ فلسفے میں ہو یا حکمت میں کسی جدید مسئلہ پر غور فرمائیے خواہ علوم سے متعلق ہو یا فنون سے کسی جدید اصول یا دریافت یا اختراع پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ فی زمانہ کوئی مغربی ملک ایسا نہیں جہاں ایک نہیں بلکہ متعدد ماہرین نے اس کے متعلق نہیں لکھا اور اسی کی معلومات میں اضافہ نہیں کیا۔ اس لیئے فی زمانہ ہر مضمون سے تمام و کمال واقفیت اصل کتابوں کے مطالعہ سے دس پانچ مغربی زبانیں جاننے پر بھی ناممکن محض اور محال قطعی ہی۔ جب تک تراجم سے کام نہ لیا جائے آج دنیا میں کوئی بھی مغربی ملک ایسا نہیں ہی جہاں تعلیم اور تربیت کا ذریعہ تراجم اور محض تراجم نہ ہوں۔ علوم صحیحہ کی تعلیم بغیر تراجم ہو ہی نہیں سکتی۔ کیا آپ کوئی علم یا حکمت کی شاخ ایسی بتلاسکتے ہیں جس کے مطالعہ کے لیئے انگریز غیر زبانوں کے محتاج نہیں۔ اگر کوئی شخص آج کل اصلی زبان کو ذریعہ تعلیم بنا کر بطور مثال صرف جدید فلسفے سے

واقف ہونا چاہیے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کم از کم بیکن۔ برونو وغیرہ سے واقف ہو جن کی اصلی تصنیفات لاطینی میں ہیں۔ دے کارت، روسو، کامت وغیرہ سے واقف ہو جن کی اصلی تصنیفات فرانسیسی میں ہیں۔ کانٹ۔ ہیگل۔ فشطے۔ شیلنگ وغیرہ سے واقف ہو جن کی اصل تصنیفات المانی میں ہیں۔ سپی نوزا سے واقف ہو جس کی اصل تصنیفات ولندیزی میں ہیں۔ کروچے سے واقف ہو جس کی اصل تصنیفات اطالوی میں ہیں وعلیٰ ہذا القیاس۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے تمام جدید فلسفہ سوائے برکلے، مل اور سپنسر کے انگریزی سے علاوہ دیگر یورپی زبانوں میں ہے۔ اگر صرف اصل زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی کوشش کی جائے تو علمی دنیا میں قیامت برپا ہو جائے اور تمام علمی تحقیقات ایک دن میں بند ہو جائیں۔

اب یونیورسٹیوں میں مغربی ادب کی تعلیم کے مسئلہ کو لیجئے چونکہ اس کا تعلق ترجمہ کے مسئلہ سے ہی ہے اس کو یہاں بیان کرنا ناموزوں خیال نہیں کرتا۔ ہماری ہندوستانی یونیورسٹیوں میں چونکہ انگریزی زبان کے پروفیسر اردو سے ناواقف انگریز ہوتے ہیں وہ انگریزی سے انگریزی میں سبق دیتے ہیں۔ ہمارے ماہرانِ تعلیم ایک لحظہ کے لیے اتنا غور نہیں کرتے کہ اس سے زیادہ غلط کیا طریقہ ہو سکتا ہے اس طریقہ کا رواج صرف اس وجہ سے ہے کہ انگریزوں کے لیئے دوسرا طریقہ ممکن نہیں۔ ہندوستان میں استاد طلبا کے لیئے نہیں بلکہ طلبا استاد کے لیئے ہیں۔ اگر شیکسپیر انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر کے پڑھایا جاتا اور اسی طرح انگریزی ادب کی تمام کتابیں اردو میں ترجمہ ہو کر تعلیم ہوتیں تو آج انگریزی علم ادب تمام خود بخود ترجمہ ہو چکا ہوتا۔ خود ہمارے ادب پر نہایت مفید اثر پڑتا اور ہم انگریزی ادب کے حقیقی مفہوم سے بھی ضرور قریب تر ہوتے۔ اگر فرانس یا روس میں آپ یہ تجویز پیش کریں کہ فرانسیسی اور روسی یونیورسٹیوں میں انگریزی زبان کا پروفیسر انگریزی سے انگریزی میں تعلیم دے تو آپ کی ہنسی اڑائی جائے اور خدانخواستہ لوگ آپ کو دیوانہ خیال کریں پروفیسر برگساں مشہور زمانہ فلسفی جب یورپ و امریکہ جاتے ہیں اور وہاں کی یونیورسٹیوں میں ہزار ہا پونڈ معاوضہ لے کر لکچر دیتے ہیں (جو لکھا ہوا ہوتا ہے اور پڑھا جاتا ہے) تو باوجود اعلیٰ ترین انگریزی دانی کے فرانسیسی زبان میں لکھ کر پڑھتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیشتر حاضرین فرانسیسی زبان سے ناواقفیت کے باعث ان کی تقریروں کو سمجھ تک نہیں سکتے لیکن وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم انگلستان یا امریکہ میں بھی انگریزی میں تقریر کرنا گو اس سے ہماری زباندانی کی شہرت کیوں نہ ہو اپنی زبان کی حیات اور اشاعت کے منافی جانتے ہیں۔

علمی کتابوں میں جو ادب اور معانی کے علاوہ اور تمام مضامین پر مشتمل ہیں ترجمہ اور اصل میں کوئی فرق نہیں ہوتا بلکہ چونکہ مصنفین جو ماہرین ہوتے ہیں اور تمام عمر ایک مضمون کی تکمیل میں صرف کرتے ہیں اور ادب کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں رکھتے اپنے مطالب کو فصاحت اور بلاغت سے اکثر بیان نہیں کر سکتے۔ مترجم جو عموماً ادیب ہوتے ہیں اپنے ترجمہ کو اصل کے ان اسقام سے پاک کر دیتے ہیں اور ترجمے عموماً اصل سے بڑھ جاتے ہیں۔

لہٰذا مغربی علوم سے بھی کما حقہٗ واقفیت جب ہی ہو سکتی ہی جب اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔

ہر ایک قوم کی زندگی میں ایک زمانہ ایسا آتا ہی جب تاریخی اور سیاسی اسباب سے علوم و فنون کی روشنی کم ہو جاتی ہی اور اس بات کی ضرورت ہوتی ہی کہ وہ اپنے چراغ کو اور اقوام کے چراغ سے روشن کرے۔ اس زمانہ میں تخلیق کی قوت زائل ہو جاتی ہی جو تصنیفات ہوتی ہیں وہ ادنیٰ درجہ سے آگے نہیں جاتیں الّا ماشاءاللہ۔ عوام کا مذاق درست نہیں رہتا۔ ایسے زمانہ میں ضروری ہی کہ کتابوں کے لکھنے والے بجائے اس کے کہ اپنے خام یا نیم پختہ خیالات کا اظہار کریں دنیا کے اور مشہور گزشتہ اور موجودہ مصنّفین کے ترجمان ہو جائیں۔ گو ہم میں ہر شخص اس بات کا مشتاق ہی کہ وہ خود مصنف ہو اور مترجم یا مؤلف ہونا اپنی کسرِ شان خیال کرتا ہی مگر یہ خیال غلطی پر مبنی ہی۔ آج یورپ میں مترجم بھی وہی پایہ رکھتا ہی جو خود مصنف کا ہی۔ اکرٹ دیوان حماسہ کا مترجم المانیہ کے مشہور شعرا میں شمار ہوتا ہی۔ ولیم آرچر کی شہرت اس بنا پر قایم ہی کہ ناروے ڈراما نویس ابسن (Ibsen) کا انگریزی مترجم ہی۔ اس غلط خیال کی ایک وجہ یہ ہی کہ ناواقف ترجمہ کو ایک بہت سہل کام سمجھتے ہیں لیکن جو لوگ اس سے واقف ہیں وہ اس کی مشکلات کو اصل تصنیف سے کم نہیں بلکہ زیادہ جانتے ہیں۔ ہمارے ملک میں جو حالت آج ہی وہ اس امر کی مقتضی ہی کہ عموماً تراجم کو تصانیف پر ترجیح دی جائے۔ سوائے معدودے چند لوگوں کے جن کو قدرت نے اعلیٰ ترین دماغوں سے مزین کیا ہی اور اپنے خاص پیغام پہونچانے کے لئے مقرر فرمایا ہی ہمارے ملک کے بیشتر لوگوں کو ترجمہ کی جانب توجہ کرنی چاہیئے۔ آج سے تیس برس بعد موجودہ مصنّفین جن کے تصنیف کردہ ناول اور افسانے آج کل ہر گلی کوچے میں ردی کے بھاؤ بک رہے ہیں ہمیشہ کے لئے فراموش کر دیئے جائینگے۔ بلکہ زبان اُردو کے مورخین اُن کے وجود کو باعثِ ننگ خیال کرینگے اور اُن کو کیڑوں سے تشبیہ دینگے جو بارش میں زمین کے متعفن ہو جانے سے خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے جہاں حالی اور شبلی کا نام قایم اور دائم

رہیگا۔ اسی طرح سید علی بلگرامی مترجم تمدن عرب و تمدن ہند۔ ملا غلام الحسنین مترجم فلسفۂ تعلیم۔ ابوالمعالی نیاز مترجم گیتان جلی کے نام بھی ہمیشہ تذکرات اُردو میں عزت سے لئے جائینگے۔

جن حضرات نے ترجمہ کے کام کو کیا ہے اُن کو یہ شکایت ہے کہ اصطلاحات علمیہ کی تلاش اور ایجاد میں سخت مشکل ہوتی ہے۔ میری رائے میں یہ اشکال خود ہی ترجمہ کے کام کو زیادہ قابل عزت و وقعت بنا دیتے ہیں کیونکہ اس قسم کی مشکلات کو حل کرکے گویا مترجم زبان کی عمارت پر نئے نقش و نگار بناتا ہے اور آیندہ نسلوں کے واسطے ترقیِ زبان کے راستے کو صاف کرتا ہے۔

اصطلاحات کے متعلق بعض حضرات کا خیال ہے کہ ان کے انتخاب یا اختراع کرنے والے ماہرین فن (Experts) ہونے چاہئیں یعنی جس علم یا فن کی اصطلاحات مطلوب ہوں اُن کو اس فن کے ماہرین بنائیں لیکن یہ صحیح نہیں۔ ہمارے اکثر پروفیسر جو علوم مغربیہ کی تعلیم دیتے ہیں اپنی زبان میں اصطلاحات وغیرہ سے بہت کم واقف ہیں بلکہ خود انگریزی میں بھی علم اللسان کے نقطۂ نظر سے یونانی یا لاطینی اصطلاحات کے معنی نہیں جانتے۔ یہ کام علم اللسان کے جاننے والوں کا ہے اور میں نے مسلم یونیورسٹی کے نظام تعلیم میں جو اصلاحات پیش کی ہیں اُن میں یہ بھی ہے کہ (M.O.L.) کی ڈگری کو اس طرح ترمیم کیا جائے کہ جو لوگ اس سند کو حاصل کریں وہ مغربی تراجم کے لئے خاص طور پر موزوں ہوں۔

بعض مشرقی اقوام نے (مثلاً میں نے اسلامبول میں خاص طور پر حکمت (Science) کی کتابیں خرید کر دیکھا) انگریزوں کی طرح اک سی جن۔ ہائی ڈروجن وغیرہ الفاظ کو ویسے کا ویسا ہی اپنی زبان میں لے لیا ہے۔ یہ محض اُن کی پست ہمتی اور نارسی کی دلیل ہے۔ انگریز تو یونانی اور لاطینی کو اختیار کرچکے اور وہ اُن کی زبان کا جزو ہو چکیں لیکن ہمارے لئے ابھی انتخاب کا موقع باقی ہے ایسی صورت میں جب کہ یہ بات یکساں ہماری قدرت میں ہے کہ چاہیں تو یونانی اور لاطینی الفاظ اور اصطلاحات کو لے لیں اور چاہیں تو خود اپنی زبان میں ترجمہ کرلیں۔ ہمارا انگریزوں کی تقلید کرنا سخت غلطی ہوگا۔ جرمنوں نے جو علمی حیثیت سے ایک نئی قوم ہیں ایسا نہیں کیا بلکہ سب اصطلاحات کو اپنی زبان میں ترجمہ کرلیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر جرمن بچہ محض اصطلاح سنتے ہی آکسیجن کا مفہوم پالیتا ہے۔ ہم کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیئے۔

ترجمہ کرنے میں دو طریقے اختیار کئے جاسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ عربی اصطلاحات بنائی جائیں۔ دوسرے یہ کہ فارسی اصطلاحات کو اختیار کیا جائے۔ عربی الفاظ کو ترجیح دینے والے یہ وجوہ پیش کرتے ہیں کہ عربی زبان میں تمام

علوم کی اصطلاحات موجود ہیں جو صرف مرورِ زمانہ سے غیر مستعمل ہو گئی ہیں۔ اُن کو تلاش کر کے دوبارہ زندہ کرنا کافی ہے اِس طریقہ کو اختیار کرنے سے دس بارہ برس میں علوم قدیمہ اور جدیدہ میں ایک خاص اتصال پیدا ہو جائیگا۔ دوم اہلِ بیروت اور اہلِ مصر نے اکثر جدید اصطلاحات وضع کر لی ہیں وہ ہمارے کام آسکتی ہیں۔ اور بہت سی محنت بچ سکتی ہے۔ فارسی اصطلاحات کے موید یہ کہتے ہیں کہ عربی اصطلاحات کے اختیار کرنے سے وہی قباحت جو انگریزوں کو لاطینی اصطلاحات کی وجہ سے ہی باقی رہتی ہے۔ اور وہ آسانی جو جرمنوں کو خاص جرمن اصطلاحات سے ہی پیدا نہیں ہوتی۔ مثلاً حیوانات میں (یہاں ایک کتاب سے مثال دیجاتی ہے) کثیر الرجل یا اخطبوطیہ شوکیتہ الجلد متسعلج الجلد سلحفیہ مستقیمۃ الاجنحہ الفاظ کا عام طور پر سمجھا جانا اور رواج پانا مشکل ہے لیکن کثیر پا، خارپشت، گداز جلد، غلاف پوش، راست پر، کے معنی ہر شخص سمجھتا ہے۔ اور ایسی اصطلاحات بہت جلد قبولِ عام کا خلعت پا سکتی ہیں۔ میری ناچیز رائے یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے بین بین طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ جہاں فارسی اصطلاحات موزوں مل سکیں اُن کو ترجیح دینا چاہیئے اس کے بعد عربی قدیم اصطلاحات کو جو مفرد الفاظ کی صورت میں ہوں اختیار کرنا چاہیئے۔ اور ایسے الفاظ کے جو ہماری زبان کے اعتبار سے سخت ہوں اجتناب کرنا چاہیئے۔ فارسی زبان میں جرمن کی طرح یہ خوبی ہے کہ جن دو لفظوں کو چاہیئے فوراً ملا کر ایک مرکب لفظ یا اصطلاح بنا لیجئے۔ عربی میں یہ بات نہیں۔ ہماری زبان میں عربی اصطلاحات ذرا ثقیل بھی معلوم ہوتی ہیں۔

اس کے بعد ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ آیا اصطلاحات کی لغت پہلے تیار ہونی چاہیئے یا پہلے ان مختلف مضامین کی کتابیں لکھی جائیں اور ان میں حسب ضرورت اصطلاحات استعمال کی جائیں۔ پھر جب رفتہ رفتہ ان میں ترقی ہو تو اِن کی تدوین سے لغت کی کتاب بنائی جائے۔ اِس خیال کے مؤید کہتے ہیں کہ اگر لغت پہلے سے تیار ہوئی تو وہ ناقص ہوگی اور اس طرح ناقص اصطلاحات رواج پا جائینگی۔ اس لئے لغت میں صرف اُنھیں الفاظ کو جگہ دینی چاہیئے جو وقت کی کسوٹی پر کسے جانے کے بعد مقبولِ عام ہو جائیں۔

اِس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ لغت کی کتابوں کے متعلق ایک مغالطہ ہے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ لغت ایک ٹکسال ہوگی اور اس کی تدوین کے بعد مصنّفوں مؤلفوں اور مترجموں کو کوئی اصطلاح "ٹکسال باہر" لکھنے کی اجازت نہ ہوگی جو لفظ یہاں جس معنی میں استعمال ہوگا وہی سب کو قبول کرنا پڑے گا۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مولوی عبد الحق

صاحب کا جنھوں نے اس عظیم الشان کام کو پورا کرنے کا تہیہ فرمایا ہی یہ منشا ہرگز نہیں - ایسا خیال کرنا ابھی قبل از وقت ہی - منشاء صرف اتنا ہی کہ لغت ساز مصنفوں اور مترجموں کی امداد کے لیئے لغت میں امتحان اور آزمایش کے لیئے الفاظ پیش کرینگے اور مصنف مؤلف اور مترجم اُن کی محنت سے مستفید ہونگے لیکن اصطلاحات کی اصلاح و ترمیم اور قطع و بُرید کا ہر حال میں اُن کو اختیار رہوگا اور وہ کسی طرح اُس کے پابند ہونگے کہ مجوّزہ الفاظ کے سوا اور کوئی لفظ استعمال بھی نہ کریں یہ کتاب لغت تو حقیقت میں ایک ابتدائی خاکہ ہوگا، اِس پر الفاظ کی رنگ آمیزی مصنفین کے مذاق سلیم اور انتخاب صحیح پر منحصر ہوگی - اور یوں اگر دونوں فریق اسی طرح ایک دوسرے کے مشیر رہے تو دس بارہ برس میں ایک عمدہ کتاب لغت بھی تیار ہو جائے گی - اور وہ وقت آجائے گا کہ الفاظ کے معنی کو مقرر کر دیا جائے -

اکثر یہ دریافت کیا جاتا ہی کہ جدید اصطلاحات کی لغت کی کتابیں ترکی عربی یا فارسی میں موجود ہیں یا نہیں - میں نے اس کے متعلق جہاں تک واقفیت بہم پہونچائی ہی وہ یہ ہی کہ ۱۹۱۲ء میں طہران میں ایک کتاب فرانسیسی زبان میں شایع ہوئی ہی جس میں انسانیات (Anthropology) اور طب مغربی (Medicine) کی اصطلاحات فرانسیسی انگریزی المانی اور فارسی میں ہیں - اس کے علاوہ فارسی زبان میں جدید مصطلحات کی کوئی لغت نہیں - عربی میں بیروت میں چند لغت شایع ہوئی ہیں - جن کی کیفیت یہ ہی - لوئس معلوف نے ایک لغت عربی الموسوم بہ المنجد ۱۹۰۸ء میں شایع کی ہی اس میں الفاظ کے معنی عربی سے عربی میں درج ہیں اور اس میں (Scientific) اور (Tecnical) اصطلاحات بھی شامل ہیں - ایک اور مفید لغت جس میں بعض انگریزی اصطلاحات کے عربی مترادف الفاظ موجود ہیں ابکاریوس ۱۸۹۲ء کی ہی - مصر میں ایک لغت بیسیرو کی ہی جو قاہرہ ۱۸۹۰ء میں شایع ہوئی ہی - پراٹسٹنٹ کالج بیروت نے مختلف جدید علوم کی شاخوں پر تیس چالیس برس کا عرصہ ہوا ابتدائی کتب لکھوائی ہیں - اِن سے بھی مدد مل سکتی ہی لیکن بہت کم - دائرۃ المعارف بیروت بھی اس نقطۂ نظر سے قابل توجہ ہی - پرانی کتابوں میں الخوارزمی کی مفاتیح العلوم اور ایسی ہی اور بیسیوں کتابیں لائق غور ہیں - ان میں بہت سی اصطلاحات مل سکتی ہیں جن کو رواج دینا ممکن ہی - ایک کتاب جس کی تعریف میں نے سنی ہی اور جو غالباً ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں موجود ہی A Dictionary of the Tecnical terms Used in the sciences of the Mohammadans. Calcutta, 1862.

اصطلاحات سازی کے لحاظ سے ناگری پرچارنی سبھا اور خصوصاً گروکل ہردوار کی کتب اور درسیات توجہ کی طالب ہیں۔ میں نے گروکل میں پروفیسر مہیش چرن سنہا صاحب کو ہندی میں نہایت روانی اور خوش اسلوبی سے طلباء کو نباتات پر لکچر دیتے ہوئے سنا ہے۔

ایک اور مشکل جو علوم کی اشاعت کی راہ میں حائل ہے وہ ٹائپ کی عدم موجودگی ہے۔ فی زمانہ کتابیں رسالے اور اخبار سنگ نویسی کے ذریعہ سے چھاپے جاتے ہیں۔ سنگ نویسی میں صرف ایک فائدہ ہے وہ یہ کہ کام سستا ہوتا ہے ورنہ اور کوئی عیب ایسا نہیں جو اس میں موجود نہ ہو۔ کام میں از حد دیر ہوتی ہے۔ کتابت بیحد غلط ہوتی ہے اور غلطیوں کو خاطر خواہ طور پر صحیح کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ تحریر میں پاکیزگی اور صفائی اور خطوط میں راستی نہیں پیدا ہوتی۔ باہمی فصل غیر مساوی ہوتے ہیں۔ اگر مصنف یا اڈیٹر دوران طبع میں عبارت کم و بیش کرنا چاہے تو ناممکن ہے۔ غرض ایک عجیب بیچارگی اور بے اختیاری کا عالم ہے۔ ٹائپ صرف گراں ہے۔ باقی تمام عیوب سے مبرّی ہے۔

لیکن ٹائپ کے رواج دینے میں یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون سے ٹائپ کو رائج کیا جائے۔ اس کا جواب اُس وقت تک نہیں دیا جا سکتا جب تک کہ رسم الخط کے مسئلہ پر بحث نہ کی جائے۔ جو رسم الخط اس وقت اردو کا ہے وہ عربی ہے جو عرب سے افریقہ اور ایران اور ایران سے دولت عثمانیہ اور ہندوستان میں پھیلا ہے۔ جب یہ رسم الخط ابتداءً ہندوستان میں آیا تو یہاں بیشتر سنسکرت رسم الخط جاری تھا اور دولتِ عثمانیہ میں گیا تو وہاں چغتائی کتابت کا رواج تھا۔ مذہب کی قوت اس قدر زبردست ہوتی ہے کہ اس نے مقامی طرزِ تحریر کو دبا کر عربی کو رائج کر دیا چنانچہ اس وقت تمام دنیا میں سوائے چین کے جہاں چینی اور البانیا کے جہاں سلیو (Slav) رسم تحریر کا رواج ہے سب مسلمان یہاں تک کہ تاجیک و تاتار بھی اسی کو استعمال کرتے ہیں۔ اب اس رسم الخط کی دنیائے اسلام میں وہی حالت ہے جو لاطینی خط کی فرانس، اطالیہ، انگلستان، المانیہ، ہالینڈ، رومانیہ، فنلنڈ، سویڈن، ناروے ڈنمارک، بلجیم، اسپین، پورتگال وغیرہ کے باشندوں کے لیے ہے۔ یہ رسم الخط دنیاء اسلام کے درمیان ایک اتحادی واسطہ ہے۔ ہماری زبان میں بہت سی آوازیں مثلاً بھ پھ ٹھ ٹ ڈ ڑ وغیرہ ایسی ہیں جو عربی فارسی میں نہیں ہیں لیکن اس کمی کی ہم نے ان حروف کے اضافہ سے تلافی کر لی ہے اور بحالت موجودہ ہم کو اپنا مروّجہ رسم الخط بدلنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ ہمارے تمام مخارج پر بخوبی حاوی ہے ترکوں نے جن کی اصلی زبان چغتائی ہے،

سخت قباحتوں کے باوجود بھی اس کی متابعت سے انحراف نہیں کیا، ترکی زبان میں چینی زبان کی طرح Long vowels نہیں ہیں گویا زیر زبر اور پیش کی حرکات اس زبان میں کام ہی میں نہیں آتیں اس لیئے عربی رسم الخط اُن کی ضرورتوں سے قطعی منافی تھا اور ہی لیکن محض مذہب کی وجہ سے اُن کا ارادہ اس کو ترک کرنے کا نہیں ہی۔ ہم کو تو چونکہ کوئی ایسی دشواری بھی نہیں ہی اس لیئے اس کو چھوڑنا کسی طرح مناسب نہیں۔

رسم الخط پر غور کرنے کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہی کہ لکھنے میں آسانی ہو۔ زیادہ طوالت اور دقت نہ ہو تا کہ کاغذ اور وقت دونوں میں کفایت رہے۔ اس لحاظ سے بھی ہماری موجودہ طرز تحریر دنیا کی اعلیٰ ترین طرزوں سے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکتی ہی۔ حقیقت میں یہ ایک قسم کی مختصر نویسی ہی۔ یہ یقیناً انگریزی کی تحریر سے بہتر و برتر ہے اگر ہم اُردو کی ایک عبارت کو انگریزی حروف میں لکھیں تو بلا مبالغہ اُس میں دوچند سے زیادہ کاغذ اور وقت اور محنت کا صرف ہی۔ اُردو پر سب سے زیادہ حق ہندی اور فارسی یا سنسکرت اور عربی کا ہی اس لیئے اس کی طرز تحریر بھی انھیں دونوں قسموں میں سے کسی ایک کی متبع ہونی مناسب ہی لیکن ہندی طرز تحریر میں وہ عیوب نہایت نمایاں طور پر موجود ہیں جو ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ ظاہر ہی کہ اس کے لکھنے میں انگریزی سے بھی زیادہ طوالت اور محنت ہی اس لیئے ہم اُردو پر ہندی کا پورا حق تسلیم کرنے کے بعد بھی اپنے موجودہ رسم الخط کو چھوڑ کر ہندی طرز تحریر اختیار کرنے کی رائے نہیں دے سکتے۔ اور محض ٹائپ کی سہولیت پر اپنی تمام موجودہ آسانیوں اور خوبیوں کو قربان نہیں کر سکتے۔

جس طرح لاطینی اور گاتھک حروف کو متحد النسل ہیں لیکن اُن کی کتابت میں ذرا سا فرق ہی۔ اسی طرح عربی اور اُردو کتابت میں بھی کچھ اختلاف ہی یہ فرق زبان میں اُس ارتقار پر مبنی ہی جو حسن صورت سے تعلق رکھتا ہی۔ جس طرح کہ خط کوفی خط نسخ میں بدل گیا ہی ویسے ہی خط نسخ محض خوش نویسوں کی جدت طرازی سے تعلیق اور نستعلیق ہو گیا ہے۔ اُردو نستعلیق اور عربی نسخ میں صرف یہ فرق ہی کہ نسخ خطوط کے اصول پر اور نستعلیق دائرے کے اصول پر قایم ہی گویا عربی خط کا ماخذ اقلیدسی مربع اور اُردو کا دائرہ ہی۔ اب تک یہ گردی شکل ہمارے اُردو خط کے لیئے ایک مزید حسن کا موجب تھی لیکن ٹائپ کے لحاظ سے اس میں ایک بہت بڑا نقص نکل آیا۔ یہ گردیت عمدہ خوبصورت ٹائپ بنانے میں مانع ہی۔ اس کی وجہ سے ایک تو جوڑ بہت زیادہ ہو جاتے ہیں جس سے کتابت غلط ہونے کا اندیشہ ہوتا ہی۔ دوسرے

خرچ بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں ایسا ٹائپ بنا ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کے پاس ایسا ٹائپ موجود ہے۔

اِس لیئے یہ ایک نہایت غور طلب سوال ہے کہ آیا باوجود ان دقتوں کے اردو نستعلیق ٹائپ کے اجرا ہی کے لئے کوشش کی جائے یا عربی نسخ کتابت کو اختیار کر لیا جائے۔

میری رائے میں اس مسئلہ پر یوں غور کرنا چاہیئے "ٹائپ" ہمارے لیئے ایک بالکل نئی شئے ہے۔ جب انگریزوں اور فرانسیسیوں وغیرہ نے ٹائپ کو اختیار کیا تو اُن کی زبانیں بھی دائرہ آمیز صورت میں تحریر ہوتی تھیں اور اب بھی قلم سے ویسی ہی تحریر ہوتی ہیں۔ اُنھوں نے قلم کی تحریر کے لیئے اپنی گردی کتابت کو قایم رکھا اور "ٹائپ" کے لئے دوائر کو خارج کر کے خطوط کو اُن کی جگہ قایم کر دیا۔ ہم کو بھی چاہیئے کہ آیندہ اردو کو قلم سے نستعلیق لکھیں اور ٹائپ میں نسخ تحریر کرنے کو رواج دیں۔

آپ یہ کہینگے کہ لوگوں کو تکلیف ہوگی۔ شروع شروع میں ضرور دقت ہوگی لیکن چند ہی سال میں بالکل جاتی رہیگی۔ ساتھ ہی ہم کو یہ چاہیئے کہ تمام اسکولوں اور مدارس سے درخواست کریں کہ وہ اپنی درسیات کو ٹائپ میں تعلیم کرنا شروع کریں اور تحریر میں نستعلیق کا استعمال جاری رکھیں۔

ٹائپ کی ایک اور تجویز وہ ہے جس کے بانی مولوی نظام الدین حسن صاحب ہیں۔ یعنی مغربی طرز پر حرفوں کو بغیر وصل لکھنے کا قاعدہ اختیار کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بہترین ٹائپ ہے اور اس سے سستا ممکن نہیں لیکن اس کے جاری کرنے میں وہ تمام عیوب از سرِ نو پیدا ہو جاتے ہیں جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں اور ساتھ ہی ایک حد تک دنیائے اسلام کے اتحاد کا منشا جو بہترین صرف موجودہ رسم الخط سے پورا ہوتا ہے فوت ہوتا ہے۔ یہ جب ہی ممکن ہے کہ تمام دنیائے اسلام میں بعد مشورہ کے اس کو رواج دیا جائے۔ بہرحال یہ تجویز قابل غور ضرور ہے۔

اس کے علاوہ ملکم صاحب سفیر برطانیہ متعینۂ ایران کی تجویز یہ ہے اور رضا من کنتوری صاحب اس کے موید ہیں کہ مذکورہ بالا طریقہ اختیار کیا جائے۔ لیکن حروف سالم نہ لکھے جائیں بلکہ مقطعات میں تحریر ہوں۔ اس میں فائدہ یہ ہے کہ تحریر میں جگہ اتنی زیادہ صرف نہ ہوگی جتنی کہ مولوی نظام الدین صاحب کی تجویز پر عامل ہونے سے ہوگی۔ مولوی نظام الدین صاحب کے طرز پر لکھی ہوئی کتابیں بہت طویل ہو جایا کرینگی۔ لیکن ضامن کنتوری صاحب

کی تجویز کئے اختیار کرنے سے ہمارا موجودہ طرز تحریر بالکل ہی بدل جاتا ہی اور اُس کا کچھ وجود بھی باقی نہیں رہتا۔ اور یوں گویا ہم محض ٹائپ کی آسانی کے لئے اپنے اسلافِ کرام کی اب تک کی تمام جانکاہ محنتوں اور سر توڑ کوششوں کے نتائج کو قربان کردیتے ہیں کیونکہ اس رسم خط کے قبول کرلینے سے ہماری تمام موجودہ کتابیں آیندہ نسلوں کے لئے بالکل ایسی ہی مشکل اور عجیب ہوجائنگی جیسے بابل یا مصر کے کتبے۔ اس سے تو کہیں بہتر ہی کہ سنسکرت یا رومن رسم الخط کو ہی اختیار کرلیا جائے جس سے ہم کو کچھ تھوڑا بہت تعلق تو ہی۔

ایک اور ضرورت ملکی۔ قومی اور اسلامی یہ ہی کہ ایک دائرۃ المعارف ترتیب دی جائے جو ہندوستان اور اسلام کے متعلق جملہ مضامین پر حاوی ہو۔ یہ برسوں کا کام ہی۔ اور صرف قابل ترین لوگ اس کو سرانجام دے سکتے ہیں۔ ایک دائرۃ المعارف اس وقت انگریزی میں (Everyman's Library) کے نام سے تیار ہو رہی ہی جس کے بانی ہوٹ زما۔ آرنلڈ اور شافے ہیں۔ لیکن یہ ہمارے مطالب کے لحاظ سے بیکار اور غیر موزوں ہی۔ میں اُن کتابوں کا عدم اُن کے وجود سے بہتر سمجھتا ہوں جن میں تعریف کے پردہ میں ہر صفحہ پر ہندوستان اور اسلام کی ہجو ملیح کی جاتی ہی۔

ایک اور ضرورت یہ ہی کہ بہترین موجودہ اُردو کتب کو جو مختلف مضامین سے متعلق ہوں انتخاب کرکے ایک سلسلہ قرار دیا جائے اور (Encyclopedia of Islam) کی طرح سَو کتابوں کا ایک انتخاب شدہ کتب خانہ شایع کیا جائے۔

ایک اور ضرورت یہ ہی کہ اُردو ادب کو انگریزی اور دیگر السنۂ ہند مثلاً مرہٹی بنگالی میں ترجمہ کیا جائے اور ملک کے اور علوم ادب کا اُردو میں ترجمہ کیا جائے۔ اہلِ بنگال نے اپنے بہت سے مصنفین کی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہی اُن کی مثال قابلِ تقلید ہی۔ جب تک یہ نہ ہوگا ہمارے نوجوان اردو کی طرف متوجہ نہونگے۔ کیونکہ ہماری تہذیب اور تعلیم اس قدر پست ہوگئی ہی کہ ہم خودداری کے لئے بھی دوسروں کی ترغیب اور توصیف کے محتاج ہیں۔ دویم اُس علمی دنیا میں نکلنا بھی ضروری ہی۔ جو گھر کی چار دیواری میں مقید نہیں بلکہ اقصائے عالم پر محیط ہی۔ یہ ایک قسم کا تبادلۂ خیالات ہی جو قوموں کے لئے ایسا ہی ضروری ہی جیسا کہ افراد کے لئے۔

اب وہ وقت آگیا ہی کہ انجمن ترقی اُردو اپنا رسالہ جاری کرے۔ اُس وقت ہندوستان میں اُردو کے ایک

نہایت اعلیٰ پایہ کے رسالہ کی اشد ضرورت ہے۔ آج کوئی بھی رسالہ ایسا نہیں جس کو اُردو زبان کا نمائندہ کہا جاسکے۔

لیکن یہ جملہ اُمور اور فی زمانا علوم کو فروغ دینا کسی ایک فرد یا چند افراد کا کام نہیں۔ ورنہ مولوی عبدالحق صاحب بی اے اور اُن کے ہمراہیوں نے کون سا دقیقہ فروگزاشت کیا ہے۔ جب تک یہ کام ایک باقاعدہ جماعت کے سپرد نہو جس کے اراکین شب و روز ان ہی فکروں میں منہمک رہیں۔ اور جس کے پاس کافی بلکہ وافر سرمایہ ہو اس کا تکمیل پانا ناممکن ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ شب بیدار مُصنف اپنا چراغ جلائے کتابیں لکھا کرتا تھا۔ اب بھی ایسی کتابیں لکھی جاتی ہیں لیکن بالعموم علمی تصانیف کا رنگ اب بدل گیا ہے۔

جس طرح اقتصادیات میں ہم دیکھتے ہیں کہ تجارت و حرفت و صنعت میں انقسام محنت سے کام لیا جاتا ہے۔ تصنیف میں بھی اب یہی کیفیت ہے۔

مسٹر مرے نے اپنی طویل عمر کا ایک کثیر حصّہ صرف کردیا ہے اور بیسیوں اشخاص ایک مرتب محکمہ کی حیثیت سے شب و روز اُن کی مدد کرتے رہے تب جا کر مرے ڈکشنری جو ایک جامع لغت ہے تیار ہوئی۔ امیر مینائی کی لغت باب الف سے آگے نہ بڑھنے پائی۔ اگر اُن کی عمر وفا کرتی اور وہ دس سال بھی زندہ رہتے تو دال (د) ذال (ذ) سے آگے نہ بڑھ سکتے تھے۔

یورپ میں ہر علم کی شاخ پر بہترین کتابیں یوں لکھی جاتی ہیں کہ کتاب کو مختلف ابواب میں تقسیم کرکے ایک ایک باب ایک ایک ماہر کے سپرد کیا جاتا ہے جن میں سے ہر ایک کو نہایت معقول معاوضہ دیا جاتا ہے۔ جب سب باب مکمل ہوجاتے ہیں تو چند اراکین کی ایک مجلس ان تمام تحریرات کی قطع و بُرید کرکے بالآخر ان کو وصل دیدیتی ہے۔ اور چند سال میں کتاب تیار ہوجاتی ہے۔

اگر آپ کسی رصدگاہ میں جائیں تو تحقیقات کے شعبے میں آپ ملاحظہ کرینگے کہ تیس تیس اور پچاس پچاس حساب دانوں اور مددگاروں کا عملہ ایک عالم کی زیرنگرانی حسابات اور اندازوں میں شب و روز مصروف ہے قاعدہ یہ قرار پایا گیا ہے کہ ہر نئے فلکی منظر کے متعلق تمام دنیا کی رصدگاہیں اور تمام منجم اپنی تحقیقاتیں ایک منتخب شخص کے سپرد

کردیتے ہیں اور اُس کو رصدگاہ اور بہت بڑا عملہ مددگاروں کا دیا جاتا ہے اور پندرہ بیس برس میں نتیجہ کو شایع کرتا ہے لیکن جہاں اہلِ کمال آشفتہ حال پھریں اور جہاں کوئی ایسا ذریعہ نہ ہو جو اُن کی کوششوں کو مجتمع کرسکے کے ان تمام کاموں میں سے جن کا میں نے شروع سے ابتک ذکر کیا ہے ایک بھی ممکن نہیں -

جب لوگ اپنی قابلیتوں کا اندازہ لگاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ معمولی محنت سے جس کے لیئے دماغی انہماک اور شب و روز کی علمی جد وجہد کی کوئی ضرورت نہیں - کثیر دولت پیدا کرنا ملازمتوں اور پیشوں میں ممکن ہے اور برخلاف اس کے علمی کاوش اور کاہش کا نتیجہ غربت کی زندگی اور کس مپرسی ہے تو ان کا خود کو فروخت کرنا کونسی عجیب بات ہے -

یہ تمام نقوش رُخِ قرطاس سے روئے کار جب ہی آسکتے ہیں کہ ایک ''اقادیمیہ'' کی بنیاد قایم ہو جس میں علماء کی ایک معتدبہ جماعت تفکرات دنیا اور مصائب معیشت سے آزاد شب و روز کام میں مشغول رہے یہ کام چندوں سے ہونا قطعاً ناممکن ہے - یہ صرف ایک طریقہ سے امکان میں ہے اور وہ طریقہ وہی ہے جس سے دنیا میں ''اقادیمیہ فرانس'' کی بنیاد پڑی تھی یعنی کوئی حکومت اس کی بانی کفیل و سرپرست ہو -

اللہ بس

شاہنامہ کی نظم کے اسباب اور زمانہ

(از جناب محمود خاں شیرانی صاحب)

بڑے کاموں کی ابتدا چھوٹی باتوں سے ہوا کرتی ہے۔ یہ انگریزی مثل ہمیں شاہنامہ کی نظم کے اسباب قلمی کرتے وقت بے اختیار یاد آجاتی ہے ایک اندھیری رات فردوسی کے نیند نہ آنے کے واقعہ کو دیکھو اور ادھر شاہنامہ کے چاروں ضخیم مجلدات کا مع ساٹھ ہزار اشعار کے خیال کرو جن پر اس نے اپنی عمر کے تین ۳ پینتیس ۳۵ سال صرف کئے شاہنامہ کی نظم فارسی زبان اور شاعری کی تاریخ میں ایک نہایت عظیم الشّان واقعہ ہے اتنے بڑے واقعہ کا ایک رات کی کچھ دیر کی بدخوابی سے بادی النظر میں کوئی تعلق تسلیم نہیں کیا جا سکتا لیکن دعوے سے کہا جاتا ہے کہ یہی خفیف واقعہ عظیم الشّان شاہنامہ کی تصنیف کا ذمّہ دار ہے۔

ان واقعات کے بیان کرنے کے لئے ہم کو طوس کے ایک باغ کا تصوّر کرنا چاہیئے جس میں فردوسی لیٹا ہوا ہے۔ باغ سے ملحق فردوسی کا مکان ہے جہاں اُس کے اہل وعیال ہیں رات نے اپنی چھاؤنی چھا دی ہے اس کا منظر بھیانک اور وحشت ناک ہے اس منظر کو میں فردوسی کے ہی الفاظ میں دکھانا چاہتا ہوں۔

رات نے قیر میں اپنا منہ دھو لیا تھا فلک پر نہ مریخ وعطارد تھے نہ زحل ماہِ نو نے انوکھی وضع کی آرایش پیش کی ابتدا شب ہی سے رخصت کی طیاریاں کریں اس کی کمر باریک تھی اور سنہری تاج لاجوردی ہوا میں گرد کے زنگار بھل چکے تھے تاریک شب نے دشت وراغ پر سیاہ فرش بچھا دیا تھا واہمہ نے شیاطین جو کالے ناگ کی طرح منہ کھولے تھے آنکھوں کے روبرو کھڑے کر دیئے تھے ہوا کی سنسناہٹ سے معلوم ہوتا تھا کہ زنگی کوئلوں کی گرد اچھال رہا ہے چمن زار اور جوئبار سے سیاہی کی موجیں اٹھ رہی تھیں آسمان ساکت آفتاب بے دست وپا اور زمین سیاہ گوں چادر سے منہ چھپائے سرگرم خواب تھی جہان کے دل پر ہراس غالب

گھڑیالی وقت سے بے خبر سنسانی اور ہُو کا عالم نہ پرندوں کی چیخ اور نہ درندوں کی للکار بُری بھلی بات سے زمانے کی زبان پر مہر سکوت نشیب و فراز اور ان کی ہستیاں مفقود۔

ایسی اندھیری رات فردوسی تنہا باغ میں سو رہا تھا لیکن کسی نامعلوم وجہ سے اس کو نیند نہیں آئی ہرچند چاہا کہ سو رہے مگر سونا مُیسّر نہ ہُوا جب وحشت زیادہ غالب ہوئی تو گھبرا کر اس نے اپنی بیوی کو آواز دی جو باغ سے ملحق مکان میں سو رہی تھی وہ بیدار ہو کر باغ میں آئی فردوسی نے چراغ لانے کی فرمایش کی اس نے حیرت کے لہجے میں کہا تم کو آج رات کیا ہو گیا ہی سو کیوں نہیں جاتے اور بھلا اتنی رات گئے چراغ کا کیا ہو گا یہاں اس استفسار کا یہی جواب تھا کہ سو کیسے جاؤں نیند تو آتی ہی نہیں اگر چراغ لے آؤ تو مہربانی ہو گی۔ الغرض چراغ اور چراغ کے ساتھ کسی قدر فواکہات اور ایک جام شراب بھی لایا گیا۔ کچھ دیر شراب اور موسیقی ساز سے دل بہلایا گیا اس کے بعد یہ عورت (جس کو مولانا شبلی منظورِ نظر اور میں بیوی کہتا ہوں اس لئے کہ شاعر اگرچہ اس کو محبت کے الفاظ سے عموماً یاد کرتا ہی لیکن ساتھ ہی ایسے الفاظ بھی استعمال کرتا ہی جو اس زمانہ میں ایک بیوی کے لئے مخصوص تھے مثلاً مہربان یار مہربان جُفت) ہمارے شاعر سے کہتی ہی کہ اگر تمہاری خوشی ہو تو دفتر باستان سے میں تم کو ایک ایسی داستان سُناؤں جو رزم بزم فریب اور محبت کے واقعات پر مشتمل اور سنجیدہ اور خردور لوگوں کے ذکر سے مملو ہی جس کے سننے سے تم کو آسمان کی نیرنگیوں پر حیرت ہو گی فردوسی نے اصرار سے کہا کہ اے ماہرو آج کی رات یہ داستان تم ضرور مجھکو سُناؤ اس سے میری پریشان طبیعت کو سکون حاصل ہو گا بیوی نے کہا میں یہ داستان سُنانے کے لئے طیار ہوں مگر تم اقرار کرلو کہ سننے کے بعد اس کو نظم کر دوں گا فردوسی نے جواب میں کہا مجھکو منظور ہی۔ یہ قصّہ جس طرح میں تم سے سنوں گا اسی طرح اس کو نظم کر دوں گا۔ اے نیکی شناس مہرباں جفت میں تمہارے اس خیال دلانے کا خدا سے شکر کرتا ہوں فکرِ شعر میں مجھکو مزے سے نیند بھی آجائے گی۔

ان مبادیات کے بعد یہ داستان سُنائی گئی یہ خوش قسمت داستان جو اُس رات فردوسی نے اپنی بیوی کی زبان سے سُنی داستان **بیژن** تھی اس کے واقعات کا تار و پود کچھ اس قسم کا ہی جو ایک عورت کی پسندیدگی کو ضرور اپنی طرف مائل کرتا ہی کیوں کہ صنف لطیف کی تحسین تسخیر کرنے کے تمام عناصر اس میں موجود ہیں۔

نوجوان بیژن جس کے چہرہ پر ابھی اچھی طرح خط بھی نکلنے نہیں پایا ہی کیخسرو کے دربار سے بیڑہ اُٹھا کر دشت ارمان

(آرمینیا) میں جنگلی سُوروں کے نیست کرنے کے لئے رخصت ہوتا ہی اس کے ہمراہ گرگین جیسا دغا باز اور کینہ پرور رفیق کر دیا جاتا ہی بیژن جب اس مہم میں کامیاب ہو کر سوروں کی دانتیاں جمع کر لیتا ہے تو گرگین کو اس پر حسد ہوتا ہے کہ یہ طفل دربار میں سُرخرو ہوگا اور میں کورا رہ جاؤں گا چنانچہ وہ بیژن کی شہرت خاک میں ملانے کے لئے فریب کا جال گانٹھتا ہی اور اطلاع دیتا ہی کہ یہاں سے ایک دو روز کے فاصلے پر ایک خوشنما مرغزار ہے جہاں تورانی لڑکیاں اکثر موسم بہار میں بغرض تفریح آتی اور دنوں تک رہتی ہیں افراسیاب کی بیٹی خوبصورت منیژہ بھی ہر سال آیا جایا کرتی ہی آج کل بہار کا موسم ہے اور تورانی عورتوں کی آمد کا زمانہ تمھیں منظور ہو تو ہم تم چل کر کچھ عورتیں پکڑ لائیں اور ایران لے چلیں اس میں ہماری ناموری ہوگی سادہ لوح بیژن اس دام میں پھنس جاتا ہی کہ یہاں گرگین ایرانی سرحد پر جاکر ٹھہر جاتا ہے اور بیژن تن تنہا تورانی علاقہ میں گھس جاتا ہی وہ بہت جلد ایک چشمہ سار پر پہونچ جاتا ہی اور تمام جنگل کو پریزادوں کا اکھاڑہ پاتا ہی منیژہ ہمارے پہلوان کو اتفاقیہ دیکھکر فریفتہ ہو جاتی ہے اور دایہ کی معرفت بیژن خیمے میں بُلوا لیا جاتا ہی۔ چوں کہ شہزادی بالکل مفتون ہو چکی تھی اس لئے مُفارقت کی تاب نہ لاکر جاتے وقت بیژن کو بیہوش کر کے اپنے ساتھ عماری میں لٹاکر توران لے جاتی ہی اور اپنے باپ افراسیاب کے محل میں کئی روز تک خفیہ رکھتی ہی شدہ شدہ یہ خبر افراسیاب تک پہونچ جاتی ہے اور وہ کرسیوز کی معرفت بیژن کو گرفتار کرا کر پیران ویسہ کی سفارش پر قتل سے باز آکر ایک کنوئیں میں قید کر دیتا ہی۔ منیژہ کی جائداد ضبط اور محل لُٹا دیا جاتا ہے اور فقیرانہ لباس میں شاہی قصر سے نکال دی جاتی ہی اب شہزادی اپنی اوقات گداگری کر کے بسر کرتی ہی وہ اسی کنوئیں پر رہتی ہے جس میں بدنصیب بیژن قید ہی اور وہی روٹی جو در در بھیک مانگ کر لاتی ہے اس سے اپنا اور قیدی کا پیٹ پالتی ہی گرگین ایران میں واپسی کے بعد بیژن کی غیر حاضری کا کوئی معقول عُذر بیان نہیں کرتا اس لئے قید کر لیا جاتا ہی اور کیخسرو جام جہاں نما کے ذریعہ سے بیژن کی قید کے حالات سے آگاہی حاصل کرتا ہی گیو بیژن کا باپ رستم کی طلبی کو نیمروز جاتا ہے رُستم ایران آکر سات پہلوانوں کو ہمراہ لے کر تاجرانہ بھیس میں توران مع گرگین بغرض رہائی بیژن پہونچتا ہے منیژہ اپنی رسائی رستم تک کر لیتی ہی رستم اس کی معرفت بیژن کے لئے کھانا جس میں اپنی انگشتری چھپا دیتا ہی بھیجتا ہے بیژن اس انگوٹھی کو پہچان کر سمجھ لیتا ہے کہ رستم اس کے چھڑانے کے لئے آگیا ہے اور منیژہ سے راز فاش نہ کرنے کی قسم لے کر رُستم کی آمد سے اس کو آگاہ کر دیتا ہی رُستم منیژہ کی نشاندہی

کے بعد ایک شب اس کنوئیں پر پہونچکر بیژن کو کنوئیں سے نکال لیتا ہے اب رُستم اپنا تاجرانہ لباس اُتار کر اصلی شکل میں پہلوانوں سمیت افراسیاب کے محل میں گھُس جاتا ہے شاہ افراسیاب رُستم کی آواز پہچان کر بھاگ جاتا ہی شاہی محل ایرانی پہلوان لوٹ لیتے ہیں اور ایران کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں دوسرے روز ان کے تعاقب میں افراسیاب لشکر لے کر آپہونچتا ہی سخت معرکہ کے بعد جس میں رُستم ظفریاب ہوتا ہی افراسیاب لوٹ جاتا ہی اور رُستم مع بیژن و منیژہ ایران پہونچ جاتا ہی۔

فردوسی نے اس داستان کو جو بسبیل اختصار درج عنوان ہوئی ہے اپنی بیوی کی خاطر نظم کا لباس پہنا دیا ہے میں اُس تمہید کے درج کرنے کا بھی موقع فروگذاشت نہیں کرنا چاہتا جو اس داستان کے زیبِ عنوان ہی۔ وہو ہذا

ستایش کنم ایزدِ پاک را   که گویا و بینا کند خاک را   بویژه دهد مالشِ نرّه شیر   کند پشّه بر پیلِ جنگی دلیر
شبے چوں شبه روئے شسته بقیر   نه بهرام پیدا نه کیواں نه تیر   دگرگونه آرائشے کرده ماه   بسیج گذر کرد بر پیشگاه
شده تیره اندر سرائے درنگ   میاں کرده باریک و دل کرده تنگ   ز تاجش سه بهره شده لاجورد   سپرده هوا را بزنگار گرد
سپاه شب تیره بر دشت و راغ   یکے فرش افگنده چوں پرِّ زاغ   چو پولاد زنگار خورده سپهر   تو گفتی بقیر اندر اندوده چهر
نمودم ز هر سو سیه اهرمن   چو مارِ سیه باز کرده دهن   هر آنگه که بر زد یکے باد سرد   چو زنگی برانگیخت زانگشت گرد
چناں گشت باغ و لب جویبار   کجا موج خیزد ز دریائے قار   فرومانده گردونِ گرداں بجائے   شده سست خورشید را دست و پائے
زمیں زیر آنجا در قیرگوں   تو گفتی شدستی بخواب اندروں   جهاں را دل از خویشتن پر هراس   جرس برگرفته نگهبانِ پاس
نه آوائے مرغ و نه هرائے دد   زمانه زباں بسته از نیک و بد   نه پیدا نشیب و فراز   دلم تنگ شد زاں درنگ دراز
بداں تنگی اندر بجستم زجائے   یکے مهرباں بودم اندر سرائے   خروشیدم و خواستم زو چراغ   درآمد بتِ مهربانم بباغ
مرا گفت شمعت چه باید همی   شبِ تیره خوابت نیاید همی   بدو گفتم اے بت نیم مرد خواب   بیاور یکے شمع چوں آفتاب
بنه پیشم و بزم را ساز کن   بچنگ آر چنگ و می آغاز کن   برفت آں بتِ مهربانم زباغ   بیاورد رخشنده شمع و چراغ
مے آورد و نار و ترنج و بهی   زدوده یکے جامِ شاهنشهی   گهی مے گسارید و گه چنگ ساخت   تو گفتی که هاروت نیرنگ ساخت
دلم بر همه کام پیروز کرد   شب تیره همچوں گه روز کرد   مرا مهرباں یار بشنو چه گفت   ازاں پس که گشتیم با جام جفت
مرا گفت آں ماه خورشید چهر   که از جانِ تو شاد باد آسپهر   بپیمائے تا من یکے داستاں   ز دفتر برت خوانم از باستاں

مرا امشب این داستان باز گوی　　بدان سرو بن گفتم ای ماہ روی　　ہمہ از در مرد فرہنگ و سنگ　　پر از چارہ و مہر و نیرنگ و جنگ

بخواں داستان و بیفزای مہر　　بگفتم بیار ای مہ خوب چہر　　بشعر آری از دفتر پہلوی　　مرا گفت کز من سخن بشنوی

ایا مہربان یار پیراستہ　　ز تو طبع من گرد د آراستہ　　شب تیرہ ز اندیشہ خواب آیدم　　مگر طبع شوریدہ بکشایدم

ایا مہربان جفت نیکی شناس　　بگویم پذیرم ز یزداں سپاس　　بشعر آورم داستاں سربسر　　چناں چوں ز تو بشنوم در بدر

خرد یاد دار و بدل ہوشیار　　بگفتار شعرم کنوں گوش دار　　ز دفتر نوشتہ گہ باستاں　　بخواند آں بت مہربان داستاں

اس تمہید کو غور سے پڑھنے کے بعد ہم یہ رائے قایم کرتے ہیں کہ فردوسی نے سب سے پیشتر داستان بیژن نظم کی تھی نیز یہ کہ وہ شاہنامہ کی نظم کا پختہ فیصلہ کرنے کے بہت زمانہ قبل اس داستان کو نظم اور شائع کر چکا تھا کہ یہ داستان بیژن کی عام قبولیت اور شہرت تمام شاہنامہ کی تصنیف کی اصلی اور قدیمی محرک ہی پیشتر اس کے کہ ہم اپنے دعوے کی تائید کے لئے شہادت اور براہین پیش کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند الفاظ: دفتر باستان اور داستان بیژن کی تعلقات کی بابت کہے جائیں۔

دفتر باستان یا نامۂ خسرواں یا دفتر پہلوی بروئے شاہنامہ ایک کتاب کا نام ہے جو فردوسی کے زمانہ سے دو ہزار سال قبل تصنیف ہو چکی تھی وہ شاہان ایران کی تاریخ تھی بعد میں اصلی نسخہ غائب ہو گیا لیکن اس کے اجزا جن میں علیحدہ علیحدہ داستانیں پائی جاتی تھیں موبدوں کے پاس ملتے رہی یہ اجزائے پریشان غالباً عہد یعقوب بن لیث صفار میں بادارت ابو منصور المعمری دوبارہ تدوین کئے گئے یہ طیار شدہ نسخہ شاہنامہ کا اصلی ماخذ ہی اگرچہ بعض واقعات فردوسی نے دیگر ذرائع سے بھی نقل کر دیئے ہیں دوستان بیژن بھی اسی نامہ خسروان یا دفتر پہلوی کی ایک کڑی ہی جس کا ماخذ یہی کتاب ہی یہاں مجھکو اس مغالطہ کا بھی ذکر کر دینا چاہیئے جو علامہ شبلی کو ہو گیا ہی وہ فرماتے ہیں کہ داستان بیژن کے واقعات فردوسی کو اس کی ایک منظورِ نظر نے مہیا کئے تھے حالاں کہ فردوسی اس موقع پر صاف صاف کہتا ہی۔

بخواند آں بت مہربان داستاں　　ز دفتر نوشتہ گہ باستاں

وہ کہانی اس نے اس قدیم کتاب سے پڑھکر سنائی۔

ان مراتب کے بعد داستان بیژن کی اوّلین نظم ہونے کے بارہ میں ذیل کے مشاہدات ناظرین کے پیش کئے

جاتے ہیں۔

(۱) ایسا معلوم ہوتا ہی کہ فردوسی اس خاص رات تک داستان بیژن اور دفتر پاستان سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتا تھا کیوں کہ جس اشتیاق سے وہ اس قصہ کے سننے پر آمادگی ظاہر کرتا ہی اس سے یہی عقیدہ مترتب ہوتا ہے نیز قصہ کے ذکر کے وقت فردوسی کی بیوی اس کے بعض خط و خال بیان کرتی ہی چنانچہ ؎

به پیمائے تا من یکے داستاں — ز دفتر برت خوانم از پاستاں

پراز چارہ و مہر و نیرنگ و جنگ — ہمہ از در مرد فرہنگ و سنگ

کہ چوں گوش نہ از گفت من یافت برخ — شگفت اندر و مانی از کار چرخ

(۲) فردوسی اگر اس وقت شاہنامہ کی نظم پر مصروف تھا تو ضرور تھا کہ اس داستان سے واقف ہوتا اگر واقف تھا تو دوبارہ سننے کی ضرورت نہیں تھی اور جب اس کی بیوی کو علم تھا کہ وہ شاہنامہ ہی پر کام کر رہا ہی تو اس داستان کے نظم کرنے کی فرمائش نہ کرتی کیوں کہ اپنے وقت پر اس داستان کی بھی باری آجاتی۔

(۳) داستانوں کی نظم کے اسباب فردوسی عام طور پر بیان نہیں کرتا اگرچہ ان کا ماخذ یا راوی وہ اکثر بتا جاتا ہے۔ چوں کہ اس نظم کے وقت واقعات غیر معمولی تھے اس لئے تاریخی دلچسپی کے لحاظ سے تمہید میں انھیں بالتفصیل ذکر کر دیا۔

(۴) فردوسی کا سکہ بحیثیت رزم نگار ہمارے قلوب پر شاہنامہ کی وجہ سے جما ہوا ہی اس صنف سخن میں شاہنامہ کے سوا کوئی اور تصنیف اس کی طرف منسوب بھی نہیں کی جاتی پھر وہ کیا مخفی وجوہ تھے جن کی بنا پر شاہنامہ کی تنظیم کا مستقل ارادہ کرنے سے ایک عرصہ پیشتر اس کے معاصرین میں فردوسی کی رزمیہ شاعری کی شہرت قایم ہو چکی تھی جس کی صدائے بازگشت ہم دیباچہ میں دیکھتے ہیں جہاں فردوسی کا ایک دوست اس کے ارادہ کو مستقل اور نیت کو مستحکم کرنے کی غرض سے کہتا ہی ؎

کشادہ زبان و جوانیت ہست — سخن گفتن پہلوانیت ہست

تم جوان اور طلیق اللسان ہو اور رزمیہ شعر خوب لکھتے ہو۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ شہرت فردوسی نے داستان بیژن کی بدولت پیدا کی تھی جو اس زمانہ سے بہت پیشتر شائع ہو چکی تھی۔

(۵) تمہید کی ابتدا میں حمد کے اشعار کا یہی مفہوم ہو سکتا ہے کہ داستان بیژن علیحدہ لکھی گئی تھی۔

(۶) اگر داستان بیژن اور داستانوں کے بعد اپنی ترتیب اور وقت پر لکھی جاتی تو گزشتہ ربط کی یاد دہانی کی غرض سے فردوسی یہ تمہیدی ابیات ہرگز نہ لکھتا ؎

چو کیخسرو آمد بکیں خواستن — جہاں ساز نو خواست آراستن

ز توراں زمیں گم شد آں تخت و گاہ — برآمد بخورشید بر تخت شاہ

بہ پیوست با شاہ ایراں سپہر — برآزادگاں بر گستر د مہر

گزشتہ داستانوں میں ہم کیخسرو اور افراسیاب کے تعلقات سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں اشعار بالا میں ان تعلقات کی طرف تلمیح کرنا محض تحصیل حاصل معلوم ہوتا ہے۔

(۷) فردوسی کا عام قاعدہ ہے کہ خط کی ابتدا میں حمدیہ ابیات ضرور لایا کرتا ہے داستانہائے ماقبل بیژن نامہ سے چند خط بیان کیے جاتے ہیں۔

(۱) نامہ منوچہر نزد فریدوں (۲) نامہ منوچہر با سر سلم (۳) نامۂ زال بہ سام (۴) نامۂ سام نزد منوچہر (۵) نامۂ رستم بزال در پیروزی کوہ سپند (۶) پاسخ نامہ رستم از زال (۷) نامہ ہشنگ بکیقباد (۸) نامہ کاؤس شاہ مازندراں بدست رستم (۹) نامہ کاؤس شاہ مازنداں (۱۰) نامہ رستم بہ شاہ ہاماوراں (۱۱) نامۂ سیاوش بکاؤس بدست رستم (۱۲) پاسخ نامۂ سیاوش (۱۳) نامۂ افراسیاب بسیاوش (۱۴) نامۂ سیاوش با فراسیاب (۱۵) نامۂ رستم نزد کیخسرو (۱۶) پاسخ نامہ رستم از کیخسرو۔

یہ تمام خطوط جو داستان بیژن سے پیشتر شاہنامہ میں ملتے ہیں حمد الٰہی سے مزین ہیں داستان بیژن میں بھی کیخسرو ایک لمبا چوڑا خط بیژن کے بارہ میں رستم کے نام لکھتا ہے۔ لیکن حمد کا ایک شعر بھی نہیں ملتا اس کی وجہ یہی ہے کہ اس وقت تک فردوسی اپنا انداز خاص قایم نہیں کر چکا تھا۔

(۸) فردوسی اختصار پسندی کے لئے مشہور ہے یہ اس کی نمایاں خصوصیت ہے وہ متاخرین شعرا کی طرح اپنے مضمون کو توسیع دینا پسند نہیں کرتا جس کے وجوہ یہ ہیں کہ اس نے پچاس اڑتالیس برس کی عمر میں شاہنامہ پر ہاتھ اٹھایا جبکہ اس کی عمر کا بہترین زمانہ گزر چکا تھا موت اور بڑھاپا سر پر کھڑے تھے ادھر شاہنامہ کوئی چھوٹی سی چیز نہیں بھی وہ بجائے خود ایک عمر کا کام تھا نیز فردوسی اپنی وفات سے پیشتر اس کے ختم کرنے کا متمنی تھا ایسی صورتوں میں بس یہی ممکن تھا کہ غیر ضروری شاعری لفاظی اور زبان آرائی کو بالائے طاق رکھکر نفس مطلب سے تعلق رکھے اور جہاں تک

ہو سکے مختصر لکھے اس طرح یہ اختصار پسندی اس کے عام مذاق کا ایک نمایاں جوہر ہو گئی جو شاہنامہ میں عموماً من اوّلہٖ
الیٰ آخرہٖ مشاہدہ کی جاتی ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ داستان بیژن میں ہمارا شاعر خلاف معمول بعض موقعوں پر بلا
ضرورت اپنی چادر پھیلا رہا ہے دُور کیوں جایئے تمہید کے ان اشعار کو دیکھئے جن میں شاعر نے رات کا منظر دکھایا
ہے یہ طرز ادا جامی یا نظامی کی معلوم ہوتی ہے نہ فردوسی کی جس کے لئے پندرہ شعر رات کا سماں بیان کرنے میں صرف
کئے جائیں یہ ابیات اس شعر سے شروع ہوتے ہیں۔

شبے چوں شبہ روی شستہ بقیر　　　نہ بہرام پیدا نہ کیواں نہ تیر

فردوسی کے زمانہ میں یہ اشعار اس کی شاعری کا بہترین نمونہ مانتے گئے ہیں۔ فردوسی کا اوّلین مقلد اسدی
دل کھول کر جواب لکھتا ہے میں ابتدا کا شعر یہاں لکھ دینا کافی سمجھتا ہوں۔

شبے بد چو زنگی سیہ تر ز زاغ　　　مہ نو چو در دست زنگی چراغ

آمدم بر سر مطلب فردوسی اسی طرح کیخسرو کے دربار کی کیفیت بیان کرنے میں خلاف توقع زبان آرائی سے
کام لے رہا ہے و ہو ہذا۔

بہ بگماز یکروز بنشست شاد　　　ز گردان لشکر ہمی کرد یاد　　　بدیبا بیاراستہ گاہ شاہ　　　نہادہ بسر بر ز گوہر کلاہ
یکی جام یاقوت پر می بچنگ　　　دل و گوش دادہ بآوای چنگ　　　بزرگاں نشستہ برامش بہم　　　فریبرز و کاوس با گستہم
چو گودرز کشواد و فرہاد و گیو　　　چو گرگین میلاد و شاپور نیو　　　شہ نوذراں طوس لشکر شکن　　　چو فرہاد و چوں بیژن رزم زن
ہمہ بادۂ خسروانی بدست　　　ہمہ پہلوانان خسرو پرست　　　می اندر قدح چوں عقیق یمن　　　بہ پیش اندروں دستۂ نارون
پری چہرگاں پیش خسرو بپائے　　　سر زلف شاں بر سمن مشک سائے　　　ہمہ بزمگہ پُر ز رنگ و نگار　　　کمر بستہ در پیش سالار بار
ز پردہ در آمد یکے پردہ دار　　　بنزدیک سالار شہ ہوشیار　　　کہ بر در بیایند ارمانیاں　　　سر مرز ایران و تورانیاں
ہمی راہ جویند نزدیک شاہ　　　ز راہ دراز آمدہ داد خواہ　　　چو سالار ہشیار بشنید تفت　　　بدرگاہ خسرو خرامید و رفت

بگفت آنچہ بشنید و فرماں گزید　　　بہ پیش اندر آوردشاں چوں سزید

یہی طوالت کا ڈھنگ ہم کیخسرو کے اس خط میں دیکھتے ہیں جو رستم کے نام اور گیو کی معرفت بھیجا گیا ہے اس خط میں
چودہ شعر رستم کی تعریف میں لکھے گئے ہیں اس قدر خوشامد اور تکلف کا کیخسرو کی طرف سے اظہار بیژن کی رہائی کے باب میں

جو رستم کا تواسا بھی ہوتا ہے ہمارے خیال میں شاہانہ متانت اور وقار کا خیال کرتے ہوئے بے موقع معلوم ہوتا ہے لیکن میں اب وہ اشعار نقل کرتا ہوں۔

کہ اے پہلواں زادۂ پرہنر   زگردان گیہاں برآوردہ سر   توئی از نیاگاں مرا یادگار   ہمیشہ کمر بستۂ کارزار

ترا داد کردن بمردی پلنگ   بدریا خروشاں زبیمت نہنگ   دلِ شہریاران وپشتِ کیاں   بفرِ یاد ہرکس کمر برمیاں

جہاں از دیوان مازندراں   بہستی وکندی بدانزا سراں   چہ مایہ سرِ تاجداراں زگاہ   ربودی وبرکندی از پیشگاہ

بسا دشمناں کز تو بیجاں شدہ   بسا بوم وبرکز تو ویراں شدہ   سرِ پہلوانان ولشکر پناہ   بنزدیکِ شاہاں ترا دستگاہ

ہمہ جادواں را شکستی بگرز   بفروختی تاج شاہاں ببرز   چہ افراسیاب وچہ خاقان چین   نبشتہ ہمہ نام تو برنگیں

ہر آں بند کز دستِ تو بستہ شد   کشایندگاں را جگر خستہ شد   کشایندۂ بندِ بستہ توئی   کیانرا سپہرِ خجستہ توئی

ترا ایزد ایں زورِ پیلاں کہ داد   بر وبازو وچنگ فرخ نژاد   بداں داد تا دستِ فریاد خواہ   بگیری برآری ز تاریک چاہ

کنوں ایں یکے کار شائستہ پیش   فراز آمدہ است ایں بشایستہ خویش

اسی طول کلامی کی ایک مثال ہم رستم کی دعایں پاتے ہیں جو دربار میں پہونچکر رستم کیخسرو کے حق میں مانگتا ہے اس قسم کی دعا شاہنامہ بھر میں اپنی آپ نظیر ہے۔

ستایش کناں پیشِ خسرو رسید   کہ ہر وستایش مر اورا سزید   برآورد سر آفریں کرد وگفت   کہ بادی ہمہ سالہ با تخت جفت

کہ ہرمزد بادت بدیں پایگاہ   چو بہمن نگہدار تخت وکلاہ   ہمہ سالہ اردی بہشتت ہژیر   نگہبان تو باد بہرام وتیر

زشہریر بادی تو پیروزگر   بنامِ بزرگی وفر وہنر   ترا باد فرخ سپنا ونژاد   زخورداد باد ابر وبوم شاد

ازآذرت رخشندہ شب ہمچو روز   توشادان وتاج تو گیتی فروز   سفندارمذ پاسبان تو باد   خرد جان روشن روانِ تو باد

درِ ہر بدی بر تو بستہ بواد   وز آبانت ہم کار فرخندہ باد   تن چارپایانت مرداد باد   ہمیشہ تن وبخت تو شاد باد

چو ایں آفریں کرد رستم بپائے   شہنشہ بداد اش برخویش جائے

داستان اکوان دیو میں بھی جو داستان بیژن سے ماسبق داستان ہے کیخسرو رستم کو نامہ بھیجکر بلاتا نظر آتا ہے یہاں قاصد گرگین میلاد ہے اور رستم حسب الطلب شاہی دربار میں حاضر ہوتا ہے یہاں یہ تمام واقعات چند اشعار میں ختم ہو جاتے ہیں اگرچہ مجھکو اندیشہ ہے کہ میرا مضمون اس قسم کی تمثیلات سے دراز ہو جائے گا لیکن میں اپنی حجت کی صحت اور صفائی

ناظرین سے اُس وقت تک تسلیم نہیں کرا سکتا جب تک کہ میں اُن کو فردوسی کے دونوں انداز علیٰحدہ علیٰحدہ مثالوں کے ذریعہ سے نہ سمجھا دوں۔

بروں رفت گرگیں چو باد دماں — دیا ہمچو گوری کہ ترسد زجاں

چو آمد بزابل بر نامدار — بدو داد آں نامۂ شہر یار

تہمتن چو بشنید فرمان شاہ — گرازاں بیامد بداں بارگاہ

ببوسید خاک از بر تخت ردی — ہمہ آفریں خواند بر بخت اوی

چنیں گفت شاہا مراخواستی — کنوں آمدم تاچہ آراستی

اسی طرح ایک اور موقع پر جب کہ ایرانی افواج تورانیوں سے ہزیمت پا کر کوہ ہماون پر محصور ہو جاتی ہیں محصورین کی اعانت کی غرض سے کیخسرو رستم کو زابلستاں سے بلواتا ہے یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ شاعر رستم کی طلبی اور دربار میں حاضری وغیرہ کے واقعات کو نہایت مختصر پیرایہ میں بیان کر دیتا ہے چند آدمی رستم کو پیغام دیتے ہیں کہ

فرستادہ ایم از بر شہریار — کند شاہ ایراں ترا خواستگار

کنوں خیز و پیش شہنشہ خرام — دلیرا یلا پور دستان سام

چنیں گفت رستم گو نیکبخت — کہ جانم فدائی شہ و تاج و تخت

بگفت این و بر رخش رخشاں نشست — بر خسرو آمد دل چہرہ دست

زمیں بوس کرد و ثنا گسترید — بداں ساں کہ او را سزاوار دید

امثلۂ بالا سے جو شاہنامہ سے نقل کی گئی ہیں واضح ہو گیا ہوگا کہ یہ تکلفات اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو پھیلا کر بیان کرنا جو داستان بیژن کے دوران میں دیکھا جاتا ہے فردوسی کا مسترہ انداز نہیں ہے لیکن یہ داستان چوں کہ اس کی کوشش کا پہلا نتیجہ تھی اس لئے جہاں تک ہو سکا شاعر نے اپنے پہلے نمونہ کو نہایت رنگینی اور رونق کے ساتھ پیش کیا۔ سب سے بہتر اور معتبر دلیل داستان بیژن کی قدامت کے حق میں شہادت کلام ہو سکتی ہے اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اگر یہ داستان حقیقت میں قدیم ہے تو اُس کی زبان اور شاہنامہ کی زبان میں یقینی فرق ہونا چاہیئے اور اگر اس فرق

کے دریافت کرنے میں ہم کامیاب ہوگئے تو گویا دوسرے الفاظ میں ہم نے اپنے دعوے کو پایۂ ثبوت تک پہونچا دیا ایک ہی شخص کے دو مختلف زمانوں کے کلام سے مادۂ فارق دریافت کرنا اصولاً اگرچہ مستند آزمائش اور صحیح طریقہ ہے لیکن وہ کثیر مطالعہ کا متقاضی ہی بدقسمتی سے ہم اس آخری شرط کی ایفاے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ نہیں ہوسکتے البتہ سطحی مشاہدہ کے اعتبار پر کہا جاسکتا ہی کہ اس قدر زمانہ گزرنے کے باوجود داستان بیژن میں ایسے آثار موجود ہیں جو فردوسی سے ماسبق اساتذہ دقیقی و رودکی میں پائے جاتے ہیں نمونہ کے طور پر الف زائدہ کا استعمال ملاحظہ ہو ع

نو بہار آمد و بشگفت گل و یاسمنا

یاسمنا کے آخر میں الف زائدہ ہی اور تحسین کلام کی خاطر استعمال ہوا ہی وہ اسم اور فعل دونوں کے آخر میں اضافہ کردیا جاتا تھا. مثلاً دقیقی کا یہ شعر۔

بہ پیش اندر آمد بہ دست اندرا بزہر آبدادہ یکے خنجرا

یا یہ شعر بدوزخ دروں دیدم اہرمنا نیارستمش گشت پیرامنا

یا یہ بیت یکے چارہ باید سگالیدنا وگرنہ رہِ ترک مالیدنا

داستان بیژن اس قسم کی بہت مثالیں پیش کرتی ہے ۔ مثلاً ایک مقام کے یہ تین مسلسل ابیات۔

بایوان افراسیاب اندرا ابا ماہروئے بہ بالیں سرا

بہ پیچید بر خویشتن بیژنا بہ یزداں پناہید زاہرمنا

چنیں گفت کای کردگارا مرا رہائی نخواہد بدن زایدرا

ایک اور موقع پر یہ دو بیت آتے ہیں۔

بپرسش کہ چوں آمدی ایدرا کہ آوردت ایدوں بدینجا درا

پریزادۂ یا سیاوخشیا کہ دل را بمہرت ہمی بخشیا

یا یہ شعر بہر نیکوئی بہرہ وربودیا چناں کز دلم زنگ بزدودیا

اس قسم کی اور مثالیں ہم پہونچائی جاسکتی ہیں اور یہ کہنا مبالغہ میں داخل نہیں کیا جاسکتا کہ تنہا داستان بیژن میں الف تحسین کا استعمال ۳۰ موقعوں پر ہوا ہی جو بجائے خود ایک حیرت میں ڈالنے والا امر ہی شاہنامہ کی ابتدائی

داستانوں مثلاً داستان کیومرث وغیرہ میں بعض موقعوں پر ہم پھر الف تحسین سے دوچار ہوتے ہیں لیکن نہ اس کثرت کے ساتھ وہ بھی بعد تلاش دوچار مقام پر ملتا ہی داستانہائے مابعد میں اس کی حاضری کم سے کمتر ہوتی جاتی ہے حتیٰ کہ اس کی موجودگی غزنوی کلام میں من قبیل شاذ ہی

فردوسی کی ابتدائی اور انتہائی نظموں میں یہ نمایاں تفاوت ناقابل تشریح رہتا ہی اس کی معماکشائی اسی صورت میں ہوسکتی ہی کہ زمانہ کے انقلاب کے ساتھ ساتھ فارسی زبان بھی انقلاب کے تھپیڑوں کا تختہ مشق بن رہی تھی اور زبان میں تغیرات واقع ہو رہے تھے فردوسی ایک باخبر ماہر ہونے کی حیثیت سے ان تغیرات سے ہمیشہ بروقت وقوف حاصل کرتا رہا باغ سخن کا یہ سب سے بہتر ادر ماہر باغبان اپنی جھولی میں وہی پھول چنتا رہا جو سکہ رواں کی فہرست میں شامل تھے اور عدالت سخن سے جو لفظ خاطی اور مجرم قرار دیدیا گیا اُس کو زبردست فردوسی بھی اپنی اقلیم میں پناہ نہیں دیسکتا تھا چنانچہ الف تحسین جس کا داستان شیرین میں فردوسی اس قدر شایق معلوم ہوتا ہی آخر کار اسی فردوسی کا شاہنامہ اس کا گورستان بنا۔

گزشتہ بیانات اور دلائل سے ہم ناظرین کو اس امر کی یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ داستان شیرین محض تفریحاً فردوسی نے اپنی بیوی کی خاطر نظم کردی تھی اور جب اس نظم نے شائع ہو کر قبولیت عام کا خلعت حاصل کرلیا تو دوستوں کی تحسین اور سخن فہموں کے اصرار نے فردوسی کو تمام شاہنامہ کی نظم پر آمادہ کردیا دقیقی کی یاد اندنوں میں تازہ تھی اور اس کے اشعار کا بھی چرچا باقی تھا اُس کی وفات کو کل اُنتیس سال گزری تھے اور فردوسی جیسا کہ ہم کو علم ہی دقیقی کے کلام سے خوب واقف تھا اگرچہ وہ اس کا چنداں قائل نہیں معلوم ہوتا ہے تاہم اس میں شک نہیں کہ شاہنامہ کے معاملہ میں فردوسی دقیقی کا مشکور ضرور رہی فردوسی کو اقرار ہے کہ اس معاملہ میں وہ میرا رہبر تھا۔

ہم او بود گوینده را راہبر

وہ دقیقی کی شہرت سے واقف تھا اور اُس کے نقش قدم چل کر وہی ہر دلعزیزی اپنے لئے حاصل کرنے کا خواہشمند تھا۔ شاہنامہ کی نظم کے خیال سے وہ اپنے وطن سے روانہ ہو کر بخارا پہونچا اس سفر سے اس کا یہی مقصد تھا کہ دفتر پہلوی کا کامل نسخہ پیدا کرے دیباچہ میں چنانچہ کہتا ہی۔

دلِ روشنِ من چو برگشت ازوے   سوِتختِ شاہِجہاں کرد روے

کہ این نامہ را دست پیش آورم ز دفتر بگفتار خویش آورم

اسی غرض سے ہم کو تحقیق معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہرات اور مرد بھی پہونچا ہرات میں پھر خراسان یا بلخ سے کچھ واقعات معلوم کئے مرو میں احمد بن سہل کے ہاں آزاد سرو سے مل کر داستان شغاد حاصل کی اسی غایت سے اس کا گزر بلخ میں بھی ہوا ہی اور کسی موبد سے خسرو پرویز کی گرفتاری کے حالات دریافت کئے۔

چنیں یاد دارم ز موبد بہ بلخ بخسرو چو شد اینجہاں تار و تلخ

یہ شعر میں نے ایک ایسے قلمی شاہنامہ سے لیا ہی جو ۸۲۵ھ میں لکھا گیا تھا۔ الغرض جہاں گیا اپنی تلاش میں سرگرم رہا اور جس سے ملا کچھ نہ کچھ تحقیق اور تفتیش کرتا رہا وہ کہتا ہی۔

بپرسیدم از ہر کسے بے شمار بترسیدم از گردشِ روزگار

اس کے عزم کے خلاف دو زبردست موانع تھے اوّل عمر کی ناپائداری دویم بے دولتی اور ناداری چنانچہ

مگر خود درنگم نباشد بسے بباید سپردن بدیگر کسے

و دیگر کہ گنجم وفادار نیست ہماں رنج راکس خریدار نیست

مزید براں زمانہ میں کچھ ایسی ناموافق ہوا چل رہی تھی کہ ملک بدامنی اور پریشانی میں مبتلا تھا آل سامان اپنے تخت پر کمزور تھے اُن کی غلام اور ماتحت رؤسا ہر طرف سرکش ہو کر خود مختار حکمران بن بیٹھے تھے چاروں طرف فساد اور جنگ کی آتش برپا تھی ۳۵۲ھ میں الپتگین خراساں کو خیرباد کہکر غزنین آچکا تھا سامانی امیر منصور بن عبدالملک نے اس کی ایالت ابوالحسن محمد بن ابراہیم سیمجور کو دیدی تھی اس کے خلف ابوعلی سیمجور نیز فائق نے سامانیوں کے خلاف عرصہ تک علم بغاوت بلند رکھا ان کی سرکوبی کے لئے کئی مرتبہ سامانیوں نے تکلیف کی نیز سبکتگین جانشین بلکاتگین کو بھی اس میں حصہ لینا پڑا ہی محاربات ہوں گے جن کے متعلق شاعر دیباچہ میں اشارہ کرتا ہی۔

زمانہ سرائے پر از جنگ بود بجویندگاں بر جہاں تنگ بود

انھیں ایام میں اس کا دوست جس کو فردوسی مہربان دوست، اور دیباچہ بایسنغری محمد لشکری لکھتا ہے فردوسی سے ملا اور جب فردوسی کے شغل اور ارادہ کی اس کو اطلاع ہوئی تو اصرار کے ساتھ اس امر کے درپے

ہوگیا کہ یہ کام تم کرو تمہاری طبیعت رزمیہ اشعار کے لئے رسا واقع ہوئی ہے تمہاری زبان پاکیزہ ہے اور اپنے اس جوہر سے بادشاہوں کے ہاں اقتدار اور آبرو حاصل کرو پوری کتاب میرے پاس پڑی ہی ہیں دیدوں گا یہ کہکر وہ گیا اور کتاب بھی لے آیا۔ قدردان سرپرست جو فردوسی کے تفقد کرتا بقول دیباچۂ بایسنغری منصور بن محمدؐ کی ذات میں ملگیا اس شریف سردار نے فردوسی کے ذوق کو معلوم کرکے اُس کی ہر قسم کی کفالت کی خدمت اپنے ذمہ لے لی فیاض رئیس جس کی نہایت نرم الفاظ میں فردوسی ثنا خوانی کرتا ہی یکایک موت کا شکار بن گیا۔ موثر الفاظ میں فردوسی نے اس کا مرثیہ دیباچہ میں لکھا ہی مرحوم نے نصیحت کی تھی کہ جب یہ کام ختم ہو تو کسی بادشاہ کے پاس لے جانا وہ اس کی قدر کرے گا اور محنت کی داد دے گا۔

الغرض کچھ ایسے اسباب تھے جنھوں نے فردوسی کو شاہنامہ کی نظم پر آخر کار مستعد کردیا۔ شاہنامہ کی ابتدا کس زمانہ سے ہوئی ہ اس کے متعلق اگرچہ فردوسی نے کوئی تصریحی اشارہ نہیں کیا۔ تاہم بعض ضمنی امور سے ہم اس زمانہ کو متعین کرنے کے قابل ہیں۔

خاتمہ شاہنامہ میں وہ صاف ظاہر کر رہا ہے کہ میں نے کامل پینتیس۳۵ سال اس کی تصنیف میں صرف کئے چونکہ سنہ ۴۰۰ھ میں شاہنامہ ختم ہوا اس لئے ظاہر ہی کہ ۳۶۵ھ میں شاہنامہ کی تعمیر کا پہلا سنگِ بنیاد قایم کیا گیا ہوگا۔

اگر اس شعر پر اعتبار کیا جائے۔

بسے رنج بردم دریں سال سی   عجم گرم کردم بدیں پارسی

تو ۳۷۰ھ شاہنامہ کے آغاز کا سال ٹھہرتا ہی۔

۳۸۷ھ میں سلطان محمود کی تخت نشینی کے ایام میں کہتا ہی ؎

سخن را نگہداشتم سال بیست   بداں تا سزاوار ایں گنج کیست

اس حساب سے ۳۶۷ھ پہلا سال ہی۔

نوشیرواں کی داستان کے ابتدا میں فردوسی کہتا ہی ؎

ہا ہشت بُد عہدِ نوشیرواں[۱]   تو بر شصت رفتی نمانی جواں

---

[۱] عہد نوشیرواں کے دو معنی لئے جاسکتے ہیں یا ایام سلطنت نوشیروان عادل جس نے کہا جاتا ہے اڑتالیس۴۸ سال سلطنت کی یا بڑے کنایہ

(باقی بر صفحہ ۳۹۳)

وہ چھیاسٹھ سال کا ہی تو جب اڑتالیس[۱] سال کا ہوگا تو سن ہجری ۳۷۶ھ ہوگا اور یہ سال آغازِ شاہنامہ ٹھہرتا ہی۔

۴۰۰ھ میں وہ اپنی عمر قریب ہشتاد ظاہر کر رہا ہے

کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد   امیدم بیک بارہ برباد شد

اب اس "نزدیک ہشتاد" سے کونسا سال مانا جائے۔ اُناسی یا اٹھتّر اگرچہ ظاہر ہے وہ اسی سال کا اس وقت نہیں تھا۔ یہ معلوم ہی کہ ۳۹۴ھ میں وہ چھیاسٹھویں سال میں تھا تو ظاہر ہے کہ ۴۰۰ھ میں وہ اپنی عمر کا اٹھتّرواں دَور طے کر رہا تھا۔ اس حساب سے بھی شاہنامہ کی ابتدا کا سال ۳۷۶ھ نکلتا ہی۔

اس تحقیقات نے ہم کو کئی سال دیئے ہیں یعنی ۳۶۵ھ ۳۶۸ھ اور ۳۷۶ھ چوں کہ آخرالذکر سال کئی قرینوں سے برآمد ہوتا ہی اس لئے میں اُسی کے حق میں فیصلہ دیتا ہوں اور ۳۷۶ھ کو شاہنامہ کی باقاعدہ ابتدا کا پہلا سال مانتا ہوں جب کہ فردوسی اپنے "مہرباں دوست" اور منصور بن محمدؐ کی تحسین و ترغیب سے متاثر ہوکر انجام کار شاہنامہ کی نظم پر کمربستہ ہو جاتا ہی۔ داستانِ بیژن ظاہر ہی کہ اس سن سے کئی سال پیشتر لکھی جا کر شائع ہو چکی تھی جس کے جامۂ شعر پہنانے کی اصلی محرک فردوسی کی بیوی ہے۔

میری نگاہ میں یہ نامعلوم عورت نہ صرف بیژن نامہ بلکہ تمام شاہنامہ کی اوّلین محرک ہی۔ شاہنامہ کی اصلی تحریک دہندہ کا احسان اب تک ہماری ادبیات میں ایک نامعلوم کمیت رہی ہے اور اس کا تشکّر ایک فراموش شدہ وام کی طرح اب تک ہمارا بار دوش ہی۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۳۹۲) کوئی زمانۂ امن و آرام ان معنوں میں فردوسی سلطان محمود کی مدح میں لکھتا ہے ع کنوں عہدِ نوشیرواں تازہ شد۔ میں پہلے معنی سے اعراض کرکے دوسرے معنی کو ترجیح دیتا ہوں میرے رُجحان کے موید یہ قرائن ہیں۔ بیت مذکور میں مصرعِ آخر علی الاعلان فردوسی سے تعلق رکھتا ہی جس میں شاعر اپنی عمر کی طرف اشارہ کرتا ہی اس لئے قیاس چاہتا ہی کہ پہلا مصرع بھی فردوسی سے علاقہ رکھے۔ اور جل وحشت سے شاعر کی اپنی عمر کے ایک خاص زمانہ کی طرف تلمیح قایم کی جائے + اس بیت کے اشعار ماقبل سلسلہ وار ہیں جن میں شاعر اپنے متعلق ذکر کرتا ہی۔ ایک تنہا مصرع کو لے کر نوشیرواں کی طرف نسبت دینا مستبعد ضرور معلوم ہوتا ہی۔ اگرچہ اُن اشعار کے سلسلہ کے انقطاع پر نوشیرواں کے حالات شروع ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہی کہ شاعر کی عمر میں جب وہ اڑتالیس[۱] سال کا تھا کوئی خوشگوار واقعہ یا انقلاب ہوا ہی۔ یہ واقعہ ظنِ غالب ہی (کیوں کہ اور کوئی توجیہ قایم ہو نہیں سکتی) شاہنامہ کی نظم کے ابتدا سے تعلق رکھتا ہی۔

*

کلامِ غالبؔ کی بعض خصوصیات

(نمبر ۲)

(از جناب مولوی محمدؐ مہدی صاحب)

فلسفہ و تصوف

یہ مسائلِ تصوّف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں　　غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

مرزا غالبؔ کا فلسفہ و تصوّف خصوصاً فلسفہ وہ امتیازی وصف ہے جس میں شعرائے اُردو میں سے کوئی ان کا ہم سر نہیں۔ تصوّف کے مضامین جیسا کہ مولانا حالیؔ نے یادگارِ غالبؔ میں تصریح کی ہے کہ حقایق و معارف کی کتابیں اور رسالے کثرت سے ان کے مطالعہ کے گزرے تھے ماخوذ و مقتبس کہے جا سکتے ہیں لیکن فلسفہ میں یہ سوائے مبدءِ فیاض کے اور کسی کے ممنونِ احسان نہیں۔ شاذ و نادر ہی اشعار ہیں جو ماخوذ خیال کئے جا سکتے ہیں۔

ہم ذیل میں تصوّف و فلسفہ کے اشعار جس قدر ہمارے خیال سے ان دو موضوع سے تعلق رکھتے ہیں مع ضروری تشریح کے نقل کرتے ہیں لیکن پہلے دو باتیں سمجھ لینی چاہئیں۔

(۱) مرزا صاحب کا کوئی خاص فلسفہ نہیں نہ تصوف میں کوئی خاص مسلک ہے۔ بلکہ وہ آزاد ہیں اور جو مضمون اُن کے ذہن میں آتا ہے وہ نظم کر دیتے ہیں اور یہی امر قابلِ تعریف ہے۔ اسی تنوعِ مضامین کی وجہ سے وہ فلسفی شاعر کہلانے کے مستحق ہیں۔ کوئی شاعر جو محض فلسفہ و تصوف میں سے صرف ایک مسئلہ وحدت وجود یا اپیکورس کا مذہب دکھا پوری کل

تو مرنا ہی ہے) اختیار کرے اور بار بار اسی کو نئے نئے اسالیب سے باندھتا رہے وہ اس لقب کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

(۲) مضامین خواہ فلسفہ و تصوف سے ہوں یا اور کسی علم و فن کے محض اُن کا نظم کر دینا شاعرانہ نقطۂ خیال سے کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ اگر کوئی شخص فلسفہ کے مسائل صرف نظم کرتا ہے خواہ وہ مسائل اُسی کے ایجاد کیوں نہ ہوں وہ بھی شاعر نہیں کہا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ اُس کو "ناظم فلسفی" کا لقب دے دیا جائے۔ ایک فطری شاعر جس علم و فن کے مسائل نظم کرے گا اگر وہ علم و فن اُس کے حصّہ میں آیا ہے تو اُس کا کوئی شعر شاعری کی رُوح سے خالی نہ ہوگا یا اس کی نظر اُنہیں مضامین کو انتخاب کرے گی جو شعر بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اگر شاعری کا تعلق محض الفاظ سے خیال کیا جائے تو ایک فطری شاعر ہر مضمون کو ایسے دل کش و دل نشین انداز سے نظم کرے گا جس سے لوگوں کا فطری ذوقِ شاعری پورا ہو سکتا ہے۔ مرزا غالب کے فلسفہ و تصوف میں جس قدر اشعار ہیں وہ کل اُن کے واقعات زندگی کے شعروں کی طرح شاعری کی رُوح سے خالی نہیں ہیں البتہ رُوح کی کمی بیشی کا فرق ہے بلکہ ان اشعار کو صرف شاعری کی حیثیت سے دیکھنا چاہیئے۔ کیوں کہ میرے خیال ناقص کے مطابق ہر علم و فن جو سطح سے گزر کر تہ تک پہنچ جاتا ہے وہ فلسفہ ہو جاتا ہے۔

اس قدر تمہید کے بعد اب ہم فلسفہ و تصوف کے ہر مضمون کے اشعار علیٰحدہ علیٰحدہ لکھتے ہیں۔

تصوّف

وحدت وجود | یہ مسئلہ شاعری میں بہت مقبول ہے کہ ایک وجود باری تعالےٰ کے سوا کوئی ہستی موجود نہیں۔ یا ایک دریائے وحدت ہے جو کثرت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس کے دو اجزا ہیں ایک یہ کہ کثرت جو نظر آتی ہے وہ محض اعتباری اور وہم و خیال ہے۔ دوسرا جزء یہ ہے کہ دریا ہی دریا ہے موج و حباب کچھ نہیں۔ دیوان غالب میں مرزا صاحب نے اس مضمون کو متعدد اشعار میں مختلف پہلوؤں سے باندھا ہے فرماتے ہیں۔

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر   یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

دریا کا وجود مختلف صورتوں کی نمود پر مشتمل ہے اس لئے خود ان صورتوں یعنی ممکنات کی کوئی ہستی نہیں۔

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی   ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

کتنا ہی کوئی ہستی یعنی موجودات کے حقیقی وجود پر اصرار کرے تم ہرگز نہ ماننا اور ہستی کا فریب نہ کھانا یعنی ان کا

وجودِ حقیقی سمجھکر ان میں گرفتار نہ ہو جانا۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ　　عالَم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

کہتے ہیں خیال نے جو ایک جال بنایا ہے تمام کائنات اسی جال کا ایک حلقہ ہے یعنی محض وہمی و خیالی چیز ہے اس لئے اپنی ہستی کو ہستی نہ سمجھنا۔

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور　　جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

جس طرح عنقا کا نام ہی نام ہے اور اس کی کوئی ہستی نہیں اسی طرح ہم کائنات کا بجز نام کے کوئی وجود تسلیم نہیں کرتے اور موجودات کی ہستی ہمارے آگے سوائے وہم کے اور کچھ نہیں ہے۔

عالَم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر　　کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

تمام عالَم وحشتِ مجنوں کا غبار ہے اسے طرۂ لیلیٰ کب تک خیال کرتے رہیں۔ مطلب یہ کہ کائنات ایک دھوکہ ہے ہم اسے کب تک معشوقِ حقیقی کی جلوہ گری سمجھتے رہیں۔

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود　　ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

اس کی شرح میں ہم "دبستان مذاہب" سے ایک عبارت نقل کرتے ہیں جو ویدانت کے بیان میں ہے۔

"صور و ترکیب و ہیئت چوں سراب و پیکر خواب ست۔ ...... اگر کسے بپرسد کہ ما را در گوہر خود ہیچ شکے نیست از جہت آں کہ یکے دانشمند و یکے نادان و یکے در آرایش و دیگرے بجز راہیں چگونہ خیال و نمایش باشد۔ جواب گویند کہ تو در خواب نہ رفتہ و خود را بادشاہ و فرماں روا و پرستار و فرمان پذیر و گرفتار و آزاد و بندہ و خداوند، بیمار و تندرست، آزردہ و خوش دل و اندوہگیں ندیدہ۔ بسا ہنگام در خواب خوش و فرح یافتہ و بسیار ترس و ہراس بر تو غالب شدہ و رنجہ گشتہ۔ شک نیست کہ آں جملہ خیال و نمایش است آں کہ در خواب است ایں ہمہ را حقیقت می پندارد۔ ... ... ایں کہ تو آں را بیداری می پنداری بزعم گیانیاں آں ہم خواب است و در خواب انگاشتہ کہ بیدار شدم کہ بسا ہنگام در خواب دیدہ می شود کہ بیدار شدم و آنچہ دیدم در خواب بود بر ایں گونہ ایں بیداری نزد بیدار دلاں گیانی خوابے ست۔"

پہلے مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ جس کو شہود سمجھتے ہیں وہ بھی غیب الغیب ہے۔

کثرت آرائی وحدت ہی پرستاری وہم　　کردیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

وحدت کو کثرت میں جلوہ گر سمجھنا نری وہم پرستی ہے لیکن ہم ان اصنام یعنی کثرت کا جسے ہمارے وہم نے پیدا کیا ہی اصلی وحقیقی وجود تصور کرکے کافر ہوگئے کیوں کہ اس صورت میں دوئی ہوئی جاتی ہی۔

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر　　ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ہر قطرہ نعرہ لگا رہا ہی کہ میں دریا ہوں۔ اسی طرح دریائے وحدت کے ایک جزو ہم بھی ہیں ہمارا پوچھنا کیا یعنی ایسی بڑی چیز ہیں جس کا بیان نہیں ہوسکتا۔

شاہدِ ہستی مطلق کی کمر ہے عالم　　لوگ کہتے ہیں کہ ہی پر ہمیں منظور نہیں

کہتے ہیں عالم معشوق حقیقی کی کمر ہے۔ معشوق کی کمر جوں کہ نہیں ہوتی اس لئے عالم بھی معشوق کی طرح ایک فرضی اور موہوم چیز ہے ہم بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں لیکن لوگ جو لفظ "اثبات" (ہی) اس کی طرف منسوب کرتے ہیں یہ ہم پسند نہیں کرتے یعنی کہنا صرف یہ چاہیئے کہ عالم نہیں ہی۔

نہ ہو بہرزہ بیابان نوردِ وہم وجود　　ہنوز تیری تصور میں ہی نشیب فراز

کہتے ہیں تو وجود ما سوائے اللہ کے وہم میں مت پڑ۔ جب تک تو یہ سمجھتا رہے گا کہ وجود کی قسمیں اور مراتب ہیں مثلاً وجوب اور امکان وغیرہ تو اُس وقت تک تیرا خیال ناقص و نامکمل رہی گا۔ حاصل یہ ہے کہ ایک ہستی واجب کے سوا دوسری ہستی نہ سمجھ۔

باوجود یک جہاں ہنگامہ پیدا ہی نہیں　　ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

پروانہ کے دل کی بساط ہی کیا جس کی شبستان کے چراغ کی روشنی ہو۔ کہتے ہیں ہم اسی شبستاں کے چراغ ہیں کہ باوجود جوش ہنگامہ کے کچھ ظہور نہیں۔ حاصل یہ ہی کہ ہستی مطلق کے سوا اور کوئی ہستی نہیں۔

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہی آئینہ　　طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

ذرہ سے آفتاب تک ہر چیز ایک دل ہی اور دل آئینہ ہے اس لئے جب عارف اس عالم کو دیکھتا ہی تو اُسے ہر طرف آئینہ ہی آئینہ نظر آتا ہے یعنی اُس کو نظر آتا ہی کہ ایک ہی ہستی ہے۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود　　پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہی

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں   غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے   نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں   ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

معدومات نہ آپس میں متاثر ہوتے ہیں نہ اُن کی طرف کوئی صفت منسوب ہوسکتی ہے۔ امتیاز اور صفات کا انتساب وجود میں آنے پر ہوتا ہے اس لئے شاعر حیرت کرتا ہے کہ جب کہ تیرے سوا کوئی موجود نہیں ہے سب چیزیں معدوم ہیں تو پھر یہ امتیازات وصفات یعنی پری چہرہ، غمزہ و عشوہ، سبزہ، گل، ابر و باد وغیرہ وغیرہ کیا ہیں۔

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے   ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے

جس بھیس میں جو آئے چاہے واعظ کی صورت میں یا جلاد کی صورت میں ہم سمجھے ہوئے ہیں کہ وہی ایک معشوق حقیقی ہے جو مختلف شکلوں میں نمودار ہوتا ہے۔ پھر ہم کو کسی سے ڈرنے اور جھگڑنے کی کیا وجہ۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن   ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

جو لوگ توحید وجودی کے قایل ہیں ان کا یہ مذہب بھی ہے کہ اگرچہ موج وحباب دریا سے علیحدہ نہیں ہیں لیکن ان کا ایک تشخص وتعین جداگانہ ہے اس لئے جب تک یہ تشخص وتعین قائم ہے اُس وقت تک دعویٰ عینیت کرنا تنک ظرفی ہے اس لئے شاعر کہتا ہے کہ ہم بھی دریائے وحدت میں شامل ہیں اس لئے عین دریا ہیں لیکن جو تنک ظرفی کہ منصور نے کی یعنی انا الحق کا نعرہ لگایا اس کی تقلید ہم پسند نہیں کرتے۔

وحدت شہود   ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں   ہے تجلّی تری سامانِ وجود

وحدتِ وجود کے خلاف ایک خیال یہ ہے کہ موجوداتِ عالم ذات واجب کے عین نہیں بلکہ اظلال و پرتو ہیں جس طرح سورج کی روشنی سے تمام چیزیں ظاہر ہوجاتی ہیں اسی طرح ذات واجب تعالےٰ کے پرتو سے تمام اشیاء وجود میں آگئیں۔ مرزا صاحب نے اس شعر میں یہی مسئلہ بیان کیا ہے اور مثال بھی وہی دی ہے جو وحدت شہود والے دیا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں جس طرح ذرہ کی ہستی آفتاب کے پرتو سے ظہور میں آتی ہے اُسی طرح تیری تجلّی موجودات کا سبب ہے۔

جس کے جلوہ سے زمیں تا آسماں سرشار ہے   ہے وہی بدمستی ہر ذرہ کا خود عذر خواہ

اس شعر میں بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے کہ تمام ممکنات اُسی کے پرتو سے وجود میں آئے ہیں۔

توحید حقیقی | ہر چند ہر ایک شے میں ہے تو — پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

ذات واجب الوجود اور کائنات علیحدہ علیحدہ مستقل ہستیاں ہیں۔ اگرچہ ان میں ایک خالق اور دوسری مخلوق ہی اور پہلی دوسری میں ساری ہی۔ اس شعر سے یہی خیال ظاہر ہوتا ہی۔ مرزا صاحب یہ نہیں کہتے کہ ہر شے تو ہی ہی نہ یہ کہتے ہیں کہ ہر شے تیرا عکس یا پرتو ہے بلکہ دو علیحدہ ہستیاں مان کر یہ شبہ یا حیرت ظاہر کرتے ہیں کہ ہر چند تو ہر چیز میں ہے لیکن جیسا کہ خود تو نے ارشاد فرمایا ہی کہ لیس کمثلہ شئ اس لئے ہر چیز میں ہونے سے تو ویسا ہی ہو جاتا ہی جیسی وہ چیز ہوتی ہی جس طرح پانی کہ جس ظرف میں ہوتا ہی وہی شکل اُس کی ہوتی ہے جو ظرف کی ہی۔

رویت باری | یہ مسئلہ مختلف فیہ ہی کہ ذات واجب الوجود کا مشاہدہ آنکھوں سے ہو سکتا ہی یا نہیں۔ علمائے ظاہر کا عقیدہ ہی کہ اُس ذات واجب تعالےٰ کو اُسی طرح دیکھیں گے جس طرح آفتاب و ماہتاب کو دیکھتے ہیں لیکن اہل باطن اور علمائے محققین کا مذہب لا تدرکہ الابصار ہی رہا ہے۔ مرزا صاحب نے اس آخری خیال کو کئی جگہ ایک سے ایک بڑھکر دلکش انداز سے نظم کیا ہی۔

نظارہ کیا حریف ہو اُس برق حسن کا — جوش بہار جلوہ کو جس کے نقاب ہی

کہتے ہیں قوت باصرہ اس برق حسن کا مقابلہ نہیں کر سکتی یعنی آنکھ اُس شاہد حقیقی کو نہیں دیکھ سکتی۔ دلیل اس کی دوسرے مصرعہ میں ہی کہ جوش بہار نقاب بن گئی یعنی رنگا رنگی نے آڑ کر لی ہی۔

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا — مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

کہتے ہیں تجھے دیکھکر ایسی از خود رفتگی ہوئی کہ اس کے باعث تیرا جلوہ نہ دیکھ سکے جو نگاہ تیرے رخ تک پہنچی وہ مست ہو کر بکھر گئی اس طرح نظارہ نے بھی نقاب کا کام کیا۔

ہنوز محرمی حسن کو ترستا ہوں — کرے ہی ہر بن مو کام چشم بینا کا

کہتے ہیں اگرچہ میرا ہر بن مو چشم بینا کا کام کر رہا ہے لیکن میں اب تک حسن ازلی کے دیدار سے محروم ہوں مطلب یہ ہی کہ انسان سراپا چشم بینا ہو کر دیکھے پھر بھی دیدار حسن سے محروم رہیگا۔

ای دل ناعاقبت اندیش ضبط شوق کر — کون لا سکتا ہی تاب جلوۂ دیدار دوست

کہتے ہیں جلوۂ دیدار دوست کی کوئی تاب نہیں لا سکتا۔ حضرت موسیٰ برق تجلی کی تاب نہ لا سکے اور طور پر غش کھا کر گر پڑے اس لئے اسے دل الخ

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے　　پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

یہ باغ و بہار آفتاب و مہتاب آسمان و زمین جس کی جلوہ گری ہے اسے کوئی نہیں بتا سکتا اُس نے اس نگارنگی اور کثرت کا ایسا پردہ چھوڑا ہے کہ وہ کسی کے اُٹھائے اُٹھ ہی نہیں سکتا۔

وا کر دیئے ہیں شوق نے بند نقاب حسن　　غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

شاہد و مشہود کے درمیان جو نقاب یا حجابات تھے وہ تو شوق نے اُٹھا دیئے اب صرف ایک نگاہ حائل ہے جو دیکھنے کی قابلیت نہیں رکھتی۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے　　حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

جب کہ خود شہود اور شاہد و مشہود ایک ہی چیز ہیں تو پھر میں حیراں ہوں کہ مشاہدہ کیا چیز ہے جس کا لوگ یقین کرتے ہیں کہ قیامت کو یا جنت میں ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ مشاہدہ نہیں ہو سکتا۔

ناکامیٔ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز　　تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

کہتے ہیں ہماری ناکامیٔ نگاہ برق نظارہ سوز بن جاتی ہے اس لئے تو کسی طرح دیکھنے میں آ ہی نہیں سکتا۔

جب وہ جمال دل فروز صورتِ مہرِ نیمروز　　آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

اس مضمون میں اس سے بہتر شعر نہیں ہو سکتا۔ کہتے ہیں وہ حسن دل افروز آفتاب نصف النہار کی طرح خود ہی نظارہ سوز ہے اس لئے اُسے کیا ضرورت ہے کہ پردے میں منہ چھپائے یعنی وہ مستور نہیں ہے یہ ہمارے ہی آنکھ کا قصور ہے جو اس کے دیدار سے محروم ہیں۔

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا　　جو دوئی کی بُو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

وہ ہر لحاظ اور ہر حیثیت سے یکتا اور بے مثل و بے مثال اور بے چون و چگوں ہے کہ اس لئے اُسے کوئی نہیں دیکھ سکتا اگر اُس میں دوئی کا شائبہ بھی ہوتا تو ممکن تھا کہ نظر آ جاتا ہے۔

مرزا صاحب نے شاعرانہ اور فلسفیانہ دونوں حیثیتوں سے اس مسئلہ کو کس قدر صاف ظاہر کر دیا ہے۔

ظہور کائنات | دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

عالم یکتائی معشوق حقیقی کا صرف ایک جلوہ ہے اور اس جلوہ گری کی علت حسن کی خود بینی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر معشوق حقیقی کو اپنے ہی حسن کا جلوہ دیکھنا منظور نہ ہوتا تو کائنات وجود میں نہ آتی۔

آرایشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیش نظر ہے آئینہ دایم نقاب میں

کہتے ہیں معشوق حقیقی ابھی تک اپنے حسن کی آرائش سے فارغ نہیں ہے ممکنات کے پردے میں آرائش کے لئے ہمیشہ آئینہ پیشِ نظر رہتا ہے یعنی وہ اب بھی اپنے علم ماضی، حال اور مستقبل کو پیش نظر رکھکر نئی نئی اشیا پیدا کرتا رہتا ہے

تلاش مبداء | صوفیوں میں جو توحید وجودی کے قائل ہیں ان کے نزدیک ہر چیز اپنی ہستی سے نالاں ہے اور طبعاً اپنے مبداء سے اتحاد و اتصال کے لئے کشش و کوشش کر رہی ہے اور اس کا مقصود یہی ہے کہ دریا میں فنا ہو جائے یہی اُس کا حق انجام ہے بقول غالب

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

یا اُسے اپنے مبداء سے جو مغائرت ہو گئی ہے وہ اُس کو دُور کرنا چاہتی ہے اُس کے نزدیک قید ہستی سے آزاد ہو جانا ہی زندگی ہے۔ مرزا صاحب نے ان مضامین کو کئی اشعار میں نظم کیا ہے فرماتے ہیں۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

کہتے ہیں جب میں کچھ نہ تھا تو خدا تھا اور کچھ نہ ہوتا یعنی موجود صورت میں میرا ظہور نہ ہوتا تو خدا ہی رہتا مطلب یہ ہے کہ دریائے وحدت میں شامل ہوتا۔ اس پر شاعر افسوس کرتا ہے کہ مبداء سے مغائر کر کے میرا ایک جداگانہ تشخص قائم کرنے نے مجھے برباد کر دیا اگر میں اپنے مبداء سے مغائر نہ ہوتا تو کیا ہرج تھا۔

بیضہ آسا ننگ بال و پر ہے یہ کنج قفس از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

جس طرح پرندے کی زندگی انڈے سے نکلنے کے بعد شروع ہوتی اسی طرح ہماری زندگی اس گنبد فلک سے نکلنے کے بعد شروع ہوگی۔

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

کہتے ہیں شمع کے لئے اپنے غم ہستی کا سوائے موت کے یعنی بجھ جانے کے اور کوئی علاج نہیں۔ وہ صبح ہونے تک ہر رنگ

میں جلتی رہتی ہے یعنی بزم میں کیسی ہی رونق و دل فریبی ہو یا بزم عزا ہو یا بزم نشاط، وہ دمِ آخر تک افسوس کرتی رہتی ہے۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا   درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

کہتے ہیں جب درد حد سے گزرتا ہے تو وہی مریض کے لئے دوا ہو جاتا ہے اور درد کا دوا ہو جانا یہ ہے کہ فنا کر دیتا ہے اور مریض کو نجات ہو جاتی یعنی وہ قیدِ ہستی سے رہا ہو کر اپنے مبداء سے متصل ہو جاتا ہے اور قطرہ کے لئے یہی باعثِ مسرت ہے کہ وہ دریا میں فنا ہو جائے۔

وائے دیوانگیِ شوق کہ مجھ کو ہر دم   آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

افسوس کرتے ہیں کہ میں فرطِ شوق سے ہر دم اپنے مبداء کی طرف جاتا ہوں لیکن نارسائی کی وجہ سے حیران رہ جاتا ہوں۔

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے   پرتوِ آفتاب کے ذرّہ میں جان ہے

کائنات کی ہر چیز تجھ تک رسائی کے لئے سرگرداں ہے جس طرح آفتاب کے پرتو سے ذرّہ میں جان پڑ جاتی ہے اور وہ حرکت کرنے لگتا ہے اسی طرح کائنات میں تیرے ذوق نے جان پیدا کر دی ہے۔

شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل   رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے خوشا موجِ شراب

زندگی میں اپنے مبداء تک رسائی کا ذریعہ معرفتِ الٰہی ہے۔ اس شعر میں یہی مضمون ہے۔ کہتے ہیں موسمِ بہار کیا عجب چیز ہے کہ اس سے ہنگامۂ ہستی کی شرح ہوتی ہے یعنی جس طرح خزاں میں تمام اشجار بے برگ و بار ہوتے ہیں اور بہار آتے ہی رنگا رنگ پھول کھل جاتے ہیں درخت ہرے بھرے ہو جاتے ہیں اسی طرح موجودات ظہور میں آتے ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں شراب کی تعریف ہے کہتے ہیں موجِ شراب کیا اچھی چیز ہے کہ قطرہ کو دریا تک پہنچا دیتی ہے۔ یہاں شراب سے شرابِ معرفت مُراد ہے۔

<u>طریقِ عرفاں</u> | صوفیہ کے نزدیک معرفتِ خداوندی کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی ذات کی آگہی حاصل کی جائے من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہ۔ یا اپنی ہستی کو بالکل فراموش کردے۔ دیوانِ غالب میں اس مضمون کے متعدد شعر ہیں فرماتے ہیں۔

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں　　ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

باوجودیکہ ہم بُت شکنی میں یعنی ترک تعلقات میں بڑے مشاق ہو گئے اور ماسوا سے کوئی علاقہ باقی نہیں رہا یا فراموش کر چکے لیکن جب تک ہم باقی ہیں یا یوں کہئے کہ جب تک یہ خیال قائم ہے کہ "ہم ہیں" تو ابھی معرفت کی راہ میں ایک سنگ گراں اور حائل ہے۔

فنا کو سونپ۔ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا　　فروغِ طالعِ خاشاک۔ ہے موقوف گلخن پر

خس و خاشاک کے طالع کا فروغ گلخن پر موقوف ہے جہاں وہ سراپا روشنی ہو جاتا ہے یا جل کر فنا ہو جاتا ہے اور اس کی آرزو پوری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر تم اپنی حقیقت کے مشتاق ہو تو فنا ہو جاؤ بغیر فنا ہوئے تمہاری آرزو پوری نہیں ہو سکتی۔

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو　　آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

ماسوا کی حقیقت سے واقفیت اور غفلت کوئی چیز نہیں ضرورت اپنی ہی ہستی سے واقفیت یا غفلت کی ہے اگر اپنی ہستی سے آگہی حاصل ہو گئی تو معرفت رب بھی حاصل ہو جائے گی اور اگر اپنی ہستی سے غفلت ہو گئی تو اس صورت میں بھی شاہد حقیقی کے جلوہ سے محروم نہ رہیں گے۔

کرے ہے صرف بہ ایمائے شعلہ قصہ تمام　　بطرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیٔ شمع

کہتے ہیں شمع کی فسانہ خوانی ان لوگوں کی طرح ہے جو اپنی ذات میں فنا ہو کر خودی کو ترک کر دیتے ہیں فسانہ خوانی سے فنا ہونا مراد ہے اور جس کے ایما سے شمع اپنا قصہ تمام کرتی یعنی فنا ہوتی ہے وہ شعلہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُس سے لو لگا کر اپنی ہستی کو مٹا دیتی ہے۔

مختلف مضامین | دجلہ قطرہ میں دکھائی نہ دے اور جزو میں کُل　　کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا

عارف کے دیدۂ بینا کی تعریف کرتے ہیں کہ وہ لڑکوں کا کھیل نہیں ہے جسے قطرہ میں دریا اور جزو میں کل نظر نہ آئے۔

غالب مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو　　جس کا خیال ہے گلِ جیبِ قبائے گل

کہتے ہیں قبائے گل کے گریبان پر جس کا خیال زینت ہے مجھے اُس سے ہم آغوشی کی آرزو ہے یعنی شاہد حقیقی کا وصال چاہتا ہوں۔

دونوں جہان دی کے وہ سمجھے یہ خوش رہا یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

انھوں نے ہم کو دونوں جہان دیدیئے اور یہ سمجھ لیا کہ ہم راضی ہوگئے لیکن ہماری خواہش اس سے زیادہ تھی یعنی یہ کہ اُن سے مفارقت نہ ہوتی۔ صرف شرم کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکے۔

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں ؟ پر یہ بتلاؤ کہ جب دل میں تمھیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

یہ تو تم کہہ نہیں سکتے کہ ہم دل میں نہیں ہیں یعنی تم دل میں تو ہو اب ہم یہ پوچھتے ہیں کہ جب الخ

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے کاش کے ادھر ہوتا عرش سے آشیاں اپنا

کہتے ہیں کہ کاشکے ہمارا مکان عرش سے ادھر ہوتا تو ہم بلندی پر ایک اور منظر بنا کر اپنے مقام کو دیکھتے یعنی اپنی حقیقت اور مرتبے کو معلوم کرتے۔ اب ایسی جگہ ہیں جہاں سے کچھ نہیں معلوم ہو سکتا۔

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں ذرہ ذرہ روکشِ خورشید عالم تاب تھا

جس طرح یہاں کا ہر ذرہ نور کا اکتساب کرکے آفتاب کا مدِمقابل تھا اسی طرح اگر ہمارا عشق کامل ہوتا تو ہم بھی اس قدر نور کا اکتساب کرتے کہ رشک آفتاب ہو جاتے مطلب یہ ہے کہ بقدر شوق وطلب تجلیات و انوار کا نزول ہوتا ہے۔

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھکر

تجلیات و انوار الٰہی کے نزول کے لئے ظرف و استعداد درکار ہے اس لئے طور پر جو کم ظرف و بے استعداد تھا برق تجلی نہ گرتی ہم پر گرتی۔

غافل بوہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں بے شانۂ صبا نہیں طُرّہ گیاہ کا

لوگ خود آرائی سے یعنی حسن یا کمال حاصل کرکے فخر و ناز کرتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہم نے حاصل کیا ہے سب ہماری ہی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اور اس بات سے غافل ہیں کہ جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ غیب یا دوسروں کی امداد کے بغیر نہیں ہوتا حالاں کہ ہر چیز میں جو حسن یا کمال ہے وہ بھی بلا امداد غیر نہیں ہے۔ طُرّہ گیاہ کو دیکھکر خیال ہوتا ہے کہ اس کی زینت و حسن ذاتی ہے حالاں کہ وہ بھی بادِ صبا کی ممنون ہے۔

شوق اُس دشت میں دوڑائے ہے مجھکو کہ جہاں جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

شوق یعنی حصول معرفت کا شوق مجھے اُس ویرانہ میں دوڑاتا ہے جہاں سوائے دیدۂ تصویر کی نگاہ کے کوئی راستہ

نہیں یعنی راستہ معدوم ہی۔ ظاہر ہے کہ اس دشت میں جو شخص قدم رکھے گا وہ حیرت کا پُتلا بن جائے گا۔

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے　　　تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

جن لوگوں نے تیری تمنا کی اُنھوں نے کچھ مقامات (سلوک) طے کئے لیکن کچھ پہلے ہی مقام سے آگے نہ بڑھنے پائے اور کچھ دوسرے تیسرے سے۔ علیٰ ہذا القیاس تمام مقامات پر رہ گئے اور تیرا پتہ نہ ملا۔ ایسی صورت میں تھک کر گر نہ پڑتے تو کیا کرتے۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم　　　ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

کہتے ہیں ہم توحید وجودی کے قائل ہیں۔ ہمارا مذہب یہ ہی کہ تمام مذاہب اور ملتوں کو ترک کردیں اس لئے جو مذہب اور ملتیں کہ مٹ جائیں گی وہ گویا اجزائے ایماں ہو جائیں گی۔

اتنا ہی مجھکو اپنی حقیقت سے بُعد ہے　　　جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

جس قدر میں غیر کو غیر سمجھتا ہوں یا وجودِ غیر کے تصور کو مشکل سمجھتا ہوں اُسی قدر مجھکو اپنی حقیقت سے بیگانگی ہی۔

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال　　　رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھکر

رہرو ہمیشہ راستہ ہموار دیکھکر چلا کرتا ہے اس لئے زنار باندھنا چاہیئے جو بالکل ہموار ہے اور تسبیح توڑ کے پھینک دینا چاہیئے جس میں از ابتدا تا انتہا ناہمواری ہے۔

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جُدا جُدا　　　ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

سر پائے خُم پہ چاہیئے ہنگام بیخودی　　　رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیئے

یعنی بحسب گردشِ پیمانۂ صفات　　　عارف ہمیشہ مست مئے ذات چاہیئے

پھول رنگا رنگ کے ہوتے ہیں اور کوئی کبھی کھلتا ہی کوئی کبھی تو جس وقت جو پھول سامنے ہو بہار کو موجود سمجھنا چاہیئے اور اس موسم میں جو رسوم ادا کی جاتی ہیں وہ ادا کرنی چاہئیں مثلاً رنگا رنگ بزم آرائیاں اور مے نوشی وغیرہ مطلب یہ ہی کہ وہی ایک ذات موجود ہے۔ یہ رنگا رنگی اُسی کی جلوہ گری ہے اس لئے ہر رنگ میں یعنی ذات کی ہر صفت کے ظہور پر اپنے اوپر جو حالت طاری ہو اُسی کے مناسب مراسم عبودیت بجا لانا اور اصل ذات میں محو رہنا چاہیئے۔

(فلسفہ)

فلسفہ میں بھی مرزا صاحب کا کوئی مسلک نہیں اور ایک شاعر کے لئے اس کی ضرورت بھی نہیں کیوں کہ شاعر کا مقصد محض لوگوں کا ذوق شاعری پورا کرنا ہوتا ہے نہ کہ تعلیم و تلقین وہ کبھی کوئی طبعیات کا مسئلہ بیان کر جاتے ہیں کبھی مابعد الطبعیات کا۔ فلسفہ زندگی پر بہت زیادہ اشعار ہیں اور اس میں بھی وہی تنوع مضامین کی خصوصیت نمایاں ہے۔ خالص فلسفہ کے مضامین بہت کم ہیں لیکن ان میں بعض مضامین اس قسم کے ہیں جو موجودہ تحقیقات سے ملتے ہوئے ہیں۔

ہم پہلے طبعیات و خالص فلسفہ کے اشعار نقل کرتے ہیں اس کے بعد فلسفہ زندگی اور اخلاق وغیرہ کے اشعار مختلف عنوانات کے تحت میں لکھیں گے۔

ضعف سے گریہ مبدل بہ دم سرد ہوا — باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

غالباً مرزا صاحب نے ضبط کہا ہو کاتب کے تصرف سے ضعف ہو گیا کیوں کہ ضبط گریہ ہی سے سرد آہ نکلتی نہ کہ ضعف سے بہر حال اس شعر میں استحالۂ عناصر کا مسئلہ ہے جو فلسفۂ قدیمہ کے مسلمات میں سے ہے۔ آج کل یہ تسلیم نہیں کیا جاتا کہ ایک عنصر دوسرے عنصر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ تحقیقات سے اس قدر ثابت ہوا ہے کہ مادہ کی حالتیں بدل جاتی ہیں یعنی جامد سیال اور سیال گیس ہو جاتا ہے۔

اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائیگا کیا — آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں — ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے — اے ناتمامیٔ نفسِ شعلہ بار حیف

جدید تحقیقات یہ ہے کہ نفس دھیمے طور پر جلنے کا نام ہے کیوں کہ آکسیجن ایک سوزندہ عنصر ہے سانس میں بھی خارج ہوتا ہے۔ مرزا صاحب کے فلسفیانہ دماغ نے یہ مسئلہ دریافت کر لیا حالاں کہ وہ علوم جدیدہ سے واقف نہ تھے اور نہ اُس وقت یہ مسئلہ منکشف ہوا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مرزا صاحب نے اسی شاعرانہ خیال پر ان شعروں کی بنیاد رکھی ہو کہ سینے میں غم یا محبت

کی آگ بھری ہوئی ہے سانس میں اُسی آگ کے شعلے نکلتے ہیں لیکن شعروں کا انداز صاف طور پر اسی جدید مسئلہ کی صراحت کر رہا ہے۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

اس شعر میں یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ مجردات کا جلوہ بغیر تعلق مادہ کے نہیں ہو سکتا مثلاً بادِ بہاری کی جلوہ آرائی چمن پر موقوف ہے جو بمنزلہ زنگار (کثافت) کے ہے۔

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود — قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

اس شعر میں علم کلام کا یہ مسئلہ نظم کیا ہے کہ قبلے کی طرف نماز پڑھنے سے قبلہ کی عظمت نہیں ثابت ہوتی بلکہ یہ قبلہ بطور قبلہ نما کے ہے جس کی نماز پڑھتے ہیں۔ وہ حواس ایک طرف ادراک کی دسترس سے بھی باہر ہے چوں کہ نماز کے لئے ایک سمت ضروری تھی اس لئے قبلے کی سمت معین کر لی ہے۔

ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے — گردشِ مجنوں بہ چشمکہائے لیلیٰ آشنا

کہتے ہیں جس طرح مجنوں کی گردش لیلیٰ کے اشارے سے تھی اُسی طرح ہر ذرہ نیرنگی زمانہ کا تابع ہے یعنی تغیر و انقلاب میں گرفتار ہے۔

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام — مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ بادیاں

کہتے ہیں کائنات کے تمام اجزا چاند، ستارے، زمین، شجر، حجر سب آمادۂ زوال ہیں یعنی فنا ہو رہے ہیں سورج مثل اُس چراغ کے ہے جو ہوا کے راستہ پر رکھا ہو جس کا بجھنا یقینی ہے۔ یہ مضمون مشہور گستاؤلیبان کے نظریہ سے بہت ملتا ہوا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات کا مادہ ایتھر میں تحلیل ہو رہا ہے جو ایک فرضی و قیاسی چیز ہے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی دردِ بے دوا پایا

عشق کا فلسفہ بیان کرتے ہیں کہ بغیر عشق کے زندگی بے مزہ ہوتی ہے اس کے پیدا ہونے سے درد یعنی بے مزگی زندگی کا علاج ہو جاتا ہے اور زندگی کا لطف آجاتا ہے لیکن بجائے خود یہ ایک درد ہے اور ایسا درد جس کی کوئی دوا نہیں۔

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا — جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غم کی حقیقت کا اظہار ہی کہ جسے تم غم کہتے ہو یہ اگر پتھر میں بجائے شراب کے پوشیدہ ہوتا تو اس سے ایسا لہو ٹپکتا جو کبھی بند نہ ہوتا یعنی کل پتھر خون بن کر بہ جاتا۔

محرم نہیں ہی تو ہی نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہی پردہ ہی ساز کا

کہتے ہیں راز کے نغموں سے تو ہی واقف نہیں ہی ورنہ یہاں ہر حجاب جس میں تو اسرار کو پوشیدہ سمجھتا ہی پردۂ ساز کی طرح بج رہا ہی اور اسرار قدرت بیان کر رہا ہی۔

ان مختلف مضامین کے اشعار کے بعد اب ہم خاص خاص مضامین کے اشعار علیحدہ علیحدہ لکھتے ہیں۔

الم پرستی | مرزا صاحب کے اشعار سے اگر اُن کے کسی عقیدہ پر استدلال ہو سکتا ہی تو وہ یہی پسیمزم (الم پرستی) ہے اور اگر اُن کا کوئی خاص فلسفہ کہا جا سکتا ہی تو وہ یہی فلسفہ ہی۔ ان کا دیوان اُٹھا کر دیکھا جائے تو ہر جگہ اس کے آثار نظر آئیں گے۔ سبب اس کا یہ ہی کہ اوّل تو مرزا صاحب کی طبیعت نہایت اثر پذیر واقع ہوئی تھی دوسرے ان کی زندگی سراپا غم و اندوہ رہی ایسے ہی واقعات انسان کو اس فلسفہ کا معتقد بنا دیتے ہیں۔ مرزا صاحب کے نزدیک دُنیا کا حصل بجز رنج غم اور تکلیف و مصیبت کے اور کچھ نہیں۔ اوّل تو دُنیا کی فرصت ایک نظر سے زیادہ نہیں اور گرمی بزم ایک رقص شرر ہی تک ہی اور یہ ایک لمحہ بھی غم ہی میں گزرتا ہی۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل — گرمیِ بزم ہی اک رقص شرر ہونے تک

تنگی دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے — کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہی پہ کہاں بچیں کہ دل ہی — غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

کہتے ہیں کہ اگرچہ غمِ عشق جاں گھلانے والا ہی لیکن غم سے ہم کسی طرح محفوظ نہیں رہ سکتے کیوں کہ دل کے لئے غم لازمی ہی اگر غمِ عشق نہ ہوتا تو اور دنیا کے افکار ہوتے۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعی آزادی — ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصت روانی کی

کہتے ہیں ہم کشاکش حیات سے آزاد ہونے کے لئے کتنی ہی کوشش کریں لیکن اس سے نجات نہیں مل سکتی بلکہ گرفتاری بڑھتی ہی جاتی ہے۔ دیکھ لو کہ موج آب کو روانی کی آزادی حاصل ہے لیکن یہی آزادی اُس کے حق میں زنجیر بن گئی ہے۔

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہُوا ۔ اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

مرنے کے بعد اصلی رنگ اُڑ کر بدن زرد ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں موت کے خوف ہی سے میرا رنگ زرد ہو گیا تھا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان کو اور کوئی فکر نہ ہو تو مرنے کی فکر سے تو کسی طرح خالی ہو نہیں سکتا۔

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی ۔ نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذت زندگانی کی

مطلب یہ ہے کہ رنج یا تکلیف کی حالت میں اگر خوشی یا راحت مل جائے تو اس کے بعد رنج و تکلیف کا احساس اور بڑھ جاتا ہے اسے ان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ اگر ہم نے کچھ شادمانی حاصل کی تو ہمارے جنون پر تسکین طلبی کا الزام عاید نہیں ہو سکتا۔ لذت زندگانی جو مل جاتی ہے وہ زخم دل پر نمک کا کام کرتی ہے جس سے تکلیف اور زیادہ ہو جاتی ہے۔

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی ۔ دوام کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا

کہتے ہیں دُنیا میں سوائے خزاں کے بہار کا وجود نہیں ہے اگر ہے بھی تو وہ حنائے پائے خزاں ہے یعنی خزاں کی زینت کے لئے ہے اور یہ زینت ایک وبال ہوتی ہے۔ اسی طرح دُنیا میں سوائے رنج و آلام کے عیش و راحت کا وجود نہیں ہے اور جو ہے وہ صرف رنج و آلام کی زینت و آرائش کے لئے۔ اس لئے ہمیشہ کلفت خاطر کا باعث ہوتا ہے۔

دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے ۔ نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

کہتے ہیں حیات دنیا کے عوض جنت دی جاتی ہے لیکن ہم نے خمار کی جس قدر تکلیف اُٹھائی ہے اس کے مقابلہ میں نشہ بہت تھوڑا ہے یعنی دنیا کی تکالیف اس قدر سخت اور اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ اس کی تلافی جنت سے نہیں ہو سکتی۔

یہ فلسفہ (الم پرستی) کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے لیکن ہے یہ ایک واقعہ۔

فلسفہ زندگی | مرزا صاحب کے فلسفہ کی جان یہی فلسفہ زندگی ہے اور اس مضمون میں اُن کی جدت آفرینی کے اچھے اچھے نمونے موجود ہیں۔

ہم نے اس مضمون کے دو حصے کر دیئے ہیں ایک نظری دوسرا عملی۔

الم پرستی کا بھی حقیقۃً فلسفۂ زندگی ہی سے تعلق ہے لیکن چوں کہ اس کی ایک امتیازی صورت ہے اس لئے ہم نے

اس کو علٰحدہ بیان کرنا مناسب سمجھا۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

کہتے ہیں اگر مرنا نہ ہو تو جینے کا کوئی مزا نہیں اسی یقین پر کہ زندگی کا زمانہ تھوڑا ہے طرح طرح کے کاموں کی اُمنگ پیدا ہوتی ہی اگر ابدالآباد تک زندہ رہنا ہوتا تو نہ یہ جوش و سرگرمی ہوتی نہ دنیا میں چہل پہل نظر آتی۔

رونقِ ہستی ہی عشقِ خانہ ویراں ساز ہی — انجمن بے شمع ہی گر برقِ خرمن میں نہیں

کہتے ہیں دنیا میں جو کچھ رونق ہی وہ عشق و محبّت ہی کی وجہ سے ہی اگر یہ نہ ہو تو نہ ایثار و ہمدردی کا وجود ہونہ سخاوت و فیاضی کا۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہی کہ دنیا کی رونق، نقصان و ضرر اور تباہی و بربادی کے سبب ہے اگر نفع و فائدہ کے سوا کچھ نہ ہو تو افراد اقوام کی باہمی جد وجہد کا نام بھی نہ ہوا ورنہ اپنی حفاظت و ترقی کے کسی سامان و اسباب کی حاجت ہو۔ نہ امن وامان قایم رکھنے کے لئے سلطنت حکومت کی ضرورت۔ خلاصہ یہ ہی کہ اگر برق خرمن نہ ہو تو انجمن بے شمع کے ہی۔

یہ دوسرا مطلب شعر کے الفاظ سے زیادہ مناسبت رکھتا ہی۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

تمام کمالات وفضائل سے متصف ہونا اور رذائل ومعائب سے پاک ہونا آسان نہیں ہی۔

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم — ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں

غم خواروں کی غم خواری اور ہوا خواہوں کی ہوا خواہی اُسی وقت مفید ہو سکتی ہے جب تکلف یا مصیبت ہی قابلِ علاج ہو ورنہ کسی غم خوار کی غم خواری اور کسی ہمدرد کی ہمدردی سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ شاعرانہ دلیل اس کی یہ ہی کہ اہلِ بزم شمع کے ہوا خواہ ہوتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ یہ بجھنے نہ پائے اور اس کی روشنی قایم رہے لیکن جس مصیبت و تکلیف میں وہ مبتلا ہی یعنی جلنا وہ اُسے گھلائے ڈالتی ہی اور ہوا خواہ کچھ نہیں کر سکتے۔

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ — دیکھیں کیا گزری ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

کہتے ہیں ہر موج میں سیکڑوں نہنگ مُنہ پھاڑے ہوئے ہیں دیکھیں قطرہ پر موتی ہونے تک کیا کیا آفتیں گزرتی ہیں۔ مطلب یہ ہی کہ انسان کو بلکہ دنیا کی ہر چیز کو کمال تک پہنچنے یا کامیابی حاصل کرنے کے لئے ہزاروں مشکلات اور

مصیبتوں کا سامنا ہوتا ہی۔

اس موقع پر یہ شعر بھی دیکھ لینا چاہیئے جو پہلے گزر چکا ہی۔ ع

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے

اخلاقی تعلیم | فلسفہ زندگی کے نظریات گو کیسے ہی دلچسپ ہوں انسان کے لئے کچھ مفید نہیں ہو سکتے اصلی چیز اس فلسفہ کا عملی حصہ ہی یعنی یہ تعلیم کہ انسان کو اپنی زندگی میں کیا اصول اختیار کرنے چاہئیں۔ مرزا صاحب نے فلسفہ زندگی کے اس حصہ کے متعلق اپنے اشعار میں جو تعلیم دی ہی وہ حسب ذیل ہی۔

غرّۂ اوج بنائے عالم امکاں نہ ہو   اس بلندی کے نصیبوں میں ہی پستی ایک دن

کہتے ہیں اس دنیا پر فریفتہ نہ ہو کیوں کہ یہ وہ چیز ہی جو ایک دن فنا ہو جائے گی۔ یعنی لا فانی چیزوں سے دل لگانا چاہیئے۔

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ   + اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

کہتے ہیں ترک آرزو نہ کرنا چاہیئے اگر شراب نہیں ملتی تو ساغر ہی کا انتظار کرنا چاہیئے۔ مطلب یہ ہی کہ کچھ نہ کچھ نصب العین ہونا چاہیئے۔

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں   گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہی

شعر صاف ہی۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں خطرات کا اندیشہ ہو اُس سے کنج عافیت بہتر ہی۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں   ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

صبر کی تعلیم دیتے ہیں کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں رات دن انقلاب ہوتا رہتا ہے کوئی انقلاب ہمارے بھی مناسب حال ہوگا۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا   ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہے

جام جم ٹوٹ گیا تو پھر دوسرا نہ بن سکا۔ مٹی کے پیالے اچھے کہ ایک ٹوٹ گیا تو دوسرا بازار سے لے آئے مطلب یہ ہی کہ پُر تکلف زندگانی پر سادہ زندگی کو ترجیح ہی۔

بہ پیچ و تابِ ہوس سلکِ عافیت مت توڑ   نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے

کہتے ہیں عافیت کی لڑی کو ہوس کے بل دے کر نہ توڑ۔ عجز کی نگاہ سلامتی کا سر رشتہ ہے اس سر رشتہ کو ہاتھ میں سے مطلب یہ ہے کہ ہوس عافیت کی دشمن ہے اور ترک ہوس سلامتی کا ذریعہ ہے۔

غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر　　کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

کہتے ہیں مال و دولت کی ہوس جو غارت گرِ ناموس ہے اگر نہ ہو تو شاہد گل کیوں باغ سے بازار میں آئے مطلب یہ ہے کہ مال و دولت کی ہوس انسان کو ذلیل کرتی ہے۔

ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو　　ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

کہتے ہیں ہم نے جو تلاش و جستجو ترک کر دی ہے تو یہ قناعت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ کمزوری کی وجہ سے ہے اس لئے ہم مردانہ ہمت کی تکیہ گاہ کے لئے وبال ہو گئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کو ہمت مردانہ پر بھروسہ رکھنا چاہیئے اگر حصول مقصد کے لئے سعی و کوشش ترک کی جائے تو وہ قناعت کی وجہ سے ہو ضعف و کمزوری کی وجہ سے نہ ہو۔

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے　　آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

کسی مقصد کے حاصل کرنے میں انسان جس قدر ہمت سے کام لے گا اسی قدر غیب سے اُس کی تائید ہو گی مثلاً قطرہ نے اپنی عالی ہمتی سے یہ نصب العین قرار دیا کہ آنکھوں میں جگہ پائے تو اُس کی غیب سے تائید ہوئی اور اُس کو وہی عزت کی جگہ مل گئی جو اس کے مطمح نظر تھی۔ اگر وہ اتنی ہی ہمت کرتا کہ موتی بن جاؤں تو غیب سے اس کی اتنی ہی تائید ہوتی کہ وہ موتی بنا دیا جاتا اور اُسے کسی کے کان میں جگہ دے دی جاتی۔

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے　　بھرے ہیں جس قدر جام و سبو مے خانہ خالی ہے

کہتے ہیں دنیا اس وجہ سے آباد ہے کہ یہاں اہلِ ہمت مفقود ہیں اگر اہلِ ہمت ہوتے تو وہ سب کچھ لٹا کر برابر کر دیتے اور دُنیا ویران ہو جاتی۔ دوسرا مصرعہ مثال ہے کہ جام و سبو کا بھرا ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ پینے پلانے والے نہیں ہیں ورنہ تمام جام و سبو خالی پڑے ہوتے۔

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب　　لطمۂ موج کم از سیلیِ اُستاد نہیں

جس طرح بچوں کو اُستاد کی سیلی متنبہ کر دیتی ہے اور دوبارہ غلطی سے باز رکھتی ہے اسی طرح دانشمندوں کے لئے طوفان حوادث مکتب ہے اور اس مکتب میں جو حادثہ پیش آتا ہے اس سے وہ عبرت حاصل کرتے ہیں جن واقعات سے مضر نتائج پیدا

ہوئے ہیں اُن سے آیندہ کے لئے احتیاط کرتے ہیں۔

وفاداری بشرطِ اُستواری اصل ایماں ہی — مَری بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

وفاداری و پابندی عہد میں اگر استقلال و ثابت قدمی کا ثبوت دیا جائے تو یہی اصل ایمان ہی اس لئے اگر برہمن اپنے مذہب پر ثابت قدم رہا یہاں تک کہ بُت خانہ ہی میں مرگیا تو اُس کے ایمان کی قدر کرنا چاہیئے اور قدر یہ ہی کہ وہ کعبے میں دفن کیا جائے۔ حاصل یہ ہی کہ خیال کا استحکام قابلِ قدر چیز ہی۔

ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال — حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

کسی کا احسان لینا اور اثر قبول کرنا، پست ہمتی کی دلیل ہی اس لئے زمانہ کا بھی احسان نہ لینا چاہیئے خواہ وہ احسان عبرت ہی کی صورت میں کیوں نہ ہو۔ حاصل یہ ہی کہ احسان کسی کا بھی نہ لینا چاہیئے اور اپنی ہی ہمت کے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیئے۔

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو — کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

حسد کا علاج بتاتے ہیں کہ اگر حسد کی وجہ سے افسردہ خاطر رہتا ہی تو دنیا کو دیکھ۔ جب تجھے معلوم ہوجائیگا کہ دنیا میں دولت و حشمت کے مالک ہزاروں لاکھوں ہیں تو شاید نظر وسیع ہوجائے جس سے افسردگی رفع ہوجائے گی۔

جی میں ہی کچھ نہیں ہی ہمارے وگرنہ ہم — سر جائے یا رہی۔ نہ رہیں پر کہے بغیر

صاف باطنی اور اخلاقی جرأت کی تعلیم ہی۔ کہتے ہیں ہمارے دل میں کسی کی بُرائی نہیں اگر ہوتی تو اُس کے ظاہر کردینے میں نہ چوکتے چاہے اس میں ہمارا سر جاتا یا رہتا۔

وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں — اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

کہتے ہیں تم جو دوسروں سے بیگانگی برتتے اور وحشت کرتے ہو اور عذر یہ کرتے ہو کہ ہم آزاد ہیں یعنی تمام تعلقات چھوڑ چکے ہیں تو یہ تمھارا عذر صحیح نہیں اگر تم بیگانگی اور وحشت کرتے ہو تو اپنی ہی ذات سے کرو یعنی خودی و انانیت چھوڑ دو اُس وقت تم آزاد ہوگے اور اُس وقت بیگانگی کا عذر صحیح ہوگا۔

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی — پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

کہتے ہیں میرے دل میں زہد و پارسائی کی اگرچہ اس میں ریاکاری نہ ہو کوئی وقعت نہیں ہوسکتی کیوں کہ جزا کی طمع کیا کم عیب ہی۔ مطلب یہ ہی کہ نیکی و پارسائی بلاخیال جزا ہونا چاہیئے۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ   دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

طاعت و عبادت جو کی جاتی ہے وہ محض جنت کے لالچ کی وجہ سے اور اسی سبب سے شہد و شراب کی لاگ قایم ہے اور جو طاعت و عبادت کسی وجہ سے کی جائے وہ نہایت ناقابل وقعت ہے اس لئے جنت کو دوزخ میں ڈال دینا چاہیئے کہ پھر جو کچھ زہد و عبادت کی جائے بالکل بے طمع ہو۔

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی   عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

کہتے ہیں اگرچہ ہماری عمر عبادت ہی میں کیوں نہ گزرے لیکن مُہلت زندگی کے ضائع کرنے کا غم نہیں مٹ سکتا یعنی عبادت کے علاوہ اور ایسے کام ہیں جن میں اپنی زندگی گذارنا چاہیئے یا یہ کہ ثمرۂ عبادت کے سوا اور ثمرات ہم حاصل کر سکتے ہیں اس صورت میں اگر ہم عبادت ہی میں فرصت ہستی صرف کر دیں تو کیوں غم نہ ہوگا۔

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں   پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے

کہتے ہیں اہلِ خرد عامیانہ رسموں میں تو گرفتار ہیں پھر کس روش خاص پہ نازاں ہیں۔

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ   یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

فرماتے ہیں اگر تم کو اس بات کا یقین ہے کہ تمہاری دعا قبول ہو جائے گی تو سوائے ایک دلِ بے مدعا کے دوسری چیز نہ مانگو۔ جب دلِ بے مدعا تم کو مل جائے گا تو پھر دونوں جہان سے مستغنی ہو جاؤگے۔ پھر کسی چیز کی حاجت ہی نہ رہے گی جس کی دعا مانگی جائے۔

شادی سے گزر، کہ غم نہ ہووے   اُردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے

رنج و غم انسان کو اسی لئے ہوتا ہے کہ وہ خوشی و مسرت سے مقابلہ کرتا ہے مثلاً ہم کو خزاں کا اس لئے غم ہوتا ہے کہ ہم بہار سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں اس لئے کہتے ہیں کہ تم شادی سے قطع نظر کر لو تو پھر غم نہیں ہو سکتا۔ اُردی (بہار کا مہینہ) نہ ہوگا تو دے (خزاں کا مہینہ) نہیں ہو سکتا۔

ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ مرزا صاحب نے جو تعلیم دی ہے وہ ہماری پُرانی اخلاقی تعلیم سے بالکل مختلف اور نہایت بلند ہے۔

خواصِ نفس | مرزا صاحب نے جن اشعار میں فطرت انسانی کی تصویریں کھینچی ہیں یا نفس انسانی کے خاصے بتلائے ہیں وہ

دو ایک شعر پہلے گزر چکے ہیں۔ مثلاً ع فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے ع ہے ناز مفلسان زر از دست رفتہ پر
ان پر اس موقع پر ایک نظر ڈال لینا چاہیئے باقی اشعار ہم اس جگہ لکھتے ہیں۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج مشکلیں ہم پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

صاف شعر ہے۔

بس ہجومِ نا اُمیدی خاک میں مل جائیگی یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

کہتے ہیں اگرچہ ہماری کوششیں بے سود ہیں لیکن ہم کو ان میں بھی ایک لذت ملتی ہے۔ مطلب یہ ہے یاس و نا اُمیدی کی حالت میں بھی کوشش سے ایک لذت حاصل ہوتی ہے۔

ہوسِ گل کا تصوّر میں بھی کھٹکا نہ رہا عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

اس شعر میں نفس کا یہ خاصہ بتایا ہے کہ انسان کسی مقصد کے حاصل کرنے میں اُسی وقت تک کوشش کرتا ہے اور اُس کو توقع ہوتی ہے جب تک اسباب حصول بھی مُہیّا ہوتے ہیں جیسا تمام اسباب و ذرائع مفقود ہو جاتے ہیں تو مقصود کا خیال بھی دل سے نکل جاتا ہے۔

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

مطلب یہ ہے کہ مطلوب کی خواہش انسان کو دمِ واپسیں تک رہتی ہے۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

انجمن میں مختلف لوگ طرح طرح کی باتیں اور مختلف خیالات پر گفتگو کرتے ہیں لیکن تنہا انسان بھی بجائے خود ایک محشرِ خیال ہے یعنی جب وہ خلوت میں ہوتا ہے تو طرح طرح کے خیالات و تصوّرات کا اُس کے دل پر ہجوم ہوتا ہے اس لئے خلوت بھی انجمن سے کم نہیں ہوتی۔

<u>خاتمہ</u> مرزا صاحب کی ان معنی آفرینیوں اور بلند خیالات کا مطالعہ کرکے بے اختیار یہ شعر زبان پر آتا ہے جو گویا انہیں نے مرزا صاحب ہی کی زبان سے کہا ہے۔

مری قدر کر اے زمینِ سخن کہ میں نے تجھے آسماں کر دیا

لیکن یہ کس قدر افسوس ناک واقعہ ہے کہ مرزا صاحب کی زندگی میں قدر ہوئی اور نہ وفات کے بعد۔ زندگی میں

جواُن کی ناقدر دانی کی گئی اُس کی شکایت وہ خود ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"... (میں نے) باون برس مشق سخن کی اب مجھکو چھیاسٹھواں سال ہے میں خدا کا شکر کرتا ہوں اور خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا کہ ان باون برسوں میں اس نے کس قدر معنی کے دروازے مجھ پر کھولے ہیں اور میری فکر کو کس درجہ کی بلندی بخشی ہے۔ افسوس کہ لوگوں نے میرے کلام کی خوبی کو نہ سمجھا اور زیادہ تر افسوس یہ کہ وہ شان ایزدی کی شناخت سے محروم رہی اور میرے نظم و نثر کے کرشموں کو آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا۔ گویا نظیری جنت آرامگاہ کا مقطع میرے حسب حال ہے۔

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح — باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ"

وفات کے بعد جواُن کی قدر دانی ہوئی وہ صرف اس قدر کہ اپنے معاصرین میں کسی سے بلند درجہ رکھتے تھے اور کسی سے کم۔ حالاں کہ ہماری رائے میں اُردو کو جن شعرا پر ناز ہو سکتا ہے وہ صرف تین ہیں۔ انیسؔ، میرؔ اور تیسری مرزا نوشہ۔ اب ہم ہر قسم کے چند اچھے اشعار لکھکر یہ مضمون ختم کرتے ہیں۔

دریائے معاصی تنک آبی سے ہُوا خشک — میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہُوا تھا

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ دل فرش راہ — کوئی مجھکو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار — لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — اِک تماشا ہُوا گلہ نہ ہُوا

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا — کہتے ہیں ہم تجھکو منہ دکھلائیں کیا

مجھے اب دیکھکر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا — کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اُس نے شدّت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

لاکھوں لگاؤ ایک چُرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم کوئی ہمیں اُٹھائے کیوں

کیا غم خوار نے رُسوا لگے آگ اس محبّت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

دے مجھکو شکایت کی اجازت کہ ستمگر
کچھ تجھکو مزا بھی مرے آزار میں آوے

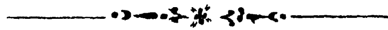
ہے وصل ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں
معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیے

بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل　　جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کری کوئی

مرے دل میں ہی غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں　　خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

سنبھلنے دے مجھے اے نا اُمیدی کیا قیامت ہی　　کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

محبّت میں نہیں ہی فرق جینے اور مرنے کا　　اُسی کو دیکھکر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے



تلمیحات

(از جناب مولوی وحید الدین صاحب سلیم پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد (دکن)

الفاظ کیا ہیں؟ وہ آوازیں ہیں، جن سے ہم اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں، یا اُن کے ذریعے سے اشیا کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ دنیا کی جن وحشی قوموں میں الفاظ نہیں ہیں، وہ اپنے خیالات، یا اشیا کے بتانے کے لئے ہاتھ پاؤں اور آنکھوں سے اشارے کرتے ہیں۔ اگر اظہارِ خیالات کے وقت تم اُن کو دیکھو، تو سخت حیرت ہوگی کہ وہ کیسی کیسی عجیب حرکتیں کرتے ہیں اور اُن کو اپنے دل کی بات بتانے میں کتنی دقتوں کا سامنا ہوتا ہے۔ جب عقلِ انسانی نے ترقی کی اور الفاظ ایجاد ہوئے، تو یہ دقتیں دُور ہوگئیں۔ ایک خاص آواز سے ایک خاص خیال یا چیز یا کام کی طرف اشارہ ہونے لگا اور ہر شخص اُس اشارہ کو سمجھنے لگا۔ ترقیِ انسانی کا یہ دور نہایت اہم تھا، جس میں زبان کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔

تلمیح اور اصطلاح سے کیا مراد ہے؟ زبان کے ابتدائی دور میں چھوٹے چھوٹے سادہ خیالات اور معمولی چیزوں کے بتانے کے لئے الفاظ بنائے گئے تھے۔ رفتہ رفتہ انسان نے ترقی کا قدم اور آگے بڑھایا۔ لمبے لمبے قصّوں اور واقعات وحالات کی طرف خاص خاص لفظوں کے ذریعے سے اشارے ہونے لگے۔ جہاں وہ الفاظ زبان پر آئے، فوراً وہ قصّے یا واقعے آنکھوں کے سامنے آگئے، جن کی طرف وہ اشارہ کرتے تھے۔ ایسا ہر اشارہ تلمیح کہلاتا ہے۔ پھر علمی مسئلوں یا اصولوں کے بتانے کے لئے بھی خاص خاص الفاظ معین کئے گئے۔ ان میں سے ہر لفظ اصطلاح کہلاتا ہے۔

دنیا کی جو زبانیں ترقی یافتہ ہیں، اُن میں تلمیحیں اور اصطلاحیں کثرت سے ہیں۔ تلمیحوں اور اصطلاحوں کی فرہنگیں الگ الگ تیار کی گئی ہیں جن میں ہر تلمیح اور ہر اصطلاح کی تشریح کی گئی ہے۔ طویل قصّوں

اور کہانیوں اور علمی مسئلوں اور اصولوں کے بار بار بیان کرنے میں جو وقت ضائع کرنا پڑتا ہے، اُس سے ان تلمیحوں اور اصطلاحوں نے بچا دیا ہے۔

جو حضرات اصطلاحیں وضع کرنے کے وقت اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہر اصطلاحی لفظ سے پورا مفہوم ادا ہونا چاہیئے، وہ سخت غلطی پر ہیں۔ دنیا میں کوئی اصطلاح ایسی نہیں ہے، جس سے پورا مفہوم ادا ہوتا ہو اور وہ پورا علمی مسئلہ یا اصول سمجھ میں آتا ہو، جس کے لئے وہ اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ یہ حضرات ترقی زبان کے رستے سے پیچھے ہٹنا چاہتے ہیں اور اُس منزل کی طرف پھر جانا چاہتے ہیں، جہاں پورے علمی مسئلے یا اصول کو بار بار دُہرانے کی ضرورت پیش آتی تھی اور ہر دفعہ ایسا کرنے میں بے انتہا وقت ضائع کرنا پڑتا تھا۔ تضییع اوقات ہی سے بچنے کے لئے یہ اشارے ایجاد کئے گئے ہیں، جن کا نام اصطلاحات ہے اور یہ اُس وقت کی ایجاد ہے، جب کہ انسانی عقل کی ترقی کے ساتھ زبان بھی ترقی کی بلندی پر پہنچ گئی تھی۔

جو حال اصطلاحوں کا ہے، وہی تلمیحوں کا۔ طوفانِ نوح کہتے ہی وہ تمام طوفانی واقعات آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں، جو حضرت نوح کے زمانے میں پیش آئے تھے۔ صُورِ اسرافیل کا لفظ زبان پر لاتے ہی وہ تمام ہیبت انگیز واقعات دل میں پھرنے لگتے ہیں، جو آغازِ قیامت کے وقت پیش آئیں گے۔ اِن میں سے پہلا اشارہ گزرے ہوئے واقعات کے ایک خوف ناک منظر کو یاد دلاتا ہے۔ دوسرا اشارہ آنے والے واقعات کے ایک پُرہول نظارہ کو آنکھوں کے سامنے لاتا ہے۔ ان اشاروں کے لئے جو الفاظ مقرر کئے گئے ہیں، وہ کسی طرح گزشتہ اور آیندہ واقعات کا پورا مفہوم ادا نہیں کرتے۔

بلاغت کے معنی یہ ہیں کہ کم سے کم الفاظ سے زیادہ سے زیادہ معنی سمجھے جائیں۔ یہ بات جس قدر تلمیحات میں پائی جاتی ہے، الفاظ کی دیگر اقسام میں نہیں پائی جاتی۔ جس زبان میں تلمیحات کم ہیں، یا بالکل نہیں ہیں، وہ بلاغت کے درجے سے گری ہوئی ہے۔ ایسی زبانوں میں بولنے والوں، لکھنے والوں اور شعر کہنے والوں کو اپنے مطالب کے ادا کرنے میں بہت زیادہ وقت ضائع کرنا پڑتا ہے۔ سُننے والے ایک ہی واقعہ کو بار بار سُننے سے

اُٹھا جاتے ہیں۔ اگر وہ واقعہ ایک مختصر لفظ سے تعبیر کیا جائے، تو اُس کا دہرانا اجیرن نہیں ہوتا بلکہ ایک خاص لطف محسوس ہوتا ہے۔ ضمیر اسم کے قائم مقام ہوتی ہے۔ وہ اسی لئے وضع کی گئی ہے کہ بار بار کسی اسم کو دُہرانا نہ پڑے اور سُننے والوں کو ناگوار نہ ہو۔ تلمیحات کو اور تلمیحات کے ساتھ اصطلاحات کو اسی قدرتی ضرورت پر مبنی سمجھو۔

تلمیحات سے ہم کیا کچھ جان سکتے ہیں؟

اگر کسی زبان کی تلمیحات کا بغور مطالعہ کیا جائے، تو اُن سے اُس زبان کے بولنے والوں کے گزشتہ واقعات اور تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔ اُن کے مذہبی عقاید، اُن کے اوہام، اُن کے معاشری حالات اور اُن کی رسوم و مشاغل معلوم ہوتے ہیں۔ کسی قوم نے جس طرح تمدنی منزلیں رفتہ رفتہ طے کی ہیں اور جو تبدیلیاں اُس کی زندگی میں یکے بعد دیگرے ہوتی رہی ہیں، اُس کی زبان کی تلمیحات کے مطالعہ سے سب نظر کے سامنے آجاتی ہیں۔ مثلاً اگر آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ جرمنوں، فرانسیسیوں اور انگریزوں کے آبا و اجداد کن اوہام و خرافات پر ایمان رکھتے تھے، پھر اُن کے مذہبی خیالات میں کیا تبدیلی ہوئی، کون سے اہم تاریخی واقعات اُنھیں پیش آئے تھے، اُن کے اسلاف میں سے کون کون اشخاص مشہور ہوئے اور وہ کن کن حالات و اوصاف سے متصف تھے، تو آپ جرمن، فرانسیسی یا انگریزی زبان کی کسی ایسی فرہنگ کو اُٹھا لیجے، جس میں اُس زبان کی تلمیحات درج کی گئی ہوں۔ ایک سرسری نظر اُس فرہنگ پر ڈالنے سے آپ پر سب کچھ منکشف ہو جائے گا۔

فرضی قصّوں میں جن اشخاص کے خاص حالات اور خاص صفات کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ آج کل اُن سے بھی تلمیح کا کام لیا جاتا ہے۔ جب کوئی انشا پرداز یا شاعر کسی ایسے شخص کا ذکر اپنی انشا یا نظم میں کرتا ہے، جس کے صفات اور حالات قصّے کے کسی مشہور شخص سے ملتے جلتے ہوں، تو وہ اپنے شخص کو اُس سے تشبیہ دینا کافی سمجھتا ہے۔ نظم و انشا کے پڑھنے والے اس تشبیہ سے فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ شخص مذکور میں کون سی صفات اور کون سے حالات پائے جاتے ہیں۔ فرضی قصّوں کی تلمیحات سے اُس قوم کے انشا پردازوں کی قوتِ تخیل کا سراغ ملتا ہے، جس کی زبان میں اس قسم کی تلمیحوں سے کام لیا جاتا ہے۔ انسانی زندگی، انسانی اخلاق اور انسانی معاشرت کے اس قدر پہلو ہیں کہ اُن کا شمار نہیں ہو سکتا۔ ہر پہلو کے لئے ایک نمونہ ہماری آنکھوں کے سامنے

موجود ہی۔ ہم جانتے ہیں کہ فلاں انسان اس قسم کی زندگی بسر کرتا ہی۔ فلاں آدمی میں اس قسم کے اخلاق موجود ہیں مگر یہ ضرور نہیں کہ ہماری گزشتہ تاریخ میں بھی کوئی نمونہ ایسا موجود ہو۔ اس لئے ضروری ہی کہ ہم اس خاص نمونے کے انسان کی صحیح تصویر قصے کے پیرایہ میں کھینچیں۔ پھر دیگر مصنفین جب اسی نمونے کے اشخاص کا ذکر کریں، تو اس قصّے کے نمونے کو تلمیح بنا کر اُس سے کام لیں۔ شایستہ اور ترقی یافتہ قوموں کے انشا پردازوں نے اسی ضرورت سے خاص خاص طریقۂ زندگی اور خاص خاص اخلاق کے انسانوں کی تصویریں قصے کے پیرایے میں کھینچی ہیں اور قوّتِ تخیّل سے کام لے کر مکمل نمونے خاص خاص اخلاق اور خاص خاص صفات و حالات کے تیار کر دیئے ہیں۔ پھر بعد کے مصنفین نے ان نمونوں سے تلمیحات کا کام لیا ہی۔

امریکہ کا مشہور انشا پرداز آسبورن لکھتا ہی۔ "تلمیحات کیا ہیں؟ ہماری قوم کے قدموں کے نشان ہیں جن پر پیچھے ہٹ کر ہم اپنے باپ دادا کے خیالات، مزعومات، عقاید، اوہام، رسم و رواج اور واقعات و حالات کا سُراغ لگا سکتے ہیں۔"

فرانس کا نامور مضمون نگار شوئی کران تحریر کرتا ہی کہ "جب میں کسی فصیح البیان شخص کی زبان سے انقلاب فرانس کا لفظ سُنتا ہوں، تو میرا دل اُن وحشت خیز اور دہشت انگیز حالات سے بھر جاتا ہی، جن کے سبب دریائے سین کی وادیاں خون سے لبریز ہو چکی ہیں۔ مگر اس کے بعد فوراً میرے خیال کا رُخ اُس شاندار جمہوریت کی طرف پھر جاتا ہی، جس کی بنیاد ان خون سے بھری وادیوں میں اُٹھائی گئی ہی۔"

ایک گروہ جو تلمیحات کو ناپسند کرتا ہی!!

غرض کہ تلمیحات شائستہ قوموں کی ادبیات کی جان ہیں۔ ان معنی خیز اشاروں سے وہ اپنی شاعری اور ادب میں بلاغت کی روح پھونکتی ہیں۔ مگر دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں، جو اپنے تئیں تلمیحات کی اُلجھن میں ڈالنا پسند نہیں کرتے اور باوجود اس قدر فوائد کے اُن سے گریز کرتے ہیں۔ انگریزی زبان کا ایک فرہنگ نگار، جس نے تلمیحات کی ایک بسیط فرہنگ لکھی ہی، ایسے لوگوں کے خیالات کا ان الفاظ میں ذکر کرتا ہے۔ "جن واقعات پر چوبیس گھنٹے سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہی، اُن کا علم حاصل کرنے سے آج کل کے بعض نوجوان

گریز کرتے ہیں۔ وہ دیرینہ حالات کو تقویم پارینہ سمجھکر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ بس اُنھیں باتوں کو سُننا چاہتے ہیں جو آج کل اُن کے گرد و پیش سُنائی دیتی ہیں۔ تلمیحات جو ہماری قوم کے گزشتہ حالات و خیالات کے اشارے ہیں، جب اُن کی نظر سے گزرتی ہیں، تو وہ ناک بھوں چڑھاتے ہیں؛ کیونکہ اُن کے حافظے میں وہ حالات و خیالات موجود نہیں ہیں۔ اس غرض سے کہ اُن کے حافظے پر بار نہ پڑے، تلمیحات کی فرہنگیں مرتب کی گئی ہیں"۔

جب یورپ اور امریکہ میں تلمیحوں سے ناک بھوں چڑھانے والے موجود ہیں، تو عجب نہیں کہ ہمارے ملک میں بھی اس خیال کے بزرگوار موجود ہوں۔ اصطلاحات کے متعلق تو ایسا خیال رکھنے والے حضرات ہماری نظر کے سامنے ہیں، جن سے خود ہمیں شرفِ نیاز حاصل ہے۔ یہ حضرات اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کوئی اصطلاح نہ بنائی جائے۔ ہر اصطلاح کا مطلب جملوں میں ادا کیا جائے۔ اُن کو اس بات کی مطلق پروا نہیں کہ اصطلاح کا مفہوم جملوں میں ادا کرنے سے کاغذ اور وقت کا کس قدر صرفہ ہوتا ہے۔ اور ایک طویل مطلب کو بار بار دُہرانا پڑھنے والوں کو کس قدر ناگوار گزرتا ہے۔

بلاشبہ کوئی رائے ایسی نہیں ہے، جس کا ایک نہ ایک ماننے والا دنیا میں موجود نہ ہو اور کوئی خیال ایسا نہیں جو کسی نہ کسی انسان کے دل میں نہ گزرتا ہو۔ یہی حال تلمیح اور اصطلاح سے نفرت رکھنے کا ہے۔ مگر جو خیال تلمیحات و اصطلاحات کو ناپسند کرنے والوں کا ہے، اگر وہ عام طور سے سب کے دلوں میں موج زن ہوتا، تو آج دنیا کی شائستہ اور ترقی یافتہ زبانوں میں ادبیات کے لطیف ذخیرے اور علمی معلومات کے وسیع خزانے موجود نہ ہوتے ہر زبان کا ادب بار بار کی دُہرائی ہوئی خشک اور بے مزہ باتوں کا ایک طویل انبار رہتا۔ کسی قوم کو اپنے علم اور اپنے ادب پر فخر و ناز کرنے کا موقع نہ ملتا۔

تلمیحات کے ماخذ تلمیحیں کہاں سے لی جاتی ہیں۔ اگر آپ اس پر غور کریں، تو حسب ذیل ماخذ معلوم ہوں گے۔

(۱) مائتھالوجی (دیومالا) یعنی دیوتاؤں کے قصّے کہانیاں۔

(۲) مذہبی قصے - مذہبی عقاید کی کتابیں -

(۳) تاریخی واقعات

(۴) عام فرضی قصے اور افسانے

(۵) شعرا کی نظمیں؛ خاص کر وہ نظمیں جن میں قصے بیان کئے گئے ہیں -

(۶) ڈراما یا ناٹک کی کتابیں -

چنانچہ انگریزی زبان اور انگریزی ادب میں جو تلمیحات مستعمل ہیں، اُن کے ماخذوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حسب ذیل ذخیروں سے حاصل کی گئی ہیں :-

کتاب مقدس (توریت و انجیل وغیرہ کا مجموعہ) یہودیوں کی مذہبی کتاب تالمود - روم و یونان کے دیوتاؤں کے قصے - شیکسپیر کے ڈرامے - ملٹن کی پیرا ڈایز لاسٹ (بہشت گم شدہ) گلیور کا سفر نامہ - مارکو پولو کا سفر نامہ - ڈان کوئکزٹ - بنین کی پلگرمس پراگرس وغیرہ - شیریڈن، ڈکنس، ڈرائڈن، مولیر، سر والٹر اسکاٹ کوپر وغیرہ کے افسانے - کولرج، ورجل، ہومر، ملٹن، پوپ، ورڈس ورتھ، گولڈ سمتھ وغیرہ کی نظمیں - تاریخ انگلستان - تاریخ یورپ -

اس کے علاوہ بعض مشہور نظموں یا مضمونوں کی سرخیاں بھی تلمیح کے طور پر مستعمل ہیں - مثلاً کتابوں کی جنگ مینڈکوں اور چوہوں کی جنگ - شاعروں کی جنگ - مختلف بادشاہوں، شاعروں، حکیموں اور مختلف مقامات کے وصفی نام بھی تلمیح کے طور پر لائے جاتے ہیں - جو شاعروں اور انشا پردازوں نے وضع کئے ہیں - مثلاً شمال کا سکندر (سویڈن کے بادشاہ چارلس دوم کا لقب ہے) ایتھنز کی شہد کی مکھی (افلاطون) امریکہ کا ایتھنز (بوسٹن) سِک مین آف دی ایسٹ یعنی مریض مشرق (اس سے ٹرکی مراد ہے) بعض فرانسیسی اور لاطینی جملے بھی بطور تلمیح مستعمل ہیں - ان سب کے علاوہ الف لیلہ جو مشرق میں تصنیف ہوئی، ایک بڑا ماخذ السنۂ یورپ کی تلمیحات کا ہے - یورپ کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے، جس میں اس عجیب اور دلکش کتاب کا ترجمہ نہ کیا گیا ہو - یہ کتاب اس قدر مشہور اور اس قدر مقبول و ہر دل عزیز ہوئی ہے کہ کوئی خواندہ شخص اس کے مطالعہ سے محروم نہیں رہا - یہی وجہ ہے کہ

اس کتاب کے قصّوں سے سیکڑوں تلمیحات لی گئیں اور وہ ادبیات یورپ میں داخل ہوگئی ہیں اور بے تکلف بولی اور لکھی اور عام طور پر سمجھی جاتی ہیں۔

اُردو زبان کی تلمیحات انگریزی زبان کی تلمیحات کا ذکر بطور مثال کے کیا گیا ہے۔ مگر ہمارا اصلی مقصود اُردو زبان کی تلمیحات پر بحث کرنا ہے۔ ان تلمیحوں کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

(اوّل) ادبی تلمیحات یعنی وہ تلمیحیں جو اُردو نثر و نظم خاص کر نظم میں مستعمل ہیں۔

(دوم) عام تلمیحات یعنی وہ تلمیحیں جو عام طور سے بول چال میں داخل ہیں۔

اُردو زبان کی ادبی تلمیحات کہاں سے آئیں۔ اس کا پتہ چلانے کے لئے اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ جب اسلام نے عرب سے نکل کر گرد و پیش کے ملکوں کو فتح کیا، تو انھیں میں سے ایک ملک ایران بھی تھا۔ جب فاتحین کے حملوں سے ایران کو سر اٹھانے اور ہوش سنبھالنے کا موقع ملا، تو ایرانیوں نے اپنے مٹے ہوئے ادب کو زندہ کرنا چاہا۔ تمام ایران مذہب اسلام قبول کر چکا تھا۔ آتش پرستی نابید ہو چکی تھی۔ اس لئے ایران کے جدید ادب میں عرب کی مذہبی روح دوڑنے لگی۔ ایران کے جغرافیہ و تاریخ اور عرب کی مذہبیت نے مل کر ایک نیا ادب پیدا کیا، جس کو نہ ہم خالص ایرانی ادب کہہ سکتے ہیں، نہ عربی ادب۔ عربی ادب کے چمکتے ریگستان، کھجوروں کے جھنڈ، اونٹ، بادیہ نشینوں کے خیمے، مار دھاڑ اور لوٹ مار کے کینڈے، بہادرانہ عشق کے کارنامے سب کافور ہو گئے۔ مگر انبیا کے قصّے، فرشتوں کے تذکرے، جنت و دوزخ اور قیامت کے نظارے اور بعض مشاہیر عرب کے حالات ایرانی ادب پر محیط ہو گئے۔ عرب کے پہاڑوں میں سے صرف کوہِ طور کا ذکر باقی رہا۔ الوند - قاف، بیستون اور البرز ایران ہی کے رہے۔ درخت اور پھول بھی ایران ہی کی سر زمین سے لئے گئے۔ یعنی سرو، شمشاد، صنوبر، بید، چنار وغیرہ پھول بھی وہی جن سے ایران کی زمین گلزار ہے۔ یعنی سوسن، سنبل، نارون، لالہ، نازبو، شبو، بنفشہ، ریحان، نرگس وغیرہ۔ حسن و عشق کی داستانوں میں سے سلمیٰ، لیلیٰ، قیس، عذرا، وامق، یوسف، زلیخا کے نام لئے گئے اور فرہاد و شیریں کا اضافہ کیا گیا۔ دریاؤں میں مصر سے نیل اور عراق عرب سے دجلہ اور فرات لئے گئے۔ ان پر جیحوں و سیحوں کا اضافہ کیا گیا۔ عرب کے مغربی سمندر قلزم اور مشرقی سمندر عمان کا تذکرہ بھی ضروری

سمجھا گیا۔ مگر خلیج فارس کا نام نہیں لیا گیا۔ موتی عدن سے اور لعل یمن سے لئے گئے اور ان پر بدخشاں کے لعل کا اضافہ کیا گیا۔ پرندا ایران ہی کے رہے یعنی بلبل، طوطی، قمری، کبک دری، تدرو، عقاب، سیمرغ، شہباز وغیرہ۔ بادشاہ اور پہلوان بھی ایرانیوں نے اپنے وطن کی تاریخ ہی سے لئے۔ یہی جدید ایرانی ادب جو نہ عربی ادب ہے، نہ ایرانی ادب، بلکہ ایک نئے نام عربیرانی کہلانے کا مستحق ہے، ہندوستان کے مغربی حملہ آوروں کے ذریعے سے ہندوستان پہنچا۔ غزنوی، غوری، تغلق، خلجی، سادات، لودھی، سوری اور مغل خاندان جنھوں نے اپنے اپنے زمانے میں ہندوستان پر حکومت کی، اُن کی زبان فارسی تھی۔ ان زبانوں میں بھی یہی عربیرانی ادب جاری تھا۔ ہندی بھاشا پر فارسی زبان کا اثر پڑنے سے رفتہ رفتہ اُردو زبان پیدا ہوئی۔ جب فارسی شاعری کو چھوڑ کر یہاں کے شعرا نے اُردو زبان میں طبع آزمائی شروع کی، تو قدرتی طور سے اسی عربیرانی ادب کا خاکا اُتارا گیا۔ یہ شعرا حاکم اور فاتح قوم کے تھے۔ مغلوب و مفتوح قوم کی زبان یعنی ہندی اور سنسکرت کی طرف اُن کی توجہ مائل نہیں ہوئی۔ ہندو راگ مالا، ہندو تاریخ، ہندو شاعری، ہندو مذہب کو وہ دلچسپی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اس لئے لازم تھا کہ جو تلمیحیں اُردو ادب میں آئیں، وہ ہندو ماخذوں سے نہ لی جائیں؛ بلکہ عرب اور ایران کے اُسی مرکب ادب سے لی جائیں، جس کو فاتح اپنے ساتھ لائے تھے۔

اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُردو شعرا کو اگر ہندو ادبیات سے شغف نہ تھا، تو اُنھوں نے بذاتِ خود ہندوستان کا مشاہدہ کیوں نہ کیا؟ کیا ہندوستان کے شاندار پہاڑ ہمالیہ، بندھیاچل وغیرہ اور یہاں کے پُر عظمت دریا گنگا، جمنا، سندھ، برہم پتر وغیرہ اُن کے دلوں پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے تھے؟ کیا یہاں کے خوبصورت اور خوش الحان پرند کویل، پپیہا، اگن، چنڈول وغیرہ اُن کے جذبات کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتے تھے؟ کیا یہاں کے دل کش پھول اور حسین پودے، ہرے بھرے مرغزار، زرخیز میدان، جھلملاتے چشمے، اُچھلتے کودتے چرند اُن کے قالبوں میں زندگی اور مسرت کی روح پھونکنے کے لئے کافی نہیں تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آریا جب اپنا اصلی وطن چھوڑ کر یہاں آئے، تو اُنھوں نے اسی ملک کو اپنا وطن بنالیا یہاں کی تمام چیزوں کو اُنھوں نے دلچسپی کی نظر سے دیکھا، بلکہ اکثر چیزوں کو مذہبی تقدس کا جامہ پہنا دیا۔

برخلاف اس کے مسلمان فاتح بن کر آئے اور فاتح بن کر رہے۔ انھوں نے اس ملک کو اپنا وطن نہیں بنایا وہ ہمیشہ جیحوں وسیحوں اور فرات و دجلہ کے خواب دیکھتے رہے۔ یہاں کی زمین اور یہاں کے آسمان کو وہ ہمیشہ اجنبیت کی نظر سے دیکھا کئے۔ وہ اپنا ملجا و ماویٰ ہمیشہ انھیں ملکوں کو سمجھتے رہے، جن سے نکل کر یہاں آئے تھے۔ جن مسلمان بادشاہوں نے سیاست کو وطنیت کے تابع کرنے کی کوشش کی، اُن پر علم برداران مذہب کی طرف سے حملے کئے گئے۔ اس کا جو نتیجہ ہوا، وہ آنکھوں کے سامنے ہے۔ اب سے کچھ دنوں پہلے تک یہی خیالات عام و خاص سب کے دلوں پر محیط تھے۔ مولانا حالی نے اپنی مشہور نظم شکوۂ ہند کی بنیاد انھیں خیالات پر رکھی ہے۔ جب مولانا سے اس کا تذکرہ آیا، تو اُنھوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا؛ مگر اصلی اور سچی بات یہ ہے کہ شاعر اپنے زمانے کا ترجمان ہوتا ہے۔ اُس کا درجہ مصلح کا نہیں ہے۔ وہ کسی عقیدہ یا خیال کو بدلنا نہیں چاہتا، بلکہ اُن خیالات و واقعات کا نقشہ کھینچتا ہے، جو اُس کے گرد و پیش پھیلے ہوئے ہیں۔ مولانا حالی کی شاعری میں سیاست کی جھلک بھی جا بجا نمایاں ہے؛ مگر یہ اُسی حد تک ہے، جہاں تک کہ اُن کے زمانے میں مسلمانوں کے سیاسی خیالات پہنچ چکے تھے۔ زمانۂ حال کا یہ سیاسی نظریہ اُن کے زمانے میں پیدا نہیں ہوا تھا کہ مسلمان مذہب اور وطنیت پر ایک ساتھ عمل کر سکتے ہیں اور ان دونوں میں کوئی ٹکر نہیں ہو سکتی۔ اس بنا پر مولانا حالی معذور تھے اور اس خیال کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔

غرض کہ یہی وجہ تھی کہ اُردو ادب میں جو تلمیحات آئیں، وہ عبرانی ادب سے آئیں۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ، قدیم ادب، یہاں کے مذہب، یہاں کے رسم و رواج اور یہاں کے قدرتی مناظر سے ان کو کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اب ہم عبرانی تلمیحات کا ذکر کرتے ہیں۔ ان تلمیحات کی دو قسمیں ہیں۔

(اول) وہ تلمیحات جو عربی اثر سے داخل ہوئیں۔

(دوم) وہ تلمیحات جن میں خالص ایرانی اثر ہے۔

اُردو ادبی تلمیحات (قسم اول)

ادبی تلمیحات کی قسم اول میں سب سے پہلے انبیا کے متعلق تلمیحات ہیں، جن کو تمام اہل اسلام عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں:۔

آدم کی پیدایش۔ فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ آدم کو سجدہ کریں۔ شیطان نے انکار کیا اور ملعون ہوا۔ خدا نے آدم کی پیدایش سے پہلے فرشتوں سے فرمایا تھا کہ میں زمین پر اپنا ایک نائب اور خلیفہ بھیجنا چاہتا ہوں۔ فرشتوں نے کہا۔ آدم کی اولاد زمین پر خون بہائیگی۔ وہ خلیفہ بنانے کے قابل نہیں۔ یہ حق ہم کو ہے؛ کیونکہ ہم تیری عبادت کرتے اور تیری حمد وثنا میں مشغول رہتے ہیں۔ خدا نے فرمایا۔ تم میری مصلحتوں سے آگاہ نہیں۔ آدم پیدا ہوئے فرشتوں کے ساتھ اُن کا امتحان لیا گیا جن باتوں کا جواب آدم سے بن پڑا، فرشتے اُن کا جواب نہ دے سکے۔ آدم کی جو اولاد قیامت تک ہونے والی ہے، اُن سب کی روحیں حاضر کی گئیں۔ خدا نے اُن سے پوچھا۔ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ یعنی کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں ؟ قَالُوا بَلٰی یعنی اُنھوں نے کہا ہاں بے شک تو ہمارا رب ہے۔ اس قصہ کی تلمیحات میں بلیٰ، قالوا بلیٰ، الست، روزِ الست، عہدِ الست، مستِ الست وغیرہ الفاظ آتے ہیں۔ حضرت آدم کو بہشت میں رہنے کا حکم ہوا۔ تنہائی سے اُن کی طبیعت گھبرائی۔ حوّا اُن کی پسلی سے پیدا کی گئیں۔ بہشت میں گیہوں کا درخت تھا۔ حکم ہوا۔ اس درخت کے پاس نہ جانا۔ حوّا کو شیطان نے بہکایا۔ گیہوں کا دانہ اُنھوں نے خود بھی کھایا اور آدم کو بھی کھلایا۔ نافرمانی کی سزا میں دونوں بہشت سے نکالے اور زمین پر ڈالے گئے۔ اس قصہ کی تلمیح میں شیطان کے مددگاروں سانپ اور مور کا بھی ذکر آتا ہے۔ شیطان کی تلمیح میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ پہلے فرشتوں کا معلم تھا، جس کی تلمیح میں معلم الملکوت کا لفظ آتا ہے وہ آگ سے پیدا کیا گیا تھا اور آدم خاک سے۔ جب شیطان نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا، تو دلیل یہی پیش کی تھی کہ میں آگ سے پیدا ہوا ہوں آدم خاک سے۔ اس بنا پر میں اُس کے آگے سجدہ نہیں کرسکتا۔ سرکشی کے سبب شیطان کے گلے میں لعنت کا طوق ڈالا گیا۔ اُس نے اولاد آدم کو بہکانے کی اجازت طلب کی۔ اجازت دی گئی؛ مگر خدا نے فرمایا کہ میرے نیک بندوں پر تیرا قابو نہیں چلے گا۔ آدم کے بیٹوں میں سے قابیل نے ہابیل کو مار ڈالا۔ اس کا ذکر بھی بطور تلمیح کے آتا ہے

حضرت لوط کا ذکر بھی تلمیحاً آتا ہے، جن کی بیوی کافر تھی۔ اُن کی قوم پر آگ اور پتھر بطور عذاب کے برسائے گئے۔ چونکہ آدم سے نسل انسانی چلی اس لئے ان کو ابو البشر کہتے ہیں۔

حضرت نوح نے عمر دراز پائی۔ اس کی تلمیح میں عمرِ نوح کا لفظ آتا ہے۔ وہ مدت دراز تک اپنی قوم کو سمجھاتے رہے۔ مگر (۸۰) آدمیوں کے سوا کوئی اُن پر ایمان نہیں لایا۔ آنھوں نے اپنی قوم کے لئے بد دعا کی۔ خدا نے پانی کا طوفان بھیجا۔ حضرت نوح کو پہلے سے خبر دی گئی۔ ہدایت الٰہی کے مطابق آنھوں نے ایک کشتی تیار کی اُس میں ہر جانور کا ایک جوڑا رکھا؛ تاکہ طوفان کے بعد اُن جانوروں کی نسل چلے۔ (۸۰) مُریدوں کو بھی اُسی کشتی میں جگہ دی۔ آغاز طوفان کے وقت آسمان سے موسلا دھار پانی برسنے لگا اور ایک بُڑھیا کے تور سے بھی الغاروں پانی اُبلنے لگا۔ کشتی پانی پر تیرنے لگی۔ درختوں اور ٹیلوں پر پانی بھر گیا۔ حضرت نوح کا بیٹا کنعان اُن سے سرکش رہا۔ اُس نے باوجود بار بار بُلانے کے کشتی میں پناہ نہیں لی۔ ایک تند موج آئی اور اُسے بہالے گئی۔ حضرت نوح کی کشتی جودی پہاڑ پر ٹھیری۔ کبوتر جو کشتی میں سے چھوڑا گیا تھا، زیتون کی ہری ٹہنی چونچ میں لایا اور اُس نے طوفان کے تھمنے کی خبر دی۔ اس قصّے کی طرف جب اشارہ کیا جاتا ہے، تو حسب ذیل الفاظ آتے ہیں۔ کشتیِ نوح۔ طوفانِ نوح۔ کنعان کی تلمیح میں، جو حضرت نوح کا ناخلف بیٹا تھا، فرزندِ نوح اور پسرِ نوح کے الفاظ آتے ہیں۔ آدم کے بعد حضرت نوح سے دوبارہ نسل انسانی چلی؛ اس لئے اُن کو آدم ثانی بھی کہتے ہیں۔

عاد عرب کی ایک قوم تھی، جو اپنے تئیں عاد بن سام بن نوح کی نسل بتاتی تھی۔ حضرت ہود اُن کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے تھے۔ مگر اُنھوں نے نافرمانی کی اور آندھی کا عذاب اُن پر بھیجا گیا اور سب ہلاک ہوگئے۔ اس قصہ کی تلمیح میں طوفانِ عاد یا صرصرِ عاد کا لفظ آتا ہے۔

ثمود عرب کی ایک اور قوم تھی، جو چار واسطوں سے اپنے تئیں حضرت نوح کی اولاد بتاتی تھی۔ ان کی ہدایت کے لئے حضرت صالح بھیجے گئے تھے۔ انھوں نے بھی سرکشی کی اور حضرت صالح کی اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔ نافرمانی کے سبب یہ بھی ہلاک کر دیئے گئے۔ اس قصہ کی تلمیح میں ناقہ صالح کا لفظ مستعمل ہے۔

حضرت زکریا پیغمبر آرہ سے چیرے گئے۔ اس کا ذکر بھی شعرا نے بطور تلمیح کے بار بار کیا ہے۔

حضرت یونس کو ایک مچھلی نگل گئی تھی۔ وہ مچھلی کے پیٹ کے اندر بھی خدا کی حمد و ثنا میں مشغول رہے

آخر مچھلی نے اُن کو دریا کے کنارے پر اُگل دیا۔ ماہی یونس کے لفظ سے اسی قصہ کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

حضرت ایوب پر امتحاناً خدا کی طرف سے طرح طرح کی تکلیفیں نازل ہوئیں؛ مگر اُنھوں نے اُف نہیں کی اور ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرتے رہے۔ صبر ایوب کی تلمیح اسی قصے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

حضرت داؤد نہایت خوش الحان تھے۔ وہ جب خدا کی حمد و ثنا کے راگ گاتے، تو پرند اُن کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ مزامیر داؤد۔ نغمۂ داؤد۔ لحن داؤدی کے الفاظ سے یہی مراد ہے۔ اُن پر زبور نازل ہوئی۔ معجزہ یہ تھا کہ لوہا ہاتھ میں آتے ہی موم بن جاتا تھا۔ وہ لوہے کی زرہ آسانی سے بنا لیتے تھے۔ اس معجزہ کا ذکر بھی شعرا نے بارہا کیا گیا ہے۔

حضرت سلیمان حضرت داؤد ہی کے بیٹے تھے۔ اُن کو خدا نے عظیم الشان سلطنت عطا کی۔ انسان، دیو پری، چرند پرند سب اُن کے مطیع تھے۔ اُنھوں نے بیت المقدس کی عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی۔ ہوا اُن کے تخت کو جہاں وہ چاہتے، اُڑائے جاتی تھی۔ ان کے پاس ایک انگوٹھی تھی، جس پر اسم اعظم کندہ تھا۔ اسی کی برکت تھی کہ تمام مخلوق پر اُن کو حکمرانی حاصل تھی۔ ایک دیو اس انگوٹھی کو چرائے گیا۔ سلطنت حضرت سلیمان کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس حالت میں وہ ایک ماہی گیر کے پاس ملازم ہو گئے۔ انگوٹھی چرا کر دیو آسمان پر اڑا؛ مگر انگوٹھی اُس کے ہاتھ سے سمندر میں گر پڑی۔ سمندر کی ایک مچھلی نے اُس انگوٹھی کو نگل لیا۔ جب خدا کو منظور ہوا کہ حضرت سلیمان کی سلطنت پھر بحال ہو، تو ایک دن وہی مچھلی ماہی گیر کے جال میں آ گئی۔ مچھلی کا پیٹ چیرا، تو انگوٹھی نکل آئی۔ حضرت سلیمان نے اُس کو پھر پہن لیا اور تخت سلطنت پر پھر بدستور جلوہ افروز ہوئے۔ تختِ سلیمانی۔ خاتم سلیمانی انگشتری سلیمانی۔ انھیں باتوں کو یاد دلاتے ہیں۔ حضرت سلیمان کے زمانے میں ملک سبا پر حکمراں بلقیس تھی۔ ہدہد حضرت سلیمان کا پیغام بلقیس کے پاس لے گیا۔ اُس نے اطاعت قبول کی اور دربار میں حاضر ہوئی۔ یہاں اُس کے آنے سے پہلے اُس کا تخت جو جواہر سے مرصع تھا، منگا کر دربار میں سجا دیا گیا تھا۔ قصر سلیمانی کے صحن میں شیشے کا فرش تھا اُس کے نیچے پانی کا حوض تھا۔ اسی فرش سے گزر کر دربار میں سب لوگ جا سکتے تھے۔ بلقیس کو شبہ ہوا کہ محل کے صحن میں پانی بھرا ہے۔ اُس نے پانی میں اُترنے کے لئے اپنے پائینچے چڑھا لئے۔ بلقیس دربار میں

اپنے تخت کو رکھا دیکھکر حیران رہ گئی اور حضرت سلیمان کی عظمت اور قوت کی قائل ہوئی۔ بلقیس۔ سبا۔ ہدہد اور حضرت سلیمان کے شیش محل کا ذکر بار بار شعرانے کیا ہے۔ ہدہد کو مرغِ سلیمان بھی کہتے ہیں۔ سلیمان کے ساتھ مور یعنی چیونٹی کا ذکر بھی ضرور آتا ہے۔ کہاں چیونٹی جو ایک حقیر مخلوق ہے اور کہاں سلیمان جو دنیا کے تمام بادشاہوں سے زیادہ صاحب عظمت و اقتدار تھے۔ مور و سلیمان کے متعلق ایک چھوٹا سا قصہ بھی ہے۔ حضرت سلیمان پرندوں کی بولیاں سمجھتے تھے۔ اس کی طرف لفظ منطق الطیر سے اشارہ کیا جاتا ہے۔

حضرت یوسف اور حضرت یعقوب دونوں کا ذکر اکثر ایک ساتھ آتا ہے۔ حضرت یوسف حضرت یعقوب کے بیٹے تھے۔ ایک ماں سے حضرت یوسف اور یا مین اور دوسری ماں سے گیارہ بیٹے اور تھے۔ حضرت یعقوب حضرت یوسف کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ بھائیوں کو یہ بات سخت ناگوار تھی۔ ایک بار حضرت یوسف نے خواب دیکھا کہ چاند سورج اور گیارہ ستارے اُن کو سجدہ کر رہے ہیں۔ اس خواب کو سُن کر حضرت یعقوب نے منع کیا کہ اس کا ذکر بھائیوں سے نہ کرنا ایک دن شکار و تفریح کے بہانے سے بہت اصرار کے ساتھ حضرت یوسف کو اُن کے بھائی جنگل کو لے گئے، اور ایک اندھے کنوئیں میں اُن کو گرا دیا۔ اُن کا کُرتا پھاڑ ڈالا اور خون سے آلودہ کرکے باپ کے سامنے لائے اور کہا کہ یوسف کو ایک بھیڑیئے نے پھاڑ کھایا۔ یہ کُرتا اُن کا ہاتھ لگا ہے۔ حضرت یعقوب نہایت غمگین ہوئے۔ مصر کو ایک تجارتی قافلہ جا رہا تھا۔ اس قافلہ کا ایک غلام کنوئیں پر پانی لینے کے لئے پہنچا۔ اُس نے دیکھا کہ کوئی آدمی کنوئیں میں ہے۔ فوراً ڈول ڈال کر اُن کو کھینچا۔ حضرت یوسف حسن و جمال میں لاثانی تھے۔ عزیز مصر کی بیوی زلیخا اُن پر عاشق ہو گئی۔ مصر کی عورتیں زلیخا کو طعنہ دیتی تھیں کہ وہ اپنے غلام پر فریفتہ ہے۔ زلیخا نے ایک بار مصری عورتوں کو جمع کیا۔ حضرت یوسف کو پردہ کے پیچھے چھپا دیا۔ ایک ایک چھری اور ایک ایک لیمو ہر عورت کو دیا گیا اور اُن سے کہا گیا کہ جب یوسف پردہ کے پیچھے سے برآمد ہوں، تو ہر عورت اپنا لیمو چُھری سے تراشے۔ جب حضرت یوسف باہر آئے تو مصری عورتوں کے ہوش و حواس گم ہو گئے اور اُنھوں نے بجائے لیمو کے اپنے ہاتھ کاٹ لئے۔ زلیخا نے اُن سے کہا۔ تم مجھے اس کنعانی غلام کے حسن پر فریفتہ ہونے کا طعنہ دیتی تھیں۔ اب تمھارے ہوش و حواس

کیوں گم ہوئے۔ حضرت یوسف کو زلیخا نے بار بار اپنی طرف مائل کرنا چاہا۔ ایک دفعہ تنہائی میں مکان کے دروازے بند کرکے اُن سے التجائیں کیں؛ مگر حضرت یوسف پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اُس کے پاس سے بھاگے دروازوں کے قفل خود بخود کُھلتے گئے۔ زلیخا اُن کے پیچھے دوڑتی چلی آئی۔ آخری دروازہ پر پیچھے سے اُن کا دامن پکڑ کر پھاڑ ڈالا۔ اتنے میں عزیز مصر بھی آگیا۔ اپنی بیوی پر خفا ہوا۔ بیوی نے کہا کہ یہ تمھارا غلام میری عصمت پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے مشکل سے پیچھا چھڑایا۔ خدا نے ایک دودھ پیتے بچّے کو، جو اُس وقت وہاں موجود تھا، زبان گویا عطا کی۔ اُس نے بہ آواز بلند کہا۔ اگر یوسف کا دامن آگے سے پھٹا ہے، تو وہ خطا وار ہے۔ اور اگر پیچھے سے پھٹا ہے، تو زلیخا کی خطا ہے۔ دیکھا تو دامن پیچھے سے پھٹا تھا۔ عزیز نے یہ دیکھ کر اپنی بیوی کو سخت ملامت کی؛ مگر عشق کا بھوت جو سر پر سوار تھا، کب مانتا تھا۔ زلیخا حضرت یوسف کے ہمیشہ درپے رہی؛ مگر جب دیکھا کہ کوئی منتر کارگر نہیں ہوتا، تو الزام لگا کر اُن کو قید خانے میں بھجوا دیا۔ حضرت یوسف قید خانے میں سخت تکلیفیں اُٹھاتے تھے؛ مگر صابر و شاکر تھے۔ اُن کو تعبیر خواب میں خاص مہارت تھی۔ دو قیدیوں کے خوابوں کی تعبیر اُنھوں نے بتائی اور ویسا ہی ظہور میں آیا۔ ایک قیدی نے جس کے خواب کی تعبیر بتائی گئی تھی اور جو بادشاہ مصر کے دربار میں ساقی گری کی خدمت پر مامور ہو گیا تھا، ایک موقع پر جب بادشاہ نے آنے والے قحط کی نسبت ایک دہشت ناک خواب دیکھا تھا، حضرت یوسف کی تقریب کی حضرت یوسف نے اُس کے خواب کی صحیح تعبیر بتائی اور کہا کہ سات برس تک ملک میں سماں رہے گا۔ پھر سات برس کا کال پڑیگا۔ بادشاہ نے حضرت یوسف کو اپنا نائب السلطنت بنا کر قحط کا انتظام اُن کے سپرد کیا حضرت یوسف نے اُس وقت جب کہ سماں تھا، خوب غلہ جمع کیا اور قحط کے زمانے میں لوگوں کو تقسیم کیا۔ حضرت یوسف کے بھائی بھی قحط سے تنگ آکر مصر میں غلہ خریدنے کے لئے آئے حضرت یوسف نے اُن کو پہچان لیا۔ بہت سا غلّہ دیا۔ سُنا کہ اُن کے غم میں حضرت یعقوب کی آنکھیں روتے روتے سفید ہو گئی ہیں۔ اُنھوں نے اپنی خبر بھیجی اور اُن کو مصر میں بُلایا۔ جب حضرت یوسف کے بھائی کنعان میں باپ کے پاس پہونچے، تو اُنھوں نے حضرت یوسف کا پیراہن پیش کیا۔ آنکھوں نے پیراہن کو چھُوا اور یکایک بینائی عود کر آئی۔ حضرت یعقوب

کو پیراہن سے حضرت یوسف کی خوشبو محسوس ہوئی۔ یہ قصہ نہایت دلچسپ ہے۔ قرآن مجید میں پوری ایک سورۃ اسی قصہ میں ہے۔ بہت سی کتابیں نثر و نظم میں ہیں، جن میں یہ قصہ بیان کیا گیا ہے۔ شعرا نے اس قصہ کی تلمیحات کثرت سے بیان کی ہیں، جو حسب ذیل الفاظ سے اس قصے کے مختلف اجزا کو یاد دلاتی ہیں۔ ماہ کنعان (حضرت یوسف)، چاہ کنعان۔ چاہ یوسف۔ حسن یوسف۔ زندان یوسف۔ بیت الحزن (حضرت یعقوب کا غم خانہ، جس میں وہ بیٹھے رویا کرتے تھے) خواب یوسف۔ برادرانِ یوسف۔ عزیز مصر۔ زلیخا۔ پیرِ کنعان (حضرت یعقوب)

حضرت ادریس کی نسبت مشہور ہے کہ وہ جیتے جی جنت میں پہنچا دیئے گئے۔ شاعری میں اُن کا ذکر بہت کم آتا ہے۔ اسی طرح حضرت یحییٰ کا بھی۔

حضرت الیاس کی نسبت مشہور ہے کہ سمندر کی خدمت اُن کے سپرد ہے اور حضرت خضر خشکی کی خدمت پر مامور ہیں، مگر عام طور سے اُردو اور فارسی ادب میں بحر و بر دونوں میں رہنمائی اور مشکل کشائی کا کام حضرت خضر ہی کے حوالے کیا گیا ہے۔ جہازوں اور کشتیوں کی رہنمائی طوفان کے وقت مصیبت زدوں کی مدد کرنا، جنگلوں اور بیابانوں میں رستہ بھولنے والوں کو راہِ راست پر لگانا انھیں کا کام سمجھا جاتا ہے۔
سکندر اور خضر ایک ساتھ آبِ حیات کے چشمے کی طرف جاتے ہیں اور ظلمات کو طے کرتے ہیں؛ مگر خضر کامیاب ہوتے ہیں اور آبِ حیات پی کر زندۂ جاوید ہو جاتے ہیں۔ سکندر ظلمات میں بھٹک کر واپس آتا ہے اور اپنی قسمت کی محرومی پر افسوس کرتا ہے۔ آبِ حیات۔ آبِ بقا۔ چشمۂ حیواں۔ آبِ خضر۔ چشمۂ خضر آبِ حیواں۔ چشمۂ زندگی۔ ظلمات۔ راہِ ظلمات۔ اسی قصے کی تلمیحات ہیں۔ حضرت خضر کو شعرا مبارک قدم خجستہ پے کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

لقمان کو بعض نے حکما کے گروہ میں اور بعض نے پیغمبروں کے زمرہ میں شامل سمجھا؛ مگر اُن کی حکمت کے سوا کوئی چیز مشہور نہیں۔

حضرت ابراہیم کا لقب خلیل اللہ ہے۔ اُن کی مہمان نوازی مشہور ہے۔ خوانِ خلیل کی تلمیح اسی کی طرف

اشارہ کرتی ہے۔ حضرت ابراہیم کے نام کے ساتھ اُن کے باپ آذر کا نام بھی بت تراش کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم جب ہوش سنبھالتے ہیں، تو اُن کو بتوں سے نفرت ہوتی ہے۔ وہ بت خانۂ آذر کے بتوں کو توڑ ڈالتے ہیں۔ بادشاہِ وقت نمرود اُن کا ذکر سُن کر بگڑ جاتا ہے اور اُن کو آگ میں ڈالنے کا حکم دیتا ہے، مگر آگ گلزار ہو جاتی ہے۔ آتشِ نمرود۔ گلزارِ خلیل۔ گلزارِ ابراہیم۔ نمرود ایک سرکش اور مغرور بادشاہ تھا۔ ایک مچھر اُس کی ناک میں گھس کر اس کا کام تمام کرتا ہے۔ اور پشہ اور نمرود کی جنگ بھی ہماری شاعری کا ایک خاص مضمون ہے۔ حضرت ابراہیم کا امتحان لیا جاتا ہے۔ وہ اپنے محبوب بیٹے اسمٰعیل کو خدا کے رستے میں قربان کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر ایک مینڈھا نمودار ہوتا ہے اور حکم ہوتا ہے کہ اسمٰعیل کے عوض اس کی قربانی کرو۔ عیدِ قرباں اسی واقعہ کی یادگار ہے۔ حضرت اسمٰعیل کو اسی قصے کی وجہ سے ذبیح اللہ کا لقب دیا گیا ہے۔ ذبحِ عظیم کا لفظ بھی اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ حضرت ابراہیم اپنے بیٹے اسمٰعیل کو اُن کی والدہ کے ساتھ مکہ میں چھوڑ آتے ہیں یہاں پانی کا نام نہیں۔ حضرت اسمٰعیل کے لئے پانی کی تلاش میں اُن کی والدہ حضرت ہاجرہ اُس بیابان میں ہر طرف دوڑتی ہیں، مگر پانی کا نشان نہیں ملتا۔ حضرت اسمٰعیل پیاس کی شدت سے روتے اور ایڑیاں رگڑتے ہیں۔ یکایک اُن کے قدموں کے نیچے چشمۂ زمزم نمودار ہوتا ہے، جو آج تک متبرک خیال کیا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم کعبہ کی بنیاد رکھتے ہیں۔ سنگِ اسود جسے حجرِ اسود بھی کہتے ہیں اُسی زمانۂ تعمیر کی یادگار ہے، جو اب تک کعبہ میں نصب ہے۔ ہر حاجی اُس کو ادب سے بوسہ دیتا ہے۔ شعرا کعبہ کو بیت اللہ۔ بیت الحرام۔ مسجدِ حرام۔ بیت العتیق کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔

حضرت موسیٰ بھی نہایت جلیل القدر پیغمبر تھے۔ اُن پر توریت نازل ہوئی۔ اُن کا لقب کلیم اللہ ہے۔ اُن کے زمانہ میں جو فرعون مصر پر حکمران تھا، وہ نہایت سرکش اور مغرور تھا اور خدائی کا دعویٰ کرتا تھا۔ کاہنوں اور نجومیوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ اُس کو ہلاک کرنے والا بنی اسرائیل میں پیدا ہوگا۔ بنی اسرائیل کی حالت اُس زمانہ میں نہایت زبوں تھی۔ وہ مصر میں غلامی اور مزدوری کی خدمتیں انجام دیتے تھے۔ فرعون نے پیشین گوئی سُن کر بنی اسرائیل کے بچوں کو ہلاک کرنا شروع کیا۔ حضرت موسیٰ جب پیدا ہوئے، تو اُن کی

والدہ نے اُن کو ایک گہوارہ میں ڈال کر دریا کی نذر کر دیا۔ یہ گہوارہ بہتے بہتے فرعون کے محل تک پہنچا۔ فرعون کی بیوی نے اُس کو دریا سے نکلوایا۔ بچّے کی شکل دیکھکر رحم آیا۔ پالنے کا عزم مصمم کر لیا۔ فرعون کو اس بچے پر اپنے قاتل کا شبہ ہوا۔ چاہا کہ ہلاک کر ڈالے، مگر فرعون کی بیوی حائل ہوئی۔ فرعون نے اس بچّے کا امتحان عجیب طریقے سے کیا۔ ایک طشت لعلوں سے اور ایک طشت انگاروں سے بھرا سامنے لایا گیا۔ فرعون کا خیال تھا کہ اگر یہ بچہ وہی ہے، جو میرا قاتل ہوگا، تو انگاروں پر ہاتھ نہیں ڈالے گا۔ جب بچّے نے ہاتھ لپکایا، تو قریب تھا کہ لعلوں کے طشت پر پڑے، مگر فرشتے نے ہاتھ کھینچکر انگاروں کے طشت پر رکھدیا۔ ایک انگارا اُٹھایا اور جھپ سے موںھ میں رکھ لیا۔ ہاتھ کی ہتھیلی اور زبان دونوں جل گئیں۔ ہاتھ کا سفید داغ بعد میں ید بیضا کے معجزہ سے تبدیل کر دیا گیا۔ مگر زبان میں لکنت ساری عمر باقی رہی۔ حضرت موسیٰ کے لئے دودھ پلانے والی عورت کی تلاش ہوئی، تو اُن کی والدہ ہی کو یہ موقع ملا اور اُنھوں نے ماں ہی کی دُودھ سے پرورش پائی۔ ہوش سنبھالنے پر حضرت موسیٰ نے شہزادوں کی طرح تعلیم پائی۔ مصری کاہنوں نے اپنے تمام علوم اُن کو سکھائے۔ اُن کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ دراصل فرعون کے بیٹے نہیں ہیں اور نہ قبطی ہیں؛ بلکہ اسرائیلی نسل کے ہیں۔ اُن کو اپنی قوم سے ہمدردی اور قبطی قوم سے نفرت ہو گئی۔ ایک دن ایک قبطی ایک اسرائیلی پر ظلم کر رہا تھا۔ یہ واقعہ دیکھ کر اُنھیں غصّہ آیا اور قبطی کو جان سے مار ڈالا۔ پھر مصر سے نکل کھڑے ہوئے۔ عرب کی سرحد پر پہنچے، تو مدین کے ایک کنوئیں پر چند نوجوان عورتوں کو اُنھوں نے پانی بھرتے دیکھا۔ پیاس شدت کی تھی پانی مانگا۔ جواب ملا کہ ہم اپنے مویشیوں کو سیراب کر لیں، تو تمھاری خبر لیں۔ حضرت موسیٰ نے کہا۔ تم مجھے پانی پلا دو۔ میں تمھارے مویشیوں کو پانی کھینچکر پلا دوں گا۔ اُنھوں نے اس شرط کو منظور کر لیا۔ یہ نوجوان لڑکیاں مدین کے پیغمبر شعیب کی بیٹیاں تھیں۔ اُنھوں نے اپنے والد بزرگوار سے اس نوجوان کا تذکرہ کیا۔ حضرت شعیب نے بُلا کر کہا کہ اگر تم بارہ برس تک ہمارے قبیلے کی بکریاں چراؤ، تو ہم اپنی لڑکی سے تمھاری شادی کر دینگے۔ حضرت موسیٰ نے منظور کر لیا۔ بارہ برس کی خدمت کے بعد شادی ہو گئی۔ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر چلے۔ راستے میں وادی ایمن ملی، جو کوہ طور کے دامن میں ہے۔ بیوی حمل سے تھیں۔ رات وہیں بسر کی اسی وقت وضع حمل ہوا۔ آگ کی ضرورت تھی۔ سامنے پہاڑ پر روشنی دکھائی دی۔ آگ لینے اُس طرف بڑھے۔ دیکھا۔ ایک درخت سرتاپا روشن ہے؛ مگر آگ کا نام نہیں۔ درخت

ہیں سے آواز آئی ۔ میں تیرا خدا ہوں ۔ تو وادی مقدس میں ہے ۔ اپنی جوتیاں اتار دے ۔ موسیٰ نے کہا ۔ ربِّ ارنی یعنی اے خدا تو اپنا دیدار مجھے دکھا ۔ جواب ملا ۔ لن ترانی یعنی تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا ۔ پھر جب تجلّی ربانی کا ظہور ہوا ، تو موسیٰ غش کھا کر گر پڑے ۔ پہاڑ لرز گیا ؛ بلکہ جل کر سُرمہ ہوگیا ۔ اس واقعہ کی طرف حسب ذیل تلمیحات میں اشارہ کیا گیا ہے ۔ تجلّی طور ۔ شعلۂ طور ۔ نخلِ طور ۔ شمعِ طور ۔ شجرِ طور ۔ نخلِ موسیٰ ۔ شجرۂ طور ۔ جلوۂ طور ۔ نخلِ ایمن شمعِ ایمن ۔ وادیٔ ایمن ۔ نورِ سینا ۔ وادیٔ سینا ۔ شعلۂ سینا ۔ طورِ سینا ۔ سرمۂ طور ۔ ربِّ ارنی ۔ لن ترانی ۔ خرّ موسیٰ (یعنی موسیٰ غش کھا کر گر پڑے) ہوش میں آئے ، تو حضرت موسیٰ کو حکم ہوا ۔ تم اور تمھارے بھائی ہارون دونوں مل کر فرعون کو میرا پیغام پہنچاؤ ۔ اسی وقت حضرت موسیٰ کو دو معجزے عطا ہوئے ۔ ایک یہ کہ جب وہ اپنے عصا کو زمین پر ڈال دیتے تھے تو وہ اژدہا بن جاتا تھا ۔ دوسرا یہ کہ جب وہ اپنا ہاتھ گریبان میں سے نکال لیتے تھے ، تو آفتاب کی طرح چمکنے لگتا تھا ۔ پہلے معجزے کی طرف عصائے موسیٰ اور عصائے کلیم کے الفاظ سے اور دوسرے معجزے کی طرف دستِ کلیم ۔ دستِ موسیٰ اور ید بیضا کے الفاظ سے اشارہ کیا جاتا ہے ۔ کوہ طور سے چل کر حضرت موسیٰ حضرت ہارون کے ساتھ مصر میں آئے ۔ فرعون نے اپنے جادوگروں کو مقابلے کے لئے پیش کیا ؛ مگر حضرت موسیٰ اپنے عصا اور ید بیضا کی مدد سے غالب آئے ۔ بڑی دقتوں اور مقابلوں کے بعد انھوں نے بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے آزاد کرایا ۔ اور اُن کو ساتھ لے کر دریا کے کنارے پہنچے ۔ عصا کی ایک جنبش سے دریا پھٹ گیا اور پایاب ہو گیا حضرت موسیٰ اپنی قوم کے ساتھ پار اتر گئے ۔ فرعون اپنے لشکر کے ساتھ اُن کے تعاقب میں عین اُس وقت پہنچا جب کہ دریا پایاب تھا اور بنی اسرائیل پار ہو چکے تھے ۔ وہ بھی اپنے لشکر کو ہمراہ لے کر دریا میں اُتر گیا ؛ مگر جب بیچ میں پہنچا ، تو پانی جو سمٹ گیا تھا ، پھر پھیل گیا اور فرعون اپنے لشکر سمیت غرق ہوگیا ۔ شاعروں نے اس دریا کا نام نیل بتایا ہے ؛ گو کہ وہ مورخین کے نزدیک بحرِ قلزم تھا ۔ دریا سے پار ہونے کے بعد حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو ہمراہ لئے اُس جنگل میں پہنچے ۔ جس کو تیہِ بنی اسرائیل کہتے ہیں ۔ یہاں چالیس برس تک رہے ۔ ہر چند بنی اسرائیل کو اُکسایا کہ فلسطین پر حملہ کرو اور فرعون کے گورنر کو نکال کر خود اپنے وطن پر قابض ہو ؛ مگر مدت دراز تک غلامی کی زندگی بسر کرنے کے سبب اُن کی ہمتوں اور جرأتوں نے جواب دیدیا تھا ۔ اس جنگل میں بنی اسرائیل کی گزران جس چیز پر تھی ، اُس کا نام منّ و سلویٰ بتایا گیا ہے ۔ عام خیال ہے کہ یہ بہشتی نعمتوں کا خوان تھا ، جو ہر روز فرشتوں کے

ذریعہ بنایا تھا اور اسی عام خیال پر شاعری کا مدار ہے۔ حضرت موسیٰ اکثر کوہِ طور پر جاتے اور خدا سے ہمکلام ہوا کرتے تھے۔ اسی مقدس پہاڑ پر اُن کو توریت کے صحیفے عطا ہوئے۔ ایک دفعہ جب وہ کوہ طور پر گئے تھے، ایک شخص نے جس کا نام سامری تھا، سونے کا ایک بچھڑا بنایا، جس میں سے آواز نکلتی تھی۔ حضرت موسیٰ کی قوم نے اس کو پوجنا شروع کردیا۔ حضرت موسیٰ جب واپس آئے تو غضب ناک ہوئے اور بچھڑے کو جو شعرا کی زبان میں گوسالۂ سامری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جلا کر خاک کر ڈالا۔

حضرت عیسیٰ بے باپ کے پیدا ہوئے۔ حضرت مریم اُن کی والدۂ ماجدہ کا نام ہے۔ وضع حمل کی تکلیف میں جس درخت کا سہارا انھوں نے لیا، وہ نخلِ مریم کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت مریم بڑی عابدہ و زاہدہ تھیں۔ رات کو نیت کرکے دن بھر کسی سے کلام نہیں کرتی تھیں اور خدا کی یاد میں مشغول رہتی تھیں۔ اسی کو صوم مریم اور روزۂ مریم کہتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ ابن مریم اور روح اللہ کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ گدھا جو اُن کی سواری میں رہتا تھا وہ خرِ عیسیٰ کے نام سے مذکور ہوتا ہے۔ مسیح و مسیحا بھی حضرت عیسیٰ ہی کے نام ہیں۔ وہ قم باذنی (یعنی کھڑا ہو میرے حکم سے) کہکر مُردوں کو زندہ کردیتے تھے۔ اس معجزے کا ذکر اعجاز عیسوی۔ دم عیسیٰ۔ اعجاز مسیحا۔ قم اور قم باذنی کے الفاظ سے کیا جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ مٹی کے جانور بنا کر اُن میں روح پھونکتے اور اُن کو اُڑا دیا کرتے تھے چمگاڈر اسی معجزہ کی یادگار ہے، جسے مرغِ عیسیٰ اور مرغِ مسیحا کہتے ہیں۔ بیماروں کو اچھا کرنا بھی حضرت عیسیٰ کا ایک معجزہ تھا اس کا ذکر بھی بار بار شاعری میں آتا ہے۔ عیسائی اُن کو ابن اللہ کہتے ہیں۔ اُن پر انجیل نازل ہوئی۔ یہودیوں نے اُن کو صلیب پر چڑھایا؛ مگر خدا نے اُن کو زندہ اٹھالیا اور وہ چوتھے آسمان پر جا پہنچے۔ قیامت کے قریب وہ دوبارہ زمین پر تشریف لائیں گے اور ایک کافر کا مقابلہ کریںگے، جس کا نام دجّال ہوگا اور جو گدھے پر سوار ہوگا۔ خرِدجال سے اسی آنے والے واقعہ کی تلمیح سمجھی جاتی ہے۔ کہتے ہیں آسمانوں پر چڑھتے وقت ایک سوئی حضرت عیسیٰ کے پیرہن میں اٹکی رہ گئی۔ چونکہ یہ دنیوی چیز تھی، اس لئے حضرت ممدوح چوتھے آسمان سے آگے نہ بڑھ سکے۔ سوزنِ عیسیٰ اسی خیال کی تلمیح ہے۔

زمانۂ انبیا کے متعلق چند تلمیحیں اور بھی آتی ہیں، جو انبیا کی ذیل میں بیان نہیں کی گئیں۔ اُن میں سے ایک ہاروت و ماروت ہے۔ یہ دو فرشتوں کا نام ہے، جنہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ انسان جس طرح نفسانی خواہشوں

میں مبتلا ہوجاتے ہیں، اسی طرح ہم اگر دنیا میں جائیں، تو کبھی مبتلا نہیں ہو سکتے۔ خدا نے اُن کو دنیا میں امتحاناً بھیجا وہ اول وعظ و عبادت میں مشغول رہے۔ پھر ایک رنڈی پر جس کا نام زہرہ تھا، عاشق ہوگئے۔ کہتے ہیں، یہ عورت نہایت حسین اور جادوگرنی تھی۔ اُس نے ان فرشتوں سے آسمان پر جانے کا علم سیکھا اور اُن کو جادو کا علم سکھایا خدا نے ان فرشتوں کو بطور سزا کے بابل کے ایک کنوئیں میں لٹکنے کی سزا دی۔ کہتے ہیں، تمام دنیا کا دھواں وہیں جاتا اور اُن کے نتھنوں میں داخل ہوتا۔ اور اُن کو ایذا دیتا ہے۔ اگر کوئی اُن سے جادو سیکھنا چاہے، تو وہ سکھا دیتے ہیں۔ رنڈی اس واقعہ کے بعد آسمان پر چلی گئی اور زہرہ تارا بن گئی۔ زہرہ اور چاہ بابل کے ساتھ یہ تلمیح وابستہ ہے۔

ایک قصہ ذوالقرنین کا ہے، جس کو عام لوگوں نے سکندر سمجھا ہے۔ کہتے ہیں کہ دو پہاڑوں کے پیچھے ایک قوم یاجوج ماجوج آباد ہے۔ اُن دونوں پہاڑوں کے درمیان ایک گھاٹی ہے جس سے یہ قوم باہر نکل کر لوگوں کو ستاتی تھی اس قوم کی شکل و صورت اور قد و قامت کی نسبت عجیب عجیب روایتیں ہیں۔ مشہور ہے کہ سکندر ذوالقرنین نے لوہے اور تانبے کو گلا کر ایک دیوار ان پہاڑوں کے درمیان بنا دی، جس سے یہ لوگ باہر نہ نکل سکیں۔ کہتے ہیں کہ ہر روز یہ لوگ اس دیوار کو چاٹ کر پتلا کر دیتے ہیں شام کو جتنی باقی رہ جاتی ہے، چھوڑ دیتے ہیں۔ رات بھر میں یہ دیوار جتنی پتلی ہوتی ہے، اتنی ہی دبیز پھر ہو جاتی ہے۔ قیامت کے قریب یہ لوگ اس دیوار سے نکل آئیں گے۔ دیوار مذکور سدِ سکندری کے نام سے مشہور ہے۔

ایک قصہ اصحابِ کہف کا ہے۔ اس کے معنی ہیں غار والے آدمی۔ جب عیسائی مذہب کی اشاعت اوّل اوّل ہوئی، تو جن سات آدمیوں نے بُت پرست رومی بادشاہ دقیانوس کے زمانے میں اس مذہب کو قبول کیا، انھیں کو اصحاب کہف کہتے ہیں۔ یہ اس بادشاہ کے ظلم سے بھاگ کر ایک پہاڑ کے غار میں جا چھپے اور تین سو برس تک سوتے رہے۔ پھر جاگے اور جاگ کر پھر سو گئے۔ ایک کُتّا ان کی ہمراہ غار کے مونہہ تک گیا اور وہ بھی وہیں سو رہا۔ اس کُتّے کا نام قطمیر بتایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اب وہ قیامت کے دن پیدا ہونگے۔ کُتّا آدمی بن کر اُٹھے گا اور وہ بھی ان کے ساتھ بہشت میں داخل ہوگا۔

ایک قصہ عنقا کا ہے کہتے ہیں کہ یہ ایک لمبی گردن کا عظیم الشان جانور تھا۔ اس کا چہرہ آدمی جیسا، پاؤں

چاٹتے تھے اور پر کئی رنگ کے تھے۔ بچوں کو اٹھائے جاتا تھا۔ جس زمانے میں اس کا ظہور ہوا حنظلہ اس زمانے کے پیغمبر تھے لوگوں نے اُن سے شکایت کی۔ اُن کی دعا سے یہ جانور ایک جزیرہ میں بھیج دیا گیا اور عام نظروں سے پوشیدہ ہوگیا اب وہ اس جزیرہ میں ہاتھی اور اژدہے کا شکار کر کے اپنا گزارہ کرتا ہے۔

ایک قصہ باغِ ارم کا ہے، جس کو ایک کافر بادشاہ شداد نے بنوایا تھا۔ اس بادشاہ نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ اُس زمانے کے پیغمبر نے نصیحت کی اور کہا کہ اگر تو راہِ حق پر آجائے، تو تجھے بہشت ملیگی۔ پھر بہشت کی کیفیت بیان کی۔ اس نے کہا کہ ایسی بہشت تو میں خود بنوا سکتا ہوں۔ چنانچہ اُس نے مقام ارم میں ایک باغ بنوایا، جواہرات سے مرصّع محل تیار کرائے۔ اُس میں حسین عورتیں حوروں کی جگہ اور حسین خادم غلمان کی جگہ رکھے۔ باغ تیار ہو چکا، تو گھوڑے پر سوار ہو کر باغ کے دروازہ پر پہنچا۔ رکاب سے پاؤں زمین پر رکھنے کی اجازت نہیں ملی۔ ملک الموت نے اُس کا دم قبض کر لیا۔ کہتے ہیں کہ اس کے مرنے کے بعد یہ باغ زمین سے اُٹھا لیا گیا اور بہشت اور دوزخ کے درمیان رکھدیا گیا۔ اب اسی کو اعراف کہتے ہیں۔ باغ ارم۔ گلزار ارم۔ جنت ارم۔ بہشتِ ارم۔ بہشت شداد جنت شداد۔ باغِ شداد اور ارم اسی قصے کی تلمیحیں ہیں۔

ایک قصہ عوج بن عنق ہے، جو حضرت آدم کے زمانے میں پیدا ہوا اور حضرت موسیٰ کے زمانے تک زندہ رہا یہ شخص بہت ہی دراز قد تھا۔ طوفانِ نوح اس کی کمر تک آیا تھا۔ حضرت موسیٰ کے زمانے میں اُس نے بنی اسرائیل کے لشکر پر حملہ کرنا چاہا اور اس غرض کے لئے ایک ۳ میل لمبا پہاڑ سر پر اُٹھا لیا اور چاہا کہ اس کو لشکر مذکور پر دے مارے مگر خدا کے حکم سے ایک ہدہد نے اس پہاڑ میں سوراخ کر دیا اور وہ پہاڑ عوج کے گلے میں اُتر گیا۔ پھر حضرت موسیٰ نے اُس کے ٹخنے کی ہڈی پر عصا مارا، جس سے وہ ہلاک ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ اُس کی پنڈلی کی ہڈی سے دریائے نیل کا پل باندھا گیا تھا۔

ایک قصہ قارون کا ہے۔ کہتے ہیں کہ قارون حضرت موسیٰ کا چچا زاد بھائی تھا۔ اُس کو کیمیا آتی تھی۔ وہ سونا چاندی بناتا اور خزانے پر خزانہ جمع کرتا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ اُس کے پاس اتنے خزانے جمع ہو گئے کہ چالیس خچروں پر اُس کے خزانوں کی کنجیاں لادی جاتی تھیں۔ حضرت موسیٰ نے اُس سے کہا کہ ہزار دینار پر ایک دینار زکوٰۃ دیا کرو۔ اُس نے انکار کیا اور حضرت موسیٰ کو ایذا پہنچانی چاہی۔ خدا نے اس کو یہ سزا دی کہ اب

تمام خزانے اُس کے سر رہیں اور وہ زمین میں برابر دھنستا چلا جاتا ہے۔ قارون کا نخل مشہور ہے۔ قارون کا خزانہ گنج قارون۔ گنجینۂ قارون۔ خزانہ قارون۔ دولتِ قارون۔ اس قصے کی تلمیحیں ہیں۔

ایک قصہ اصحاب فیل کا ہے، جو رسولِ خداؐ کی ولادتِ باسعادت سے پہلے وقوع میں آیا۔ حبش کے بادشاہ کی طرف سے ایک شخص ابرہہ نامی یمن کا گورنر تھا۔ وہ کعبہ کی طرف لوگوں کی توجہ دیکھکر حسد سے جل گیا۔ یمن میں ایک عالی شان عبادت گاہ تیار کرائی اور لوگوں کو اس کے طرف حج کی غرض سے آنے کی ہدایت کی؛ مگر کسی نے پروا نہیں کی۔ غضب ناک ہوکر ہاتھیوں کی ایک فوج سے کعبہ پر چڑھائی کی، مگر سمندر کی طرف سے ابابیلوں کا ایک لشکر آکر آسمان پر منڈلانے لگا۔ ہر ابابیل کی چونچ میں ایک سنگریزہ تھا۔ جب یہ سنگریزے ابابیلوں نے اُس لشکر پر چھوڑے، تو ہاتھیوں اور ہاتھیوں پر بیٹھنے والوں کے جسموں سے پار نکل گئے اور وہ سب ہلاک ہوگئے۔ اصحاب فیل اور طیراً ابابیل کے الفاظ اس قصے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

آنحضرتؐ سب سے اخیر پیغمبر ہیں۔ آپ کے بیشمار وصفی نام بطور تلمیح کے آتے ہیں مثلاً خاتم الانبیا۔ خاتم النبیین ختم رسلؐ۔ شافعِ محشر۔ شفیعِ روز قیامت۔ شاہِ امم۔ رسول مقبول۔ شافعِ امم۔ رحمۃ للعالمین۔ شفیع المذنبین سرورِ کائنات۔ ماہِ یثرب۔ خیرالوریٰ۔ مدینۃ العلم۔ مصطفےٰ۔ مجتبےٰ وغیرہ۔ لولاک ایک حدیث قدسی کا ٹکڑا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر تو نہ ہوتا، تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا۔ شرح صدر بھی ایک تلمیح ہے۔ قصہ یہ ہے کہ لڑکپن کے زمانے میں ایک دفعہ فرشتوں نے آپ کا سینہ چیر کر آپ کے دل کو دھویا اور صاف کیا اور نور معرفت سے بھر کر پھر آپ کے سینے کے اندر رکھدیا۔ مُہرِ نبوت ایک اور تلمیح ہے۔ یہ ایک خاص نشان حضور انور کے جسم مبارک پر تھا۔ اس مقام پر بالوں کا ایک حلقہ اس شکل کا بن گیا تھا کہ اس میں کلمے کے حروف پڑھے جاتے تھے۔ قاب قوسین کے معنی ہیں "دو کمانوں کا فاصلہ"۔ یہ تلمیح معراج کے متعلق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضور انور معراج میں خدا سے اس قدر قریب ہوئے کہ دو کمانوں کا فاصلہ، یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔ معراج خود ایک تلمیح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک رات، جب کہ آپ سو رہے تھے، جبرئیل آئے اور انھوں نے آپ کو جگاکر براق پر سوار کردیا۔ یہ ایک بہشتی چارپایہ تھا جو خچر سے چھوٹا، گدھے سے بڑا تھا۔ اس پر سوار ہوکر آپ پہلے بیت المقدس میں پہونچے، جہاں تمام انبیا کی روحیں آپ کے استقبال کے لئے جمع تھیں۔ یہاں سے

آپ نے آسمان کی طرف چڑھنا شروع کیا۔ جب آسمان پر بیت المعمور میں پہنچے، تو فرشتوں نے آپ کا استقبال کیا۔ بیت المعمور آسمان پر فرشتوں کے لئے ایسا ہی مقام ہے، جیسا کہ زمین پر انسانوں کے لئے کعبہ۔ سدرۃ المنتہیٰ جس کو سدرہ بھی کہتے ہیں، حضرت جبریل کے رہنے کا مقام ہے۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے کہا۔ میں اس مقام سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اگر آگے قدم بڑھاؤں گا، تو میرے بال و پر تجلیٔ الٰہی سے جل جائینگے۔ براق نے بھی یہاں ساتھ چھوڑ دیا۔ یہاں ایک اور عجیب سواری ملی، جس کو رفرف کہتے ہیں۔ آپ اس پر سوار ہو کر آگے بڑھے اور خدا سے خاص قرب حاصل کیا۔ حضورِ انور اس رات کو جس مقام تک پہنچے اس کا نام مقامِ محمود ہے جب واپس تشریف لائے تو آپ کے حجرۂ مبارک کی زنجیر ابھی ہلتی تھی اور آپ کا بستر ابھی گرم تھا۔ گویا آپ نے چشم زدن میں افلاک۔ عرش۔ کرسی۔ جنت۔ دوزخ وغیرہ مقامات کی سیر کر لی۔ اس واقعہ کا ذکر معراج اسرا۔ شبِ معراج۔ لیلۃ الاسرا وغیرہ الفاظ سے کیا جاتا ہے۔ غارِ حرا۔ ایک اور تلمیح ہے۔ یہ ایک پہاڑی غار مکہ کے قریب ہے یہاں آپ عبادت کے لئے اکثر جایا کرتے تھے۔ ایک تلمیح مسجد ضرار ہے۔ جب مکہ سے ہجرت کر کے آپ مدینہ میں پہنچے، تو آپ نے وہاں ایک مسجد کی بنا ڈالی۔ اس میں تمام مسلمان عبادت کا فرض ادا کرتے تھے۔ مسجد نبوی سے دور ایک اور مسجد منافقوں نے بنائی۔ غرض یہ تھی کہ وہاں اسلام اور آنحضرت کے برخلاف سازش کے مشورے کریں۔ انھوں نے آنحضرتؐ سے درخواست کی کہ ایک دفعہ آپ اس مسجد میں نماز پڑھیں۔ اور جو مسلمان کمزور ہیں اور دوری کے سبب مسجد نبوی میں نہیں آسکتے، ان کو اس نئی مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت دیں۔ وحی کے ذریعے سے آپ کو ان کا ارادہ معلوم ہو گیا۔ آپ وہاں نماز کے لئے تشریف نہیں لے گئے۔ پھر آپ کے حکم سے وہ مسجد جلا دی گئی۔ اسی کو مسجد ضرار کہتے ہیں۔ خم غدیر جو اصل میں غدیر خم ہے، ایک جھیل کا نام ہے، جہاں آخری حج سے واپسی کے بعد آپ نے آخری تقریر فرمائی۔ اہلِ بیت آپ کے کنبے والوں کو کہتے ہیں۔ خاتونِ جنت آپ کی دخترِ اطہر حضرت فاطمہ زہرا کا لقب ہے۔ یارِ غار کی تلمیح سے حضرت ابوبکر صدیق مراد ہیں، جو ہجرت کے وقت ایک پہاڑ کے غار میں حضورِ انور کے رفیق تھے فاروق یا فاروقِ اعظم حضرت عمر کا اور ذوالنورین اور جامع قرآن حضرت عثمان کا لقب ہے، جو جلیل القدر صحابی تھے۔ حضرت علی آپ کے داماد تھے۔ ان کے وصفی نام کثرت سے ہیں مثلاً فاتحِ خیبر۔ خیبر شکن۔ حیدرِ کرار

حیدر صفدر۔ ابو تراب۔ مرتضیٰ۔ مشکل کشا۔ ساقی کوثر۔ شیر خدا۔ دلدل سوار۔ شاہِ مرداں۔ اسد اللہ وغیرہ
اُن کی تلوار ذوالفقار کے نام سے مشہور ہے اور گھوڑا دُلدل کے نام سے۔ خالد بن ولید بھی ایک صحابی تھے۔
اُن کا لقب سیف اللہ ہے۔ ایک صحابی ابوہریرہ کی کنیت سے ممتاز ہیں۔ اُنھوں نے ایک بلی پال رکھی تھی۔ گربۂ
ابوہریرہ کی تلمیح سے وہی بلی مراد ہے۔ آپ کے مخالفوں میں سے ایک کی کنیت ابوجہل اور ایک کی ابولہب ہے
باغ فدک کھجوروں کا ایک باغ تھا، جو یہودیوں سے صلح ہونے پر لیا گیا تھا۔ اسی کی آمدنی پر آنحضرت کی گزران تھی
جن فرشتوں کا ذکر بطور تلمیح کے آتا ہے، اُن میں سے ایک جبریل ہیں۔ اُن کے بہت سے وصفی نام ہیں۔
مثلاً مرغ سدرہ۔ بلبل سدرہ۔ طائر سدرہ۔ سدرہ نشین۔ جبریل امین۔ جوہر اول۔ عقل کل۔ روح قدس
طائر قدس۔ روح امین۔ ناموس اکبر۔ ناموس اعظم۔ فرشتہ وحی وغیرہ۔ یہ آنحضرت کے پاس خدا کا پیام
لاتے تھے۔ ان کا مقام سدرۃ المنتہیٰ ہے۔ جیسا کہ معراج کے ذکر میں ابھی بیان ہو چکا ہے۔ ایک فرشتے کا نام
میکائیل ہے۔ روزی تقسیم کرنا اُن کا کام ہے۔ ایک فرشتہ عزرائیل ہے، جو روحوں کو قبض کرنے پر مامور ہے
اس کو ملک الموت یا قابض ارواح یا فرشتۂ موت بھی کہتے ہیں۔ ایک کا نام اسرافیل ہے۔ یہ قیامت کو صور
پھونکیں گے۔ صور اسرافیل کی تلمیح انھیں کے نام کے ساتھ منسوب ہے۔ دو فرشتے کراماً کاتبین کے نام سے
موسوم ہیں۔ ان کو کاتب اعمال بھی کہتے ہیں۔ دونوں انسان کے دائیں بائیں رہتے ہیں اور ہر ایک انسان
کی نیکی بدی لکھتے رہتے ہیں۔ وہ دفتر جس میں نیکی بدی لکھی جاتی ہے اور جو قیامت کے دن خدا کے سامنے
پیش ہوگا صحیفۂ اعمال، دفتر اعمال۔ نامۂ اعمال۔ اعمال نامہ کہلاتا ہے۔ دو فرشتے ہیں، جو قبر میں آتے
ہیں اور مردے سے سوال وجواب کرتے ہیں اُن کو منکر نکیر یا نکیرین کہتے ہیں۔ ایک فرشتہ رعد کے نام سے
موسوم ہے، جو بادلوں کو ہانکتا اور مینہ برساتا ہے۔ ایک فرشتہ جنت کا داروغہ ہے۔ اُس کا نام رضوان ہے۔
ایک اور فرشتہ ہے، جو دوزخ کا نگہبان ہے۔ اُس کو مالک کہتے ہیں۔

مرنے کے بعد قیامت تک جو زمانہ گزرے گا، اُسے برزخ یا عالم برزخ کہتے ہیں۔ جنت وہ مقام ہے جہاں
نیک آدمیوں کی روحیں رکھی جائینگی۔ اس کے بہت سے نام ہیں۔ مثلاً بہشت۔ خلد۔ جنان۔ دارالسلام
باغ جنان۔ باغ رضوان۔ فردوس۔ فردوس بریں۔ خلد بریں۔ باغ عدن۔ دارالقرار۔ علیین۔ باغ نعیم

وغیرہ - دوزخ وہ مقام ہے، جہاں گنہگار رکھے جائیں گے اور آگ کے عذاب میں مبتلا ہونگے - اُس کے بھی بہت سے نام ہیں - مثلاً نار - جہنم - جحیم - سعیر - ہاویہ - سقر وغیرہ - جنت میں ایک درخت کا نام طوبیٰ ہے، جس کی شاخیں ہر جنتی کے گھر میں پہونچی ہیں - کئی نہریں بھی ہیں، جن میں سے ایک کا نام کوثر ہے اسے چشمۂ کوثر اور حوض کوثر بھی کہتے ہیں - دیگر نہروں کے نام حسب ذیل ہیں تسنیم - نہر لبن - سلسبیل - زنجبیل - کافور - دوزخ اور جنت کے درمیان جو مقام ہے اس کا نام اعراف ہے، جہاں ایسے لوگ رکھے جائیں گے جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہیں - دوزخ کے پشت پر ایک پل ہے - جس کو پل صراط کہتے ہیں - یہ تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے - نیک آدمی اس پر سے بجلی کی طرح گزر جائینگے اور بد آدمی کٹ کٹ کر دونوں طرف دوزخ میں گرینگے - نیکیوں اور بدیوں کا اندازہ کرنے کے لئے قیامت کے دن ایک ترازو کھڑی کی جائیگی جس کو میزان یا میزان اعمال کہتے ہیں - بہشت میں جو خوبصورت عورتیں بہشتیوں کی خدمت میں ہونگی، وہ حوریں کہلاتی ہیں اور جو حسین خادم اُن کی خدمت کرینگے، وہ غلمان کے نام سے موسوم ہیں - بہشتیوں کو جو شراب پلائی جائیگی، اس کا نام شراب طہور ہے - دوزخ میں دوزخیوں کو ایک کانٹے دار پھل کھانے کو دیا جائے گا، جو زقوم کہلاتا ہے - دوزخ میں بہت سے گنہگار جھونکے جائیں گے، مگر اُس کا پیٹ نہیں بھرے گا - وہ بار بار یہ صدا بلند کریگی "ھل من مزید" (کیا میرے لئے کچھ اور بھی خوراک ہے؟) یہ آیت بھی بطور تلمیح کے بار بار آتی ہے -

اس کے علاوہ حاتم کی فیاضیوں اور لیلےٰ و قیس کی عشق بازیوں کے قصے بھی عرب سے ایران میں آئے اور ایرانی ادب میں گھل مل گئے -

(باقی آئندہ)

تجویز اصلاح رسم الخط

(از جناب مولوی سید ہاشمی صاحب رکن دارالترجمہ جامعۂ عثمانیہ)

اس عنوان سے عبداللہ یوسف علی صاحب کا جو مضمون رسالۂ اُردو کے جنوری کے پرچے میں چھپا ہی اُس کے دو حصّے ہیں :-

(۱) پہلے میں اُنھوں نے مرکّب افعال و الفاظ کو ملا کر لکھنے کے متعلق چند قاعدے تجویز کئے ہیں اور تیسرے قاعدے میں حروف ربط و جار کو علٰحدہ علٰحدہ لکھنے پر زور دیا ہی۔ لیکن یہ سب قاعدے درحقیقت ایک مقررہ اصول املا کے تحت میں آتے ہیں اور وہ یہ ہی کہ :

"تمام مستقل الفاظ خواہ وہ مفرد استعمال کئے گئے ہوں اور خواہ مرکب الفاظ کا جزو بن گئے ہوں، علٰحدہ علٰحدہ اور بغیر ملائے تحریر کرنے چاہئیں"

اس اصول کی رو سے عبداللہ یوسف علی صاحب کے پہلے تینوں قاعدے درست اور قابل تسلیم ہیں۔ اگرچہ دوسرے کے متعلق کسی قدر گفتگو کی گنجائش باقی رہتی ہی لیکن اس جگہ ہم صرف اُن کی چوتھی تجویز کے ایک حصّے سے اختلاف کریں گے اور وہ یہ ہی کہ مرکب الفاظ کے جو اجزا ترمیم و ترخیم کی وجہ سے اب مستقل لفظ نہیں رہے اُن کو صاحب موصوف کی تجویز کے مطابق ہم علٰحدہ لکھنا درست نہیں سمجھتے مثلاً :-

"کن پھٹا"، "پن گھٹ" وغیرہ جن کا صحیح املا "کنپھٹا" اور "پنگھٹ" ہونا چاہیئے۔ البتہ وہ مرکبات جن کے اجزا اصلی حالت میں (یعنی بامعنی لفظ) ہیں علٰحدہ علٰحدہ لکھنے چاہئیں۔ جیسے "شیخی خور"

"کام چور" وغیرہ

پہلی قسم کے الفاظ کو عبداللہ یوسف علی صاحب نے علیحدہ علیحدہ مگر درمیان میں فصل چھوڑے بغیر لکھنے کی جو صورت تجویز کی ہے وہ تکلف سے خالی نہیں۔ اور پتھر کے چھاپے یا عام تحریر میں اس کی پابندی کرنی محال ہوگی

---

(۲) عبداللہ یوسف علی صاحب کے مضمون کا آخری حصہ زیادہ تفصیلی اور اصولی بحث کا محتاج ہے۔ راقم الحروف کو اس بارے میں اُن سے زبانی گفتگو کرنے کا بھی موقع ملا تھا! یہ عجیب بات ہے کہ صاحب موصوف اور اُن کے ہم خیال یٓ اور وٓ کی بحث کرتے وقت شاید اعراب کے وجود سے ہی خالی الذہن ہو جاتے ہیں جن کے بغیر اُردو تحریر کا کوئی لفظ بھی صحیح نہیں لکھا جا سکتا! ورنہ ظاہر ہے کہ ماقبل مفتوح اور معروف ہونے کی حالت میں تو کسی نئے قاعدے کی مطلق ضرورت نہیں کیونکہ مقررہ اعراب لگانے سے یہ آوازیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً:۔

ماقبل مفتوح
- دَیر (بمعنی معبد)
- دَور (بمعنی چکّر)

معروف
- دِیر (فارسی تلفظ بمعنی تاخیر)
- دُور (بمعنی بعید)

اب رہی مجہول حالت میں ان حروف کی وہ آواز جسے خالص ہندی آواز سمجھنا چاہیئے۔ اس کے لئے اُردو تحریر و تلفظ میں خود ان حروفِ علت کو "اعراب" یعنی ایک قسم کا زیر و پیش مان لیا گیا ہے اور جب ان کے ماقبل حرف پر کوئی اعراب نہ لگایا جائے تو وہاں ہمیشہ مذکورہ بالا ہندی آواز پیدا ہو جاتی ہے جیسے پھیر، ڈھیر، ڈول، گھول وغیرہ ہندی الفاظ میں ہے۔

بے شبہ اس آواز کو ظاہر کرنے کے واسطے کوئی خاص علامت مقرر نہیں ہے۔ مگر جو اُستاد اس اصول کو سمجھتے ہیں ہجے کراتے وقت مبتدی کو بتا دیتے ہیں کہ ایسے الفاظ میں یٓ اور وٓ سے پہلے کوئی زیر زبر پیش نہیں ہوتا بلکہ انھیں بجائے خود حرفِ ماقبل کے ساتھ ملا کر وسطی یا ہندی آواز نکالی جاتی ہے۔ غرض ہمیں اس بارے میں کسی نئے قاعدے کی ضرورت نہیں اور پنجاب والوں نے لفظ کے آخر میں جو لمبی ےٓ لکھنے کا طریقہ

نکالا ہے وہ بھی درحقیقت غیر ضروری بلکہ بے اصولی کی بات ہے اور گو اس سے ایک ظاہری سہولت ضرور ہو گئی لیکن اس کو دیکھ کر وہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے جس میں عبداللہ یوسف علی صاحب اور اُن کے دوسرے ہم خیال مبتلا ہیں ۔

---

(۳) لمبی ی کی طرح پنجاب والوں نے اُردو میں دو چشمی ھ کے حروف (بھ ۔ پھ وغیرہ) بنا کر ایک اور بے اصولی پیدا کر دی ہے ۔ واضح رہے کہ اس قسم کی مخلوط آواز عربی زبان میں تو ہے نہیں کہ ہماری تحریر کے اصل واضعین کو اُن کے واسطے خاص حروف وضع کرنے کی ضرورت ہوتی ۔ نہ فارسی زبان میں اس کی ضرورت پڑی لیکن ہندی زبان میں ایسے بہت الفاظ ہیں جن میں دو حروف کی آواز مل کر ایک آواز پیدا ہوتی ہے ۔ ان مخلوط آوازوں کے متعلق غالباً ہندوستانی مسلمانوں میں سب سے پہلے انشاء اللہ خاں نے اپنی کتاب دریائے لطافت میں بحث کی ہے ۔ پنجاب کے سررشتۂ تعلیم نے ان کے واسطے اُردو تحریر میں چند نئے قاعدے مقرر کئے ہیں اور ظاہری خوبی اور سہولت کی وجہ سے وہی ملک میں عام طور پر رائج ہوتے جاتے ہیں ۔ مگر ہمیں ان نئے قاعدوں پر غور کرنے سے پہلے اپنی نئی ضروریات پر نظر ڈالنی چاہیئے :۔

ہندی زبان میں تین حروف ایسے ہیں جن کی آوازیں دوسرے حروف کے ساتھ مل جاتی ہیں اور وہاں خود اِن ہی حروف کی جداگانہ ہستی گم ہو جاتی ہے :۔

(۱) ان میں سب سے اول حرف ھ ہے جو بہت سے حروف کے ساتھ مل کر اپنی مستقل آواز کھو دیتا ہے اور جس حرف کے ساتھ ملا ہے صرف اس کی آواز میں ایک قسم کی " بھر بھراہٹ" پیدا کر دیتا ہے جیسے " ڈھیل "، " بھیل "، " گھر " وغیرہ الفاظ میں ۔ ظاہر ہے کہ یہ مخلوط آوازیں حرف ھ، ل، ڈ، ب اور گ کے ساتھ خاص طور پر مل جانے سے پیدا ہوئی ہیں اور ان کو کسی علٰحدہ یا مستقل حرف کی آواز قرار دینا محض غیر ضروری ہے ۔ لیکن دیوناگری تحریر میں ان آوازوں کے واسطے مستقل حروف بنائے گئے ہیں اور عجب نہیں کہ اسی کی تقلید میں پنجاب والوں نے اُردو میں " حروف ہائے " (یعنی بھ پھ ٹھ وغیرہ) علٰحدہ بنائے ہوں کہ مذکورہ بالا قسم کی مخلوط آواز کے واسطے، سادہ ھ کی بجائے ان نئے حروف سے کام

لیا جائے، اور دوچشمی ہ کو جو محض ہ کی ایک دوسری صورت تھی اس کام کے واسطے مخصوص کرلیا جائے اس طرح گو اُردو حروف تہجّی کی تعداد بڑھ گئی تاہم یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ اس قاعدے کے بنانے والوں نے دیوناگری والوں کی سی غلطی نہیں کی کہ بالکل ہی علٰحدہ شکل کے نئے حروف بنا لیتے۔

(۲) دوسرا حرف ں ہے جو دوسرے حروف کے ساتھ مل کر محض اُن کی آواز کو "غنغنا" کردیتا ہے اور اس کی یہ آواز عربی، فارسی کے الفاظ میں بھی موجود ہے۔ پنجاب والوں نے مستقل ن اور اس قسم کے ں (غنّہ) میں امتیاز کرنے کے لئے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ جب وہ لفظ کے آخر میں ہو تو نقطہ نہ دیا جائے اور جب بیچ میں ہو تو اس کے نقطے پر اُلٹا جزم لگا دیا جائے۔

میرے عنایت فرما منشی الطاف حسین صاحب کاظم (فرید آبادی) جنہوں نے بہت محنت و غور کے بعد ایک نیا قاعدۂ اُردو لکھا اور اس پر انجمن ترقّی اُردو کی طرف سے انعام حاصل کیا تھا، اس طریق پر دو اعتراض کرتے ہیں۔ اوّل تو یہ کہ آخر میں نون غنّہ آئے تو وہاں بھی اس کے نقطے پر اُلٹا جزم کیوں نہ بنایا جائے کہ ایک ہی حرف کی تحریر کے واسطے دو جداگانہ قاعدے نہ بنانے پڑیں۔ دوسرے یہ کہ جب اس نون غنہ کی بھی ٹھیک وہی حالت ہے جو حروف ہائے میں ہ کی ہوتی ہے تو پھر اس کے واسطے بھی علٰحدہ مخلوط حروف کیوں نہ بنائے جائیں؟ چنانچہ اُنھوں نے اپنے قاعدے میں بھ پھ کی طرح انۂ بنۂ پنۂ وغیرہ "حروفِ غنّہ" بھی ایجاد کئے ہیں اور بے شبہ جو لوگ پہلی قسم کے حروفِ مخلوط کو جائز سمجھتے ہیں، انھیں منشی صاحب موصوف کی توجیہات کو ماننا اور اُردو کے حروف تہجّی میں یہ نئے حروف بھی بڑھانے پڑینگے۔

(۳) تیسرا حرف ی ہے جو بعض ہندی الفاظ میں الف کے ساتھ اس طرح آتا ہے کہ خود اس کی اصلی آواز یا جداگانہ حیثیت قائم نہیں رہتی۔ جیسے "کیا" (حروفِ استفہام) "پیاس" "دھیان" "گیان" وغیرہ الفاظ ہیں، ان کو پڑھاتے وقت اُستاد ہجّے تو کسی نہ کسی طرح بتا دیتے ہیں لیکن تحریر میں اس خاص قسم کی ے کے ظاہر کرنے کا، جہاں تک مجھے معلوم ہے کوئی قاعدہ مقرر نہیں ہے۔

(۴) اسی طرح بعض دوسری قدیم و جدید السنہ میں ایک حرف کی آواز دوسرے حرف میں مدغم ہوجاتی ہے مثلاً چینی زبان میں ت اور س کو ملا کر یکبارگی ایک مخلوط آواز نکالی جاتی ہے یا انگریزی کا حرف ch

جب لفظ کے شروع میں حروف صحیح سے مل کر آتا ہے تو اس کی آواز میں الف کی آواز بھی شامل ہوتی ہے جیسے اسمتھ، اسکول وغیرہ اسما ہیں جو ہمیں اُردو میں بھی استعمال کرنے پڑتے ہیں؛ لیکن ہمارے ہاں ان مخصوص و مخلوط اصوات کو تحریر میں نمایاں کرنے کا کوئی قاعدہ نہیں ہے۔

یہ سچ ہے کہ غیر زبانوں کے لب و لہجہ اور اصوات کے بالکل صحیح لکھنے کے لئے قاعدے بنانے ہمارا فرض نہیں ہے۔ لیکن یہ چوتھی صورت بھی درحقیقت اسی اصول کے ماتحت آسکتی ہے جس سے ہماری اوپر کی تین ضرورتیں متعلق ہیں اور ان سب کے واسطے عرصے تک غور و فکر کرنے کے بعد خاکسار کاتب الحروف نے یہ تجویز سوچی ہے کہ اہل پنجاب نے ن غنہ کو تحریر میں ظاہر کرنے کا جو قاعدہ نکالا ہے وہ اس قسم کے تمام حروفِ مخلوط کے واسطے اختیار کر لیا جائے جو دوسرے حروف کے ساتھ مل کر اپنی اصلی آواز کھو بیٹھتے ہیں۔ مثلاً مذکورہ بالا چاروں اقسام کے الفاظ کو ہم اس (اُلٹے جزم کے) جدید قاعدے کی رو سے حسب ذیل طریق پر تحریر کرینگے۔

۱ (حروف ہائے) گھر ۔ اُبھر ۔ بُدھ

۲ (حروف غنہ) گنوار ۔ سائین (اہل پنجاب کی طرح)

۳ (حروف یائے) گیا ۔ پیاس ۔ دِھیان

۴ (دیگر حروفِ مخلوط) اَسمتھ ۔ تَ انگ (چینی)

اس جدید قاعدے کے مناسب ہمیں ایسے حروف مخلوط کی ہجے بھی بچوں کو نئی طرح بتانے پڑینگے۔ چنانچہ گھر (معنی مکان) کے ہجے اس طرح کئے جائینگے کہ "گ، ہ یہ اُلٹا جزم = گہ اور گہ ر زبر = گھر وقس علیٰ ہذا

یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ مذکورہ بالا تجویز اہل الرائے کے نزدیک قابل پذیرائی ہوگی لیکن غالباً اس حد تک سب حضرات کو اتفاق ہوگا کہ یہ ہر قسم کی مخلوط آوازیں ایک اصول کے ماتحت ہیں اور ان کی تحریر کا بہتر ہے کہ کوئی یکساں قاعدہ بنا لیا جائے؛ اب کسی ایسے نئے قاعدے کو منتخب اور مقرر کرنا اور پھر تمام صوبوں کے تعلیمی محکموں سے خط و کتابت کے بعد اسے (خاص کر ابتدائی) کتب درسی میں رواج دینا انجمن ترقی اُردو کا کام ہے۔ کیونکہ اس طرح سرکاری طور پر رواج پائے بغیر اس قسم کی کوئی تجویز یا اصلاح اُردو تحریر میں عام طور پر مروج و مستعمل نہیں ہو سکتی فقط

تبصرہ

مرقع ہند (بابت سنہ ۱۹۱۹ء)

یہ ترجمہ ہی اُس رپورٹ کا جسے حکومت ہند کے لئے پروفیسر رشبرُک ولیم نے پارلیمنٹ میں پیش کرنے کی غرض سے مرتب کیا تھا۔ یہ پہلی سرکاری رپورٹ ہی جو ایک مشہور مؤرخ اور انشا پرداز کی قلم سے نکلی ہی اور سلیقہ کے ساتھ دلچسپ طریقہ سے لکھی گئی ہی۔ اور تحریر اور طرز ادائے مطالب میں اعتدال سے کام لیا گیا ہی۔ گزشتہ سال کے سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور تعلیمی حالات پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ جو لوگ ملک کے حالات سے واقف ہونے کا شوق رکھتے ہیں انھیں اس کا مطالعہ ضروری ہی۔ اگرچہ معاملات سے بحث کرتے وقت اعتدال مدنظر رکھا گیا ہے تاہم واقعات سے جو نتائج نکالے ہیں انھیں قبول کرنے میں احتیاط اور غور کی ضرورت ہی۔ ۱۹۱۹ء ہندوستان کی تاریخ میں ایک پرانقلاب اور عجیب وغریب سال ہوا ہی اور جو واقعات اور حالات اس سنہ میں گزرے ہیں اُن کا غور سے مطالعہ کرنا اُن سب کے لئے جو ملک کے مختلف کاموں میں مصروف ہیں، ناگزیر ہے۔ یہ رپورٹ معلومات کا مخزن ہے اور اس قسم کے مطالعہ کی رہنمائی کرسکتی ہے۔ لیکن اس مطالعہ کی تکمیل کے لئے اُن تحریروں کا پڑھنا بھی ضروری ہے جو وقتاً فوقتاً سیاست دانان ملک کی قلم سے نکلی ہیں۔

تعلیم کے باب میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن اور اس کی رپورٹ کا مفصل ذکر کیا ہی اور اُن اصطلاحات پر بحث کی ہی جو کمیشن نے تجویز کی ہیں۔ لیکن تعجب ہی کہ اس رپورٹ میں کمیشن کی اُس خاص تجویز کا مطلق ذکر نہیں کیا جس کا قومی نقطۂ نظر سے ملک کی تعلیم سے خاص تعلق ہی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اس پر زور دیا ہے کہ مدارس میں میٹراکولیشن تک جہاں تک ممکن ہو مضامین کی تعلیم دیسی زبان کے ذریعہ سے دی جائے اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دیسی زبانوں کی تعلیم کا انتظام اعلیٰ پیمانہ پر کیا جائے۔ اور اُن کی تعلیم تاریخی اور تنقیدی نظر سے ہو۔ ملک میں اس وقت جابجا قومی

مدارس کھل رہے ہیں، انھیں یہ نکتہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے اور جہاں تک جلد ممکن ہو اس امر کی کوشش کرنی چاہیئے کہ ملک کی ایک زبان ہو جائے کیوں کہ ہم خیالی کا دار مدار بہت کچھ ہم زبانی پر ہی۔

ہندوستانی ریاستوں کے تعلیمی تبصرہ میں جامعۂ عثمانیہ (حیدرآباد دکن) کا ذکر ذیل کے الفاظ میں کیا گیا ہی:۔

"حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی جس کے وجود میں آنے کا گزشتہ سال ذکر ہو چکا ہے آہستہ روی کے ساتھ قدم بڑھا رہی ہے۔ چوں کہ اس یونیورسٹی میں اُردو کے ذریعہ سے تعلیم ہوگی لہٰذا یونیورسٹی ہونے سے پہلے تراجم کا کام بہت بڑے پیمانہ پر شروع کرنا پڑا۔ اسی وجہ سے عثمانیہ یونیورسٹی کی رفتار سُست ہی۔"

میسور کی یونیورسٹی کے متعلق کہا ہی کہ

"میسور میں پہلے ہی سے ایک یونیورسٹی قایم ہی جو سرسبزی کی حالت میں ہی۔"

میسور یونیورسٹی کی سرسبزی اور عثمانیہ یونیورسٹی کی سُست رفتاری کا خاص سبب ہی۔ میسور یونیورسٹی اور ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں میں مطلق کوئی فرق نہیں۔ لیکن عثمانیہ یونیورسٹی کا نظام بالکل مختلف اور جدید ہی۔ ہندوستان کی یہ پہلی یونیوسٹی ہے جس میں دیسی زبان کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم کے دینے کا انتظام کیا گیا ہی اور اس لئے ابتدا میں اس کا سُست رفتار ہونا لازم ہی۔ کاش مولف رپورٹ کے قول کے مطابق ترجمہ کا کام بڑے پیمانہ پر کیا جاتا۔ دارالترجمہ کا موجودہ عملہ اس اہم اور وسیع کام کے لئے کافی نہیں۔

مترجم رپورٹ خان بہادر چودھری واجد حسین صاحب بی۔ اے۔ ایم۔ ایل، اے نے مطالب کو صاف اور سریع الفہم زبان میں ادا کرنے کی کوشش کی ہی اور مختلف مضامین کے ترجمہ میں (جو اُردو کے لئے خاصے مشکل ہیں) بہت کچھ محنت کی ہی۔ مگر تاہم ہماری رائے میں نظرِ ثانی اور اصلاح کی ضرورت ہی۔ بعض الفاظ کا ترجمہ ایسا کیا ہی جس سے اصل مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ مثلاً اصطلاحی تعلیم سے ہرگز یہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ یہ کس قسم کی تعلیم ہے اور اس سے کیا مراد ہی یہ غالباً (Technical Education) کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر اس کا ترجمہ فنّی تعلیم یا فنون کی تعلیم کرتے تو زیادہ مناسب اور موزوں ہوتا۔ اسی طرح عنصری تعلیم جو غالباً (Elementry Education) کا ترجمہ ہی۔ موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ ابتدائی تعلیم کہتے تو بہتر تھا (Incorporated) کا ترجمہ ملحق شدہ کالج اور (Constituent) کا ہم عزم کالج درست نہیں ہی۔ اس سے تو یہ بہتر تھا کہ یونیورسٹی کے اندرونی اور بیرونی کالج لکھتے جس سے مفہوم

صاف سمجھ میں آجاتا۔

کتاب میں کاغذ چکنا اور قیمتی لگایا گیا ہے۔ اور بلحاظ لکھائی چھپائی کاغذ اور حجم کی قیمت بہت کم ہی یعنی صرف ایک روپیہ۔ تعلقدار پرنٹنگ پریس فیض آباد میں چھپی ہی۔

رُوحِ ادبُ

یہ منشی شبیر حسن خاں صاحب جوشؔ کے نثر و نظم کے مجموعہ کا نام ہی۔ حضرت جوشؔ ایک مستعد پرجوش اور جدت پسند شاعر اور نثّار ہیں۔ نثر میں جا بجا جدّت سے کام لیا ہی اور فرضی تصویروں میں اصلیت کا رنگ دکھایا ہی۔ استعارات و تشبیہات کی اس قدر بہتات ہی کہ مسلسل پڑھنے سے جی اُکتا جاتا ہے اور کتاب ہاتھ سے رکھ دینی پڑتی ہے۔ طرز تحریر کے ساتھ خیالات میں بھی انوکھا پن دکھایا ہی۔ لیکن اُن میں تہ کم ہے۔ بعض جگہ ٹیگور کا تتبع کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں کامیاب ہوئی ہی لیکن اکثر جگہ ناکامی نظر آتی ہے اور مضمون پھیکا اور سپاٹ ہو کر رہ گیا ہے۔ کامیابی کی ایک مثال شاید وہ آجای کے مضمون میں صاف نظر آتی ہے۔ بعض مقامات پر عبارت میں خامی معلوم ہوتی ہے، اگرچہ وہ زیادہ قابل لحاظ نہیں تاہم نہوتی تو بہتر ہوتا۔ مثلاً عجیب شیرینی کا پہلا جملہ "ایک رنگین عارضوں والی دوشیزہ" یا اس شعر میں "اشک" کا لفظ

تمہارے سامنے کیوں اشک میرا بہ نہیں سکتا
اسے محسوس کر سکتا ہوں، لیکن کہہ نہیں سکتا

بعض جگہ حضرت اکبرؔ کا تتبع کیا ہی، لیکن شعر نہایت پست اور عامیانہ ہو گئے ہیں۔ مثلاً

ہر اسٹیشن پہ دو اک زخم کاری دل پہ کھاتے ہیں ۔۔۔ سفر کرتے ہیں یا ہم جنگ کے میداں میں جاتے ہیں

رنگیں رتوں نے ذبح کیا دل کو ریل پر ۔۔۔ مرنے کو اور جایئے پنجاب میل پر

یہ رنگ جوشؔ کی طبیعت کے مناسب نہیں۔ اس میں طبع آزمائی کرنا اُن کے لئے زیبا نہیں۔

حضرت جوشؔ فطرت پسند واقع ہوئے ہیں اور بار بار اس کا اظہار انھوں نے اپنی نظم و نثر میں کیا ہے اور بعض مقامات پر قدرتی مناظر اور اُن کے اثرات کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہی۔ اسی طرح مختلف انسانی جذبات کو بھی بڑی نزاکت سے

الفاظ اور خیال کی رنگینی میں ظاہر کیا ہے۔ جوش صاحب نے نثر میں بعض انگریزی انشا پردازوں کی تقلید کی ہے مگر یہ طرز تحریر خاص خاص مضامین کے اظہار کے لیے موزوں ہو سکتا ہے۔ ہر جگہ کام نہیں آسکتا اور اس کے نبھانے کے لئے علاوہ زبان کی قدرت کے خیال کی بلندی بھی درکار ہے۔ اس مجموعہ کے مختلف مضامین پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی یہ پہلی مشق ہے مگر تاہم اس میں کامیابی اور کمال کی جھلک نظر آتی ہے۔

بلاشبہ حضرت جوش ایک جواں طبیعت، جدت پسند اور ہونہار شاعر اور ناثر ہیں۔ لیکن جدت کے جوش میں انھیں ذوق سلیم کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے۔ ان کی نثر میں تصنع اور تکلف کا دخل زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ حصول کمال کے لئے اس سے بچنا ضروری ہے۔

لیکن سب سے زیادہ مایوسی اور رنج ہمیں اُن تصویروں کو دیکھکر ہوا جو اس کتاب میں بعض مضامین فطرت و جذبات کے ساتھ چسپاں کی گئی ہیں۔ اس سے مصنف کے ذوق کا ایک حد تک اندازہ ہوتا ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ تصویریں اُن جذبات کی گرمی اور حسن کو بڑھائیں دیکھنے والے پر اُلٹا اثر کرتی ہیں۔ تعجب ہے کہ قابل مصنف نے اس قسم کی ادنیٰ عامیانہ اور بازاری تصویروں کا اس مجموعہ میں داخل کرنا کیوں گوارا کیا۔ بعض تصویروں کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سگرٹ کے بکسوں میں جو تصویریں آتی ہیں ان کی ہُو بہو نقل کر دی ہے یا انگریزی اخباروں اور رسالوں کے اشتہاروں سے لی گئی ہیں۔ اس سے تو یہ بہتر تھا کہ تصویریں شریک ہی نہ کی جاتیں۔ ورنہ اس کا خاص اہتمام کیا جاتا اور نازک خیال مصوّروں سے بنوائی جاتیں۔

کاغذ بہت اچھا استعمال کیا گیا ہے لکھائی چھپائی بھی اچھی ہے مگر اُس درجہ کی نہیں ہے جیسی کہ ہونی چاہیئے تھی۔

اشارات

(اُردو یا ہندوستانی)

کہتے ہیں کہ نام میں کیا دھرا ہے۔ مگر نام بعض اوقات بڑا کام دیتا ہی۔ اس کے دیکھتے ہی یا سنتے ہی ایک خاص تصوّر دماغ میں پیدا ہو جاتا ہی، تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ کبھی وہ تاریخ کا پتہ دیتا ہی جسے ہم بھول گئے ہیں کہیں وہ اُس تہذیب و تمدّن کا سُراغ لگاتا ہی جس کے آثار ہم اپنی زندگی اور معاشرت میں پاتے ہیں حقیقت یہ ہی کہ ہر لفظ اپنی ایک تاریخ رکھتا ہی اور اگر الفاظ کا مؤرخ ہر لفظ کے سوانح لکھے تو وہ انسانی خیالات و تمدن کا عجیب کارنامہ ہو۔ وہ زبان جسے ہم آج کل اُردو کے نام سے موسوم کرتے ہیں، مختلف زمانوں میں مختلف ناموں سے یاد کی گئی ہی۔ یہ نام اس زبان کی تاریخ میں نشانِ راہ کا کام دیتے ہیں۔ میر تقی میر کا تذکرۂ شعرائے اُردو نکات الشعرائے ہندی کے نام سے موسوم ہی۔ یہ نام گویا فارسی کے مقابلہ میں تھا۔ دوسرے اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہی کہ یہ زبان بھی ہندوستان کی بعض دوسری زبانوں کی طرح ہندی سمجھی گئی۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ شعرا نے اسے ریختہ کہنا پسند کیا چنانچہ صاحب آبِ حیات اس کے متعلق فرماتے ہیں ''اسی زبان کو ریختہ بھی کہتے ہیں کیوں کہ مختلف زبانوں نے اسے ریختہ کیا ہی جیسے دیوار کو اینٹ مٹی، چونا، سفیدی وغیرہ سے پختہ کرتے ہیں۔ یا یہ کہ ریختہ کے معنی ہیں گری پڑی پریشان چیز۔ چوں کہ اس میں الفاظ پریشان جمع ہیں اس لئے اسے ریختہ کہتے ہیں۔'' اُردو کا لفظ جو اُردوئے معلّے شاہجہاں آباد دہلی سے نکلا ہی زیادہ عام اور مقبول ہوا۔ اور ایسا رواج پایا کہ ہر جگہ یہی استعمال ہونے لگا۔ انگریزوں اور اہلِ یورپ نے ہندوستانی کا لفظ تراشا۔ ان کی کتابوں میں عموماً یہی لفظ استعمال ہوا ہی۔ اب ایک مدت بعد پھر مہاتما گاندھی اور ان کے ہم خیال اصحاب نے اسے زندہ کیا ہی۔ لفظ معقول ہے۔ ہندوستان کی عام زبان کے لئے اس سے موزوں اور کیا لفظ ہو سکتا ہی۔ جنوبی ہند میں اسے مسلمانی کہتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ اس خطے میں یہ زبان مسلمانوں کے

ذریعہ سے پہنچی ورنہ اور کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ فرانس کے مشہور سابق وزیر اعظم موسیو کلیمنسو نے اُردو کے متعلق مجھے کہا کہ کیوں کر ممکن ہے کہ ایک فاتح قوم نے جبراً اپنی زبان اہلِ ملک کے سر چپیک دی اور وہ ملک میں رائج ہوگئی۔ میں نے کہا کہ یہ نہ فاتح قوم کی زبان تھی نہ انھوں نے کبھی اس کی سرپرستی کی اور نہ اُن کے دربار میں یہ بولی جاتی اور نہ اُن کے دفتروں میں استعمال ہوتی۔ تو پوچھا، پھر یہ کہاں سے آئی۔ میں نے کہا کہ ہندو مسلمانوں کے میل جول اور باہمی معاشرت اور میل ملاپ سے پیدا ہوئی۔ اس پر صاحب موصوف فرمایا تو پھر یہ تو "ہندو زبان" ہوئی میں نے کہا بیشک۔ یہ ذکی اور جہاندیدہ مدبر دو تین منٹ کی گفتگو میں اس زبان کی اصل حقیقت تک پہنچ گیا۔ اس لیے اُسے ہندوستانی کہنا کچھ بیجا نہیں ہے۔

رسم الخط

لیکن ہندوستانی اور اُردو میں تھوڑا سا فرق ہے۔ اُردو کے نام کے ساتھ معاً اس کے رسم الخط کا بھی خیال آجاتا ہے۔ لیکن ہندوستانی کا لفظ اس سے بری ہے۔ وہ کسی خط کے ساتھ مخصوص نہیں۔ انگریز اسے رومن حروف میں لکھتے تھے اور بعض مقامات کے ہندو اُسے ناگری حروف میں لکھتے ہیں۔ زبان وہی ہے مگر مختلف لباسوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ ۱۹۳۷ء میں "یک زبان و یک حروف" کانفرنس کا اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا تھا اور مسٹر تلک اس کے صدر تھے۔ اس میں مسز سروجنی نائیڈو نے اُردو میں ایک مختصر اور صاف ستھری تقریر کی اور اثنائے تقریر میں یہ فرمایا کہ ایک طرف پنڈت مدن موہن مالویہ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ سارے ہندوستان کی زبان ناگری (ہندی) ہو جائے اور دوسری طرف مولوی عبدالحق کی یہ سعی ہے کہ تمام ملک میں اُردو شائع ہو اور وہی ملک کی مشترکہ زبان قرار پائے۔ میں تو ملک کی زبان وہی سمجھتی ہوں جس میں اس وقت تقریر کر رہی ہوں۔ اس کے جواب میں پنڈت مدن موہن مالویہ صاحب نے فرمایا کہ مجھ میں اور میرے دوست میں درحقیقت کوئی اختلاف نہیں۔ زبان ایک ہی ہے، البتہ مذہبی رُجحان اور روایات قدیمہ کے اثر کی وجہ سے ہندو زیادہ تر سنسکرت الفاظ استعمال کرتے ہیں اور مسلمان عربی فارسی، ورنہ اصل زبان میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ پنڈت صاحب کا یہ قول بالکل صحیح ہے۔ اب سارا اختلاف اس میں رہ جاتا ہے کہ رسم الخط کیا ہو۔ ہندو اکثر ناگری حروف کو ترجیح دیتے ہیں اور

مسلمان عربی حروف کو۔ مولوی عبد الماجد صاحب نے مارچ کے ماڈرن ریویو میں ایک بہت اچھا مضمون اس بحث پر لکھا ہے کہ "دیسی زبانوں میں اردو کا کیا درجہ ہے" اس مضمون کے آخر میں انھوں نے اس امر پر بھی بحث کی ہے کہ ان دونوں میں سے کون خط قابلِ ترجیح ہے۔ اُن کی رائے میں اُردو خط کو بوجوہ ذیل ترجیح ہے۔ اس میں (۱) جگہ کی کفایت ہے یعنی تھوڑی سی جگہ میں بہت سی تحریر آجاتی ہے (۲) وقت کی کفایت ہے۔ یعنی کم وقت میں زیادہ لکھا جاتا ہے۔ (۳) لکھنے اور پڑھنے والے کی محنت میں کفایت ہے۔ علاوہ اس کے یہ خط بعض خفیف اختلافات کے ساتھ تمام اسلامی ممالک میں رائج ہے۔ اور بنگال کے مشرقی گوشہ سے لے کر مغرب میں طرابلس اور مراکش تک یکساں مقبول ہے۔ ایک ایسے خط کے اختیار کرنے سے جو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ افغانستان، بلوچستان، اسلامی ترکستان، ایران عراق عرب، عرب، شام، فلسطین، روم، مصر اور افریقہ کی بعض ریاستوں میں بھی مروج ہے، جو بین اقوامی فوائد حاصل ہوں گے وہ خاص طور پر قابل لحاظ ہیں اور اُن سے روگردانی کرنا کسی حال میں مناسب نہ ہوگا۔

اصل بات یہ ہے کہ ابتدا میں ناگری حروف اور ہندی عبارت پڑھنے میں ضرور آسانی ہوتی ہے اور اُردو حروف اور عبارت کے پڑھنے میں یہ آسانی نہیں ہوتی۔ لیکن کچھ عرصے کی مشق کے بعد اُردو جس روانی اور آسانی سے لکھ پڑھ سکتے ہیں، ہندی نہیں لکھ پڑھ سکتے۔ پھر جگہ وقت اور محنت کی کفایت بھی بڑی چیز ہے۔

غرض اختلاف خط میں ہے۔ لیکن اس میں اب زیادہ لڑنے جھگڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص کو حق ہے کہ وہ دونوں خطوں کے حسن و قبیح، آسانی اور وقت پر غور کرے اور جس میں اُسے سہولت معلوم ہو اُسے اختیار کرے مگر زبان ایک ہی ہونی چاہیئے اور ایک ہی رہنی چاہیئے۔ لیکن ہندو مسلمان دونوں سے میری یہ عرض ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سنسکرت اور عربی کے غیر مانوس اور ثقیل الفاظ کے استعمال سے بچیں اور اُردو کے حُسن کو دھبہ نہ لگائیں۔ اتن میں آج کل جو افراط تفریط برتی جا رہی ہے اس سے زبان کی فصاحت کو صدمہ پہنچتا ہے۔

معارف کی تنقید

معارف نے اُردو کا خیر مقدم کیا ہے جس کا ہم شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اگرچہ معارف کی طرح اُردو کا شیوہ نوک جھونک نہیں ہے۔ لیکن فاضل مرتب معارف نے ابتدائے تنقید ہی میں چند جملے ایسے لکھ دیئے ہیں جن سے مغالطہ پیدا ہوتا ہے

اور اس کا رفع کرنا ہم ضروری خیال کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ "اُردو کا آغاز ہی" پڑھنے سے خیال ہوتا ہے کہ اس کے دربار میں نہ حالی و آزاد (مولوی محمد حسین) کی صف میں شبلی کی جگہ ہے اور نہ "حسن" "دکن ریویو" کے ساتھ "الندوہ" کے نام سے یہ اپنی زبان قلم آلودہ کرنا چاہتا ہے۔ ہمیں دراصل اب تک اس کا علم نہ تھا کہ الندوہ بند ہو گیا ہے۔ اُردو رسالوں کا جو جاری ہو کر بند ہو گئے ضمناً ذکر آگیا تھا، ان پر کوئی مستقل مضمون نہ تھا جو مکمل فہرست پیش کی جاتی ورنہ اور بھی ایسے کئی رسالے ہیں جو رہ گئے ہیں۔ ہمارا مقصد اس سے نہ کسی کی تنقیص تھی نہ کسرِ شان۔ اسی طرح ابتدائے مضمون میں مصنفینِ اُردو کا ذکر نہیں کیا گیا ورنہ ممکن نہ تھا کہ مولانا شبلی مرحوم کا ذکر نہ آتا۔ کم سے کم انھیں یہ تو خیال کرنا چاہیئے تھا کہ اسی رسالہ میں پروفیسر براؤن کی جدید کتاب سے ایک ٹکڑے کا ترجمہ درج ہے جس میں مولوی شبلی مرحوم کا ذکر بڑی تعریف کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ہمارا منشا اس ترجمہ کے شائع کرنے سے صرف یہی تھا کہ ہماری ملک کے ایک اعلیٰ پایہ مصنف کی عظمت معلوم ہو۔ بہر حال ہمیں اُن کی طبیعت کا رنگ معلوم ہو گیا اور جو اُن کے دل میں تھا وہ اُن کی قلم سے بے اختیار ٹپک پڑا۔ ورنہ سجّادہ نشین خانقاہ شبلی کو بُرا ماننے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

اسی تنقید میں وہ ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری مرحوم کے مضمون کے متعلق فرماتے ہیں "مرحوم ڈاکٹر نے ذرا افراط پسندی سے کام لیا ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ شاید غالب نے جدید فلسفہ و سائنس، ریاضیات وطبیعیات سب کچھ پڑھکر شاعری میں قدم رکھا تھا"، ہمیں یہ تنقید پڑھکر معاً مولوی شبلی مرحوم کی تالیف سوانح عمری مولانا رومؒ کا خیال آیا فاضل مولف نے مولانا روم کے کلام سے "اُرتقا" کا اصول ثابت کیا ہے۔ کیا اس کی نسبت یہ کہنا صحیح ہو گا کہ اسے پڑھکر یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید مولانائے روم نے ڈارون کی تصانیف پڑھکر شاعری میں قدم رکھا تھا۔ روس کے نامور ناول نویس ڈاس ٹائیسکی کے متعلق ایک فاضل اور مستند ڈاکٹر یہ لکھتا ہے کہ اس نے اپنے بعض ناولوں میں بعض مریضوں کے متعلق ایسی باتیں لکھی ہیں جو اُس وقت تک ڈاکٹروں کو معلوم نہیں ہوئی تھیں لیکن بعد میں اُن کی صداقت ثابت ہوئی اور ابھی بعض باتیں ایسی اور ہیں جو اب تک پایۂ تحقیق کو نہیں پہنچیں لیکن یقین ہے کہ وہ صحیح ثابت ہوں گی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بعض اوقات سچے شاعر کا تخیل فلسفہ و سائنس سے کہیں آگے پہنچ جاتا ہے۔ اس پر فاضل مرتب معارف کو تعجب ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

اِصطلاحاتِ علمیہ

جیسا کہ ہم اپنے پہلے رسالہ میں لکھ چکے ہیں۔ اصطلاحاتِ علمیہ کے شائع کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہی کہ ماہرین فن کو ان پر تنقید کرنے کا موقع ملے اور اُن کی خامیاں رفع ہو جائیں۔ لیکن اب تک سوائے ایک صاحب کے جنھوں نے ازرہِ عنایت اپنی رائے لکھکر بھیجی ہے کسی نے اس طرف توجہ نہیں فرمائی۔ اب ہم نے یہ ارادہ کیا ہی کہ کچھ نسخے الگ چھپواکر اُن حضرات کی خدمت میں بھیجے جائیں جو رائے دینے کے اہل ہیں۔ معارف نے یہ رائے دی ہے کہ جو اصطلاحات پیدا ہو گئے ہیں ان پر اہل الرائے طبقہ کی ایک جماعت کی نظرثانی کراکے جلد سے جلد ایک "قاموس اصطلاحات" حاجتمندوں تک پہنچ جائے، پھر اس پر اضافہ ہوتا رہیگا"۔ ہمیں اپنے فاضل ہم عصر کی رائے سے کامل اتفاق ہی۔ لیکن اس جماعت سے نظرثانی کرانے کی کیا صورت ہی۔ ان کا ایک مدت کے لئے یکجا جمع ہونا تو دشوار ہے البتہ یہی ہوسکتا ہی کہ یہ اصطلاحات اُن کی خدمت میں بھیجی جائیں اور ان سے اظہار رائے کی درخواست کی جائے۔ اگرچہ اس سے قبل ہم اس کا تجربہ کر چکے ہیں اور اس میں ہمیں مایوسی ہو چکی ہے تاہم دوبارہ کوشش کرکے دیکھتے ہیں۔ اگر اس میں کامیابی ہوئی تو فبہا ورنہ بُری بھلی جو اصطلاحیں بن چکی ہیں وہی شائع کر دی جاہیں گی۔

فہرست کتب

(سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقیِ اردو)

البیرونی کمالاتِ ذہنی میں ابوریحان بیرونی کا مرتبہ تعریف سے مستغنی ہی دسویں صدی کا فاضل ہی مگر تبحرِ علمی اور دقیق النظری میں بیسویں صدی کا محقق معلوم ہوتا ہی ہندوستان آیا اور ہندوستان کے فلسفہ، تاریخ اور مذہب و معاشرت پر ایک بے مثل کتاب لکھی البیرونی اس کے حالاتِ زندگی اور کمالاتِ علمی پر مشتمل ہی ۸ر

فلسفۂ اجتماع تالیف ہی اور اس کا موضوع نفسِ اجتماعی جماعت کے لیئے اعمال و قوائے دماغی کے تحلیل و تشریح ہی موجودہ انقلابات میں اس کا مطالعہ دلچسپی اور فائدے سے خالی نہ ہوگا - اِس پر انگلستان و ہند کے علما و اخبارات نے اچھے اچھے ریویو لکھے ہیں - عہ

قاعدہ و کلید قاعدہ مدت کے غور و خوض کے بعد اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہی- ڈائرکٹر تعلیمات بمبئی نے اپنے صوبہ کے گورنر سے تحریک کی ہی کہ اس قاعدہ کو نصاب میں داخل کیا جائے - جن اُصول اور طریقہ پر اِس کی تعلیم ہونی چاہیئے اُن کی تشریح کے لیئے ایک کلید بھی تیار کی ہی- قاعدہ ۲ر کلید قاعدہ ۴ر

دریائے لطافت ہندوستان کے مشہور سخن سنج میر انشاء اللہ خاں کی تصنیف ہی اُردو صرف و نحو اور روزمرہ و محاورات و الفاظ کی پہلی کتاب ہی اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب و غریب نکات درج ہیں - قیمت عہ ر

طبقات الارض اِس فن کی پہلی کتاب ہی- تین سو صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل قلم بند ہیں انگریزی اور اُردو داں دونوں کے لیئے یکساں طور پر مفید ہی- کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور اُن کے مرادفات کی فہرست بھی منسلک کردی گئی ہی- قیمت عہ ر

مشاہیرِ یونان و روم- پلوٹارک لائوز کا ترجمہ ہی سیرت نگاری اور انشاپردازی میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس سے

آج تک مسلّم الثبوت چلا آتا ہی۔ ادبیانِ عالم بلکہ شکسپیر تک نے
اِس چشمہ سے فیض حاصل کیا ہی۔ وطن پرستی و بے نفسی، عزم
و جوانمردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ لبریز ہی۔
ہماری قوم کے ہر نوجوان کے ہاتھ میں اس کا ایک نسخہ
ضرور ہونا چاہیئے۔ دُنیا کی تمام مہذّب زبانوں میں اس کا
ترجمہ ہو چکا ہی۔ جلد اوّل غیر مجلد عہ؍ جلد دوم مجلد عہ؍

اسباق نحو دو حصے ملک کے ادیب کامل مولٰنا
مولوی حمید الدین صاحب بی اے کی تالیف سے
ہیں۔ اختصار کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک ضروری
مسئلہ درج ہی عربی خواں طلباء کے لیئے نادر تحفے ہیں
قیمت فی رسالہ ۴؍

علم المعیشت۔ اسرارِ تمدن کے سمجھنے کے لیئے
اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمد الیاس برنی
صاحب ایم اے نے ملک پر بڑا احسان کیا ہی۔
حجم (۵۰۲) صفحے قیمت صرف للعہ؍

تاریخ اخلاق یورپ اصل مصنّف لیکی کا نام علم
و تبحر تحقیق و صداقت کا مرادف ہی یہ کتاب کئی ہزار
برس کے تمدن و معاشرت اُصول اخلاق مذہب و خیالات
کا مرقع ہی۔ ترجمہ مولوی عبد الماجد صاحب بی اے۔
حصہ اول مجلد سے۳؍ دوم مجلد سے۳؍

مبادیِ سائنس فرانسیسی سے انگریزی اور انگریزی
سے اُردو میں ترجمہ کی گئی ہی اس کا بیان سلیس اور مقبول
عام ہی اُردو ترجمہ صرف ایک حصہ کا ہی اور آخر کتاب
میں فرہنگ مصطلحات بھی ہی قیمت عہ؍

تاریخ یونانِ قدیم۔ یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند کتابوں
کا خلاصہ ہی اور زبان کے لحاظ سے سلاست و شگفتگی کا نمونہ
اِس کا نقطۂ خیال خالصًا ہندی ہی۔ ایف اے کلاس کے
طلباء جو یونانِ قدیم کی تاریخ سے گھبراتے ہیں اس کتاب
کو انتہا درجے مفید پائینگے۔ مجلد قیمت عہ؍

انتخاب کلام میر۔ میر تقی سرتاج شعرائے اُردو کے کلام
کا انتخاب ہی مولوی عبد الحق صاحب سکرٹری انجمنِ ترقی اُردو
نے یہ انتخاب ایک مدت کی سعی و محنت کے بعد کیا ہی اور
شروع میں میر صاحب کی خصوصیات شاعری پر ۲۴ صفحے
کا ایک مقدمہ بھی ہی۔ قیمت عہ؍

رسالہ نباتات - اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے علمی اصطلاحات سے معرّا۔ سلاست روانی مملو اور دلچسپ ومفید ہے۔ طلبا نباتات جس مسئلہ کو انگریزی میں نہ سمجھ سکیں وہ اسی رسالہ میں مطالعہ کریں۔ قیمت مجلد عہ

دیباچہ صحت - اس کتاب میں مطالبات صحت مثلاً ہوا، پانی، غذا، لباس وغیرہ پر مبسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ہے زبان عام فہم اور پیرایہ مؤثر و دل پذیر ہے۔ ملک کی بہترین تصنیف ہے۔ اس کا مطالعہ طبیبوں کے کئی ہزار نسخوں سے زیادہ قیمتی ثابت ہوگا۔ حجم ۵۵۰ صفحے مجلد قیمت للعہ

قواعد اردو - ارباب فن کا اتفاق ہے کہ اردو زبان میں اس سے بہتر قواعد نہیں لکھی گئی بسیط و مشرح کے علاوہ اس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ فارسی قواعد کا تتبع نہیں کیا گیا ہے اس کو ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم بمبئی نے نصاب میں داخل کرنے کی تجویز کی ہے قیمت عہ

الفوز الاصغر - ابن مسکویہ کی معرکۃ الآرا تصنیف الفوز الاصغر کا اردو ترجمہ ہے۔ ابن مسکویہ آسمان علم و فضل کا آفتاب تھا یہ کتاب فلسفہ انھیں کے اصول پر لکھی گئی ہے اور مذہب اسلام پر انھیں اصول کو منطبق کیا گیا ہے اس کو بمبئی یونیورسٹی نے سرکاری کتب خانوں کے لیئے تجویز کیا ہے قیمت عہ

امرائے ہنود - پانسو سے زیادہ ہندو امرا کے حالات قلم بند ہیں۔ یہ امرا سلاطین مغلیہ کے زمانے میں بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز تھے کتاب گویا ان متعصب اور ناواقف مؤرخوں کا جواب ہے جو اسلامی حکومت پر تعصب کا الزام لگاتے ہیں۔ قیمت حصہ اوّل عہ
حصہ دوم عہ

القمر - قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی صراحت اور چاند کے متعلق جتنی جدید انکشافات ہوئے ہیں ان سب کو جمع کر دیا ہے طرز بیان دلچسپ اور کتاب ایک نعمت ہے۔ قیمت ۸ر

تاریخ تمدن - سر ٹامس بکل کی شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ ہے الف سے یے تک تمدن کے ہر مسئلہ پر کمال جامعیت سے بحث کی گئی ہے۔ ہر بحث کے لیئے ایک دلچسپ

گو پر زور اُصول اختیار کیا گیا ہی اور ہر اُصول کی تائید
میں تاریخی انتقاد سے کام لیا گیا ہی اس کے مطالعہ سے
معلومات میں انقلاب اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہی
بمبئی میں سرکاری لائبریریوں کے لیئے تجویز کی گئی
ہی۔ قیمت حصہ اوّل غیر مجلد عہ حصہ دوم مجلد عا،

مقدمات الطبیعات یہ ترجمہ ہی انگلستان کے مشہور سائنس
داں حکیم ہکسلی کی کتاب کا ترجمہ ہی۔ جس کا نام کتاب کی کافی
ضمانت ہے، اس میں مظاہر فطرت کی بحث درج ہی لیکن کتاب
علم و فضل کا مرقع ہی۔ متعلمان سائنس اور عام شائقین کے
لیئے بہت مفید ہی۔ قیمت عہ

فلسفۂ جذبات۔ کتاب کا مصنف ہندوستان کا مشہور
نفسی ہی۔ جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت
لیاقت اور زبان آوری کے ساتھ بحث کی گئی ہی قیمت عہ

نکات الشعراء یہ اُردو شعرا کا تذکرہ میر تقی میر کی تالیف
سے ہی اس میں میر صاحب کی رائے اور زبان کے بعض
بعض نکات پڑھنے کے قابل ہیں۔ مولانا حبیب الرحمن خاں
صاحب شروانی نے اس پر ایک ناقدانہ اور دلچسپ مقدمہ
لکھا ہی۔ قیمت سعہ،

نپولین اعظم ایبٹ کی مستند کتاب کا اُردو ترجمہ ہی
کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ نپولین کی زندگی بشری
جدوجہد کا آخری باب ہی، واقعات کی داد یا تو سکندر
کی زبان دے سکتی ہی یا تیمور کی زبان، ترجمہ آسان اور عام
فہم ہی مکمل پانچ جلد قیمت [illegible]،

فلسفۂ تعلیم۔ ہربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلہ
تعلیم کی آخری کتاب ہی۔ غور و فکر کا بہترین کارنامہ اور والدین
و معلم کے لیئے چراغ ہدایت ہی تربیت کے زبانی قوانین کو اسقدر
صحت کے ساتھ مرتب کیا ہی کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہی قیمت سعہ،

رہنمایان ہند۔ مشہور کتاب پرنسس آف انڈیا کا ترجمہ ہی شروع
میں ہندو مذہب کے برگزیدہ عقائد کا بیان فاضلانہ مگر دلکش پیرایہ
میں لکھا ہی اس کے بعد سری کرشن جی مہاراج کی
سوانح اور گوتم بدھ کے پر اثر حالات آتے ہیں آخری حصہ
میں شنکر اچاریہ رامانج اور رامانند کا ذکر ہی قیمت عہ

آنریری سکرٹری انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

اُردُو

۱- انجمنِ ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ ہی جو جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوا کرے گا۔

۲- یہ خالص ادبی رسالہ ہی جس میں زبان ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی۔ حجم کم سے کم ۱۵۰، اور زیادہ سے زیادہ ۲۰۰ صفحہ ہوگا۔

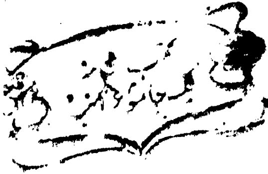
۳- قیمت آٹھ روپے بارہ آنے سالانہ مع محصول ڈاک، اور ارکانِ انجمنِ ترقی اُردو سے سات روپے چار آنے

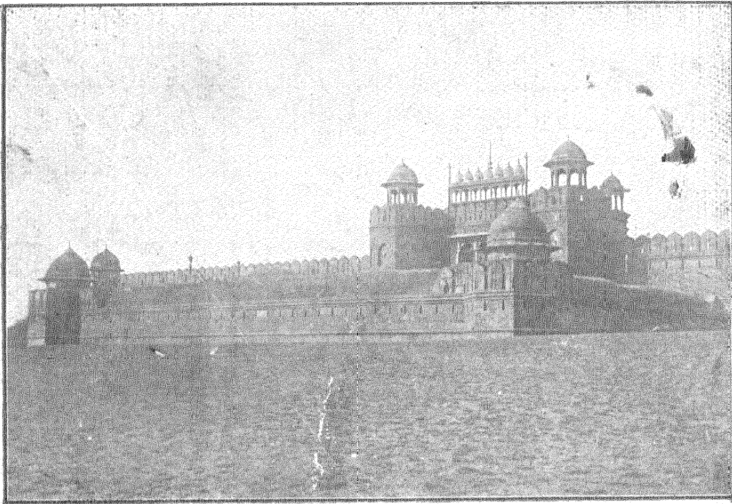
۴- تمام خط وکتابت:- آنریری سکرٹری انجمن ترقی اُردو و اڈیٹر اُردو اورنگ آباد دکن سے ہونی چاہیے۔

(باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی مُسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڈھ میں چھپا اور وہیں سے شایع ہوا)

جلد اوّل　　بابت اکتوبر سنہ ۱۹۲۱ء　　حصّہ چہارم

اُردُو





انجمنِ ترقی اُردو

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرستِ مضامین

ہجوِ سلطان محمود غزنوی

(از جناب محمود شیرانی صاحب)

اُن واقعات اور اسباب کی تلاش میں جنھوں نے فردوسی کو سلطان محمود کی ہجو لکھنے پر مجبور کیا ہے ہم اس قدر مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں کہ باوجود کوشش بلیغ ناظرین کو کسی تنقیدی فیصلہ کی طرف رہنمائی کرنے سے ہم اپنے آپ کو قاصر پاتے ہیں۔ اُن مشکلات کے ذمہ دار وہ متعدد بیانات ہیں جو فردوسی کے سوانح نگار ایک دوسرے کے برخلاف پیش کر رہے ہیں دیباچہ نگار بایسنغرخانی اور اُس کے متبعین کا کثیر گروہ کچھ ایسی شہادت پیش کر رہا ہے جس سے سلطان پر نقضِ عہد کا صریح الزام عاید ہوتا ہے لیکن ان کا قصہ اس قدر رنگین اور غیر معمولی معلوم ہوتا ہے کہ عقلِ سلیم اس پر اعتقاد لانے سے انکار کرتی ہے علاوہ ازیں ان کا زمانہ فردوسی کے زمانے سے اس قدر دُور دراز واقع ہوا ہے کہ قدیم شہادت کی موجودگی میں ان کے بیانات کی کوئی معتدبہ وقعت نہیں کی جا سکتی جس حالت میں کہ مؤخر الذکر اس کی صاف تردید اور تکذیب کر رہے ہیں۔

اِس سے ہماری مراد دیباچۂ قدیم اور نظامی عروضی ہیں۔ فردوسی ادبیات میں ہمارے پاس یہ دو نہایت قدیم اسناد ہیں جو بالترتیب پانچویں اور چھٹی صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں لیکن بدقسمتی سے یہ قدیم اسناد بھی باہم متناقض ہیں باستثنا ء چند امور۔

دیباچۂ قدیم کی مختصراً یہ شہادت ہے کہ عنصری کی معرفت فردوسی دربار میں آتا ہے اور شاہنامہ کی نظم کے لیے

مقرر ہوتا ہے امتحاناً داستان سیاوش سے ایک ہزار بیت نظم کرکے پیش کرتا ہے جو پسند آتے ہیں اور ایک ہزار دینار زرِ رکنی دیئے جانے کا حکم ملتا ہے۔ چھ سال میں فردوسی شاہ نامہ اختتام کو پہونچا دیتا ہے لیکن چونکہ شرطِ ادب نگاہ نہ رکھ کر کتاب میں اپنے مذہب کا ذکر کرتا ہے ؎

گرت زیں بد آید گناہِ من ست   چنین ست و ایں رسم و راہِ من ست

سلطان برہم ہو کر سیاست کا حکم دیتا ہے۔ عنصری اور دیگر شعرائے دربار سفارش کرکے معافی دلواتے ہیں جب انعام کا موقع آتا ہے تو چونکہ شاہ نامہ میں ساٹھ ہزار ابیات تھے، اس لیے حسبِ قرارداد ساٹھ ہزار دینار زرِ رکنی شاعر کو ملنا چاہیئے تھے لیکن منصور روایت کرتا ہے (منصور کسی راوی کا نام ہے) کہ سلطان کے دبیر ابوسہل ہمدانی کے عرض کرنے پر کہ یہ کثیر رقم ایک شاعر کو دیا جانا کیا ضرور ہے اگر اس کے عوض ساٹھ ہزار درم سیم دیئے جائیں تو بھی بہت ہے، سلطان اس تعداد کے درم ہمارے شاعر کے پاس بطور صلہ بھجواتا ہے۔ فردوسی اُس وقت حمام میں تھا، بیس ہزار درم حمامی بیس ہزار فقاعی اور بیس ہزار انعام لانے والوں کو دے دیتا ہے اور حمام سے نکل کر یہ دو تین بیت بحرِ متقارب میں لکھ کر ایاز کے سپرد کرکے روپوش ہو جاتا ہے۔ چند روز کے بعد ایاز وہ کاغذ حسب ہدایت فردوسی سلطان کے روبرو پیش کرتا ہے۔ سلطان اس کو گنج نامہ کا کاغذ خیال کرکے نہایت شوق سے کھولتا ہے اور پڑھ کر نہایت متغیر ہوتا ہے۔ فردوسی کی گرفتاری کے لیے پچاس ہزار درم کا اشتہار لگا دیا جاتا ہے لیکن فراری کا کسی طرف پتہ نہیں چلتا۔ سلطان ادہر سے مایوس ہو کر اپنا طیش اپنے وزیروں اور دبیروں پر نکالتا ہے۔ ان کو اپنی بدنامی کا بانی کہتا ہے اور سیاستاً اُن کو موقوف اور شہر بدر کر دیتا ہے۔

برخلاف اِس کے نظامی عروضی کا بیان ہے کہ شاہ نامہ طوس میں ختم ہو کر خواجۂ بزرگ احمد بن حسن میمندی کی وساطت سے دربارِ سلطانی میں پہونچا۔ لیکن خواجہ کے دشمنوں نے دراندازی کرکے اور فردوسی کو رافضی اور معتزلی ثابت کرکے سلطان کو صرف پچاس ہزار درم دینے پر راضی کر لیا۔ یہ انعام فردوسی حمامی اور فقاعی میں تقسیم کرکے اور سیاست سلطانی سے خائف ہو کر راتوں رات غزنین سے فرار کر گیا۔ طبرستان پہونچ کر سلطان کی ہجو میں اِس نے ایک سو بیت لکھے اور شہریار روالیِ طبرستان سے عرض کی چونکہ یہ کتاب تمھارے اجداد اور اسلاف کے حالات میں ہے اس لیئے میں اِس کو تمھارے نام سے منسوب کرتا ہوں۔ شہریار نے کہا کہ محمود میرا آقا ہے

یہ کتاب تو اسی کے نام پر رہنے دے تیری محبت کا صلہ تجکو اپنے وقت پر مل جائیگا البتہ سلطان کی ہجو میں خریدنا چاہتا ہوں یہ تو مجھے دیدے دوسرے روز ایک لاکھ درہم شہریار نے فردوسی کے پاس بھجوا دیئے۔ جس نے صفحۂ کاغذ سے اس کو دھو ڈالا سلطانی ہجو اس طرح ضائع ہوگئی اور یہ چھ بیت من جملہ اس کے باقی رہ گئے۔

چو محمود را صد حمایت کنم　　اگر مہرشاں من حکایت کنم　　بمہر نبی و علی شہ کہن　　مرا غمزہ کردند کاں پر سخن

چو دریا کرانہ ندانم ہمی　　ازیں در سخن چند رانم ہمی　　وگر چند دارد پدر شہریار　　پرستار زادہ نیاید بکار

ندانست نام بزرگاں شنود　　چو اندر تبارش بزرگی نبود　　وگرنہ مرا برنشاندے بگاہ　　بہ نیکی نبد شاہ را دستگاہ

ان بیانات میں ہم دیکھتے ہیں کہ دیباچۂ قدیم و نظامی سوائے دو باتوں کے اور تمام امور میں ایک دوسرے کے برخلاف ہیں دونوں کو صرف اس بات پر اتفاق ہے کہ سلطان بوجہ اختلاف مذہبی فردوسی سے ناراض ہوا اور یہ کہ فردوسی نے سلطان کی ہجو ضرور لکھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا بوجہ تخالف مذہبی سلطان محمود فردوسی سے ناراض ہوا اور کیا فردوسی نے انعام نہ ملنے پر سلطان کی ہجو لکھی؟ یہ سوالات ہیں جن پر ہم ذیل میں بحث کرنا چاہتے ہیں۔ سب سے پیشتر ہم مخالفت مذہب کے مسئلے کو لیتے ہیں۔

شاہ نامہ میں ایک مقام ایسا آگیا ہے جہاں بعض اشعار ہماری تلاش کے مقصد پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں داستان شیریں و خسرو کی ابتدا میں فردوسی تذکرۃً کہتا ہے۔

ز گفتار و کردار آں راستاں　　کہن گشتہ ایں نامۂ باستاں　　سخنہائے شیریں و خسرو کنم　　کنوں داستان کہن نو کنم

سخنہائے شائستہ غمگسار　　بود بیت شش بار بیور ہزار　　کہ تا یاد دارند از سرکشاں　　ہمی نو کنم مرد را زیں نشاں

ہمانا کہ باشد کم از پنج صد　　وگر باز جویند از و بیت بد　　بنشتہ بابیات صد بار سی　　نہ بیند کسے نامۂ پارسی

زبد گوئے و بخت بد آمد گناہ　　نکرد اندریں داستانہا نگاہ　　بگیتی ز شاہاں درخشندۂ　　چنیں شہریارے و بخشندۂ

تبہ شد بر شاہ بازار من　　در افتاد بدگوئے در کار من

یہ اشعار ظاہر ہے کہ ایسے وقت لکھے گئے ہیں جب کہ شاہ نامہ اختتام کو پہنچ گیا ہے یعنی اس وقت جب کہ فردوسی کو اپنے اشعار کی تعداد معلوم ہو چکی تھی اس نے دو طرح سے ان کی تعداد بیان کی ہے ایک دفعہ کہتا ہے "شش بار بیور"

یعنی ساٹھ ہزار۔ دوبارہ کہتا ہے "سدبارسی" لیکن اگر تیں کو سو میں ضرب دیں تو کل تعداد تین ہزار ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ ہم فردوسی کو ایسے موقع پر سہو کا الزام نہیں دے سکتے تاوقتیکہ یہ اُس پر الزام نہ لگائیں کہ اُس کا علم حساب نہایت کمزور تھا ورنہ "صدبارسی" کو "صدیارسی" پڑھنا ہوگا اور "یارسی" کے معنی چھ سو لینا ہونگے ۶۰۰ x ۱۰۰ = ۶۰۰۰۰ ساتھ ہی وہ یہ بھی کہہ رہا ہے کہ اس میں کمزور اور خراب اشعار کی تعداد کم سے کم پانسو ہوگی۔ اب سلطان کی نسبت گویا ہے کہ ایسا پادشاہ جو دُنیا کے پادشاہوں میں ممتاز ہے تعجب ہے کہ اُس نے میری کتاب کی طرف کچھ توجہ نہیں کی۔ جس کی دو وجوہ وہ قایم کرتا ہے۔ پہلے دشمن کی سعایت دوسرے اپنی بدنصیبی۔ دشمن کی بدگوئی کا ذکر کرتے ہوئے وہ گویا ہے کہ دشمن نے میرے معاملات میں ایسی کارروائی کی ہے کہ پادشاہ کی نگاہ میں میرا بازار بالکل تباہ ہوگیا۔

فردوسی ہم سے یہ نہیں کہتا کہ وہ بدگو کون تھا اور اُس کی بدگوئی کی کیا نوعیت تھی۔ اب ظاہر ہے کہ فردوسی کے تذکرہ نگاروں کے دو فریق جن میں ایک فرقہ غالباً سُنّی ہے اور دوسرا شیعی اور اُن کے اپنے زاویۂ نگاہ سے مختلف اقوال ایک کا خواجہ احمد بن حسن میمندی کو فردوسی کا دوست اور سرپرست بیان کرنا دوسرے فرقہ کا خواجہ کو خارجی اور فردوسی کا دشمن کہنا برخلاف اس کے ایاز کو فردوسی کا دوست ظاہر کرنا دوسرے فرقہ کا اس کی تردید میں ایاز کو فردوسی کا دشمن بیان کرنا اور اُس کو نقصان پہونچانا وغیرہ وغیرہ۔ ہماری رائے میں محض فرضی اور مصنوعی قصے ہیں۔ جو دونوں فرقوں نے ان اشعار کی تشریح کے مقصد سے ایجاد کیے ہیں۔ یہ واضح ہے کہ جب خود فردوسی اپنے دشمن کا نام نہیں جانتا تھا اور اگر جانتا تھا تو بیان کرنا نہیں چاہتا تھا تو اس کے معاصرین کو بھی صحیح واقعات کی اطلاع نہیں ہوسکتی تھی چہ جائے کہ ایسے لوگوں کو جو فردوسی کے زمانہ اور اُس کے واقعات کے بہت عرصہ بعد پیدا ہوئے۔ بدگوئی کی تاویل میں کہا جاتا ہے کہ فردوسی شیعہ یا رافضی تھا میرے خیال میں یہ تاویل بیکار معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ فریقی تنافر کا یہ قعرِ عمیق جو سُنّی اور شیعہ کو فی زمانا جدا کر رہا ہے اُس وقت حائل نہیں تھا۔ دونوں فرقوں میں تعلقات خوشگوار تھے اور خود سلطان محمود کی دختر امیر کیکاؤس والی طبرستان کو بیاہی گئی تھی جو شیعہ خاندان سے علاقہ رکھتا تھا۔ اس قدر ضرور مفہوم ہوتا ہے کہ وہ بدگوئی خواہ کسی نوعیت سے کیوں نہو اُس کی تشیع پر ڈال نہیں ہوسکتی۔ کسی سُنّی کے لیے یہ کہنا کہ وہ سُنّی ہے بدگوئی کی تعریف میں داخل نہیں علیٰ ھذا

کسی شیعہ کو یہ کہنا کہ وہ شیعہ ہے بدگوئی نہیں ہو سکتی البتہ ایک سُنّی یا شیعہ کو ان زمانوں میں ملحد یا قرملی کہنا بدگوئی مانا جا سکتا ہے لیکن واقعہ اگر ایسا ہوتا تو ضرور ہے کہ فردوسی بطور احتجاج اس کی تکذیب یا تردید کرتا۔ بالخصوص جب ہم ناظرین کو یہ اطلاع دینگے کہ مذکورہ بالا ابیات امیر نصر بن ناصر الدین سلطان محمود غزنوی کے سگے اور پیارے بھائی کو خطاب کرکے شاعر نے لکھے ہیں۔ اس استدلال سے بھی ایک نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ فردوسی خود اپنے دشمن اور اُس کی دشمنی سے ناواقف محض تھا ورنہ ضرور امیر نصر کو اس کی حقیقی کیفیت سے اطلاع دیتا اور یہ کہ فردوسی کے مذہب کا اِس معاملہ کو کوئی تعلق نہیں تھا۔

یہ امر فردوسی کی طبیعت میں داخل ہے کہ خارجی واقعات سے خواہ خفیف ہوں یا اہم نہایت متاثر ہوتا ہے اور اُن کا ذکر بھی بطور جملۂ معترضہ شاہ نامہ میں ضرور کر دیتا ہے۔ تعجب ہے کہ فردوسی اپنی عمر بھر کی اُمیدوں کے خون ہونے کے واقعے کو صرف دو شعروں میں بیان کر دیتا ہے اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی ناکامی کے اسباب اور اُن کے بانیوں سے قطعاً تاریکی میں تھا! البتہ اس قدر اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ سلطان کی سرد مہری اور عدم توجہی اِس ناکامی میں ایک نمایاں عنصر تھی۔

فردوسی کی ناکامی پر رائے زنی کرتے وقت ہمیں یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ مذہبی حلقوں میں فردوسی اپنی تصنیف میں عربوں کے ساتھ منصفانہ اور غیر جانبدارانہ سلوک مرعی نہ رکھنے کا ملزم بنایا گیا ہے الزام اِس میں شک نہیں ایک حد تک درست ہے۔ اِس بنا پر ملک میں جذبات اس کے خلاف برافروختہ ہو گئے تھے اِس کی تصدیق کتاب عمر نامہ سے ہوتی ہے جو شاہ نامہ کے رد میں اِن ہی ایّام میں تالیف ہوئی تھی۔ اِس جوشِ مخالفت کا اثر فردوسی کے خلاف کہاں تک ہوا اور سلطان کے ہاں اُس کی ناکامی میں اُس نے کوئی نیا سبب اضافہ کیا ہم نہیں کہہ سکتے لیکن یہ بدیہی ہے کہ فردوسی اپنی زندگی کے ایام میں غیر مقبول ضرور رہا۔ اس کی حمایت میں ردِ عمل فردوسی کے زمانہ کے بعد کی تحریک ہے جب کہ آنے والی نسلوں کو شاہ نامہ کی سحر بیانی تسخیر کر چکی ہے اُسی زمانہ میں یوسف زلیخائے فردوسی اس کے نام پر تصنیف ہوئی ہے جس میں ایران پرست اور فلسفی طبع فردوسی ایک تائب اور دیندار و متقی مسلمان کی حیثیت سے دکھایا گیا ہے۔

فردوسی کی ناکامی کا اصلی سبب میرے خیال میں غریب فضل بن احمد کی تباہی قید اور ہلاکت سے تعلق رکھتا ہے

جو واقعہ شاہ نامہ کے اختتام کے قریب زمانہ میں رونما ہوتا ہے۔ ایشیائی درباروں میں کسی شخص کی رسائی اور کامیابی ہم یقینی طور پر جانتے ہیں بغیر طاقتور تائید یا سفارش کے ناممکن ہے۔ محمود کا دربار کسی وقت بھی فریقی مناقشات اور حریفی جدال سے خالی نہیں رہا ہے۔ طاقتور افراد دربار میں ہر وقت ایک دوسرے کی توڑ کے استیصال میں سرگرم نظر آتے ہیں کچھ اسی قسم کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا فضل بن احمد دس سال مستقل وزیر رہنے کے بعد شکار ہوا۔ اس وزیر سے فردوسی کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ فضل عربی زبان اور عربی علوم سے اُمّی محض تھا۔ اس لیے دفتر کی زبان اُس نے فارسی کر دی تھی۔ ادہر فردوسی ایران کی قدیم عظمت وجلال کے افسانے اپنی سادہ مگر برجستہ زبان میں زندہ کر رہا تھا پھر کیا وجہ تھی کہ ان دو زبردست ہستیوں کے قلوب میں ایک دوسرے کا پاس او راحترام نہو فردوسی جو بالطبع مدح خوانی اور قصیدہ سرائی سے نفرت رکھتا تھا شاہ نامہ میں کئی مقام پر فضل بن احمد کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ دیباچہ میں بھی ایک تلمیح اسی وزیر کی طرف ہے ایک اور مقام پر کہتا ہے ؎

کجا فرش را مسند و مرقد ست　　　نشستن گہہ فضل بن احمد ست

اسی وزیر کا شکریہ کرتے ہوئے فردوسی کہتا ہے ؎

ز دستور فرزانۂ دادگر　　　پراگندہ رنج من آمد بسر

جس حالت میں کہ فردوسی فضل بن احمد کا آوردہ یا دوست مان لیا گیا تھا تو ظاہر ہے کہ وزیر کے دشمن ہمارے شاعر کو کسی حالت میں کامیاب ہوتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔

آیندہ فردوسی کا کیا طرزِ عمل رہا۔ آیا ہجو لکھ کر اُس نے اپنے دل کا بخار نکالا یا کوئی اور طریقہ جو اُس سے زیادہ مفید ہو سکتا ہے اختیار کیا۔ غزنین کے قیام کے دوران میں فضل بن احمد کے علاوہ ایک اور زبردست شخص نے فردوسی کے معاملات میں دلچسپی لی ہے وہ امیر نصر بن ناصر الدین سبکتگین ہے۔ فردوسی کئی موقعوں پر اس کی مدح میں ترانہ ریز ہے۔ دیباچہ میں کہتا ہے ؎

ز گیتی پرستندۂ فرِ نصر　　　زید شاد در سایۂ شاہِ عصر
کسے کش پدر ناصر الدیں بود　　　پئے تختِ او تاجِ پروین بود
خداوند مردی و رائے و ہنر　　　بدو شادماں مہتراں سر بسر

بویژہ دلاور سپہدار طوس — کہ در جنگ بر شیر دارد فسوس

سکندر کی وفات کے موقع پر سلطانی مدح کے ضمن میں فردوسی امیر نصر کے متعلق پھر گویا ہے ؎

سپہدار سالار او میر نصر — کزو شادمان ہست گردندہ عصر

سپہدار چون بو المظفر بود — سر لشکر از ماہ کمتر بود

کہ پیروز نام ست و پیروز بخت — ہمی بگذرد کلک او از درخت

ہمی دون سپہدار او شاد باد — دلش روشن و گنجش آباد باد

امیر نصر کے جو مختصر حالات تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں اُن سے دریافت ہوتا ہے کہ وہ نہایت قدردانِ علم و فن تھے۔ فرشتہ مزاج ایسے کہ مدت العمر کبھی مُنہ سے کسی کو گالی نہیں دی۔ حنفی علما کا ایک مدرسہ نیشاپور میں اپنی یادگار چھوڑا۔ شعرا کے بڑے قدردان تھے۔ عنصری جو محمودی دور کا آفتاب مانا جاتا ہے پہلے پہل انہیں کے مہدِ شفقت میں پلا ہے اور خود عنصری کہتا ہے ؎

ز رسم تو آموختم شاعری — بمدح تو شد نام من مشتہر

کہ بودم من اندر جہاں پیش ازیں — کرا بود در گیتی از من خبر

ز جاہِ تو معروف گشتم چنیں — من اندر حضر نام من در سفر

زمال و ز نام تو دارم ہمی — ہم اندر سفر زاد و ہم در حضر

القصہ فردوسی نے ان کی طرف رجوع کی اور وہ اشعار پڑھ کر جو دشمن کے حسد اور سلطان کی ناقدردانی سے تعلق رکھتے ہیں یوں عرض کرتا ہے ؎

چو سالار شہ آں سخنہائے نغز — بخواند بہ بیند بپاکیزہ مغز

ز گنجش من ایدر شوم شادماں — کزو دور بادا بد بدگماں

وزاں پس کند یاد بر شہریار — مگر تخم رنج من آید ببار

کہ جاوید باد افسر و تخت اوے — ز خورشید تابندہ تر بخت اوے

اِن اشعار میں فردوسی امیر موصوف سے یہی درخواست کر رہا ہے کہ آپ جب اس کتاب "سخنہائے نغز"

کو پڑھیں تو اُمید کرتا ہوں کہ قدردانی کرینگے اور میں آپ کی فیاضی سے بےنیل مرام نہ جاؤنگا نیز میری یہ درخواست ہے کہ آپ دربار میں بھی سلطان سے میری سفارش کریں شاید اس طرح سے میرا درختِ اُمید بار آور ہو اور میں کامیاب ہو جاؤں۔

فردوسی کے مساعی کا امیر نصر کے ہاں کیا نتیجہ برآمد ہوا۔ ہم بالکل ناواقف ہیں شاہ نامہ میں اس کے متعلق کوئی چرچا نہیں۔ یہ کتاب اس وقت ختم ہو چکی تھی بعد کے واقعات فردوسی اس میں شامل نہیں کر سکتا تھا۔ اگرچہ ہم نہیں کہہ سکتے ہیں کہ امیر نصر کے ہاں وہ کامیاب ہوا یا محروم رہا لیکن اور قرائن سے پایا جاتا ہے کہ سلطان محمود کی طرف سے مایوس ہی رہا۔ اسی زمانہ میں فردوسی کے مایوسانہ خیالات اور جذبات کا یہ قطعہ شاہد ہے ؎

حکیم گفت کسے را کہ بختِ والا نیست | بہیچ وجہ مرا در زمانہ جویا نیست
برو مجاور دریا نشیں بگردونے | بدشت افتد و دُرّے کجاش ہمتا نیست
خجستہ درگہِ محمود زابلے دریاست | کدام دریا کہ آں را کنارہ پیدا نیست
شدم بدریا۔ غوطہ زدم ندیدم دُر | گناہِ بختِ من ست ایں گناہِ دریا نیست

یہ اشعار اگرچہ مایوسانہ اور جگر خراش ہیں لیکن ان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ان کا قائل کوئی انتظام تجویز کر رہا ہے۔

فردوسی جیسا کہ ہم شاہ نامہ سے سیکھتے ہیں ایک بلند حوصلہ اور عالی ظرف انسان تھا بلند ہمت اتنا کہ تکلیف اور ظلم یا اور کسی قسم کی بدنصیبی کو صبر اور تحمّل کے ساتھ برداشت کر لیتا اگرچہ سلطان کی ناقدردانی نے اس کا دل پاش پاش کر دیا تھا تاہم کہا جا سکتا ہے کہ وہ رکیک ہجو لکھ کر انتقام لینے کے ناقابل تھا۔ اس کی شریف طبیعت کے موافق تھا کہ وہی محمود جس کی اس نے اپنی ضخیم کتاب میں بےشمار موقعوں پر مدح آفرینی کی ہے جس کا تن بقول فردوسی "زندہ پیل اور روح جبرئیل ہے۔ اگر اس کا کف ابر بہمن ہے تو دل دریائے نیل ہے۔ جو بزم میں آسمان وفا ہے اور رزم میں تیز دم اژدہے کی مثال ہے۔ جو بھیڑ اور بھیڑیے کو ایک گھاٹ پانی پلاتا ہے۔ زمانہ جس کے طفیل باغ سدا بہار بن گیا ہے اور جس کی برکت سے بارش وقت پر آجاتی ہے، گہواروں میں شیرخوار اس کا نام لیتے ہیں اور ماہ و کیوان اس کو سجدہ کرتے ہیں"۔ صرف صلہ سے محرومی کی حالت میں جس کے لیے محمود نے کسی قسم کی ذمہ داری نہیں

کی تھی اس لیئے کہ شاہ نامہ فردوسی نے محض اپنے شوق سے شروع کیا تھا ؎

من این نامہ فرّخ گرفتم بفال　　همی رنج بردم بہ بسیار سال

محمود کی اس طرح سے مذمّت کرنا جو یاجیوں اور بازاریوں کا طریقہ ہے۔

فردوسی مال و دولت کا بھی زیادہ فریفتہ نہیں نظر آتا۔ حرص و طمع کا سب سے زبردست دشمن ہم فردوسی میں دیکھتے ہیں اس کے فلسفے میں صرف تین اشیاء ضروریات زندگی میں تسلیم کی گئی ہیں۔ غذا، لباس، اور بستر۔ باقی خواہشات اس کے نزدیک آزمائی جاکر ممنوعات میں شمار کی گئی ہیں۔ مال کے لیئے اس کا قول ہے ؎

زبہر درم تُند و بدخو مباش　　تو باید کہ باشی درم گو مباش

کسے کو بگنج و درم ننگرد　　همہ روز او برخوشی بگزرد

کیا ایسے اُصولوں کا پابند اوران مواعظ کا تلقین کنندہ ہم خیال کرسکتے ہیں انعام کے لالچ میں سلطان سے بگاڑتا اور اُس کی مذمت کرتا۔

شاہ نامہ ایک عظیم کتاب ہے اس میں فردوسی نے دوست اور دشمن دونوں کا ذکر کیا ہے۔ مگر کوئی موقع ایسا نظر سے نہیں گزرا جہاں فردوسی یاس و قنوط رنج و غصّہ اور طیش میں آکر اپنی متانت اور تہذیب کو ہاتھ سے کھوکر عامیانہ زبان استعمال کرے نہ کہ وہ زبان جو کہا گیا ہے فردوسی نے ہجو میں سلطان کے حق میں استعمال کی ہے۔

ہمارے تذکرہ نگاروں کی عقل پر پردے پڑگئے ہیں جنھوں نے فردوسی کو ہر ذلیل اور مذموم فعل کا مرتکب بنادیا ہے اس کے دامن پر نہ صرف ہجو کا داغ ہے جو بھک منگے اور ٹکر گدے شاعروں کا آلہ ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی اور دروازوں پر جس میں والیانِ ماژندران قہستان طبرستان اور بغداد شامل ہیں سر پر شاہ نامہ کی عظیم مجلدات کا پشتارہ اور ہاتھ میں کاسۂ گدائی لیے بھجوایا ہے۔ یہاں وہ قصیدہ لکھتا ہے وہاں وہ یوسف زلیخا تصنیف کرتا ہے۔ قصہ مختصر اُنھوں نے ہر ناممکن شے کو ممکن کردکھایا ہے۔ یہ یاد رہے کہ اسّی برس کا پیر فرتوت بڑھاپے نے جس کی کمر دوہری کردی ہے آنکھوں سے جس کو بہت کم سوجھائی دیتا ہے کانوں سے جو تریسٹھویں برس میں ہی بہرا ہوگیا تھا جس کے اعضا میں لرزہ اور رعشہ غلبہ پاچکا تھا اور جو عصا کی مساعدت کے بغیر ایک قدم بھی حرکت نہیں

ہیں کر سکتا تھا ان دراز سفروں میں کیونکر اپنا جسم سنبھالنے اور سفر کرنے کے قابل ہو سکا اور پھر سلطانی تعاقب سے بچ کر کئی سال آوارۂ وطن رہ کر اپنی تصنیفات لیے لیے اجنبی رؤسا کے درباروں میں پہنچ کر رسائی بھی پیدا کر لیتا ہے۔ ایسے خلاف معمول واقعات الف لیلیٰ کی کہانیوں میں البتہ ملتے ہیں نہ تاریخی اوراق میں۔ فردوسی کا یہ سفر سندباد بحری کے سفر سے کیا کم کہا جا سکتا ہے۔

ہجو کے باب میں خاتمۂ شاہ نامہ بھی کسقدر روشنی ڈالتا ہے۔ شاعر کی عمر اکہتر ویں سال یا ۳۹۳ھ میں شاہ نامہ ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ شعر ؎

چو سال اندر آمد بہفتاد و یک ہمی زیر شعر اندر آمد فلک

۴۰۰ھ میں آخری مرتبہ اس نے شاہ نامہ کو ہمیشہ کے لیئے بند کرنے کے غرض سے خاتمہ میں قلم اُٹھایا ہے ان دو تاریخوں کے درمیان سات سال کا پردہ حائل ہے۔ اچھا فردوسی اس عرصہ میں کیا کرتا رہا اور کس شغل میں رہا۔ غالباً وہ شاہ نامہ کی درستی تصحیح اور ترتیب میں مشغول رہا یا جیسا کہ اس کے تمام تذکرہ نویس مدعی ہیں سفر اور مختلف شہروں میں بسر کرتا رہا۔ اگر واقعی فردوسی نے ہجو لکھی ہے تو بہر حال ان سات سالوں کے اندر اندر لکھی جا چکی ہوگی اور قیاس سلیم بھی اسی نظریہ کا مقتضی ہے لیکن ہم یہاں پر دیکھتے ہیں کہ فردوسی ان آخری ابیات میں بھی سلطان کے ذکر میں مشغول ہے اگرچہ یہاں وہ مدح گستری نہیں کرتا تاہم ایسے الفاظ میں سلطان کا ذکر کر رہا ہے جن سے ظاہر ہے کہ اس کی جذبات سلطان کی طرف سے تلخ نہیں ہیں وہ کہتا ہے ؎

سی و پنج سال از سرائے سپنج بسے رنج بردم بامید گنج

چو بر باد دادند رنج مرا نبد حاصلے سی و پنج مرا

کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد امیدم یکبارہ بر باد شد

اِن ابیات میں اس کے دلی جذبات بھرے ہیں اگرچہ وہ مایوس اور محروم نظر آتا ہے اگرچہ اُس کی تمام آرزوں کا خون ہو چکا ہے تاہم وہ غضبناک نہیں ہے نہ اس نے اب تک ہجو لکھی ہے نہ اُس کے لکھنے پر مائل ہوتا ہے۔ یہ شکستہ دل بوڑھا شاعر جس کو اناسی اسّی سردیوں نے بالکل ضعیف فرسودہ اور افسردہ کر دیا ہے اپنے بادشاہ کے حق میں ہاتھ اٹھا کر یہ دعا دیتا ہوا خاموش ہو جاتا ہے ؎

تنِ شاہ محمود آباد باد — ہمیشہ بکامِ دلش شاد باد

چنانش ستودم کہ اندر جہاں — سخن ماند از و آشکار و نہاں

ہمش رائے و ہم دانش و ہم نسب — چراغِ عجم آفتابِ عرب

فردوسی کی محرومی کے متعلق نظامی گنجوی بھی تلمیح کرتے ہوئے نصرۃ الدین سے کہتے ہیں [۱]

بیادِ نظامی یکے طاسِ می — خوری ہم بہ آئینِ کاؤسِ کی

ستانی بہ ایں طاسِ طوسی نواز — حقِ شاہ نامہ ز محمود باز

دو وارث شمار از دو کانِ کہن — ترا ز سخا و مرا در سخن

بو امی کہ ناداده باشد بخت — حقِ وارثاں از وارث آید درست

شہریار نامۂ مختاری[۲] میں بھی ہجو کی نسبت اشارہ پایا جاتا ہے اس شاعر کا زمانہ تعین کرنے میں کامیاب نہیں ہوا ہوں۔ ہجو کا ذکر ان اشعار میں ہے

چو مختاری آں بارور داستاں — بنامِ تو گفت اے شہِ راستاں

گرم ہدیہ بخشی دریں بارگاہ — بہ پیشِ بزرگانِ با عز و جاہ

شود شاد، افزوں شود جاہِ تو — ہماں مدح گویم بدرگاہِ تو

وگر ہدیہ نہ دہی ایا شہریار — نرنجم کہ ہستی خداوندگار

زبانِ من از ہجو کوتاہ باد — ہمیشہ ثنا گوئے ایں شاہ باد

ہجو کے بارہ میں عالمگیر اعتقاد کے باوجود میری سوءظنی تعجب کی نگاہوں سے دیکھی جائیگی بالخصوص جب کہ میں اس عقیدہ میں بالکل تنہا ہوں اس لئے کہ ہجو سے آج تک کسی نے انکار نہیں کیا ہے اور نہ کسی قسم کا اشتباہ اِس پر کیا گیا ہے لیکن جیسا کہ اوپر دکھایا جاچکا ہے میں محض شاہ نامہ کی سند پر اس کے وجود سے منکر ہوں اس مسئلہ کا بہترین

---

[۱] یہ شعر کلکتہ کے شاہ نامہ و دیگر قلمی و مطبوعہ نسخوں میں نہیں ملتا ہے ایک قلمی نسخہ نوشتہ ۸۵۲ھ سے جو باعتبار عمر قدیم ترین نسخہ ہے جو میری نظر سے گزرا ہے نقل کیا ہے

[۲] انگریزی ماہرین مختاری کو سلطان محمود غزنوی کے جانشین سلطان مسعود شہید کا معاصر مانتے ہیں اور مختاری کا یہ شعر ان کے خیال کا مؤید ہے ~ گل باغ سلطان محمود شاہ جہاں جوئے بخشندہ مسعود شاہ میرے خیال میں یہ مختاری اگرچہ عثمان مختاری غزنوی نہیں ہے لیکن شہریار نامہ کی زبان کی روانی اور صفائی دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ ہم کو اس کا زمانہ آلِ سلجوق کے عہد میں ماننا پڑیگا اور کوئی تعجب نہیں اگر بہمن نامہ اور شہریار نامہ ایک ہی دور کے یادگار ہوں۔

فیصلہ تنقید کے ہاتھ میں ہے جو ذیل میں آتی ہے۔

ہجو کی ابتدا اور تنظیم

پیشتر اس کے کہ تنقید کے میدان میں خامہ فرسائی کی جائے چند کلمات ہجو کی اصلیت اور نظام کے متعلق کہنا بادی النظر میں غیر ضروری معلوم نہیں ہوتے۔ بقول دیباچۂ قدیم ہجو کل دو تین ابیات پر محدود تھی لیکن ہم ان اشعار سے واقف نہیں ہو سکتے۔ بقول نظامی عروضی وہ کل چھ شعر ہیں اُن سے ہم واقف ہیں لیکن نظامی کے بیان کو ہمیں نہایت احتیاط کے ساتھ قبول کرنا چاہئے حقیقت یہ ہے کہ ان چھ میں بھی دو شعر شاہنامہ سے سرقہ کیے گئے ہیں۔ پہلا۔ پرستار زادہ نیاید بکار الخ۔ دوسرا۔ ازین در سخن چند رانم ہمی ❊ چو دریا کرانہ ندانم ہمی ❊ یہ وجہ ہے کہ اس بارہ میں نظامی کے مقولہ کو ہم بداعتقادی کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور اس عقیدے پر قایم ہو جاتے ہیں کہ ابتدا میں ہجو کی کوئی اصلیت نہیں تھی اور یہ کہ اس کا آغاز فردوسی کے زمانہ کے بعد ہوا ہے۔

ہجو کی ولادت کا قصہ ہمیشہ کے لیئے ایک سربستہ راز رہیگا جس طرح کہ فردوسی کے متعلق اور واقعات شاہنامہ کی عالمگیر شہرت اور سلطان کے ہاں سے فردوسی کی ناکامی کے قصے غالباً اس کی تولید کے ذمہ دار ہیں۔ ہر شخص آشوب ماژندرانی کے مانند تنگ چشم اور متعصب نہیں تھا۔ فردوسی کی حمایت میں ردعمل غالباً پانچویں صدی ہجری میں شروع ہو چکا تھا جس کے ابتدائی جراثیم ہم دیباچۂ قدیم میں دیکھتے ہیں اور ہجو کی داغ بیل اسی زمانہ میں پڑ چکی تھی لیکن اس کی بالیدگی کی رفتار نہایت تدریجی تھی حتےٰ کہ وسط قرن ششم میں اس کا وجود کل چھ ابیات پر منحصر تھا۔ فردوسی پرست جماعت اب ملک میں ہر طرف نظر آتی تھی شاہنامہ کے اشعار عوام کی زبان پر تھے بادشاہوں کے محل اُن سے گونجتے تھے خطیبوں کے منبر سے وہ سنائی دیتے تھے اور میدانِ جنگ میں تیغ و شمشیر کی جھنکار اور بوق و نائے کی آواز کے ساتھ ساتھ فردوسی کی رجز خوانی بھی مسموع ہوتی تھی۔ جب شاہنامہ اس طرح ملک میں چاروں طرف اپنی ہر دل عزیزی کا سکہ بٹھا چکا ہے تو ظاہر ہے کہ عوام کو فردوسی کے حالات اور سوانح زندگی کی بھی تلاش ہوئی ہوگی۔

سلاطینِ اسلام کے درباروں میں شعرا کا طبقہ ایک خاص امتیاز رکھتا تھا اپنے اقتدار کو ثبات اور ترقی دینے

کی غرض سے اس جماعت نے ایک نئی قسم کے فلسفہ کی بنیاد ڈالی تھی جس میں پادشاہوں کی بقائے نام اور اُس کی غیر فنائیت اپنے فرقہ کی بہبود تربیت اور قدرشناسی کے ضمن میں ثابت کی تھی۔ مختاری کہتے ہیں ؎

گرچہ مردم ز عمر بر گزرست | عمر ثانی مدائح شعراست
زندہ رستم بشعر فردوسیست | ورنہ زو در جہاں نشانہ کجاست
عنصری را ز زر محمودی | آں چناں شعرہائے بیش بہاست
جاں گدازیست شاعری کردن | چوں بہا دادنش بصلہ سزاست
غرض از آفرینش شعرا | مدحت پادشاہ باشد راست

اِس فرقہ نے اپنی حفظ نوع کے لیئے ایک ہتیار بھی ایجاد کیا تھا جس کو اظہارِ ناخوشنودی اور انتقام کے وقت وہ استعمال کرتا تھا اس کا نام ہجو یا ہجا یا مذمّت تھا ان کا قول تھا ؎

کہ شاعر چو رنجد بگوید ہجا | بماند ہجا تا قیامت بجا

اسلام کی طاقتور سلطنتیں اگرچہ یوں تو اُن کی وسیع طاقت کی قانون انسانی یا قانون الٰہی بھی حدبندی نہیں کرسکتا تھا لیکن شعرا ان کے ہاں ابتدا ہی سے اپنا زبردست اقتدار اور اثر قایم کرچکے تھے اُنھوں نے اپنے بارہ میں ان شاہانہ اور مستبدانہ اختیارات کو بہت کچھ معتدل کردیا تھا۔ اتفاق سے محمود اور فردوسی کے ناخوشگوار تعلقات کا راوی بھی یہی طبقہ ہے کیونکہ ہمعصر تاریخیں اس مقدمہ میں بالکل خاموش ہیں۔ اِس جماعت نے اس قصہ میں اپنی اپنی تعلیم کی تائید کے حق میں نہایت ضروری اجزا پائے اس کی شہرت میں اپنی حفاظت کا سامان دیکھا اِس لیے اس افسانے کو اُنھوں نے بہت کچھ آب و تاب دے کر مختلف رنگ آمیزیوں کے ساتھ ہر موقع پر بیان کرنا شروع کیا محمود اگرچہ اسلام کے طاقتور اور اولوالعزم پادشاہوں میں سے ہے مگر فردوسی کے انتقام نے اُس کو ہمیشہ کے لیئے نگاہوں میں ذلیل کردیا ہے وہ ہر سلطان اور امیر کے لیئے سبقِ عبرت بنایا گیا ہے کہ شعرا کے ساتھ سلوک مرعی رکھنے میں احتیاط سے کام لینا چاہیئے ورنہ کہیں وہی حشر نہ ہو جو محمود غزنوی کا ہوا۔ محمود اور فردوسی کا افسانہ بار بار دوہرایا گیا اور سنایا گیا ہے اس صورت میں ہجو کی ہر طرف تلاش کی گئی ہوگی ہر شخص اس کے دیکھنے اور پڑھنے کا مشتاق ہوگا اگرچہ شروع میں لوگ یہی کہتے رہے کہ وہ غائب ہوگئی لیکن یہ امر انسانی بالخصوص شاعر کی طبیعت

کی منافی تھا کہ ہجو کا فقدان ہمیشہ کے لئے مانا جائے ۔ فردوسی اگر موجود نہیں تھا فردوسی کے ہم مشرب ہر وقت اور ہر زمانہ میں موجود تھے آخرکار ان کی کوششوں نے اس گوہرِ گم گشتہ کو بھی پیدا کرلیا اور رفتہ رفتہ شاہ نامہ کے ہر نسخہ کے ساتھ شائع ہونے لگی حتّٰی کہ اس کا اصلی جزو بن گئی ۔ متاخّرین نے کبھی اس کی مصنوعی ہستی کا احتمال تک نہیں کیا ۔ اور آج یہ جعلی نمونہ اسی قدر فردوسی کا اصلی کلام مانا جاتا ہے جیسے فردوسی کا اور صحیح کلام ۔ عوام النّاس شاہ نامہ سے واقف ہیں لیکن ہجو کے اشعار سے بچہ بچہ تک آگاہ ہے ۔ ہجو کی مقبولیت اس میں شک نہیں شاہ نامہ کی مقبولیت سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی ہے اور ہم جو کہ اس عام غلطی اور ایک غیر تاریخی واقعہ کی تکذیب میں قلم اٹھا رہے ہیں اس کے افشا کرنے سے خود متالم اور متفکر معلوم ہوتے ہیں کیونکہ جس مقبولہ اور عام غلطی میں ہم نے پرورش پائی ہے اس کے ابطال کو ہمارا دل گوارا نہیں کرتا ۔

حقیقت یہ ہے کہ فردوسی کے افسانے جو اسلاف نے ترکہ میں ہم تک پہونچائے ہیں کچھ ایسے دل کش خوش آئند اور دل فریب ہیں کہ ان کی تصدیق سے انکار کرنے کو ہمارا دل نہیں مانتا ۔ ہم ایک طرف ایک جلیل القدر نوجوان سلطان کو دیکھتے ہیں جس کے اشارۂ چشم پر لاکھوں تلواریں ایک دم میں برہنہ ہوسکتی ہیں اور لاکھوں سر بے دوش ہوسکتے ہیں جو انسانی طاقت کے انتہائی معراج پر ہے اور طیش میں ہے اس کے مقابلہ میں ایک پیر منحنی کو دیکھتے ہیں جس کا جسم بھی اس کے قابو میں نہیں ہے اس کے ہاتھ میں صرف ایک قلم ہے غصہ نے اس کے ابروؤں پر شکن ڈال دی ہے ۔ اس جنگ میں کون جان سکتا تھا کہ بوڑھے کی فتح ہوگی مگر ایسا ہی ہوا ۔ یہ بوڑھا ماہر اپنے قلم سے صفحۂ قرطاس پر کچھ لکھتا نظر آتا ہے اور کسی قریب کے آدمی کے ہاتھ میں وہ کاغذ دے کر بغیر کسی سمت نظر ڈالے رخصت ہوجاتا ہے ۔ قلم شمشیر سے زیادہ طاقتور ہے ۔ اس مقولہ کا ثبوت اس جنگ جذبات میں ملتا ہے ۔ جب اس کاغذ پر سلطان نظر ڈالتا ہے تو غصہ سے آتش وشعلہ بن جاتا ہے وہ اس بوڑھے کی گرفتاری، قتل اور ہلاکت کا حکم دیتا ہے لیکن بوڑھا گویا غزنین سے پر لگا کر اڑ گیا تھا نہ ملا پر نہ ملا ۔ فردوسی دارالسلام بغداد پہنچ چکا تھا اور محفوظ تھا ۔ آتش سلطان اپنی طاقت کا اندازہ کرکے امیر المومنین کے خلاف بھی اعلانِ جنگ کردیتا ہے اور بغداد کی خاک کو ہاتھیوں پر لدوا کر غزنین منگوانے کی دھمکی دیتا ہے لیکن فردوسی حوالہ نہیں کیا جاتا ۔ اس طرف فردوسی کی ہجو اپنا کام کررہی ہے وہ آتش صحرا کے مانند تیز عنانی کے ساتھ شہر بشہر قصبہ بہ قصبہ کوچہ بہ کوچہ خانہ بخانہ پھر رہی ہے اسے جوان بھی پڑھتے ہیں بوڑھے بھی پڑھتے ہیں

اور بچے بھی جانتے ہیں - نوجوان سلطان با ایں ہمہ جلال و شوکت اس خوفناک انتقام کے لئے مستعد نہیں تھا اس کا غصہ کافور ہو جاتا ہے وہ پشیمان ہوتا ہے تلافیِ مافات اور فردوسی سے معافی مانگنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور ظفر فردوسی کے پرچم پر لہراتی ہے- فردوسی کی حسرتناک موت اور انعام کی بے وقت آمد بھی کچھ ایسا درد خیز واقعہ ہے کہ ہم اس سے انکار کرنے کے لئے تیار نہیں معلوم ہوتے ہم میں قدرتاً کرشمہ پسندی کا مادہ موجود ہے اور ہم کو یہی پسند آتا ہے کہ فردوسی ایک غیر معمولی آدمی تھا اور اس غیر معمولی ہستی کی موت بھی غیر معمولی طریقہ سے ہونا چاہیئے - ہم کو اسی میں لطف ملتا ہے کہ فردوسی کے لئے ایسی مرگ پسند کریں اور پھر درد کے مزے لے لے کر اور ہاتھ مل مل کر کہیں ع

نوشدارو کہ پس از مرگ بسہراب دہند

کرشمہ پسند طبائع سے اگر یہ کہا جائے گا کہ فردوسی کے حالات جو اسلاف نے ہمارے لئے ودیعت چھوڑی ہیں تاریخی افسانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تو وہ ہرگز باور نہیں کرینگے - سچ تو یہ ہے کہ ہم اپنے بچپن کے سبق کو جوانی اور بوڑھاپے میں بھولنا نہیں چاہتے عام اس سے کہ ہماری شاہراہ ہم کو ترکستان لے جائے یا کعبے - وہ تاریخی اغلاط جو ہمارے ادبیات کی روح و رواں بن گئی ہیں اور صدیوں سے جن پر ہماری نسلوں نے تعلیم پائی ہے ہم کیونکر گوارا کر سکتے ہیں کہ طشت از بام ہوں- لیکن تاریخ اور ہے اور افسانہ اور ہے اور مؤرخ کو ایک تلخ فرائض بھی ادا کرنے چاہئیں -

یہاں میں ہجو کی تنظیم کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں مختلف نسخوں میں ہجو کے اشعار دو عنوان سے شروع ہوتے ہیں ؎

(الف) ایا شاہ محمود کشور کشائے + ز کس گر نہ ترسی بترس از خدائے + (ب) الا اے خردمندِ صاحب خرد + بگفتارِ کردار من بنگرد

"ہجو الف" میں ایک سو دو ابیات ہیں- بمبئی اور نول کشوری نسخوں میں ان کی تعداد ایک سو پانچ ہے- "ہجو با" میں ایک سو چونتیس اشعار نظر آتے ہیں -قاضی نور اللہ شوستری مجالس المومنین میں پوری ہجو نقل کرتے ہیں لیکن اُن کے ہاں کُل اُنہتر ابیات ہیں - ایک قلمی نسخہ میں جو نویں صدی ہجری کی ابتدا سے تعلق رکھتا ہے اٹھتر بیت پائے جاتے ہیں اور وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہجو کے متعلق ہر شاہنامہ میں کچھ نہ کچھ اختلاف کمی اور بیشی ملیگی اور اگر ان تمام اختلافات کو جمع کیا جائے تو اس میں شک نہیں کہ کُل ابیات کی تعداد دو سو سے زائد ہو جائیگی -

قاضی نور اللہ شوستری کے ہاں اگرچہ ہجو کے اشعار کی تعداد بہت کم ہے تاہم مندرجۂ ذیل وہ اشعار ہیں جو کلکتہ کے شاہ نامہ میں نہیں ملتے ؎

چو سلطانِ دیں بد نبی و علی (۱) بفرّ الٰہی و شانِ ولی
زلالِ رواں بخش آں نظمِ پاک (۲) در آتش فگندی و نیاورد باک
اگرچہ شود کشتہ آتش ز آب (۳) ولیکن شد آں آب ز آتش خراب

یہ دو شعر دیباچۂ بایسنغرخانی کے متن میں منقول ہیں معلوم نہیں قاضی صاحب نے انھیں ہجو میں کیوں شامل کر دیا ہے ؎

چو قولِ شہ از جود بنوشت نخ (۴) حدیثِ فقع را نوشتم بہ نخ
جہاں را چنین ست آئین و ساز (۵) کہ سازد فرومایہ را سرفراز
ستاند ز خاک و رساند بتخت (۶) کند یارمندش بہ نیروئے بخت
نداند نکوئی شود ناسپاس (۷) نہ باشد خداوند را حق شناس

یہ تینوں شعر کسی نسخہ میں نظر سے نہیں گزرے ؎

اگر در کفِ پائے پیلم کنی (۸) تنِ ناتواں ہچو نیلم کنی

یہ شعر معلوم نہیں کلکتہ شاہ نامہ اور اس کی تقلید میں بمبئی اور نول کشوری شاہ نامہ سے کیوں خارج کر دیا۔

خواجہ حسن میمندی کی ہجو میں قاضی نور اللہ کہتے ہیں کہ فردوسی نے یہ اشعار لکھے ؎

بدل ہر کہ بغضِ علی کرد جائے (۹) ز مادر بود عیبِ آں تیرہ رائے
کہ ناپاک زادہ بود خصمِ شاہ (۱۰) اگرچند باشد بایوان دگاہ
زمیمندی آئینِ مردی مجوئے (۱۱) ز نام و نشانش مکن جستجوئے
قلم بر سر او بزن ہجو من (۱۲) کہ گم باد نامش بہر انجمن

ان کا پتہ کسی نسخہ میں نہیں چلتا دیباچۂ بایسنغری میں البتہ درج ہیں اور اگرچہ فردوسی کی طرف منسوب ہیں ہمارا عقیدہ ہے کہ ان کی تصنیف کا حق صاحبِ دیباچہ ہی کو حاصل ہے۔ ہجو الف میں مندرجۂ ذیل ابیات ایسے ہیں جو ہجو با میں نہیں ملتے

(۱) کہ پیش از تو شاہان فراواں بدند   ہمہ نامداران گیہاں بدند
(۲) فزوں از تو بودند یکسر بجاہ   بگنج و سپاہ و بہ تخت و کلاہ
(۳) نہ کردند جز خوبی و راستی   نگشتند گرد کم و کاستی
(۴) ہمہ داد کردند بر زیر دست   نبودند جز پاک یزداں پرست
(۵) نجستند از دہر جز نام نیک   وزاں نام جستن سرانجام نیک
(۶) ہر آں شہ کہ در بند دینار بود   بہ نزدیک اہل خرد خوار بود
(۷) چہ گفت آں خداوند تنزیل وحی   خداوند امر و خداوند نہی
(۸) کہ من شہر علمم علیّم در ست   درست ایں سخن قول پیغمبرست
(۹) گواہی دہم کیں سخن راز اوست   تو گوئی دو گوشم بر آواز اوست
(۱۰) چو باشد ترا عقل و تدبیر و رائے   بہ نزد نبی و علی گیر جائے
(۱۱) گرت زیں بد آید گناہ من ست   چنین ست و ایں رسم و راہ من ست
(۱۲) ابا دیگراں مر مرا کار نیست   بدیں در مرا جائے گفتار نیست
(۱۳) چو بر تخت شاہی نشاند خدائے   نبی و علی را بدیگر سرائے
(۱۴) من ایں نامۂ شہریاران پیش   بگفتم بدیں نغز گفتار خویش
(۱۵) ازاں گفتم ایں بیتہائے بلند   کہ تا شاہ گیرد ازیں کار پند
(۱۶) کزیں پس بداند چہ باشد سخن   باندیشد از پند پیر کہن
(۱۷) دگر شاعراں را نیازارد او   ہماں حرمت خود نگہدارد او
(۱۸) کہ شاعر چو رنجد بگوید ہجا   بماند ہجا تا قیامت بجا
(۱۹) بنالم بدرگاہ یزداں پاک   فشانندہ بر سر پراگندہ خاک
(۲۰) کہ یارب روانش بآتش بسوز   دل بندۂ مستحق بر فروز

بمبئی اور نول کشوری نسخوں میں یہ تین شعر ملتے ہیں ؎

کہ سفلہ خداوند ہستی مباد (۱) جواں مرد را تنگ دستی مباد

قاضی نور اللہ کے ہاں بھی یہ بیت موجود ہے ؎

چو پروردگارش چنیں آفرید (۲) نیابی تو بر بند یزداں کلید
بزرگی سراسر بگفتار نیست (۳) دو صد گفتہ چوں نیم کردار نیست

ہجو آ میں اشعار کی تعداد سب سے زیادہ ہے جیسا کہ اوپر گزارش ہو چکا ہے ابیات آیندہ اس میں ایسے ہیں جو ہجو الف سے غیر حاضر ہیں ؎

(۱) الا اے خردمند صاحب خبر   بگفتار و کردار من در نگر
(۲) میانجی میان من و شاہ باش   بحق خدا کز حق آگاہ باش
(۳) مرا نظم شہنامہ فرمود شاہ   در آں دم کہ بنشست شاداں بگاہ
(۴) کہ بخشد ز ہر بیت زر یک درم   ہر آنچ آورم نظم از بیش و کم
(۵) شش و بیور ایں نامہ و شش ہزار   بگفتم نہ کرد ایچ در من نظار
(۶) حسد برد بدگوئے در کار من   تبہ کرد بر شاہ بازار من
(۷) سخنہائے شائستۂ غمگسار   بگفتار بدگوئے بگذاشت خوار
(۸) چو بر باد دادند رنج مرا   نبد حاصلے سی و پنج مرا

(۹) چنین شهریاری و بخشنده‌ای — بگیتی ز شاهان درخشنده‌ای
(۱۰) بدین گونه بگذشت از قولِ خود — برآورد بر قولِ خود بولِ خود

(۱۱) نه مسکین بدین پادشاه در نرفت — که از وی کم این سخنها شنفت
(۱۲) چو قولِ شه از جود بشکست نخ — حدیثِ فقع بر نوشتم بتخ

(۱۳) چو گفتارِ شه می‌کند زر و سیم — نباشد همی نام او جز لئیم
(۱۴) نژادش چو از بیخ شاهی نزست — بگفتار زینسان بود نادرست

(۱۵) شهی را که از طبع روشن بود — بشهنامه او را نشاید ستود
(۱۶) نیرزم ازین پس که من نزد ام — که تخم سخن را برافگنده‌ام

(۱۷) ز مزد ستانده هرگز نمیرد سخن — سخندان ببین این سخن فهم کن
(۱۸) چنین گفته بد او که بوده است گیو — همان رستم و طوس و گودرز نیو

(۱۹) مرا در جهان شهریاری نواست — بسی بندگانم چو کیخسرو است
(۲۰) نه خسرو نژادی نه والایی — پدر را ز اصفهان بود آهنگیی

(۲۱) اگرچه بود زند آهنگران — بر از شاه بدشان نژاد گران
(۲۲) گر او را نبودی نژاد از بنش — تهمتن نه دادی بد دخترش

(۲۳) مرا این نامهٔ شهریاران بحل — سر از چرخ گردون همی بگذرال
(۲۴) که آن شهریاران چو تو شهریار — بسی بود شاهان بگیهان بشی کار

(۲۵) نگشتند هرگز بگفتار خویش — بهشتند در دم ز آزار خویش
(۲۶) چو این نامور نامه آمد بُن — پشیمان شد از گفتهای کهن

(۲۷) کرم بین نزدیک شاه فقیر — بگوئی ز گفتار حق وا مگیر
(۲۸) نه نیکو بود حق نگهداشتن — بخاشاک ایمان بر انباشتن

(۲۹) ازان گفتم این ابیات من — نجویند ازین گفتها عیب من
(۳۰) خرد نیست در شاه محمود را — که بینم دلش مانعِ جود را

(۳۱) حدیثِ پیمبر بگشتست رد — شود هر شئی راجع اصل خود
(۳۲) نه محمود غزنین که محبوبِ حق — ز شاهنشهان برد بی‌شک سبق

(۳۳) شهنشاه محمود کاندر جهان — دراشیر تردان بود پهلوان
(۳۴) نکردی تو در نامهٔ من نگاه — که رونقی نبودت بگوئی نشاه

(۳۵) بگفتا حسن کر بتر یاوه گوئی — نشاید شنیدن سخن زشت روئی
(۳۶) صد افسوس دارم ز عمرِ عزیز — که مدح گشتم بر آن بی تمیز

(۳۷) بگفتار بد گفتی این نامه بد — پذیرفتی و بد نهادی بخود
(۳۸) مرا نام بادا ترا گنج و مال — که این جاودان است و آن پایمال

(۳۹) ولیکن چو دارندهٔ لم یزل — قلم رانده بد این چنین در ازل
(۴۰) نباید ز ما با قضا چاره — نسودی کند هیچ بیچاره

(۴۱) اگر گشت ویران مرا شاه گنج — مرا گشت آباد گنجم ز رنج
(۴۲) که نزدِ خداوندِ جان آفرین — بسی می‌برم زین جهان آفرین

(۴۳) شفیعم محمد رفیقم علی ست — امام علی و ولیم نبی ست
(۴۴) اگر دوست داری تو آلِ رسول — سخن افتدت در محلِ قبول

(۴۵) ترا بس بود گفتنم یادگیر — بدار البقا جایم آباد گیر
(۴۶) مرا از دولت مهر آل نبی — بکن خویشتن را ازان اجنبی

(۴۷) خدایا تو این بنده را دستگیر — ببخشائی تقصیر این مرد پیر
(۴۸) نخواهم ز دنیای مردم گزائی — تن آباد دارم به دیگر سرای

(۴۹) روان را مرا در مقامِ صفا — فرود آر در حضرتِ مصطفا
(۵۰) تن آسانم از عقدها بگذرال — بپایان ز جسم بدادرسال

(۵۱) من و مہر کہ از دوستداریست | بمہر محمد دلش روشن ست | (۵۲) الٰہی باعزاز آلِ عبا | کہ مارا مجد دبہ بخشد خطا
(۵۳) ز فردوس اعلیٰ بزیرِ لوا | بہ بخشائے آں جائے مارا بقا | (۵۴) ہزاراں ہزاراں ہزار آفریں | زما بر محمد و آل جمعین

ہجو با

قبل ازیں گزارش ہو چکا ہے کہ ہجو باسب سے آخری مگر سب سے زیادہ نشو و نما یافتہ مرحلہ ہے سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم نہایت مسلسل اور مکمل ہے برخلاف ہجو الف کے جس میں ترتیب اور ربط کی ضرورت قدم قدم پر محسوس ہوتی ہے۔ واقعات کے لحاظ سے اس کے بیانات نہایت عجیب و غریب طریقہ سے دیباچہ بایسنغرخانی کے مقالات کی تائید اور تقویت کرتے ہیں اور یہی تائید ہے جو سب سے پہلے ہمیں شبہ میں ڈالتی ہے کہ کہیں دیباچہ کے بیانات پڑھ کر کسی نے اس کو نظم کر دیا ہو۔ تمہید کے ابتدائی اشعار ہیں ؎

(۱) الا اے خردمند صاحب خبر | بگفتار و کردارِ من درنگر | میانجی میانِ من و شاہ باش | بحقِ خدا کز حق آگاہ باش
مرا نظم شہنامہ فرمود شاہ | درآں دم کہ بنشست شاداں بگاہ | کہ بخشد زہر بیت زر یک درم | ہر آنچ آورم نظم از بیش و کم
بسی سال و پنج از سرائے سپنج | چنیں رنج بردم بامیدِ گنج | بشش بود ایں نامہ و شش ہزار | بگفتم نہ کرد ایچ در من نظار

مقصد یہ ہے کہ جب بادشاہ تخت نشین ہوا تھا تب اُس نے مجکو شاہ نامہ کی نظم پر مامور کیا کہ جو کچھ میں نظم کروں فی شعر ایک دینار کے حساب سے مجکو اُجرت ملے اس لیئے انعام کی اُمید میں پینتیس سال میں نے کام کیا چھیاسٹھ ہزار اشعار لکھے لیکن اُس نے میری طرف توجہ ہی نہیں کی یہاں دعوی کیا گیا ہے کہ شاہ نامہ سلطان کے تخت نشینی کے وقت شروع ہوا جو واقعہ ۳۸۶ھ یا ۳۸۷ھ میں ظہور پذیر ہوا اس پر اگر پینتیس سال اضافہ کیئے جائیں تو گویا ۴۲۲ھ یا ۴۲۳ھ میں شاہ نامہ ختم ہوا لیکن اس تاریخ سے ایک یا دو سال قبل سلطان محمود غزنوی یعنی ۲۳ ربیع الاول ۴۲۱ھ ہجری کو وفات پا چکا ہے۔ اب فردوسی مردہ سلطان کی ہجو لکھنے سے رہا شاہ نامہ بقول فردوسی ۴۰۰ھ میں ختم ہوا۔ اب ظاہر ہے کہ ہجو کا بیان فردوسی کے قلم سے نہیں نکلا۔ علاوہ بریں شہادتِ کلام سے بھی ہم کچھ اسی قسم کا نتیجہ نکالتے ہیں وہ فردوسی کی زبان ہے اور نہ اس کا انداز "صاحب خبر" اور "حق خدا" کی ایسی ترکیبیں ہیں جو فردوسی کے ہاں رائج نہیں آخری دو شعر قریب قریب شاہ نامہ سے لیئے گئے ہیں۔

نہ کرد اندریں داستانم نگاہ — بگفتارِ بدگوئے گم کردہ راہ

حسد برد بدگوئے در کارِ من — تبہ کرد بر شاہ بازارِ من

سخنہائے شائستہ آبدار — بگفتارِ بدگوئے بگزشت خوار

آخری مصرع کے علاوہ باقی ڈھائی شعر شاہ نامہ سے ماخوذ ہیں ؎

چو بر باد دادند رنجِ مرا — نبُد حاصلے سی و پنج مرا

شاہ نامہ سے نقل کیا گیا ہے ؎

چنیں شہریاری و بخشندۂ — بگیتی ز شاہاں درخشندۂ — بدیں گونہ بگزشت از قولِ خود — برآورد بر قولِ خود بولِ خود

نہ ممسک بدیں پادشاہ و نہ زفت — کہ از وے کم ایں سخنہا شگفت — چو قولِ شہ از جود بنوشت نخ — حدیثِ فقع برنوشتم بہ یخ

پہلا شعر شاہ نامہ سے منقول ہے دوسرے شعر میں قول اور بول ایسے الفاظ ہیں جن کو فردوسی استعمال نہیں کرتا "از قولِ خود بگزشت" لالہ بھائیوں کا محاورہ معلوم ہوتا ہے۔ بر قولِ خود بول برآوردن ایک عجیب محاورہ ہے کہ یہاں کے سوا کسی فارسی کتاب میں اس کا پتہ نہیں چلیگا۔ بہرحال فردوسی کے لیئے ایسی گندی زبان استعمال کرنا ناممکن تھا۔
تیسرے اور چوتھے شعر میں ممسک قول جود حدیث اس قدر عربی الفاظ ہیں کہ فردوسی کا کلام نہیں کہا جاسکتا۔

چو گفتارِ شہ می کند زر بسیم — نباشد ہمیں نامِ او جز لئیم

زر بسیم می کند اس کا کیا مطلب ہوا کیا یہ فارسی ہے اور کیا یہ فردوسی کی زبان ہے۔ اس شعر میں چونکہ سلطان کو دینار کا وعدہ کرکے درم دینے پر مستعد دکھایا جاتا ہے جو بالکل امر خلاف واقع ہے اس لیئے ثابت ہے کہ وہ ملحقات سے ہے۔

نژادش ہم از بیخ شاہی نرست — بگفتار زیں ساں بود نادرست

یہ شعر بالکل کمزور ہے پہلے مصرعہ میں جس قسم کا تکلّف ہے فردوسی اس کا عادی نہیں اس کی سادگی کی مثال اس مصرع میں دیکھی جاسکتی ہے ع نژادِ من از پشتِ گشتاسپ ست

اس شعر کے بیانات بھی خلاف واقع ہیں محمود اس میں شک نہیں کہ امیر ناصر الدین سبکتگیں کا فرزند تھا امیر مذکور خواہ کچھ ہی کیوں نہو محمود کے لیئے علاوہ ذاتی نجابت کے یہ شرافت کافی ہے کہ وہ ایک بادشاہ کا بیٹا ہے اور کون ایسا بادشاہ ہوا ہے جو ہمیشہ سے پوتڑوں کا رئیس چلا آیا ہے ؎

نمیرم ازیں پس کہ من زندہ ام — کہ تخم سخن را پراگندہ ام — نہ زدست دہر گزنمیرد سخن — سخنداں زمن ایں سخن فہم کن

پہلا ڈیڑھ شعر شاہنامہ سے ہے۔ آخری مصرع کی تصنیف ملحقات سے جاننا چاہیئے ؎

چنیں گفتہ بداو کہ بودہ ست گیو — ہماں رستم وطوس و گودرز و گیو — مرا در جہاں شہریارے تو است — بسے بندگانم چو کیخسرو است

نہ خسرو نژادے نہ والا سرے — پدرش از صفاہاں بد آہنگرے — اگرچند بودند آہنگراں — بہ از شاہ شاں بد نژاد گراں

گر او را نبودے نژاد اندرش — تہمتن ندادے بدو دخترش

یہ اشعار غالباً تلمیح کرتے ہیں محمود کے کسی اعتراض پر جو اس نے ہم سمجھتے ہیں گیو کی آہنگر نژادی پر کیا ہوگا اور صاحب ہجو گیو کا سلطان سے مقابلہ کرکے دعوی کرتا ہے کہ گیو اگرچہ لہار تھا تاہم بادشاہ سے اچھی نسل کا تھا۔ اگر اس کی ہڈی میں کوئی داغ ہوتا تو رستم اپنی بیٹی اس کو کیوں دیتا۔ اس واقعہ کا چرچہ کسی تاریخ میں نہیں ملتا نہیں معلوم یہ گم نام مصنف کس ذریعہ سے اس کا ذکر کرتا ہے البتہ نخسرو نژادے نہ والا سرے الخ شاہ نامہ میں ملتا ہے

مرایں نامۂ شہریاراں بخواں — سرا سر چرخ گردوں ہمی بگزراں

اس شعر کا پہلا مصرع شاہنامہ سے لیا گیا ہے۔ مصرع دوم برائے بیت ہے۔ شاہ نامہ میں یہ شعر یوں واقع ہوتا ہے ؎

مرایں نامۂ شہریاراں بخواں — نگر تا کہ باشد چو نوشیرواں — کہ آں شہریاراں چو تو شہریار — بسے بود شاں بگیاں بیش کار

نہ گشتند ہرگز ز گفتار خویش — بہشتند مردم ز آزار خویش

ان اشعار کو ملحقات سے تصور کرنا چاہیئے ان کی بندش کی کمزوری بغیر نشان دہی معلوم کی جا سکتی ہے۔

چو ایں نامور نامہ آمد بہ بن — پشیماں شد از گفتہائے کہن — یہ شعر شاہنامہ کے دو مختلف شعروں سے ماخوذ ہے۔

(۱) چو ایں نامور نامہ آمد بہ بن — ز من روئے کشور شود پر سخن — (۲) چو بشنید شاہ از پشوتن سخن — پشیماں شد از کردہائے کہن

کرم بیں تو نزدیک شاہِ فقیر — بگوے و ز گفتارِ حق وا مگیر

یہ شعر تو ہمیں لالہ بھائیوں کی فارسی کی یاد دلاتا ہے۔ معاذ اللہ اگر یہ زبان فردوسی کی مانی جائے۔ کرم فقیر اور حق ایک شعر میں تین عربی الفاظ موجود ہیں ؎

نہ نیکو بود حق نگہداشتن — نجاشاک ایماں بر انباشتن — ازاں گفتم ایں را کہ تا انجمن — نگویند از یں گفتہا عیب من

اس حق نگہداشتن کے کیا معنی، مطلب تو میں سمجھ گیا کہ سچی بات چھپانا اچھا نہیں ہوتا میرے خیال میں نہان داشتن

موزوں معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال یہ ہندوستانی فارسی ہے اس سے زیادہ تنقید کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی ؎
خرد نیست مرشاہِ محمود را   کہ بینیم دشن مانع جود را ۔ آخری مصرعہ میں "را" کا استعمال ملاحظہ ہو اس فارسی نے تو لالہ بھائیوں کو بھی شرما دیا ہوگا۔

حدیث پیمبر نگشت ست رد   شود ہر شیئے راجع اصلِ خود

یہ حدیثِ نبوی کا ترجمہ ہے کہ کُلُّ شَیْئٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِہٖ ۔ اس کی بندش کی کمزوری بغیر بتائے معلوم ہوتی ہے اور ہم اس کو ملحقات سے مانتے ہیں۔

نہ محمود غزنی کہ محبوب حق   زشاہنشہاں برد بیشک سبق
شہنشاہ محمود کاندر جہاں   وراشیر یزداں بود پہلواں

یہ اشعار اس شیعی نقطۂ خیال کے غیر ترقبہ تائید کر رہے ہیں جس کے بظاہر قاضی نور اللہ شوستری بانی ہیں۔ یہ خیال اگرچہ شیعہ حلقوں میں قاضی مرحوم کے زمانہ سے پیشتر کا ہے کہ فردوسی نے شاہنامہ رسول اللہؐ اور حضرت علیؑ کے نام پر لکھا ہے جیسا کہ یہ شعر مظہر ہے۔

بنامِ نبی و علی گفتہ ام   گہر ہائے معنی بسے سفتہ ام

اس عقیدہ کی تردید کی چنداں ضرورت معلوم نہیں ہوتی اس لئے کہ شاہنامہ خود اس کی تردید کر رہا ہے "محبوبِ حق" اور "شہنشاہِ محمود" سے مراد رسول اللہؐ ہیں "شیر یزداں" "اسداللہ الغالب" کا ترجمہ کیا گیا ہے اور حضرت علی مراد ہیں۔ اشعار کا مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب محمود غزنوی کے نام پر نہیں لکھی گئی ہے بلکہ رسول اللہؐ کے نام پر جن کے پہلوان حضرت علی ہیں۔

نکردی تو در نامۂ من نگاہ   کہ رونسے نبودت نکوئی زشاہ
بگفتا حسن کرز بیادہ گوئے   نشاید شنیدن سخن زشت روئے
صد افسوس دارم زعمرِ عزیز   کہ ممدوح گشتم براں بی تمیز

ان اشعار میں لغویات اور زبان کی کمزوری بغیر ہماری نشاں دہی کئے معلوم کی جاسکتی ہے پہلا مصرع شاہنامہ سے لیا گیا ہے جو یوں ہے۔ نکرد اندریں داستانہا نگاہ ۔ دوسرے مصرع میں شاہ کا لفظ برائے بیت نہیں بلکہ برائے قافیہ لایا گیا ہے۔

ان اشعار کی زبان اس قدر بھدی اور بے ربط ہے کہ معمولی فارسی خواں کو بھی اس سے شرم آئیگی ممدوح

کے معنی میں اس ماہرِ فن نے توسیع دیدی ہے جس کی سند پر ہم اس کو معنی مادح استعمال کر سکتے ہیں دروغ گو را حافظہ نہ باشد۔ نہایت سچی مثل ہے اور اس کا مصداق یہ بیان ہے جو حسن میمندی کے نام پر کیا گیا ہے یہاں یہ ہجو نگار اسی عام غلطی کا شکار رہے جس میں صاحبِ دیباچۂ بایسنغرخانی قاضی نور اللہ شوستری اور علامہ شبلی پڑے ہوئے ہیں وہ یقین کرتے ہیں کہ حسن میمندی سلطان کا وزیر تھا۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے حسن میمندی سبکتگیں کے زمانہ میں مارا جا چکا ہے اور اس کا فرزند خواجہ احمد میمندی سلطان کا وزیر تھا۔ اب یہ خیال کرنا کہ فردوسی کو بھی وہی عام مغالطہ ہو گیا جو اور تذکرہ نگاروں کو ہو گیا ہے ناممکن ہے۔

بگفتار بدگوئے این نام بد	پذیرفتی و بد نہادی بخود	مرا نام بادا ترا گنج و مال	کہ این جاودانست آن پائمال

بدبر خود نہادن کونسا محاورہ ہے۔ ان دونوں اشعار کو ملحقات میں ماننا ہو گا۔

ولیکن چو دارندۂ لم یزل	قلم راندہ بداین چنین از ازل	نیاید زما با قضا چارۂ	نہ سودے کند ہیچ بیچارۂ
اگر گشت ویران بدین شاہ گنج	مرا گشت آباد گنجم ز رنج	کہ نزدِ خداوندِ جان آفرین	بسے می برم زین جہان آفرین
شفیعم محمد رفیقم علیست	امام ولی و ولیم نبیست	اگر دوستداری تو آلِ رسول	سخن افتدت در محلِ قبول
ترا بس بود گفتنم یادگیر	بدار البقا جایم آباد گیر	مرا از دولت مہرِ آلِ نبیؐ	مکن خویشتن را از ان اجنبی
خدایا تو این بندہ را دستگیر	بہ بخشائے تقصیر این مرد پیر	نخواہم ز دنیائے مردم گزائے	تن آباد دارم بدیگر سرائے
روانِ مرا در مقامِ صفا	فرود آر در حضرتِ مصطفا	منم ہر کہ از دوستدار من ست	بمہرِ محمد دلش روشن ست
الٰہی باعزازِ آلِ عبا	کہ مارا مجد بہ بخشا عطا	ز فردوسِ اعلیٰ بزیرِ لوا	بہ بخشائے آن جائے ما را لقا
	ہزاران ہزاران ہزار آفرین	زما بر محمد و آل اجمعین	

اِن اشعار کے متعلق صرف اسی قدر کہنا کافی ہو گا کہ نہ وہ فردوسی کی زبان ہے اور نہ فردوسی کے خیالات ہیں۔ اور نہ اس کا عقیدہ ظاہر کرتے ہیں۔ میں ان کو بلا کسی پس و پیش کے ملحقات میں شمار کرتا ہوں۔

ہجو الف کے جو اشعار ہجو با میں نہیں ملتے اس کی وجہ یہی ہے کہ ہجو با کے مصنف نے اس سے جہاں تک ہو سکا ان تمام اشعار کو سلسلہ وار رقم کیا لیکن جن اشعار سے سلسلہ قایم نہیں رہتا تھا یا جو دیباچہ میں ملتے تھے۔ مثلاً حضرت علی کی شان میں اشعار وغیرہ کو اس نے ترک کر دیا۔

ہجو الف

ایا شاہ محمود کشور کشا　　زکس گر نہ ترسی بترس از خدا

کہ پیش از تو شاہاں فراواں بدند　　ہمہ تاجداران گیہاں بدند

یہ یاد رہے کہ ان دونوں شعروں میں کافی ربط نہیں پایا جاتا اصل میں ہمارے خیال میں صاحب ہجو نے پہلے شعر کے بعد یہ شعر لکھا تھا۔

کہ بد دین و بدکیش خوانی مرا　　منم شیر نر میش خوانی مرا

اب دونوں شعر باہم خوب چسپاں ہوتے ہیں۔

فزوں از تو بودند یکسر بجاہ　　بگنج و سپاہ و بہ تخت و کلاہ

مصرع آخر شاہنامہ سے لیا گیا ہے۔ چنانچہ۔

ز فرہاد گیوت بر آرم بجاہ　　بگنج و سپاہ و بہ تخت و کلاہ

نکردند جز خوبی و راستی　　نگشتند گرد کم و کاستی

میرے خیال میں پچھلے مصرع میں "کمی" بجائے "کم" آنا چاہیے تھا۔ چنانچہ فردوسی

ہنرمردمی باشد و راستی　　ز کژی بود کمی و کاستی

یہ شعر اگرچہ بہت کچھ شاہنامہ کے رنگ میں ہے لیکن ایک فرق ہے کہ کم و کاستی کے بجائے فردوسی اکثر کژی و کاستی" لکھتا ہے اور اسکے قریب قریب اشعار شاہنامہ میں حسب ذیل ہیں۔

بجوید بجز خوبی و راستی　　نیارد بداد اندرون کاستی　　بند در دلش کژی و کاستی　　نجستے بجز خوبی و راستی

نجستم ہمیشہ جز از راستی　　زمن دور بد کژی و کاستی　　نجستی جز از کژی و کاستی　　نکردی بہ بخش اندرون راستی

نہ جوید جز از داد در راستی　　نیارد بداد اندرون کاستی

اس سے اس قدر اور بھی معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی ایک مقولہ خیال کن الفاظ میں ادا کریگا جب اس نے خوبی اور راستی کے خیال کو جز حرف استثنا کے ساتھ ادا کیا ہے تو پانچ مقام پر اس کے واسطے فعل جستن لایا ہے نہ "کردن"

جس کا استعمال ہجو کے مصرع میں ہوا ہے اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اگر فردوسی اس شعر کا مالک ہوتا تو قطعی اسے یوں لکھتا۔ "بخشنند جز خوبی و راستی" "کردن" اور جستن کے فرق سے جو تغیر اس مصرع میں واقع ہو گیا ہے ایک سخن فہم سمجھ سکتا ہے اور ان ہی باتوں سے ہم ایک استاد اور اس کے مقلد کے کلام میں فرق دریافت کر سکتے ہیں۔

نہ جستند از دہر جز نامِ نیک　　　وزاں نام جستن سرانجام نیک

اس شعر کے قریب قریب شاہنامہ میں اشعار ملتے ہیں لیکن مجکو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ شعر نہیں ملتا۔

ہمہ داد کردند بر زیر دست　　　نبودند جز پاک یزداں پرست

پرست کسی اسم کے ساتھ مل کر اسم فاعل کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً یزداں پرست بت پرست آتش پرست وغیرہ پاک کا اسم موصوف کیا ہے آیا یزداں یا یزداں پرست۔ اب جز کے استعمال پر غور ہوا اگر اس کے بجائے "مگر" استعمال کیا جاتا تو مصرع کے معنی بالکل صاف ہو جاتے یعنی نبودند مگر خالص یزداں پرست۔ جز اور مگر میں جو فرق ہے وہ اظہر من الشمس ہے شاہنامہ میں یہ ہی مطلب ان الفاظ میں ادا ہوا ہے۔

کہ بے دشمن آرم جہاں ابدست　　　نباشم مگر پاک یزداں پرست

دوسرے مقام پر کہا گیا ہے۔

گنہگار باشد تنِ زیردست　　　مگر مردمِ پاک یزداں پرست

ہر آں شہ کہ در بندِ دینار بود　　　بہ نزدیک اہلِ خرد خوار بود

در بند چیزے بودن اس قسم کا محاورہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے فردوسی نے شاہنامہ میں نہیں لکھا ہے نیز اہلِ خرد کی ترکیب ہماری طبیعت پر کھٹکتی ہے کیونکہ فردوسی ایسی ترکیبیں مشکل سے لاتا ہے۔

نباشد جز از بے پدر دشمنش　　　کہ یزداں بآتش بسوزد تنش

یہ شعر دیباچہ شاہنامہ میں ملتا ہے۔

چہ گفت آں خداوند تنزیل وحی　　　خداوند امر و خداوند نہی
کہ من شہرِ علمم علیم درست　　　درست ایں سخن قولِ پیغمبر است
گواہی دہم کیں سخن رازِ اوست　　　تو گوئی دو گوشم بر آوازِ اوست
چو باشد ترا عقل و تدبیر و رائے　　　بنزد نبی و علی گیر جائے
گرت زیں بد آید گناہ من است　　　چنین است و ایں رسم و راہِ من است

یہ پانچوں شعر دیباچۂ شاہنامہ میں موجود ہیں اور اسی وجہ سے غالباً صاحب ہجو "با" نے انھیں اپنے یہاں سے ترک کر دیا۔

ابا دیگراں مر مرا کار نیست — بدیں در مرا جائے گفتار نیست

یہ شعر مقدمۂ یوسف زلیخائے فردوسی میں اور بعض شاہ ناموں میں بھی پایا گیا ہے۔

چو بر تخت شاہی نشاند خدائے — نبی و علی را بدیگر سرائے

اس شعر کی طرز پرانی نہیں معلوم ہوتی اور نہ شاہنامہ میں ملتا ہے۔

من ایں نامۂ شہریاران پیش — بگفتم بدیں نغز گفتار خویش

یہ شعر خاتمۂ جلد دوم شاہنامہ میں یوں ہے۔

کہ ایں نامۂ شہریاران پیش — بہ پیوندم از خوب گفتار خویش

اگر شاہ را شاہ بودے پدر — بسر بر نہادے مرا تاج زر

یہ وہی مشہور شعر ہے جو کہا جاتا ہے کہ طوس میں فردوسی کی واپسی کے وقت ایک لڑکے نے پڑھا تھا۔ نظامی عروضی اس شعر سے واقف نہیں ہے۔ شعر کا بیان حقیقت کے خلاف ہے۔ محمود کا باپ سبکتگیں اس میں کوئی شک نہیں الپتگیں کا غلام تھا مگر محمود کی ولادت کے وقت وہ زبردست امیر تھا اور ہجو میں کم از کم کچھ تو واقعیت ہونی چاہیے بہرحال اس شعر کی سراغ رسی مجھ سے نہیں ہو سکی۔

ازاں گفتم ایں بیتہائے بلند — کہ تا شاہ گیرد ازیں کار پند
کزیں پس بداند چہ باشد سخن — باندیشد از پند پیر کہن
دگر شاعراں را نیازارد او — ہماں حرمت خود نگہدارد او
کہ شاعر چو رنجد بگوید ہجا — بماند ہجا تا قیامت بجا
بنالم بدرگاہ یزدان پاک — فشانندہ بر سر پراگندہ خاک
کہ یارب روانش بآتش بسوز — دل بندۂ مستحق بر فروز

ان اشعار میں حسب ذیل عربی الفاظ ہیں۔ بیت، شاعر، حرمت، ہجا، قیامت، مستحق اس کثرت سے عربی الفاظ کا استعمال فردوسی کی عادت متمادہ کے خلاف ہے۔ اشعار میں وہ قدامت جو فردوسی کے پائی جاتی ہے بالکل نظر نہیں آتی۔ شاعر نے اپنے خیالات ایسی زبان میں ادا کئے ہیں جو آٹھویں اور نویں صدی کی زبان کہلائی جا سکتی ہے اور فی زماننا بھی ان خیالات کو قریب قریب ان ہی الفاظ میں ادا کیا جائیگا۔

بنالم بدرگاہِ یزدانِ پاک   فشانندہ بر سر پراگندہ خاک

یہ شعر صاف نہیں ہے۔ فشانندہ اور پراگندہ نے ایک قسم کی نادرستی پیدا کردی ہے۔ خوش قسمتی سے شاہنامہ میں اصلی شعر مل گیا۔ چنانچہ ؎

بنالم ز تو پیشِ یزدانِ پاک   خروشاں بسر بر پراگندہ خاک ص ۳۶۶

کہ شعلہ خداوندِ ہستی مباد   جواں مرد را تنگ دستی مباد

قاضی نور اللہ شوستری کے ہاں نیز بمبئی اور نول کشوری نسخوں میں یہ شعر ملتا ہے۔ لیکن یقین ہے کہ سعدیؒ کی بوستاں سے سرقہ کیا گیا ہے جہاں حکایت "کریم تنگ دست با سائل" میں ملتا ہے۔

چو پروردگارش چنیں آفرید   نیابی تو بربندِ یزداں کلید

جلد چہارم شاہنامہ میں یہ شعر یوں آتا ہے۔

چو پروردگارش چنیں آفرید   تو بربندِ یزداں نیابی کلید
بزرگی سراسر بگفتار نیست   دو صد گفتہ چوں نیم کردار نیست

گرشاسپ نامہ نیز آن شاہ ناموں میں جن میں داستانِ گرشاسپ ضم کردی گئی ہے یہ شعر "داستان آمدن رسولِ گرشاسپ نزد فغفور" میں ملتا ہے ؎

ہنرہا سراسر بگفتار نیست   دو صد گفتہ چوں نیم کردار نیست

ہنر اور بزرگی کے الفاظ کی تبدیلی سے جو خوبی اس شعر میں پیدا ہوتی ہے محتاجِ بیان نہیں۔

بقیۂ ہجو

یہاں ہم اُن اشعار کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو تمام اسناد کے نزدیک ہجو میں داخل ہیں اور جن پر مجموعی حیثیت سے تمام روایات متفق ہیں ؎

گرایدون کہ شاہی بگیتی ترا ست   نگوئی کہ ایں خیرہ گفتن چرا ست
ندیدی تو ایں خاطرِ تیزِ من   نیندیشی از تیغِ خوں ریزِ من
کہ بد دین و بد کیش خوانی مرا   منم شیرِ نرمیش خوانی مرا

اِن اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ فردوسی پر بد دینی کا اتہام رکھا گیا تھا اور یہ پہلا کھلا بیان ہے جو ہم اس سے سُنتے ہیں لیکن وہ ابیات جو اُس نے امیر نصر کے ہاں پیش کیئے تھے ہمارے زیرِ نظر ہیں اور ہمیں تعجب معلوم ہوتا ہے کہ وہاں فردوسی نے یہ الزام کیوں نہ ظاہر کیا اور ہجو میں کیوں کیا اس کا جواب ہمارے پاس یہی ہے کہ فردوسی کو اس کے متعلق اگر معلومات ہوتیں تو امیر نصر کے سامنے اپنی بریت کی غرض سے ضرور بیان کرتا اس لیئے وہ تو اجنبی رہا لیکن ہجو کے معمار اس معاملہ میں زیادہ خوش قسمت تھے انھیں نظامی عروضی یا اور کسی تذکرہ نگار سے یہ وجہ کشیدگی معلوم ہو گئی تھی اس لیئے انھوں نے شعرِ آخر میں اسے بد دینی اور بدکیشی کے نام سے یاد کیا۔

مرا غمزہ کردند کاں پُر سخن　　　بمہرِ نبی و علی شد کہن

یاد رہے نظامی عروضی کے ہاں من جملہ ہجو کے چھ شعروں کے یہ پہلا شعر ہے۔ اب ناظرین کو غور کرنا چاہیئے کہ یہ شعر یہاں کس قدر غیر موزوں واقع ہوا ہے وہ خود زبانِ حال سے کہہ رہا ہے کہ مجکو بلا قصور ہجو کے بانیوں نے قید کر دیا ہے۔ تمہید سے اب تک جس قدر اشعار گزرے سب خطابیہ ہیں لیکن یہ شعر جمع غائب کے صیغہ میں ہے اور گزشتہ ربط کو بالکل توڑتا ہے۔ علیٰ ہذا آیندہ شعر سے بھی اس کا سلسلہ منقطع ہوتا ہے۔ یہ شعر اس بُری اینٹ کے مشابہ ہے کہ جہاں کہیں دیوار میں اس کے لیئے جگہ کی جاتی ہے ناموزوں معلوم ہوتی ہے ہجو میں یہی کیفیت اس شعر کی ہے جہاں کہیں اسے ڈالا جاتا ہے کسی جگہ میں نہیں کھاتا۔ اس کو مصنفین ہجو قطعی ترک کر دیتے لیکن ایسا کرنے میں ان کا راز طشت از بام ہوتا تھا اس لیئے کہ پُرانی روایات میں اصلاح دینا اُن کے لیئے ناممکن تھا اور ہجو میں اس کا لایا جانا ایک تاریخی مجبوری ہے ؎

ہر آں کس کہ در دیش کینِ علی ست　　　از و خوار تر در جہاں گو کہ کیست

ظاہر ہے کہ یہ شعر گزشتہ شعر سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ پہلے بیت میں رسول اللہؐ اور حضرت علیؓ کی محبت کا فردوسی پر الزام لگایا جاتا ہے پچھلا جو غالباً شیعی رنگ آمیزی کا نتیجہ ہے صرف حضرت علی کے نام پر قناعت کرتا ہے

منم بندۂ ہر دو تا رستخیز　　　اگر شہ کند پیکرم ریز ریز

من از مہرِ ایں ہر دو شہ نگذرم　　　اگر تیغِ شہ بگذرد بر سرم

یہ دونوں شعر متحد المعنی ہیں اور ایک دوسرے سے ماخوذ ہوئے ہیں اور یقیناً "مرا غمزہ کردند" والے شعر کی

خاطر ایجاد ہوئے ہیں۔

منم بندۂ اہلِ بیت نبیؐ ستانیدۂ خاکِ پائے وصی

شاہ نامہ میں یہ شعر یوں آتا ہے

منم بندۂ اہلِ بیت نبیؐ سرافگندہ بر خاکِ پائے وصی (داستانِ سیاوش)

مرا سہم دادی کہ در پائے پیل تنت را بسایم چو دریائے نیل

(اگر در کفِ پائے پیلم کنی تنِ ناتواں ہمچو نیلم کنی)

شعر ثانی اکثر قلمی نسخوں میں ملتا ہے اور تقریر سخن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہونا چاہیئے لیکن کلکتہ والے شاہنامہ میں معلوم نہیں میکن نے کیوں خارج کردیا۔ پہلے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصل میں "منم شیر نرمیش خوانی مرا" کے بعد لایا گیا ہوگا یہ بھی یاد رہے کہ پھر وہی خطابیہ سلسلہ جاری ہوگیا ہے۔ دیباچہ بایسنغری میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ سلطان نے فردوسی کو ہاتھیوں کے پاؤں میں کچلوانے کی دھمکی دی تھی۔ ہمیں تعجب معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمود جس کے دربار میں تمام مذہب و ملت کے لوگ تھے فردوسی کو محض حبِ رسول و آلِ رسول کی پاداش میں ایسی سزائے مہیب کی دھمکی دیتا۔ سلطان ہم نے مانا انتہائی متعصب سنّی تھا لیکن کیا وہ حبِ رسول یا دوست داریِ آلِ رسول سے انکار کر سکتا تھا۔ مخترعین ہجو یہاں اس قسم کی کوشش کر رہے ہیں کہ سلطان کے فرضی وزیر حسن میمندی کے ساتھ ساتھ سلطان کو بھی خارجی ثابت کریں۔ یہ خیال کرنا کہ یہ اشعار فردوسی کے قلم سے نکلے ہیں خیالِ باطل ہے فردوسی کی زبان میں یہ توڑ جوڑ اور لوچ کہاں سے آیا۔ اسی ہاتھی کے پاؤں میں روندہنے کے خیال کو وہ اس سادگی سے ادا کرتا ہے

وگر ہیچ کژے گمانی برم بزیرِ پئے پیل تاں بسپرم

فردوسی اپنی سادگی اور برجستگی کو جو اس کی خصوصیات شاعری سے ہے کہیں فروگذاشت نہیں کرتا جبتکہ وہ غیر ضروری تکلفات سے محترز ہے

نترسم کہ دارم ز روشن دلی بدل مہر آلِ نبی و علی

اگر شاہ محمود ازیں بگزرد مرا و را بیکجو نہ سنجد خرد

ان کا تعلق بھی اشعارِ بالا سے ہے۔

چو بر تختِ شاہی نشاند خدائے — نبی و علی را بدیگر سرائے

گر از مہرِ شاں من حکایت کنم — چو محمود را صد حمایت کنم

دونوں شعر غیر مربوط ہیں آخری شعر نظامی عروضی کے چھ شعروں میں سے ہے جس کا ربط "مرا غمزہ کردند کاں پُر سخن" الخ سے درست بیٹھتا ہے۔ آخری شعر میں حمایت اور حکایت عربی الفاظ ہیں شاہنامہ میں مشکل سے ان الفاظ کا سراغ چلے گا۔

باین زادہ ام ہم بریں بگزرم — چناں داں کہ خاکِ پئے حیدرم

یہ شعر شاہنامہ کے دیباچہ میں ملتا ہے اگرچہ مطبوعہ نسخوں میں اس کا سُراغ نہیں چلتا۔ (مولانا نظامی کا یہ بیت بھی یاد رہے ؎ بخوئے خوش آمودہ شد گوہرم — بریں زیستم ہم بریں بگزرم)

جہاں تا بود شہریاراں بود — پیاسم بر شہریاراں بود

کہ فردوسیِ طوسیِ پاک جفت — نہ این نامہ بر نام محمود گفت

بنام نبی و علی گفتہ ام — گہرہائے معنی بسے سفتہ ام

پہلے شعر کے قافیہ میں کسی قسم کی غلطی رہ گئی ہے۔ شعر سوم کا آخری مصرعہ بالکل برائے بیت ہے۔ ایسے مصرعوں کے لئے قادر نامہ اور خالق باری کے صفحات زیادہ موزوں تھے نہ ہجو کے اشعار۔ مصرعہ فی نفسہ نہایت بلیغ ہے لیکن اس کی بندش صاف کہہ رہی ہے کہ میں فردوسی کے قلم سے نہیں نکلی۔ اسدی اور نظامی کی زبان پر البتہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔ ان اشعار میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ میں نے یہ کتاب سلطان محمود کے نام پر نہیں لکھی ہے بلکہ نبی اور علی کے نام پر۔ شاہنامہ اس دعوے کا سب سے اچھا قول فیصل ہے فردوسی اگر ایسا کرنا چاہتا تو چند مقام پر سلطان کی مدح کے ابیات جو شاہنامہ میں پائے جاتے ہیں نکال کر ان کی جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ کی شان میں اشعار لکھ دیتا اور یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا بلکہ برخلاف اس کے ہم کو شاہنامہ سے معلوم ہے کہ فردوسی نے خود نعت اور منقبت کے اشعار نہایت کمی کے ساتھ لکھے ہیں اور اس قدر کمی کے ساتھ لکھے ہیں کہ ان کا ہونا اور نہ ہونا برابر ہے۔ اس لئے ذرا مشکل سے ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ ہجو کے میدان میں آ کر اتنا جوشیلا شیعہ بن جائے کہ پورے بیس بیت ہجو کے منقبت اور نعت میں بھر دے۔ یہ بحث کہ آیا فردوسی شیعہ تھا یا سُنّی یا کچھ اور، ہم کسی اور موقع کے لئے اٹھا

رکھتے ہیں یہاں صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ فردوسی اگر شیعہ تھا جو بہت مشتبہ امر ہی تاہم اتنا جوشیلا شیعہ ہرگز ہرگز نہیں تھا جس کا وہ ہجو میں دعویٰ کر رہا ہی ؎

کہ فردوسیِ طوسیِ پاک جفت الخ

پر غور کرو کیا فردوسی اس شعر کا قائل ہی ؟ فردوسی میں اور عیب ممکن ہی کہ ہوں لیکن اس قدر وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہی کہ خود ستائی کا عیب اس میں نہیں تھا۔ شاہنامہ اس قدر ضخیم ہی۔ اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ فردوسی نے اس میں اپنا نام کے مقام پر لیا ہی مشکل سے دو مقام پر۔ وہ بھی دقیقی کے ذکر میں اور وہاں بھی پورا پورا شبہہ ہوتا ہی کہ آیا اصل میں گوینده تھا یا فردوسی کیونکہ سب سے قدیم نسخہ میں جو ۶۵۲ھ کا نوشتہ ہی "گوینده" پایا جاتا ہی۔ اور وہ اشعار یہ ہیں ؎

بفردوسی آواز دادے کہ مَی ‌‌‌‌ ‌‌ مخور جز بآیینِ کاؤس کَی

دیگر

زفردوسی اکنوں سخن یادگیر ‌‌ ‌‌ سخنہائے شایستۂ دل پذیر

آمدم بر سرِ مطلب۔ اس شعر کی تمام طرز یہی کہہ رہی ہی کہ اس کا قائل کوئی غیر فردوسی ہی ؎

چو فردوسی اندر زمانہ نبود ‌‌ ‌‌ بداں بد کہ بخشش یگانہ نبود

یہ شعر بھی علیٰ ہذا کسی غیر فردوسی کے قلم سے نکلا ہی۔ اصل یہ ہی کہ شعر فردوسی کا تھا ہجو تراشوں نے بقدر ضرورت اس میں اصلاح دیدی۔ فردوسی نے اس کو یوں لکھا تھا ؎

سپاہے کہ آں را کرانہ نبود ‌‌ ‌‌ بداں بد کہ بخشش یگانہ نبود ‌‌ ‌‌ (ج اول ص ۳۰ سطر ۱۳)

نکردی دریں نامۂ من نگاه ‌‌ ‌‌ بگفتار بدگوئے گشتی زراه

ہرآنکس کہ شعر مرا کرد پست ‌‌ ‌‌ بگیرد تش گردون گردنده دست

پہلا شعر شاہ نامہ میں یوں آتا ہی ؎

نکرد اندریں داستانہا نگاه ‌‌ ‌‌ ز بدگوے و بخت بد آمد گناه

ہجو کے بانیوں نے بقدر ضرورت اصلاح دے کر اس کو خطابیہ صورت میں بدل دیا۔ شعر دوم کا شاہنامہ میں پتہ نہیں چلا ؎

چو عمرم بہ نزدیکِ ہشتاد شد　　اُمیدم بیکبارہ برباد شد

بسی سال اندر سرائے سپنج　　بسے رنج بُردم بامُیدِ گنج

دونوں شعر خاتمۂ شاہ نامہ میں ملتے ہیں۔ (از شاہ نامہ قلمی ۱۰۵۲ھ)۔

زابیات غرّہ دو رہ سی ہزار　　مر آں جملہ در شیوۂ کارزار

اِس شعر پر غور کرو وہ بالکل متاخرین کی طرز میں ہے فردوسی یہی مطلب یوں ادا کرتا ہے

بود بیت شش بار بیور ہزار

دوسرے مقام پر کہتا ہے　　نشش بیور ابیاتش آمد شمار

دیکھو مطلب وہی ہے مگر اداے مطلب میں کس قدر فرق ہے

زصحرا و دریا و از خشک رود　　زبر گستوان و زخفتان و خود　　زگوپال و از تیغہائے بلند　　زشمشیر تیر و کمان و کمند

کزیشاں بگردون رسیدہ غریو　　زنیرنگِ غول و زجادو و دیو　　زعفریت و از اژدہا و نہنگ　　زگرگ و زشمشیر و پیل و پلنگ

چو تور و چو سلم و چو افراسیاب　　ہمان نامدارانِ با جاہ و آب　　زگردانِ جنگی گہ رزم و لاف　　زمردانِ نامی بروز مصاف

چو شہ آفریدون و چوں کیقباد　　چو ضحاک بدکیش و بے دین و داد

یہ ابیات نیز آنے والے اشعار شاہنامہ کے مضامین کی فہرست دے رہے ہیں وہ بالکل متاخرین کی زبان ہے پلنگ اور نہنگ کا ذکر شاہنامہ میں نہیں آتا۔ اِن کا داخلہ اس فہرست میں ثابت کرتا ہے کہ یہ ابیات فردوسی کے قلم سے نہیں نکلے

چو گرشاسپ و شام و نریمان گرد　　جہاں پہلوانان و با دست برد

شاہ نامہ میں گرشاسپ و نریمان کا قصّہ (اگرچہ شاہنامہ اُن کے ناموں سے واقف ہے) جو رستم کے اجداد میں سے مشہور پہلوان ہیں کہیں نہیں آتا اُن کی شہرت گرشاسپ نامہ کے بیانات پر منحصر ہے چونکہ گرشاسپ نامۂ اسدی بھی غلطی سے شاہنامہ میں ملا دیا گیا تھا اس لئے ہجو کے مُصنّفین نے گرشاسپ نامہ کو شاہ نامہ کا جزو جانکر شعر بالا میں گرشاسپ اور نریمان کا بھی ذکر کر دیا۔ فردوسی اگر یہ ابیات لکھتا تو کبھی اس غلطی کا ارتکاب نہ کرتا اِس کا دوسرا مصرعہ داستان سوسن رامش گر میں ملتا ہے

زجا در رسیدہ بہ ہوماں سپرد — جہاں پہلوانان با دست برد (ملحقات صفحہ ۵۰۹)

چو ہوشنگ و طہمورثِ دیو بند — منوچہر و جمشید شاہِ بلند

چو کاؤس و کیخسرو تاجور — چو رستم چو روئیں تنِ نامور

چو گودرز و ہشتاد پور گزیں — سوارانِ میدان و شیرانِ کیں

شاہنامہ میں یہ شعر یوں آتا ہے۔

چو گودرز و ہفتاد پور گزیں — سوارانِ میدان و شیرانِ کیں

دوسرے مقام پر یوں آتا ہے۔

چو گودرز و ہفتاد پور گزیں — ہمہ نامدارانِ با آفریں

گودرز بن کشواد کے اصل میں اٹھتّر فرزند تھے جنگ پشن ولادون میں ان میں سے ستّر مقتول ہوئے۔

ہماں نامور شاہ لہراسپ را — زریرِ سپہدار و گشتاسپ را

چو جاماسپ کاندر شمارِ سپہر — فروزندہ تر بد ز تابندہ مہر

شعر دوم شاہنامہ میں یوں آتا ہے۔

چو جاماسپ کاندر شمارِ سپہر — فروزندہ تر بد ز ناہید و مہر (صفحہ ۳۴۳۵ جلد چہارم)

چو دارائے داراب و بہمن ہماں — سکندر کہ بد شاہِ شاہنشہاں

اگر یہ شعر فردوسی کے قلم سے نکلتا تو وہ سکندر کے لئے شاہِ شاہنشہاں کا لفظ استعمال نہ کرتا۔ سکندر بالاسلام میں اس میں شک نہیں بہت کچھ ہر دلعزیز ہے لیکن فردوسی اس معاملہ میں ایرانی اور بالخصوص ساسانی خیال کا واقع ہوا ہے محب ایران ہونے کی حیثیت سے سکندر کو جو ایران کی چراغ سلطنت کا گل کرنے والا تھا پسند نہیں کرتا تھا چنانچہ اشعارِ ذیل ہمارے دعوے کے شاہد ہیں۔

(۱) ہیبہ نے زکرماں بیامد دماں — بنزدیک اسکندرِ بدگماں (صفحہ ۷۸)

(۲) بدانگہ کہ اسکندر آمد ز روم — بایران و ویران شد آں مرز و بوم

گراو نا جوانمرد بود و درشت — کہ سی و شش از شہریاراں بکشت

لبِ خسرواں پر زنفرینِ اوست ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ہمہ روئے گیتی پر از کینِ اوست

(۳) کسے نیست زیں نامدار انجمن ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ز فرزانہ و مردمِ رائے زن

کہ نشنید کا سکندر بد نہاں ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ چہ کرد از فرومائگی در جہاں

(۴) نخست آندر آیم زسلم سترگ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ باسکندر آنگینہ و رپیر گرگ ‏ ‏ ‏ ‏ (صفحہ ۵۳۵)

(۵) مراورا سکندر ہمی یارہ کرد ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ز بیدانشی کار یکبارہ کرد

(۶) سکندر کہ او خونِ دارا بریخت ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ چناں آتشِ کیں بما بر بہ بیخت

کہ دارا برا آدر پدر خواندے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ہمے فیلقوشش پسر خواندے

پدر پاک بد بادرش بد گہر ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ چناں واں کز و پاک ناید پسر

چو شاہ اردشیر و چو شاپور او ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ چو بہرام و نوشیروانِ نکو

"او" پہلے مصرع میں حشو ملیح ہے۔ کیا فردوسی اسی شستہ زبان کے لئے مشہور ہے؟

چو پرویز و ہرمز چو پورش قباد ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ چو خسرو کہ پرویز نامش نہاد

اس شعر کے مطالعہ کے وقت خیال کیا گیا کہ اس میں کوئی غلطی ہو گی لیکن مختلف نسخوں میں ہم اس کو اسی صورت میں دیکھتے ہیں فردوسی اگر اس شعر کا مالک ہوتا تو کیوں کر یقین کیا جاتا ہے کہ خسرو پرویز کو جو ایک مشہور بادشاہ ہے دو شخص یا دو پادشاہ بیان کرتا اس شعر کے مصنف کے نزدیک ایک پرویز ہرمز کا بیٹا ہے دوسرا خسرو ہے جس کا نام پرویز ہے۔

چنیں نامداران و گردنکشاں ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کہ دادم یکایک از ایشاں نشاں

ہمہ مردہ از روزگارِ دراز ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ شد از گفتِ من نامِ شاں زندہ باز

چو عیسیٰ من ایں مردگاں را تمام ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ سراسر ہمہ زندہ کردم بنام

ہجو کے مصنفین کو یہاں فردوسی کے ان اشعار سے توارد ہو گیا ہے۔

ہمہ پہلوانان و گردنکشاں ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کہ دادم دریں قصہ زیشاں نشاں

ہمہ مردہ از روزگارِ دراز ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ شد از گفتِ من نامِ شاں زندہ باز

منم عیسی آں مردگاں را کنوں — روانشاں بمینو شدہ رہنموں

ابتدائے ہفتخواں اسفندیار۔

یکے بندگی کردم اے شہریار — کہ ماند زتو در جہاں یادگار
بناہائے آباد گردد خراب — زباران واز تابشِ آفتاب
پے افگندم از نظم کاخ بلند — کہ از باد و باراں نیابد گزند
بریں نامہ بر عمرہا بگذرد — بخواند ہر آنکس کہ دارد خرد

مؤلفین ہجو نے یہ ابیات شاہنامہ سے لئے ہیں۔

یکے بندگی کردم اے شہریار — کہ ماند زتو در جہاں یادگار
بناہائے آباد گردد خراب — زباران واز تابشِ آفتاب
پے افگندم از نظم کاخ بلند — کہ از باد و باراں نیابد گزند
بریں نامہ بر عمرہا بگذرد — ہمی خواند آنکس کہ دارد خرد

نہ زینگونہ دادی مرا تو نوید — نہ ایں بودم از شاہ گیتی امید
بد اندیش کش روز نیکی مباد — سخنہائے نیکم بہ بد کرد یاد
بر بادشہ پیکرم زشت کرد — فروزندہ اخگر چو انگشت کرد

ان اشعار کا اگرچہ شاہنامہ میں کہیں پتہ نہیں چلتا مگر زبان پر لحاظ کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ فردوسی مصنف نہیں۔ "بد اندیش کش روز نیکی مباد" کے قریب قریب سعدی کہتے ہیں۔

کہ بد مرد را روئے نیکی مباد

اگر منصفی بود از راستاں — بہ اندیشہ کردی دریں داستاں
بگفتی کہ من در[illegible]ادِ سخن — بدادستم از طبع دادِ سخن
جہاں از سخن کردہ ام چوں بہشت — ازیں پیش تخم سخن کس نکشت
سخن گستراں بیکراں بودہ اند — سخنہا بے اندازہ پیمودہ اند
ولیک ار چہ بودند ایشاں بسے — ہما نا نگفت ست زینساں کسے

"سخن پیمودن" فردوسی نے کم سے کم شاہنامہ میں نہیں لکھا ہے نہ وہ "ولیک" لکھتا۔ اشعار بالا میں الفاظ سخن و سخن گستر شعر اور شاعر کے معنوں میں مستعمل ہوئے ہیں ذیل میں ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ فردوسی سخن کو شعر کے معنی میں نہیں لکھتا سخن فردوسی کے ہاں کلام گفتگو بات چیت افسانہ تاریخ اور واقعہ کے معنوں میں ملتا ہے مثال سخنگوئے دہقاں چہ گوید نخست — کہ نام بزرگی بگیتی کہ جست (دیگر) سخنگوئے دہقاں چو بنہاد خواں — یکے داستاں اند از ہفتخواں
سخنہائے ہرمز چوں شد بہ بن (دیگر) یکے تو پے افگند مو بد سخن — یکے پیر بد پہلوانی سخن (دیگر) بگفتار و کردار گشتہ کہن

پژوہندۂ روزگار نخست بگفتند پیشش یکایک جہاں (دیگر) گزشتہ سخنہا ہمہ باز جست سخنہائے شاہان وگشت جہاں
جہاں دیدۂ نام او بود ماخ (دیگر) سخندان با برگ و با برز و شاخ کنون داستانہائے دیرینہ گوے (دیگر) سخنہائے بہرام چوبینہ گوے
الا اے سخنگوئے مرد کہن (دیگر) بگردا زرہ آز و بگسل سخن نمر دست وہرگز نمیرد سخن (دیگر) بود تازہ ہرچند گردد کہن

ان اشعار میں سخنگوئے سخندان اور سخن کو ممکن ہی کہ شاعر و شعر کے مفہوم میں لیا جائے اور بعض موقعوں کے وہ معنی درست بھی بیٹھ جائیں لیکن شاعر حقیقت میں انھیں راوی داستان گوئے مؤرخ واقعہ تذکرے اور کلام کے معنوں میں استعمال کر رہا ہی۔ اگر ہمارے یہ مشاہدات درست ملنے جائیں تو ظاہر ہی کہ ہجو کے یہ اشعار فردوسی کے قلم سے نہیں نکل سکتے ؎

بسے رنج بردم دریں سال سی عجم زندہ کردم بدیں پارسی

یہ شعر اگرچہ مطبوعہ شاہناموں میں ہجو کے سوائے کہیں نہیں ملتا لیکن قلمی شاہنامہ نوشتہ ۸۵۲ھ کے خاتمہ میں یوں آتا ہی ؎

بسے رنج بردم دریں سال سی عجم گرم کردم بدیں پارسی

جہاں دار اگر نیستی تنگدست مرا بر سر گاہ بودی نشست بدانش نبد شاہ را دستگاہ وگرنہ مرا بر نشاندے بگاہ

پہلا شعر یقیناً دوسرے شعر سے ماخوذ ہی جو نظامی عروضی کے چھ شعروں میں سے ایک ہی شاہنامہ میں ان کا کھوج تک نہیں ملا۔

چو دیہیم دارش نبد در نژاد ز دیہیم داراں نیاورد یاد چو اندر تبارش بزرگی نبود نیارست نام بزرگاں شنود

یہ دونوں ایک دوسرے سے ماخوذ ہیں دوسرا شعر نظامی کے چھ شعروں میں ملتا ہے اور پہلا شعر فردوسی کی زبان نہیں میری حجت صرف اسی قدر ہی کہ فردوسی کے ہاں اسم فاعل "دیہیم دار" کا رواج نہیں شاہنامہ دیہیم سے واقف ہی اور ترکیبی صورت میں "دیہیم جوئی" اس میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً

گرانمایہ سینہ خت نہاد روئے بدرگاہ سالار دیہیم جوئے (یا) بصندوق در مرد دیہیم جوئے دو اسپ گرانمایہ بست اندر دے بفرمود سالار دیہیم جوئے (دیگر) کہ نہ ہند آمر زور چیرے بدوئے چنیں داد پاسخ کہ او را بگوئے (دیگر) نہ تو شہریاری نہ دیہیم جوئے

دیہیم دار با وجود تلاش شاہنامہ میں میری نظر سے نہیں گزرا اس لئے میں اسی ایک نتیجہ پر پہنچا ہوں

کہ شعر بالا فردوسی کا ہو نہیں سکتا ؎

اگر شاہ را شاہ بودے پدر بسر بر نہادے مرا تاجِ زر
وگر مادرِ شاہ بانو بدے مرا سیم و زر تا بزانو بدے

دونوں شعر حقیقت سے دُور ہیں محمود کا باپ خود بادشاہ تھا محمود کی ماں مؤرخین کہتے ہیں رئیسِ زابل کی دختر تھی اسی لئے اس کو محمود زابلی کہا جاتا ہی یہ شعر شاہنامہ میں نہیں ملتے ؎

کفِ شاہِ محمودِ عالی تبار نہ اندر نہ آمد سہ اندر چہار

ایسے بعید زمانہ میں عقد انامل کا رواج نظم میں جب کہ طریق ابجدی تک کا استعمال ہی نامعلوم تھا قیاس میں نہیں آتا ؎

چو سی سال بردم بشہنامہ رنج کہ شاہم بہ بخشد بپاداش گنج
شہے کو نترسندہ درویش بود بشہنامہ او را نشاید ستود

فردوسی اپنی تصنیف کو شاہنامہ کے نام سے کبھی یاد نہیں کرتا وہ اسے دفتر پہلوی نامۂ خسروان نامۂ باستان وغیرہ ناموں سے یاد کرتا ہی یہ ایک اتفاقی امر تھا کہ اس کا نام شاہنامہ ہو گیا کیوں کہ فردوسی کے زمانہ سے پیشتر کم سے کم دو کتابیں ایسی موجود تھیں جن کا نام شاہنامہ تھا ایک ابوالموید بلخی کی تالیف تھا جس کا ذکر ہم تاریخ طبری اور قابوس نامہ میں پڑھتے ہیں چوں کہ فردوسی کی تصنیف بھی اسی مضمون پر تھی اس لئے اس کا نام بھی عوام میں شاہنامہ ہو گیا۔ عنصری بھی شاہنامہ کا ذکر کرتا ہے لیکن وہ فردوسی کا شاہنامہ معلوم نہیں ہوتا

عنصری اگر ز دجلہ فریدوں گذشت بے کشتی بشاہنامہ بریں حکایت ست سمر

فردوسی کی تالیف کا سب سے اوّل ذکر کرنے والا اسدی طوسی ہے جو کہتا ہی ؎

بشہنامہ فردوسی نغز گوئے چو از پیش گویندگاں برد گوئے

شعر مذکورۂ بالا خاتمۂ شاہنامہ کے اس شعر کے بہت قریب ہی ؎

بسی سال پرنج از سرائے سپنج بسے رنج بردم باُمید گنج

اس میں شک نہیں کہ شاہنامہ کی نظم میں تیس پینتیس سال صرف ہوئے لیکن شاعر غزنین میں سلطان کے پاس ششتہ میں آیا ہی دوسرے مصرعہ سے ایسا مترشح ہوتا ہی کہ فردوسی برابر تیس سال سلطان سے انعام لینے کی اُمید میں کام کرتا رہا اس لئے ہجو کے مؤلفین پھر اسی مشہور غلطی سے کام لے رہے ہیں کہ شاہنامہ سلطان

محمود غزنوی کے حکم سے لکھا گیا تھا۔

مرا زیں جہاں بے نیازی دہد　　میانِ یلاں سرفرازی دہد

یہ شعر شاہنامہ میں یوں ہے ؎

مرا ز جہاں بے نیازی دہد　　میانِ یلاں سرفرازی دہد

(خاتمۂ جنگ پیران و گودرز)

فقاعی بیرزیدم از گنج شاہ　　ازاں من فقاعی خریدم براہ
بپاداش گنج مرا در کشاد　　بمن جز بہائے فقاعے نداد

ان شعروں سے یہی مطلب اخذ ہو سکتا ہے کہ جب مجھکو صلہ بخشنے کے لئے سلطان نے اپنا خزانہ کھولا تو صرف پیالہ بھر شربت کی قیمت عنایت فرمائی (یعنی بہت ہی کم انعام دیا) چوں کہ اس قلیل مقدار سے صرف ایک پیالہ شربت خریدا جا سکتا تھا اس لئے میں نے ایسا ہی کیا۔ ان اشعار کا مصنف اگر فردوسی ہے تو ظاہر ہے کہ کوئی ذیہوش انسان باور نہیں کر سکتا کہ فردوسی ان ساٹھ ہزار درم کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو اس نے فقاعی حمامی اور انعام لانے والوں میں تقسیم کئے تھے ظاہر ہے کہ ان شعروں کا مصداق یہی قصّہ ہے یہ قصہ ان ابیات کی ایجاد کا باعث ہے یا یہ شعر اس قصّہ کی اختراع کے ذمہ دار ہیں ناظرین جو چاہیں سمجھیں مگر میں ان کو فردوسی کی ٹکسال کا نہیں مانوں گا ؎

پرستار زادہ نیاید بکار　　اگر چند دارد پدر شہریار
پشیزے بہ از شہریارے چنیں　　کہ نہ کیش دارد نہ آئین و دیں

شاہنامہ میں یہ شعر یوں وارد ہوتا ہے ؎

پلنگے بہ از شہریارے چنیں　　کہ نہ کیش دارد نہ آئین و دیں　　(جلد چہارم صفحہ ۲۴۶)
پرستار زادہ نیاید بکار　　اگر چند دارد پدر شہریار

یہ شعر بھی نظامی عروضی کے چھ اشعار میں شامل ہے اس میں پھر سلطان کی ماں کی طرف اشارہ ہے لیکن جیسا کہ اوپر دکھا چکا ہوں سلطان کی ماں کو لونڈی باندی کہنا بالکل غلط ہے اور جھوٹی ہجو لکھکر فردوسی اپنے آپ کو کیوں ذلیل کرتا۔ یہ شعر بیشک فردوسی کا ہے لیکن اس نے کسی مختلف مقصد سے اس کو لکھا تھا جس کا قصہ یہ ہے کہ مہران استا نوشیرواں کے لئے خاقانِ چین کی لڑکیوں میں سے ایک لڑکی پسند کرنے اور لانے کے لئے بھیجا جاتا ہے

رخصت کے وقت نوشیرواں اسے ہدایت کرتا ہے کہ تو خاقان کی شبستان کو غور سے دیکھنا اس کی کئی بیٹیاں ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ تو ان کی خوبصورتی اور آرائش لباس سے فریب کھا جائے اصلی بیوی سے خاقان کی جو اولاد ہو اسے پسند کرنا پرستار کی اولاد کی مجھکو کوئی ضرورت نہیں وہ بادشاہ کی اولاد ہو تو ہو۔ اس موقع پر نوشیرواں کہتا ہے۔

پرستارزادہ نیاید بکار   اگرچند دارد پدر شہریار

فردوسی نے اس کا استعمال اگرچہ مختلف غرض سے کیا تھا لیکن ہجو کے معماروں نے اپنے مطلب کا پاکر ہجو میں داخل کرکے ثابت کرنا چاہا کہ سلطان محمود اصیل سے نہیں تھا بلکہ باندی کا لڑکا تھا۔

سرناسزایاں برافراشتن   وزایشاں امید بہی داشتن
سررشتۂ خویش گم کردنست   بجیب اندروں مار پروردنست

جن اصحاب نے شاہنامہ کو غور سے پڑھا ہے کیا یقین کرسکتے ہیں کہ یہ فردوسی کی زبان ہے فردوسی کے عہد میں ایسے کنایات کا رواج نہیں تھا اور نہ وہ خود دیکھتا ہے زبان میں یہ گھلاوٹ نظامی کے ہاں البتہ ملتی ہے شاہنامہ میں ان اشعار کا کہیں پتہ نہیں چلتا نہ ان کے قریب المعنی اشعار ملتے بہمن نامہ جو سلطان محمود شاہ بن ملک شاہ سلجوقی ۵۱۱ھ و ۵۲۵ھ کی عہد کی تصنیف ہے اس کے چند اوراق سرکاری کتب خانہ کی ایک جلد نمبر ۳۵۸ میں محفوظ ہیں یہ اوراق اس میں شک نہیں اب سے تین ساڑھے تین سو برس پہلے کے نوشتہ ہیں ان میں یہ شعر فرامرز بن رستم بہمن بن اسفندیار کو خطاب کرکے پڑھتا ہے۔

زناجنس چشم بہی داشتن   بدل تخم یاری ازو کاشتن
سررشتۂ خویش گم کردنست   بجیب اندروں مار پروردنست

آخری شعر دونوں میں ایک ہے اور پہلے شعر میں اگرچہ بندش ایک ہی وضع کی ہے الفاظ میں اختلاف ضرور ہے ہر ایک شعر کی اصلیت کا اس زمانہ میں پتہ چلانا بہت مشکل کام ہے مگر اس قدر کہا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں شعر ایک دوسرے سے ماخوذ ہوئے ہیں اس قدر اور اضافہ کیا جاتا ہے کہ بہمن نامہ مطبوعہ بمبئی میں یہ اشعار نہیں ملتے۔

درختیکہ تلخست ویرا سرشت   گرش برنشانی بباغ بہشت
ورازجوئے خلدش بہنگام آب   بہ بیخ انگبیں ریزی و شہد ناب
سرانجام گوہر بکار آورد   ہماں میوۂ تلخ بار آورد

یہ معروف و مشہور اشعار ہیں اور عام طور پر فردوسی سے منسوب ہیں جامی نے جب ہاتفی کا شاعری میں امتحان لیا تو یہی مضمون دیا تھا جس کو ہاتفی نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

اگر بیضۂ زاغ عنبر سرشت   نہی زیرِ طاؤسِ باغ بہشت   بہنگامِ آن بیضہ پروردنش   ز انجیرِ جنت دہی ارزنش
دہی آبش از چشمۂ سلسبیل   بر آن بیضہ گر دم دمد جبرئیلؑ   شود عاقبت بچۂ زاغ زاغ   برد رنجِ بیہودہ طاؤسِ باغ

یہ ابیات خواہ فردوسی کے ہوں خواہ کسی اور کے لیکن قدردانی بھی دولت کی طرح اندھی ہے جس نے اس کی معائب کی مطلق پروا نہیں کی ہے "انگبیں" اور "شہدِ ناب" میں کیا فرق رہا یہ میرا اعتراض نہیں ہے بلکہ صاحبِ خزانۂ عامرہ کا۔ ممکن ہے کہ اصل میں یہاں شیرِ ناب ہو اور نہ اس بات کی پروا کی گئی ہے کہ ان کا مضمون اُستاد ابوشکور بلخی ۳۳۶ھ کے اشعار سے ماخوذ ہے

بدشمن برت مہربانی مباد   کہ دشمن درختیست تلخ از نہاد   درختیکہ تلخش بود گوہرا   اگر چرب و شیریں دہی مر ورا
ہمان میوۂ تلخ آرد پدید   ازو چرب و شیریں نخواہی مزید

شاہنامہ میں درخت کی تشبیہ بہت عام ہے۔ مثلاً بسانِ درختے بباغِ بہشت یا

درختے کہ پروردی آمد ببار   بہ بینی برش ہم کنوں در کنار   گرش بار خارست خود کشتۂ   وگر پرنیانست خود رشتۂ (دیا)
درختے[ٹ] کہ شیریں بود بار او   نگردد کسے گردِ آزارِ او   وگر آنکہ شیریں نباشد برش   بخاک اندر آرند ناگہ سرش
بماند بباغ آن و در آتش ایں   تو خواہی چناں باش و خواہی چنیں

ہم کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکتے کہ یہ اشعار فردوسی کے ہیں یا نہیں مگر سلیس اور سادہ گو فردوسی سے مشکل سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے اصلی رنگ کو چھوڑ کر یکایک ایسی شاندار ترکیبیں استعمال کرتا جن سے محض بلاغت یا الفاظی شان و شوکت مقصود ہو جو ہم "درفشانی" "باغ بہشت" "جوے خلد" اور "شہدِ ناب" میں معائنہ کرتے ہیں ظاہر ہے کہ تمام مضمون تکلف کے ساتھ ادا کیا گیا ہے۔

جب کوئی شاعر ایک خاص خیال کسی موقع پر ادا کرتا ہے جب دوسرے مقام پر اس کا مرادف یا ہم معنی خیال ادا کرے گا تو اس میں بھی غالباً وہی تناسب مساوات اور طرزِ ادا ملحوظ رکھے گا جو پہلے خیال کی تسوید کے وقت اس نے مدِ نظر رکھی تھی کیوں کہ شاعر کا متخیلہ محدود ہے جس طرح کہ اس کے الفاظ کا ذخیرہ۔

اگر اس کو ہم ایک کلیہ مان لیں اور پھر اس میزان میں جس طرح کہ خط سے ملا کر خط شناخت کیا جاتا ہے ہم شاعر

ٹ یہ اشعار نواب بندہ علی خاں ۱۱۵۶ھ نے فردوسی کے کلام کے نمونہ میں شاہنامہ سے دیئے ہیں لیکن مطبوعہ نسخوں میں میری نظر سے نہیں گزرے

کے معلوم اشعار سے اس کے نامعلوم یا مشتبہ اشعار کا موازنہ اور مقابلہ کریں تو ہمارا خیال ہے کہ ہم صحیح نتیجہ پر پہونچنے کی امید کر سکتے ہیں۔

شاہ نامہ ایک سمندر ہے اور فردوسی نے وہی ایک خیال مختلف موقعوں پر متعدد پہلوؤں سے باندھا ہے تلاش نے اشعار مبحث فیہ کے مقابل اشعار بھی شاہنامہ میں دریافت کر لیے جو حسب ذیل ہیں ؎

اگر بچۂ شیر ناخوردہ شیر — بپوشد کسے در میانِ حریر

دہد نوشش او راز شیر و شکر — ہمیشہ درا پرورا ند بہ بر

بگوہر شود باز چوں شد بزرگ — نترسد ز آہنگ پیل سترگ

یہ اشعار شاہنامہ میں سیاوش کے بارہ میں افراسیاب اور گرسیوز کے درمیان مکالمہ کے وقت آتے ہیں سادہ طبیعت فردوسی اپنے شیر کے بچّہ کو حریر میں لپیٹ کے انسانی بغل میں دے دیتا ہے اور شیر و شکر سے اس کے کھانے کا انتظام کر دیتا ہے لیکن وہ عالی دماغ شاعر اپنے درخت کو سیدھا دنیا کے پردہ سے اُٹھا کر نہ صرف بہشت "بلکہ باغِ بہشت" میں لے جاتا ہے ہمارا خیال تھا کہ آب کوثر سے وہ پانی کا انتظام کرے گا جس کے متعلق ہمیں علم ہے کہ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شکر سے زیادہ شیریں ہے نہیں وہ اس کو مبتذل اور پا افتادہ لفظ مان کر اس کے بجائے "جوئے خلد" کا شاندار لفظ استعمال کرتا ہے جو آب کوثر یا نہر کوثر سے زیادہ بلند اور باشکوہ ہے پھر اس جوئے سے وہ انگبین لاتا ہے اور انگبین بھی کیا دوسرے الفاظ میں دوہرا کر کہتا ہے "شہد ناب" اب ظاہر ہے کہ یہ تکلفات فردوسی کے مزاج میں داخل نہیں اور نہ یہ فلک سیر تخئیل فردوسی کا ہے اسدی یا اس کا ہم مشرب اپنی زبان میں یہ لوچ اور تخئیل میں پرواز دکھا سکتا ہے۔ فردوسی نے بھی شیر کے بچّہ کا مضمون شاہنامہ کے دوران میں بار بار دوہرایا ہے مضمون کا پیرایہ وہ بدل دیتا ہے لیکن اپنی اصلی سطح نہیں چھوڑتا اور نہ تخئیل بدلتا چنانچہ ؎

ہماں بچۂ شیر ناخوردہ شیر (۱) ستاند ہمی موبد تیز ویر

مرا اورا درآرد میانِ گروہ — چو دنداں برآرد شود زو ستوہ

ابے آں کہ دیدہ است بستان مام — بجوئی پدر باز گرد و تمام

کہ گر بچۂ شیر نر پروری (۲) چو دنداں کند تیز کیفر بری

چو با زور و با چنگ برخیزد اوے به پرورد گار اندر آویزد اوے

چنین گفت با من یکے ہوشمند کہ جانش خرد بود و رایش بلند (۳) کہ اے دایۂ بچۂ شیر نر چہ رنجی کہ جاں ہم نیاری بہ بر

بکوشی و داورا کنی پرہنر تو بے بر شوی چوں وی آید بہ بر نختیں کہ آیدش نیرو بہ چنگ ہماں پرورانندہ آرد بچنگ

زدانا تو نشنیدی ایں داستاں کہ برگوید از گفتۂ باستاں (۴) کہ گر پروری بچۂ نرہ شیر شود تیز دنداں و گردد دلیر

چو سر بر کشد زود جوید شکار نخست اندر آید بہ پروردگار

بہ عنبر فروشاں اگر بگذری شود جامۂ تو ہمہ عنبری (۵) و گر تو شوی نزد انگشت گر ازو جز سیاہی نیابی دگر

ز بد گوہراں بد نباشد عجب نشاید ستردن سیاہی ز شب

میں اعتراف کرتا ہوں کہ شاہنامہ میں یہ ابیات کہیں نہیں ملتے۔

ز ناپاک زادہ مدارید امید کہ زنگی بشستن نگردد سفید

یہ شعر شہرت پیدا کر کے ضرب المثل بن گیا ہے ایسے صاف اور ہموار زبان مشکل سے فردوسی کے کہی جاسکتی ہے

فردوسی اس کے قریب قریب خیال ان الفاظ میں لکھتا ہے ؎

بناسانیان تا مدارید امید مجوئید یاقوت از سرخ بید ص ۱۴۳

دیگر

بنا بودنیہا مدارید امید نگوید کہ بار آورد شاخ بید

بوستان سعدی میں ایک شعر یوں آتا ہے ؎

بکوشش نروید گل از شاخ بید نہ زنگی بگرمابہ گردد سفید (حکایت مرد درویش و خاک کیش)

سعدی کا پہلا مصرع فردوسی کے مصرع سے ماخوذ ہے فرق صرف اتنا ہے کہ ایک بار کہتا ہے دوسرا گل لیکن سعدی کا دوسرا مصرع زنگی اور حمام کے خیال کا نہایت بلند واقع ہوا ہے مگر ہجو کا مصرع اس سے بھی زبردست اور صاف ہے۔ مخفی نہ رہے کہ اگر سعدی کو ہجو کے اس مصرع کی اطلاع ہوتی تو ہرگز ہرگز اپنا مصرع نہ لکھتے کیونکہ جو لطافت کہ "زنگی بشستن نگردد سفید" میں ہے وہ سعدی کے مصرعہ "نہ زنگی بگرمابہ گردد سفید" میں نہیں ہے۔ حالانکہ کل فرق دونوں مصرعوں میں "گرمابہ" اور

"شستن" کے استعمال میں ہے اور نہ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ شیخ سعدی ایک مبتذل سرقہ اپنے لیئے کیوں گوارا کرتے نیز فردوسی کی ہجو سے سعدی کا ناواقف رہنا بھی احتمال نہیں کیا جا سکتا اس لیئے میں یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوا ہوں کہ ہجو نگاروں نے سعدی کے مصرعہ میں "شستن" کے اضافہ سے لطافت پیدا کر کے مصرعہ پر اپنا قبضہ کر لیا - علاوہ ازیں بہمن نامہ میں یہ شعر یوں ملتا ہے ؎

زناپاک زادہ مدارید امید — کہ ہندو بشستن نگردد سفید

زبد اصل چشم بہی داشتن — بود خاک در دیدہ انباشتن

بیت ہذا ان ابیات سے ماخوذ ہے ؎

سرِ ناسزایاں برافراشتن — وزیشاں امید بہی داشتن

سرِ رشتۂ خویش گم کردن ست — بجیب اندروں مار پروردن ست

دونوں کا مقصد ایک ہے فرق صرف اتنا ہے کہ وہی مضمون ایک مقام پر مختصر کر دیا گیا ہے اور دوسرے مقام پر طوالت سے بیان کیا گیا ہے ؎

جہاندار اگر پاک نامی بدے — دریں راہ دانش گرامی بدے

شنیدی چوزیں گونہ گونہ سخن — ز آئینِ شاہان و رسمِ کہن

دگر گونہ کردی بکار م نگاہ — نگشتی چنیں روزگارم تباہ

ان اشعار میں جو مطلب ادا کیا گیا ہے وہ اس سے قبل ان الفاظ میں ادا ہوا تھا ؎

اگر منصفی بودے از راستاں — کہ اندیشہ کردے دریں داستاں

بگفتے کہ من در رہ داستاں — بداد ستم از طبع داد سخن

اِن کی بندش کی کمزوری کہہ رہی ہے کہ ان کا فردوسی سے کوئی تعلق نہیں -

اِس تنقید سے جو گزشتہ صفحات میں کی گئی ہے ناظرینِ کرام پر ہجو کی مصنوعی ہستی کا راز افشا ہو گیا ہو گا اس کی مصنوعیت اور مجہولیت کا پردہ کامل طور پر چاک کر دیا گیا ہے اس نکسال کے اکثر سکے قلب ہیں اور وہ ابیات جن پر فردوسی کا داغ ہے شاہنامہ سے سرقہ کیے گئے ہیں ایک خفیف جزو دیگر اساتذہ کے ہاں سے لیا گیا ہے ہجو کا ایک حصّہ اس قسم کا

بھی ہو جن کو شاہنامہ نہ اپنے خیاباں کے پھول تسلیم کرتا ہے اور نہ تنقید کی روشنی اُن پر سے تاریکی کے پردوں کو اُٹھا سکتی ہے ممکن ہے کہ مستقبل اُن کی اصلیت پر روشنی ڈالے۔ فردوسی نے اگر نفس الامر میں کوئی ہجو لکھی تھی تو وہ فوراً برباد کر دی گئی ہے اور ضائع شدہ ہجو کا اب ایک شعر بھی ہمارے پاس نہیں ہے البتہ اگر یہ فرض کریں کہ یہ وہی حصّہ ہے جس کی سُراغ رسانی کسی ماخذ تک نہیں کی جا سکتی اس قسم کے اشعار کی تعداد بہت کم ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرجان منڈویل کے ہیروں کی طرح ہجو کے ابیات میں بھی بالیدگی تو الداور تناسل کی قوت حلول کر آئی تھی کیونکہ نظامی کے عہد میں چھ بیت سے چودھویں صدی میں ایک سو پچاس اشعار سے زیادہ اس کی تعداد پہنچ گئی ہے اس قسم کی ترقی ہم اکثر تبرکات میں مشاہدہ کرتے ہیں اور فردوسی کی ہجو کیا تبرک سے کم تھی۔ حضرت عیسیٰ کی صلیب اگرچہ ابتدا میں ایک لکڑی کا ٹکڑا تھا لیکن قرونِ وسطیٰ میں وہی تبرک اگر یورپ کے کلیساؤں سے لے کر ایک جگہ انبار کر دیا جاتا تو یقین ہے وہ انبار کئی گاڑیوں میں نہ سما سکتا۔ دنیا کی آبادی روزانہ ترقی کرتی جا رہی ہے اسی طرح فردوسی کی ہجو بھی روز افزوں ترقی کرتی گئی یہ کرشمہ اس میں شک نہیں نہایت حیرت انگیز ہے لیکن مظاہرِ افعالِ انسانی اس قسم کے بہت سی مثالیں پیش کر رہے ہیں۔

ہجو کیا ہے شاہنامہ خوان دنیا کا انتقام ہے سلطان محمود غزنوی کے خلاف کیونکہ وہ کسی شخص واحد کی تصنیف نہیں ہے بلکہ اس کے قصر کی تعمیر میں ساری قوم نے ہاتھ بٹایا ہے اور اس کی تکمیل میں کئی صدیاں گزری ہیں۔ گرشاسپ نامۂ اسدی یوسف زلیخا بہمن نامہ اور بوستانِ سعدی میں چار صدیوں کا فاصلہ ہے اور جو اشعار ان وسائل سے لیے گئے ہیں اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ سعدی کے زمانہ تک ہجو کی تکمیل نہیں ہو چکی تھی۔

مضمون کے لحاظ سے اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہجو کے ضمن میں بہت شعر مرادف اور مکرر ہو گئے ہیں ایسے ابیات کی طرف میں اپنی تنقید کے دوران میں اشارہ کر چکا ہوں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجو کی دو ولادتگاہ ہیں۔ شیعی نقطۂ خیال کے ابیات کی کثرت سے یہی مفہوم ہوتا ہے کہ اس عقیدے کے اصحاب نے ہجو کی سرپرستی میں غالب حصّہ لیا ہے ہجو کی تعمیر کے لیے سب سے زیادہ ذخیرہ شاہنامہ سے لیا گیا ہے ظاہر ہے کہ ربط کلام کی غرض سے بعض اشعار میں اصلاح یا تبدیلی کی گئی ہو گی سلسلہ قایم کرنے کے لیے نئے اشعار کی بھی ضرورت محسوس ہوئی ہو گی اس طرح سے یہ ہجو تیار ہوئی ہے جو آج بغیر کسی شبہ کے فردوسی کی تصنیف مانی جاتی ہے۔

ذیل میں وہ اشعار نقل ہوتے ہیں جو اس غرض سے شاہنامہ سے لیے گئے ہیں نیز جو غیر ذرائع سے اخذ ہوئے ہیں۔

اشعار ہجو		اشعار شاہنامہ	
۱- چہ گفت آں خداوند تنزیل وحی	خداوند امر و خداوند نہی	چہ گفت آں خداوند تنزیل وحی	خداوند امر و خداوند نہی
۲ کہ من شہر علمم علیم دراست	درست ایں سخن قول پیغمبر است	کہ من شہر علمم علیم در ست	درست ایں سخن گفت پیغمبر است
۳ گواہی دہم کیں سخن را ز اوست	تو گوئی دو گوشم بر آواز اوست	گواہی دہم کیں سخن را ز اوست	تو گوئی دو گوشم بر آواز اوست
		(از دیباچہ شاہنامہ)	
۴ چو باشد ترا عقل و تدبیر و رائے	بنزد نبی و علی گیر جائے	اگر چشم داری بدیگر سرائے	بنزد نبی و علی گیر جائے
گرت زیں بد آید گناہ من است	چنیں است و ایں رسم و راہ من است	گرت زیں بد آید گناہ من است	چنیں است آئین و راہ من است
نباشد بجز بے پدر دشمنش	کہ یزداں بآتش بسوزد تنش	نباشد جز از بے پدر دشمنش	کہ یزداں بآتش بسوزد تنش
		(دیباچہ شاہنامہ)	
منم بندۂ اہل بیت نبی	ستائندۂ خاک پائے ولی	منم بندۂ اہل بیت نبی	سر افگندہ بر خاک پائے وصی
		انجام داستان سیاوش جلد اول و یوسف زلیخائے فردوسی	
بشش بیت ایں نامہ و شش ہزار	بگفتم نکرد ایچ در من نظار	بود بیت شش بار بیور ہزار	سخنہائے شایستۂ غمگسار
چنیں شہریاری و بخشندۂ	بگیتی ز شاہاں درخشندۂ	چنیں شہریاری و بخشندۂ	بگیتی ز شاہاں درخشندۂ
نکرد اندریں داستانم نگاہ	بگفتار بدگوئے گم کردہ راہ	نکرد اندریں داستانہا نگاہ	ز بدگوئے و بخت بد آمد گناہ
حسد برد بدگوئی در کار من	تبہ شد بر شاہ بازار من	در افتاد بدگوئی در کار من	تبہ شد بر شاہ بازار من
		(جلد چہارم ابتدائے داستان شیریں و خسرو)	
بسی سال و پنج از سرائے سپنج	چنیں رنج بردم بامید گنج	سی و پنج سال از سرائے سپنج	بسے رنج بردم بامید گنج
چو بر باد دادند رنج مرا	بند حاصلے سی و پنج مرا	چو بر باد دادند رنج مرا	بند حاصلے سی و پنج مرا
چو عمرم بنزدیک ہشتاد شد	امیدم بیکبار بر باد شد	کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد	امیدم بیکبارہ بر باد شد

اشعار ہجو

نہ خسرو نژادے نہ والا سرے ۔ پدر زا صفہاں بود آہنگرے

چو جاماسپ کاندر شمار سپہر ۔ فرازندہ تر بد ز تابندہ مہر

درایں نامۂ شہریاراں بخواں ۔ سراز چرخ گردوں ہمی بگزراں

چنیں نامداران گردن کشاں ۔ کہ دادم یکایک ازایشاں نشاں

ہمہ مردہ از روزگار دراز ۔ شد از گفت من نام شاں زندہ باز

چو عیسیٰ من ایں مردگاں را تمام ۔ سراسر ہمہ زندہ کردم بنام

مرا در جہاں بے نیازی دہد ۔ میان یلاں سرفرازی دہد

یکے بندگی کردم اے شہریار ۔ کہ ماند ز تو در جہاں یادگار

بناہائے آباد گردد خراب ۔ ز باران واز گردش آفتاب

پے افگندم از نظم کاخ بلند ۔ کہ از باد و باراں نیابد گزند

بریں نامہ بر عمرہا بگزرد ۔ بخواند ہر آنکس کہ دارد خرد

چو ایں نامور نامہ آمد بہ بن ۔ پشیماں شد از گفتہای کہن

ہر آنکس کہ دارد دہش و رائے و دیں ۔ پس از مرگ بر من کند آفریں

نمیرم ازیں پس کہ من زندہ ام ۔ کہ تخم سخن را پراگندہ ام

اشعار شاہنامہ

نہ خسرو نژادے نہ والا سرے ۔ پدر زا صفہاں بود آہنگرے

ج اوّل ص ۱۶۱ سطرہ ۱۱ از آخر

چو جاماسپ کاندر شمار سپہر ۔ فروزندہ تر بد ز ناہید و مہر

جلد چہارم صفحہ ۱۱۰ ایضاً صفحہ ۵۴۳ نولکشور

یکے نامۂ شہریاراں بخواں ۔ نگر تا کہ باشد چو نوشیرواں

(جلد چہارم عہد نامۂ نوشیرواں بعد از زند خود ہرمز)

ہمہ پہلوانان و گردن کشاں ۔ کہ دادم دریں قصہ زیشاں نشاں

ہمہ مردہ از روزگار دراز ۔ شد از گفت من نام شاں زندہ باز

منم عیسے آں مردگاں را کنوں ۔ رواں شاں بمینو شدہ رہنموں

جلد سوم ابتدائے ہفتخوان اسفندیار

مرا زیں جہاں بے نیازی دہد ۔ میان یلاں سرفرازی دہد

یکے بندگی کردم اے شہریار ۔ کہ ماند ز من در جہاں یادگار

بناہائے آباد گردد خراب ۔ ز باران و از تابش آفتاب

پے افگندم از نظم کاخ بلند ۔ کہ از باد و باراں نیابد گزند

بریں نامہ بر عمرہا بگزرد ۔ ہمی خواند آں کس کہ دارد خرد

خاتمۂ جنگ پیران در ستائش محمود و گلۂ روزگار

چو ایں نامور نامہ آمد بہ بن ۔ زمن روئے گیتی شد پر سخن

ہر آنکس کہ دارد دہش و رائے و دیں ۔ پس از مرگ بر من کند آفریں

نمیرم ازیں پس کہ من زندہ ام ۔ کہ تخم سخن را پراگندہ ام

اشعارِ ہجو	اشعارِ شاہنامہ
پرستار زادہ نیاید بکار / اگرچند باشد پدر شہریار	پرستار زادن نیاید بکار / وگر زاں کہ باشد پدر شہریار جلد چہارم داستان خاقانِ چین
بشیرے باز شہریارے چنیں / کہ نہ کیش دارد نہ آئین و دیں	پلنگے باز شہریارے چنیں / کہ نہ کیش دارد نہ آئین و دیں جلد چہارم
چو فردوسی اندر زمانہ نبود / بداں بہ کہ بخشش جوانہ نبود	سپاہے کہ آں را کرانہ نبود / بداں بہ کہ بخشش جوانہ نبود جلد اول داستان توذر
چو گودرز و ہشتاد پورِ گزیں / سوارانِ میدان و شیرانِ کیں	چو گودرز و ہفتاد پورِ گزیں / سوارانِ میدان و شیرانِ کیں جلد چہارم
چو پروردگارش چنیں آفرید / نیابی تو بر بندِ یزداں کلید	چو پروردگارش چنیں آفرید / نیابی تو بر بندِ یزداں کلید جلد چہارم
چو ایں نامور نامہ آمد بہ بن / پشیماں شد از گفتہای کہن	چو بشنید شہ از پشوتن سخن / پشیماں شد از کردہای کہن جلد سوم رہائی زال از دستِ بہمن
مرا در جہاں شہریاری رواست / بسے بندگانم چو کیخسرواست	نہ او در جہاں شہریاری رواست / بزرگست و با عہد کیخسرواست جلد سوم پاسخ گشتاسپ با سفندیار
من ایں نامۂ شہریارانِ پیش / بگفتم بدیں نغز گفتارِ خویش	کہ ایں نامۂ شہریارانِ پیش / بہ پیوندم از خوب گفتارِ خویش
بدیں زادم و ہم بریں بگذرم / چناں داں کہ خاکِ پئے حیدرم	بریں زادم و ہم بریں بگذرم / چناں داں کہ خاکِ پئے حیدرم دیباچۂ شاہنامہ قلمی نعت و منقبت
کہ پیش از تو شاہاں فراواں بدند / ہمہ نامدارانِ گیہاں بدند	بزد شست بسیار شاہاں بدند / ہمہ نامدارانِ گیہاں بدند گرفتاری خاقانِ چین و شکست تورانیان بدست رستم د

اشعار ہجو		اشعار شاہنامہ	
بنالم بدرگاهِ یزدانِ پاک	فشانده برسر پراگنده خاک	بنالم ز تو پیشِ یزدانِ پاک	خروشان بسر بر پراگنده خاک
		(آشفتن رستم بر طوس برائے طلایہ)	
		خاتمۂ داستان اسکندر در گلۂ آسمان و ستایش سلطان محمود جلد سوم	
نمرده است و هرگز نمیرد سخن	سخندان زمن این سخن فهم کن	نمرده است و هرگز نمیرد سخن	بود تازه هرچند گردد کهن
فزون از تو بودند یکسر بجاه	بگنج و سپاه و به تخت و کلاه	ز فرها دو گیوت برآرم بجاه	بگنج و سپاه و به تخت و کلاه
		خواستن بیژن نبرد هومان از گودرز جلد چهارم	

اشعار ہجو		اشعار غیر شاہنامہ	
ز ناپاک زاده مدارید امید	که زنگی بشستن نگردد سفید	بکوشش نروید گل از شاخِ بید	نه زنگی بگرمابه گردد سپید
		بوستانِ سعدی حکایت مرد درویش و خاکِ کیش	
که سفله خداوندِ هستی مباد	جوانمرد را تنگدستی مباد	که سفله خداوندِ هستی مباد	جوانمرد را تنگدستی مباد
		بوستان سعدی (حکایت کریم تنگدست با سائل)	
بزرگی سراسر بگفتار نیست	دو صد گفته چون نیم کردار نیست	هنرها سراسر بگفتار نیست	دو صد گفته چون نیم کردار نیست
		گرشاسپ نامه اسدی رسیدن رسول گرشاسپ نزد فغفور	
چو گرشاسپ و سام و نریمانِ گرد	جهان پهلوانانِ با دست برد	ز جادر ربوده بهومان سپرد	جهان پهلوانانِ با دست برد
		برزونامه داستانِ سوسن رامشگر (ملحقات)	
سرِ ناسزایان برافراشتن	وزایشان امیدِ بهی داشتن	ز ناجنس چشمِ بهی داشتن	بدل تخمِ یاری ازو کاشتن
سرِ رشتهٔ خویش گم کردن است	بجیب اندرون مار پروردن است	سرِ رشتهٔ خویش گم کردن است	بجیب اندرون مار پروردن است
ز بد اصل چشمِ بهی داشتن	بود خاک در دیده انباشتن	ز ناجنس چشمِ بهی داشتن	بدل تخمِ یاری ازو کاشتن
		(بهمن نامه)	

ناول نویسی

(از جناب ڈاکٹر لطافت حسین خاں صاحب آئی ایم ایس مولف دیباچہ صحت)

(۱)

انسان کی طبیعت کا خاصہ ہے کہ دوسروں کے حالات معلوم کرنے میں بڑی دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ جگ بیتی کے سننے میں اُسے بڑا لطف آتا ہے۔ حالاں کہ اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اُس کی اپنی ہی زندگی کیا کم ہے؛ اور اپنی ہی معاشرت اور میل ملاپ کے روزانہ مشاہدے اس کے لئے کافی ہو سکتے ہیں۔ لیکن شاید اس کے مزاج میں ایک عجب عیاری اور شوق جستجو ہے۔ وہ اپنے تجربوں کو نہایت سستے داموں مول لینا چاہتا ہے۔ دوسروں کی تقلید کی خواہش ہمیشہ دامنگیر رہتی ہے۔ اور ان کی زندگی ایسی پراسرار و عجیب معلوم ہوتی ہے کہ اپنے مشاہدات خواہ کتنے ہی دلچسپ و نتیجہ خیز ہوں مگر مقابلتاً کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ قصوں اور کہانیوں کے پڑھنے یا سننے میں اسے ایک خاص قسم کا ذوق و شوق ہوتا ہے۔ وہ اس مقصد کو پورا کرتے ہیں اور ان کی تعلیم و تلقین خواہ کتنی ہی مصنوعی و مبالغہ آمیز کیوں نہ ہو مگر اس کے وہم و تخیل کی تسکین کے لئے کافی ہے اور اس کی سمجھ کے موافق اس کے علم میں بھی اضافہ کرتی ہے اور وابستگی کا باعث بھی ہوتی ہے۔

جب انسان نے وحشیانہ حالت سے قدم آگے بڑھایا تو شاید ابتدا علم ادب سے کی ہوگی۔ اور اپنے جذبات کو ظاہر کرنے والے، رزم بزم کے معرکوں کو بیان کرنے والے جملے بے ساختہ اُس کی زبان سے نکلے ہوں گے جس میں نہ وزن ہوگا نہ قافیہ۔ بلکہ ایک نامکمل شاعری تھی جو رفتہ رفتہ ترقی کر کے اعلیٰ پیمانہ پر پہونچ گئی اور ہومر (Homer) کی الیڈ (Iliad) اور ویاس کی مہابھارت کا ظہور ہوا۔ ان سے زیادہ قدیم شاید ہی کوئی دوسری کتاب ہو۔ نثر کا زمانہ بعد میں شروع ہوا مگر تعجب ہے کہ اس میں قصص و حکایات کا بہت کم

پتہ لگتا ہے اور قلدانیہ، اشور، ایران، مصر و یونان نے جو اپنے علمی ذخیرے چھوڑے ہیں ان میں بہت کم ایسی کتابیں ہیں جن پر محض قصہ کا اطلاق ہو سکتا ہے یعنی قصے سے جو ہمارا مفہوم ہے وہ اُس کے تحت میں نہیں آتیں ورنہ یوں تو بکثرت کتابیں تاریخی و مذہبی موجود ہیں جو قصے کہانیوں کی طرح لکھی گئی ہیں اور مثل راج نیتی کلیلہ ودمنہ وایساپ فیبلس (Aesop Fables) کتابیں موجود ہیں زیادہ تر سلطنت کی ہدایت و تعلیم مقصود تھی۔ اور حکمرانی وغیرہ کے آئین وآداب کہانیوں کے پیرایہ میں سکھانے مدنظر تھے۔ مگر عوام الناس اُن سے بے خبر تھے اور وہ مذہبی پیشواؤں، حکیموں و بادشاہوں کے مطالعہ کے لئے مخصوص تھیں۔ عوام کو ڈراما سے زیادہ شوق تھا کیوں کہ اُس سے حظ اُٹھانے کے لئے ان کی علمی کم مائگی اور نوشت وخواند سے بے بہرگی حارج و مانع نہ تھی۔ ہر کوئی نقل کر سکتا تھا اور سوانگ بھر کے حصہ لے سکتا تھا۔ اور چوں کہ اُس میں مذہبی رنگ کی چاشنی تھی اور اُس زمانہ کے مذاق و تمدن کے مطابق تھا اس لئے تمام مہذب ملکوں میں خصوصاً یونان و ہند و روم میں جہاں آریہ قومیں آباد تھیں صدیوں تک اس کا بڑا چرچا رہا اور اس رُتبہ تک پہنچ گیا کہ موسیقی کے ساتھ اعلیٰ فنون لطیفہ میں شمار کیا جانے لگا۔

فسانہ نگاری کا وہ دَور جس کی ایک عمدہ مثال الف لیلہ ہے کب اور کیوں کر شروع ہوا بہت کچھ فیصلہ طلب و قابل غور ہے۔ کیا وہ قدیم تہذیب و تمدن کے زوال کے ساتھ وابستہ تھا اور فنون لطیفہ کے انحصار و مذاق عامہ کی پستی پر دلالت کرتا تھا یا اُس کے فروغ دینے والے وہ مسلمان عرب تھے جو مذہباً نقل اور سوانگ کو مذموم و معیوب خیال کرتے تھے غرض کہ کچھ بھی ہو مگر اس میں شک نہیں کہ قرون وسطیٰ سے جو اُس کی ترقی شروع ہوئی تو برابر بڑھتی ہی گئی اور نہ صرف اس نے اپنی رقیب ڈراما کو بہت جلد پیچھے چھوڑ دیا بلکہ اُس نے ایک نئی دلکش شکل اختیار کی اور نوبت یہاں تک پہونچ گئی ہے کہ ادب کیا بلکہ اور تمام علوم بھی اُس کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے نظر آتے ہیں۔

وہ مثل ایک کوہ سر بفلک کی ہے جس کے مقابلہ میں اور تمام علوم چھوٹے چھوٹے ٹیلے نظر آتے ہیں۔ وہ ایک سیلاب عظیم ہے جس کے تلاطم میں اندیشہ ہے کہ کہیں تاریخ، فلسفہ و حکمت کے چھوٹے چھوٹے جہاز او کشتیاں ایک دن غرقاب نہ ہو جائیں۔ کیوں کہ ہم بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں

فلسفے مختلف زبانوں میں شائع ہوتے ہیں اور پھر بھی اُن سے سیری نہیں ہوتی۔

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اکثر ان میں ایسے ہیں جن کی عمر طبعی بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ اکثر ایسے ہیں جن کی حیثیت چمنستانِ ادب میں خس و خاشاک سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی کلیاں ہیں جو مُنہ کھولتے ہی مرجھا جاتی ہیں۔ یا بدہیئت و بدبودار پودے ہیں جو بہت جلد تراش دیئے جاتے ہیں اور شاذ و نادر ہی ایسے نکلتے ہیں جنھیں صدابہار ہونے کا شرف حاصل ہوتا ہو یا محفلِ ادب کی زیب و زینت کا باعث سمجھے جاتے ہوں مگر اس میں شک نہیں کہ ان کی روئیدگی و نمو میں ایک عجب قوت ہے جسے پُورے طور سے سمجھنے کے لئے ہم اپنے کو اسی طرح قاصر پاتے ہیں جس طرح انسان کی طبیعت اور اس کے مذاق کا تلون بخوبی احاطۂ ادراک و فہم میں نہیں آسکتا۔

اس غیر معمولی ترقی پر خیال کرتے ہوئے ہمیں موجودہ فسانوں کے مورثِ اعلیٰ یعنی قصّوں اور کہانیوں کو نہیں بھولنا چاہیئے دونوں کے طرز میں اگرچہ ایک بیّن فرق نظر آتا ہے مگر اصل ایک ہی ہے۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ کیوں کر درجہ بدرجہ اور مختلف منازل طے کرتا ہوا وہ اس خاص شکل و ہیئت میں جسے آج کل ناول کہتے ہیں ظاہر ہوا، ایک دوسرا ہی سوال ہے جس کا جواب دینا آسان نہیں اور بہت کچھ قابلِ مطالعہ و غور ہے۔ اس کے لئے مختلف اقوام اور مختلف زبانوں کی ادبیات کی بکثرت ورق گردانی کی ضرورت ہے جو ہمارے امکان سے باہر ہے اور نہ یہ اس مضمون کا منشا ہے۔ ہمارے لئے یہاں اتنا ہی معلوم کر لینا کافی ہے کہ طرزِ جدید موجودہ معاشر اور تہذیب و تمدن کے ساتھ وابستہ ہے اور نیز اس پر اُن تمام علوم و فنون (سائنس و فلسفہ) کا اثر پڑا ہے جو انسان کے دماغی ترقیوں کا نتیجہ ہیں۔ اسے ہم بالتشریح ابھی بیان کریں گے۔

اٹھارھویں صدی عیسوی تک یورپ بھی توہمات باطلہ کے پھندے میں پھنسا ہوا تھا۔ اُسے فرضی داستانوں اور دیووں اور پریوں کی کہانیوں میں خاص لطف آتا تھا۔ اور یہی کیفیت اور اُس کی شاعری سائنس و دیگر علوم کی بھی تھی کہ سب پر کم و بیش جہل چھایا ہوا تھا اور اس کی تاریکی میں حقیقت نظروں سے چھپی ہوئی تھی۔ تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ کبھی کبھی ایک بجلی سی چمک جاتی تھی یعنی ایک غیر معمولی شخص خداداد ذہن و طبیعت لے کر آتا اور قدرت کی حقایق کو آشکارا کر کے ششدر و حیران کر دیتا تھا۔ بعض کو یہ راز

اتفاقیہ معلوم ہوجاتے بعض اصلیت وغیر اصلیت دونوں کو باہم اس طرح خلط ملط کردیتے جس طرح ایک ہی لڑی میں سچے اور جھوٹے دونوں قسم کے موتی پرو دیئے جائیں اور انھیں ایک دوسرے سے تمیز کرنا مشکل ہوجائے۔ غرض کہ یہی کیفیت تھی اور علم کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا کہ آخرکار ایک دن وہ بھی آیا جب عقل سلیم کی روشنی نمودار ہوئی اور صاحبان فہم وبصیرت نے دیکھا کہ قاعدے اور اصول قایم کئے بغیر سچائی پر آگاہی پانا بہت مشکل ہی اور خیالات وقیاسات کو تجربہ ومشاہدے پر ترجیح دینا سخت دھوکے میں ڈالنے والی بات ہی اور قدرت کے کرشموں کے اسباب وعلل کی کھوج وجستجو کے لئے نہ صرف نہایت احتیاط وہوشیاری کے ساتھ اس کے معائنہ ومطالعہ کی ضرورت ہی بلکہ یہ بھی لازم ہی کہ اس کو صداقت اور ایمانداری کے ساتھ بیان کیا جاوے اور یہ اُمید رکھنا کہ وہ بغیر محنت ومشقت کے یوں ہی الہاموں کے ذریعہ سے اپنے راز بتاویگی ایسا ہی بے سود ولاحاسل ہی جس طرح کوئی بھوکا شخص کسی پھل کو للچائی نگاہوں سے دیکھے اور یہ تصور کرے کہ آپ ہی آپ وہ اُس کے منہ میں چلا آئے گا۔

یہی وہ خیالات تھے جنھوں نے علوم نظریہ یعنی سائنس کی بنیاد قایم کی اور تمام دنیا میں ایک انقلاب عظیم پیدا کردیا۔ اب قاعدہ ہی کہ جب کسی درخت کی ایک شاخ پر پھل آتے ہیں تو دوسری بھی ہری ہونے لگتی ہی جب ایک شمع جل اُٹھتی ہے تو دوسری بھی جو نزدیک ہیں پگھلنے لگتی ہیں اسی طرح جب علم انسانی کے کسی ایک شعبہ کو ترقی ہوتی ہی تو دوسرے بھی لامحالہ اُس سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ وسیر میں تحقیق وتنقید سے کام لیا جانے لگا۔ فلسفہ میں نفسیات اور الٰہیات کا آغاز ہوا۔ نقاشی ومصوری میں تناسب واصلیت کا خیال رکھا جانے لگا۔ شاعری نے ایک جدا رنگ اختیار کیا اس کا دائرہ جو پہلے محدود تھا اب وسیع ہونے لگا اور بجائے گل وبلبل وآہ ونالے کے اس میں قدرت کی صناعیوں کے ذکر ہونے لگے۔ اصلی واقعات لکھے جانے لگے اور سچے جذبات وخواہشات کا اظہار ہونے لگا۔ اسی طرح افسانوں وقصوں کا بھی طرز واندازبدلنے لگا اور بجائے اس کے کہ انسان کو عجیب وغریب فوق العادت قوتوں کا غلام تصور کیا جاوے اُسے اپنے ماحول کا تابع بنایا گیا اور اُس کی خاص تربیت جبلی خصائل وعادات کو ملحوظ رکھا گیا اور اس کے جذبات وخواہشات کو ایک ایک کرکے واضح وآشکارا کیا گیا اور فرضی اور خیالی باتوں سے اجتناب کرکے مشاہدہ سے کام لیا گیا اور پورے

غور و فکر کے بعد نتیجے اخذ کیے گئے تاکہ زندگی کے جو مرقعے پیش کیے جائیں وہ اصلیت و حقیقت کے مطابق ہوں چنانچہ اس طرح ایک معرکۃ الآرا انقلاب فسانہ نگاری میں پیدا ہوا اور اس طرز خاص کو "نیچرل طرز" (فطری طرز) کے نام سے پکارنے لگے۔ اس کے بانی و محرک زیادہ تر فرانسیسی مصنفین ہوئے ہیں جنھوں نے بڑی دقیقہ سنجی و باریک بینی کے ساتھ فطرت کا مطالعہ کیا اور سالہا سال کی محنت کے بعد ایسی یادگاریں چھوڑی ہیں جنھوں نے افسانوں اور قصوں کی وقعت کو اس قدر بلند کر دیا کہ فلسفہ و تاریخ کے ہم پلّہ ہوگئے۔

یہ ممکن ہے کہ آیندہ چل کر اس طرز کی بھی اصلاح و تجدید کی جائے کیوں کہ ادب میں بھی سائنس کی طرح نظر ہمیشہ ترقی کی طرف رہتی ہے اور کمال تک پہونچنا ناممکن ہے لیکن جن اصولوں پر اس کی بنیاد قایم ہے وہ ہمیشہ سچے رہیں گے اور اگر کبھی فسانہ نگاری اُن سے دُور بھٹک گئی تو اس کا زوال یقینی و لازمی ہے اور جس طرح نقاشی و مصوری کا حال ہے کہ خواہ کتنے ہی مختلف طرز کیوں نہوں اور مختلف ناموں یونانی، ہندی، جاپانی وغیرہ سے پکاری جائیں مگر اُن کی فضیلت کا معیار وہی ایک صفت واحد ہے یعنی فطرت و قدرت کی مطابقت جس کے بغیر نہ کوئی فن فن رہ سکتا ہے اور نہ ادب ہی میں جان باقی رہ سکتی ہے۔

ہماری نظر کے سامنے پرانے اور نئے فسانوں کی طرح طرح کے طرز موجود ہیں جن پر "نیچرل" (فطری) کا اطلاق نہیں ہوسکتا تاہم ان کی شہرت میں کلام نہیں اور وہ مقبول عام ہیں کیوں کہ پڑھنے والوں کا مذاق بلحاظ ان کی عمر و تعلیم و تربیت کے مختلف ہوا کرتا ہے اور لکھنے والا بھی عموماً اُسی کی پیروی کرتا ہے لیکن یاد رہے کہ ان میں سے اکثر کچھ دنوں کے بعد نابود ہوجائیں گے۔ بعض عجائبات میں سے شمار کیے جائیں گے اور شہرت دوام کا فخر اُسی کو حاصل ہوگا جس نے فطرت کو اپنا اُستاد مانا ہے اور صداقت و اصلیت کو اپنا شعار گردانا ہے۔

(۲)

ناول نویسی علم ادب کی ایک بڑی دشوار گزار اور کٹھن منزل ہے جس پر قدم رکھنے سے پہلے اپنے دماغ کی اعلیٰ سے اعلیٰ صفات سے کام لینا پڑتا ہے اور تخیل مشاہدہ مطالعہ و غور و فکر غرض کہ ہر قسم کی قوتوں سے زاد راہ طلب کرنی پڑتی ہے۔ پھر بھی اکثر اوقات دیکھا جاتا ہے کہ پورے طور سے حق ادا کرنا اور مقصود پر پہنچنا

مولی عقل و ذہن کے آدمی کے امکان سے باہر ہے۔ شاید ہی کوئی دوسرا مضمون ہو جس کے لئے اس قدر جستجو جانکاہی اور باریک بینی کی ضرورت ہوتی ہو۔ انشا پردازی کی شاید ہی کوئی ایسی صنف ہو جس میں مثل فسانہ نویسی کے سخن آفرینی، عبارت آرائی اور انداز بیان پر ادائے مطالب کا اس قدر دارومدار ہوتا ہو۔ یہ تمام باتیں نہایت ضروری ہیں۔ ان پر ہم ابھی بحث کریں گے لیکن اس سے پہلے ہمارا فرض ہی کہ فسانہ کی مختلف صورتوں پر ایک نظر ڈالیں اور اس کے رائج الوقت طرزوں کو جن میں "نیچرل" (فطری) اور "غیر نیچرل" (غیر فطری) دونوں شامل ہیں سرسری طور سے دیکھ جائیں۔

قصے و کہانیاں چھوٹے بچوں اور نوعمر لڑکیوں لڑکوں کے لئے اب بھی ایسی کتابوں کی ضرورت ہی جنھیں وہ خاص دلچسپی سے پڑھیں۔ اور چوں کہ اس عمر میں مادۂ فہم و ادراک کم ہوتا ہی اس لئے جنوں یا پریوں کی من گھڑت کہانیوں یا عجیب و غریب سیر و سیاحت کے قصوں سے خاص طور سے ذوق ہوتا ہی۔ اس قسم کے بعض فسانے بڑے پایہ کے موجود ہیں مثلاً الف لیلہ رابنسن کروسو (Robinson Crusoe) سیاحت گلیور (Gulivers Travels) وغیرہ یہ کتابیں ایسی مستند مان لی گئی ہیں کہ ان کا جواب ہونا اب ناممکن ہی اسی طرز پر موجودہ زمانے میں بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہی اور اب اس قدر فرسودہ ہو گیا ہی کہ اس میں کوئی نئی بات نکالنا غیر معمولی جدت کا کام معلوم ہوتا ہی۔

فوق العادت فسانے یہ ایک عجب طرز ہی جس کا مقصد شاید یہ ہو کہ مذاق طفلی معمر اور سمجھدار ہونے کے بعد بھی قایم رہی۔ یعنی محض لغو اور فرضی باتوں کو جو بالکل خلاف فطرت ہیں سچائی اور صداقت کا جامہ پہنا کر اس خوبی کے ساتھ پیش کیا جائے کہ اصل کا دھوکا ہو جائے رائڈر ہیگرڈ (Rider Haggard) کے مشہور فسانے اس کی خاص مثالیں ہیں۔

پُراسرار فسانے بعض لوگوں کو کسی ناول کے پڑھنے میں لطف ہی نہیں آتا جب تک کہ اس میں رازداری اور سراغ رسانی کی باتیں نہ ہوں جن کا افشا خاتمہ پر ہوتا ہو۔ اس قسم کے فسانے جو عموماً خیالی و طبع زاد ہیں یا تو مختصر ہوتے ہیں یا طویل بکثرت موجود ہیں جن میں ایمیلی گبراؤ (Emlee Gubrou) ولکی کالنس (Wilki Collins) ولیم لی کوئی (William Le Queu) اور کانن ڈائل (Canan Doyal)

کی تصانیف سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ آخر الذکر ایک بالکل ہی انوکھے طرز کا موجد ہے جس کی وقعت اس وجہ سے بڑھ گئی ہی کہ اس میں مشاہدات اور عقلی دلائل سے کام لیا گیا ہی۔

تاریخی فسانے ہمارے خیال میں اس سے زیادہ مشکل شاید ہی کوئی دوسرا مضمون ہو اور جس سے مصنف کی تحقیق جستجو، مطالعہ وتخیل کے اتنی بڑی آزمائش ہو سکتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخی ناول نسبتاً بہت کم لکھے گئے ہیں اور ان میں سے بھی صرف شاذونادر ہی مستند اور اعلیٰ درجہ کے تصور کئے جاتے ہیں۔ اس دشواری کے دو خاص سبب ہیں اوّل تو زمانہ ماضیہ سے اجنبیت دوسرے تاریخی مواد کی قلت۔ جن کی بھول بھلیوں میں پڑکر لکھنے والا بہت جلد حیران و پریشان ہو جاتا ہے اور قیاس وتخیل کے آسان راستہ کو اختیار کرکے منزل مقصود سے بہت دُور بھٹک جاتا ہی۔

ظاہر ہی کہ اپنے ہی زمانے اپنے ہی ملک بلکہ اپنے ہی شہر و محلہ کے حالات پر پوری واقفیت پانے کے لئے اتنی علم و فہم کی ضرورت ہی کہ معمولی سمجھ کا آدمی اگر کافی مشاہدے اور غور و فکر سے کام نہ لے تو ٹھیک جواب نہیں دیسکتا چہ جائیکہ گزشتہ زمانہ کے واقعات اور وہ بھی شاید ایک غیر ملک اور غیر قوم کے جس کی طرز معاشرت بود و باش وعادات میں آج کل سے زمین آسمان کا فرق ہوگا کیوں کر ممکن ہی کہ صحیح طور سے لکھے جا سکیں یا ان میں قیاسات و فرضیات کا دخل نہ ہونے پائے۔

اب اس کے ماخذ کو دیکھئے کہ اُس کے تین خاص ذرائع ہیں۔ کتب تاریخ وسیر، قلمی کتبے اور آثار قدیمہ۔ یہ تینوں عموماً ناکافی ثابت ہوتے ہیں کیوں کہ پہلے کو لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سوائے یورپین زبانوں کے کہ ان میں تو قدیم روم و یونان اور قرون متوسطہ کی طرز معاشرت اور دیگر تمدنی حالات کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہی۔ ایشیائی تاریخیں عموماً اس مضمون پر خاموش نظر آتی ہیں۔ اُن کے صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جایئے لیکن سوائے جنگ وجدال دیگر واقعات سلطنت کے لوگوں کے اندرونی حالات کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ البتہ بعض بعض جملے اور بیان ضمناً لکھدئے گئے ہیں جو اتفاق سے اگر ڈھونڈنے والے کی نظر پڑ گئے تو وہ اُنھیں کو بہت غنیمت سمجھکر فوراً قلم بند کر لیتا ہی۔

قلمی مکتوبات۔ تصاویر و مرقعجات سے بھی بہت مدد مل سکتی ہی لیکن یا تو یہ خاص لوگوں کے پاس ہیں یا

بڑے بڑے کتب خانوں میں محفوظ ہیں جہاں ہر کسی کا آسانی سے گزر نہیں ہو سکتا۔

مذکورۂ بالا دونوں ذرائع سے زیادہ بیش بہا اور مفید آثار قدیمہ ہیں کیوں کہ ان کے دیکھنے سے زمانہ گزشتہ کی عمارات اور روزمرہ کے استعمال کی ہزاروں چیزوں کا علم عینی اور فوراً حاصل ہو جاتا ہے جنھیں خواہ کوئی کتنا ہی لکھے اور بیان کرے لیکن بغیر دیکھے پورے طور سے ذہن میں نہیں آسکتیں۔ چنانچہ لارڈ لٹن Lord Lytton نے جب اپنے مشہور ناول پامپیائی (Pompeii) کے لکھنے کا ارادہ کیا تھا تو مہینوں اُس کے کھنڈروں میں پڑے ہوئے مطالعہ و مشاہدہ میں مشغول و مصروف رہے۔ مگر ہر شخص ایسا خوش قسمت نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ پامپیائی کے آثار ایسی عمدہ حالت میں کھود کر نکالے گئے ہیں کہ دوسری نظیر ملنا مشکل ہے۔ ان کے دیکھنے سے سلطنت روم کے باشندوں کی طرز معاشرت کے ایسے تفصیلی و جزئی حالات آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں کہ گویا ہم بھی اُسی زمانہ میں موجود ہیں۔ اب اگر ایشیا کو دیکھا جائے تو یہاں تو اور بھی زیادہ ذخیرہ موجود ہے بابل، اسیریا (موصل) مصر و ہند کے آثار قدیم تہذیب و تمدن کا ایک لاجواب مرقعہ پیش کرتے ہیں اور ان کے ٹوٹے ہوئے محلات کندہ کتبات اور اینٹوں پر لکھی ہوئی کتابیں اور دیگر استعمال کے اشیا، ہماری معلومات میں اس قدر اضافہ کرتی ہیں کہ کسی کتاب کے پڑھنے سے ممکن نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح عربوں کے تمدن کی یادگاریں تمام دُنیا میں پھیلی ہوئی ہیں اور شاہان مغلیہ کے زمانہ کے آثار ابھی تک دلی آگرے اور لاہور وغیرہ میں صحیح و سالم موجود ہیں جن کے مشاہدہ سے ایک سمجھنے والا بہت کچھ اُس زمانے کے بود و باش اور طرز زندگی کے حالات معلوم کر سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ تاریخی فسانہ نویسی جتنی مشکل ہے اتنی ہی زیادہ دلچسپ ہے۔ اس کا حق کچھ وہی شخص پورے طور سے ادا کر سکتا ہے جس کے پاس کافی وقت اور سرمایہ ہو اور ایسا شوق و ولولہ ہو کہ تمام عمر اُسی جستجو و تحقیق میں گزار دے۔

موجودہ طرز معاشرت کے فسانے

اس میں ہم اُن بے شمار اور مختلف النوع فسانوں کو شامل کرتے ہیں جن کا منشا یہ ہے کہ اپنے زمانہ کے قومی، ملکی، اخلاقی و معاشرتی حالات کو ایک دلچسپ طریقہ سے بیان کیا جائے اور ان پر بحث کی جائے۔

ان کی دو قسمیں کی جا سکتی ہیں (الف) خیالی و فرضی۔ قریباً نوّے فی صدی ناول جو آج کل لکھے جاتے ہیں

اسی زمرے میں ہیں۔ لیکن اس کے بھی کئی درجے ہو سکتے ہیں۔ سب سے اول وہ ہیں جو نہ صرف فرضی ہیں بلکہ ایسا معلوم بھی ہوتا ہے۔ بعد ازاں وہ جو اگرچہ فرضی ہیں مگر اس خوبی کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ یہ عیب بالکل چھپ گیا ہے یا وہ جس میں کسی واقعہ کو روایت غیر پر صحیح مان لیا گیا ہے مگر حقیقت میں وہ بہت کچھ غلط و مبالغہ آمیز ہے۔ اور سب سے آخر میں وہ جس کی بہت سی باتیں اصلی ہیں اور لکھنے والے کے زیر مشاہدہ آچکی ہیں مگر اُس نے کسی مصلحت سے جگہ جگہ تصرف کر کے اُن میں تغیر و تبدل کر دیا ہے۔

اس قسم کے تمام ناولوں کو بالکل ناقص و لغو خیال کر لینا سخت غلطی ہے اور ہمیں اعتراف ہے کہ بہت سے مشہور فسانے جن کا شمار اس میں ہو سکتا ہے آج بڑی مستند اور پایہ کی کتابیں مانی جاتی ہیں اور ان کی خوبی میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا نیز ان کے لکھنے والوں میں بعض ایسے لوگ گزرے ہیں جنھیں فطرت انسانی کے سمجھنے کا خداداد ملکہ تھا۔ وہ اپنے فن کے ماہر اور اُستاد تھے اور ان کے خیال و ذہن کی رسائی ایسی صحیح تھی کہ معمولی آدمیوں کے مشاہدات اس کے سامنے ہیچ ہیں۔

یہ سب کچھ صحیح مگر پھر بھی یہ ماننا پڑتا ہے کہ تاریخی حیثیت سے اور اس حیثیت سے کہ جو واقعہ لکھا جاوے وہ اپنے ہی مشاہدہ و تجربہ پر منحصر ہو یعنی مطابق اصول سائنس ہو اس طرز کا پایہ اُس سے گرا ہوا ہے جسے ہم اب بالتفصیل بیان کرتے ہیں۔

(ب) "نیچرل طرز" (پیروان فطرت) ارتقائے فسانہ نگاری میں ہم نے "نیچرل طرز" کو سب پر فوقیت دی ہے اور یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ اس کے موجد فرانسیسی تھے یعنی بالزک (Balzac) اور اسٹنڈ ہال (Stendhal) کو اولیت کا فخر ہے اور ان کے بعد جو سلسلہ نامور مصنفین کا اس طرز کا پیرو گزرا ہے اس میں فرانس میں گائی ڈموپاں (Guy de Maupassant) ڈاڈے (Daudet) زولا (Zola) اور انگلستان میں ڈکنس (Dickens) اور تھیکرے (Thackery) مشہور و معروف ہوئے ہیں۔

ان فسانہ نویسوں کا سب سے بڑا اصول یہ تھا کہ صرف انھیں واقعات کو قلم بند کرتے جو ان کے چشم دید ہوتے تھے اور صرف انھیں لوگوں کے حالات لکھتے جن کی زندگی کے مطالعہ کے ان کو خاص موقعے ملتے تھے اور اپنے وہم و خیال کو کم دخل دے کر زیادہ تر قوت مشاہدہ سے کام لیتے اور طبائع انسانی کی تشریح کو اپنا خاص فرض سمجھتے

اُنھیں اگر کسی پلاٹ (Plot) کی ضرورت ہوتی تو بجائے اس کے کہ کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھکر خیالات کی بلند پروازیاں کرتے۔ باہر نکل کر جاتے۔ اپنی گرد و پیش کے دنیا کو نظر غائر سے دیکھتے اور اپنے دوست واحباب عزیز و اقارب بلکہ خود اپنی زندگی سے سبق آموز ہوتے اور صحیح نتیجے نکالتے۔

یہ کام بادی النظر میں نہایت سہل و آسان معلوم ہوتا ہی مگر دراصل اس کے لئے ایک بہت بڑی قابلیت درکار ہی اور دماغ و ذہن کو خاص طور سے تربیت دینے کی ضرورت ہی کیوں کہ ہر کسی میں فطرت کے سمجھنے کا مادہ نہیں ہی اور حقیقت پر باخبر ہونے کا صحیح احساس بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ انسان کی طبیعت ایک عجب پُراسرار معمہ ہی اور تو اور وہ اکثر خود اپنے جذبات و خیالات کی تشریح نہیں کر سکتا اور بسا اوقات ان کے سمجھنے سے معذور و مجبور ہی کیوں کہ آدمی بقول غالب "بجائے خود ایک محشر خیال ہی"

اکثر لوگ ایسے ہیں جن کی آنکھوں پر تمام عمر پٹی بندھی رہتی ہے۔ ان کا تجربہ و مشاہدہ نہایت محدود رہتا ہی وہ دیکھتے ہیں مگر کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ سُنتے ہیں مگر کچھ سنائی نہیں دیتا اور اُس شخص کی طرح جس کی نگاہ بعض رنگوں کو نہیں دیکھ سکتی اُن کی بھی دل کی آنکھیں کور ہیں اور ادراک و فہم کے نور سے محروم ہیں۔

پیروانِ فطرت نے یہ ثابت کر دکھایا ہی کہ تخیل جو فسانہ نویسی کی ایک بڑی صفت سمجھا جاتا تھا حقیقت میں اس کے لئے چنداں ضروری نہیں ہی۔ لیکن اس میں ایک باریک نکتہ ہی، اگر تخیل سے یہ مطلب ہی کہ فرضی و قیاسی باتوں کو اصلیت پر ترجیح دی جائے تو بیشک وہ اس سے گریز کرتے ہیں لیکن اگر اُس سے قوت خالقہ و موجدہ مُراد ہی جو حقیقت کو اپنا صحیح لباس پہنا کر سامنے کھڑا کر دے تو اُس سے بھلا کوئی کیوں کر منکر ہو سکتا ہی اور بغیر اُس کی مدد کے کیوں کر قدم آگے بڑھ سکتا ہی۔ اگر اُس سے کام نہ لیا جائے تو اس قسم کی فسانہ نگاری اور ایک معمولی سیرت یا روزنامچہ میں کیا فرق ہوگا جس کی مثال ایک ایسی تصویر کی سی ہوگی جو صحیح تو ہے مگر قدرتی رنگ روپ سے خالی ہی یعنی ایک بیجان مرقعہ ہی جس کے مشاہدہ سے ہمارے محسوسات پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اس لئے اُس قوت سے ضرور مدد لینی پڑتی ہی اور فسانہ میں چند باتیں لازمی طور سے ایجاد طلب ہوتی ہیں مثلاً پلاٹ (Plot) کی ترتیب دہی کیرکٹروں (Characters) کا نشو و نما اور تکمیل لیکن ان سب کو اس خوبی کے ساتھ طرز بیان کے ذریعہ نباہا جاتا ہی کہ نفس فسانہ میں کوئی نقص نہیں آنے پاتا اور اس کی خصوصیت یعنی نیچرل (مطابق فطرت)

ہونے ہیں بالکل فرق نہیں آتا۔ اسے اس طرح سمجھنا چاہیئے کہ ایک ہوشیار کاریگر گلاس کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو مسالا لگا کر اس صنعت کے ساتھ جوڑ دے کہ نہ جوڑ کا پتہ لگے نہ مسالے کا۔ چنانچہ ایک قابل فسانہ نگار بھی منتشر واقعات کو باہم جمع کرنے کے لئے قیاس و تخیل کو کام میں لاتا ہے مگر بہت کم اور اس خوبی کے ساتھ اصلیت و حقیقت کے نیچے چھپا دیتا ہے کہ کہیں ان کا پتہ نہیں لگتا۔

"نیچرل طرز" پر ایک یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ مخرب اخلاق ہے اور زولا (Zola) وغیرہ نے آوارگی و عیاشی کے حالات بیان کر کے لوگوں کو بُری باتوں کی طرف مائل کر دیا ہے۔

اگر انصاف سے دیکھا جائے تو یہ الزام نہ صرف بیجا ہے بلکہ بے معنی ہے۔ کیوں کہ دنیا میں اچھے بُرے دونوں قسم کے لوگ ہوتے ہیں لکھنے والے کا فرض ہے کہ ان کے حالات کو بے کم و کاست اور بے رو رعایت پُورے طور سے بیان کر دے اور ان کے اصل جذبات کو ظاہر کرے اور ان کے افعال کو بھی ہُو بہُو لکھدے اور اپنے آپ کو ایک کاتب یا محرر کی طرح سمجھے جس کا کام رائے زنی کرنا نہیں ہے۔ وہ صرف واقعات کو قلمبند کرنے کے لئے مقرر کیا گیا ہے جنھیں پڑھکر نتیجے نکالنا یا فیصلے سُنانا صرف اُس عدالت کا کام ہے جسے رائے عامّہ کہتے ہیں۔

ایک ماہر سائنس جب کسی امر کی تحقیق کرتا ہے تو اپنے تجربوں اور عملیات کے دَوران میں کریہ و قبیح ہر قسم کی چیز کو چھوتا ہے اور کوئی فوری نتیجہ قایم کئے بغیر اُن کی تجزی و تشریح کر کے اپنے کُل واقعات کو ایک جا جمع کرتا ہے اور جس درجہ تک پُورا ثبوت بہم پہنچ گیا ہے اُس سے آگے نہیں بڑھتا ورنہ اس کے کام کی کوئی قدر نہ کیجائے گی۔ یہی اصول ایک "نیچرل" لکھنے والے کے بھی مدنظر ہے کہ صرف انھیں واقعات کو تحریر میں لاتا ہے جو اُس کے چشم دید ہیں اور اپنی ذاتی رائے و تعصب کو دخل دے کر ان کی وقعت نہیں گھٹانا چاہتا چنانچہ اس کی تصویر ایک اصلی اور سچّا مرقعہ ہوتی ہے جسے دیکھکر تماشائی خواہ کانپ اُٹھیں مُنہ بنائیں، مُسکرائیں یا کوئی سبق حاصل کریں۔ ان باتوں سے اُسے کچھ غرض نہیں اس کا جو فرض تھا یعنی حقیقت کی ترجمانی وہ اس نے پُورا کر دیا۔

بداخلاقی کا الزام دینے والے عموماً ایسے فسانوں کو پسند کرتے ہیں جن میں بُرائی کی مذمت اور نیکی کی تنا

وصفت ہو جو اکثر مبالغہ کے اس درجہ تک پہونچ جاتی ہو کہ ناظرین کے دل پر اس وعظ و پند کا اُلٹا اثر پڑتا ہے یا ان کی رائے میں اگر نیکی و بدی کو ایک ساتھ دکھایا جائے تو مصنف کو چاہیئے کہ اپنی پسندیدگی و نفرت و غصہ کا ضرور اظہار کرے یعنی خاتمہ پر بُرے آدمی کو اپنی مکافاتِ عمل کا ثمرہ چکھائے اور باایمان اور پاکباز کی فتح دکھائے یا سب سے بہتر یہ ہو کہ انسانی طبائع کے خراب پہلوؤں کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا جائے اور صرف اُس کی اچھی باتیں بیان کی جائیں۔

ظاہر ہو کہ یہ اصول کس قدر بعید از انصاف و خلاف فطرت ہو اور اگر پیروانِ فطرت اس قسم کی دروغ گوئی و ریاکاری کو بداخلاقی سے تعبیر کریں تو کچھ بیجا الزام نہ ہوگا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا میں کسی چیز کو کمال حاصل نہیں ہو۔ مجسم نیکی اور ایمان اسی طرح عنقا ہیں جس طرح کامل تندرستی و صحت جسمانی اور اچھے سے اچھے قلوب میں بھی شہوانیت و نفسانیت کے داغ اسی طرح پائے جاتے ہیں جس طرح جسم میں بیماری کے جراثیم۔ چنانچہ معمولی طبائع کا تو ذکر ہی کیا اچھے اچھوں کو بھی اگر کوئی غور سے دیکھے تو داغ کیا بڑے بڑے دھبے نظر آئیں گے۔ مگر ہمارے ناول نویس اب بھی بھولی بھالی لڑکیوں کو عفت و عصمت و نیکی کی دیویوں سے تشبیہ دیتے ہیں اور اپنے ہیرو (Hero) کو عاشقِ صادق و فاکیش اور بڑا جری اور سورما بتاتے ہیں جنھیں اگر اس دنیا میں چراغ لے کر بھی ڈھونڈھیے تو کہیں نہ ملیں گے۔ وہ ان کی صرف خیالی و فرضی تصویریں ہیں اور اُن کے عیوب پر عمداً یا سہواً یا اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے ایک پردہ ڈال دیا گیا ہو۔

اس قسم کے مصنوعی فسانے ایک لحاظ سے اور بھی معیوب بلکہ خطرناک ہیں یعنی وہ ہماری زندگی کا ایسا باطل خیال دماغوں میں قایم کر دیتے ہیں جس کا مٹانا مشکل ہو جاتا ہے اور جس کا اثر یقینی ہمارے اقوال و افعال پر بھی کچھ نہ کچھ پڑ کر انھیں راہ راست سے بھٹکا دیتا ہو یا یوں سمجھنا چاہیئے کہ آنکھوں پر ایک غلط عینک لگ جاتی ہو جس سے کوئی شے اپنی اصلی حالت میں نظر نہیں آتی اور ہماری دھوکہ دہی اور غلط فہمیوں کا باعث ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہو کہ شاید آج کل یورپ میں تصنع اور بناوٹ بہت زیادہ ہو اور ریاکاری اس کی تہذیب و تمدن کا

شعار بن گئی ہی کیوں کہ وہاں ایسے ناولوں اور ڈراماؤں کا بہت چرچا ہے۔ اور عوام الناس عموماً اس کو زیادہ شوق
سے پڑھتے اور دیکھتے ہیں جن میں ان کی مادی زندگی اور خوش آیند باتوں کا زیادہ تر ذکر ہوتا ہی۔

”نیچرل طرز“ ان عیوب سے پاک ہی۔ وہ ہماری زندگی کی ان سچّی باتوں کو جن سے ہمیں روزمرہ سابقہ پڑتا ہی
ظاہر و آشکارا کرتا ہے۔ وہ انسان کو اُس اوجِ کمال پر جس کا وہ مستحق نہیں ہی پہونچانے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ
اچھائیوں کا بھی ذکر کرتا ہی اور ساتھ ہی بُرائیوں کو بھی چھپانا نہیں چاہتا۔ مگر ان کو زیب و زینت دے کر خوشنما
و پسندیدہ بنانے کے بھی درپے نہیں ہی۔ اُس کا خاص منشا و مقصد یہ ہی کہ زندگی کے ہر پہلو کو دکھایا جائے
خواہ وہ احسن ہوں یا قبیح تلخ ہوں یا شیریں۔ ممدوح ہوں یا مذموم مگر صداقت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے
کیوں کہ اسی میں سب سے بڑی پند و نصیحت ہی جس سے استفادہ کے بغیر کوئی نہیں رہ سکتا۔

یہ نصیحت ناسمجھ بچّوں اور فاطر العقل آدمیوں کے لئے نہیں ہی بلکہ اُن ذی ہوش اور سمجھدار لوگوں کے
لئے جن کی روزمرہ کی زندگی صرف نیکی کے فرشتوں ہی کے ساتھ نہیں بسر ہوتی بلکہ دغابازی بے ایمانی۔
دھوکہ دہی۔ جرایم اور ہزاروں مختلف گناہوں کے نرغے میں پھنسی ہوئی ہی جن سے اپنے تئیں آزاد کرنے
والے شاید وہی شاذ و نادر لوگ ہوں گے جو عالم روحانیت میں پہونچکر دنیا مافیہا سے بے خبر ہو گئے ہیں۔

اگر عوام الناس اپنی سچی تصویروں کو اس آئینہ میں دیکھکر کوئی تنبیہ حاصل کریں اور اپنی اصلاح کے درپے
ہوں تو یہ انکا کام ہی۔ فسانہ نگار کو اس سے کچھ غرض نہیں۔ اس کی تسکین و تسلّی کے لئے صرف یہی بات کافی
ہی کہ فطرت انسانی کو جیسا اس نے پایا تھا ویسا ہی بے کم و کاست سامنے پیش کر دیا۔

پلاٹ اور کیرکٹر ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ناول کے پلاٹ (Plot) اور اس کے کیرکٹروں (Characters)
کے نشو و نما و تکمیل بھی ایک ضروری امر ہے اور فسانہ نگار کے کمال فن کا اسی سے پتہ لگتا ہی۔ اُس کی حالت بعینہ
ایک مصور کی سی ہے جو سب سے پہلے گرد و پیش کے مناظر حسب موقع و محل دکھاتا ہی پھر اپنی تصویروں کو ان کے
موافق حال ترتیب دیتا ہی۔ ان کی باہمی نسبت و تعلق کا اُسے بڑا خیال ہی یعنی جو سب سے پیچھے یا دُور کھڑے ہوئے
ہیں وہ آگے والوں سے زیادہ چھوٹے نظر آتے ہیں۔ نیز کسی کے تناسب اعضا میں فرق نہیں آنے دیتا اور

ہر ایک کے خط و خال و لباس وغیرہ کی باریکیاں ایسی تفصیل سے دکھاتا ہے اور ان میں ایسی خوبی کے ساتھ قدرتی رنگ بھرتا ہے کہ اصلیت سے سرِ مو فرق نہیں آنے دیتا۔ برعکس اس کے ہم بعض ناولوں میں یہ نقص پاتے ہیں کہ ان کے کیرکٹر نہ صرف ضرورت سے زیادہ بڑھ جاتے ہیں بلکہ آپس میں خلط ملط ہو جانے کی وجہ سے اُدھورے رہ جاتے ہیں اور لکھنے والا نہ ان کے خواص کو پورے طور سے واضح و آشکارا کرتا ہے نہ اُس کو شروع سے آخر تک اچھی طرح نباہتا ہے چنانچہ ایک دوسرے کے تناسب اور مجموعی تعلقات کا بھی زیادہ خیال نہیں رہتا۔ اور کبھی کبھی قدرتی مناظر کی اس قدر بھرمار ہو جاتی ہے کہ تمام کیرکٹر اس میں چھپ جاتے ہیں اور مقصد اصلی فوت ہو جاتا ہے۔

طرزِ بیان | جس طرح ایک مصوّر اپنی تصویر کے عیوب کو کوچی یا بُرش سے درست کر کے دُور کر دیتا ہے۔ فسانہ نویس کے پاس بھی ایک نہایت عمدہ آلہ موجود ہے یعنی اس کا قلم۔ اُس کا طرزِ بیان جس کے ذریعہ سے ناول کے کیرکٹروں میں جان پڑ جاتی ہے، وہ چلتے پھرتے نظر آنے لگتے ہیں جس کی مدد سے روزمرّہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے اور معمولی واقعات دلچسپ اور حیرت انگیز بن جاتے ہیں۔

طرزِ بیان، انشاء پردازی کی روحِ رواں ہے۔ وہ ایک خداداد ملکہ ہے جسے ہم چند خاص اصولوں میں محدود و مقید نہیں کر سکتے۔ اس لئے اس میں افراط و تفریط کی بڑی گنجایش ہے اور سنوارنے اور بگاڑنے دونوں کی استعداد موجود ہے۔ مگر جو ہنرمند اور ہوشیار ہیں وہ اس کی باریکیوں اور نکتوں سے خوب واقف ہیں اور اپنے کیرکٹروں کے انکشاف میں، جو ایک نہایت اہم کام ہے، پورے طور سے اُس سے مدد لیتے ہیں۔ یعنی بجائے اس کے کہ یہ انکشاف چند لفظوں میں ادا کر دیا جائے مثلاً یہ کہہ دیا جائے کہ فلاں شخص دغاباز اور کینہ پرور ہے خود پلاٹ کے اندر ایسے اتفاقات و واقعات لائے جاتے ہیں اور ایسے حرکات و اقوال دکھائے جاتے ہیں کہ بلا کسی قسم کی رائے زنی کئے شخص مذکور کی فطرت خود بخود واضح و آشکار ہو جاتی ہے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہیئے کہ کیرکٹروں کی تعریف و توضیح ان کے ماحول کے ذریعہ سے عمل میں لائی جاتی ہے اور غیر ضروری بیان سے حتی الامکان اجتناب کیا جاتا ہے۔

مذکورۂ بالا اصولوں کو مدِّ نظر رکھکر جب ہم مختلف قسم کے معمولی ناولوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ان میں چند بڑے بڑے نقص پاتے ہیں۔ یعنی بعض کا تو اندازِ بیان بالکل غلط و خلافِ فطرت ہوتا ہے بعض کا صحیح بھی ہے، مگر واقعات کا انتخاب درست نہیں ان کی موزونیت و تناسب کا غلط اندازہ کیا گیا ہے اور جگہ جگہ افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے۔

مثلاً ملاحظہ ہو (۱) کسی عمارت یا جگہہ کا ذکر کیا گیا ہے مگر اس قدر مشرح اور طویل کہ فسانہ کے مجموعی حالت کے لحاظ سے ناموزوں معلوم ہوتا ہی (۲) جذبات وخیالات کی تشریح کی گئی ہے مگر یا تو اس قدر زیادہ کہ تناسب باقی نہیں رہتا یا اس قدر کم کہ جس اثر کی ضرورت تھی مفقود معلوم ہوتا ہے (۳) مناظر قدرت کے بیان کو اس قدر زیادہ بڑھا دیا۔ گیا کہ کیرکٹر مدھم پڑ گئے۔ یہ ایک عام کمزوری دیکھی جاتی ہی جس کے شاید وہ لوگ زیادہ مرتکب ہوتے ہیں جو قدرت کے والہ وشیدا ہیں اور ایک خاص موقعہ پر پہنچکر اپنی طبیعت پر ضبط نہیں کر سکتے اور جو حالت اپنے دل پر طاری ہوتی ہی اُسے ظاہر کئے بغیر اُنھیں چین نہیں آتا۔ وہ اپنے محسوسات کو قلم بند کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اپنی نازک خیالیوں کے جوہر آبدار دکھاتے ہیں جو بذاتہ ہر طرح سے قابل داد وستایش ہیں مگر بے محل ہونے سے ان کی قدر وقیمت گھٹ جاتی ہی (۴) علاوہ مذکورۂ بالا دوسرے موقعوں پر بھی لکھنے والا اپنی ذاتی محسوسات وشاعرانہ جذبات کو بے ضرورت داخل کر دیتا ہی جس کا اثر پڑھنے والے پر خواہ کچھ ہی ہو لیکن اگر کیرکٹر کے اظہار و نمود کے لحاظ سے غیر ضروری ہی یا مبالغہ آمیز ہو کر ایک خاص حد سے متجاوز ہو گیا ہی تو ہمارے خیال کے مطابق نقص بیان کا باعث ہوگا۔

خصوصیت کلام | اس سے مراد وہ انشا پردازی نہیں جسے عمداً عجیب و بے قاعدہ بنانے کی کوشش کی گئی ہی اور اپنی قابلیت کا اظہار مقصود ہی۔ کیوں کہ کسی طرز کو انوکھا ہونے کی وجہ سے اختیار کرنا سخت غلطی ہی اور کامیابی کے لئے سدِ راہ ہی بلکہ ہمارا مطلب یہ ہی کہ لکھنے والا اپنی تحریر میں ایک خصوصیت ذاتی پیدا کرے اور جس پودے کو اُگا کر ہرا بھرا دیکھنا چاہتا ہی اُسے دوسروں پر نہ چھوڑے بلکہ خود اپنے خون جگر سے سینچے اور اپنے ہی دل و دماغ کو اس کے لئے صرف کرے۔

یہی وہ شئے ہے جس نے غالبؔ، میرؔ و سوداؔ جیسے بے مثل ادیب پیدا کئے اور ان کی غیر معمولی فہم و ذکا کا سکہ ہمارے دلوں پر ایسا بٹھا دیا کہ کبھی محو نہ ہو سکے گا۔ بعد ازاں بہت سے لکھنے والوں نے انھیں کا سا رنگ اختیار کیا اور شاید شعر بھی اچھے کہہ گئے مگر ان کے ناموں سے آج کوئی واقف تک نہیں اور وہ بہت جلد پردۂ گمنامی میں جا کر غائب ہو گئے۔

اگر شاعری کے لئے اس خصوصیت کو ضروری سمجھا جاتا ہی تو نثر پر بھی وہی بات صادق آتی ہی چنانچہ غالبؔ

سر سید، نذیر احمد، محمد حسین آزاد، ابوالکلام وغیرہ کا اپنا اپنا مخصوص طرز اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ غرض کہ کوئی طرز اختیار کیا جائے مگر لکھنے والے کو چاہیئے کہ نہ صرف جملوں کو ترتیب دے کر اپنا مطلب ادا کر دے۔ بلکہ اُس کے بیان میں ایک خاص قوت ہو، جوش و ولولہ ہو جس سے پڑھنے والوں کے دل ہل جائیں۔ ہر جملہ میں ایک رُوح جھلکی ہوئی ہو اور ہر لفظ سے ایک ایسی آواز نکلتی ہو جسے سنتے ہی لوگ سمجھ جائیں کہ کہاں سے آ رہی ہے۔ وہ ایک ایسا ترانہ ہو جس کے مسرت انگیز یا درد بھرے راگ نہ صرف اہل مجلس کو بیتاب کر دیں بلکہ مطربِ فسوں ساز کی سوزشِ نہاں سے بھی پوری خبر دیں ؎

اُس کے سخن میں ہمدم ایسی بھری تھی گرمی

دے دیتی جو خبر تھی اِک سوزشِ نہاں سے

ہم اکثر مصنفین کو دیکھتے ہیں کہ وہ ہر طرح سے لایق وفایق ہیں۔ ان کی تحریر قواعد وعروض کے لحاظ سے نہایت صحیح و درست ہوتی ہے۔ ان کے خیالات بھی پاکیزہ ہیں اور طبیعت بھی ایسی رواں پائی ہے کہ جملے پہ جملے بآسانی و بے تکان لکھتے چلے جاتے ہیں۔ غرض کہ ان کی نثر میں ہر طرح کی خوبی ہے مگر نہیں ہے تو وہی جسے ہماری آنکھیں ڈھونڈتی ہیں یعنی خصوصیت ذاتی۔ وجہ یہ ہے کہ ان کی طبیعتوں میں ایجاد کا مادہ کم ہے۔ دوسروں کو بلا سوچے سمجھے اُستاد مان لیتے ہیں اور ان کے کلام سے ایسے مرعوب ہو جاتے ہیں کہ خود اپنی ذات پر بھروسہ باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ جو طرز کہ مروّج زمانہ ومقبولِ عام ہوتا ہے اُسی کی اتباع کرنے لگتے ہیں۔ تصرّف ونقل کو کام میں لاتے ہیں اور رفتہ رفتہ دوسروں کے خوشہ چین وطفیلیے بن کر رہ جاتے ہیں اور باوجود دماغ پاشی وخامہ فرسائی کے کبھی ممتاز و نامآور نہیں ہو سکتے۔

زبان دانی انشاپردازی کے اس پہلو پر بحث کرتے ہوئے ہم سب سے پہلے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ فسانہ نویسی بھی فصاحت وبلاغت کی ایسی ہی محتاج ہے جیسے علم ادب کے اور دوسرے شعبے۔ مگر یاد رہے کہ صرف عبارت کی رنگینی اور مضمون آرائی سے کام نہیں چلتا۔ نازک خیالی بھی شرط ہے اور تحریر خواہ کیسی ہی سلیس وفصیح کیوں نہ ہو اگر معنی سے خالی ہے تو اُس کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جس کے چہرے پر رنگ و روغن لگا کر اور عمدہ لباس پہنا کر کھڑا کر دیا ہو مگر حقیقت میں مُردہ ہے۔

خیالات کو جس طرح ہم محسوس کرتے ہیں اُسی طرح لکھ دینا اور وہی کیفیت جو ہمارے دماغ میں موجزن تھی تحریر میں پیدا کر دینا نہایت ہی مشکل و دشوار امر ہے۔ ہر کوئی اس پر قادر نہیں۔ اس کے لئے بڑی زبان دانی اور خداداد قابلیت کی ضرورت ہے۔

موزوں الفاظ کا انتخاب، ان کی مناسب نشست و ترتیب، محاورات، استعارات و تشبیہات کا صحیح استعمال یہ تمام باتیں ایسی ہیں جن کی ذرا سی بھول چوک میں تمام اثر زائل اور مطلب خبط ہو جاتا ہے۔

یاد رہے کہ لفظوں کا بھی ایک خاص لہجہ ہوتا ہے۔ ان کو بلانا یا گونگا کر دینا لکھنے والے کے اختیار میں ہے۔ وہ اگر اپنے فن کا اُستاد ہے تو جس سین کو کھینچے گا اس کی عبارت بآواز بلند خود بول اُٹھے گی اور "سبزہ کی لہک، پھولوں کی مہک، غنچوں کی چٹک" (رائیس) اپنا اصلی سماں آنکھوں کے سامنے پیش کر دے گی۔ نیز یہ بھی خیال رہے مختلف مضامین کے لئے مختلف طرزِ عبارت مخصوص ہے۔ سائنس (Science) فلسفہ و تاریخ کا اپنا علیحدہ علیحدہ رنگ ہے جو ناول میں نہیں کھپ سکتا۔ اور اس کی بھی ٹریجڈی (Tragedy) کامیڈی (Comedy) اور تاریخی حیثیت سے متعدد قسمیں کی جا سکتی ہیں۔

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ جملوں اور الفاظ کی مناسبت و ترتیب فصاحت کے لئے کس قدر ضروری ہے لیکن برعکس اس کے آج کل کے اکثر ناول نویس اور مترجم جن کے خیالات و زبان پر انگریزی طرز کا بڑا غلبہ ہے جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو بالکل اُسی کا چربہ اپنی زبان میں اُتار کر اُس کی شکل بگاڑ دیتے ہیں۔ مثلاً ملاحظہ ہو "دور ہو۔ میری سامنے سے چلا جا" لڑکے نے کانپ کر تھرتھراتی ہوئی زبان سے کہا۔ اسی طرح اور بھی بکثرت مثالیں مل سکتی ہیں۔

صرف ایک موقعہ ہے جہاں ناول نویس کے لئے غیر فصیح ہونا روا رکھا گیا ہے یعنی جب وہ دوران مکالمہ میں اُن لوگوں کی زبان دکھانا چاہتا ہے جو جاہل و ناخواندہ ہیں یا کوئی خاص لہجہ استعمال کرتے ہیں۔ مگر یہ آزادی بھی اُسی حد تک ہے کہ پڑھنے والے کو سمجھنے میں دقت نہ ہو۔ نیز عورتوں اور بچوں کی زبان کا ایک جداگانہ انداز ہے جس سے شناسائی بہت ضروری ہے اور تاریخی کیریکٹروں کی تقریر و گفتگو ایسی نہ ہونی چاہیئے جیسی آج کل دہلی کے محلات یا لکھنؤ کے چانڈو خانوں میں مروّج ہے۔

محاورات کا جا و بیجا استعمال نہ صرف معیوب ہے بلکہ کاتب کی کمزوری پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح استعارات

وتشبیہات کو بھی بے ضرورت داخل کر دینا کلام کی وقعت کو گھٹا دیتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض فسانہ نویس جنھوں نے مناظرِ قدرت کو کبھی غور و فکر کے ساتھ مشاہدہ نہیں کیا ہے جب انھیں بیان کرتے ہیں تو شاعرانہ تشبیہات کو اس قدر دخل دیدیتے ہیں کہ پڑھنے والے کے علم میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور تحریر بھی بے اثر و مضحکہ انگیز ہو جاتی ہے۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ وہ دوسری کون سی صفت ہے جو مصنفین کی امتیاز و فوقیت کا باعث ہوتی ہے۔ وہ اُن کی طبیعت کی روانی و آمد ہے۔ یعنی دل و دماغ کے سرچشمہ سے الفاظ اُبلتے ہوئے چلے آئیں، اور خامہ کی زبان "منقار ہزار داستان" کی طرح چہکنے لگے۔ بخلاف اس کے اگر طبیعت پر زور دے کر بڑی دقت سے ایک ایک حرف نکلا ہے اور بار بار اُس کی کانٹ چھانٹ اور اصلاح کی گئی ہے اور اسی تکمیل کی اُدھیڑ بن میں سارا وقت صرف ہو گیا ہے تو عبارت تو بے نقص و صحیح ہو گی مگر کلام سے اُس کی رُوح غائب ہو جائے گی۔ پڑھنے والا اُسے حیرت و استعجاب سے تو دیکھے گا مگر اُس کے دل پر چوٹ نہ لگے گی۔ نقادِ سخن اُسے اپنی کسوٹی پر تو خالص پائے گا لیکن چمک دمک سے اُس کی آنکھیں خیرہ نہ ہوں گی۔ ایسا طرزِ بیان ممکن ہے کہ علوم و فنون۔ منطق و فلسفہ وغیرہ کی مجالس میں مقبول ہو لیکن ادب کے دربار میں تو کبھی اُسے حیات جاودانی کا خلعت نہیں بخشا جا سکتا کیوں کہ اُس میں وہ خصوصیت ذاتی مفقود ہے جو اس بخشش و انعام کی سب سے بڑی شرط مقرر کی گئی ہے۔

اس کے لئے ضروری ہے کہ لکھنے والے میں نہ صرف بصارت و بصیرت کا مادہ اور ذوقِ سلیم ہو۔ اس کے دل میں ایک شوق، جوش، ولولہ بھی ہونا چاہیئے بلکہ کلام اور سخن پر پورے طور سے قادر ہو اور زباندانی کے تمام گُروں سے واقف ہو۔ اس کی تصریح مزید کے لئے چاہیئے تھا کہ اردو زبان کے مشہور و معروف نثر لکھنے والوں کا کلام پیش کیا جاتا، اُس کا موازنہ و مقابلہ ہوتا اور اس کے حُسن و قبح پر بحث کی جاتی مگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ہمارے دائرۂ مضمون سے باہر ہے اس لئے صرف ناول نویسوں تک محدود رہیں گے اور پہلے مختصر طور سے غیر زبان والوں کا ذکر کر کے اپنے ملک کے نامور فسانہ نگاروں کی طرف متوجہ ہوں گے۔

(۳)

اساتذہ کے کلام پر تنقید و تقریظ کرنا آسان کام نہیں ہے۔ تنقید بجائے خود علم ادب کی ایک شاخ ہے جس پر قلم اُٹھانے سے پہلے خود بھی کچھ ماہر ہونا چاہیئے۔ ہم یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے اور بخوبی جانتے ہیں کہ

ہماری حالت ایک ایسے تماشائی کی سی ہے جسے خود تو مصوری نہیں آتی مگر مختلف تصویر خانوں میں جاکر اس نے اچھے بڑے اس کثرت سے مُرقعے دیکھ ڈالے ہیں کہ رائے زنی کا حوصلہ دل میں پیدا ہو گیا ہے۔

ممکن ہے کہ یہ خواہش قبل از وقت ہو اور ابھی پختگی و صلاحیت کے درجہ تک نہ پہنچی ہو۔ لیکن مضمون کی اہمیت اور اس کی طرف عام بے اعتنائی پر خیال کرکے باوجود اپنی کم مائگی کے اس ذمہ داری کو بخوشی قبول کیا جاتا ہے اور حتی الامکان انجام دینے کی کوشش کی جائے گی۔

سب سے بڑی دقت ناولوں کی لاتعداد کثرت ہے جنھیں صرف سرسری طور سے پڑھنے کے لئے بھی عمر نوح چاہیئے اب رہا انتخاب سو وہ بھی نہایت مشکل ہے دوسرے وہ مختلف زبانوں میں ہیں جن میں سے اکثر اجنبی ہیں اور ترجموں میں وہ بات نہیں۔ نہ ان کے پڑھنے سے طرز بیان کا وہ لطف جو اصل میں موجود ہے کبھی آسکتا ہے تیسرے اس قسم کے فسانوں میں مقامی خصوصیات وحالات اس قدر ہیں کہ غیر ملک کا پڑھنے والا زیادہ لطف نہیں اُٹھا سکتا تاہم باوجود ان باتوں کے اگر مذکورۂ بالا اصولوں کو مدنظر رکھیں تو ان کے حسن و قبح کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔
سب سے پہلے فرانسیسی فسانہ نگاروں سے شروع کرتے ہیں۔ کیوں کہ یہ اس فن میں اُستاد مانے گئے ہیں اور دوسری قوم کے آدمیوں سے گوئے سبقت لے گئے ہیں۔

فرانسیسی فسانہ نگار | وکٹر ہیوگو (Victor Hugo) اسے علم ادب کا سرتاج اور اُستاد سخن کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ فلسفی و شاعر دونوں تھا۔ اور نثر کے لکھنے میں بھی غیر معمولی قابلیت رکھتا تھا۔ اس کی تصنیفات جن میں فسانے بھی شامل ہیں بکثرت ہیں۔ فسانوں میں درد وغم، رنج و مصیبت کے حالات اس خوبی کے ساتھ لکھتے ہیں کہ بے اختیار دل پر چوٹ پڑتی ہے۔ جذبات انسانی کی تشریح میں اسے عجب کمال حاصل ہے خیالات و محسوسات کو اس خوبی کے ساتھ آشکارا کرتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اور طرز بیان ایسا پرجوش و پرفسوں ہے کہ پڑھنے والا مبہوت رہ جاتا ہے چنانچہ لے مزربل (Les Miserable) اور ناتردم دپیری (Nontre dam de Paris) اس کی تصدیق کے لئے کافی ہیں ہیوگو (Hugo) نے اکثر اپنے تخیل و ذہن سے کام لیا ہے اور "نیچرل طرز" کا پورا حامی نہیں معلوم ہوتا۔

الگزنڈر ڈوما (Alexander Dumas) اس نے بھی بکثرت ناول لکھے جن میں

تھری مسکیٹر (Three Muskiteers) اور مانٹی کرسٹو (Monti Cristo) سب سے زیادہ مقبول ہوئے ہیں۔ یہ عموماً تاریخی واقعات کو لیتا ہے اور رزم و بزم کے معرکوں حسن و عشق کے کرشموں اور پُر اسرار سازشوں کو اس دلچسپی کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ ایک مرتبہ لے کر پھر کتاب چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔

ڈوما کی قلم میں غضب کی روانی ہے۔ ایک دریا ہے کہ بہتا چلا جاتا ہے۔ طرز بیان نہایت مرغوب ہے۔ تصویریں باتیں کرتی اور چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ مگر جذبات وغیرہ کی زیادہ کاٹ چھانٹ نہیں کرتا اور فلسفیانہ غور و فکر کو کام میں نہیں لاتا۔

بالزک (Balzac) اس مشہور مصنف کو "نیچرل طرز" کا موجد خیال کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس نے اپنے زمانہ کے معاشرت کی بکثرت سچی تصویریں پیش کی ہیں اور ایک نئی بات فسانہ نگاری میں دکھائی جو اس سے قبل نہ تھی تاہم اس کی کتابیں زیادہ مقبول نہیں ہوئیں جس کی شاید یہ وجہ ہو کہ ہیوگو کے مقابلہ میں اس کا طرز بیان کسی قدر خشک و بے مزہ معلوم ہوتا ہے۔

گستاو فلابرٹ (Gustave Flaubert) یہ اگرچہ بالزک کا پیرو تھا مگر "نیچرل طرز" میں اس نے اپنی جادو بیانی سے ایک نئی رُوح پھونک دی اور یہ ثابت کر دکھایا کہ جس جوش و خروش کے ساتھ یونانی شاعر ہومر (Homer) نے اپنے دیوتاؤں کے حال لکھے ہیں، اگر کسی کے قلم میں زور ہے تو اسی طرح معمولی دیہاتیوں یا گنواروں کے حالات لکھکر دلوں کو ہلا سکتا ہے۔

اس کے مشہور ناول میڈم بووری (Madam Bovary) اور سلامبو (Salambo) ہیں پڑھکر دیکھ لیجئے اور انشا پردازی کے اعلیٰ صناعیوں اور کرشموں کا مشاہدہ کیجئے کہ جو لفظ نکلا ہے ایسا ڈھلا ہوا اور سڈول اور اس پر اس حسن و خوبی کے ساتھ جلا اور صیقل کی ہوئی کہ بے اختیار احسنت و آفریں کا نعرہ زبان سے نکل جاتا ہے۔

الفانسو ڈاڈے (Alphonsu Daudet) اس مشہور مصنف کا قاعدہ تھا کہ شام کے وقت گھر پہنچکر دن بھر کے واقعات جو اُس کو عجیب معلوم ہوتے قلم بند کر لیتا۔ اُس نے پہلے مختصر فسانوں سے شروع کیا اور فطرت انسانی کی نہایت صحیح تصویریں دکھائیں۔ اس کے کلام میں عجب روانی طرز بیان میں عجب حلاوت۔ دلفریبی

اور کشش ہی اسے رُلاتا بالکل نہیں آتا۔ اور جگہ جگہ ظرافت، شوخی، کنایہ و اشارہ میں طنز و طعنہ میں ایسی چٹکی لیتا ہے کہ طبیعت پھڑک جاتی ہی۔

گائی ڈی موپساں (Guy de Maupassant) یہ اگرچہ فلابرٹ کا شاگرد تھا مگر اپنے طرز میں نرالا نکلا۔ اُس نے اکثر مختصر فسانے لکھے اور انھیں میں کمال حاصل کیا۔ فطرت انسانی پر اسے بڑا عبور تھا۔ دیہاتی زندگی کے جو مرقعے اس نے کھینچے ہیں ان میں علاوہ دلفریبی اور سادگی کے ایک عجب صداقت معلوم ہوتی ہی اس کا کلام نہایت ستھرا۔ پاکیزہ و آورد سے پاک ہی۔ لیکن اُس کی تصانیف میں ہر جگہ مایوسی کی جھلک پائی جاتی ہی جو غالباً اس دماغی بیماری کا نتیجہ تھا جس میں آخر اُس نے جان دی۔

تھیوڈور گاتیر (Theodore Gautier) اس فسانہ نگار کا انداز بیان بھی نہایت درجہ دلکش و موثر ہی۔ اس کی نازک خیالیوں اور شاعرانہ خیالات نے نثر کا رنگ دوبالا کر دیا۔ اور ایک عجب شان خوبی اس میں پیدا کر دی۔

اس کے ناولوں میں مدمزل ڈموپن (Mdlle De Maupin) قابل ذکر ہے جو اگرچہ اخلاقی نقطہ خیال سے کسی قدر گرا ہوا ہی مگر مشہور و مقبول عام ہی۔

امیل زولا (Emili Zola) متاخرین میں یہ مصنف نہایت مشہور گزرا ہی۔ وہ ''نیچرل طرز'' کا بہت بڑا حامی تھا۔ اس کا کلام بھی نہایت پرجوش و موثر ہوتا ہی چنانچہ اُسے علم ادب کا شیر ببر کہتے تھے۔ اس نے بہت سے ناول لکھے ہیں جن میں نانا (Nana) روم (Rome) وڈرنک (Drink) قابل دید ہیں۔

جولس ورن (Jules Vern) اسے عجیب و غریب اور خیالی فسانوں کے لکھنے میں جنھیں بچے پڑھکر خوش ہوں کمال حاصل ہی۔ اس کے ناول چاند کا سفر تحت الثریٰ کی سیر وغیرہ بہت مقبول ہوئے ہیں۔ اسکی طبیعت میں عجب جدت اور تخیل میں بلا کی بلند پروازی ہی۔ طرز بیان بھی نہایت دلچسپ ہوتا ہی۔

امیلی گبراؤ (Emili Gabrau) اس کے فسانوں میں راز و اسرار جاسوسی و مخبری وغیرہ کا حال ہی۔ اور اس خاص مذاق کے پڑھنے والوں کے لئے بہت دلچسپ ہیں۔

اناتول فرانس (Anatole France) فرانس کے زندہ ناول نویسوں میں سب سے اعلیٰ درجہ رکھتا

ہی۔ اس کی انشا پردازی، سادگی، روانی، حسن و خوبی میں درجۂ کمال پر پہنچی ہوئی ہی۔ بیان اس کی ظرافت نہایت
لطیف اور اس کا بیان نہایت پاکیزہ ہی۔ وہ اس شان میں اپنا نظیر نہیں رکھتا اور تمام یورپ اُستاد مانا جاتا
ہی۔ وہ متشککین میں سے ہی اور اس کا فلسفہ شک ہی۔ اس کے ناول بہت مقبول ہوئے ہیں۔ اس کا علم و
فضل اس کی سادگی میں پوشیدہ ہی۔ اس نے چھوٹے چھوٹے فسانے بھی لکھے ہیں۔ اس نے اپنے بعض ناولوں میں
زمانۂ حال کے مسائل پر بھی بحث کی ہی مگر نہایت لطیف پیرایہ میں اور اپنے ذاتی خیالات فرضی کیرکٹروں
کے ذریعہ سے بڑی خوبی سے ظاہر کیے ہیں جس میں ڈراما کی جھلک آجاتی ہی۔ اس کے کیرکٹر انسانی نفسیات
کے غور و مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ اس کے مشہور ناول تھے (Thaïs) کرائم دی سلوسٹر بونارڈ
(Crime de Sylvestre Bonnard) وی دی جین دی آرک (Vie de Jeanne d'Arc)
وغیرہ ہیں۔ تھے میں اس نے بڑا کمال دکھایا ہی اور انسانی فطرت کے مطالعہ کا ایک عجیب مرقعہ ہی ایک
راہب جس کی تمام زندگی زہد و ورع میں گذری اسکندریہ کی ایک مشہور اور حسین بیسوا کو راہِ راست پر لاتا
ہی مگر آخر میں اپنی رُوح اس کے نذر کر دیتا ہی۔ بیسوا ولی کے رُتبہ تک پہنچ جاتی ہے اور یہ ولی (راہب)
بیسوا کے درجہ سے بھی گر جاتا ہی۔

پیرلوتی (Pierre Loti) یہ بھی فرانس کے زندہ اور نہایت نامور انشا پردازوں میں سے
ہی جس کی شہرت تمام عالم میں ہی۔ یہ اس کا اصل نام نہیں بلکہ علمی نام ہے۔ اس کی کتابیں اور ناول نیم فسانہ
اور نیم آپ بیتی (Biography) ہیں۔ اس کے طرزِ بیان میں موسیقیت اور خاص حسن پایا جاتا ہے
وہ جذبات و اثرات کے بیان میں کمال رکھتا ہی اور اُن کی تہ تک پہنچ جاتا ہے اور اس خوبی اور حسن کے ساتھ
ان کی توضیح کرتا ہی کہ یہ معلوم ہوتا ہی کہ خود ان میں جذب ہو گیا ہے اور جو چیز وہ بیان کرتا ہی اس کی ایسی
دلکش اور صحیح تصویر سامنے آجاتی ہی کہ ہر شخص مشاہدہ سے یہ بات حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ اکثر غیر ملکوں کے
متعلق لکھتا ہی۔ ترکوں سے اُسے خاص اُلفت ہی اور اُن کے تمدن و معاشرت سے خوب واقف ہی اس کا
ناول دِس ان چانتے (Desenchantees) ترکی معاشرت کی پیاری تصویر ہے۔ جاپان کے
متعلق اس کا فسانہ مدام کرِس ان تیم (Madame Chrysanthème) ہے۔ بات اس

ناول میں ذرا سی ہی مگر اُسے کچھ کا کچھ بنا دیا ہے۔ اس میں جاپانی معاشرت کے بعض پہلو بڑی خوبی سے نظر آتے ہیں۔ اس نے سفرنامے بھی لکھے ہیں جن میں ہندوستان اور مصر کے سفرنامے بہت مشہور ہیں۔ ان میں بعض مقامات اور حالات کے بیان بے انتہا دلکش اور محویت پیدا کرنے والے ہیں۔ ہندوستانی ناچ کا جو بیان اس نے لکھا ہی اُسے پڑھتے وقت انسان کو یہ معلوم ہوتا ہی کہ وہ کسی دوسرے عالم میں ہی۔ اُس نے اس ناچ کو ایک عجیب روحانی رنگ میں بیان کیا ہی۔

علاوہ مذکورۂ بالا فسانہ نگاروں کے اور بھی بہت سے مثل جارج سینڈ (George Sand) اسٹنڈہال (Stendhal) پال بورجت (Paul Bourget) گان کورٹ (Goncourt) لبلانک (Leblanc) یوجین سو (Eugene Sue) وغیرہ کے مشہور و نامور ہوئے ہیں جن کا حال یہاں طوالت کے خیال سے نظر انداز کر دیا گیا ہی۔

انگریزی فسانہ نگار | چارلس ڈکنس (Charles Dickens) انگریزی مصنفین میں اِس کا نام نامی ہمیشہ ممتاز رہی گا۔ اور اس کی تصانیف دائماً قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔ اُس نے فطرتِ انسانی کا خوب ہی مطالعہ کیا تھا اور حقیقت و اصلیت کے سمجھنے میں کمال کا ذہن رسا پایا تھا۔ چنانچہ جس کیرکٹر کو لیا اُس کو حیات جاودانی کا جامہ پہنا دیا۔ مسٹر پکوک (Mr. Pickwick) ہی کو دیکھئے کہ کون ان کے کارناموں سے واقف نہیں کون ان سے اتنا ہی شناسا و مانوس نہیں جتنا کہ کسی دوست یا عزیز سے ہو سکتا ہی۔ حق تو یہ ہے کہ ڈکنس کی خوبیاں لکھنے میں نہیں آسکتیں وہ کچھ اُس کے کتابوں ہی کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتی ہیں کہ کس قابلیت کے ساتھ اپنے پلاٹ (Plot) ترتیب دیتا و سنوارتا ہے۔ اپنے کیرکٹروں (Characters) کو اُبھارتا اور مکمل کرتا ہے اور ماحول کی تاثیرات کو دکھاتا ہے۔ اسی طرح اس کا طرز بیان بھی نرالا ہی۔ اس میں اک عجب روانی و دلکشی ہی اور ایسی شوخی و ظرافت ملی ہوئی ہی جس میں چھچھورا و سفلہ پن نام کو نہیں پایا جاتا۔ خاص کر غریب طبقہ کی معاشرت اور طرز زندگی کے بیان کرنے میں کمال رکھتا ہی۔ اس کے ناولوں کا ملک پر بڑا اثر ہوا اور بعض ناولوں نے معاشرت، تعلیم اور سیاسیات میں انقلاب پیدا کر دیا۔

تھیکرے (Thackery) بعض کا خیال ہی کہ یہ فسانہ نگار "نیچرل طرز" کا پیرو ہونے کے لحاظ سے

ڈکنس سے بھی ایک درجہ بڑھ گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے ناولوں میں خیالی و فرضی باتیں بہت کم ہیں۔ بلکہ ایک ایک واقعہ کو ایسی دقیقہ سنجی و دیدہ ریزی کے ساتھ بالتفصیل دکھایا گیا ہے کہ اُس زمانے کی معاشرت کی ایک بے مثل سچی تاریخ بن گئی ہے جسے ہم پڑھتے ہیں تو اپنے آپ کو تھوڑی دیر کے لئے اُسی زمانہ میں سمجھنے لگتے ہیں۔ قسم قسم کے لوگوں سے ملتے جلتے ان کی صحبت کے مزے لیتے ان کی خوشی و غم میں شریک ہوتے اور ان کی زندگی کی ذرا ذرا سی باتوں سے اس قدر واقف ہو جاتے ہیں کہ شاید اپنے سے بھی اتنا باخبر نہ ہوں۔

تھیکرے کا طرزِ بیان علاوہ دلچسپ ہونے کے ایک خصوصیت ذاتی رکھتا ہے۔ یعنی اُس کی ضخیم سے ضخیم کتابیں بھی پڑھتے چلے جائیے طبیعت کبھی نہیں اُکتاتی۔ اس کے ناولوں میں وینٹی فیر (Vanity Fair) نیوکمز (Newcomes) اور پنڈنس (Pendinnis) قابل دید ہیں۔ بخلاف ڈکنس کے اُمرا کی معاشرت اور طرزِ زندگی خوب بیان کرتا ہے۔ تھیکرے انشا پردازی کا بڑا اُستاد ہے اس میں اس فن کی تمام خوبیاں موجود ہیں سوائے اختصار کے۔ تھیکرے جہانیاں جہاں گشت معلوم ہوتا ہے اور ڈکنس لندن کا روڑا۔ تھیکرے زیادہ وسیع النظر ہے کیوں کہ وہ علاوہ ناول نگار ہونے کے مضمون نگار، نقاد مؤرخ اور شاعر بھی ہے۔ وہ بعض ایسے کیرکٹر پیدا کرتا ہے جو بالکل ڈکنس کے سے معلوم ہوتے ہیں مگر ان کا دائرہ محدود ہوتا ہے اور ڈکنس کی سی وسعت ان میں نہیں پائی جاتی۔ تھیکرے بعض دلچسپ مضامین پر کبھی کبھی لطیف تنقید کر دیتا ہے، حاشیہ چڑھاتا ہے اور کبھی پند و موعظت پر اُتر آتا ہے۔ اگر یہی مضمون ڈکنس کے ہاتھ میں ہوتا تو وہ ظرافت کے پھول برسا دیتا۔

سر والٹر اسکاٹ (Sir Walter Scott) یہ شاعر بھی تھا اور اُس نے اپنے ملک کی تاریخ پر فسانے بھی متعدد لکھے ہیں جن میں ٹالسمین (Talisman) اور آئی وِنہو (Ivenhoe) زیادہ مشہور و مقبول ہیں اوّل الذکر میں ضمناً سلطان صلاح الدین کا بھی ذکر آگیا ہے جس کی عالی حوصلگی کی داد دیتا ہے۔ لیکن اُس زمانہ کے عربوں کی طرزِ معاشرت سے نابلد ہے اسی طرح اپنے دوسرے ناولوں میں بھی اگرچہ روزمرّہ زندگی کسی قدر سرسری طور سے بیان کرتا ہے لیکن رزم و بزم اور حسن و عشق کی معرکہ آرائیوں کو

خوب ہی دلچسپ طریقہ سے لکھا ہے۔

جارج ایلیٹ (George Elliot) اس مصنفہ کے ناول بھی مقبول ہوئے ہیں۔ اس نے اپنے زمانہ کی معاشرت اور لوگوں کے جذبات وخیالات کا خوب اظہار کیا ہے۔ لیکن اکثر اس قدر طوالت سے کام لیا ہے کہ طبیعت اُکتا جاتی ہے۔ اس کے مشہور ناولوں میں آدم بیڈ (Adam Bede) وسائلس مارنر (Silas Marner) قابل ذکر ہیں اس کی نظر فلسفیانہ ہے۔

جین آسٹن (Jane Austin) اس عورت نے بھی بعض ناول بڑی قابلیت کے ساتھ لکھے ہیں منجملہ ان کے پرائڈ اینڈ پرجڈس (Pride and Prejudice) اور سنس وسنسبلٹی (Sense and Sensibility) مستند کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ خیالات پاکیزہ ہیں اور طرز بیاں بھی دلچسپ اور سادہ ہے۔

بلورلٹن (Bulwar Lytton) یہ اگر صرف لاسٹ ڈیز آف پامپیائی (Last days of Pompeii) لکھکر مرجاتا تو بھی اس کا نام نامی ہمیشہ روشن رہتا۔ کیوں کہ اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی ناول واقعی کس طرح لکھنا چاہیئے۔ ہزاروں برس قبل کی تہذیب وتمدن، اہل پوپیائی کی بود وباش کے طریقے ان کے مکانات، عبادت گاہیں، تھیٹر، حمام وغیرہ کا اس تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور ان کے لباس طرز گفتگو ودیگر عادات وخصائل ایسی باریکی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ وہ زمانہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے اور تاریخ قدیم کی بوسیدہ ہڈ[یوں میں] جان پڑجاتی ہے۔ لٹن کے اور دوسرے ناول بھی نہایت دلچسپ ہیں اور اس کا طرزبیان بھی مرغوب وپسند[یدہ او]ر شاندار و پُرشکوہ ہے۔

رابرٹ لوئس (Robert Loius Stevenson) اس نے اپنی کتاب ڈاکٹر جیکل (Jekyll) [اور مسٹر ہائی]ڈ (Mr. Hyde) میں نفس امارہ ولوامہ کے جد وجہد کو فسانہ کے پیرایہ میں خوب دکھایا ہے۔ [اس کی تص]نیفات بھی بہت مقبول ہوئیں۔ طرزبیان کی روانی وسلاست نہایت دلپذیر ہے۔

کنگ[سلے (Kings]ley) یہ بھی ایک مشہور فسانہ نویس گزرا ہے۔ اس نے متعدد ناول لکھے ہیں جن میں ہی[رورڈ دی ویک (Hereward the Wa]ke) جو تاریخی ہے اور ویسٹ ورڈ ہو (Westward Ho) زیادہ تر

مشہور ہیں۔ بیان میں کسی قدر ثقل ہے اور اکثر غیر ضروری طوالت سے کام لیتا ہے۔

ولکی کالنس (Wilkie Collins) اس فسانہ نگار کو عجیب و غریب دلچسپ واقعات کے لکھنے اور انھیں سچا بتا کر دکھانے میں ایک خاص ملکہ حاصل ہے اُس کا ناول وی وومین اِن وہائٹ (The Woman in white) قابل دید ہے۔

جوزف رینالڈ (Joseph Reynold) تعجب ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلے جس غیر زبان کے مصنف کے ناول مقبول ہوئے وہ یہی ہے۔ اُس کی کتاب مسٹریز آف دی کورٹ آف لنڈن (Mysteies of the Court of London) کا ترجمہ جو نہایت ناقص و ردی تھا ہاتھوں ہاتھ بکا۔ اس فسانہ میں جارج چہارم اور دیگر عیش پسند امرا کے حالات کی خوب پردہ دری کی گئی ہے۔ معلوم نہیں کہ وہ کہاں تک صحیح ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ مخرب اخلاق اور نوجوانوں کی طبیعتوں پر خراب اثر ڈالنے والے ہیں۔ رینالڈ کا طرز بیان رنگین و دلپذیر ہے تاہم ضرورت سے زیادہ مبالغہ آمیز ہونے کی وجہ سے اعلیٰ معیار ادب سے گرا ہوا ہے۔ وہ اپنے تخیل کو بہت کام میں لاتا ہے اور ذاتی محسوسات و تعصبات کو دخل دے کر مشاہدہ سے زیادہ فائدہ نہیں اُٹھاتا۔

کانن ڈائل (Canon Doyle) موجودہ زمانہ کے ناول نویسوں میں اس کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ کیوں کہ اس نے ایک نیا طرز ایجاد کیا اور سراغ رسانی کے فسانوں [illegible] سائنس کے دائرہ میں لے آیا ہے۔ یعنی رازوں کے انکشاف میں اُن دلائل عقلی سے کام لیا ہے جن کی بنیاد مطال[illegible]ت انسانی و مشاہدات و نظریات پر قایم ہے چنانچہ اسی وجہ سے شرلاک ہومس ([illegible] Holmes [illegible]) کو اب ایسی شہرت دائمی حاصل ہو گئی ہے کہ شاید ہی کسی دوسرے ناول کے کیرکٹر ([illegible]) کو نصیب ہوئی ہوگی۔

حال میں کانن ڈائل نے ایک جدا رنگ اختیار کیا ہے یعنی روحانیت [illegible] کے بعد آنے والی زندگی کے ثبوت میں عجیب و غریب حالات لکھتا ہے اور لکچر دیتا پھرتا ہے۔

ایچ۔ جی۔ ولس (H. G. Wells) ممکن ہے کہ ناول نویسی کا آ[illegible] [illegible]ل کی صورت

ہیں ہو۔ جس کا ثبوت اس مصنف کے ناول وار ان دی ایر (War in the air) سے ہم پہنچا ہی جو اس نے قبل از جنگ یورپ لکھا تھا اور اُس میں طیاروں کی ہوا میں لڑائی کا حال بیان کیا تھا۔ تعجب ہی کہ بہت سی باتیں اس کی صحیح نکلیں۔ اس نے اسی طرح کے اور بھی چند فرضی ناول مثل مین ان دی مون (Man in the Moon) دی انوِسبل مین (The invisible man) دی سلیپر اویکس (The Sleeper awakes) وغیرہ لکھے جو نہایت عجیب وغریب ناممکنات سے بھرے ہوئے ہیں اور حد درجہ دلچسپ ہیں ولس نے جمہوریت ومعاشرت پر بھی متعدد ناول لکھے ہیں جن سے اس کی وسعت خیال، غور وفکر وعام انسانی ہمدردی کا پتہ لگتا ہے۔

ہال کین (Hall Caine) اس کے ناول بانڈمین (Bondman) اور وہائٹ پرافٹ (White Prophet) مشہور ہیں اور ڈراما (Drama) کی صورت میں بھی اسٹیج (Stage) اچھے ہیں۔ طرز بیان نہایت پرجوش وموثر ہے اور پلاٹ میں اصلی وفرضی دونوں قسم کی باتیں ملی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

رائڈر ہیگرڈ (Rider Haggurd) اس کے تمام فسانوں کا رنگ یکساں ہے۔ واقعات جن میں روحانیت وتناسخ کی جھلک پائی جاتی ہی، نہایت عجیب، خیالی اور من گڑھت ہوتے ہیں جن میں سچائی نام تک کو نہیں مگر اس خوبی وقابلیت کے ساتھ اصلیت کا رنگ ان پر چڑھایا گیا ہی کہ بچے تو بچے سمجھدار لوگ بھی ایک مرتبہ دھوکے میں آجائیں۔ اس کے مشہور ناولوں میں شی (She) کلیوپیٹرا (Cleopatra) منٹزیماز ڈاٹر (Montazimas daughter) وغیرہ ہیں۔

بیری پین (Barry Pain) یہ فسانہ نگار بھی مشہور ہی۔ ڈراما بھی لکھتا ہے۔ طرز بیان دلچسپ خیالات شستہ اور زبان نہایت فصیح ہی۔

اسٹینلے ویمن (Stanley Weyman) اس کے فسانوں کا بھی انداز یکساں ہوتا ہی۔ ہیرو عموماً ایک اُدھیڑ عمر کا باوقعت وباوقار شخص ہی جس کی معشوقہ پہلے اس سے سخت نفرت واکراہ کا اظہار کرتی ہی لیکن بعد میں اس کی مردانگی، ایثار اور دوسری عمدہ خصلتوں کو دیکھکر خود فریفتہ وشیدا ہو کر محبت کا دم بھرنے لگتی ہے۔

کاؤنٹ ہینیبال (Count Hannibal) اور جنٹلمین آف فرانس میں (Gentleman of France)
اس کو نہایت خوبی و دلچسپی کے ساتھ دکھایا ہی۔

سیٹن میریمان (Seton Merriman) اس کے فسانوں میں سوئرس (Sowers)
جس میں روس کے حالات لکھے ہیں زیادہ دلچسپ ہی۔ اس مصنف کی عادت ہی کہ جگہہ جگہہ حسب حال اپنے
خیالات و مشاہدات کا بھی مقولوں کی صورت میں اظہار کرتا جاتا ہی جو عموماً نہایت سنجیدہ و فلسفیانہ ہوتے ہیں۔

میری کورولی (Marie Corillie) اس عورت کے فسانے بھی خاص مذاق کے لوگوں
میں نہایت مقبول ہوئے ہیں۔ اس کا طرز بیان نہایت پُر شوکت و لطیف ہی۔ خیالات کی بلند پروازی قابل داد
ہی مگر بعض وقت حد سے گزر کر اور روحانیت کا رنگ اختیار کرکے مبالغہ آمیز و مصنوعی معلوم ہونے لگتی ہی
اس کے مشہور ناولوں میں مائٹی ایٹم (Mighty Atom) زسکا (Ziska) اور سوروز آف سیٹن
(Sorrows of Satan) وغیرہ ہیں۔

بیرنس ارکزی (Baroness Orczy) اس عورت کی شہرت اسکارلٹ پمپرنل
(Scarlet Pimpernel) کے لکھنے سے ہوئی جس میں زمانہ انقلاب فرانس میں ایک انگریزی امیر
کے کارہائے نمایاں کا ذکر ہی کہ کس طرح اپنے کو خطرہ میں ڈال کر اس نے بہت سے شرفائے فرانس کی
جانیں بچائیں۔

مارک ٹوین (Mark Twain) یہ امریکا کا ایک نہایت مشہور و معروف فسانہ نگار گزرا
ہی جس کا انداز بیان حد درجہ شوخ اور مضحکہ انگیز ہی اور نہایت مقبول عام ہوا ہے۔ انوسنٹس ابراڈ
(Innocents abroad) و جمپنگ فراگ (Jumping Frog) اس کی خاص مثالیں ہیں۔

روڈیارڈ کپلنگ (Rudyard Kipling) یہ شاعر و فسانہ نویس دونوں ہی۔ چوں کہ طبیعت
میں بڑی جدت اور بیان میں شوخی و انوکھا پن ہی اس لئے اس کی تصنیفات بہت مقبول ہوئیں۔ یہ ایک
عرصہ تک لاہور میں رہ چکا ہی اور کم (Kim) جو اس کا مشہور ناول ہی اس میں پنجاب کی معاشرت کا
خاص طور سے ذکر کیا گیا ہی۔ ہندوستانیوں کو چوں کہ ذرہ صاحبیت کی نگاہ سے دیکھتا ہی اس لئے ان کے

سچے حالات نہیں لکھ سکتا۔ اس کی اکثر غزلیں اور اشعار نہایت اچھے و عامیانہ ہیں اور ایسی ہی مذاق کے لوگوں کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔

فلارنس سٹیل (Florence Steel) یہ ایک لیڈی ہی جو شاید کبھی ہندوستان میں رہ چکی ہی اور اب بہت کچھ غور و مطالعہ کے بعد اس ملک کے متعلق فسانے لکھتی ہے جن کا پلاٹ اور طرز بیان تو عموماً ضرور دلکش ہوتا ہی مگر معاشرت کی صحیح تصویر نظر نہیں آتی۔

اس نے ایک تاریخی ناول موسوم مسٹرس آف مین (Mistress of Man) لکھا ہی جس میں جہانگیر و نورجہاں بیگم کی زندگی کے حالات نہایت دلچسپ طریقہ سے دکھائے ہیں۔

میڈوز ٹیلر (Meadows Taylor) ہندوستان کی طرز معاشرت پر بہت سے انگریز مصنفین نے قلم اُٹھایا ہی مگر افسوس ہے کہ تعصب کو دخل دے کر غلط تصویریں کھینچتے ہیں اور سب پر اپنی ہی کو بالا سمجھتے ہیں۔ مگر ٹیلر کے فسانوں میں یہ بات بہت کم ہی۔ وہ ایک عرصہ تک دکن میں رہا تھا۔ وہاں کے مقامات و لوگوں کے حالات سے خوب واقف ہی اور جو کچھ لکھتا ہے زیادہ تر صحیح لکھتا ہی۔ ٹھگ (Thug) سیتا (Seeta) نوبل کوئن (Noble Queen) اس کی تصانیف کی عمدہ مثالیں ہیں۔

مارماڈیوک پکتھال (Marmaduke Pickthal) یہ نومسلم انگریز مصنف آج کل کے مشہور ادیبوں میں سے ہی۔ عربوں و مصریوں کی معاشرت پر خوب لکھا ہی اس کے ناول نائٹ آف اربی (Knights of Araby) سعید دی فشرمین (Said the Fisherman) قابل دید ہیں۔

علاوہ مذکورۂ بالا کے بکثرت اور بھی ناول نویس ہیں مثل ولیم لی کوئی (William Le Queu) فلپ اوپنہن (Philip Oppenheim) میسن (Mason) وغیرہ وغیرہ جن کے فسانے مختلف مذاق کے لوگوں میں بہت زیادہ مقبول ہوئے ہیں۔ اور انھوں نے اپنے ملک کی اخلاقی۔ قومی۔ معاشرتی و دیگر مسائل پر خوب بحث کی ہی اور ایک بے شمار ذخیرہ چھوڑا ہی جس کا ذکر یہاں خالی از طوالت نہ ہوگا۔

دیگر یوروپین فسانہ نویس | افسوس ہی کہ ہمیں جرمن۔ اسٹرین و روسی[1] ناول نویسوں کا بہت کم تجربہ ہی البتہ

[1] افسوس کہ فاضل مضمون نگار روسی ناول نویسوں کے متعلق کچھ نہیں لکھ سکے اور مضمون کا یہ حصہ تشنہ رہ گیا۔ حالانکہ روسی علم ادب جس قدر

(بقیہ بر صفحۂ آئندہ)

لوئی ٹالسٹائی (Louis Tolstoy) کے چند ناولوں کے ترجمے انگریزی زبان میں دیکھے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہی کہ وہ کس بڑے پایہ کا مصنف ہی اور اپنے ملک کی معاشرت کے کیسے سچّے حالات لکھتا ہی۔ علاوہ بریں ٹالسٹائی ایک اتنا بڑا فلسفی، مدبّر، مصلح قوم وصوفی گزرا ہی جس کی مثال شاید ہی مشکل سے مل سکتی ہی۔ اس نے بکثرت کتابیں لکھی ہیں جو بڑی قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ اس نے اپنے خیالات سے نہ صرف اپنے ملک اور یورپ پر بلکہ تمام دُنیا پر اثر ڈالا ہی۔

ایشیائی ناول نویس | چینی، جاپانی، ایرانی، عرب، مصری وترکی ادیبوں نے بھی فسانے لکھے ہیں جنھیں پڑھنے کا ہمیں زیادہ اتفاق نہیں ہوا۔ البتہ جرجی زیدان کی تاریخی ناولوں کے چند ترجمے نگاہ سے گزری ہیں جن سے معلوم ہوتا ہی کہ اُس نے کسی قدر تعصّب سے کام لیا ہی اور قدیم عربوں کی معاشرت کو ایسی اچھّی طرح نہیں دکھایا جیسا چاہیئے تھا۔

ہندوستانی ناول نویس | یوروپین فسانہ نگاروں کے سامنے جب ہم اپنے ملک کے مصنفین کو لاتے ہیں اور دونوں کا مقابلہ کرتے ہیں تو زمین آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہی اور اُستاد وطفل مکتب کی مثال صادق آتی ہی۔ اس پر غور کیجئے تو کئی وجوہ معلوم ہوں گے۔ اوّل تو اس سے انکار کرنا مشکل ہی کہ بہ نسبت یوروپین کے ایشیائی طبائع زیادہ اوہام پرست ہیں اور فوق العادت قصّہ کہانیوں کے زیادہ شایق ہیں چنانچہ باوجود اس قدر تعلیم وغیرہ کے اب بھی ہمارے ہاں ایک بہت بڑا گروہ سمجھدار و سن رسیدہ لوگوں کا ہی جسے طلسم ہوشربا، فسانہ عجائب جیسی کتابوں کے پڑھنے میں کہیں زیادہ لطف آتا ہی۔ ان کا حال یہ ہی کہ گزشتہ نصف صدی میں علم وادب کی دنیا بہت کچھ بدل گئی مگر یہ ابھی تک اُسی زمانہ کے مزے لے رہی ہیں۔ شاعری و نثر کا ایک نیا دَور دَورہ شروع ہوگیا ہی مگر یہ ابھی تک گل وبلبل ہی کے خیال میں مست ہیں اور بظاہر ان کے فکر و ذہن کو تعصّبات باطلہ نے اس قدر زنگ آلود کر دیا ہی اور قدامت پرستی کا اس قدر غلبہ ہی کہ ان دونوں مصیبتوں سے نجات پانا آسان نہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۶۱) اہلِ ہند کے لئے سبق آموز ہی کسی دوسرے ملک کا نہیں۔ ناول نویسی کا بیان ہو اور اُس میں ڈاسٹوسکی کا ذکر نہ ہو معصیت سے کم نہیں۔ ہم آیندہ ایک بسیط مضمون روسی علم ادب اور اس کے اثر پر شائع کریں گے جس سے اس کمی کی تلافی ہوجائے گی (اڈیٹر)

اب رہا وہ گروہ جس نے مغربی چشمۂ علم سے اپنی تشنگی بجھائی ہو اس کی حالت اور بھی ناگفتہ بہ ہو یعنی بجائے قدامت پرستی کے غیر زبان نے اُسے ایسا اپنا بندۂ بے زر بنا لیا ہو کہ اپنے ملکی علوم و فنون کی وقعت دل سے غائب ہوگئی اور اپنی مادری زبان کے مطالعہ و کتب بینی کو کسر شان سمجھنے لگا۔

ابھی وہ زمانہ زیادہ نہیں گزرا ہو جب ہم دیکھتے تھے کہ خاص کر لکھنؤ و دہلی میں اُردو علم ادب کے ذوق و شوق کا کیا عالم تھا۔ عوام کے دلوں میں اپنی زبان کی ایسی محبت و عزت تھی کہ کسی مشہور شاعر یا مرثیہ خوان کا اتفاق سے گزر ہوتا تو اُسے ہاتھوں ہاتھ لیتے اور تمام شہر میں ایک تہلکہ سا مچ جاتا یا اب یہ حال ہو کہ کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی اور بڑے بڑے قابل اور ہونہار لکھنے والے حالت گمنامی میں دل مسوس کر بیٹھ جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں قابل ولایق مصنفین کے نہ پیدا ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ بدقسمتی سے سچی ہمت افزائی مفقود ہو اور عوام اس کے مفہوم کو وہی سمجھے ہوئے ہیں جو سو برس پہلے سمجھتے تھے یعنی واہ واہ "کیا کہنا" کے نعرے مار کر اپنے فرض سے سستے چھوٹ جانا۔ مگر اُس کلام کے خریدنے کے لئے ایک دمڑی بھی جیب سے نہ نکالنا۔ اُنھیں یہ خبر نہیں کہ پُرانے زمانہ میں امیروں اور نوابوں کی فیاضیاں مصنف کو عوام کی امداد سے مستغنی کر دیتی تھیں درانحالیکہ اب کیفیت دگرگوں ہو۔ ہر ایک کو قدرتاً اپنی روزی کی فکر سب سے پہلے ہو اور جب تک اس کی طرف سے یکسوئی نہ ہولے وہ کیوں کر اپنی تمام عمر پورے جوش و شوق کے ساتھ ایک ایسے شغل کے لئے صرف کر سکتا ہو جس میں منفعت کی اُمید بہت کم ہو۔ اس کا بڑا ثبوت یہ ہو کہ آج کل لاکھوں آدمی اُردو زبان میں لکھنا پڑھنا جانتے ہیں لیکن ابھی تک کوئی ایسی کتاب یا رسالہ طبع نہیں ہوا ہو جن کی فروخت کم از کم دس ہی ہزار تک پہنچی ہو اور متعدد بار طبع ہوا ہو۔

اصل یہ ہو کہ پبلک حد درجہ لاپرواہ مفت خور، ناقدری اور اس شعر پر عامل ہے ؎

گر جاں طلبی مضائقہ نیست

ور زر طلبی سخن درین ست

اُس کا مذاق بہت زیادہ گر گیا۔ اس کے دل سے اپنی زبان کی خوبی و قدر و قیمت کا احساس غائب ہو گیا ہو۔ کم دام دیتی ہو تو گھٹیا چیز تبادلہ میں ملتی ہے جس سے مذاق اور بگڑتا ہو اور اس بگڑنے کا اثر پھر پلٹ کر مصنف کے

دماغ پر پڑتا ہی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں ایک دائرہ خبیثہ کے اندر بند ٹکریں لگا رہے ہیں اور ایک دوسرے کو رہائی پانے کا موقع نہیں دے سکتے۔

ہماری طرز معاشرت بھی قابل الزام ہی کیوں کہ جس طرح ہمیں تفریحات جسمانی کا بہت کم شوق و ذوق ہی باغات و دریا بکثرت موجود ہیں لیکن بہت کم لوگ ان کی سیر کو نکلتے ہیں اسی طرح تفریحات دماغی کی طرف سے بھی ایک عام بے پروائی ہی اور اکثر حضرات بجائے اس کے کہ اپنے اوقات بیکاری میں کوئی اخبار یا مفید کتاب پڑھیں۔ یوں ہی فضول گپ شپ میں یا ہاتھ پہ ہاتھ رکھے اُسے کاٹ دیتے ہیں۔

مصنفین کا لایق و قابل نہ ہونا بہت کچھ موجودہ تعلیم کی خرابی پر بھی منحصر ہی۔ کیوں کہ اُسے سچے شوق و محبت کے ساتھ حاصل نہیں کیا جاتا بلکہ مقصد کچھ اور ہی ہے اور بہت ذلیل ہی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جستجو اور تفتیش کا مادہ بہت کم پیدا ہوتا ہی۔ اور ایسا شخص جب کچھ لکھنے بیٹھتا ہی تو لامحالہ اُس کی تحریر بھی باریک بینی سے خالی ہوتی ہی اور اپنی علمی کم مائگی کو لفاظیوں اور عبارت کی رنگینی میں چھپانے کی کوشش کرتا ہی۔ علاوہ اس کے موجودہ تعلیم میں قیاسی و خیالی علوم کا بہ نسبت اُن کے جو مشاہدات پر مبنی ہیں بہت زیادہ حصہ ہے۔ اس لئے اس قوت میں کمی رہجاتی ہی جس کا خراب اثر نہ صرف تصنیفات پر پڑتا ہی بلکہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی ترقی کا سد راہ ہوتا رہتا ہی۔

ہماری زبان کی ناداری و کم مائگی کا ایک بڑا سبب یہی ہی کہ بہت کم لوگ سچے دل سے اُس کے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ غیر زبانوں کا مطالعہ تو بڑی محنت کے ساتھ کیا جاتا ہی مگر اپنی مادری زبان کو شاید بہت آسان اور بے حقیقت سمجھکر اس کا مستحق نہیں سمجھا جاتا۔ یہ خیال ایسا عجیب ہی کہ شاید ہی کسی دوسری قوم یا ملک میں پایا جاتا ہی اور حد درجہ کی خود بینی و غلط فہمی پر دلالت کرتا ہی اور جب تک یہ دور نہ ہوگا زبان کی ترقی ناممکن ہی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے تھوڑے سے دیوان اور ناول پڑھ لئے اور لگے اپنے کو تصنیف و تالیف کا اہل سمجھنے۔ اور ورق پر ورق سیاہ کرنے جس سے نہ صرف اپنا ہی سر کھپا بلکہ دوسروں کا بھی وقت رائگاں ہوا۔ اور زبان کی وقعت اور تصنیفات کی شان جو کچھ گھٹ گئی وہ اس پر مستزاد ہوا۔ اس کا علاج صرف یہی ہوسکتا ہی کہ ایک

اعلیٰ معیارِ ادب کا لکھنے والوں کے سامنے پیش کیا جائے اور ان کے مطالعہ کے لئے جگہہ جگہہ کتب خانے کھولے جائیں۔

اب ایک اور مصیبت اور بلا بھی ہے جو اُردو ادب کو بہت نقصان پہنچا رہی ہے۔ اس کا نام محض تجارتی منفعت کی غرض سے کتابیں لکھنا یا طبع کرانا ہی۔ پنجاب کو اسی نے تباہ کیا۔ یعنی یوں سمجھئے کہ گویا ایک مشین کے سامنے والے سوراخ میں پیسے ڈالتے ہیں اور نیچے سے فوراً ایک کتاب بن کر نکل آتی ہی چنانچہ اس طرح اس کثرت سے خراب اور پوچ لچر کتابیں خصوصاً ناول شائع ہوئے ہیں کہ ان کو کسی ردی خانہ میں پھینک دیا جائے تو وہاں سے بھی بدبو پھوٹ کر نکلے۔

ایسی کتاب لکھتے وقت شاید غریب مصنّف کی یہ حالت ہوتی ہوگی کہ ایک ہاتھ میں قلم ہے تو دوسرا خالی جیب کو ٹٹول رہا ہی اور آنکھیں گھڑی کی سوئیوں پر لگی ہوئی ہیں کہ کس طرح وقت ختم ہو اور اس مصیبت سے نجات ملے۔

ہمیں معلوم نہیں کہ ہندوستان کی اور دوسری زبانوں کا کیا حال ہی۔ سُنتے ہیں کہ بنگالی زبان فسانہ نویسی میں بہت ترقی کر گئی ہی مگر ہمیں صرف چند ترجموں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہی جس سے صحیح رائے قایم کرنا ناممکن ہی۔

اس لئے اس موقعہ پر ہم مذکورۂ ذیل تنقید کو صرف اُردو زبان تک محدود رکھیں گے اور اس میں بھی خاص خاص مصنفین کے ذکر پر اکتفا کریں گے۔

مولوی نذیر احمد دہلوی | اس مشہور و معروف مصنّف کی کتابیں بہت مقبول ہوئی ہیں اور ادبی دُنیا میں مابہ الامتیاز و مستند مانی جاتی ہیں۔ اُس کے فسانوں پر ناولوں کا مفہوم پُورے طور سے صادق نہیں آتا اور نہ آج کل کے ناول کی طرز پر لکھے گئے ہیں۔ بلکہ اُن سے منشا و مقصود یہ ہے کہ مختلف مسائل مذہبی و معاشرت کو قصّے کے پیرایۂ میں بیان کیا جائے اور لوگوں کو اصلاح کی طرف مائل کیا جائے رویائے صادقہ اور توبۃ النصوح اس کی خاص مثالیں ہیں اور اسی طرح مراۃ العروس اور بنات النعش میں عورتوں کو خانہ داری وغیرہ کے طریقے بتائے گئے ہیں اور فسانۂ مبتلا میں تعدد ازدواج کے خراب نتایج پر بحث کی گئی ہے

ان فسانوں میں جگہہ جگہہ لوگوں کے عادات واطوار اور ان کی عام روزمرّہ کی زندگی کی ایسی سچی تصویریں کھینچی ہیں جن کو دیکھنے سے مصنف کی اعلیٰ درجہ کی قوّت مشاہدہ کا اظہار ہوتا ہے۔ طرز بیان بھی نہایت موثر دلپذیر وانوکھا ہے اور مطالب کے ادا کرنے کا ایک خدا داد ملکہ اور زبان اُردو پر ایک غیر معمولی قدرت پائی ہے۔ کیرکٹر بھی ایسے پیدا کئے ہیں جو جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور ہماری سوسائٹی کی سچی تصویریں ہیں۔ مثلاً اصغری، اکبری، کلیم، مرزا ظاہر دار بیگ وغیرہ۔

عیب یہ ہے کہ کبھی کبھی اپنے راستہ سے بھٹک جاتے ہیں اور بات میں سے بات نکال کر مضمون کو بہت طویل کر دیتے ہیں۔

مولوی عبدالحلیم شرر انھوں نے اکثر ناول اسلامی تاریخ پر لکھے ہیں۔ جن کے پلاٹ (*Plot*) کی ایجاد و ترتیب اور کیرکٹروں (*Characters*) کا نشوونما بہت قابل تعریف ہے لیکن بیان سطحی ہے۔ اس میں زیادہ غور و فکر مطالعہ و تفتیش سے کام نہیں لیا گیا اور زمانہ قدیم کی طرز معاشرت کی تفصیلی و جزئی حالات نہیں بتائے گئے۔ یہ ہم مان لیتے ہیں کہ خود کتب تاریخ و سیر اس مضمون پر ساکت اور خاموش ہیں مگر ڈھونڈھنے والے کو محنت و جستجو سے کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے چنانچہ برٹن (*Burton*) نے اپنے ترجمۂ الف لیلہ کے ساتھ جو نوٹ دیئے ہیں اور لین پول (*Lane Poole*) نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس بات کی صداقت کے لئے کافی ہے۔ بہرحال "ایام عرب" کے پڑھنے کے بعد کچھ ہمارے آنسو پُچھ جاتے ہیں لیکن "زوال بغداد" پر جب نظر ڈالتے ہیں تو دل میں کسی قدر حسرت باقی رہجاتی ہے کہ بغداد کے محلات اُس کی درسگاہوں، بازاروں، حماموں اور گلی کوچوں کی کچھ اور سیر کرائی ہوتی اور ہلاکو خاں کی وحشتوں کا ذرا اور تفصیلی حال لکھا ہوتا۔ یہ دونوں باتیں کتب تاریخ میں موجود ہیں اور بآسانی دستیاب ہو سکتی ہیں۔

علاوہ بریں ان فسانوں میں شاید عوام کی پسندیدگی کے لئے اہلِ عرب و عجم کو ہندوستانی لباس پہنانے کی کوشش کی گئی ہے اور ان کی طرز گفتگو اور عادات واطوار کو بھی ہمارا ہی سا دکھایا گیا ہے۔ جو کسی قدر بھدّا اور غیر موزوں سا معلوم ہوتا ہے طرز بیان اگرچہ سلیس و فصیح ہے لیکن کسی قدر پھیکا سا معلوم ہوتا ہے اور جذبات کو پورے جوش قلم کے ساتھ واضح نہیں کیا جاتا۔ نیز اپنے بعض ناولوں میں مناظرِ قدرت کے ساتھ شاعرانہ تشبیہات کو داخل کر کے انھیں

بدنما و خلاف فطرت بنا دیا ہی۔

باوجود ان تمام باتوں کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شرر کا اُردو علم ادب و فسانہ نگاری پر بہت بڑا احسان ہی اُس نے اُسے سفلہ پن، دنایت اور ہرزہ گوئی سے بچا لیا اور تاریخ کا مذاق لوگوں کے دلوں میں پیدا کرکے ان کے علم، وسعت نظری اور بلند خیالی میں بہت بڑا اضافہ کیا۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار | اس مشہور ناول نویس نے لکھنؤ کی طرز معاشرت پر کئی فسانے لکھ ڈالے ہیں جو ایک خاص مذاق کے لوگوں میں نہایت مقبول ہوئے۔ ہمیں اُس کی قابلیت سے انکار نہیں مگر یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتے کہ عموماً اس کا پلاٹ بالکل نامکمل سا معلوم ہوتا ہی کیوں کہ اُس میں کیرکٹروں کو اس کثرت سے بھر دیتا ہی کہ ان کو شروع سے آخر تک نباہنا مشکل ہو جاتا ہی مثلاً فسانۂ آزاد کو دیکھئے کہ اس میں واقعات در واقعات بے ترتیبی کے ساتھ بکثرت موجود ہیں۔ ایک کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا کہ دوسرا شروع ہو گیا اور پہلے کی خبر کہیں بہت دُور جا کر نکلتی ہی اور کبھی نکلتی بھی نہیں۔ اس کے بعض مرقعے نہایت سچّے معلوم ہوتے ہیں اور بعض بالکل غلط و مبالغہ آمیز۔ سچّے وہ ہیں جن میں افیمچیوں، شرابیوں اور بھٹیاروں وغیرہ کو دکھاتا ہی۔ غلط وہ ہیں جن میں بیگماتوں اور شریف زادیوں کی عشق بازی کے سین دکھاتا ہی۔ اسی طرح فطرت انسانی کے سمجھنے میں بھی اکثر سخت دھوکے کھاتا ہی مثلاً یہ اُس کی ہیروئن کی ایک معمولی عادت ہی کہ پہلے ہی نگاہ میں کسی مرد کو دیکھتے ہی عاشق ہو جائے اور بیہوش ہو کر فوراً بیمار پڑ جائے۔

سرشار کو غور و فکر کی عادت نہیں نہ اُسے اپنی طبیعت پر قابو ہی۔ اس کا قلم ہے کہ ایک سمند باد رفتار کی طرح اُڑتا چلا جا رہا ہی۔ اور اس روانی کے ساتھ طرز بیان بھی بڑا دلچسپ ہی اس میں ظرافت اور شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہے جس میں کہیں کہیں چھچھورے پن اور ادنیٰ خیالی کی جھلک بھی صاف طور سے دکھائی دیتی ہی۔

اس کو زبان اُردو پر پوری قدرت ہی مگر محاورات و استعارات کی اس قدر بھرمار کر دیتا ہے کہ کلام میں تصنع اور بناوٹ پیدا ہو گئی ہے اور یہ شبہ ہونے لگتا ہی کہ شاید لکھنے والے کو اپنی خود نمائی مقصود ہی۔

مرزا ہادی رُسوا | اگر "نیچرل طرز" اُردو فسانوں میں دیکھنا ہی تو امراؤ جان ادا کو پڑھیئے۔ اس میں قبل از غدر اور لکھنؤ کی ایک خاص سوسائٹی کے حالات اس خوبی کے ساتھ لکھے ہیں کہ ہمیں ان کی صداقت میں ذرا بھی

شبہ نہیں رہتا۔ طرز بیان نہایت فصیح و موثر ہے۔ پلاٹ و کیرکٹر کی ترتیب بھی درست ہو جسے دیکھنے کے بعد ہمیں افسوس ہوتا ہو کہ کاش اسی طرز کے ناول اس مصنف نے اور بھی لکھے ہوتے اور اتنی جلدی اپنا قلم نہ روک لیا ہوتا۔

سجاد حسین ان کا ناول "طرحدار لونڈی" لکھنؤ کے ایک خاص طبقہ کی معاشرت کا نہایت سچا مرقعہ معلوم ہوتا ہو بڑی خوبی یہ ہو کہ تمام کیرکٹر اپنے ماحول کی مطابقت کرتے ہیں اور سرشار کی طرح ہو بیٹیوں کو یکایک آوارہ نہیں کر دیتا، بلکہ ان کی خاندانی رذالت ناقص تربیت و صحبت اور دیگر اسباب کو اس کا سبب گردانتا ہو۔

اس نے کایا پلٹ، حاجی بغلول، احمق الذین وغیرہ ناول بھی لکھے ہیں جن میں کہیں کہیں خلاف فطرت بھی لکھ جاتا ہو. مثلاً ایک جگہ ایک جن یا موکل کو اپنے افسانہ میں داخل کر کے بلا وجہ اُس کے اچھے خاصے پلاٹ کو بگاڑ دیا ہو۔

طرز بیان دلکش، ظرافت آمیز اور شوخیوں سے بھرا ہوا ہے۔ زبان بڑی شیریں و رواں ہو اور محاورات واستعارات بھی بلا ضرورت و بے موقعہ استعمال نہیں کئے۔

حکیم محمد علی انھوں نے جعفر و عباسہ، اختر و حسنہ اور گورا وغیرہ کے قسم کے کئی ایک ناول لکھے ہیں جنھیں پڑھنے کے بعد یہ ظاہر و عیاں ہوتا ہے کہ کیوں کر ایک قابل اور لایق انشا پرداز جس کے قلم میں خاصا زور ہو خیالات کی کم مائگی اور مشاہدہ و تخیل کے صحیح نہ ہونے کی وجہ سے فسانہ نگاری کے مفہوم سے دُور بھٹک جاتا ہے اور عوام کے علم و حُسنِ مذاق میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتا. مثال کے طور پر لیجئے۔ جعفر و عباسہ کے عشق کا واقعہ خواہ تاریخی لحاظ سے مستند نہ ہو مگر کس قدر دلچسپ پلاٹ ہو۔ اگر عباسیہ کے زمانہ کے عربوں کی طرز معاشرت دکھائی ہوتی ان کے جذبات و خیالات کی صحیح ترجمانی کی ہوتی اور مختلف مناظر کا ذکر کیا ہوتا تو یہی کتاب کس قدر قابل قدر ہوتی لیکن بجائے اس کے اس پر ہندوستانیت کا پورا رنگ سر تا سر چڑھا دیا گیا ہے اور وہ بھی غلط، خلاف فطرت اور اصلیت سے دُور بلکہ بعض جگہ شرمناک جس کے بیان میں خیال آفرینی سے اس قدر کام لیا گیا ہو کہ ایک سچی بات بھی بے سر و پا نظر آتی ہے اور فسانہ کی حیثیت بہت کچھ گر گئی ہو۔

مراثی انیسؔ

از

جنابؔ مولوی نظام الدین حسین صاحب نظامی۔ اڈیٹر ذوالقرنین

جناب سید راس مسعود صاحب بی۔ اے (آکسن) ناظم تعلیمات دولت آصفیہ نے اُردو اساتذہ کے کلام شائع کرنے کی ایک اسکیم شائع کی تھی یہ اس کی دوسری قسط ہے اور اعلیحضرت اقدس سلطان دکن خلد اللہ ملکہ کے شاہانہ عطیہ کی بدولت اس کی اشاعت کا انتظام عمل میں آیا ہے۔ یہ میر انیس کے مرثیوں کی پہلی جلد ہے اور زیر طبع ہے۔ اس میں میر صاحب کی آخر عمر کا کلام ہے اور بعض وہ مرثیے بھی درج کئے گئے ہیں جو اب تک طبع نہیں ہوئے۔ سید علی حیدر صاحب نظمؔ (نواب حیدر یار جنگ) نے اس کی ترتیب و تصحیح فرمائی ہے۔ حضرت نظمؔ ایک قادر الکلام شاعر اور اپنے وقت کے استاد ہیں۔ اور اُس وقت کی یادگار ہیں جب اُردو شاعری لکھنؤ میں عروج پر تھی۔ کاش ان مرثیوں پر وہ خود ہی مقدمہ لکھتے۔ مگر افسوس وہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے اسے انجام نہ دے سکے۔ لہذا صاحب مطبع نظامی بدایوں (جہاں یہ کتاب زیر طبع ہے) مولوی نظام الدین حسین صاحب نظامی نے یہ مقدمہ لکھا ہے اور اشاعت کے لئے اُردو کو عنایت فرمایا ہے۔ (اڈیٹر)

تمہید | دنیا میں جس قدر روشن دماغ اور مہذب قومیں ہیں وہ قدرتی طور پر شاعری کی دلدادہ ہیں کسی قوم کی تاریخ اُٹھا کر دیکھئے اس میں کچھ نہ کچھ ایسی روایات ضرور ملیں گی جن کو نظم کا لباس پہنا کر مشاہیر کے شجاعانہ مذہبی اور اخلاقی کارناموں کو پیش کیا گیا ہے اسی وجہ سے جملہ اصناف سخن میں رزمیہ شاعری کو فوقیت حاصل ہے اور وہ آیندہ نسلوں میں جرأت دلیری اور قومی غیرت کے جذبات پیدا کرنے کو صدیوں تک زندہ رہیگی۔ یونانی زبان میں ہومر نے الیڈ[1] کے صفحات پر رزم و بزم کی معرکہ آرائیاں پیش کی ہیں۔ لاطینی میں ورجل نے اینیڈ[2] کے اوراق میں اینیس[3] کے واقعات زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ سنسکرت میں مہابھارت کے واقعات آج تک انسانی دل و دماغ پر گہرا اثر ڈال رہے

---

۱ Iliad ۲ Aenead ۳ Aeneas

ہیں۔ انگریزی میں پیراڈائیز لاسٹ[1] میں ملٹن کے بیانات مہذب سوسائیٹوں کے دل پر نقش بٹھا رہی ہیں کہ جنگ تہذیب وتمدن کے رُخ سے نقاب اُٹھا کر انسانوں کو علوم وفنون کا مالک بنا دیتی ہے۔ عربی میں سبعہ معلقہ کے بعض قصاید ایسے ہیں جو دلوں پر برچھی اور بھالے کا کام کر جاتے ہیں۔ فارسی زبان میں شاہنامہ فردوسی کی رزمیہ داستانیں مشہور ومعروف ہیں مگر اُردو میں رزمیہ شاعری کا پرچا اس وقت تک نہ ہوا جب تک کہ ہندوستان میں ایک ایسا شاعر پیدا نہ ہوا جس نے اُردو کی رزمیہ شاعری کا نہ صرف پارسی سے رُتبہ بڑھا دیا بلکہ یونانی، لاطینی اور انگریزی شاعری سے بھی ارفع کر دیا۔ وہ کون تھا انیس۔ اُس نے اپنے قلم کے سمند کو اس شان سے میدان میں دوڑایا کہ ہومر، ورجل اور کالیداس کی رُوحیں ٹاپوں سے اُڑنے والے غبار کو اپنی آنکھوں کا سُرمہ بنانے لگیں۔ بالمکی اور بیاس اس کی علم برداری پر آفریں کہہ اُٹھے۔ اہل عرب کی رجز خوانی اور شجاعان عرب کے نعرے اس کے شکوہ وتجمل سے خجل ہوگئے اور اُس نے اپنی تیغ زبان کے جوہر سے فردوسی کی فصاحت پر پانی پھیر دیا۔ انیس نے اپنی شاعری کے لیے جس جاں گداز واقعہ کو انتخاب کیا وہ نہ صرف تاریخ کا ایک اہم جزو ہے بلکہ اس کو تہذیب وتمدن مذہب واخلاق سے خاص تعلق ہے اور ان کی ممدوح وہ مقدس ذات تھی جو ان کی مدح سے مستغنی تھی اس لئے اس کی مدح خود مدّاح کے لئے باعث مباہات ہے۔ برخلاف اس کے فردوسی نے اپنی قوتِ مبالغہ اور چرب زبانی کے زور سے اپنے ہیرو کے شجاعانہ داستانوں میں جان ڈال کر اس پر احسان کیا ہے۔ جیسا کہ وہ خود کہتا ہے ؎

منش کردہ ام رستم داستاں

دگر نہ یلے بود در پاستاں

خلاصہ یہ کہ میر انیس نے جن واقعات کو نظم کیا ہے ان سے انسانی طبائع ہمیشہ متاثر ہوتی رہیں گی اور ایک عظیم الشان مذہبی قربانی کے حالات عالم اسلام کے ستونوں کو جنبش میں لاتے رہیں گے۔

میر صاحب کے اسلاف | میر انیس کے اسلاف ہرات کے سادات سے تھے پرانی دلی میں آکر آباد ہوئے۔ میر ضاحک میر حسن میر خلیق کے نام ادبی دُنیا میں آفتاب کی طرح روشن ہیں۔ میر انیس کے دادا میر حسن عالم جوانی

---

[1] Paradise Lost

میں اپنے والد میر ضاحک کے ساتھ دلی سے فیض آباد (اودھ) چلے آئے تھے اور سرفراز جنگ کی سرکار میں ملازم ہوگئے تھے وہاں سے لکھنؤ تشریف لے گئے۔ آپ کی مثنوی "بے نظیر بدر منیر" اُردو لٹریچر میں لاجواب چیز ہی جس میں زبان کی سلاست۔ محاورات کے خوش اسلوبی کے سوا جواہر نگار خامہ سے قدرت کے مُرقعے کھینچے گئے ہیں۔

ولادت | میر انیس میر خلیق کے گھر ۱۲۱۲ھ کے قریب فیض آباد میں پیدا ہوئے بعض سوانح نگاروں نے ان کی جائے پیدایش دہلی کو لکھا ہی لیکن صحیح نہیں معلوم ہوتا دہلی میں تو کبھی ان کا جانا بھی ثابت نہیں۔

تعلیم و تربیت | ابتدائی تعلیم فیض آباد میں حاصل کی۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں میر صاحب اور ان کے بھائی میر مونس لکھنؤ تشریف لائے۔ میر خلیق اور اُن کے منجھلے بیٹے میر انس عرصہ تک فیض آباد میں مقیم رہی میر صاحب کے دیکھنے کو خلیق اور انس دونوں اکثر لکھنؤ آتے جاتے رہی مدت کے بعد لکھنؤ کی کشش میر انس کو بھی فیض آباد سے کھینچ لائی میر خلیق اب بھی فیض آباد ہی میں اپنے بزرگوں کے مکان میں مقیم رہی۔ لیکن خاک اُن کی بھی لکھنؤ ہی کی تھی ان کا انتقال لکھنؤ میں ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ میر انیس کی مشق سخن اس وقت ترقی پر تھی اپنے مرحوم باپ کی قبر پر مجلسیں کرتے تھے اور ہر مجلس میں نیا مرثیہ پڑھا کرتے تھے۔ مفتی محمد عباس صاحب مرحوم خود فرمایا کرتے تھے کہ صدرہ میر صاحب نے اُن سے پڑھا تھا۔

علمی معلومات | میر صاحب کو ادبی و علمی مسایل کی تحقیق اور تدقیق کا بہت شوق تھا۔ چالیس سال کی عمر تک اُنھوں نے طالب علمانہ زندگی بسر کی وہ عالم نہ تھے لیکن تمام تذکرہ نویس اس بات کے معترف ہیں کہ علمی معلومات اعلیٰ درجہ کی تھی۔ جس طرح میر صاحب کا گھر تعلیم و تربیت کے اعتبار سے ایک علمی درسگاہ کا رُتبہ رکھتا تھا اسی طرح علما و فضلا کی سوسائٹی نے ہر علم و فن کے رموز سے آگاہ کر دیا تھا۔ تلوار کی تعریف میں آپ کا ایک مصرع ہی۔ "ہر جز و تن کو لا یتجزیٰ بنا دیا" ذوق مرحوم فرماتے ہیں ع "جو ہر فرد تھے بالفرض تو کیا بے قسمت" یہ دونوں مصرعے اپنے اپنے مصنفوں کے مبلغ علم کو ظاہر کر رہے ہیں۔ ازرق کے قتل پر میر صاحب فرماتے ہیں۔

ع لو کو فیو گرا دیا حرفِ ثقیل کو

یہ مصرعہ خبر دیتا ہے کہ کوفیین و بصریین میں تحقیق زبان و نحو عربی میں جو جو مباحثے ہوئے ہیں وہ سب مصنف کے پیشِ نظر تھے۔

باپ بیٹے کی اصلاح کا مقابلہ | ایک دفعہ کا ذکر ہی کہ خلیق اپنے دونوں بیٹوں انیس اور مونس سے ملنے کے لئے فیض آباد سے لکھنؤ آئے ان کے منجھلے بیٹے مہر علی انس ان کے ہمراہ تھے میر خلیق نے میر انیس سے کہا مہر علی انس نے جو مرثیہ اس سال کہا ہی ذرا اسے سنو اس مرثیہ پر میر خلیق کی اصلاح تھی اور وہ بیٹے سے اس اصلاح کی داد کے طالب تھے چنانچہ انیس نے مرثیہ سن کر بہت داد دی اسی کے ساتھ کہا کہ باواجان میر نواب (مونس) نے جو مرثیہ اسی سال کہا ہی ذرا اسے بھی سنئے۔ مونس نے مرثیہ سنایا یہ کچھ چیز ہی اور تھا اس پر انیس کی اصلاح تھی۔ اس مرثیہ کو سنانے کی غرض بھی یہی تھی کہ میر خلیق بیٹے کی اصلاح کی داد دیں خلیق چھوٹے بیٹے کے مرثیہ اور بڑے بیٹے کی اصلاح سے بہت خوش ہوئے۔

چھوٹے بھائی کے ساتھ محبت | میر صاحب کو اپنے چھوٹے بھائی مونس سے جو بچپن سے میر صاحب کے ساتھ لکھنؤ میں رہے تھے کمال درجہ کی محبت تھی باوجود صاحب اولاد ہو جانے کے کبھی شفقت مربیانہ میں فرق نہ آیا میر صاحب کے صاحبزادہ میر خورشید علی نفیس ہمیشہ رشک کرتے تھے اور کہا کرتے تھے ہمارا مرثیہ باواجان کی اصلاح سے مہینوں محروم رہتا ہی اور چھوٹے چچا کے مرثیہ پر فوراً اصلاح ہو جاتی ہی۔

خودداری | میر صاحب اس قدر خوددار اور نازک دماغ تھے کہ کوئی شخص آپ سے ملنے کے لئے اُس وقت تک نہ جا سکتا تھا جب تک پہلے سے اس کی ملاقات کا وقت مقرر نہ ہو جائے روزمرہ کے آنے جانے والے بھی اطلاع کے بعد شرف ملاقات حاصل کرتے تھے۔

خودداری کی ایک مثال | حکیم مہدی سے لوگوں نے ذکر کیا کہ انتزاع سلطنت کے بعد سے میر انیس نے مجلسوں میں پڑھنا ترک کر دیا ہی اکثر لوگوں نے بہت کچھ الحاح و اصرار و اظہار شوق کیا مگر بے سود ہوا اور سب کا اشتیاق برسوں سے تقاضا کر رہا ہی کہ پھر میر صاحب کو منبر پر دیکھیں حکیم مہدی نے کہا ”دیکھو میں پڑھواتا ہوں انیس کو“ رقعے چھپوا کر انھوں نے تقسیم بھی کر دیئے کہ فلاں تاریخ مجلس ہی میر صاحب پڑھیں گے میر انیس سے لوگوں نے پوچھا کہ حکیم مہدی کے یہاں آپ پڑھیں گے میر صاحب نے کہا میں تو نہیں پڑھوں گا حکیم مہدی کو یہ خبر پہنچی اُس نے اس برتے پر میر انیس کو پڑھوانے کا دعویٰ کیا تھا کہ نجف کے ذاکروں میں مبارک محل میر انیس کو بھی وثیقہ مقرر کر گئی تھیں وہ وثیقہ آج تک جاری تھا مگر میر صاحب خود پڑھنے کو نجف کی مجلس میں نہ جاتے تھے

میر نفیس مرحوم کو حکم تھا کہ میرے بدلے تم جا کر پڑھ آیا کرو اس وثیقہ کی تولیت حکیم مہدی کو تھی اُس نے نواب غضنفر الدولہ کی وساطت سے میر صاحب کے پاس کہلا بھیجا کہ میری مجلس میں آپ نہ پڑھیں گے تو مبارک محل کے وظیفہ سے ہاتھ دھو رکھیے غضنفر الدولہ بہادر میر صاحب کے اخلاص مند دوستوں میں تھے اُنھوں نے بہت چاہا کہ میر صاحب کو مجلس پڑھنے پر راضی کر لیں جب دیکھا کہ اُنھیں بھی اس بات میں کد ہی کہ حکیم مہدی کے یہاں ہرگز نہ پڑھیں گے تو کہدیا کہ نجف سے جو وظیفہ آپ کو ملتا ہی وہ ظالم موقوف کر دے گا میر صاحب کے پاؤں میں زر دوزی اوگی تھی کہنے لگے میں جاتوں گا میری اوگی کے ستارے جھڑ گئے آخر نہ پڑھنا تھا نہ پڑھے وظیفہ کے موقوف ہو جانے کی کچھ پروانہ کی زوال سلطنت اودھ کا قلق میر صاحب کو برسوں رہا پڑھنا بلکہ مجلسوں میں جانا تو یک قلم موقوف کر دیا تھا کہتے بھی کم تھے یہ زمانہ مونس کی اصلاح میں بہت صرف ہوتا تھا ایک دفعہ نواب فدا علی خاں کے اصرار پر پڑھنے کا وعدہ کر لیا یہ خبر مشہور ہو گئی لکھنؤ کے چاروں طرف ریل نکل چکی تھی دُور دُور سے لوگ اشتیاق میں آتے تھے اہل مجلس منتظر تھے کہ انیس آئے پینس میں سے میر خورشید علی نفیس اُترے اُنھوں نے منبر پر جا کر پہلے یہ عذر کیا کہ سب حضرات جناب قبلہ وکعبہ کے اشتیاق میں جمع ہوئے ہیں میرے پڑھنے کا کوئی محل نہ تھا لیکن میں معذور ہوں ارشاد ہوا کہ میں اس وقت نہیں جا سکتا تو جا کے پڑھ دے امتثال حکم کرتا ہوں۔ مرثیہ انیس کا بنایا ہوا اور اُن کی نظر میں کھبا ہوا بھی تھا جانتے تھے انیس کے پڑھنے کی ضرورت نہیں یہ مرثیہ نفیس کی زبان سے بھی بے رنگ دکھائے نہیں رہیگا یہی ہوا ہر شخص مجلس سے یہی کہتا اُٹھا کہ میر خورشید علی کبھی ایسا نہیں پڑھے جیسا آج پڑھے اس کے چند مہینے بعد حیدر خاں کے یہاں میر خورشید علی پڑھنے والے تھے حیدر خاں نے آ کر قدموں پر ٹوپی رکھدی اور کہنے لگا اب کے میری مجلس میں شریک ہو کر مجلس کی رونق اور میری عزت بڑھایئے میر خورشید علی صاحب کو آپ نے کبھی مجلس پڑھتے نہیں سُنا سُنئے گا تو نہایت خوشی ہو گی۔ میر صاحب حیدر خاں کی مجلس میں چلے آئے دیکھتے کیا ہیں کہ لکھنؤ کے تمام ماہرین فن اور نقادان سخن کا مجمع ہی اُن لوگوں میں ناسخ والوں میں سے بڑے خوش فکر مرثیہ گو سید صاحب تعشق بھی موجود تھے ان قدر شناسوں نے کچھ ایسا اصرار اور اشتیاق کا اظہار کیا کہ میر صاحب منبر پر چلے گئے ۱۸۵۷ء کے بعد لکھنؤ میں پہلی مرتبہ میر صاحب نے یہی مجلس پڑھی مگر آدھا مرثیہ پڑھا ہو گا کہ نواب فدا علی خاں پر نظر پڑ گئی کہ وہ بھی مجلس میں موجود ہیں آنکھ ملتے ہی میر صاحب پر حجاب طاری ہوا مرثیہ بند کر کے اہل مجلس سے خطاب کیا کہ باقی مرثیہ نواب

فدا علی خاں صاحب کی آیندہ مجلس میں پڑھوں گا پھر نواب فدا علی خاں کے یہاں بھی پڑھے نواب ابو صاحب کی مجلسیں بھی پڑھے یہ میر صاحب کا آخر عمر کا پڑھنا تھا۔

طبعی خصوصیات | شہسواری سیف زنی پٹا۔ بانک۔ بنوٹ کے فنون سے بخوبی ماہر تھے۔ ورزش کا شوق آخر وقت تک قایم رہا چند ڈنٹر اور پچاس ساٹھ ہاتھ مگدر ہلالینا کبھی ناغہ نہ ہوا۔ میر صاحب کی طبیعت حسن پرستی سے خالی نہ تھی اور وہ حسن پرستی انسانی خوبصورتی تک محدود نہ تھی بلکہ اُن کی نگاہ تمام موجودات عالم میں سے اپنے دل بہلاؤ کا ذریعہ پیدا کرلیتی تھی خوبصورت اور خوشنما پھولوں کو دیکھ کر اُن کا ذوق وجدانی ترقی کرجاتا تھا جمادات، نباتات وحیوانات کے مشاہدہ میں ان کی نظر قدرتی خوبیوں کو پا جاتی تھی۔

حلیہ اور وضع | میر صاحب کا قد لانبا تھا۔ سر کے بال باریک اور مُلایم۔ چہرہ خوبصورت۔ کتابی رنگ کھلا ہوا گندمی۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ مونچھیں بڑی اور افگندہ مو۔ داڑھی صاف۔ گردن صراحی دار۔ سینہ کشادہ چال نہایت نستعلیق۔ اپنی وضع کے نہایت پابند تھے جو وضع انھوں نے شروع سے اختیار کی تھی وہی آخر دم تک قایم رہی۔ سر پر سپیدی پنج گوشہ ٹوپی رکھتے تھے اور اپنے سامنے آئینہ رکھکر جب تک ٹوپی کو درست نہ کرلیتے اور وہ سر پر موزوں نہ معلوم ہوتی ہرگز چین نہ آتا بعض مرتبہ ایک ایک گھنٹہ اس شغل میں صرف ہوجاتا ایک خاص وضع کا گھیر دار کرتہ۔ گول پردہ کا انگرکھا زیب جسم فرماتے تھے۔ ڈھیلا پائجامہ پہنتے تھے۔ ہاتھ میں پتلی چھڑی اور سفید رومال ہوتا تھا پاؤں میں لکھنؤ کا زردمخملی اور اکثر زردوزی جوتا۔

معاصرین | جس زمانہ میں میر انیس لکھنؤ تشریف لے گئے شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش کی غزل سرائی اور میر ضمیر وخلیق کی مرثیہ گوئی کے ڈنکے بج رہے تھے۔ میر خلیق نے اپنے پیارے بیٹے کو بھی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے آداب سکھائے اور خاص خاص مجالس میں ان کو اپنے ساتھ لیجانے لگے۔ آخر وہ دن آیا کہ شایقین کے اصرار سے میر خلیق نے انیس کو منبر پر بٹھا دیا۔ میر صاحب جب پہلی مرتبہ منبر پر تشریف لے گئے تو اوّل تو چند لمحہ تک خاموش بیٹھے رہے پھر ایک رباعی پڑھی۔ پڑھنے کے انداز اور جوانی کی آواز نے دلوں پر گہرا اثر ڈالا چاروں طرف سے واہ وا اور سبحان اللہ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ آپ نے ایک سلام پڑھا۔ جس نے تمام مجلس کو گرویدہ بنالیا۔ پھر اس شان سے مرثیہ شروع کیا کہ آپ کی فصاحت اور بلاغت نے محفل کو

گرما دیا رزم و بزم کی تصویروں پر ارباب سخن غش ہو گئے اور مرثیہ ختم ہونے کے بعد قدرشناس اپنی جگہ سے اٹھکر مصافحہ کرنے لگے اور ہاتھ چومنے لگے۔ خوش نصیب باپ کی زندگی ہی میں آپ کی مرثیہ گوئی کا شہرہ ہو گیا اس وقت جب کہ لکھنؤ میں میر صاحب کے کلام کا چرچا ہو رہا تھا ناسخی گروہ کے بعض شعرا کو ماہرین فن سمجھا جاتا تھا چنانچہ ان لوگوں نے جواب کہنے کی طرف توجہ کی حرملہ کے تیر مارنے کا ذکر میر علی اوسط رشک نے اس طرح نظم کیا ہے

حلقِ اصغر بازوئے سرو دلِ زہرا چھدا　　　　رن کہاں جنت کہاں اللہ ری پلّہ تیر کا

عشق کہتے ہیں ؎

علم کا جب پھریرا دوش پر عباس نے کھولا　　　　پکارے جعفرِ طیار شہپر ایسے ہوتے ہیں

علم کا لچکنا دیکھئے ؎

عالم عجب لچکنے میں ہے آب و تاب کا　　　　پنجہ بجھا رہا ہے چراغ آفتاب کا

ان لوگوں نے زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے مگر میر انیس کا جواب نہ ہوا۔

انیس کی شاعری کا جو خاص میدان تھا اس کی ہوا بھی کسی کو نہ لگی تھی حر شہید کا لشکرِ یزید سے علٰحدہ ہونا ایک تصویر ہی جو انیس نے کھینچ دی ہی ؎

کس لشکرِ بد خو سے بگڑ کر نکل آیا　　　　وہ لاکھ ستمگاروں سے لڑ کر نکل آیا

تنہا ہوا تلوار پکڑ کر نکل آیا

پھر حر کی آمد لشکرِ یزید میں تصویر نہیں کرامات ہی ؎

زور بازو کا نمایاں تھا بھرے شانوں سے　　　　دست فولاد دبا جاتا تھا دستانوں سے

برچھیوں اڑتا تھا دب کے فرس رانوں سے　　　　آنکھ لڑ جاتی تھی دریا کے نگہبانوں سے

پسرانِ زینب کی تصویریں دیکھئے ؎

وہ سینے ہلال کے دم خم پہ جن کو فوق　　　　جرأت کا جوش تیغ زنی کا دلوں میں شوق

ہنس ہنس کے زخم کھائیں زبانوں کو اس کا ذوق　　　　گیسو رخوں پہ۔ کانوں میں بندے۔ گلوں میں طوق

آنکھیں جو نرگسی ہیں تو رُخ بھولے بھالے ہیں　　نذروں کے منتوں کے۔ مرادوں کے پالے ہیں

پھر دونوں بھائیوں کا ہجوم فوج میں ساتھ چھوٹ جانا اور پھر یکایک مل جانا میر صاحب کی معجز بیانی کا ایک کارنامہ ہی ملاحظہ ہو ؎

وہ چھیڑ کے تازی کو سواروں میں در آیا　　دم بھر میں پیادوں کو یہ پامال کر آیا

جب شیر سا پہنچا وہ اُدھر یہ اِدھر آیا　　جان آگئی بھائی کو جو بھائی نظر آیا

بچ بچ کے نکلتے تھے جو تیغوں کے تلے سے

اک بھائی لپٹ جاتا تھا بھائی کے گلے سے

لشکرِ یزید میں کیسے کیسے سنگدل تھے سب جانتے ہوں گے مگر انیس نے اُن لوگوں کو آنکھوں سے دکھا دیا ؎

کہتا تھا کوئی تیر کو چلّہ میں جوڑ کے　　گزرے گا یہ گلا علی اصغر کا توڑ کے

سوئیں گے جب زمین پہ جھولے کو چھوڑ کے　　دونوں کڑے اُتاروں گا پہنچے مروڑ کے

شاہزادہ علی اکبر کی امام حسین سے رخصت ؎

تسلیم کر کے بولے علی اکبرِ غیور　　لاکھوں برس جہاں میں سلامت رہیں حضور

فرمایا شہ نے خیر اجل بھی نہیں ہے دُور　　برچھی لگا کے دل پہ خوش آمد یہ کیا ضرور

پھوپھی کو بھتیجے سے شکایت ہے ؎

کنگھی کسی کے ہاتھ کی بھاتی نہ تھی کبھی　　بے میرے لیٹے نیند انھیں آتی نہ تھی کبھی

بے ان کے ماں کی قبر پہ جاتی نہ تھی کبھی　　روئیں پسر یہ ان کو رُلاتی نہ تھی کبھی

میرے سوا کسی کو کبھی جانتے نہ تھے

جو بھی سوئیں تھی ماں کو تو پہچانتے نہ تھے

ہر چند دونوں تھے مرے فرزند خرد سال　　پر ان کے آگے اُن کا مجھے کچھ نہ تھا خیال

راتوں کو جب لپٹتے تھے مجھ سے وہ نونہال　　میں کہتی تھی ہٹو۔ علی اکبر ہے میرا لال

وہ دونوں مرنے والے تو پہلو میں ہوتے تھے　　پھیلا کے پاؤں یہ مری چھاتی پہ سوتے تھے

میر انیس کے مقابلہ میں مرزا دبیر بھی حریف بن کر مرثیہ گوئی کے میدان میں نمودار ہوئے۔ اور دونوں کی شہرت حضرت جانعالم محمد واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے گوش گزار ہوئی۔ مفتاح الدولہ کے ذریعہ سے دونوں مرثیہ پڑھنے کے لئے شاہی امام باڑہ میں بلائے گئے پہلے مرزا دبیر وقت پر پہنچے اور حضور میں باریاب ہوکر ایک جانب بیٹھ گئے۔ میر صاحب نے گھڑی گھڑی کی خبریں پہنچنے کا انتظام کرلیا تھا۔ جب آپ کو یہ معلوم ہوگیا کہ مرزا صاحب پہنچ گئے تو اپنے جانے میں قصداً دیر لگانا شروع کر دی۔ یہاں تک کہ تمام مجلس حاضرین سے بھر گئی اور وقت معینہ سے کچھ وقت زیادہ آگیا تب شاہی چوبدار حاضر ہوا اور عرض کی کہ مجلس تیار ہے صرف آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ میر صاحب تیار تو تھے ہی پینس سامنے حاضر تھی اس میں سوار ہوکر روانہ ہوگئے مجلس میں فرش پر پاؤں رکھتے ہی تمام ارباب مجلس تعظیماً اُٹھ کھڑے ہوئے میر صاحب سیدھے منبر کی طرف گئے اور اپنے قاعدۂ مقررہ کے موافق منبر کے پاس بیٹھ گئے نواب مفتاح الدولہ سامنے آئے تو اُن سے کہا آپ حضرت جانعالم سے عرض کر دیں کہ انیس حاضر ہے اور آپ کو دعا عرض کرتا ہے۔ مفتاح الدولہ نے بادشاہ سے اطلاع کی دیکھنے والے حیران رہ گئے کہ میر صاحب کو اپنی خودداری کا خیال کہاں تک تھا۔ بادشاہ کی طرف سے پہلے مرزا دبیر کو پڑھنے کا حکم دیا گیا اُنھوں نے بادشاہ کی تعریف میں ایک رُباعی پڑھی جس پر چاروں طرف سے آفریں کی صدائیں گونج اُٹھیں پھر میر صاحب کو پڑھنے کے لئے ارشاد کیا گیا۔ اُنھوں نے جناب امیر علیہ السلام کی منقبت میں ایک رباعی پڑھی جس کو سن کر سامعین پر وجد طاری ہوگیا۔ اس کے بعد سلام شروع کیا جس کا مطلع یہ تھا ؎

غیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہوکر
مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سُلیماں ہوکر

لکھنؤ سے باہر کی مجلسیں | لکھنؤ کے علاوہ میر صاحب کو عظیم آباد و الہ آباد و حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا جہاں کہیں بھی آپ نے مرثیہ پڑھا ماہرانِ فن کے دلوں پر اپنی شاعری کا سکہ بٹھا دیا حیدر آباد میں آج تک یہ روایت مشہور ہے کہ وہاں ایک صاحب نے میر صاحب کی شاعری کی تعریف کرتے ہوئے اُن سے کہا کہ میر کی شاعری کا پایہ بھی آپ کے سامنے پست نظر آتا ہے فرمایا کہ میر غزل کے اُستاد تھے میں ایک مرثیہ گو مجھے اُن سے

کیا نسبت اُنھوں نے کہا جناب عالی میرا قول بے دلیل نہیں مقابلہ کر لیجئے میر کا مطلع ہی ؎

اُس زلف پہ محو ہو گئے ہم یعنی سرِ شام سو گئے ہم

اور آپ (میر انیس) فرماتے ہیں ؎

ایک آہ میں سرد ہو گئے ہم ٹھنڈی جو ہوا تھی سو گئے ہم

اپنے اور میر تقی کے مطلع کو سُن کر میر صاحب کو جواب دیتے کچھ نہ بن پڑا مسکرانے لگے۔

میر صاحب کی مرثیہ گوئی کا طرۂ امتیاز اور اس کی مثالیں

میر صاحب کی شاعری پر تنقید کرنا صرف اس شخص کا کام ہی جو خود بھی اس فن کے نکات سے آگاہ ہو۔ لیکن ہر شخص جو ذوقِ سلیم رکھتا ہے کہہ سکتا ہی کہ اُردو زبان میں اُنھوں نے اس فن کو ایسی ترقی دی کہ ان کا نام اُردو ادب کی تاریخ میں زریں حروف سے لکھا جائے گا۔ مرثیہ گوئی کا فن نیا فن نہیں ہی انسانی نسل کی نشو و نما کے ساتھ ساتھ اس کا بھی وجود پایا جاتا ہی۔ عربی تاریخوں کی ورق گردانی سے پتا چلتا ہے کہ جب قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر ڈالا تو حضرت آدم کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور اس وقت جو الفاظ ان کی زبان سے نکلے اپنی موزونیت کے اعتبار سے وہ شعر کا درجہ رکھتے تھے۔ ایاّم جہالت کے اکثر مرثیئے عربی کی ادبی کتابوں میں موجود ہیں فارسی میں بھی مرثیہ گوئی کا رواج قدیم زمانہ سے پایا جاتا ہی۔ مقبل۔ مخلص محتشم وغیرہ شعرا نے فارسی زبان میں حسرت و یاس کے دردناک مناظر پیش کرنے میں کوئی بات اُٹھا نہیں رکھی ہے اُردو شاعری میں بھی میر انیس کے زمانہ سے قبل مرثیہ گوئی کا پتہ چلتا ہی۔ حضرت میر تقی میر نے اپنے مشہور تذکرہ نکات الشعرا میں یکرنگ معاصر میاں آبرو کی تصنیف سے یہ اشعار درج کئے ہیں جو بطور مرثئے کے لکھّے گئے تھے ؎

زخمی برنگ گل ہیں شہیدان کربلا گلزار کی نمط ہے بیابانِ کربلا

کھانے چلا ہی زخمِ ستم ظالموں کے ہاتھ وہ ہاتھ زندگی ستی میدان کربلا

اندھیری جہاں میں کہ اب شامیوں کے ہاتھ ہے سر بُریدہ شمع شبستانِ کربلا

اشعار مندرجۂ بالا سے معلوم ہوتا ہی کہ قدیم اُردو میں جو مرثئے لکھے جاتے تھے بیس تیس بیت سی زیادہ نہ ہوتے تھے پھر ایک ایسا دَور شروع ہوا جس میں مراثی مُسدّس کے طرز پر لکھّے جانے لگے اور میر ضمیر و میر خلیق کے

زمانہ میں یہ ایک مستقل فن ہوگیا اور آخر میں میر انیس کی طبع رسا نے ترقی دے کر اس کو معراج کمال پر پہنچا دیا اور مرثیہ گوئی کے میدان کو وسیع کر دیا۔ میر صاحب نے مناظر فطرت کے جس حصے پر توجہ کی کمال کر دکھایا مثلاً صبح کا سین اُنھوں نے اس خوبی سے ناظرین کے سامنے پیش کیا ہی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر نے صحیفۂ فطرت کو کس قدر گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ کہتے ہیں ؎

وہ صبح اور وہ چھاوں ستاروں کی اور وہ نور   دیکھے تو غش کرے ارنی گوئی اوج طور
پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور   وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور
گلشن خجل تھے وادیِ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

اسی مرثیہ کی بیت ہی ؎

طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں   جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

اس ٹیپ میں میر صاحب نے صبح کی جس کیفیت کو پیش کیا ہی اس کا پورا لطف اسی شخص کو آسکتا ہی جس کو علم الحیوانات تک دسترس حاصل ہی۔ آفتاب کی تمازت کا جو قدرتی اثر انسان حیوان اور جمادات پر ہوتا ہی اس کا بیان جن الفاظ میں فرمایا ہی اس سے بہتر نقشہ کسی دوسرے شاعر کے قلم سے کھنچنا ناممکن ہی۔ کہتے ہیں ؎

وہ دھوپ کی تیزی غضب اوروں کا وہ چلنا   وہ دوپہر اس دشت کی اور دن کا وہ ڈھلنا
ہر ایک بدن سے وہ پسینے کا نکلنا   اور تن پہ حرارت سے وہ ہتیاروں کا جلنا
جنگل کے چرندے سبھی جھیلوں میں پڑے ہیں
اور دھوپ میں پیاسے شہ مظلوم کھڑے ہیں

وہ دھوپ ہی جس میں کہ ہرن ہوتے ہیں کالے   اور ہانپتے ہیں شیر زبانوں کو نکالے
گرمی سے دد و دام ہیں منھ آب میں ڈالے   ریتے میں دھریں پاؤں تو پڑ جاتے ہیں چھالے
آہن کی سی شے موم صفت نرم ہوئی ہی
پتھر ہیں چٹکتے یہ زمیں گرم ہوئی ہی

ایک موقع پر خوفناک جنگل کا سماں اس طرح بیان کیا ہے ؎

جنگل کی ہوا اور درندوں کی صدائیں　　تھرّاتی تھیں بچوں کو چھپائے ہوئے مائیں
دھڑکا تھا کہ دہشت سے نہ جائیں کہیں جائیں　　روتی تھی کوئی اور کوئی پڑھتی تھی دعائیں
گودوں میں بھی راحت نہ ذرا پاتے تھے بچے
جب بولتے تھے شیر تو ڈر جاتے تھے بچے

جس گھر میں اہلِ بیت اطہار کو یزید نے قید کیا تھا اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے ؎

شکلِ دلِ یزید تھا وہ سب مکاں سیاہ　　تاروں کی روشنی کو بھی ملتی تھی واں نہ راہ
چھایا تھا دل جلی ہوئی رانڈوں کا دودِ آہ　　حجرے سے چشمِ تر کے نکلتی نہ تھی نگاہ
دیکھے کسی کی شکل کوئی یہ محال تھا
روزن بھی تھا کوئی تو وہ چشمِ غزال تھا

شب کا تو ذکر کیا ہے کہ لگتا تھا دن کو ڈر　　ظاہر تھے جا بجا حشراتِ زمیں کے گھر
تھے وقفِ آشیانِ ابابیل سقف و در　　نکلا وہ مر کے قید ہوا اس میں جو بشر
گھر تھا اجل کا خانۂ رنج و بلا نہ تھا
برسوں سے واں چراغ کسی شب جلا نہ تھا

سید الشہدا کی سیف زنی کی تعریف میں لکھا ہے ؎

سر گرنے لگے جسم سے چلنے لگی تلوار　　چار آئینے میں جا کے نکلنے لگی تلوار
افعی کی طرح زہر اگلنے لگی تلوار　　پی پی کے لہو رنگ بدلنے لگی تلوار
پانی نے اثر زہر ہلاہل کا دکھایا
ہر ضرب میں جلوہ حق و باطل کا دکھایا

حضور کا سراپائے مبارک لکھتے ہوئے کس قدر نفیس استعاروں اور تشبیہوں سے کام لیا ہے فرماتے ہیں ؎

وہ ریش پاک اور وہ چہرے کی آب وتاب نکلا ہے چیر کر شب یلدا کو آفتاب
کچھ جابجا جو کھل گیا ہے ریش کا خضاب رخصت ہو مل رہے ہیں گلے پیری و شباب
تا وقت عصر اور زمانِ حیات ہے
اب زندگی میں کوئی نہ دن ہے نہ رات ہے

میدان جنگ کا نقشہ کھینچنے اور یزیدی فوج کے لوگوں کی کیفیت لکھنے میں جو کمال ظاہر کیا ہے اس کا اندازہ اس بند سے ہو سکتا ہے ؎

جنگی وہ رومیوں کے پرے شامیوں کے دل خوفِ خدا نہ جن کو نہ اندیشۂ اجل
مکار و اہلِ نار و دغاباز و پر دغل شکلیں مہیب دیو سے قد ابر و ئے چ بل
بدخواہِ خاندان رسالت پناہ تھے
ایسے جلے ہوئے تھے کہ چہرے سیاہ تھے

علی اکبرؑ کو رن کی اجازت دینے کے موقع پر بی بی زینب کی زبان سے ماں کی فطرتی محبت کا موازنہ پھوپی کی محبت سے کیا ہے وہ قابل ہزار ستایش ہے۔ کہتے ہیں ؎

سچ ہے کہ اُس کی چاہ سے نسبت ہے مجھے کہاں ہوں لاکھ ان کی چاہنے والی وہ پھر ہے ماں
آنکھوں کا نور قلب کی طاقت بدن کی جاں آرزخ آتما کی ہے وہ قیامت کہ الاماں
کیا سوچتے ہو صاحبو کچھ تم کو خیر ہے
ماں ہے تو ماں ہے خلق میں پھر غیر غیر ہے

گھوڑے کی تعریف میر صاحب نے اکثر موقعوں پر لکھی ہے لیکن جس طرح ایشیائی شاعر قصیدوں میں اپنے ممدوح کے گھوڑے کی تعریف میں انتہائے مبالغہ سے کام لے کر اپنے کلام کو مبتذل بنا دیتے ہیں اس سے میر صاحب کا کلام مبرا ہے اور ان کے یہاں بھی مبالغہ ہے لیکن لطف سے خالی نہیں اور اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ اس میں بھی اکثر فطرتی مضامین میر صاحب کے قلم سے نکل گئے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں ؎

لکھتا ہے ادہمِ قلم اب سرعتِ عقاب نعل اس کے ماہ نو ہیں تو سم رشکِ آفتاب

پستی میں سیل ہو تو بلندی میں ہو سحاب سرعت میں برقِ گرم روانی میں جوئے آب

اُڑنے میں اس فرس کو پرندوں پہ اوج ہے

ایک شور تھا۔ قدم نہیں دریا کی موج ہے

سمٹا۔ جما۔ اُڑا۔ ادھر آیا اُدھر گیا چمکا بڑھا جمال دکھایا ٹھہر گیا

تیروں سے اُڑ کے برچھیوں سے بے خطر گیا برہم کیا صفوں کو پروں سے گزر گیا

گھوڑوں کا تن بھی ٹاپ سے اس کی فگار تھا

ضربت تھی نعل کی کہ سروہی کا وار تھا

فطری مضامین میں اضطراب استقلال۔ فراق و وصال وفاداری بے ثباتیِ دنیا۔ انقلاب عالم غرض کوئی مضمون ایسا نہیں ہے جس میں میر صاحب کے قلم نے شیکسپیر اور کالیداس سے زیادہ ڈرامانگاری کی قوت نہ دکھائی ہو اگر یہ قوت میر صاحب کے قلم میں نہ ہوتی تو میر صاحب کو اعلیٰ درجہ کی رزمی شاعر (ایپک پوئٹ) کا مرتبہ حاصل نہ ہوتا۔ میں اگر اس مختصر دیباچہ میں اور ہر مضمون کے بندوں کو مثال میں پیش کروں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔ اس لئے میں اس سلسلہ کو ختم کرتا ہوں اور اُمید رکھتا ہوں کہ ناظرین جس وقت ان مراثی کو جو اس جلد اوّل کے ذریعہ سے ان کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں مطالعہ فرمائیں گے تو وہ خود انصاف سے کہدیں گے کہ میر صاحب بلاشبہ فطری شاعر تھے اور ان کی فطرت نگاری دلوں پر ایک خاص اثر ڈالتی ہے اُردو شعرا میں مناظر قدرت کی طرف ان کا میلان طبعی تھا۔ اور فطرت پسند اور فطرت شناس طبعیت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے جس چیز کی تصویر کھینچی ہے لاجواب ہے۔ ان کا انداز بیان دلکش ہے جس واقعہ کو نظم کیا ہے اس کو ترتیب کے سلسلہ میں ایسا منسلک کیا ہے کہ سُبحان اللہ ؎

نظم ہے یہ یا دُرِ شہوار کی لڑیاں انیسؔ

جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں

ایک نئی طرز کی ایجاد سے اُردو شاعری کو فی الواقع آپ نے چار چاند لگا دیئے جیسا خود فرما گئے ہیں ؎

سُبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر مگر ہم نے پلّہ گراں کر دیا
مری قدر کر اے زمینِ سخن تجھے بات میں آسماں کر دیا

میر صاحب کے ان اشعار کو شاعرانہ تعلّی نہ سمجھنا چاہیئے اس میں بہت کچھ واقعیت موجود ہے اُن کے مراثی پر گہری نظر ڈالنے سے ان کے اس بیان کی کہ ؎

بزم کا رنگ جدا رزم کا میداں ہی جدا یہ چمن اور ہے زخموں کا گلستاں ہی جدا
فہم کامل ہو تو ہر نامہ کا عنواں ہی جدا مختصر پڑھ کے رُلا دینے کا ساماں ہی جدا

دبدبہ بھی ہو مصائب بھی ہوں توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں رقّت بھی ہو تعریف بھی ہو

پوُرے طور پر تصدیق ہوتی ہی اور بڑے سے بڑے نکتہ چیں کو یہ اقرار کرنا پڑتا ہی کہ ان کے کلام میں جامعیت کی شان پائی جاتی ہے۔ اور ڈراما نگاری کے اعلیٰ اصول کی پابندی کے ساتھ اُنھوں نے اُردو زبان کو ایک خاص قسم کی جلا دینے میں کامیابی حاصل کی ہے دیگر شعرا کی نسبت اُنھوں نے اپنے کلام میں اُردو کے سب سے زیادہ الفاظ خوش سلیقگی اور شائستگی سے استعمال کئے ہیں اور اگر اسی ایک بات کو معیارِ کمال قرار دیا جائے تو بھی بقول مولانا حالی میر انیس کو اُردو شعرا میں سب سے برتر ماننا پڑے گا۔ مرزا دبیر جن کا ذکر اس مقدمہ میں ایک موقع پر آچکا ہے میر صاحب کے ہمعصر بلکہ مدمقابل مرثیہ گو شاعر گزرے ہیں اور آج بھی ایک گروہ مرزا صاحب کے کلام کو میر صاحب کے کلام پر ترجیح دینے والا ملک میں موجود ہے۔ مولانا شبلی نے اس مضمون پر ایک مستقل کتاب موازنۂ انیس و دبیر لکھکر اُردو لٹریچر میں ایک مفید اضافہ کیا ہی۔ اس کے بعد دوسری کتاب المیزان لکھّی گئی جس میں موازنۂ انیس و دبیر کے مصنف کی بعض رایوں پر جو اس نے میر صاحب کے کلام کے متعلق دی ہیں نکتہ چینی کی گئی ہے۔ مولانا آزاد نے تذکرۂ آبِ حیات میں مرثیہ گوئی کے ان دونوں پہلوانوں کے متعلق جو فیصلہ کیا ہے وہ یہ ہی :-

"میر انیس صفائی کلام لطف زبان۔ چاشنی محاورہ۔ خوبی بندش حسن اسلوب مناسبت

مقام طرز ادا اور سلسلہ کی ترتیب میں جواب نہیں رکھتے مگر مرزا دبیر بھی شوکت الفاظ
مضامین کی آمد اس میں جا بجا غم انگیز اشارے، درد خیز کنائے، دل گداز انداز کے جو مرثیے
کی اصلی غرض ہی باوشاہ تھے۔"

لیکن ان سب رایوں کے دیکھنے کے بعد بھی ایک غیر جانبدار شخص جو نہ انیسیوں میں ہو نہ دبیریوں
میں وہ صرف اُردو ادب کے گزشتہ موجودہ اور آیندہ حالت پر نگاہ رکھکر مولانا حالی کی اس رائے سے
اتفاق کرنے پر مجبور ہی :-

"میر انیس اُردو شعرا میں سب سے زیادہ برتر تھے" فقط

اصطلاحاتِ علمیہ

ALGEBRA

الجبرا

English	Urdu
Abscissa	فصلہ یا مقطوعہ
Absolute term	رقم مطلق
Algebra	جبر ومقابلہ۔ الجبرا
Alternando (ratio)	تبدیل (نسبت)
Antecedent (ratio)	مقدم (نسبت)
Antilogarithms	عکسی لوکارتم
Approximations	تقرب
Arithmetical progression	سلسلۂ حسابیہ
Arithmetic mean	اوسط حسابی
B	
Base (triangle)	قاعدہ (مثلث)
Binomial Theorem	مسئلہ ثنائی
C	
Charecteristic (Logarithm)	ممیز (لوکارتم)
Circular Cone	مخروط مستدیر
Circular permutations	مدوّر ترتیبیں
Co-efficient	سر یا مکرر
Combination	اجتماع
Commensurable (numbers)	متوافق (اعداد)
Common difference	فرق مشترک
Common ratio	نسبت مشترک
Common Logarithm	مروّج یا عشری لوکارتم
Complimentry (Combinations)	متمم (اجتماع)
Componendo (ratio)	ترکیب (نسبت)
Composite number	عدد مرکب
Compounding (of ratios)	تالیف (نسب)
Compound Surd	مرکب اصم
Concrete (quantities)	(مقادیر) مقرون
Conjugate	زوج یا مزدوج
Consecutive terms	ارقام متصلہ
Constant (quantity)	(مقدار) مستقل
Continued proportion	تناسب مسلسل
Convergence	استدقاق
Convergent series	مستدق سلسلہ
Corresponding values	مطابق قیمتیں
Co-ordinate	محدود
Cross Multiplication	ضرب چلیپائی

Cross section	تراشِ عمودی
Cube	مکعب
Cube root	نسب نما
D	
Denominator	نسب نما
Dependent (variable)	(متغیر) تابع
Descending powers	نزولی قوا
Determinate	مقطعات
Digits	ہندسے
Dimensions	ابعاد
Direct variation	تغیر مستقیم
Dissimilar (things)	غیر متشابہ اشیاء
Divergence	اتساع
Divergent series	متسع سلسلہ
Dividendo	تفصیل نسبت
Duplicate (ratio)	(نسبت) مثنّاة
E	
Elastic string	لچکدار رسّی
Electric current	برقی رو
Eliminent	حاصل اسقاط
Eliminate	ساقط کرنا
Elimination	اسقاط

Equation	مساوات
Equilateral triangle	مثلث متساوی الاضلاع
Eqimultiples	اضعاف متساویہ
Expand	پھیلاؤ
Expansion	صورت تفصیلی یا تفصیل
Exponential Theorem	مسئلہ قوت نما
Expression	جملہ
Extremes	طرفین
Even	جفت
F	
Factor	جزو ضربی
Finite series	سلسلۂ متناہیہ
Formula	ضابطہ
Fractions	کسور
Fractional	کسری
Function (of x)	جملہ (لا کا)
G	
Gas	گیس
General Form	صورتِ عامہ
Geometrical	ہندسیہ
Geometrical progression	سلسلۂ ہندسیہ
Geometric mean	نسبت مشترکہ

H

Harmonic mean	اوسط موسیقی
Harmonic progression	سلسلۂ موسیقیہ
Height	ارتفاع
Homogeneous (expression)	(جملہ) متجانسہ
Hyperbola	ہذلولی (قطعۂ زائد)
Hypothesis	مفروضہ

I

Identity	مساوات متماثلہ
Imaginary quantities	مقادیر خیالی
Incummensurable (numbers)	متبائن (اعداد)
Independent (variable)	(متغیر) مستورع
Index	قوت نما
Induction	استقراء
Infinite great (small)	لاانتہا بڑا (چھوٹا)
Infinite series	سلسلۂ غیر متناہیہ
Integer	عدد صحیح
Intensity (of light)	اشتداد (روشنی)
Inverse variation	تغیر معکوس
Intvertendo (ratio)	عکس (نسبت)

J

Joint variation	تغیر مشترک
Jupiter	مشتری

L

Limit	انتہا یا حد
Linear (permutations)	خطی (ترتیبیں)
Logarithm	لوکارتم
Logarithmic series	لوکارتمی سلسلے

M

Mantissa	جلد اوّل لوکارتمی
Mass	مقدار مادّہ
Middle term	درمیانی رقم
Multinominal theorem	مسئلہ کثیر الارقام
Meltiple	ضعف
Multiplying factor	ضارب جز ضربی

N

Natural logarithm	طبعی لوکارتم
Natural numbers	اعداد طبعیہ
Negative	منفی
N—factorial	حاصل ضربی ن
Notation	طریق کتابت
Nth. power	ن ویں قوت

Nth root	ن واں جذر
Numerator	شمار کنندہ
Numerically	تعداداً

O

Odd	طاق
Ordinate	معین
Oscillating series	اہتزازی سلسلے
Oscillation	اہتزاز

P

Parobola	شلجمی (قطعہ مکافی)
Partial product	جزوی حاصل ضرب
Pendulum	رقاص
Perfect square	مربع کامل
Permutation	ترتیب
Plane	سطح مستوی
Planet	سیارہ
Polygon	کثیر الاضلاع
Position of rest	محل سکون
Positive	مثبت
Power	قوت
Pressure	دباؤ
Prime number	عدد مفرد
Product	حاصل ضرب
Proper fraction	کسر واجب
Proportion	تناسب
Proportional	تناسب

Q

Quadratic Equation	مساوات درجہ دویم
Quantities	مقادیر

R

Redical	علامتِ جذر
Radius	نصف قطر
Rationalise	ناطق بنانا
Rationalising factor	منطق جزو ضربی
Rational quantity	مقدار ناطق یا منطق
(Ratio of) less inequality	نسبتِ صغریٰ
Real quantities	نسبتِ کبریٰ
Reciprocal	متکافی یا مقلوب
Reciprocal equations	مساوات متکافیہ
Rectangle	مستطیل
Recurring decimal	کسور اعشاریہ متوالیہ
Recurring period	دورِ متوالی
Reduction	تحویل
Relation	ربط یا تعلق
Resistance (Electric)	مزاحمت
Resolution	تحلیل
Revolution	گردش
Right cone	قایم مخروط
Root (of an equation)	قیمت (مساوات)

S

Significant (digits)	ملحوظ (ہندسے)
Similar surds	متشابہ مقادیر اصم
Similar things	متشابہ اشیاء
Similar (triangles)	متشابہ (مثلثات)
Source of light	مبداء روشنی
Speed	چال
Square	مربع
Square pile	مربع انبار
Square root	جذر
Straight line	خط مستقیم
Sub-duplicate (ratio)	(نسبت) جذر
Subsequent (ratio)	تالی (النسبت)
Surds	مقادیر اصم

T

Tangent	مماس
Tension	تناؤ
Terms	ارقام
Transposition	عمل نقل
Triangular pile	مثلثی انبار
Triplicate (ratio)	(نسبت) مثلثہ

U

Unequal roots	غیر مساوی قیمتیں
Unit	اکائی
Unknown (quantities)	(مقادیر) مجہول

V

Variable quantities	مقادیر متغیرہ
Variation	تغیر
(Vary) inversely	(بدلتا ہے) بالعکس
(Vary) jointly	(بدلتا ہے) بالاشتراک
Venus	زہرہ
Volume	حجم
Vulgar fraction	کسر عام

LOGIC

منطق

Abstraction	تجرید
Accident	عرض یا عارضہ
Accident Seperable	(۱) عرض حادث (۲) عرض مفارق
Accident Inseperable	(۱) عرض لازم (۲) عرض غیر منفک
Affirmation	ایجاب
Agreement	موافقت
Disagreement	مخالفت
Alternative member	رکن متبادل

Ambiguous	مبہم
Analogy	تمثیل
Analogy false	تمثیلِ کاذب
Anticedent	مقدم
Anticedent Inveriable	مقدم دائمہ
Analysis	تحلیل
Analytic method	اسلوب تحلیلی
Attributes	اعراض
Argument	برہان
Axioms	(۱) اوّلیات ۔ (۲) براہینِ اولیہ ۔ (۳) علوم متعارفہ
Beliefs	یقینیات
Beliefs fundamental	۱۔ اوّلیات ۲۔ یقینیاتِ اولیہ
Beliefs Universal	۱۔ اوّلیاتِ عامہ ۲۔ یقینیاتِ عامہ
Category	مقولہ
Cause	علّت ۔ سبب
Cause Proximate	علّت قریبہ
Cause Remote	علت بعیدہ
Cause Predisposins	۱۔ علت بالواسطہ ۲۔ علت غیر مستقیم
Cause Direct	۱۔ علت بلاواسطہ ۲۔ علت مستقیم
Cause Final	
Casual relation	علاقہ علیت
Characteristic	خاصّہ
Circumstances	عوارض حالات

Cognition	تعقل
Classification	اصطفات
Collectively	کلیتہً
Common Effects	معلولات مشترکہ
Comparision	موازنہ ۔ مقابلہ
Comprehension	سمک
Conception	تصور
Concept	تصور
Condition	شرائط
Cannotation	تضمین
Consequent	تالی
Contradiction	تناقض
Contradictory	نقیض
Contradictories	منافی کامل یا نقیض
Contrary	ضد
Sub-contrary	متضاد مختلف
Conversion	عکس
Conversion Simple	سادہ ۔ مستوی ۔ بسیط
Conversion per accidence or by limitation	عکس بالتقید ۔ عکس اتفاقی عکس بالعوارض
Contraposition	عکس نقیض ۔ عکس تقابل
Controvend	منعکس یا معکوس
Copula	رابطہ
Corelative	متضائف

Data معطیات

Definition تعریف

Definition descriptive or Definition by accidental qualities بیان یا تعریف بالعوارض

Definition by accidents تعریف بالعوارض

Definition per differentic تعریف بالرسم

Definition Partial or incomplete تعریف جزوی یا ناقص

Definition Obscure, Figurative and Ambiguous تعریف مجہول ومجازی مبہم

Definition Complete تعریف کامل یا تام

Definition Accidental تعریف اتفاقی

Definition Redundant تعریف فاضل

Definition Provisional تعریف عارضی

Definition in Circle تعریف دوری

Definition too narrow تعریف غیر جامع

Definition too wide تعریف غیر مانع

Definition Negation تعریف منفی

Dectum de Omne et Nullo المقابل فی کل شے ولا شے

Denotation تعبیر

Difference اختلاف - تفریق

Distributively جزئیتہ

Differentia فصل

Division تقسیم

Division Physical partition and Metaphysical analysis تقسیم طبعی - تجزی بالشقاق وتحلیل مابعد الطبیعات

Division Cross تقسیم متوارد

Division complete or overcomplete تقسیم کامل یا اکمل

Division over lapping تقسیم متداخل

Division by Dichotomy تقسیم بالشفاع

Effect معلول

Eliminition طرح

Experience }
Experiment } تجربہ - اختبار

Explanation توجیہ

Extensive وسعت

Fallacies مغالطات

Fallacies of Inference مغالطات انتاجی

Fallacies Conversion مغالطات عکس

Fallacies Permutation or Contraposition مغالطات عدل

Fallacies opposition مغالطات منافات (معارضت)

Fallacies Subalternation مغالطات تحکیم

Fallacies Model consequence — مغالطات تبع جہتی

Fallacies Charge of relation — مغالطات تبدیل نسبت

Fallacies Mediate Inference — مغالطہ انتاج نظری

Fallacies Syllogistic — مغالطۂ قیاس

Fallacies of Indistributed Middle — مغالطۂ عدم حصر حد اوسط

Fallacies of four terms — مغالطۂ چار حد

Fallacies Non Syllogistic — مغالطۂ غیر قیاس

Fallacies Non-Inferential — مغالطۂ منطقی غیر انتاجی

Fallacy of Ambiguous middle — مغالطۂ ابہام حد اوسط

Fallacy of composition — مغالطۂ انشاء

Fallacy of Division — مغالطۂ تقسیم

Fallacy of Accident — مغالطۂ اتفاقی

Fallacy Non-logical or Material — مغالطۂ غیر منطقی یا مادی

Fallacy Undue Assumption of the premises — مغالطۂ مقدمہ مفروضہ بغیر وجواب

Fallacy Pettio Principil — مغالطۂ انحصار مقدمہ بر نتیجہ۔ اقتراح المسئول

Fallacy Argumentive circle — مغالطۂ برہان دوری

Fallacy Non-Causa Pro Causa — مغالطۂ مقدمہ غلط یا غیر موید

Fallacy Ignoratiu Elenchi — مغالطہ نتیجہ غیر متعلقہ۔ افحام الذہول

Fallacy Shifting the ground — مغالطۂ تبدیل بناے بحث

Fallacy Appeal to passion — مغالطۂ مرافعہ تشافقی

Fallacy Argument and hominum — مغالطۂ دلیل مرافعہ الی الشخص

Fallacy Popular — مغالطۂ دلیل مرافعہ الی تشافق العوام

Fallacy Verecundiam — مغالطۂ الی تعظیم المستندین العظام

Fallacy of four terms — مغالطۂ چار حد

Fallacy of four premises — مغالطۂ چار مقدمہ

Fallacy Undistributed Middle — مغالطۂ اوسط غیر محصور

Fallacy of Ellicit Process — مغالطۂ عمل سخت

Fallacy Negative Premises — مغالطۂ مقدمات سالبہ

Fallacy Semi-logical — مغالطۂ نیم منطقی

Fallacy Non-seqitur — مغالطۂ عدم لزوم بالتبع

Fallacy of many questions — مغالطۂ سوالاتِ کثیرہ

Fallacy Inductive — مغالطۂ استقرائی

Falsity — کذب

Figures — اشکال

Formal truth — حقیقت صوری

General — کلی

General Notion — تصورِ عامہ

English	Urdu
Generalisation	۱ استغراق ۔ ۲ استعمام ۔ ۳ تعمیم
Generalisation empirical	تعمیمات تجربی
Genus	جنس
Genus Summun	جنس عالی
Hypothesis	۱۔ مفروضات ۔ ۲۔ تقدیرات
„ Adequate	۱۔ تقدیر موجہ ۔ ۲۔ دعوی مفروض کامل
„ Gratuitous	۱۔ تقدیر تناعی ۲۔ دعوی مفروض غیر ضروری
Hypothetical reasoning	استدلال تقدیری
Inconsistent	متناقض
Indefinite	غیر متعین
Induction	استقرأ
Induction complete	استقرأ تام
Induction Incomplete	استقرأ ناقص
Inductis per simplicem enumeration	استقرأ سانج عددی
Inductive	استقرائی
„ Inference	انتاج استقرائی
„ Methods	طرق استقرار
Inference	انتاج ۔ استنتاج
Immediate	استنتاج بدیہی
Mediate	استنتاج نظری
Valid	استنتاج مباح
Implication	دلالت
Impact	معنی

English	Urdu
Intuition	علم وجدانی
Judgment	تصدیق یا حکم
Kind	قسم
Law	قانون
Law of idality	قانون عینیت
Law of Encluded Middle	قانون ارتفاع نقیضین
Law of Sufficient reason	قانون ارتفاع نقیضین
Law of Uniformity of nature	قانون استقلال و استمرار فطرت
Law of Causation	قانونِ علت و معلول قانون تعلیل
Logic	منطق
Logic Formal	منطق صوری
Logic Material	منطق مادی
Logic of Reality	منطق حقیقت
Logic of Deductive	منطق استخراجی
Logic Inductive	منطق استقرائی
Logic Pure	منطق خالص
Logic of certanity	منطق یقینی
Logic of Probability	منطق احتمالی
Logical propositions	منطقی خواص
Mal-observation	سوء مشاہدہ
Mechanical force	قوائے میکانی
Methods of induction	طرق استقرار
Methods of Agreement	طرق طرد

English	Urdu
Methods of difference	طرق عکس
Methods of double agreement	طریقۂ طرد بالتکرار
Methods of Residues	طریق طرح۔ طریق تحصیل
Methods of Concomitant variation	طریق اختلاف اوصاف با اوصاف
Mind	نفس
Modality	جہت
Moods	ضروب
Moods Subattere	ضروب تحتانی
Moods possible	ضروب منتجہ
Moods valid	ضروب واجبہ
Major Premises	مقدمۂ کبریٰ
Minor "	مقدمۂ صغریٰ
Negative	سلبی
Nomenclature	تسمیہ
Name	نام
Negation	سلب
Non-observation	عدم مشاہدہ
Objectivity	خارجیت
Observation	مشاہدہ
Orders	رتب۔ مرتبات
Partieular	جزئی
Perception	ادراک
Percepts	مدرکات

English	Urdu
Phenomena	مظاہر
Phenomenon	حادثہ، اثر
Postilate	اصول موضوعہ
Predicate	مسند۔ محمول۔ محکوم بہ
Process of Comparison	عمل موازنہ
Product of Comparison	نتیجہ موازنہ
Property	خاصہ
Proposition	قضیہ
Proposition Categorical	قضیہ حملیہ
Proposition Conditional	قضیہ شرطیہ
Proposition Affirmative	قضیہ موجبہ
Proposition Negative	قضیہ سالبہ
Proposition Necessary	قضیہ ضروریہ
Proposition Assertory	قضیہ مطلقہ
Proposition Problematie	قضیہ احتمالیہ
Prodosition Universal	قضیہ کلیہ
Proposition Particulal	قضیہ جزئیہ
Proposition Verbal or Analytical	قضیہ ملفوظی یا تحلیلی
Proposition Real or Synthetical	قضیہ معقولی یا ترکیبی
Proposition Hypothetical	قضیہ افتراضیہ
Proposition Conjunctive	قضیہ شرطیہ متصلہ
Proposition Disjunctive	قضیہ منفصلہ
Proposition Modal	قضیہ جہتیہ
Proposition Indefinite	

Proposition Singular	قضیہ مخصوصہ
Proposition Observe	قضیہ معدولہ
Proposition Contropositive	قضیہ متقابل
Proposition Symbolic	قضیہ انموذجی
Proposition Enplicative	قضیہ توضیحی
Proposition Real	قضیہ معقول
Proposition Synthetic	تفیہ ترکیبی
Proposition Accidental	قضیہ عارضی
Proposition Amplicative	قضیہ توفیری
Positive	ایجابی

Q

Quality	کیفیت ۔ صفت
Quantity	کمیت

P

Reasoning	استدلال
„ Probable	استدلال احتمالی
Reduction	تحویل
Reduction per deduction and impossible	تحویل بالاستخراج الی الاستحالہ
Reduction direct	تحویل مستقیم
„ indirect	تحویل غیر مستقیم
Resemblances	مشابہت

S

Science	حکمت
Simple	مفرد
Species	نوع
„ Infima	نوع سافل
Subject	موضوع یا محکوم علیہ
Substances	جواہر
Subaltern	ضد محکوم
Syllogism	قیاس
„ Enthymeme	قیاس مستوی الرکن
Syllogism Sorites	قیاس متراکمہ
Syllogism Epicheiema	قیاس مزاحفہ
Syllogism Dilemma	قیاس محتمل ضدین
Syllogism Pure	قیاس خالص
Syllogism Mixed	قیاس مخلوط
Syllogism Necessary	قیاس ضروریہ
Syllogism Assertory	قیاس مطلقہ
Syllogism Probable	قیاس احتمالیہ
Syllogism Categorical	قیاس حملیہ
Syllogism „ Pure	قیاس حملیہ خالص
Syllogism Hypothetical	قیاس افتراضیہ
Syllogism Disjunctive	قیاس منفصلہ
„ Categorical	قیاس منفصلہ حملیہ
Syllogism Conjuntive disjunctive	قیاس عاطفہ منفصلہ

English	Urdu
Syllogism Hypothetical Cotegorical	قیاس اقترانیہ حملیہ
Syllogism Dilemma	قیاس منفصلہ
Synonym	قیاس مرادف
Synthetical Method	اسلوب تحلیلی

T

English	Urdu
Term	حد
Term Single worded	حد یک لفظی
Term Many worded	حد کثیرالالفاظ
Terin Abstract	حد مجردہ
Terin Singular	حد جزئی
Terin General	حد کلی
Terin Middle	حد اوسط
Terin Minor	حد اصغر
Terin Major	حد اکبر
Terin Collective	حد اسم الجمع
Terin Concrete	حد مقرون
Terin Positive	حد مثبت
Terin Negative	حد منفی
Terin Privative	حد سلبی
„ Relative	حد سلبی
„ Absolute	حد مطلق
„ Connotative	حد تضمنی
„ Non-connotative	حد غیر تضمنی
Terin Categorematic	حد مواطی
„ Syn Catego-rematic	حد غیر مواطی
„ Indefinite	حد غیر معین
Theory	نظریہ
Theory of Predicate	مسئلہ محمولیت
Thought	فکر
Thought (object of)	مفکور
Trains of Reasoning	سلاسل
Synthetical Reasoning	ترکیبی استدراجیہ یا تدریجیہ یا مابعدی
Varification	امتحان
Barbara	برابابا
Darii	دہاقینی
Calaren'	شعاعتجہ
Ferio	قعیوقہ
Camestres	شرامعسس
Baroko	شراوکوہ
Cesare	شعسراعن
Festino	فعسبلنو
Darapti	دراارضی
Datisi	وطاطیس
Felapton	فعارضتون
Ferison	فی سورن
Disamis	ولیس امیس

Fresison	فرع میسون
Dimeris	دیماطیس
Doolamosk	شلاموسک
Facoko	فاشولو

Bokardo	بوکارو
Bramantip	براماطیض
Camenes	مشامنعس
Fesupe	فعساضو

تجویزِ اصلاحِ رسم الخط

از

جناب منشی فاضل مولوی محمد نعیم الرحمن صاحب ایم اے، فیلو مدراس یونیورسٹی پروفیسر عربی
فارسی اُردو گورنمنٹ محمڈن کالج مدراس

شاید ہی کوئی اُردو داں و اُردو خواں اس باب میں شک کرسکتا ہو کہ اب وہ زمانہ آگیا ہو کہ اُردو رسم الخط کی اصلاح کی جائے۔ بادی النظر میں اُردو کے رسم خط میں کسی طرح کا سقم نہیں معلوم ہوتا اور خیال ہوتا ہو کہ اس کی موجودہ صورت اس کی زندگی کے لئے کافی و وافی ہو۔ لیکن مختصر سے غور کے بعد ہی یہ حقیقتِ سنگین آشکارا ہو جاتی ہو کہ اگر اس میں ابھی سے اصلاح نہ کی گئی تو آئندہ رفتہ رفتہ اس کے رسم الخط میں اس قدر کثرتِ طرق اور اختلافِ صحیح پیدا ہو جائیگا جس کا سنبھالنا اور پھر ہر ایک طریق کے لئے دلائلِ صحت قائم کرنا نہایت دشوار ہو جائیگا۔ مزید برآں اس اختلاف سے اُردو زبان غیر اُردو داں اقوام کے لئے دنیا کی چند دیگر السنہ کی طرح عسیر الحصول ہو جائیگی۔

اس سے قبل اس عنوان پر جناب عبداللہ یوسف علی صاحب اور جناب سید ہاشمی صاحب اُردو کے دو حصوں میں تحریر فرما چکے ہیں۔ صاحب متقدم الذکر نے چند قواعد بھی اس باب میں منضبط کئے ہیں۔ آج میں بھی اسی موضوع پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں:۔

ا۔ جناب سید ہاشمی صاحب کی طرح میں بھی جناب عبداللہ یوسف علی صاحب کے پہلے تین قواعد کو

"درست اور قابل تسلیم" سمجھتا ہوں۔ چوتھے قاعدے میں مقدم الذکر صاحب نے جو اختلاف کیا ہے میں اس اختلاف سے متفق ہوں۔ یعنی یہ کہ قاعدہ یہ ہونا چاہیئے کہ :-

مرکب الفاظ کے جو اجزاء ترمیم یا ترخیم کی وجہ سے اب مستقل لفظ نہیں رہے ہیں ان کو علیحدہ علیحدہ نہ لکھنا چاہیئے۔

(ملاحظہ ہو اُردو۔ حصہ سوم صفحہ ۴۶۹)

۲۔ حروف و ۔ ی ۔ ن ۔ ہ کے متعلق سید ہاشمی صاحب نے طوالت کے ساتھ بحث کی ہے۔ ضمن (۲) میں واو اور ی پر بحث کرتے ہوئے ان کو تعجب ہوتا ہے کہ عبداللہ یوسف علی صاحب" اور ان کے ہم خیال ی اور و کی بحث کرتے وقت شاید اعراب کے وجود سے ہی خالی الذہن ہو جاتے ہیں جن کے بغیر اُردو تحریر کا کوئی لفظ بھی صحیح نہیں لکھا جا سکتا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ماقبل مفتوح اور معروف ہونے کی حالت میں تو کسی نئے قاعدے کی مطلق ضرورت نہیں کیونکہ مقررہ اعراب لگانے سے یہ آوازیں پیدا ہو جاتی ہیں" اگر میں اس فقرے کا مفہوم صحیح سمجھا ہوں تو شاید میرا یہ اندیشہ بے جا نہ ہوگا کہ جس طرح اُردو کی عام تحریر ہر وقت اور ہر غرض کے لئے اعراب کے استعمال سے مستغنی سمجھی جاتی ہے اور ان کے عدم وجود سے کوئی قاری الفاظ کو غلط نہیں پڑھتا (یا یوں کہئے کہ یہ فرض کیا جاتا ہے کہ غلط نہیں پڑھیگا) اسی طرح و اور ی کے سوال کو بھی قطعاً ترک کر دینا چاہیئے بنابریں عقیدہ سید صاحب موصوف نے ماقبل مفتوح اور معروف کے لئے جو مثالیں زیر، زیر اور پیش دے کر تحریر کی ہیں نہ صرف یہ کہ ان کی ضرورت ہی نہیں رہتی بلکہ و اور ی کی معروفیت۔ مجہولیت اور اقبال بالفتحہ کا سوال ہی بحث سے خارج ہوا جاتا ہے۔ مجھے یہ شبہہ ہوتا ہے کہ سید صاحب دو مختلف امور کو خلط ملط کر رہے ہیں یہ تو بالکل بجا ہے کہ ہر حرف پر اعراب پڑھا جاتا ہے حال آں کہ اسے ضبطِ تحریر میں نہیں لایا جاتا۔ مگر و اور ی کے باب میں ان حروف کے خاص اعراب کا سوال نہیں ہے بلکہ ان کے حروف ماقبل کے اعراب سے بحث ہے جس کی وجہ سے ان کے تلفظ میں فرق آ جاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ مسئلہ اہم ہے اور ضرور ہے۔ اُردو جس شخص کی مادری زبان ہے وہ تو شاید آسانی سے تمام واوی اور یائی الفاظ کو صحت سے پڑھنے پر قادر ہو سکتا ہے مگر ایک غیر اُردو داں قوم کے فرد کے لئے یہ امر اُردو کے نشر اور اس کی ترقی میں سخت رکاوٹ پیدا کرتا ہے

لہذا اس میں ترمیم کرنا اولیات اصلاح میں شمار کرنا چاہیئے۔

تمام دیگر حروف کی طرح واو :۔

(۱) مفتوح ہوگا یا مکسور یا مضموم۔ اور یٓ مفتوح ہوگی۔

(۲) واو کا حرف ماقبل مفتوح ہوگا یا مضموم۔ اور یٓ کا حرف ماقبل مفتوح ہوگا یا مکسور۔

صورت اوّل میں وٓ اور یٓ دونوں حروفِ صحیحہ کے طور پر شمار ہونگے اور صرف لفظ کے شروع یا درمیان میں آسکتے ہیں۔ مثلاً :۔

حرف	شروع میں	درمیان میں
واو مفتوح	وَسیلہ	محاوَرہ
واو مکسور	وِقار	کاوِش
واو مضموم	وُسعت	×
یائے مفتوح	یَل	غالیَہ

صورتِ ثانیہ میں وٓ اور یٓ حروفِ صحیحہ نہیں ہونگے۔ بلکہ :۔

(ا) ماقبل مفتوح ہونے کی صورت میں دونوں علت مرکبہ اور

(ب) وٓ ماقبل مضموم اور یٓ ماقبل مکسور حروف علت شمار ہونگے۔ بعینہٖ یہی حال الف ماقبل مفتوح کا ہے کہ وہ بھی اس صورت میں محض حرف علت ہوتا ہے نہ کہ حرف صحیح۔ مزید برآں الف واو او، تین صورتیں ایسی ہیں جن میں یہ حروف مسکون ہوتے ہیں ورنہ ان پر کسی نہ کسی اعراب مختصر یہ کہ زبر۔ زیر اور پیش کے اعراب سہ گانہ سے معر ہیں اور مسکون ہوں تو حروف علت۔ اور وٓ اور یٓ ہر ایک دو دو قسم کی آوازیں دیتے ہیں جن کو معروف

غیر اُردو داں شخص کے لئے اس میں سخت دشواری سے سابقہ پڑتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس کا کافی و وافی بندوبست کرکے اُردو تحریر کی قرأت میں سہولت پیدا کی جائے۔

بنابریں سبب مجھے جناب ہاشمی صاحب سے اختلاف ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ "پنجاب والوں نے لفظ کے آخر میں لمبی ے لکھنے کا (جو) طریقہ نکالا ہے اسے سید صاحب "غیر ضروری بلکہ بے اصولی کی بات" کیوں قرار دیتے ہیں۔ آج کل یہ طریقہ صرف پنجاب ہی میں رائج نہیں ہے بلکہ اودھ میں بھی جاری ہے اور اگر سید صاحب غور فرمائیں تو غالباً انھیں اس امر سے اتفاق ہوگا کہ اس طریق نے اُردو کی قرأت میں بہ نسبت سابق بہت زیادہ سہولت پیدا کردی ہے۔ اگر ان کے اس مذاکرہ کی مطبوعہ صورت ان کی تحریر کا چربہ ہے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ خود بھی اس کے متبع ہیں! اور ایسا نہیں ہوسکتا جب تک کہ انہوں نے اس طریق عمل میں سہولت کا اندازہ نہ کرلیا ہو۔

بہرکیف میں وٓ اور یٓ میں معروف و مجہول کی تمیز کے لئے نئی تدابیر اختیار کرنے کو ضروری خیال کرتا ہوں۔ اور جناب عبداللہ یوسف علی صاحب نے یٓ کے متعلق جو تجاویز پیش کی ہیں ان سے بالکلیہ متفق ہوں۔ البتہ اس قدر ضرور ہے کہ انہوں نے وسطی یائے مجہول کے نقطوں کے باب میں صرف ایک چھوٹے سے خط کی جو تجویز کی ہے اس میں مجھے یہ شک ہوتا ہے کہ اکثر محررین دو نقطوں کو اسی طرح لکھتے ہیں کہ وہ چھوٹا سا خط معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا میرے خیال میں مناسب ہوگا کہ اس کے لئے یہ قاعدہ قائم کیا جائے کہ:۔

لفظ کے درمیان میں جو یائے مجہول ہو اس کے نیچے بجائے نقاط کے ایک چھوٹی سی ضرب
امت بنائی جائے۔ مثلاً شیر۔ سویرے۔ تیرا وغیرہ

طرح جناب عبداللہ یوسف علی صاحب کی تجاویز متعلقہ وٓ میں واو مجہول کی مجوزہ شکل میں
شبہہ ہوتا ہے جو میں نے ابھی یٓ کے بارے میں بیان کیا ہے۔ اور میں یہ تجویز پیش کرتا
[illegible] خط کی صورت دی گئی ہے۔ اسی طرح
ا جائے اور اسے آخر میں موڑ دیا جائے
یا ہے۔ پس الفاظ کرد۔ جاؤ اور چلو کا املا یوں ہوگا۔

کرف - جاف - چلف

اس کے متعلق بطور تنبیہ اتنا اور عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اس مجوزہ بلا نقطہ ف کے آخر میں جو موڑ ہے اسے اندر سے خالی رہنا چاہیئے نہ کہ بھرا ہوا۔

۳۔ اس کے بعد جناب ہاشمی صاحب نے ہائے مخلوط کی بحث اُٹھائی ہے۔ اور اس دوران میں بھی انہوں نے اہل پنجاب کی اختراع پر "بے اصولی" کا اعتراض وارد کیا ہے۔ اور گو کہ وہ اس "رسم خط کی "ظاہری خوبی اور سہولت" کے قائل ہیں تاہم (صفحہ ۴۳، ۴۴ پر) اس کے لئے بھی ایک قاعدہ وضع کرتے ہیں۔ جو ایک سرسری نظر سے دیکھنے ہی میں زحمت فزا اور پر تکلف معلوم ہوتا ہے۔ میں نے ہر چند غور کیا مگر اس کی تائید کے لئے کوئی وجہ نہیں پاتا۔ بلکہ میں اس باب میں بھی جناب عبد اللہ یوسف علی صاحب سے متفق اور ان کا موید ہوں اور اسی طریقہ کو بہترین سمجھتا ہوں جو وہ بتا رہے ہیں۔ اور زیادہ تر اس لئے کہ وہ بہت کچھ رائج اور مقبول بھی ہو چکا ہے۔

۴۔ پھر جناب ہاشمی صاحب کے ہاں نون کی بحث آتی ہے۔ نون غنہ کے باب میں دونوں حضرات کا بہت کم اختلاف ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اہل پنجاب کا طریقہ کہ لفظ کے آخری نون غنہ کو بلا نقطہ اور درمیانی نون غنہ پر الٹا جزم لکھا جائے نہایت معقول ہے۔ اسی کو اختیار کر لینا بہترین تدبیر ہے۔

اس ضمن میں جناب ہاشمی صاحب ڈرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جناب کاظم فرید آبادی کے " انۂ بنۂ پنۂ وغیرہ حروف غنہ .. .. کو بھی اُردو کے حروف تہجی میں بڑھانا پڑیگا" میرا خیال یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کے خوف یا تامل کی ضرورت نہیں ہے۔ جونکہ اُردو زبان سنسکرت۔ ہندی۔ عربی اور فارسی زبانوں سے (یعنی زیادہ تر) بنی ہے اس لئے اس کی حروف تہجی کی تعداد اس قدر زیادہ ہے۔ گو کہ اسی سبب سے وہ اپنی موجودہ صورت میں بھی جامع ہیں۔ مگر اُردو کی آئندہ ترقی و نشر۔ اس کی تکمیل و کمال اور جمع و منع ضہ امر کا مقتضی ہے کہ اس میں اور اضافہ ہو۔ میں تجویز کرتا ہوں کہ آئندہ اُردو کے حروف تہجی میں لھ

ٹھ۔ جھ۔ چھ۔ دھ۔ ڈھ۔ کھ۔ گھ۔ کھ۔ نھ اور جناب کاظم کے مجوزہ "حروف غنہ" گنے جائیں۔

۵۔ جناب ہاشمی نے ضمن (۴) میں کیا (سوالیہ

ہے وہ نہایت معقول اور قابل عمل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اُنہوں نے حروف ہائے۔ حروف غنہ۔ حروف یائے اور دیگر حروف مخلوط کے لئے اسلئے جزم کی جو جامع تجویز پیش کی ہے وہ عمدہ اور معقول ہے۔ مگر اوّل دو صورتوں میں اس قاعدے کی ایسی تعمیم سے اس لئے اختلاف ہے کہ ان کے لئے فی الحال پنجاب میں بالکلیہ اور دہلی وا ودھ میں زیادہ تر جو طریقہ رائج ہے اس سے انحراف کرکے نئی تدابیر و اشکال کا قائم کرنا ان کے حصول واتخاذ میں ضرور سنگ راہ ہوگا۔ اس لئے بہتر ہے کہ ان کو ایسی صورت پر باقی رکھا جائے (جیسا کہ میں اوپر عرض کرچکا ہوں) اور تیسری اور چوتھی صورتوں میں جناب ہاشمی کا مجوزہ قاعدہ قائم کیا جائے۔

۶۔ ٹ۔ ڈ اور ڑ کے متعلق تو غالباً کیا یقیناً سب متفق ہیں اور ہونگے اور ان پر بجائے چار نقطوں یا دو چھوٹے چھوٹے خطوط کے ایک چھوٹی سی ط بنا دینا انسب واولیٰ ہے۔ افسوس کہ نون غنہ بلا نقطہ کی طرح ٹائپ میں ایسی ٹ ڈ ڑ کا ابھی تک پتا نہیں ہے۔ اس کا سبب اہلِ اُردو و حامیانِ اُردو کی غفلت شعاری اور بے پروائی کے اور کیا ہوسکتا ہے۔

۷۔ جناب ہاشمی صاحب کا خیال ہے کہ "غیر زبانوں کے لب و لہجہ اور اصوات کے بالکل صحیح لکھنے کے لئے قاعدے بنانے ہمارا فرض نہیں ہے" افسوس کہ میں ان کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرسکتا! جب تک کہ دنیا مقام اسباب ہے اور اس کے کاروبار نتائج وعلل پر مبنی ہیں۔ جب تک کہ انسان انسان ہے اور اس کے مختلف شعوب وقبائل واقوام میں تعلقات ہیں اور وہ بغیر ایسے تعلقات اور اخذ وعطا کے زندگی بسر نہیں کرسکتے یہ ناممکن ہے کہ اُردو اور اُردو والوں کو غیر زبانوں اور ان کے لہجہ اور پھر معانی مطالب کو [illegible] کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔ گو آج ہمیں اپنی بدشوقی اور دوں ہمتی سے ایسی ضرورت محسوس نہ ہوتی ترقی اُردو محض الفاظ ہی نہیں ہیں اور اگر دنیا کی ایک مستقل زبان ہوکر عزت وشان کی زندگی لئے مقدر ہے تو ایک زمانہ آئیگا (اور ممکن ہے کہ جلد آ پہنچے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ آگیا خصوصاً اور متفرق دیگر علوم وفنون کے مطالعہ میں عموماً اس کی ضرورت مختلف السنہ عالم کی مختلف الہیئت آوازوں اور لہجوں

کے ادا کرنے کا سامان مہیا کریں۔ اس سے میری یہ مراد نہیں ہے کہ ہمیں دنیا کی تمام زبانوں کی آوازوں کے لئے حروف وضع کرکے اپنے حروف تہجی میں مستقل طور پر شامل کرلینا چاہیئے۔ کیوں کہ ایسا کرنا خلاف اقتضاء خلاف فطرت اور بے کار محض ہوگا۔ میرا اختلاف مبنی ہے جناب ہاشمی کے الفاظ "ہمارا فرض نہیں" پر۔ میں سمجھتا ہوں کہ

"غیر زبانوں کے لب ولہجہ اور اصوات کے بالصحت ادا کرنے کے لئے قاعدے بنانا ہمارا فرض ہے۔

[میں نے اپنے اس قول میں لفظ "صحیح" کو لفظ "بالکل" سے مقید نہیں کیا۔ کیوں کہ جہاں تک میرا خیال مجھے مدد دیتا ہے کسی اہل زبان کو من حیث القوم (نہ بلحاظ فرد) کسی دوسری زبان کے "بالکل" صحیح لہجہ کے ادا کرنے کی طاقت نہیں ہو سکتی!]

اس ضمن میں مثال کے طور پر میں انگریزی اور جرمن زبانوں کو پیش کرتا ہوں جنہوں نے السنۂ مشرقیہ کی تقریباً تمام زبانوں کے صحیح لہجہ وصوت کے اظہار کے لئے اپنے اپنے طور پر مختلف تدابیر اختیار کی ہیں۔ مثلاً

ج کو انگریزی میں j اور جرمن میں dsch سے لکھا جاتا ہے
خ " kh " ch "
ش " sh " tsch "
ی " y " j "

ع اور ہمزہ انگریزی اور جرمن میں بالترتیب بالائے سطر ایک اُلٹے اور سیدھے قامہ سے ظاہر کئے جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

دور کیوں جایئے ہندی ہی کو لیجئے اور دیکھئے کہ انہوں نے ہمارے حروف ذ ز ض ظ کے اظہار کے لئے اپنے حرف ज کے نیچے اور خ کے لئے ख کے نیچے نقطہ دے کر لکھنا شروع کیا ہے۔ یورپ کی دیگر زبانوں (مثلاً فرانسیسی۔ ہسپانی۔ اطالی) میں بھی اسی طرح ہماری زبانوں کے لئے

حروف متشکلہ ومتغیرہ اور علامات مختلفہ سے کام لیا جاتا ہے۔ برعکس اس کے اردو کی بے مائگی کا یہ عالم ہے کہ
ہم ہندی (یا سنسکرت) کے حروف ण ञ ङ ऋ ष ہی کے اظہار کی طاقت نہیں رکھتے جو
ہماری ہمسایہ زبان ہے اور جسے اردو کی ماں نہیں تو بہن کہنا بے جا نہیں ہے۔ تا بہ السنۂ دیگر چہ رسد
اسی طرح مثلاً انگریزی کے let - net - set اور stall - hall - ball
اور tour وغیرہ الفاظ کے ٹھیٹھ انگریزی تلفظ کے اظہار کا ہمارے ہاں کوئی وسیلہ نہیں ہے۔ اور
انگریزی کے مرکب و ممتزج الفاظ اور اسماء خاصّہ کو اردو میں لکھنے میں جو زحمت پیش آتی ہے اس کے
بیان کی حاجت ہی نہیں۔ فرض کیجئے کہ علوم و فنون کے متعلق نہیں تو کم از کم اگر ہم کو انگریزی کے کسی مؤرد
لفظ کے باب میں اپنی کسی لغت کی کتاب میں مأخذ انگریزی اور اس کے اصلی تلفظ کے اظہار کی ضرورت
پڑے (اور پڑے ہی گی) تو کیا کیا جائیگا؟ اب تک تو ایسی کتب لغات میں اُلٹے سیدھے کسی طرح گزارہ
ہو جاتا تھا لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آئندہ بھی بیسویں اور اکیسویں صدی کی ترقی علوم و فنون کے زمانے میں
اسی طرح کام چل سکیگا؟ میں تو نہیں سمجھتا کہ کوئی صاحبِ فہم اور خیرخواہ اردو اس سوال کا جواب اثبات
میں دیگا۔ میرا خیال ہے کہ وہ وقت یہی ہے اور اسی وقت اہل اردو بھی اپنے ہاں دیگر السنہ کی اصوات
اور ان کے لہجے کے لئے حروف اور ان کے اوضاع کی تقسیم و ترتیب کا کام شروع کردیں۔ جس طرح انگلستان
میں یہ کام رایل ایشیاٹک سوسائٹی نے کیا ہے (اور کر رہی ہے) بعینہ اسی طرح یہاں بھی انجمن ترقی اردو کا
فرض ہے کہ وہ اس طرف متوجہ ہو اور جس قدر جلد ان تمام امور کا تصفیہ کردے بہتر ہو۔ کیوں کہ اردو کی جو
لغت ہم تیار کرنے والے ہیں اس میں اس کی سخت ضرورت ہوگی۔ مزید برآں یہ اردو کے تمام اہل قلم
اور مصنفین اور مؤلفین کو ایک ہی رسم الخط پر جمع کردیگی اور اردو ادبیات آئندہ ایسے اختلاف تحریر کے
بدنما داغ سے محفوظ رہینگی۔ ظاہر ہے کہ اردو میں کم و بیش تمام ہندی زبانوں سے الفاظ لئے گئے ہیں اور
پھر یورپ کی بعض زبانیں بھی اس میں دخیل ہیں۔ لہذا سب سے پہلے ہندوستانی اور پھر انگریزی کی ضرورت
اصوات کے لئے سامان کرنا چاہیئے اور اس قسم کے تصفیہ کے بعد تمام ملک میں ہر اہل قلم کے لئے اسی کا
استعمال لازم قرار دیا جائے۔

رسم خط کے ساتھ ساتھ اوقاف قرأت کی تعین بھی ضروری ہے جس کے عدم وجود سے اُردو تحریر و تقریر میں جو نقص ہے اور رہیگا اس کی تشریح و تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

مگر یہ اور اس سے قبل کی فصل میں مذکورہ امور علیحدہ علیحدہ بھی معرض بحث میں آسکتے ہیں۔ اُردو رسم خط سے یہ مضامین متعلق ہیں اس لئے میں نے ان کی جانب توجہ کا انعطاف کیا ہے۔

بہر حال ان تمام امور کی تعیین و تقسیم ہماری انجمنِ ترقی اُردو کے مقاصد میں شامل ہے اور جس قدر جلد ہو سکے انھیں تکمیل کو پہنچ جانا چاہئے۔

محمد نعیم الرحمٰن



تبصرہ

مرہٹی دناں کوش

یعنی

(مرہٹی اِن سائیکلوپیڈیا)

جلد اوّل

اہلِ مہاراشٹر قابل مبارک باد ہیں کہ جس علمی مہم کی تکمیل کے درپے وہ کئی سال سے تھے، اس کی پہلی قسط اب شائع ہوئی ہے۔ کتاب کے اصل مطالب پر بحث کرنے سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ابتدا و قیام کا مختصر سا ذکر کر دیا جائے۔

اس سے اہلِ مہاراشٹر کی معاملہ فہمی اور دُور بینی کا پتہ چلتا ہے کہ اس قاموس علوم کی تالیف کے لئے اُس کے بانیوں اور منتظموں نے (جیسا کہ ہمارے ہاں کا معمول ہے) کسی راجہ مہاراجہ کے سامنے دست گدائی نہیں پھیلایا اور نہ کسی سے عطیہ کی درخواست کی، بلکہ یہاں تک احتیاط کی ہے کہ اگر کوئی عطیہ دینا چاہے بھی تو وہ قبول نہیں کرتے۔ اس علمی مہم کے اصل بانی اور اس کے روح و رواں ڈاکٹر سری دھر وِنکٹیش کیتکر ایم اے، پی ایچ ڈی ہیں۔ انھوں نے اس کام کے چلانے کے لئے جو محنت طلب ہی نہیں بلکہ زرطلب بھی ہے، یہ ترکیب نکالی

لہ یہ وہی لفظ ہے جو ہندی میں گیان ہو گیا ہے اور اصل سنسکرت میں جنان ہے

کہ دناں کوش منڈل کے نام سے ایک کمپنی قایم کی۔ سرمایہ کا پہلا اندازہ پچاس ہزار روپیہ کیا گیا تھا۔ جو پانسو حصوں
میں تقسیم کیا گیا۔ مگر خریداروں کو ایک حصہ سو روپیہ کا ۸۵ روپیہ میں دیا گیا۔ اس کے بعد پھر پانسو حصے پچاس
ہزار روپیہ کے نکالے گئے۔ پہلے خریداروں کو سو روپیہ کا حصہ پچاسی میں دیا گیا۔ لیکن دوسری بار سو کا
حصہ سو ہی میں دیا گیا۔ اس کے بعد حصے کی قیمت ایک سو پینتیس ۱۳۵ ہو گئی اور کتاب کے شائع ہونے تک ڈیڑھ سو
روپیہ ہو جائے گی۔

اس کمپنی کی رجسٹری ۸ رجولائی ۱۹۱۶ء میں ہوئی اور ۲۰ رمارچ ۱۹۱۷ء میں کام کا آغاز ہوا۔
ابتدا میں اس کا صدر دفتر ناگپور میں تھا۔ اور پونا، بمبئی اور لندن میں اس کی شاخیں قایم کی گئیں۔
مگر بعد ازاں (غالباً ۱۹۱۹ء میں) صدر دفتر پونا میں منتقل ہو گیا اور شاخوں کی ضرورت نہ رہی۔

اس ادارے کے چیف اڈیٹر اور منتظم ڈاکٹر کیتکر ہیں اور پندرہ اور تعلیم یافتہ اور قابل اشخاص اُن کی
زیر نگرانی ان سائیکلو پیڈیا اور دفتر کا کام کرتے ہیں۔ علاوہ ان اصحاب کے جو دفتر میں کام کرتے ہیں، دوسرے
ایسے اہل علم سے بھی معاوضہ دے کر مضمون لکھوائے گئے ہیں جو اپنے اپنے فن کے ماہر تسلیم کئے جاتے ہیں۔
خصوصاً اُن مضامین کے لئے ماہرین فن کی ضرورت واقع ہوئی ہے جو دنیا کی مختلف زبانوں سے انتخاب کرکے
مرہٹی میں لکھے جائیں گے۔ اس کا انتظام دفتر میں نہیں کیا گیا اور نہ ایسا ممکن تھا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ
ان ماہرین فن کو فرصت نہیں ہوتی تو ادارہ کی طرف سے تنخواہ دار آدمی اُن کی مدد کے لئے بھیج دیا جاتا ہے
لیکن ان مضامین کی تنقید و نگرانی وغیرہ دفتر ہی میں ہوتی ہے۔ دفتر کے لئے صرف ایسے مضامین رکھے گئے
ہیں جن کو مختلف کتابوں سے منتخب کرکے تیار کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً تاریخی معلومات وغیرہ جو مسلّمہ اور
مستند کتابوں سے جمع کئے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر کیتکر کی تنخواہ ابتدا میں تین سو روپیہ ماہانہ تھی۔ بعد میں چار سو پچیس ۴۲۵ ہو گئی۔ ہم نے اس ادارہ کا
معائنہ ۱۹۱۹ء میں کیا تھا اور جہاں تک ہمیں یاد ہے اس کا ماہانہ خرچ دو ہزار روپیہ تھا۔ منتظمین سے گفتگو میں
یہ معلوم ہوا کہ اس کتاب کی تکمیل میں چھ سال صرف ہوں گے۔ اور ہمیں یاد پڑتا ہے کہ ان کا یہ ارادہ تھا کہ
ابتدائی چار جلدیں ہندوستان اور دنیا کے عام معلومات اور اہم مباحث پر ہوں گی۔ باقی جلدوں میں معلومات

لغت کے طور پر بہ ترتیب حروف ابجد درج ہوں گے۔ چنانچہ پہلی جلد ابھی شائع ہوئی ہی اور اس کا عنوان "ہندوستان وجگ" (ہندوستان اور دنیا) ہی۔

علمی اصطلاحات کی دقت ہر دیسی زبان میں پائی جاتی ہے اور یہی مشکل مرہٹی زبان میں بھی پیش آئی۔ یہ مسئلہ بارہا مرہٹی پبلک کے سامنے پیش ہوا مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ لہذا منتظمین ان سائیکلوپیڈیا کو علمی اصطلاحات کی لغت بھی تیار کرنی پڑی۔ اُن کے بیان کے مطابق یہ لغت یکم دسمبر ۱۹۱۹ء کو مکمل ہوجانی چاہیئے تھی۔ انھوں نے ہر انگریزی لفظ کے لئے جدید مرہٹی لفظ وضع نہیں کیا۔ بلکہ جو الفاظ اس سے قبل بعض مصنفین نے وضع کئے ہیں یا جو الفاظ قدیم سے زبان میں رائج ہیں انھیں تنقیدی نظر سے دیکھا ہی اگر وہ صحیح ہیں اور مفہوم ادا کرتے ہیں تو انھیں بجنسہٖ قایم رکھا ہی۔ البتہ جن اصطلاحات کے لئے مرہٹی میں الفاظ نہیں ہیں اُن کے لئے جدا الفاظ وضع کئے ہیں۔ اس کے لئے انھیں سائنس اور دیگر علوم کی تمام کتابیں جواب تک مرہٹی میں لکھی گئی ہیں جمع کرنی پڑیں۔ نیز وہ ماہانہ رسالے وغیرہ بھی جمع کئے گئے جن میں کبھی کبھی علمی مضامین شائع ہوئے ہیں۔

جرمن اور فرنچ زبانوں سے بھی کام لیا گیا ہی۔ ہندوستان کے متعلق بعض مضامین کے لئے جن کا تعلق سنسکرت کے ادب اور قدیم زمانہ سے ہی ان زبانوں میں بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔ یہ کام دو صاحبوں کے سپرد کیا گیا ہی۔ ان میں سے ایک صاحب نے جرمنی میں تعلیم حاصل کی ہی اور دوسرے صاحب ایک مدت تک فرانس میں مقیم رہے ہیں اور فرانسیسی زبان پر قدرت رکھتے ہیں۔

معلومات کے بہم پہنچانے میں اس امر کا التزام کیا گیا ہی کہ اس طور سے لکھی جائیں کہ آسانی سے سمجھ میں آسکیں۔

ہندوستان کے متعلق عام طور پر اور خاص طور پر مہاراشٹر کے متعلق معلومات تفصیل سے دی گئی ہیں دوسرے ملکوں کے متعلق اختصار سے کام لیا گیا ہی۔

حتی الامکان یہ کوشش کی گئی ہی کہ مضامین طویل نہوں۔ شاید ہی کوئی مضمون ایسا ہوگا جو آٹھ صفحے سے زائد ہو (کتاب کی تقطیع ۶ × ۱۰ ہی اور ہر صفحہ کے دو کالم ہیں)

تصویریں بھی ہوں گی (کتاب کی خوبصورتی کے لئے نہیں، بلکہ مطالب کے سمجھنے کے لئے)۔

جہاں تک ممکن ہوگا جدید ترین معلومات بہم پہنچائی جائیں گی۔

ہندو تمدن و تہذیب اور علوم و فنون کے متعلق جہاں تک ممکن ہوگا کامل معلومات بہم پہنچانے کی کوشش کی جائے گی۔ زمانۂ وید سے لے کر اب تک جتنے مذاہب اور فرقے پیدا ہوئے ہیں ان کا تفصیلی ذکر کیا جائے گا بدھ، جین، من بھاؤ وغیرہ کے متعلق جو کچھ لکھا جائے گا، غیر طرفدارانہ ہوگا۔ اُن کے خیالات و عقائد کی صداقت وغیر صداقت سے بحث نہیں کی جائے گی۔ صرف ان کی رائیں اور عقاید لکھدیئے جائیں گے۔ البتہ ان فرقوں کے تنزل و انحطاط کے اسباب کا ضرور ذکر کیا جائے گا۔

عام تاریخی مضامین کے متعلق صرف اسی قدر لکھا جائے گا جس کا علم یقینی ہے۔ جو حالات ابھی مشتبہ ہیں اور پایۂ تحقیق کو نہیں پہنچے اُن کے لکھنے سے احتراز کیا جائے گا۔

اپنی طرف سے کسی قسم کی جدید اختراع یا جدید تحقیقات نہیں کی جائے گی۔ لیکن جو معلومات تحقیق کو پہنچ چکی ہیں وہ سادہ زبان میں بیان کردی جائیں گی۔

زمانۂ حال کے حالات ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں گے۔ سائنس سے متعلق امور پر مختلف مضامین لکھے جائیں گے۔ جہاں ضرورت محسوس ہوگی وہاں ایک مبحث پر دو دو مضمون ہوں گے۔ ایک عام ناظرین کے لئے اور دوسرا خاص لوگوں کے لئے۔ اور یہ الگ الگ ٹائپ میں چھاپے جائیں گے۔

اُن جدید علمی الفاظ کے ساتھ جو وضع کئے گئے ہیں قوسین میں اصلی انگریزی الفاظ بھی لکھدیئے جائیں گے۔

اُن علوم کے متعلق جن میں مغربی اور مشرقی طرزِ خیال جدا جدا ہے (مثلاً کیمسٹری، طب، موسیقی، نجوم وغیرہ) اُن پر مغربی اور مشرقی نقطۂ نظر سے الگ الگ مضمون لکھے جائیں گے۔ دونوں کو ایک دوسرے ملایا نہیں جائے گا۔

اُن خاص مضامین کے متعلق جو ہندوستان سے مخصوص ہیں مثلاً منتر شاستر، جوتش اور روحانیات کے بعض طریقے، ہماری رائے متشککانہ رہے گی۔ مگر اُن کی تاریخی نشوونما، اور اُن کے طریقے اور اعمال بے کم و کاست

درج کئے جائیں گے۔

تاریخ ہندوستان کی مفصلۂ ذیل تقسیم کی جائے گی۔

(۱) زمانۂ وید (۲) مابعد وید آمدِ مسلمانان (۳) مسلمانوں کا عہد (۴) یورپی عہد (۵) ہندوستان کی دوسری قوموں کی تاریخ (مثلاً راجپوت، سکھ، گورکھا، برہمی، اُڑیا وغیرہ)

مرہٹوں کی تاریخ پر علیٰحدہ مضمون ہوگا۔

جغرافیہ - یورپ کا جغرافیہ، ایشیا کا جغرافیہ (جس میں ہندوستان کا جغرافیہ داخل نہوگا) امریکا، افریقہ، اوشینیا کا جغرافیہ۔

معاشرتی حالت - قانون (ہندوستان اور تمام دُنیا کے) دھرم شاستر (ہندؤں کا قانون)

معاشی (اقتصادی) تجارت اور اس کے متعلق دوسرے شعبے۔

مذاہب - اور مذہبی فرقے۔

انسان کی مختلف نسلوں کا ذکر

سائنس-کیمسٹری، ارضیات، زراعت، نباتات، عضویات، ریاضیات، ہیئت، بلاغت، موسیقی، تعلیم، تاریخی تحقیقات، تاریخ ادب، مصوری، جنتر (میکانک) انجینیری، ہندی طب، مغربی طب

یہ ہی خلاصہ اُس کارنامہ کا جو مرہٹی ان سائیکلوپیڈیا کے منتظمین کے پیش نظر ہی اور جسے ہم نے عام اطلاع اور معلومات کے لئے درج کر دیا ہی۔ ممکن ہے کہ آیندہ کام کرنے والوں کو اس سے کچھ مدد ملے۔

اب ہم پہلی جلد کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ جلد مفصلۂ ذیل چھ ابواب اور ایک ضمیمہ پر منقسم ہے۔ (تعداد صفحات ۵۰۰)

پہلا باب - دُنیا میں منافسۃ اور مقابلہ۔

دوسرا باب - ہندوستان کا سیاسی تعلق (دوسرے ممالک سے)

تیسرا باب - معاشرتی تعلق (دوسرے ممالک سے)

چوتھا باب - ہندوستان اور ہندو - ان کا تعلق دُنیا سے بلحاظ تہذیب و تمدّن و روحانیات - یعنی ان کا اثر دُنیا کی دوسرے اقوام پر اور دوسرے اقوام کا اثر ان پر -

پانچواں باب - ہندو جماعت کی اندرونی حالت اور اس کا تعلق ہندوستان کی دوسرے اقوام سے -

چھٹا باب - قومی مذہب (نیشنل ریلیجن) قایم کرنا - قومی دھرم اور سیاسی قوت - رائے عامہ (پبلک اوپینین) اور عوام (پبلک) کی قوت سے کیا توقع ہوسکتی ہے - ہندو سوسائٹی کو ترقی دینا (یعنی ہندو خیالات کو پھیلانا تعصب کو کم کرنا اور پھر چار وان قایم کرنا) آیندہ معاشی (اقتصادی) حالت - قومی تحریک - مہاراشٹر کی تاریخ اور ان کی تجارت اور معاشرت - مفتوحہ اقوام کی معاشی حالت - ہندوستانی اور یورپی معاشرت کا مقابلہ - بنک - کواپریٹو سوسائٹیاں (انجمن ہائے اتحادی) مختلف ذاتوں اور قوموں کی حفاظت -

ضمیمہ - کانگریس کا جدید دَور - پنجاب و خلافت کے واقعات - عہدنامہ سیورے -

اس جلد کے پہلے حصے میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندی تمدّن کا اثر دنیا کے ممالک پر غیر ممالک کا اثر ہندوستان پر کیا ہوا - اس بحث میں سیلون اور برہما کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان دونوں کو اپنے ساتھ ملانے اور ہندوستانی معاملات میں متحد کرنے کی کوشش کرنی چاہیے - کیوں کہ یہ ہم سے زیادہ قریب اور ہندوستانی تمدّن کے زیادہ زیر اثر ہیں - اس کے بعد جاوا، سماترا، بورنیو، سنگلدیب، لنکا دیپ، چین، جاپان، تبت، افغانستان، بلوچستان، افریقہ، یونان و روم وغیرہ کا مختصراً ذکر کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ قدیم زمانہ میں ان ممالک پر ہندوستان کے تمدّن و تہذیب کا اثر کن کن طریقوں سے ہوا اور یونان و روما نے ہمارے تہذیب پر کیا اثر ڈالا - اصل واقعہ یہ ہے کہ ان ممالک پر ہندی تہذیب کا اثر بدھ مذہب کے ذریعہ سے ہوا - اس مذہب کے دعاۃ (مشنری) غیر ملکوں میں جاتے اور اپنے مذہب اور خیالات کے اشاعت کی کوشش کرتے تھے - چنانچہ بدھ مذہب کی اکثر کتابوں کے ترجمے چینی جاپانی زبانوں میں ہوئے اور اب بھی ان کی

کتابیں چین وجاپان اور تبت میں ملتی ہیں۔ مگر تعجب ہے کہ اس ضمن میں فاضل مؤلف نے اسلامی تمدن و تہذیب کے اثر کا جو ہندوستان پر ہوا، ذکر نہیں کیا۔ افریقہ کے متعلق وہ یہ لکھتے ہیں کہ آج کل جو ہندوستانی وہاں جاتے ہیں اُن کی حالت قلیوں کی ہے اور اس لئے ہندی تمدن کا اثر وہاں نہیں ہوسکتا۔

باقی ابواب میں ملک کی اندرونی حالت اور اس کے مختلف شعبوں پر بحث کی گئی ہے۔ مگر طرز بیان دلکش اور صاف نہیں ہے اور ابواب کی تقسیم اس طور سے کی گئی ہے کہ چند مخصوص خیالات کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے انسائیکلوپیڈیا کے لحاظ سے جن معلومات کا بہم پہنچانا ضروری تھا وہ اس میں پایا نہیں جاتا۔ ان مضامین کی حیثیت اخبار کے معمولی مضامین کی سی ہے جن پر بہت کم محنت کی جاتی ہے۔ مناسب یہ ہوتا کہ ہر باب ایسے شخص سے لکھوایا جاتا جو اس مضمون پر پوری طرح حاوی ہوتا۔ ہم ذیل میں چند خاص خیالات کا ذکر کرتے ہیں جو ڈاکٹر کیتکر صاحب نے ملک کی اصلاح کے متعلق ان ابواب میں ظاہر کئے ہیں۔

سب سے بڑا زور انھوں نے اس بات پر دیا ہے کہ "قومیت کا مذہب" رائج کرنا چاہیئے۔ عیسائی، مسلمان یہودی کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیئے۔ یہ خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا کرنا چاہیئے کہ ہندوستان ہمارا دیس ہے اور اور سب ذاتیں اور سب مذاہب ایک ہیں۔ اس خیال کو عمل میں لانے کے لئے چھوت ترک کردینی چاہیئے اور باہم شادی بیاہ ہونا چاہیئے۔ لیکن اس خیال میں عام لوگوں کو ساتھ رکھنا چاہیئے ورنہ چند لوگوں میں اس خیال وعمل کے محدود رہنے سے ایک نیا فرقہ بن جائے گا۔ ہرگز کوئی جدید فرقہ نہ بنانا چاہیئے اور موجودہ سوسائٹی (جماعت) میں رہکر یہ اصلاحیں عمل میں لانی چاہئیں۔ یہ خیال نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم ہندو ہیں بلکہ یہ ہونا چاہیئے کہ ہم "ہندی" ہیں اور یہ خیال طرح طرح سے لوگوں کے ذہن نشین کرنا چاہیئے۔ اور ہندو پارسی مسلمان نام ترک کردینے چاہئیں۔ کیوں کہ یہ ایک قسم کی تنگ خیالی ہے۔ اہل یورپ نے جس طرح قومیت حاصل کی ہے ہمیں بھی اسی طریقہ سے حاصل کرنی چاہیئے مگر زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ۔

وہ ذات کا امتیاز مٹانے کے حامی ہیں۔ لیکن کہتے ہیں کہ پہلے جو مذہبی یا معاشرتی مصلح ہوئے ہیں اُن میں اکثر ایسے تھے جنھیں اپنی شہرت یا نمود و نمایش منظور تھی اور اُن کے کام نیک نیتی پر مبنی نہ تھے بعض ایسے بھی تھے جن کا فعل نیک نیتی پر مبنی تھا۔ لیکن اُن میں اس کا سلیقہ یا شعور نہ تھا۔ وہ حکیم یا ڈاکٹر نہ تھے بلکہ

عطائی تھے اور اس لئے انھیں کامیابی نہ ہوئی۔ اگرچہ ہمیں کہتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ یہ بات ہمیں غیر ملک والوں (انگریزوں) نے سمجھائی ہے۔ انھوں نے ہمیں متحد ہونا، ذات پات کی تفریق مٹانا، باہم ہمدردی کرنا اور قوم بننا سکھایا ہے۔ اُن کے نمونے سے جو بات ہمیں حاصل ہوئی ہے وہ اس سے قبل ہمیں کسی مصلح کی کوشش وسعی سے حاصل نہیں ہوئی تھی۔ ہمیں وہ "گھر چک"[1] نہیں کرنی چاہیئے جو بدھ یا رام موہن رائے نے کی تھی۔ اس کے لئے اعلیٰ درجہ کا ایثار، اخوت کا بلند خیال اور سوشل سائنس (عمرانیات) کے اصول درکار ہیں۔ بدھ اور رام موہن رائے کی کوششیں قبل از وقت تھیں اور اس لئے بیکار ثابت ہوئیں۔

ڈاکٹر صاحب کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ جو لوگ ہندوؤں سے قریب تر ہیں انھیں ہندو بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ تین ہزار ذاتیں جو بن گئی ہیں وہ توڑ دی جائیں اور اُن کی ایک ذات بنا دی جائے اُن کے فرق مٹانے سے ایک ذات ہو سکتی ہے۔ اگرچہ سب فرق نہیں مٹ سکتے تاہم ایک ذات بنانے کے لئے جو فرق مٹانے ضروری ہیں وہ ممکن ہے۔ ایک دوسری جگہ یہ فرماتے ہیں کہ موجودہ صدہا ذاتوں کو مٹا کر پھر قدیم چار دان قایم کرنے چاہییں۔

کہتے ہیں کہ قومیت کو مذہب بنانے کے لئے ضرورت ہے کہ سوسائٹی کی حالت یکساں کی جائے، لوگوں کی سیاسی قوت بڑھائی جائے، ملک کی مختلف قوموں اور اہل تمدن کو اس مذہب کی تعلیم دی جائے، سوسائٹی کا نظم ایسا ہونا چاہیئے کہ جس سے ملک کے سب لوگ متحد ہو جائیں۔

ڈاکٹر صاحب نے مذہب قومیت کی کہیں تصریح نہیں کی کہ اس سے ان کا کیا منشا ہے۔ اور کیوں کر مختلف قوموں کو جو اس ملک میں آباد ہیں اس مذہب کی تلقین کی جائے۔ جو امور یا اصول انھوں نے اوپر بیان کئے ہیں وہ بہت مبہم ہیں۔ ایسی حالت میں مہاتما بدھ اور راجہ رام موہن رائے کو الزام دینا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

کتاب کے مختلف مقامات پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا خیال ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہندی

---

[1] یہ مرہٹی محاورہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اتنی بڑی چوک جتنا گھوڑا۔ یعنی بہت بڑی غلطی

تہذیب کو رواج دیا جائے، ہندی عیسائیوں اور نیچ قوموں کو اپنے ساتھ ملایا جائے اور اپنا ادب اُن میں شائع کیا جائے۔ ایک دوسرے مقام پر ایک صورت اور بھی بیان کی ہے جس سے اتحاد میں مدد مل سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ملک کی تقسیم زبان کے لحاظ سے کی جائے۔ اس میں سرکار کا فائدہ بھی ہے اور رعایا کا بھی۔ سرکار کا فائدہ یہ ہے کہ عہدہ داروں کا تبادلہ ایسے مقامات پر نہ ہوگا جہاں کی زبان دوسری ہے اور اس لئے انھیں رعایا کے حالات وخیالات سے زیادہ واقفیت ہوگی۔ تعلیم کی اصلاح میں زیادہ آسانی ہوگی، اس وقت اُس کا حلقہ بہت محدود ہے۔ اگر دیسی زبان ذریعۂ تعلیم ہوگئی تو لوگوں میں تعلیم کی اشاعت زیادہ ہو سکتی ہے۔ اس وقت سررشتۂ تعلیم زیادہ کام نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے لوگوں میں بدگمانی پیدا ہو گئی ہے کہ سرکار کا منشا دیسی زبانوں کو مٹانا ہے بعض سرکاری عہدہ داروں کی مخالفت سے نیز سرکاری مشکلات کا صحیح اندازہ نہ کرنے سے ایسا خیال پیدا ہوگیا ہے۔ چوں کہ آئرلینڈ اور اسکاٹلینڈ کی زبانیں مٹادی گئی ہیں اس لئے لوگوں کو یہ خیال ہوتا ہے اور سمجھتے ہیں کہ زبان کے مٹانے سے ہماری قومیت بھی جاتی رہے گی۔ ایک فائدہ سرکار کا یہ ہے کہ سرکاری احکام اور تحریرات دیسی زبانوں میں ہونے سے سرکار اپنے خیالات اور منشا کو زیادہ وضاحت اور خوبی کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کر سکتی ہے۔ جب کسی صوبہ میں ایک ہی زبان ہوگی تو سرکار کو اپنے خیالات اور منشا کی اشاعت میں آسانی ہوگی۔ متعدد زبانوں کی حالت میں مشکل ہوتی ہے۔

رعایا کا فائدہ ہے کہ لوگ اپنے خیالات ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح سمجھا سکیں گے۔ آپس میں زیادہ ہمدردی اور آشتی ہو جائے گی۔ ہندوستانی زبانوں کو زیادہ ترقی ہوگی۔ دیسی زبانوں کی تعلیم سے اعلیٰ تعلیم بڑھے گی اور سوسائٹی زیادہ ترقی کرے گی۔ جب دیسی زبانیں ذریعۂ تعلیم اور سرکاری اور دفتری کاروبار کا واسطہ ہو جائیں گی تو ملک میں مشترکہ تہذیب کی بنا پڑ جائے گی۔ غیر ملکوں کی اختراعات وایجادات دیسی زبانوں میں آنے سے ملک کو بہت فائدہ ہوگا۔ جتنا ہم دیسی زبان کا درجہ بڑھائیں گے اتنی ہی اُن لوگوں کی قدر ووقعت زیادہ بڑھ جائے گی جو اس زبان کے بولنے والے ہیں۔ اس طرح ملک میں مساوات سی ہو جائے گی اور قلیل جماعتیں بھی ساتھ ہو جائیں گی۔

ڈاکٹر صاحب نے آخری باب نیز ضمیمہ میں اس وقت کے بعض معاملات پر بھی رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ فرماتے

ہیں کہ مسلمانوں میں حکومت و مذہب جُدا جُدا نہیں بلکہ ایک ہیں۔ سب مسلمان ایک ہیں۔ خلافت ان کا مرکز ہی
دُنیا پر حکومت کرنا اور دوسروں کی دولت لوٹنا اور اس کے ساتھ مذہب کی اشاعت کرنا ان کا اصول
حکومت ہی۔ پان اسلام ازم نے خلافت کو قوت دی۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی اتحاد و اخوت کو
بڑھایا جائے اور اسلامی تہذیب کی اشاعت کی جائے۔ اوّل اوّل سرکاری عہدہ داروں نے اسے مدد دی
تاکہ ہندی اتحاد میں کھنڈت پڑ جائے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہی کہ جب تک خلافت کی قوت باقی رہے گی
مسلمانوں میں اس ملک کی محبت پیدا نہ ہوگی اور وہ ہمیشہ خیبر کے خواب دیکھتے رہیں گے۔ اب جو حریص یورپی
دول کی بدولت خلافت کی قوت زیر و زبر ہوگئی ہے تو مسلمانوں میں حُبّ وطن پیدا ہو گی۔ مسٹر گاندھی اور
اُن کے ہند و اعوان و انصار جو خلافت کے لئے اس قدر جد و جہد کر رہے ہیں تو اُن کا منشا کیا ہی؟ یہ دیکھکر
دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہی کہ یہ بدمعاش ہیں یا بیوقوف؟ کسی کے دل کا حال معلوم کرنا نہایت مشکل ہے۔
لیکن حالات و قرائن پر نظر ڈالنے سے اصل منشا کو معلوم کر سکتے ہیں۔ موجودہ حالات و قرائن کو بغور معائنہ
کرنے سے یہ خیال ہوتا ہی کہ ہندوؤں نے جب یہ دیکھا کہ خلافت اب بیجان ہوگئی ہے اور اس کے سرسبز
ہونے کی کوئی اُمید باقی نہیں رہی تو انھوں نے کہا، لاؤ زبانی ہمدردی کرنے میں ہمارا کیا ہرج ہی۔ ہماری
کوششوں سے خلافت کو پہلی سی قوت تو حاصل ہوگی نہیں اور اگر تھوڑی بہت ہوئی بھی تو دنیا میں تو اُسے
وہ عروج نہیں ہو سکتا اور نہ مسلمان دُنیا کے فاتح ہو سکتے ہیں تو مفت کرم داشتن میں ہمارا کیا نقصان ہے، بلکہ
مسلمانوں سے ہمدردی کرنے میں یہ فائدہ ہی کہ وہ ہمارے معاملات میں ہم سے ہمدردی کریں گے اور
بیرونی خیالات چھوڑ کر وہ ہندوستان کے ہو جائیں گے اگر یہ خیال ہے تو مسٹر گاندھی کا فعل بالکل عقل
اور دُور اندیشی کے خلاف نہیں ہی۔

یہ چند خیالات ہیں جن کا ڈاکٹر کیتکر نے بار بار اظہار کیا ہی۔ اُن کے اکثر خیالات معمولی اور اوپری ہیں
جن میں کوئی جدّت نہیں۔ اور جن میں کچھ جدّت ہی وہ پھُس پھُسے ہو کر رہ گئے ہیں۔ انھیں صاف گوئی کا دعویٰ
ہی اور اسے ہم تسلیم کرتے ہیں۔ ایک عرصہ ہوا کہ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں مہاتما بدھ کی شان میں کچھ
نازیبا کلمات لکھے تھے۔ بدھ مذہب کے ایک محقق اور عالم پروفیسر دھرمانند کوشامبی نے جواب میں صرف

اس قدر لکھا تھا کہ کیتکر جیسے بہت سے اس دنیا میں آئیں گے اور چلے جائیں گے اور کوئی ان کا نام بھی نہ جانے گا مگر مہاتما بدھ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ہم اس موقع پر صرف ان الفاظ کا اعادہ کرنا کافی سمجھتے ہیں اور زیادہ بحث و تنقید کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

ہم ڈاکٹر کیتکر صاحب کے دل سے ممنون ہیں کہ انھوں نے ایک بڑے کام کا بیڑا اُٹھایا ہے اور فی الحقیقت مرہٹی زبان پر احسان کیا ہے کہ معلومات کا ایک بڑا ذخیرہ مہیا کر رہے ہیں۔ دیسی زبانوں کو ترقی اور فروغ دینے کے لیے اس کی بہت ضرورت ہے۔ ہم اُن کی ہمت اور اولوالعزمی کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں چند امور کے متعلق شکایت ہے جنھیں ہم مختصراً ذیل میں بیان کرتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ آیندہ جلدوں میں ان کے رفع کرنے کی کوشش فرمائیں گے۔

۱۔ پہلی جلد کا طرز تحریر بے مزہ، طولانی اور غیر مربوط ہے۔ بعض خیالات کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے۔ جن معلومات کی ضرورت تھی وہ رہ گئی ہیں اور ذاتی خیالات کو زیادہ ترجیح دی گئی ہے۔ انھیں ابواب میں اس قسم کی بحثیں آسکتی تھیں جن کے پڑھنے سے ناظرین کی معلومات میں حقیقی اضافہ ہوتا مگر ان کا لحاظ نہیں کیا گیا اور زیادہ تر بحثیں اوپری اور اخباری طرز میں پیش کی گئی ہیں۔

۲۔ تعلیم کا مسئلہ نہایت اہم ہے اس پر کوئی مستقل بحث نہیں کی گئی صرف ضمناً بعض مقامات پر چند جملوں کے کہنے پر اکتفا کیا گیا ہے ضرورت تھی کہ اُس پر خاص مضمون لکھا جاتا اور وضاحت کے ساتھ اس پر بحث اور تنقید کی جاتی۔ اُمید ہے کہ آیندہ کسی جلد میں مستقل مضمون لکھا جائے گا۔

۳۔ اگر ہر باب اُس مضمون کے ماہر اور محقق سے لکھوایا جاتا تو کتاب کی وقعت بڑھ جاتی اور زیادہ مفید ہوتی۔

۴۔ بہت مناسب ہوتا اگر اس جلد کے دیباچہ میں کتاب کا آیندہ پروگرام درج کیا جاتا نیز یہ بتایا جاتا کہ آیندہ جلدوں میں کن کن علما اور ماہرین فن سے مضامین لکھوائے گئے ہیں۔ غرض کتاب کی ترتیب و تالیف اور انتظام کے متعلق کافی اور مفصّل بحث ہونی چاہیے تھی۔

۵۔ اس جلد میں چند تصویریں بھی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ وہ ادنیٰ درجہ کی ہیں اور بمبئی کے معمولی ناٹکوں کے

فوٹوؤں سے لی گئی ہیں۔ علاوہ ادنیٰ درجہ کی ہونے کے تاریخی لحاظ سے بھی غلط ہیں۔ اس بارے میں ان کا یہ عذر کہ ہمارا مقصد تصویروں سے کتاب کی خوبصورتی نہیں بلکہ مضامین کی وضاحت ہی قابل لحاظ نہیں ہو سکتا۔

۶۔ کیا اچھا ہوتا اگر کتاب کے آخر میں مضمون نما (انڈکس) بھی لگا دیا جاتا۔

شرعۃ الحق

اس کتاب کے مصنف شمس العلما مولوی حافظ سید محب الحق صاحب عظیم آبادی ہیں۔ اس سے قبل دعوۃ الحق، منہاج الحق، اور کئی کتابیں اُن کی تصنیف سے شائع ہو چکی ہیں۔ مولوی صاحب موصوف قرآن کے مضامین پر بہت حاوی معلوم ہوتے ہیں اور انھوں نے اپنی کتابوں میں شروع سے آخر تک تمام استدلال قرآن شریف ہی سے کیا ہے ان کا دعویٰ ہے کہ قرآن مجمل نہیں بلکہ اس میں تمام احکام موجود ہیں اور اُسے کسی تفصیل یا تفسیر کی ضرورت نہیں (وھو الذی انزل الیکم الکتاب مفصلا) اس آیت کے بعد قرآن کو مجمل کہنے کا کسی کو حق نہیں۔ ان کا دعوے ہی نہیں بلکہ انھوں نے ثابت کر کے دکھایا ہے اور تمام ضروری اور بعض مختلف فیہ مسائل کو قرآن پاک سے استنباط کر کے لکھا ہے۔

وہ اگلے بزرگوں کا جنھوں نے حدیث کی تنقیح و تنقید کے متعلق کوششیں کی ہیں بڑے احترام سے ذکر کرتے ہیں مگر حدیث کی وقعت مذہبی تاریخ سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر حدیثیں اُس طرح جانچی جائیں جس طرح پردہ جانچی گئی ہیں تو صرف ایک ہی قسم کی حدیث یعنی مرفوع مستند متصل جو راویوں کی جانچ پر بھی صحیح اُترے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی حدیث کہی جا سکتی ہے۔ اگر اس میں بھی تواتر کی قید لگائی جائے تو سوائے قرآن مجید کے اور کیا رہے گا۔ کیوں کہ متواتر حدیثیں یا تو ہیں نہیں یا ہیں تو چار پانچ سے زیادہ نہیں۔ رہ گئی مشہور کی قید۔ اس طرح تو حدیث کا ذخیرہ ہی غائب ہو جاتا ہے۔ اس پر بھی یہ حدیثیں افادۂ ظن ہی کرتی ہیں اور ظنیات سے نہیں نکلتیں حدیث کی کتابیں نہ مصنفۂ رسول ہیں نہ مصدقۂ رسول اور نہ محکوم بہ اطاعت۔ ساری حدیثیں منسوب بہ رسول بھی نہیں، سلسلہ روایت اور رواۃ کی جانچ غیر قطعی، غیر محفوظ اور معترض علیہ ہے۔ باہمہ انتخاب جو رہتی بھی ہیں اُن کی قطعیت باہمہ تحقیق شائبۂ ظن سے خالی نہیں۔ اس لئے حدیثیں ظنیات میں ہیں اور خبر و تاریخ میں داخل۔

وہ فقہ کے بھی قائل نہیں اور نہ اس کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ فقہ کا پتہ جو قرآن مجید سے ملتا ہے اُس کے معنی یہ نہیں کہ جی یا قضایا کرو اور وہ قضایا نئے دین کی بنیاد ڈالیں، قوم میں تفرقے پیدا کریں اور بیت اللہ میں چار مصلے قایم کئے جائیں جو نبی یا صحابہ نے قایم نہ کئے۔ ۔ ۔ کسی فقیہ یا امام نے نیا دین قایم نہیں کیا، اُن کے ماننے والوں نے اُن کی طرف بہت کچھ منسوب کر کے اُن کے برگزیدہ صفات میں غلو پیدا کر کے، تفرقہ پیدا کیا ہے اور اُن کی رایوں اور قضایا کو دین سمجھ رکھا ہے۔ مگر وہ اس سے بری ہیں ۔ ۔ ۔ ہاں قرآن مجید میں سمجھ پیدا کرنا تفقّہ ہے اور اس کو سمجھانا اور پھیلانا فقیہ و امام کا کام ہے۔ آپ کے مختلف اعمالِ دین، مجاز من اللہ کی مختلف صورتیں ہیں، مختلف ادیان نہیں ہیں۔ کوئی اُس طرح نہ کرے دوسری طرح کرے تو اُس کی نماز یا عبادت باطل نہ ہوگی۔ مگر یہ تدبّر اور تفقّہ رسول معصوم صلی اللہ علیہ وسلّم کا ہے اور آپ موردِ وحی تھے، شیطان کا گزر آپ تک نہ تھا۔ اگر آپ کا تدبّر و تفقّہ قطعاً ثابت ہو جائے تو سارے اولیا و صلحا سارے پیشواؤں اور اماموں کے تدبّر و تفقّہ سے بلند تر، رفیع تر، مطابق رضائے مولا۔ آپ کے تفقہ کے آگے کسی کے تفقّہ کا نام لینا غلط۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ کا تدبر و تفقہ قطعاً ثابت ہو جائے، عمل متواتر کی شہادت سے یا اُن حدیثوں کی شہادت سے جن کی شرائط صحت کو میں نے اوپر بیان کیا ہے اور جانچنے کے بعد یہ ثابت ہو جائے کہ یہ آپ کا تدبّر و تفقّہ ہے تو ہرچند وہ علما و صلحا کے لئے موجب ہدایت و رحمت ہے، مگر وہ آپ کی وحی منزل کے درجہ میں نہیں ہے۔ دین قرآن مجید میں کامل ہو چکا جس کا منکر کافر ہے۔

اوپر کے مختصر اقتباس سے قابل مصنّف کا مذہب معلوم ہو سکتا ہے۔ وہ قرآن کو قطعی اور مفصل سمجھتے ہیں اور تفسیر، حدیث و فقہ کا محتاج خیال نہیں کرتے۔ وہ قرآن پاک کے معانی و مطالب کے لئے ناسخ و منسوخ، شانِ نزول اور تاویل کے بھی قایل نہیں بلکہ ان چیزوں کو راہ حق میں حارج سمجھتے ہیں۔ ان کا مذہب بالکل صاف ہے اور اسی اصول پر انھوں نے عبادات، طہارت، غسل، وضو، تیمم، اذان، صلوٰۃ، صوم، حج و عمرہ، حلال حرام، طلاق و خلع، سرقہ، زنا، احکام مالی، صدقہ، زکوٰۃ، ربوا کے مسائل قرآن پاک ہی سے بلا تاویل مستنبط کئے ہیں۔ خصوصاً حلال و حرام اور ربوا کا بیان قابل دید ہے۔

مصنّف کے مذہب سے بہت سے لوگوں کو اختلاف ہوگا۔ کیوں کہ انھوں نے اُنھی ارکان کو دین سے

خارج کر دیا ہی جن سے مسلمانوں کی جماعت میں مذہبی چہل پہل، رد و قدح، بحث و مباحثہ مباہلہ و مجادلہ اور تکفیر و تردید کا دار و مدار ہی۔

لیکن کیا قرآن مجید سے تمام مسائل کے استنباط کرنے میں توجیہ و تاویل اور اختلافات کی گنجایش نہیں ہی؟ کیا یہ خود ایک نیا فرقہ نہ بن جائے گا اور اختلاف کو نہ بڑھائے گا؟ مصنف نے اس بارے میں بہت احتیاط کی ہی اور وہ ہرگز کسی جدید فرقہ کی بنیاد ڈالنا نہیں چاہتے بلکہ اس خیال کو بڑی حقارت اور نفرت سے دیکھتے ہیں مگر کیا ایسا نہیں ہوا ہی کہ ایک شخص نیک نیتی سے اختلافات مٹانے کی کوشش کرتا ہی اور بلا ارادہ و بلا سعی اور باوجود احتیاط کے ایک نئے فرقے کا بانی ہو جاتا ہی؟

اس میں شبہ نہیں کہ مصنف نے اس فرض کو نیک نیتی سے انجام دیا ہی۔ یوں اختلاف کا میدان وسیع ہی۔ لیکن انھوں نے اختلاف کو کم کرنے کی کوشش کی ہی۔ خدا کے کلام کی عظمت کو قایم کرنا چاہا ہی۔ ماسوا کے ہجوم کو ہٹایا ہے۔ اُن کے اصول سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مصنف سے جو اختلاف رکھتے ہیں وہ انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

اگرچہ مصنف قرآن کو مفصل اور جامع خیال کرتے ہیں اور کسی تفسیر یا حدیث وغیرہ کا محتاج نہیں سمجھتے لیکن حدیث و فقہ کی مسلمانوں کو بحیثیت جماعت یا قوم کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ یہ اُن کی تہذیب و تمدن کا جز ہو گئی ہیں اور اُن کے مذہبی تخیل میں رچ گئی ہیں۔ ان کی تعلیم و اشاعت کا سلسلہ اس قدر وسیع ہو چکا ہی اور طلبا و علما کا انہماک اس میں اس قدر بڑھا ہوا ہی کہ بعض وقت یہ دھوکا ہوتا ہی کہ (نعوذ باللہ) مسلمانوں کا ایمان قرآن پر نہیں، حدیث و فقہ پر ہی۔ ایسی حالت میں مصنف کا قرآن کی طرف متوجہ کرنا اور اُسے مفصل اور جامع اور حدیث و فقہ و تفسیر سے مستغنی ثابت کرنا قابل ستایش ہی نہ موجب سرزنش۔

افسوس ہی کہ ادبی لحاظ سے عبارت میں جابجا اسقام پائے جاتے ہیں۔ کاتب نے اس بدعت میں اور اضافہ کر دیا ہی۔

بہرحال کتاب پڑھنے اور غور کرنے کے قابل ہی مگر ایسی کتابوں کو ٹھنڈے دل سے پڑھنا چاہیئے۔ ورنہ عیب و صواب میں فرق کرنا دشوار ہو جاتا ہی۔

نکاتِ غالبؔ

یہ چھوٹی تقطیع پر ۲۱ صفحے کی ایک خوبصورت کتاب ہے جسے مولوی نظام الدین حسین صاحب نظامی نے جمع کیا اور اپنے مطبع "نظامی پریس" میں چھاپا ہے۔

اس کے تین حصے ہیں (۱) مرزا صاحب کے حالات خود انھیں کی قلم سے، یعنی اپنے رقعات میں کہیں کہیں جو اپنا ذکر کر گئے ہیں، مُرتب نے اُن سب کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے (۲) ادبی نکتے، یہ بھی مرزا کے رقعات ہی سے جمع کئے گئے ہیں (۳) مرزا صاحب کے لطائف۔

مُرتب نے اپنی طرف سے کہیں کچھ اضافہ نہیں کیا ہے۔ البتہ سلیقہ سے ان سب چیزوں کو جمع کر دیا ہے۔ مرزا صاحب کے رقعات اُردو زبان کا زیور، ادب کا سرمایہ اور اہلِ ذوق کے لئے بڑی نعمت ہیں۔ کتاب بہت دلچسپ اور پُرلطف ہے۔ اور صاحبانِ ذوق اس کی قدر کریں گے۔ ہم مولوی نظام الدین حسین صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ایک ایسی اچھی کتاب شائع کی ہے ہر طبقہ کے لوگ لطف و مسرّت کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔ ہماری زبان میں اس قسم کی کتابوں کی شدید ضرورت ہے کہ جنھیں عام اور خاص لوگ اور طالب علم فرصت کے وقت پڑھ سکیں اور جن کے پڑھنے سے لطف بھی حاصل ہو اور صحیح ذوق بھی (کتاب مجلد ہے۔ قیمت عہ ر)

تجارت کی پہلی کتاب

خواجہ حسن نظامی صاحب نے اُردو زبان میں جہاں اور جدتیں پیدا کی ہیں، اُن میں سے ایک یہ بھی ہے۔ اُن کا ارادہ ہے کہ معلوماتِ تجارت پر ایک سلسلہ شائع کریں۔ اس سلسلہ کی یہ پہلی کتاب ہے۔ اور مولوی یہ ظہور احمد صاحب وحشی شاہجہاں پوری سے تالیف کرا کر شائع کی ہے۔ شروع میں دیباچہ خود خواجہ صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ جس میں انھوں نے تجارت کو دنیائے دنی سے لے کر اعلیٰ علیین تک پہنچا دیا ہے اور ہُو کے میدان تجارت کی جھنڈی پھیلا دی ہے اور اسے علوم الٰہی اور فنون یزدانی کا ایک شعبہ قرار دیا ہے۔ آگے چل کر اپنے چند ہم وطنوں مثلاً اڈیٹر پیسہ اخبار، منشی نولکشور، خان بہادر عبدالاحد، اڈیٹر رسالہ صوفی، اڈیٹر اخبار وطن، سر آدم جی پیر بھائی، سیٹھ غلام علی کی

تجارت اور ترقی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس ضمن میں وہ اپنی تجارت کا ذکر بھول گئے جس میں "دین و دنیا" دونوں کی سرخروئی ہے۔ شاید اس کی وجہ انکسار ہے۔

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اس کتاب کے پڑھنے سے آدمی تاجر بن سکتا ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل میں تجارت کا ولولہ ضرور پیدا ہوتا ہے اور ابتدائی معلومات کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ یہ ایک قسم کی ترغیبی کتاب ہے۔ اور کارآمد و مفید ہے۔ اس میں مفصلۂ ذیل ابواب ہیں۔

(۱) تجارت اور اُس کی ضرورت (۲) تجارت اور دیگر پیشوں پر اس کی فوقیت (۳) تجارت کا اثر عقل و دماغ پر (۴) دُنیا کے کامیاب تاجر اور اُن کے تجربے (۵) تجارت کی تعلیم (۶) تجارت کی مختلف صورتیں (۷) کاروباری آدمی کا نظام عمل (۸) کاروباری آدمی کا کیریکٹر (۹) تجارت کا انتخاب (۱۰) کاروبار کے ضروری شعبے (۱۱) سرمایہ اور تجارت (۱۲) مشترکہ سرمایہ سے تجارت (۱۳) تجارت کم سرمایہ سے یا سرمایہ کے بغیر (۱۴) ہندوستان کی تجارتی اور حرفتی اشیا (۱۵) یورپ اور امریکا کی تجارتی اور حرفتی اشیا (۱۶) عام تجارتی معلومات (جس میں قانون، ٹریڈ مارک، ایجاد و پیٹنٹ، سکہ، ہنڈی، بیمہ، ڈاک، تار، ریلوے کے قاعدے، جداول و نف جات وغیرہ ہیں۔

تیرھویں باب میں چند چھوٹی بڑی تجارتوں کے طریقے اور اُن کے حساب بھی بتائے ہیں اور چند مختلف آسان حرفتوں اور تجارتوں کی فہرست بھی دی ہے۔

پانچویں باب (تجارت کی تعلیم) میں ہندوستان کی تجارتی اور حرفتی درسگاہوں کی ایک فہرست نقشے کی شکل میں دی ہے جس میں تعلیم کی نوعیت، مدت تعلیم، شرائط و تاریخ داخلہ اور اخراجات درج ہیں۔ اس میں بعض درسگاہوں کا ذکر رہ گیا ہے۔ علاوہ اس کے معلومات بہت کم ہیں ان میں اور اضافہ ہو سکتا تھا جس سے طالب علم کو پوری واقفیت ہو سکتی اور وہ آسانی سے درسگاہ کا انتخاب کر سکتا۔ اُمید ہے کہ جب کتاب دوبارہ چھپے گی تو اس کمی کو پورا کر دیا جائے گا۔

کتاب چھوٹی خوبصورت تقطیع اور چکنے کاغذ پر بہت اچھی چھپی ہے۔ جو لوگ تجارت کا ارادہ رکھتے ہیں ان کے مطالعے کے قابل ہے۔

جامعۂ ملیہ اسلامیہ (علی گڑھ) کا نصابِ تعلیم

تعلیم کا مسئلہ روز بروز زیادہ اہم اور نازک ہوتا جاتا ہے۔ اور کوئی تعلیم فی الحقیقت تعلیم کہلانے کی مستحق نہیں ہوسکتی جب تک وہ قومی نہو۔ لیکن قومی تعلیم سے کیا مراد ہی؟ اس میں اختلاف کی بہت کچھ گنجایش ہی لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ وہ تعلیم ملک یا قوم کے تمدن (سویلزیشن) اور تہذیب (کلچر) کے مطابق ہو اور اُسے معاشی اور معاشرتی حالات سے بھی لگاؤ ہو۔ ہندوستان کی مروجہ تعلیم میں اس کا خیال نہیں رکھا گیا، اس میں زیادہ تر نقالی سے کام لیا گیا ہی جو صحیح تعلیم کے حق میں مضرت رساں ہی۔ اس نے تعلیم یافتہ گروہ پیدا کیا۔ لیکن وہ ایک جدا فرقہ ہوگیا ہے جو ملکی اور قومی خصوصیات سے محروم ہی۔ اس نے فلسفہ کی تعلیم دی مگر خاص دائرہ میں محدود رہی، اس نے تاریخ پڑھائی لیکن ہماری تاریخ کو حقیر سمجھکر اُسے ضمنی درجہ دیا اور نظر میں وسعت پیدا نہونے دی۔ اس نے ادبیات کی تعلیم میں کوشش کی مگر اس میں ہمارے علم ادب کا بہت کم حصّہ تھا۔ اس نے تعلیم یافتہ بنایا مگر اس کی جولانی بجائے تحصیل علم کے امتحان کی کامیابی اور امتحان کا مقصد ملازمت رہا۔ یہ اُن تمام درسگاہوں کی حالت ہی جو سرکاری نگرانی میں ہیں۔

سرکاری مدارس اور یونیورسیٹوں کے علاوہ ہماری قدیم تعلیم گاہیں سنسکرت اور عربی کی اب تک قایم ہیں لیکن وہ جدید حالات اور علوم کو نظر اُٹھاکر نہیں دیکھتیں اور اس لئے اُن کا افادہ بہت محدود اور کم ہی۔ بعض ہی خواہانِ ملک نے اس تعلیمی ابتری کو دیکھکر زمانہ کے مطابق جدید درسگاہیں قایم کیں اور اپنے اپنے خیالات کی رُو سے تعلیم میں اصلاح کی کوشش کی جن میں زیادہ ممتاز آریہ سماج کا گروکل ہردوار میں، ندوۃ العلما کا دارالعلوم لکھنؤ میں اور ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور کا شانتی نکتن بولپور میں ہیں۔

گروکل کا نصب العین قدیم آریائی تہذیب کو زندہ کرنا اور زمانۂ وید کے خیالات اور معتقدات کو واپس لانا ہے سنسکرت اور مذہبی تعلیم پر بہت زور دیا جاتا ہی اور اس کے ساتھ ہی جدید علوم کی بھی اپنی زبان کے ذریعہ سے تعلیم دی جاتی ہی۔ لیکن اُن کے طریقۂ تعلیم میں ایک قسم کی سختی، تصنع اور قدیم روایات و زہدِ خشک کی پابندی ضرورت سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ بچّوں کو اٹھارہ بیس سال تک گھر خاندان اور جماعت (سوسائٹی) سے الگ نئے اور

عجیب حالات اور ماحول میں رکھکر اُن کو حقیقی زندگی اور معاشرت سے محروم کر دیا جاتا ہے اور اُن کے لطیف جذبات کو نشو و نما کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سمجھ لینا کہ بچوّں کے دل سادہ کاغذ کے مانند ہیں اُن پر جو نقش چاہیں جما دیں تعلیم کے حق میں بہت مضر ہی۔ گروکل کی نظر پیچھے ہی آگے نہیں۔

ندوۃ العلما کا دار العلوم اچھے خیال اور اچھی نیت سے قایم کیا گیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ قدیم و جدید علوم اور طریقوں کو سموکر نئے طریقہ سے تعلیم دی جائے اور ملک میں حقیقی عالم پیدا کئے جائیں لیکن عمل میں کامیابی نہوئی اُسے ایسے فاضل معلّم نہیں ملے جو اس کی رہنمائی کرتے اور طلبہ میں تحقیق علم کا سچّا شوق پیدا کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دونوں طرف سے گئے نہ قدیم طرز کے عالم پیدا ہوئے نہ جدید علوم سے روشناسی ہوئی اور وہ ایک معمولی درجہ کا مدرسہ ہو کر رہ گیا۔

شانتی نکتن میں ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور نے نئی راہ نکالی ہے۔ بچوں کو پھولوں کی طرح پرورش کرتے ہیں۔ محبت اور ہمدردی کا مادہ پیدا کیا جاتا ہے اور وہ اور اُن کے مددگار اُن سے اُسی محبت اور ہمدردی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ بہ نسبت دوسرے مدرسوں کے بچوّں کو زیادہ آزادی ہی اور فرداً فرداً ہر بچہ کا خیال رکھا جاتا ہی فنون لطیفہ سے ابتدا ہی سے شوق پیدا کیا جاتا ہی۔ لیکن ابھی تک یہ مدرسہ معرض تجربہ میں ہی اور ہم صحیح طور سے نہیں کہہ سکتے کہ اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہی۔ فاضل بانی اب اُسے بین الاقوامی یونیورسٹی بنانا چاہتے ہیں۔

حال میں مسلمانوں اور ہندوؤں نے اپنی اپنی یونیورسٹیاں قایم کی ہیں۔ ایک بنارس میں دوسرے علی گڑھ میں۔ لیکن دونوں نیم سرکاری ہیں۔ اُن پر سرکار کی وہی نظر ہی جو اپنی یونیورسٹیوں پر ہی۔ قیود زیادہ ہیں آزادی کم ہی۔ یہاں تک کہ سرکار کو اختیار ہے کہ وہ چاہے تو کسی پروفیسر کے تقرر کو نامنظور کر دے۔ تعلیم کا ذریعہ وہی انگریزی ہے جو قومی تعلیم اور صحیح اصول تعلیم کے منافی ہی۔ بہرحال ان یونیورسٹیوں کو موقع ہے کہ وہ اپنی ادبیات اور تہذیب کو نمایاں کرنے کے لئے خاص انتظام کریں اور تحقیق کا دروازہ جو اب تک ہماری یونیورسٹیوں میں بند ہی طلبہ کے لئے کھولیں۔

میسور کی یونیورسٹی سرکاری یونیورسٹیوں کی نقل ہی۔ اس نے اپنی زبان کے ذریعہ سے تعلیم دینے سے انکار کر دیا ہی۔ تاہم اُسے موقع ہی کہ علم کے مختلف شعبوں میں خاص امتیاز حاصل کرے۔ البتہ عثمانیہ یونیورسٹی

(حیدرآباد دکن) ایک ایسی یونیورسٹی ہی جس نے سب سے اوّل دیسی زبان میں تعلیم دینے کا تہیّہ کیا ہی۔ یہ صحیح اور سیدھا رستہ ہی۔ اور اس لئے اس سے توقع ہی کہ وہ کچھ کرکے دکھائے گی بشرطیکہ وہ اپنا نصب العین ہیں تک محدود نہ کردے۔ ضرورت اس امر کی ہی کہ اعلیٰ تعلیم کے کامل سامان بہم پہنچائے جائیں اور طلبہ کو حقیقی علما اور بالغ نظر محققین کی صحبت سے مستفید کیا جائے اور ان میں علم و تحقیق کی لگن پیدا کی جائے اور خاص کر اپنے ہاں کے ادبیات اور تہذیب کو تحقیق کی روشنی میں لایا جائے۔

سب سے زیادہ تعلیمی تحریک قومی یونیورسٹیوں کی ہی جو اس تذبذب و تلاطم کے زمانہ میں پیدا ہوئی ہی۔ ان میں زیادہ معروف و ممتاز دو یونیورسٹیاں ہیں۔ ایک احمدآباد میں دوسرے علی گڑھ میں۔ یہ بالکل آزاد ہیں، ان پر کسی کا دباؤ نہیں، ملازمت کے لالچ سے بری اور مصلحتوں کے تار و پود سے بے لگاؤ ہیں۔ یہ چاہیں، موقع ملے اور ان کی رہنمائی اچھے ہاتھوں میں ہو تو بہت بڑا کام کرسکتی ہیں۔ مگر ان کے رستے میں بھی بہت سے جھاڑ جھنکاڑ ہیں۔ اُن کے بانیوں، منتظموں اور معاونین کو جن کے دل موجودہ سیاسیات کے جوش سے اُبل رہی ہیں بڑے احتیاط سے تعلیم کے کام میں ہاتھ ڈالنا چاہیئے۔ ہر اصول کو سوچ سمجھکر پرکھکر اختیار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ ایک بار غلط راہ پر پڑ لینے کے بعد اصلاح کے لئے ایک زمانہ درکار ہوتا ہی۔ کوئی یونیورسٹی، یونیورسٹی کہلانے کی مستحق نہیں ہوسکتی جس میں سیاسیات کی تعلیم نہو اور جہاں طلبہ اپنے ملک اور دُنیا کے حالات سے باخبر نہوں اور اُن میں حصہ نہ لیں۔ مگر طلبہ کو (کسی اور وجہ سے نہیں بلکہ اس خیال سے کہ ان کی منزل کھوٹی نہو) وقتی ہنگاموں سے الگ رکھنا چاہیئے۔ یونیورسٹی تحصیل علم و تحقیق کی جگہ ہے، ہنگامہ آرائیوں کا مقام نہیں ہی۔

کچھ دن ہوئے ہمارے پاس جامعۂ ملیّہ اسلامیہ علی گڑھ کا نصاب تعلیم وصول ہوا جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ منتظمین جامعہ نے اس مبحث پر کافی غور کیا ہی اور نصاب کے تیار کرنے میں بعض ماہرین تعلیم سے بھی مشورہ کیا ہے۔

سب سے پہلی بات جو قومی یونیورسٹی کے لئے مقدم ہی یہ ہے کہ ذریعۂ تعلیم اپنی زبان ہوگا۔

دوسری بات جس پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہی وہ مذہبی تعلیم ہی۔ موجودہ حالات میں ایک قومی یونیورسٹی کے لئے مذہب کی تعلیم لازم ہی۔ ممکن ہے کہ بعض طلبہ اس پر عامل نہوں مگر قومی تہذیب کے حصول کے لئے اور بحیثیت

افرادِ قوم کے اس کا جاننا نہایت ضروری ہے۔ لیکن اس موقعہ پر ہم ادب و انکسار سے یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ فرقہ داری یا قومی درسگاہوں میں جہاں مذہبی تعلیم میں غلو کیا جاتا ہے وہاں طلبہ میں ایک قسم کی تنگ نظری اور تنگ دلی پیدا ہو جاتی ہے اور اُن کے خیالات سے تعصب کی بو آنے لگتی ہے۔ دوسرا نقص اس قسم کی درسگاہوں میں یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی فرقہ اور ملت کے لوگوں کے ساتھ رہتے رہتے طلبہ میں قومی تفاخر اور دوسروں سے بیگانگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی خبر گیری اور روک تھام بہت ضروری ہے ورنہ ان یونیورسٹیوں سے جو مذہب و ملت کے لحاظ سے جُدا جُدا قایم کی گئی ہیں بجائے فائدہ کے نقصان ہونے کا اندیشہ ہے۔ طلبہ میں حُبِّ وطن اور ایثار کے ساتھ بے تعصبی بھی اُسی درجہ کی ہونی چاہیئے۔ اور اُن کی نظر بلند، اُن کے دل وسیع اور اُن کی ہمدردی عالمگیر ہو۔

ابتدائی جماعتوں میں مذہبی تعلیم کا جو طریقہ رکھا گیا ہے وہ تعلیمی نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض معلوم ہوتا ہے تجویز یہ کی گئی ہے کہ حروف شناسی کے بعد ہی بچے کو قرآن پاک کی آخری چند سورتیں نہ صرف عربی میں یاد کرائی جائیں بلکہ ساتھ ساتھ اُن کا ترجمہ بھی اپنی زبان میں یاد کرایا جائے۔ اس سے بچے کے حافظہ پر بہت زیادہ بار پڑے گا۔ حالاں کہ صحیح طریقہ تعلیم یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حافظہ پر کم بار پڑے۔ اس میں فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ ترجمہ یاد کرنے سے وہ نماز سمجھ کر پڑھے گا۔ لیکن جب وہ الفاظ کے معنی ہی نہیں سمجھتا تو اپنی زبان میں ترجمہ یاد کرنے سے اُسے کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا ایک تو غیر زبان کی عبارت یاد کرنا اور پھر اپنی زبان میں بغیر معنی سمجھے دوسری عبارت حفظ کرنا ایک بوجھ ہے جو تعلیمی نقطۂ نظر سے ہرگز قرینِ مصلحت نہیں۔ ایسا کرنا گویا ابتدا ہی سے غلط طریقہ اختیار کرنا ہے جو بچے کے لئے بہت مضر ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی تجویز کی گئی ہے کہ بارہ تیرہ سال کی عمر تک وہ تمام قرآن شریف مع ترجمہ کے پڑھ لے گا۔ ہماری رائے میں اس عمر کے بچے کے لئے یہ بہت زیادہ ہے خصوصاً جب کہ اُسے اور بھی کئی مضامین پڑھنے ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے لئے پانچ سال رکھے گئے ہیں آخری تین سال میں عربی زبان کی تعلیم دی جائے گی اور اسی عرصہ میں قرآن شریف مع ترجمہ کے پڑھایا جائے گا یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ اوّل شروع ہی میں اُسے اس قدر استعداد نہیں ہو سکتی کہ عربی سمجھ کر ترجمہ پڑھ سکے اور قطع نظر اس کے دو سال میں اُسے اپنی مادری زبان میں بھی اتنی قدرت نہیں ہو سکتی کہ قرآن کا ترجمہ

آسانی سے پڑھ لے اور سمجھ لے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام بار اُس کے حافظہ پر پڑے گا اور اس کی تعلیم تباہ ہو جائے گی ہماری رائے میں یہ زیادہ مناسب ہوتا کہ تین سال عربی پڑھنے کے بعد اُسے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھایا جاتا۔ اس وقت تک اُسے اپنی زبان میں بھی خاص استعداد ہو جائے گی اور عربی زبان سے بھی ایک حد تک مانوس ہو جائے گا۔ ہم اس بات کے بہت موید ہیں کہ قرآن مجید سمجھکر پڑھا جائے۔ لیکن ایسی حالت میں جب کہ بچہ نہ تو اپنی زبان جانتا ہو نہ عربی سے مانوس ہو اُسے ترجمہ کے ساتھ پڑھانا اُس کی تعلیمی بنیاد کو خراب کرنا ہو۔

علاوہ اس کے ابتدائی تعلیم میں بہت سے مضامین رکھے گئے ہیں جو بچے کی استعداد سے بڑھکر ہیں اور اغلب ہے کہ وہ اس بار کا متحمل نہ ہو سکے۔ ابتدائی تعلیم کے لئے جس کی مدت پانچ سال ہو مفصلہ ذیل مضمون تجویز کئے گئے ہیں

(۱) دینیات (۲) قرآن شریف مع ترجمہ (۳) ریاضی جس میں حساب، زبانی حساب، مبادیات علم ہندسہ (جیومیٹری) مبادیات مساحت، مبادیات حساب کتاب (بک کیپنگ) (۴) دیسی زبان (کتب نصاب میں (۱) تاریخ۔ یعنی تاریخ اسلام و تاریخ ہند بہ تعلق تاریخ عالم (۲) جغرافیہ، ہندوستان کا جغرافیہ مفصل، اسلامی ممالک کا جغرافیہ مجمل، بہ تعلق جغرافیۂ عالم (۳) دستور حکومت ہند (گورنمنٹ ہند کا کانسٹیٹیوشن) وانتظام ضلع مع حقوق و فرائض شہری) اور (۴) عقائد و فقہ شامل ہوں گے (۵) عربی زبان کی ابتدائی تعلیم مع انشا و گفتگو بزبان عربی (۶) دیسی زبان کی انشا جس میں عرضی، پٹہ، بیعنامہ، مختارنامہ وغیرہ لکھنا بھی شامل ہو۔

ابتدا میں بچے پر اس قدر مضامین کا بار ڈالنا قرین مصلحت نہیں۔ ابتدائی تعلیم میں جہاں تک ممکن ہو مضامین کم ہوں مگر تعلیم کامل ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد مضامین کی تعداد بڑھا دی جائے تو مضائقہ نہیں۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ دیسی زبان کی کتب نصاب (ریڈروں) میں صرف زبان ہی کی تعلیم کا لحاظ نہیں رکھا گیا بلکہ ان میں عقائد و فقہ (متعلق بہ عبادت اخلاق و سیرت) سائنس، تاریخ ہند و تاریخ اسلام، جغرافیہ ہند و اسلامی ممالک و دستور حکومتِ ہند و انتظام ضلع وغیرہ کے مضامین بھی شریک ہوں گے اور امتحان میں صرف زبان ہی کے سوال نہوں گے بلکہ ان تمام مضامین پر سوال کئے جائیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ طریقۂ تعلیم میں اصلاح کی گئی ہو اور زیادہ تر مضامین کی تعلیم زبانی رکھی گئی ہے تاہم ان مضامین کو سمجھنا، اُن پر بحث کرنا، امتحانات میں جواب دینا کچھ کم مشکل نہیں۔

یہ طریقہ بہت مستحسن ہے کہ ابتدائی دو سال میں بچوں کو بغیر امتحان کے اوپر کی جماعتوں میں ترقی دی جائے گی البتہ تیسرے سال سے امتحان لے کر ترقی دی جایا کرے گی۔

ثانوی تعلیم کے لئے بھی پانچ سال رکھے گئے ہیں۔ یعنی تیرھویں سال سے سترھویں سال کے آخر تک اس میں مفصلہ ذیل مضامین رکھے گئے ہیں۔

لازمی مضامین

۱۔ اسلامی دینیات۔ مضامین قرآن کا علم، فقہ، اخلاق، سیرت مع مبادی اصول فقہ، اصول حدیث، اصول تفسیر، اور قرآن پاک کی تدوین۔

۲۔ عربی زبان۔ قرآن پاک، پانسو احادیث (منتخبہ) اور عربی نظم کے پانسو اشعار۔ گفتگو، انشا اور مبادیات صرف و نحو۔

۳۔ دیسی زبان۔ ادب، تاریخ زبان، صرف و نحو اور انشا۔

۴۔ پیشہ (جس کا مقامی حالات کے رو سے انتظام ہو سکے)

اختیاری مضامین

مفصلہ ذیل مضامین میں کوئی سے تین پہلے تین سال میں اور کوئی سے دو آخری دو سال میں۔

۱۔ کوئی ایک ایشیائی (ماسوائے ملکی زبان کے) یا یورپی زبان۔

۲۔ تاریخ ہند و اسلام پہلے تین سال میں اور آخری دو سال میں ذیل کی کوئی ایک تاریخ۔

(۱) یونان قدیم (۲) رومائے قدیم (۳) ہندوستان قدیم (۴) سامی اقوام (۵) ایشیائی یا یورپی تاریخ کا کوئی عہد (۶) انگلستان کی دستوری تاریخ۔

۳۔ دنیا کا جغرافیہ۔

۴۔ سیاسیات۔

۵۔ معاشیات۔

۶۔ سائنس۔ پہلے تین سال میں طبعیات وکیمیا اور آخری دو سال میں ان میں کوئی تین :

(۱) طبعیات (۲) کیمیا (۳) نباتات (۴) حیوانیات (زوالوجی) (۵) عضویات (فزیالوجی)

۷۔ ریاضیات۔

۸۔ منطق اور مبادیات نفسیات۔

۹۔ ڈرائنگ۔

یہ نصاب بہت اچھا ہے۔ لیکن ہماری رائے میں اسلامی دینیات کی جگہ صرف قرآن پاک کی تعلیم (ابتدائی تعلیم سے خارج کرکے) رکھی جائے۔ یعنی قرآن مجید مع ترجمہ۔ اور قرآن ہی کی آیات سے احکام عبادت ومعاملات استنباط کرکے پڑھائی جائیں۔ یہ بالکل کافی ہے۔ اصول حدیث، اصول فقہ اور اصول تفسیر کی ثانوی تعلیم میں ضرورت نہیں یہ مضامین یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے رکھے جائیں۔

اختیاری مضامین میں اس کی تصریح ضروری ہے کہ طالب علم نے شروع تین سال میں جو تین مضمون لئے ہیں آخری دو سال میں انھیں میں سے کوئی دو مضمون لے سکتا ہے یا اُسے اُن کے علاوہ کوئی اور دو مضمون لینے ہوں گے۔ اگر پہلی صورت ہے تو بہت مناسب ہے اور اگر یہ مطلب ہے کہ آخری دو سال میں اُسے دو نئے مضمون لینے چاہئیں تو ہماری رائے میں یہ درست نہیں۔ اس سے مضامین کی تعداد بہت زیادہ ہو جاتی ہے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ تعلیم ناقص رہ جائے گی۔ مناسب یہی ہوگا کہ پانچ سال تک انھیں مضامین میں تعلیم پائے تاکہ اس کا علم پختہ ہو جائے۔ ثانوی تعلیم میں صرف ایک جدّت پائی جاتی ہے یعنی پیشہ کی تعلیم اور یہ نہایت مناسب و مستحسن ہے۔ مگر ابھی تک یہ مبہم ہے۔ غالباً مقامی حالات کے رو سے بعد میں انتظام کیا جائے گا۔

درجۂ یونیورسٹی

اس میں تین سال کی تعلیم رکھی گئی ہے یعنی ۱۸ سال کی عمر سے ۲۰ سال کی عمر تک۔ یہ تعلیم سند (ڈگری) حاصل کرنے سے قبل دی جائے گی۔

جن لوگوں نے ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں سے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے اُن کے لئے مفصلۂ ذیل مضامین کا امتحان رکھا گیا ہے جن میں کامیاب ہونے کے بعد وہ قومی یونیورسٹی کے درجہ یونیورسٹی میں داخل ہوسکیں گے۔ وہ مضامین یہ ہیں۔

(۱) دینیات ۔ جو ثانوی تعلیم کے لئے مقرر ہے (۲) قرآن پاک ۔ آخری پارہ کے پہلے نصف کا اور سورۂ بقر کا ترجمہ (۳) حدیث ۔ ترجمہ چہل حدیث (شاہ ولی اللہؒ) اور ۶۰ دوسری احادیث کا ترجمہ (۴) عربی (اُن کے لئے جو عربی میں نہیں جانتے) اُسی قدر ابتدائی تعلیم میں ہے اس کے علاوہ صرف و نحو جو ثانوی تعلیم میں ہے (۵) انگریزی (اُن کے لئے جو انگریزی نہیں جانتے) اس کا معیار وہی ہوگا جو عربی کا ہے (۶) اُردو (اُن کے لئے جو اُردو نہیں جانتے) اس کا معیار اُس عربی اور انگریزی سے زیادہ ہوگا جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

خیال کیا گیا ہے کہ اس امتحان میں چھ مہینے یا سال بھر میں کامیابی حاصل کر لی جائے گی۔ اس کے بعد سند کے لئے دو یا ڈھائی سال ملیں گے۔

سند یا ڈگری کے لئے مفصلہ ذیل شعبے رکھے گئے ہیں طالب علم صرف دو مضمون لے سکتا ہے۔ یعنی ایک دینیات جو لازمی ہے اور دوسرا کوئی ایک شعبہ۔

دینیات میں (۱) تفسیر قرآن پاک ۔ سورۂ بقر، آل عمران، انفال اور توبہ اور آخری پارہ (۲) مبادیات اصول تفسیر (۳) منتخب پانسو احادیث اُن کے علاوہ جو ثانوی تعلیم میں ہیں (۴) مبادیات اصول حدیث (۵) فقہ (۶) سیرت (۷) تاریخ خلفا و تاریخ اسلام مفصلۂ ذیل شعبوں میں سے کوئی ایک۔

اسلامی علوم (۱) قرآن پاک، تفسیر اور اصول تفسیر (۲) حدیث، اصول حدیث و اسماء الرجال (۳) اصول فقہ، فقہ مع فرائض (۴) عقائد و کلام (۵) سیرت (۶) تاریخ اسلام مع ضروری جغرافیہ۔

تاریخ (۱) تاریخ خلفا، اسلامی تاریخ کا خاکہ (۲) ہندوستان کی تاریخ، ہندوستان کی معاشیات کی تاریخ (۳) مختصر تاریخ عالم (۴) ایشیائی یا یورپی تاریخ کا کوئی زمانہ یا کسی اسلامی ملک یا قوم کی تاریخ (۵) کسی قوم یا ملک کی جد وجہد آزادی کی تاریخ (۶) (۱) (۲) میں سے کوئی خاص مضمون جس کا مطالعہ اصلی ماخذوں اور اسناد کے رُو سے ہوگا۔

عمرانیات (سوشیالوجی) جس میں سیاسیات و معاشیات وغیرہ بھی شامل ہیں۔

فلسفہ - جس میں منطق، نفسیات، ما بعد الطبیعات و علم اخلاق ہیں۔

السنہ و ادبیات - جس میں عربی مع مبادیات عبرانی - انگریزی یا یورپ کی کوئی جدید زبان اُردو یا کوئی دیسی زبان (لیکن دیسی زبانوں کے لئے ڈگری صرف تصنیف و تالیف کی صورت میں دی جائے گی)

قانون - سائنس - ریاضیات -

ڈاکٹر کی سند کے لئے اوپر کے مضامین میں سے کسی خاص مضمون کا انتخاب کیا جا سکتا ہی -

دیسی زبان کے متعلق ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں یہ قرار دیا گیا ہی کہ جہاں کی زبان اُردو ہے وہاں ہندی کا لکھنا پڑھنا لازمی ہوگا اور جہاں کی زبان ہندی ہی وہاں اُردو کا لکھنا پڑھنا۔ موجودہ حالات کے رو سے یہ صورت بہت خوب اور مناسب ہی -

طریقۂ تعلیم میں بھی مناسب تغیر و تبدل کیا گیا ہی اور یہ بہت ضروری تھا۔ کیوں کہ طریقۂ تعلیم کے صحیح نہ ہونے سے یہی نہیں کہ وقت زیادہ صرف ہوتا ہی اور علم کم آتا ہے بلکہ طلبہ کے دماغ بھی خراب ہو جاتے ہیں۔ یونیورسٹی کی تعلیم لکچروں کے ذریعہ سے دی جائے گی کیوں کہ ضروری کتابیں فی الحال مختلف علوم میں دستیاب نہیں ہو سکتیں لیکن ابتدائی تعلیم میں بھی درس کا بہت کچھ حصہ زبانی رکھا گیا ہی۔ تعجب ہی کہ مختلف پیشوں کی تعلیم کا جہاں ذکر کیا گیا ہی وہاں مدرسی کے پیشہ کا نام تک نہیں آیا۔ حالاں کہ اس کی شدید ضرورت ہی اور اس کا انتظام فوری ہونا چاہیئے ورنہ جس ڈھنگ پر بانیانِ یونیورسٹی ابتدائی اور ثانوی تعلیم دینا چاہتے ہیں اس میں ہرگز کامیابی نہ ہوگی۔ جب تک مدرسین کی تعلیم و تربیت کا انتظام نہ ہوگا۔ جیسا کہ نصاب تعلیم سے معلوم ہوتا ہی اس یونیورسٹی کے متعلق مدارس بھی ہوں گے اور اچھے مدرسین کی ضرورت لاحق ہوگی تو اس لئے یہ نہایت ضروری ہی کہ یونیورسٹی میں ایک شعبہ اساتذہ کی تعلیم کے لئے بھی قایم کیا جائے۔ بچوں کی تعلیم ایسا آسان کام نہیں ہی جیسا کہ سمجھا جاتا ہے لہذا خاص طور پر ٹرینڈ مدرسوں کا ہونا ضروری ہے اور اس کا انتظام یونیورسٹی کو اپنے خاص خیال اور طریقہ پر کرنا چاہیئے تاکہ ابتدا سے تعلیم کی بنیاد صحیح طریقہ پر قایم ہو۔

تاریخ کی تعلیم کا جو طریقہ تجویز کیا گیا ہے وہ قابل تعریف ہی۔ موجودہ طریقہ درحقیقت بے سود ہے۔ مختلف

قوموں یا ملکوں کی تاریخ پڑھائی جاتی ہے جس کا کوئی تعلق تاریخ عالم سے نہیں ہوتا۔ حالاں کہ وہ زنجیر کی لڑیاں ہیں
تاریخ کا کوئی شعبہ یا حصہ ہو جب تک اس کا سلسلہ دوسرے ممالک یا اقوام اور تاریخ عالم سے نہ ملایا جائے وہ بے تعلق سی
چیز ہو جاتی ہے۔ جب صورت یہ ہے اور اسے بانیان یونیورسٹی تسلیم کرتے ہیں تو کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ پہلے طلبہ کو انسان
کی تاریخ اور تاریخ عالم کا مختصر خاکا بتایا جائے اور بعد ازاں خاص ممالک اور اقوام کی تاریخ پڑھائی جائے۔ اور ساتھ
ساتھ اس سلسلہ کو قایم رکھا جائے۔

ہمیں افسوس ہے کہ یونیورسٹی فی الحال تجربہ خانہ (لیبوریٹری) اور کتب خانہ کا انتظام نہیں کر سکتی۔ جب تک تجربہ خانہ
اور کتب خانہ کا انتظام وسیع پیمانہ پر نہ ہو یونیورسٹی کوئی کارآمد چیز نہیں ہو سکتی۔ تحقیق و تنقید جو یونیورسٹی کی جان ہے وہ ایسے
مقام پر کیوں کر عمل میں آسکتی ہے جہاں نہ تجربہ خانہ ہے نہ کتب خانہ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں یہ یونیورسٹی ایک معمولی مکتب یا مدرسہ ہو کر
نہ رہ جائے۔

ہندوستان میں اس وقت کئی نوعیت کی یونیورسٹیاں ہیں۔ ایک تو سرکاری یونیورسٹیاں، دوسرے ہندو اور مسلمان
یونیورسٹیاں جنھیں نیم سرکاری سمجھنا چاہیے۔ تیسرے آزاد یونیورسٹیاں جو قومی یونیورسٹیاں کہلاتی ہیں۔ لیکن دیکھا جائے
تو ان کی دو ہی قسمیں ہیں۔ ایک سرکاری دوسرے ہندو مسلمان یونیورسٹیاں (تعجب ہے کہ یونیورسٹیاں بھی ہندو
مسلمان ہونے لگیں) لیکن افسوس کہ ہندوستان کی یونیورسٹی کوئی بھی نہیں۔ سرکاری یونیورسٹیاں ساٹھ ستر سال
سے قایم ہیں مگر وہ ہمیں صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ بنانے میں ناکام رہیں۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ جدید یونیورسٹیاں جو قایم
ہوئی ہیں وہ کہاں تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوتی ہیں۔ اگرچہ ہندو و مسلم یونیورسٹیوں میں فرق صرف مذہبی تعلیم کا
ہے لیکن یہ فرق معمولی نہیں۔ اس سے دماغ پر طبیعت پر اخلاق پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ جس طرح تاریخ و فلسفہ کی تعلیم بنی
نوع انسان اور تمام عالم کے نقطۂ نظر سے ہو سکتی ہے تو کیا مذہب کی تعلیم اُسی نقطۂ نظر سے ممکن نہیں؟ ہندوستان کو ایسی
یونیورسٹی کی شدید ضرورت ہے۔ لیکن اس کے قایم کرنے کی ہمت کوئی کرے۔ کیا ہم ہندوستان کے سپوت عالی دماغ
حکیم اور نازک خیال شاعر ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور سے یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ ہندوستان کی ایک یونیورسٹی قایم کریں گے؟

مُشتہرین
کو
مژدہ

رسالۂ اُردو انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ ہے اور ملک کے اعلیٰ ترین ہندوستانی طبقوں میں پہونچتا ہے۔ مشتہرین کے نفع حاصل کرنے کا یقینی ذریعہ ہے۔

۲ - اُجرتِ اشتہار حسب ذیل ہوگی۔

پیمانہ	مدّت	اُجرت
چوتھائی صفحہ	ایک بار	صہ ر
"	دو بار	لعہ ر
"	تین بار	عہ
"	چار بار	عہ

نصف صفحہ کے لئے اس سے دو چند ¾ صفحہ کے لئے سہ چند۔ پورے صفحہ کے لئے چہار چند۔

نوٹ:- (۱) صفحہ میں ۲۱ سطریں اور فی سطر اوسطاً ۱۰ الفاظ قرار دیئے گئے ہیں۔ (۲) خفی و جلی قلم میں اسی معیار کا لحاظ ہوگا۔

۳ - چوتھائی کالم سے کم کی اُجرت نہیں لی جائیگی۔

۴ - صرف مہذب اشتہارات منظور کیئے جائینگے۔

۵ - منیجر کو کسی اشتہار کے نامنظور کر دینے کا حق ہوگا۔

۶ - اُجرت بہرحال پیشگی لی جائیگی۔

۷ - مشتہرین کو فی پرچہ ۸ر زائد ادا کرنے پر رسالہ روانہ کیا جاسکیگا۔

خط و کتابت وغیرہ کے لئے پتہ:-

انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد (دکن)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو کی بہترین کتابیں

خدا کے فضل و کرم سے ہندوستان بھر میں صرف یہی ایک کارخانہ ہے جو تمام مشہور و معروف مصنفین اُردو کی مکمل تصانیف کا ذخیرہ رکھتا ہے اور اُردو کی تقریباً کُل وہ کتابیں جو قابل دید کہی جاسکتی ہیں اپنے معزز قدردانوں کی خدمت میں پیش کرتا رہتا ہے۔ مُلک بھر میں جتنی جدید و عمدہ تصانیف شایع ہوتی ہیں وہ کارخانہ ہذا میں فوراً منگائی جاتی ہیں۔ اِس طرح جو صاحب الناظر بک ایجنسی سے معاملت رکھیں گے اُن کو انشاءاللہ تعالیٰ اُردو کی کسی کتاب کے لیئے دوسرے کارخانہ کی طرف رجوع کرنے کی حاجت نہوگی۔ مختصر فہرست درج ذیل ہے مفصل فہرست بنام **مصنفین اُردو** طلب کرنے پر روانہ خدمت عالی ہوگی۔

المعلن: - منیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مرزا غالب مرحوم

کتاب	قیمت
اردوے معلی	سے/
عود ہندی	/۱۲
دیوان غالب پاکٹ ایڈیشن	سے/

سرسید احمد خان مرحوم

کتاب	قیمت
تفسیر القرآن جلد	عیعہ
مضامین تہذیب الاخلاق	للعہ/
خطبات احمدیہ	۶/
آثار الصنادید	ہیے
مکمل مجموعہ لکچر	للعہ
اسباب بغاوت ہند	/۶
ابطال غلامی	عصر

مولانا آزاد مرحوم

کتاب	قیمت
آب حیات	عیہ/
دربار اکبری	سے/
سخندان فارس	سے/
نیرنگ خیال	/۱۰
مکتوبات آزاد	/۱۰
مجموعہ نظم آزاد	/۱۲

مولانا حالی مرحوم

کتاب	قیمت
دیوان حالی مع مقدمہ مجلد	للعہ
مسدس حالی	/۸
یادگار غالب	عیہ/
حیات سعدی	عیصر

مولانا نذیر احمد مرحوم

کتاب	قیمت
ترجمۃ القرآن متوسط	معہ/
الحقوق والفرائض ۳ جلد	صیر
اجتہاد	عیصر
مجموعہ نظم بے نظیر	عیصر
مبادی الحکمۃ	عصر/
موعظہ حسنہ	عیصر
رویائے صادقہ	عیصر
ابن الوقت	عیصر
ایامی	عیصر
فسانہ مبتلا	عیصر
مراۃ العروس	/۱۲
توبۃ النصوح	/۱۲
بنات النعش	/۹
مجموعہ لکچر ۲ جلد	صہ/

مولانا شبلی مرحوم

کتاب	قیمت
سیرۃ النبی صلعم جلد دوم	تے/
الفاروق	سے/
الغزالی	عیصر
المامون	عیصر
سیرۃ النعمان	عیصر
سوانح مولانا روم	۶/
بیان خسرو	/۱۰
علم الکلام	۶/
الکلام	۶/
سفرنامہ مصر و شام و روم	[illegible]
رسائل شبلی	عیصر
مقالات شبلی	عیصر
مضامین عالمگیر	/۱۲
شعر العجم ۵ جلد	[illegible]
مجموعہ کلام شبلی	/۱۲

مولانا ذکاء اللہ مرحوم

کتاب	قیمت
تاریخ ہندوستان کامل ۱۰ جلد	عہ
تاریخ عہد سلطنت انگلشیہ ۳ جلد	سے
آئین قیصری	عمہ
کرزن نامہ	ع/
صحیفہ فطرت	ع/
محاربات عظیم	۸/
فلسفہ امثال	۱۲/
تقویم اللسان	۶/
تعلیم الانتظام	۱۲/
اہل عرب کا جبر ومقابلہ	۶/
جغرافیہ ریاضیہ	۱۲/
جغرافیہ طبعی	۸/
رسالہ علم تناسب	۶/
رسالہ علم مساحت	۱۲/
معاون الحساب	۱۲/

مولوی عبد الرزاق کانپوری

کتاب	قیمت
البرامکہ	سے
نظام الملک طوسی مجلد	عہ

مولوی عزیز مرزا مرحوم

کتاب	قیمت
خیالات عزیز	عمہ
وکرم اروسی	عمہ

نواب محسن الملک مرحوم

کتاب	قیمت
آیات بینات ۳ جلد	معہ
مضامین تہذیب الاخلاق	للعہ
مجموعہ لکچر	للعہ
تقلید وعمل بالحدیث	۸/
کتاب المحبت والشوق	۸/

سید محمود مرحوم

کتاب	قیمت
کتاب الطلاق	ع/
کتاب الشفعہ	ع/
شرح قانون شہادت	سے
لکچر	۸/

خلیفہ محمد حسین مرحوم

کتاب	قیمت
اعجاز التنزیل	سے
سفرنامہ برنیر ۲ جلد	للعہ
تاریخ پٹیالہ	سے

مولانا شہری مرحوم

کتاب	قیمت
حیات انیس	ع/
ایشیائی شاعری	عصہ
نورجہان بیگم	۸/
ٹیپو سلطان	عمہ
حیدر علی سلطان	عصہ

مولوی چراغ علی مرحوم

کتاب	قیمت
مضامین تہذیب الاخلاق	عیہ
تحقیق الجہاد	سے
اعظم الکلام جلد	سے
مجموعہ رسائل	سے

مولوی احسان اللہ عباسی

کتاب	قیمت
ترجمہ قرآن مجید	صہ
تاریخ الاسلام	للعہ
الاسلام	عہ
المجاہدہ	عصہ
زاہدہ	عصہ
نشتر سخن	سے

مولوی حبیب الرحمن خان شروانی

کتاب	قیمت
علمائے سلف	عصہ
اسلامی اخلاق	۸/
نفش دفا	۸/
ذکر جمیل حبیب سیرۃ الصدیق	عہ

منشی سعید احمد مارہروی

کتاب	قیمت
آثار اکبری	ع/
حیات خسرو	۱۲/
حیات صالح	۴/

مولانا اسلم جیراجپوری

کتاب	قیمت
حیات	عصہ
حیات جامی	۸/
علوم عرب	عیہ
خواتین	عصہ
رسالہ محجوب الارث	۴/

نواب علی حسن خان حسام الملک

کتاب	قیمت
فطرت الاسلام	ع/
المدنیۃ فی الاسلام	عیہ

مولوی رشید احمد انصاری

کتاب	قیمت
تحریر المراۃ	عیہ
المدنیۃ فی الاسلام	ع/

منشی محمد حسن خان

کتاب	قیمت
ترکوں کی معاشرت	عہ
ہاجرہ	ع/

مسٹر ظفر علی خان بی اے

کتاب	قیمت
جنگل مین منگل	ع/
سیر ظلمات	ع/
ڈراما جنگ روس وجاپان	عصہ
فلسفہ ابن سینا	۸/

کتاب	قیمت
معاشرت	۱۰/
اپریل فول	۸/

مولوی عبد الغنی وارثی مرحوم

کتاب	قیمت
مسلمانان اندلس	عیہ
تنقیح حقوق نسوان	۱۲/

خواجہ غلام الثقلین مرحوم

کتاب	قیمت
روزنامہ سیاحت	ع/
ایک فلسفیانہ لکچر اسلام	۴/

مسٹر عنایت اللہ خان بی اے

کتاب	قیمت
دعوت اسلام	عہ
زلفی	۸/

مسٹر ظفر عمر بی اے

کتاب	قیمت
نیلی چھتری حصہ اول	عصہ
پولیسین حصہ دوم	عہ

محمد ہادی بی اے

کتاب	قیمت
امراؤ جان ادا	عصہ
شریف زادہ	۸/
خونی مصوّر	عصہ
لیلے مجنون	۸/
مثنوی امید وبیم	۴/

منیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

منشی امیر احمد مینائی مرحوم

کتاب	قیمت
امیر اللغات	عـہ
میناے سخن	عہر
محامد خاتم النبیین	۸/

پروفیسر نواب علی

کتاب	قیمت
تذکرۃ المصطفیٰ	عہر
معاریج الدین	عہر ۱۲/
صحف سماوی	سے/

انیس احمد عباسی بی اے

کتاب	قیمت
احمد و کیتھرینا	۶/
نازنین آرمینیا	عصر ۴/
زلیخا	۱۲/

مرزا داغ دہلوی مرحوم

کتاب	قیمت
مہتاب داغ	سے/
گلزار داغ	عہر
انتخاب داغ	عہر
یادگار داغ	۸/
فریاد داغ	۵/

جلال مرحوم

کتاب	قیمت
مضمون ہاے دلکش	عصر/

کتاب	قیمت
نظم نگارین	عصر/
رسالہ تذکیر و تانیث	۸/
قواعد المنتخب	۴/
افادہ تاریخ	۸/

منشی برکات احمد

کتاب	قیمت
جمیلہ	۱۱/
بیعرفا	۱۲/
یادگار سلطنت	۶/

منشی سجاد حسین مرحوم

کتاب	قیمت
احمق الدین	۸/
حاجی بغلول	زیر طبع
پیاری دنیا	۱۰/
طلسمی فانوس	۶/
میٹھی چھری	۶/
کایا پلٹ	۱۲/

پنڈت رتن ناتھ سرشار

کتاب	قیمت
ہشو	۶/
پچھڑی دلہن	۸/
پی کہاں	۵/
کامنی	عہر
خدائی فوجدار	۶/
سیر کہسار ۲ جلد	سے/

کتاب	قیمت
فسانہ آزاد	عـہ
جام سرشار	عہر

منشی جوالا پرشاد برق

کتاب	قیمت
مرنالنی	۱۲/
مار آستین	۱۲/
بنگالی دولہن	۱۲/
پرتاب	۱۲/
معشوقۂ فرنگ	۱۰/
بروگ	۵/

مولانا عبد الحلیم شرر

کتاب	قیمت
جنید بغدادی	عصر/
ابوبکر شبلی	عصر/
عزیزۂ مصر	عہر
دولت اسپانیۂ عرب ۵ حصہ	معہ ۱۲
صقلیہ میں اسلام	۱۴/
قیس و لبنیٰ	عہر
فلپانا	عہر ۸
ماہ ملک	۶/
منصور موہنا	۸/
شوقین ملکہ	عہر ۸
رومۃ الکبریٰ	عہر
فلورا فلورنڈا	۶/
خوفناک محبت	عہر

کتاب	قیمت
حسن کا ڈاکو ۲ جلد	عہر ۸
دربار حرامپور	۱۰/
الفانسو	۱۲/
فاتح و مفتوح	عہر
جویاے حق ۲ جلد	للعہ/
بابک خرمی ۲ جلد	عہر ۸
لعبت چین	عصر/

حکیم محمد علی خان

کتاب	قیمت
عبرت کامل	سے/
حسن سرور کامل	سے/
دیول دیوی	عہر ۹
گورا	۶/
نیل کا سانپ	عہر ۹
جعفر و عباسہ	عہر ۱۲
اختر و حسینہ	۶/ ۸

منشی احمد علی شوق قدوائی

کتاب	قیمت
ترانۂ شوق	۶/ ۸
عالم خیال	۸/
قاسم و زہرہ	۱۲/
گنجینہ	۸/

مولوی سید احمد دہلوی مرحوم

کتاب	قیمت
راحت زمانی	عہر

کتاب	قیمت
رسوم دہلی	عصر/
تسخیر شوہر	۱۲/
مہرا فروز بیگم	۱۰/
کنز الفوائد	۸/
انشا معہ تحریر النسا	عصر/
تعلیم طبعی	۸/
لغات النسا	للعہ/

مرزا حیرت دہلوی

کتاب	قیمت
سیرۃ الرسول ۱ جلد	سے/
کتاب شہادت ۵ جلد	سے/
مضامین حیرت	۶/
حاجی بابا اصفہانی	عہر ۸
الف لیلیٰ دنیازاد	سے ۱۲/
الف لیلیٰ شہرزاد	۶/ ۸
روز الیمبرٹ ۲ جلد	سے/
کثرت ازدواج	۸/
تزک امیری ۲ جلد	۶/ ۸

خواجہ عشرت لکھنوی

کتاب	قیمت
قواعد میر	۹/
لسانزانی	۶/
اصلاح زبان اردو	۶/
شاعری کی پہلی کتاب	۸/
شاعری کی دوسری کتاب	۸/

حکیم احمد حسین الہ آبادی

کتاب	قیمت
تاریخ ابن خلدون جلد اول	عـہ/۸
" جلد دوم	عـہ/۸
" جلد سوم	عـہ/۸
جلد چہارم	۶/۸
پنجم (زیر طبع) ششم	۶/
" ہفتم	۶/
" ہشتم	۶/
" نہم	۶/
" دھم	۶/
" یازدھم	۶/
صلاح الدین	عـہ/
نورالدین محمود	عـہ/

مولوی انشاء اللہ

کتاب	قیمت
تزک تیموری	عـہ/
حالات قسطنطنیہ	عـہ/
تاریخ مرکش و مغرب الاقصٰی	۶/۱۲

مولوی محمد حلیم انصاری

کتاب	قیمت
تمدن اسلام ۲ جلد	سے/
الاسلام والنصرانیۃ	۸/
اسلام اور توسیع نظام	۸/
فتح اندلس	عـہ/
فلاح دارین	۱۲/

مولوی عبد اللہ العمادی

کتاب	قیمت
کتاب المعارف	عـہ/۸
محکمات	عـہ/۴
تاریخ عرب قدیم	۱۰/
علم الحدیث	۸/
صناعۃ العرب	۴/
فلسفۃ القرآن	۳/
محرم کی بدعتیں	۴/

مولانا سید سلیمان ندوی

کتاب	قیمت
ارض القرآن ۲ جلد	سے/۱۲
لغات جدیدہ	عـہ/۸
مکاتیب شبلی ۲ جلد	سے/۸
اہل السنۃ والجماعت	۸/
سیرۃ عائشہ رضی اللہ عنہا	۶/۸

مولوی عبد السلام ندوی

کتاب	قیمت
سیرۃ امام مسلم	۴/
سیرۃ عمر بن عبد العزیز	عـہ/۸

پروفیسر عبد الباری ندوی

کتاب	قیمت
مبادی علم انسانی	عـہ/
برکلے کا فلسفہ	عـہ/
عقلیت و اسلام	۱/۰

خواجہ حسن نظامی

کتاب	قیمت
روزنامہ بلاد شرقیہ	۶/۸
روزنامچہ ہندوستان	۱۲/
میلاد نامہ	عـہ/
محرم نامہ	عـہ/
یزید نامہ	عـہ/۴
طمانچہ بر رخسار یزید	عـہ/
محل نامہ گیارھویں	۱۲/
کرشن بیتی	۶/
آپ بیتی	عـہ/
جگ بیتی	۶/
خطوط حسن نظامی	۱۲/
بیوی کی تعلیم	عـہ/
اتالیق خطوط نویسی	۱۲/
بھکاریان و گدگدیان	۱۰/
بچوں کی کہانیاں	۱۰/
اردو دعائیں	۱۰/
اسلام کا انجام	۸/
سیر دہلی	عـہ/
غدر دہلی کے افسانے ۵ حصے	صہ/
اسرار	۴/

پروفیسر شہباز مرحوم

کتاب	قیمت
زندگانی بے نظیر	عـہ/۴
خیالات شہباز	عـہ/

مولانا راشد الخیری

کتاب	قیمت
صبح زندگی	عـہ/
شام زندگی	عـہ/۴
غب زندگی	عـہ/
نوحۂ زندگی	۱۲/
منازل السائرہ	عـہ/
جوہر قدامت	عـہ/۴
عروس کربلا	عـہ/۸
الزہراء	۱۲/
بنت الوقت	۸/
سراب مغرب	۸/
سات روحوں کے اعمال نامے	۶/
مودودہ	۸/
ماہ عجم	عـہ/

مولوی بشیر الدین دہلوی

کتاب	قیمت
تاریخ بیجاپور ۳ جلد	سے/
حرز اطفال	عـہ/
نشاط عمر	عـہ/۴
عصائے پیری	عـہ/
حسن معاشرت	عـہ/۴
اصلاح معیشت	عـہ/۸
اقبال دلہن	عـہ/
بیویوں سے دو دو باتیں	عـہ/
عزم بالجزم	۴/

نیاز فتح پوری

کتاب	قیمت
جذبات بھاشا	۱۲/
گہوارۂ تمدن	۶/
گیتانجلی مجلد	۶/
کیوپڈ اینڈ سائکی	۸/
مریخی سماج کی ڈائری	۶/

سیماب اکبر آبادی

کتاب	قیمت
خدیجۃ الکبریٰ	عـہ/۴
بنت الرسول	۵/
سیرۃ الحسین	۶/
جام کوثر	۵/

صفدر مرزا پوری

کتاب	قیمت
بزم خیال	عـہ/
مشاطۂ سخن	عـہ/

مہاشے پرکاش دیو

کتاب	قیمت
حضرت محمد صلعم	۸/
مہاتما بدھ ۲ جلد	۶/
مارٹن اور لوتھر	۸/
خدا اور روح	۱۲/
سیر المستورات	۱۲/
بچوں کی کہانیاں	۶/

ضروری اعلان۔ فرمائش کرتے وقت اس بات کا خیال ضرور رکھیں کہ صرف اخبار میں آپ ہماری فہرست ملاحظہ کی ہے۔ غلط فہمی نہ ہو

مینیجر الناظر بک ایجنسی، لکھنؤ

فہرست کتب

(سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو)

البیرونی کمالات ذہنی میں ابوریحان بیرونی کا مرتبہ
تعریف سے مستغنی ہے دسویں صدی کا فاضل ہے مگر تبحر علمی
اور دقیق النظری میں بیسویں صدی کا محقق معلوم ہوتا
ہے ہندوستان آیا اور ہندوستان کے فلسفۂ تاریخ
اور مذہب و معاشرت پر ایک بے مثل کتاب لکھی البیرونی
اس کے حالاتِ زندگی اور کمالاتِ علمی پر مشتمل ہے عہ

فلسفۂ اجتماع تالیف ہے اور اس کا موضوع نفسِ اجتماعی
جماعت کے لیئے اعمال و قوائے دماغی کے تحلیل و تشریح
ہے موجودہ انقلابات میں اس کا مطالعہ دلچسپی اور
فائدے سے خالی نہوگا - اس پر انگلستان و ہند کے
علما و اخبارات نے اچھے اچھے ریویو لکھے ہیں - عہ

قاعدہ و کلید قاعدہ مدت - کے غور و خوض کے بعد
اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہے - ڈائرکٹر تعلیمات بمبئی
نے اپنے صوبہ کے گورنر سے تحریک کی ہے کہ اس قاعدہ
کو نصاب میں داخل کیا جائے - جس اُصول اور طریقہ پر
اس کی تعلیم ہونی چاہیئے اُن کی تشریح کے لیئے ایک کلید بھی
تیار کی ہے - قاعدہ ۲ر کلید قاعدہ ۴ر

دریائے لطافت ہندوستان کے مشہور سخن سنج
میر انشاء اللہ خاں کی تصنیف ہے اُردو صرف و نحو اور روزمرہ و محاورات
والفاظ کی پہلی کتاب ہے اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب
و غریب نکات درج ہیں - قیمت عہ

طبقات الارض - اس فن کی پہلی کتاب ہے - تین سو
صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل قلمبند ہیں انگریزی اور اُردو
دانوں کے لیئے یکساں طور پر مفید ہے - کتاب کے
آخر میں انگریزی مصطلحات اور اُن کے مرادفات کی فہرست
بھی منسلک کردی گئی ہے - قیمت عہ

مشاہیر یونان و روم - پلوٹارک لائوز کا ترجمہ ہے سیر نگاری
اور انشا پردازی میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس سے

آج تک مسلم الثبوت چلا آتا ہی۔ ادیبان عالم بلکہ شکسپیر تک نے
اس چشمہ سے فیض حاصل کیا ہی۔ وطن پرستی و بے نفسی، عزم
و جوانمردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ لبریز ہی۔
ہماری قوم کے ہر نوجوان کے ہاتھ میں اس کا ایک نسخہ
ضرور ہونا چاہیئے۔ دنیا کی تمام مہذب زبانوں میں اس کا
ترجمہ ہو چکا ہی۔ جلد اول غیر مجلد عہ مجلد ۸ر جلد دوم مجلد ۸ر

اسباق نحو دو حصے ملک کے ادیب کامل مولٰنا
مولوی حمید الدین صاحب بی اے کی تالیف سے
ہیں۔ اختصار کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک ضروری
مسئلہ درج ہی عربی خواں طلباء کے لیئے نادر تحفے ہیں
قیمت فی رسالہ ۴ر

علم المعیشت اسرار تمدن کے سمجھنے کے لیئے
اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمد الیاس برنی
صاحب ایم اے نے ملک پر بڑا احسان کیا ہی۔
حجم (۵۰۲) صفحے قیمت صرف للعہ

تاریخ اخلاق یورپ اصل مصنف لیکی کا نام علم
و تبحر تحقیق و صداقت کا مرادف ہی یہ کتاب کئی ہزار
برس کے تمدن و معاشرت اصول اخلاق مذہب و خیالات
کا مرقع ہی۔ ترجمہ مولوی عبدالماجد صاحب بی اے۔
حصہ اول مجلد ؏ دوم مجلد ؏

مبادی سائنس فرانسیسی سے انگریزی اور انگریزی
سے اردو میں ترجمہ کی گئی ہی اس کا بیان سلیس اور مقبول
عام ہی اردو ترجمہ صرف ایک حصہ کا ہی اور آخر کتاب
میں فرہنگ مصطلحات بھی ہی قیمت عہ

تاریخ یونان قدیم۔ یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند کتابوں
کا خلاصہ ہی اور زبان کے لحاظ سے سلاست و شگفتگی کا نمونہ
اس کا نقطہ خیال خالصاً ہندی ہی۔ ایف اے کلاس کے
طلباء جو یونان قدیم کی تاریخ سے گھبراتے ہیں اس کتاب
کو انتہا درجے مفید پائینگے۔ مجلد قیمت عہ

انتخاب کلام میر۔ میر تقی سرتاج شعرائے اردو کے کلام
کا انتخاب ہی مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو
نے یہ انتخاب ایک مدت کی سعی و محنت کے بعد کیا ہی اور
شروع میں میر صاحب کی خصوصیات شاعری پر ۲۴۰ صفحے
کا ایک مقدمہ بھی ہی۔ قیمت ؏

رسالہ نباتات - اس موضوع کا پہلا رسالہ ہی علمی اصطلاحات سے معرّا - سلاست روانی مملو اور دلچسپ و مفید ہی - طلباء نباتات جس مسئلہ کو انگریزی میں نہ سمجھ سکیں وہ اسی رسالہ میں مطالعہ کریں - قیمت مجلد عہ ۸ر

دیباچہ صحت - اس کتاب میں مطالبات صحت مثلاً ہوا، پانی، غذا، لباس وغیرہ مبسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ہی زبان عام فہم اور پیرایہ مؤثر و دل پذیر ہے - ملک کی بہترین تصنیف ہی - اس کا مطالعہ طبیبوں کے کئی ہزار نسخوں سے زیادہ قیمتی ثابت ہوگا - حجم ۵۵۰ صفحے مجلد قیمت للعہ ر

قواعد اردو - ارباب فن کا اتفاق ہی کہ اردو زبان میں اس سے بہتر قواعد نہیں لکھی گئی بسیط و شرح کے علاوہ اس میں بڑی خوبی یہ ہی کہ فارسی قواعد کا تتبع نہیں کیا گیا ہی اس کو ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم بمبئی نے نصاب میں داخل کرنے کی تجویز کی ہی قیمت عہ ر

القول الاظہر - ابن مسکویہ کی معرکۃ الآرا تصنیف الفوز الاصغر کا اردو ترجمہ ہی - ابن مسکویہ آسمان علم و فضل کا آفتاب تھا یہ کتاب فلسفہ انھیں کے اصول پر لکھی گئی ہی اور مذہب اسلام پر انھیں اصول کو منطبق کیا گیا ہی - اس کو بمبئی یونیورسٹی نے سرکاری کتب خانوں کے لیئے تجویز کیا ہی قیمت عہ ر

امرائے ہنود - پانسو سے زیادہ ہندو امرا کے حالات قلمبند ہیں - یہ امرا سلاطین مغلیہ کے زمانے میں بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز تھے کتاب گویا ان متعصب و ناواقف مؤرخوں کا جواب ہی جو اسلامی حکومت پر تعصب کا الزام لگاتے ہیں - قیمت حصّہ اوّل عہ ر حصّہ دوم عہ ۸ر

القمر - قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی طرح اور چاند کے متعلق جتنی جدید انکشافات ہوئے ہیں ان سب کو جمع کر دیا ہی طرز بیان دلچسپ اور کتاب ایک نعمت ہے - قیمت ۸ر

تاریخ تمدن - مسٹر ٹامس بکل کی شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ ہی الف سے یے تک تمدن کے ہر مسئلہ پر کمال جامعیت سے بحث کی گئی ہی - ہر بحث کے لیئے ایک دلچسپ

مگر پُرزور اُصول اختیار کیا گیا ہی اور ہر اُصول کی تائید
میں تاریخی انتقاد سے کام لیا گیا ہی اس کے مطالعہ سے
معلومات میں انقلاب اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہی۔
بمبئی میں سرکاری لائبریریوں کے لیئے تجویز کی گئی
ہی۔ قیمت حصہ اوّل غیر مجلد عہ حصہ دوم مجلد عہ،

مقدمات الطبیعات یہ ترجمہ ہی مگر انگلستان کے مشہور سائنس
داں حکیم ہکسلی کی کتاب کا ترجمہ ہی۔ جس کا نام کتاب کی کافی
ضمانت ہے، اس میں مظاہر فطرت کی بحث درج ہی لیکن کتاب
علم و فضل کا مرقع ہی۔ متعلمان سائنس اور عام شائقین کے
لیئے بہت مفید ہی۔ قیمت عہ

فلسفۂ جذبات۔ کتاب کا مصنف ہندوستان کا مشہور
نفسی ہی۔ جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت
لیاقت اور زبان آوری کے ساتھ بحث کی گئی ہی قیمت عہ

نکات الشعرا۔ یہ اُردو شعرا کا تذکرہ میر تقی میر کی تالیف
سے ہی اس میں میر صاحب کی رائے اور زبان کے بعض
بعض نکات پڑھنے کے قابل ہیں۔ مولانا حبیب الرحمن خاں
صاحب شروانی نے اس پر ایک ناقدانہ اور دلچسپ مقدمہ
لکھا ہی۔ قیمت سے،

نپولین اعظم ایبٹ کی مستند کتاب کا اُردو ترجمہ ہی۔
کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ نپولین کی زندگی بشری
جدوجہد کا آخری باب ہی، واقعات کی داد یا تو سکندر
کی زبان ادا کرسکتی ہی یا تیمور کی زبان، ترجمہ آسان اور عام
فہم ہی مکمل پانچ جلد قیمت

فلسفۂ تعلیم۔ ہربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلہ
تعلیم کی آخری کتاب ہی۔ غور و فکر کا بہترین کارنامہ اور والدین
و معلم کے لیئے چراغ ہدایت ہی تربیت کے زبانی قوانین کو اسقدر
صحت کے ساتھ مرتب کیا ہی کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہی قیمت سے،

رہنمایان ہند۔ مشہور کتاب پروفیسر آف انڈیا کا ترجمہ ہی شروع
میں ہندو مذہب کے برگزیدہ عقائد کا بیان فاضلانہ مگر دلکش پیرایہ
میں لکھا ہی اس کے بعد سری کرشن جی مہاراج کی
سوانح اور گوتم بدھ کے پراثر حالات آتے ہیں آخری حصہ
میں شنکر اچارج رامانج اور رامانند کا ذکر ہی قیمت عہ

آنریری سکرٹری انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)